



تاجدنگہ پتا ہوا صحرا پھیلا ہوا تھا۔ جانجا بکھرے ہوئے ریت کے ٹیلے اور کانٹوں سے الٹی جھاڑیاں سورت  
پیش کئے اسے اپنا چہرہ جھلستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”دادی!“ اس نے ایک مرتبہ پھر نگاہ دور دور تک دوڑائی۔ ”دادی! کہاں ہیں!“  
سورت کی تیز گرم جھلسائی ہوئی آگ اب اسے اپنے پوٹوں پر محسوس ہوئی اور چند لمحوں کے لیے ہر سواندھیرا چھ

”دادی! دادی! دادی! کہاں ہیں آپ!“ پیاس کی شدت سے اس کے گلے میں کانٹے اگ رہے تھے۔  
”ربیعہ!“ اچانک دادی کی آواز ایک سرگوشی کی صورت میں اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ربیعہ پیاس

ہے۔ ربیعہ پیاس لگی ہے۔“  
”دادی! دادی! دادی! کہاں ہیں آپ!“ دھوپ کی شدت نے بالآخر اسے دیکھنے کی صلاحیت سے قطعی طور

محروم کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اندھوں کی طرح دادی کو ڈھونڈنے لگی۔  
”دادی! میری دادی!“

”ربیعہ!“ سرگوشی پھر ابھری تھی۔ ”ربیعہ! پیاس لگی ہے۔ ربیعہ! پیاس لگی ہے۔“



وہ زور زور سے رونے لگی۔ بے بسی کا احساس پوری شدت سے اس کے حواس پر طاری تھا۔ وہ صرف رو سکتی تھی۔

اچانک اس نے اپنی ہچکچوں کی آواز سنی اور پھر خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ چند لمحے اس طرح گزرے تھے جیسے وہ قبر میں لپٹی ہوئی ہو۔ ہر سو چھایا ہوا اندھیرا تھا۔ آواز اور وحشت سے پھٹا دل! بڑا شاید اسی کیفیت کا نام ہے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ مؤذن کی آواز آ رہی تھی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔  
”حسب علی الفلاح۔“

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس آواز نے اسے قبر سے نکال کر دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ اسے اپنے چہرے پر پھیلی غمی کا احساس ہوا۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو جسم سے چپکی قیصل نے اسے احساس دلایا کہ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی ہے۔ حلق کانٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ زبان اکڑی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لیے وہ قوت گویائی سے محروم ہو گئی ہو۔

بستر سے اتر کر وہ تیز قدموں سے دروازے کی جانب بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ مؤذن کی آواز واضح ہو گئی۔  
”اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ ان لا الہ الا اللہ“

وہ صحن میں چلی آئی۔ گھٹو غمی پر دھڑکتے ہوئے سے پانی نکال کر اس نے وہیں کھڑے کھڑے گلاس خالی کر دیا اور ایک گلاس بھر کر وہ وہیں بیٹھ گئی۔

”گھونٹ گھونٹ پانی پیتے ہوئے“ مسلسل اپنے خواب کے متعلق سوچ رہی تھی۔  
”صبح کاؤب کے وقت دیکھے گئے خواب سچے ہوتے ہیں۔ اور خواب کے بعد آنکھ کھلے اور فجر کی اذان سنتو تو سمجھو بالکل سچا خواب ہے۔“ وادی اتنی کہا کرتی تھیں۔ ”بندہ پاک صاف ہو، عشاء پڑھ کر واپسی کروٹ سویا ہوتا ہے۔ بس یہی نشانیاں ہیں سچے خوابوں کی۔“

اس کے کانوں میں وادی کی آواز گونج رہی تھی۔ نظروں کے سامنے ان کا چہرہ پھر رہا تھا۔ ابھی دس دن پہلے کی بات تھی۔ جیتی جاگتی چلتی پھرتی وادی جان کا پیار لے کر وہ کالج گئی تھی۔ اس کے سامان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ آخری مرتبہ انہیں دیکھ رہی ہے۔ انہوں نے وہ دبست شفقت آخری مرتبہ اس کے سر پر پھینکا ہے۔ اب وہ کبھی انہیں بات کرنا نہ پائے گی۔ اب وہ کبھی اس پر نور مسکراہٹ کو دوبارہ نہ دیکھے گی۔ اسے خبر ہوئی تو وہ گھر سے قدم نہ نہ نکالتی۔ وہ دل پر زخم کر کھڑی ہو جاتی۔ ملک الموت سے پہلے اس کا سامنا ہوتا۔ وہ اپنی وادی کو کبھی اس کے ساتھ نہ جانے دیتی۔ کبھی نہیں۔

بے بسی کا احساس پھر پوری شدتوں سے اس پر حاوی ہوا۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چارپائی پر گر پڑا۔ اس نے رونانا چاہا مگر وہ نہ سکی۔ پچھلے دس دن میں وہ اتنا روتی تھی کہ اب آنسو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ چیزوں کے چھٹانے کی آواز نے زور پکڑا اور ملکجا اندھیرا اجالوں میں بدلنے لگا تو وہ یوں چونکی جیسے نیند سے اب

بیدار ہوئی ہو۔  
”اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ ان لا الہ الا اللہ“  
وہ نے آنکھوں کو نہ دیکھا۔ وہ حساب سکون بخشا۔ وضو کے عطا کردہ سکون و اطمینان سے لبریز ہو کر وہ وادی کی چوکی پر آئی۔ وادی جان کی جاء نماز اسی طرح پہنچی ہوئی تھی۔ صاف ستھری بے شکن اس کے کونے پر ان کی ملی سبج جیسے کسی کی انکھوں کی منتظر تھی۔ جزوان میں لپٹا قرآن پاک رحل پر رکھا ہوا تھا۔

وادی کی عبادت کے لیے مخصوص تھا۔ وادی جان رات اور دن کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارا کرتی تھی۔ ہند کھنٹوں کے مخصوص اوقات میں وہ گھر کا تمام کام ختم کر دیتی تھیں۔ وہ بہت محنتی اور کامیاب عبادت گاہ تھیں۔ آخری عمر میں بھی وہ گھر کا سب کام جھٹ پٹ کر لیا کرتی تھیں۔ انہوں نے کبھی کوئی کام نہ دھوڑا تھا۔ وہ ڈھالی تین بجے گھر میں داخل ہوتی تو صاف ستھرا چمکتا گھر اس کا استقبال کرتا تھا۔ اسی سے یہاں سے وہاں پرانہ ملا تھا۔ یاد رچی خانے میں وہ ہلے دھلے چمکتے برتن اپنے اپنے خانوں میں چھپے ہوئے پر تازہ کی ہوئی ہانڈی دھری ہوئی اور گرم گرم روٹیاں کپڑے میں لپیٹی رکھی ہوتی تھیں۔ وادی کو اس نے ہمیشہ تازہ دم، ہشاش بشاش پایا تھا۔ مصروف گزارے ہوئے وقت کی شکن کا شائبہ تک ان پر نہ آتا تھا۔

لہذا انسانی دونوں وادی پوتی وہیں یاد رچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھا لیتیں۔ وادی کے ساتھ وہاں بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ کو بہت مرغوب تھا۔ اسے اپنا گھر بہت عزیز تھا۔ کمرے کا جو گوشہ اس کے لیے مخصوص تھا وہ اس کے لیے مالی تھی۔ اپنے آگن میں بار سنگھار کے درخت کے نیچے جا بیٹھنا بھی اسے دل و جان سے پسند تھا۔ لیکن وادی کی بات سب سے جدا تھی۔ وہاں وہ اپنی وادی کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہان کے قصے چھیڑا کرتی تھی۔ وادی کی سبیلوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں وہ کرتی رہتی۔ وادی بڑے شوق و انتہا کے ساتھ سن کر تھیں۔ کبھی کبھی لوگ دیتیں وہ ان کی نصیحت کو پہلو سے باندھ لیا کرتی۔ کبھی اس کی کسی بے عقلی کی بات پر اس میں بڑے شوق سے ان کا چہرہ کھنکھاتی جاتی۔ وہ بس کبھی کبھار ہی ہنستی تھیں۔ زیادہ ہنسا انہیں پسند نہ آتا تھا۔ وادی انہیں بڑے پرہیزگار کو بھی نوک دیا کرتی تھیں۔  
”اے اہل مراد کرتا ہے بیا!“

وادی کی بات سن کر وادی نے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا، جڑوں میں گد گدی ہونے لگتی۔ لیکن پھر وہ اندر ہی اندر ہنستی۔

وادی کی وادی کا کھانا بہت عزیز جو تھا۔  
وادی نے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں یا تو یاد رچی خانے میں ملتی تھی یا پھر رات کو بستر پر سوہاں ہاتھ لگا کر وادی ایک ہاتھ میں سبج کے دانے گھماتیں دو سرایاں اس کے گرد حائل رکھتیں۔ بستر پر اس لڑکی تھیں۔ لیکن ربیعہ ان کے وجود سے اٹھتی۔ یعنی کبھی کبھار اس قدر مانوس تھی کہ ان کے ہاتھ سے نیند آتی تھی۔ وادی نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا کہ وہ اپنا بستر الگ کیا کرے۔ وہ رات کو

وادی میں لیکن ربیعہ کے خیال سے ان کو جاء نماز چھوڑ کر اس کے پاس آنا پڑتا تھا۔ پھر کبھی تو ایسا ہوتا کہ وادی چپکے سے اٹھ کر جاء نماز پر جا بیٹھتی تھیں۔ پھر رات کو جب تک نوافل پڑھتی رہتیں۔ وادی کے سوئے سوئے انہیں خود بھی نیند آ جاتی تھی۔ وہ اسی بات سے گھبرا کر کہتی تھیں۔  
”اے اہل مراد کرتا ہے بیا!“  
لیکن ربیعہ الگ لینٹ تو جاتی پر اسے نیند نہ آتی تھی۔ وہ فکر وادی کا کرتا تھا۔ وادی ہی جاء نماز چھوڑ کر اس کے پاس آ بیٹھتیں۔  
”اے اہل مراد کرتا ہے بیا!“

وادی نے کہا کہ ”بڑے ہونے کا مطلب آپ سے الگ ہونا ہے تو میں ہمیشہ چھوٹی رہوں گی۔“

وادی نے کہا کہ ”بڑے ہونے کا مطلب آپ سے الگ ہونا ہے تو میں ہمیشہ چھوٹی رہوں گی۔“



قریب ہونا ان کو دکھ دیتا ہو۔ شاید اس سے دور جانے کا خیال انہیں دکھ دیتا تھا۔

ربیعہ نماز پڑھ کر وہیں پر ہی لیٹ گئی۔ اس میں داوی کے وجود کا احساس بسا ہوا تھا۔ کتنے برس ربیعہ نے ان پابندی و وقت کے ساتھ اس چوکی پر نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ کتنی بھلی خاتون تھیں وہ نیک بخت عبادت گزار دو سروں کے دکھ سکھ کی سانچھی۔ قدم قدم پھونک پھونک کر رکھنے والی۔ ایک ایک اسے حلق میں اگنے والے کانٹے یاد آگئے۔

”ربیعہ ربیعہ پیاس لگی ہے۔ ربیعہ پیاس لگی ہے۔“

سرگوشی کہیں آس پاس سے کانوں میں گونجی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیسا خواب تھا یہ؟ کیا خواب تھا۔ کم و بیش ایسا ہی خواب اس نے چند روز قبل بھی دیکھا تھا۔ کیا تعبیر تھی اس خواب کی؟ کیا اس کی داوی کی روح بے چین تھی؟ کیا انہیں وہ سرے جہاں میں کوئی تکلیف تھی؟ کیا مرتے وقت ان کے دل میں کوئی خواہش پھانس کی مانند اٹکی رہ گئی تھی۔

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی بے چینی سوا ہو گئی تھی۔

”ایسا خواب کیوں دیکھا میں نے۔ وہ پتا ہوا صحرا وہ دیکھتے ہوئے رست کے ٹیلے وہ کانٹوں سے اٹی جھاڑیاں وہ پیاس کی شدت سے گلے میں آگے ہوئے کانٹے۔ اوس۔ اوس۔ داوی کی آواز تھی میری داوی کو کیا دکھ ہے وہاں۔ کون سی تکلیف۔ کون سا گناہ“ نہیں نہیں۔ میری داوی نے بھلا کیا گناہ کیا تھا۔ میں ان کے بل بل کی سامنے ان کے دن رات کی رفق میں گواہ ہوں ان کی راسبت بازی کی۔ ان کی سچائی کی ان کے ماتھے پر چمکتے ہوئے تھوڑے کا داغ ان کی موت کے بعد کیسا گہرا ہو گیا تھا۔ ان کے چہرے پر کتنا نور تھا ان کی میت سے کیسی پیاری آواز آرہی تھی۔ بھلا میری داوی نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا۔ بن ماں باپ کی بچی کو پال پوس کر جو ان کی آسائش کہ دنیا کی برائی کا ما کا سا سایا بھی نہ بڑے دیا اس پر حالات کی دھوپ کو چھو کر گزرنے نہ دیا۔ مرغی کی طرح اپنے پردوں میں سمیٹ کر اسے ایک طویل عرصے تک زمانے کے سرد گرم سے بچائے رکھا۔ صبح صادق کی نرم روشنی سے ہٹان کا چہرہ اپنے اعمال کی گواہی آپ تھا۔ بھلا داوی جان سے ایسی کون سی لغزش ہوئی تھی کسے کسے؟

”ربیعہ۔ پیاس لگی ہے۔“ آواز کی بھراہٹ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

وہ قرآن پاک کھول کر بیٹھ گئی۔ قرآن پڑھ پڑھ کر وہ داوی کی روح کو ایصالِ ثواب کرتی رہی۔

پھر بابائیمینان کی لہرس اس کے اپنے اندر سے اٹھنے لگیں تو اس نے قرآن پاک بند کیا تھا۔

\*\*\*

اور ازور سے بچ رہا تھا۔

بہرہرا کر اٹھ بیٹھی خالی خالی نظروں سے اس نے اپنے آس پاس دیکھا۔ قرآن پاک اس کے سر پہ رکھا تھا۔ اس کے پیچھے پڑی تھی۔ وہ نجانے کب وہیں پر لیٹے لیٹے سو گئی تھی۔

ساری دنیا اور وہی اب ہر سو بکھری ہوئی تھی۔

وہ رونا رونا کر رہا تھا۔

وہ رونا رونا کر رہا تھا۔

وہ رونا رونا کر رہا تھا۔

وہ رونا رونا کر رہا تھا۔

وہ رونا رونا کر رہا تھا۔

وہ رونا رونا کر رہا تھا۔

وہ رونا رونا کر رہا تھا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

میں نے اس کے قدم دیکھے کون نہ کرتا۔

”پئے پئے بیٹی۔“ تکلیف کس بات کی؟ لوتے بھلا بتاؤ!“ وہ جھینپ کر ہنس دیں۔  
 ”دیکھتے دنوں سے آپ ماں بن کر میرا خیال رکھ رہی ہیں۔ میں چاہوں بھی تو آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ یہ  
 بھی میں شکریہ ادا کرنا بھی نہیں چاہتی۔ ماں کے خلوص کو شکریہ کے لفظوں میں تول کر میں آپ کا مان کم کرنا نہیں  
 چاہتی۔ آپ نے اس مشکل وقت میں مجھے بہت سہارا دیا ہے خالہ جان!“  
 ”پئے پئے بیٹی۔“ بھلا بتاؤ!“ نفیسہ خالہ جی بھڑک کر شرمندہ ہونے لگیں۔

نفیسہ خالہ کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھی لایینی باتیں سوچتی رہی، پھر اس نے جنا سوچے سمجھے کوئے سے  
 پڑتی جھاڑو اٹھائی اور گھر کی صفائی شروع کر دی۔  
 گھر ایک کوئیانی سے لے کر دوسرے کوئے تک گندا ہو رہا تھا۔ گریبیوں کی آمد آمد تھی۔ آج کل دھول مٹی ان  
 اب بہت کم ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہفتہ بھر سے گھر کی صفائی نہ ہوئی تھی۔  
 دادی جان کی زندگی میں ایسا ممکن نہ تھا۔ وہ بے حد صفائی پسند خاتون تھیں۔ دھول مٹی سے ان کی طبیعت  
 گھبراتا بھی۔  
 ”اور کیا اب وہ منوں مٹی تلے جاسوئی ہیں۔“ نجائے کہتے!“ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر سر جھنڈ  
 کر دوبارہ صفائی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

دراصل اتنے دنوں سے گھنٹن ایسی ایک بات کی تکرار نے اس کا ذہن بری طرح سے تھکا دیا تھا۔  
 ٹوٹ پھوٹ کا عمل پوری شدت سے جاری تھا سوا اب اس کا جی سچا کر رہا تھا کہ وہ دادی کو یاد نہ کرے۔ وہ کچھ  
 کے لیے بھول جائے کہ اس کی پیاری دادی اس سے بہت دور جا چکی ہیں۔ نہ بھی نہ لوٹنے کے لیے۔ وہ کچھ دیر  
 لیے مصروف رہنا چاہتی تھی۔ وہ گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگی رہی۔ جھاڑو لگا کر اس نے صحن کے کون  
 میں بنی کیاری صاف کی۔ سب پتے جمع کر کے ڈسٹ بن میں ڈالے۔ پودوں کو پانی دیا۔ باورچی خانے کے س  
 میں جمع شدہ چند برتن نجائے کب سے گندے پڑے تھے انہیں دھو کر جگہوں پر پہنچایا۔ باورچی خانے کا فرش  
 کرپوچھے سے خشک کیا پھر وہ کمرے میں چلی آئی۔  
 اس کی نگاہ بستر پر پڑی۔ اس پر کچھ بھی بلکھی چادر تنکوں سے پر تھی۔ نہ چائے ہوئے بھی اس کی آنکھوں  
 آہستہ آہستہ۔ وہ یہ چادر بدلتا نہ چاہتی تھی۔ اس چادر میں ابھی اس کی دادی کے جسم کی مہک باقی تھی۔ زندگی  
 آخری رات انہوں نے اسی بستر پر گزاری تھی۔ اس کی تنکوں میں ان کے وجود کی گواہی تھی۔  
 وہ آہستہ آہستہ چلتی چلتی بستر تک آئی پھر اس پر بیٹھ کر دھیرے دھیرے اسے چھو کر محسوس کرنے لگی۔

مہک تھی تنکیں تھیں مگر وہ وجود نہ تھا۔  
 اس کا شخص تیز ہوتا گیا۔ ایک بار پھر دادی سے بچھڑنے کا دکھ اس کی رگ رگ میں سکھنے لگا۔  
 دروازے پر دستک نے اسے واپس حواسوں میں لوٹایا تھا۔ چند لمحے اسے خود پر قابو پانے میں لگے پھر وہ اپنے

کمرے سے نکل گئی۔  
 ”خاکم خانہ!“ باہر سے آواز آئی تھی۔  
 ربیحہ نے دروازہ کھولا دیا۔

**قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے،**

۱۔ ہم کی سندس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کو ہم آپ پر فرض ہے لہذا اسی صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرت و سستی سے غور و فکر کریں۔

۱۱۔ اہم کلمات اور آیات اور امام ربیع بنوی علیہ السلام کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کلام آپ پر فرض ہے لہذا اسی صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے بخور لیں۔

۱۱۔ اس لی بیہوش کی سیکھیاں تھیں۔ اپنے دل کی باتیں وہ ہمیشہ ہی سے ایک دوسرے سے شیئر کرنے کی عادی تھیں۔ یہ تھی کہ بات محض سیدہ شہسباز تک ہی محدود نہ تھی۔ پورا محلہ ہی ہمیشہ سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتا تھا، یہاں کسی کے بھی غم کو ہر گھر اسی طرح محسوس کرتا تھا، جیسے یہ اس کا اپنا غم ہو۔

۱۱۔ یہ کی ماں کی وفات پر محلے کی سب عورتوں نے بل کرا نہیں اپنی محبت کے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔  
۱۲۔ مرنے سے بعد دونوں لڑکیاں ہی نہیں بلکہ چھ سالہ غیب بھی ماں کا غم قریباً "فراموش کر بیٹھا تھا۔ محلے  
۱۳۔ اورت ان کی ماں تھی۔ نفیسہ خالہ، سکینہ بوا، دادی اور رحمت آبا ان کی ایک ماں کے چلے جانے پر ان تینوں  
۱۴۔ ہمارا میں میسر آگئی تھیں۔

۱۔ مہربان کے گھر چلو ہمارے جلاتھا۔ صبح کا ناشتہ نفسیہ خالہ کے گھر سے آتا تو دوسرے کاکھانا سیکینہ بوا کے اور راع کو رہت آیا خان اٹھائے چلی آئیں۔ یہاں تک کہ لڑکیاں سنبھل گئیں۔ ہنسنے بولنے لگیں۔

۲۔ ان مہربان پرے طریقے سلیقے سے کرنے لگیں۔

۱۔ اسی لمبے رشتہ آپا کے شوہر کا انتقال ہوا تو سب نے مل کر اس طرح ان کے دکھی دل پر چاہستہ ہمدردی اور ہمدردی کا ہر دم رکھا کہ بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال کر وہ اپنا اور اپنے دو بچوں کا پیش پالنے لگیں۔

۱۔ اے اللہ! اے اللہ! اے اللہ! کے دروازے پر دستک دی تھی تو پورا حملہ اس کا غم بانٹنے اس کے آنگن میں جمع تھا۔  
۲۔ انا اسرار و محبت سے اسے گھناٹا کھلا جاتی تھیں۔ سمیعہ ثوبیہ گھر کا کام نمٹاتے ہی اس کی دل جوئی

میں نے ایک آواز پر دیوار پر آمو جو ہو میں ہے۔  
 کے والد صبح شام چکر لگاتے۔ اسے حوصلہ دیتے۔ ہر کوئی اسے اپنے گھر لے جانے پر  
 مانی الحال یہ نے ایسا کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔

۱۰۱۱۔ اسی کی موت پہلے ہی کام نہ کرتی تھی۔ دن رات اس کے لیے اجالے اور اندھیرے کا نام تھا۔ گھڑی  
۱۰۱۲۔ اسی کی ریش اسے فرق نہ پڑتا تھا۔  
۱۰۱۳۔ اسی نے ابھی دیکھا ہی نہ تھا۔ شعور کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اسے ان رشتوں کا ان کی اہمیت کا

۱۔ اے اللہ! یہ سب سہرا جانا اس کے لیے اتنا سہل نہ ہو تا اگر دواؤں نے اسے صبر و شکر کا بے پناہ عادی کیا تو اللہ اور صبر و شکر کی تلقین کیا کرتی تھیں۔

اور مہر اس کی دولت ہے۔ وہ اکثر ربیحہ سے کہا کرتی تھیں۔ جس کے پاس صبر

”السلام علیکم چچا جان!“ اس نے انہیں اندر آنے کا رشتہ دیا۔  
 ”وعلیکم السلام.....“ وہ اندر چلے آئے ”کیسی ہو ربیعہ!“  
 ”بس.....“ وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔  
 اندر سے ایک ہوک اٹھی تھی۔

”اتنا غم نہ کرو۔ نازک سی جان ہو، کچھ اپنی ذات کا بھی خیال کرو۔ ابھی تو عمر بڑی ہے۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پکیرا۔ اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی۔

”چچا جان! ان کے سوا کون تھا میرا اس دنیا میں۔ میں نے تو کبھی آنکھیں کھول کر اس دنیا کے رستوں کو پہچاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے اپنی دادی کی آنکھوں سے ہی دنیا نظر آتی تھی۔ وہ آنکھیں بند ہو گئی ہیں چچا جان۔۔۔ میں تو اندھیروں سے بدتر ہو گئی۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے کچھ بھائی ہی نہیں رہتا۔“

”بس۔ بس۔“ وہ اسے پرکاز رہے۔ تھے۔ ”یوں رو رو کر اپنی صحت کا نقصان نہ کرو۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ اور تالا لگا کر ہمارے گھر چلی آؤ۔ یہاں تنہائی میں بڑی رہو گی، سوچ سوچ کر اپنی جان نکلان کر دو گی۔ رو کر آؤ گے۔ خراب کر لو گی۔ یوں بھی جوان لڑکی ہو۔ ایسے شمار مانع نہیں ہے۔ پھر سمجھو، تو یہ بھی تمہارا

دھیان بنائیں گی۔ سہیلیوں سے لڑکیاں یوں بھی جلد بہل جاتی ہیں۔“

”میں ٹھیک ہوں چچا جان!“ وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔ ”بس یونہی ذرا جی بھر آیا تھا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں“

اصل میں۔۔۔ میرا یہاں سے جانے کو جی نہیں کرتا۔ یہاں تو قدم قدم پر میری دادی کی یادیں بکھری ہیں۔ مجھے

”نہ نہ سوچنا بھی میت۔“ حاکم خان کے ماتھے پر ہل پر گئے۔ ”وہاں بدرا اور سکندر جیسے بد قماش لڑکے ہیں۔ نفیسہ تو بے وقوف عورت ہے جو اس نے ایسی بات کی، تم ہمارے ہاں چلی آؤ۔ وہاں مہمیا اور ثوبیہ

”چچا جان! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی ڈر خوف محسوس نہیں ہوتا۔ دیوار سے دیوار ملی ہے اور صبرِ نفیسہ خالہ کا صحن ہے اس طرف سکیٹنے بواہیں۔ اگلا گھر آپ کا ہے، سامنے خانو بیا رہتے ہیں۔ مجھے بھلا کا ہے کا

”بہت خدی لڑکی ہو تم۔!“ وہ ہنسنے لگے۔  
 ”نہیں بچیا جان! اسے میری ضد نہ سمجھیں۔ بس میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ رادی سے اور کچھ نہ لیا۔“

”ارے ارے۔۔۔ بھئی! ایسی وضع داری۔۔۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”پکلی کہیں کی۔ اچھا یہ بتاؤ کچھ منگوانا تو نہیں۔ میں سبزی وغیرہ لینے جا رہا تھا۔“

”آج تو نہیں عین ذرا چیزوں کا جائزہ لے لوں یہاں کل ضرور آپ کو ضروری اشیاء کی لسٹ بنا دوں گی۔“

”جیلور ٹھیک ہے۔ اچھا میں چلوں۔“ انہوں نے ایک طائرانہ نگاہ گھبراہٹ سے ڈالی۔ ”سمیٹھ گھر کا کام نمٹا کر آجائے گی۔“

”شکریہ چچا! وہ انہیں چھوڑنے دو وازے تک آئی۔“

44







”میں بتا رہی ہوں ماما!“ ورنہ عذرا بیگم کو اٹھتا دیکھ کر بولی۔ ”کیا بنانا ہے؟“

”ایک اٹھ فرائی کرو، دو سلاکس سینک دو ایک کپ چائے“ ورنہ بارہ بیٹھے گئیں۔

”اور رافع! تم ناشتہ کر کے ورنہ کو مار کیٹ تک لے جاؤ۔ اسے کچھ کام ہے۔“

”کوئی نیک بخت دن ایسا بھی ہوتا ہے جب کسی لڑکی کو مار کیٹ سے کام نہ ہو۔“

”بیکو مہت۔“ ماں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ”تمہیں کون سے پہاڑ توڑنے ہیں یہاں۔“

”پہاڑ بے شک تر و الیں۔ یہ ہونقوں کی مانند بازار میں کھڑا ہونا بہت مشکل کام ہے۔ خاتون تو کسی دکان میں

جاگھتی ہیں ساتھ جانے والا بندہ بے چارا اس لباس گزرتی لڑکیوں سے کئی کترا تا رہتا ہے۔“

”صدقے جاواں۔“ علی کی آمد عموماً ”یونہی ہوا کرتی تھی۔“ یہ شرافت ہمیں نہ ملی سہائے ہائے۔

”جی آپ تو سرتاپا شرافت ہیں۔“ رافع نے طنز سے اسے دیکھا۔ ”مجسم پار سالی۔“

”آواب عرض کرنا ہوں۔ پہلی بار کسی نے میرا ”Inner“ کھوجا ہے۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”تمہاری امی کیا کر رہی تھیں؟“ شفیقہ حیات نے اس سے پوچھا۔

”ایکسٹنڈسٹ تیار کر رہی تھیں۔ جوں ہی مینبری نگاہ پڑی گھبرا کر بھاگا یہاں آکر رکا۔“

”شرم نہیں ہے ان لڑکوں کو۔“ عذرا بیگم ہنسنے لگیں۔

”ناشتہ تو کروادیں چچی! اکل رات کا کھانا کھایا ہوا ہے۔“

”ہم نے کیا فجر کے وقت اٹھ کر کھالیا تھا؟“ رافع نے اسے گھورا۔ ”ہم بھی رات کا ہی کھائے ہوئے ہیں۔“

”ماشاء اللہ! آپ میں صبر بست ہے۔“ اس نے بچن سے آئی ورنہ کے ہاتھوں سے ٹرے لے لی۔ ”ابھی کچھ دیر

اور صبر کریں۔“

”میں تو بیٹا جی دوپہر تک صبر کر سکتا ہوں۔“ اس نے اس کی حرکت پر جی بھر کر اطمینان کا اظہار کیا۔ ”تم ذرا یہ

ناشتہ نمٹا کرو ورنہ کو مار کیٹ تک لے جانا اسے کچھ کام ہے۔“

”اس نے پہلے کہ علی عجلت میں لقمہ نگل کے کچھ کتاؤ وہ بیٹھ رہے غائب ہو چکا تھا۔“

”ہائے اللہ امی۔ یہ اتار دیا کیوں ہے۔“ ماہین نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ”بچوں میں اللہ میاں نے آن آف

کاٹیں کیوں نہیں لگایا۔ کم از کم کسی گھڑی تو آف کر کے کسی کو بے میں رنجو دیتے۔“

”توبہ کرو۔“ فردوس بیگم نے اسے گھرا۔ ”اللہ نے اولاد دی ہے، اس کا شکر ادا کرو۔ بجائے اس کے الٹی

سیدھی باتیں کیے جاتی ہو۔“

”میں بھی اتار دیتی تھی اتنا ہی تنگ کرتی تھی آپ کو؟“

”نہیں۔“ وہ طنز سے بولیں۔ ”تم تو پیدا ہی اتنی بڑی ہوئی تھیں مجھے کیا کرنا پڑا۔“

”افو۔“ وہ حسام کو تیز پرچ کر جھلائی۔ ”چپ ہی نہیں ہوتا۔“

فردوس بیگم اسے خفگی سے دیکھتے ہوئے بریدار ہی تھیں۔ ریکٹ ہلاتا حمزہ اندر داخل ہوا تو ماہین کی جان میں جان

”ذرا آئی سہی۔“ حمزہ میرا بھائی۔ ذرا اس کیتے کو دو گھڑی کے لیے لے آئیں۔“

”رہز“ کس کیتے کو؟“ اس نے حیرانی سے اسے ہزا دھرا دیکھا۔

”اس ریس ریس میں میں کو۔ ہر وقت کا بچا جا۔“

”رہز“ کس کیتے کو؟“ اس نے حیرانی سے اسے ہزا دھرا دیکھا۔

”اس ریس ریس میں میں کو۔ ہر وقت کا بچا جا۔“

اس نے حسام کے سر پر چیت لگائی۔ وہ اور زیادہ رونے لگا۔

"افوہ ہمارے بھانجے کی شان میں آپ اس سے زیادہ گستاخی نہیں کر سکتیں۔" اس نے ریکٹ بیڈ پر پھینک کر حسام کو اٹھا لیا۔ وہ فوراً خاموش ہو گیا تھا۔

"یہ آپ کی شکل دیکھ کر روتا ہے ایسا!"

"کیوں؟" وہ مشتعل ہوئی۔ "میری شکل کو کیا ہوا؟"

"آپ کی شکل کو کچھ نہیں ہوا۔ اس کا مزاج اسے باپ پر چلا گیا ہے۔"

"آئے ہائے لڑکے! فردوس بیگم اسے گھورنے لگیں۔ "کتنا بد لحاظ ہو رہا ہے۔"

"مگر میوں میں تو میرا جی چاہتا ہے سائنس دانوں کو مشورہ دے ڈالوں۔ ہینڈی اسے سی ایجاد کرنے کا۔ بس ہاتھ میں پکڑ کر گھومتے رہوں۔"

عریشہ جیسے بلبلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ سیاہ اور سرخ امتزاج کا لالہ کا پرنٹ اس کی دیکتی ہوئی رجھت پر خوب بہاؤ دے رہا تھا۔

"شکر کرو اے سی بیڈروم میں جی بھر کر عیش کر لیتی ہو۔" فردوس بیگم نے اس کی بھی خبر لے ڈالی۔

"نجانے سسرال میں جا کر کیسا کمرہ ملے۔ ہینڈی اے سی ایجاد کروائیں گی سائنس دانوں سے ملکہ لڑتھ۔"

"افوہ ای! کبھی تو دعا بھی دے دیا کریں۔" وہ جھلائی۔ "جب بولیں گی ہولناک سا نقشہ نگاہوں میں پھر ادیں گی۔"

"ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔" ماہین نے ماں کا ساتھ دیا۔ "تمہارے تو داغ ہی نہیں ملتے۔ ہر جگہ تھوڑی سی خرنے چلتے ہیں۔ لڑکیوں کو تو صبر شکر کا عادی ہونا چاہیے۔"

"ارے ایسا! کیوں بے چاری کو ذرا راری ہیں۔" حمزہ ہنسنے لگا۔ "صبر شکر ٹریننگ انشٹیٹیوٹ میں باضابطہ ایڈمیشن لے گی تو خود ہی سب کچھ سیکھ جائے گی۔ ابھی سے کیوں اتنی سخت ٹریننگ کا اشارت لے رہی۔"

"یہ کون سا اسکول ہے؟" فردوس بیگم کچھ سمجھی نہ تھیں۔

"سائنس کی آس، فنڈ کی بھڑاس، دیور کی باس اور شوہر کا ستیاناس۔ کچھ اس قسم کی کلاسز ہوتی ہیں وہاں ای جی۔"

ان تینوں کو ہی ہنسی آگئی تھی۔

"توبہ، کتنی بکواس کرتا ہے۔" فردوس بیگم نے خود پر قابو پا کر اسے مصنوعی خشکی سے گھورا۔ "بجائے جو کبھی لکھتا پڑھتا نظر آئے۔"

"ارے ای جی! آج کل ٹیبل پر بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا زمانہ نہیں ہے۔ آج کل تو دور ہے حرکت کا۔ ہر شے میں حرکت، کھانا پینا، لکھنا پڑھنا سب حرکت میں رہ کر ہوتا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کچھ عرصے بعد سونا بھی حرکت میں نہ ہو۔ آدمی سو بھی رہا ہے اور مزے سے اپنے کام بھی نمٹا تا پھر رہا ہے کیوں ایسا!"

"ایسی فضول حرکت تم ہی کر سکتے ہو۔" اس نے ناک چڑھائی۔ "یہ علی کہاں ہوتا ہے آج کل، نظری نہیں آتا۔"

وہ نظر آکر اس کو اپنی شامت بلوائی ہے کیا؟ وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں؟ ہم کیا کہتے ہیں اسے؟" اس نے ہنسنے لگا۔ "کبھی تو کھانا پکھانے کی شے ہے۔ اگر لے جاؤ، ہمیں اب کیا بہنوں کا اتنا بھی حق نہیں۔ وہاں پہچو بکے پورشن میں ہر وقت رات کو اور درہ کے کام کرتا رہتا ہے۔"

"ناغہ کا نام آج آپ کیوں گول کر لیں؟ اس نے اس کے تین چکر لگائے۔ "جمنے نے شوخی سے اسے

اس کی ہانپاں گودہ کسی طور یا سنگ مار کس نہ دیتی تھیں۔

"ارے۔ میں ایسے خیالات ہیں آپ کے؟" اس نے کن اکھیوں سے عریشہ کو دیکھا۔

"وہ بے زاری سے گویا ہوئیں۔" یہ کون سا کم ہیں کسی سے۔ ان کا "منہ پھار" بھی بہت بڑا

اس کی سب کا بولیں گی۔

"ای! اہ تپ کر کھڑی ہو گئی۔" مجھ سے تو آپ کو اللہ واسطے کانیر ہے۔ دو گھڑی کو باس آکر بیٹھ جاؤ۔

"وہ اتنی بے اور یہ حضرت۔ یہ تو کیلی جالو ہیں۔ ایک سفید برقع کیوں نہیں خرید لیتے تپ۔"

"اس کے بغیر بھی چل رہا ہے۔" وہ منصوبیت سے گویا ہوا۔ "کیا نہیں چل رہا؟" وہ اتنی ہی

ماہین نے انکا۔

"یہ بچ کر کمرے سے نکل گئی۔"

"ماہین نے اسے نکل گیا۔ ماہین حساب کا بکھرا ہوا

ماں آئیں گے لینے یا رکھنے کا ارادہ ہے۔" فردوس بیگم نے موڈ اور موضوع بدل کر فضا خوشگوار کرنے

ان کی ہانپاں گودہ کسی طور یا سنگ مار کس نہ دیتی تھیں۔

"ماہین نے اسے نکل گیا۔ ماہین حساب کا بکھرا ہوا

"ماہین نے اسے نکل گیا۔ ماہین حساب کا بکھرا ہوا

"ماہین نے اسے نکل گیا۔ ماہین حساب کا بکھرا ہوا

"ماہین نے اسے نکل گیا۔ ماہین حساب کا بکھرا ہوا

"ماہین نے اسے نکل گیا۔ ماہین حساب کا بکھرا ہوا

"ماہین نے اسے نکل گیا۔ ماہین حساب کا بکھرا ہوا

بچوں کو میرا بہت بہت پیار دینا میری طرف سے انہیں بہت سے کھلونے خرید کر دینا اور ہر گھمانے لے کر جانا۔  
تمہارا عاشق

وہ چند لمحے خط کا کونا ہونٹوں میں دبا کر ہنسی رہی پھر اٹھ کر آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔  
سیاہ پھول دار پرنت میں شمالی رنگت دمک رہی تھی۔ آنکھوں میں چند لمحے قبل ملنے والی خوشی کے سینے جل رہے تھے۔ کیلے بالوں سے شفاف قطرے ٹپک رہے تھے۔  
پھر ایک نئی آوازی نے اسے آگھیرا۔ بہا کی آگ میں جلتے دو سال ہو گئے تھے۔ دو سال پہلے وہ اپنی کمپنی کی طرف سے جاپان گیا تھا۔ مومن جب اوسال کا تھا اور ایمان محض چند ماہ کی اور ان کی شادی کو محض تیار سے تین سال کا عرصہ ہوا تھا۔

بس اتنا ہی وقت اس کے ساتھ گزار سکی تھی وہ اور اتنی مدت میں اس کی محبت اور چاہت کی وہ ایسی عادی ہوئی تھی کہ نشے کی وہ زنجیر اب تک اس کے لبوں میں چبکتی تھی۔  
تیار ہو کر بھی آئینہ دیکھتی تو وہاں اس کی نگاہیں چمکتیں۔ فارغ ہو کر بستر پر جا لیتی تو اس پاس اس کے لب زبکھڑی رہتی۔ ابھی چند روز قبل تو اس نے بینک میں پیاس ہزار ڈالے تھے جو تمام گھریلو اخراجات پورے کر کے بیچ گئے تھے۔ اس نے پھر مزید رقم بچوا دی تھی۔

”مجھے تمہاری ضرورت ہے عاشر!“ وہ زرب لب بولی۔ ”میرے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ لوٹ آؤ نا!“  
(نیل کی آواز پر وہ خیالوں کی دنیا سے نکل آئی کھڑی پر نظر پڑی تو اس نے ایک کروڑ واڑہ کھول دیا۔  
”اسلام علیکم! سنئے مومن کو بیک لٹکاؤ دیکھ کروہ اداسی بھول کر مسکراؤی تھی۔  
”و علیکم السلام!“ اس نے مشتاقانہ جواب دے کر یکساں کو تھمایا۔  
”ایمان کہاں ہے ماما؟“ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ پہلا سوال بہن کے متعلق کرتا تھا۔  
”مٹوڑی ہے جانو!“ اس نے جھک کر اس کا گل چوما۔ ”آپ یونینا مچھ کر لو تو میں کھانا لگاتی ہوں۔ ماما کو بہت بھوک لگی ہے۔“

”کیا پکا ہے ماما؟“  
”آپ کافیورٹ آلو گوشت۔ شوربے والا۔“  
”ساتھ میں چاول بواگل کیے ہیں؟“  
”بالکل کیے ہیں۔“ وہ نشوونما سے بولی۔ ”آپ کپڑے تبدیل کر لیں بادشاہ سلاطین! تو پھر ہم کھانا کھائیں۔“

”ماما! ایمان کو جگائیں ماما اس کے لیے چاکلیٹ لایا ہوں۔“  
”ماما! پیچھے آئی ہوئی آواز پر دونوں نے سرگردیہ کیا تھا۔  
گھنٹوں سے اونچی پنک ٹکڑی فرائٹ پنے کھڑی منہ بسور رہی تھی۔  
”لیجئے ہو گئی خواہش پوری۔“ اس نے زبردستی کو ختم کر کے کہا۔ ”اٹھ گئی بہنا تمہاری۔“  
”اگر ایمان (بچہ) آئے تو ہمیں چاکلیٹ دوں۔“ وہ کھل اٹھا۔

وہ لپک کر بھاگی لے لپٹ گئی تھی۔  
”اگر ایمان (بچہ) آئے تو ہمیں چاکلیٹ دوں۔“ وہ کھل اٹھا۔  
”اگر ایمان (بچہ) آئے تو ہمیں چاکلیٹ دوں۔“ وہ کھل اٹھا۔  
”اگر ایمان (بچہ) آئے تو ہمیں چاکلیٹ دوں۔“ وہ کھل اٹھا۔

”اس نے ہٹا کر کتنی قہقہی چلا دی۔“  
”جانت کریں آپ! یہ بہت تیز ہو گئی ہے۔ میں تو اس سے کہہ رہی ہوں ایمان نے میں ایڈیشن میں  
ان لے او بہت چلے گی۔“ ناعمہ مزے لے لیتی انہیں دیکھ رہی تھی۔  
”نہ میں خاک۔“ ورد نے خوب ہی برا منایا۔ ”گر بچویشن کر کے میں درزی کی دکان کھول لوں۔“  
”نیل میں جائیں گی۔“ وہ زور سے ہنسی۔ ”اور اگر جلی بھی لگیں تو بھی کچھ نہیں ملنے کا۔ کلغش پر دکان  
میں اور ہے۔“  
”اس میں کرو ناعمہ۔ میں کام کر رہی ہوں نا۔“ وردہ پریشان ہوئی۔  
”اللہ۔“ ”آجائیک راتر کے لبوں سے نکلا تھا۔“ ”یہ تم کہاں سے آگئیں گی۔“  
”اور ناعمہ نے سرگردیہ کیا اور اپنے منہ پر مسکرا دیں۔  
”بہن! ایمان دروازے پر کھڑی تھی۔ ریڈ فرائٹ پر دو پونیاں باندھے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔  
”ناعمہ نے لپک کر اسے گود میں بھر لیا۔ ناعمہ سے اس کی بچی بھی بہت تھی۔  
”ہمبہلہ (مبہلہ) کال (کہاں) ہے؟“  
”اماؤ آپ چمبہلہ کو دیکھنے آئی ہیں؟ ہم سے آپ کو کچھ مطلب نہیں۔“ ناعمہ خفا ہوئی۔  
”ہاری نما کہاں ہیں اور مومن؟“ راتر نے اس سے پوچھا۔  
”الپاس۔“  
”پاپا! گلیں۔ ایقان خالہ آئی ہیں۔“ وہ تینوں فرائٹ کام لپیٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ ”حقیقہ حیات کے پورشن میں  
ہی بن تھے ایقان ماں سے لگی بیٹھی تھی۔  
”ماشریاں کب لوٹ رہے ہیں؟“ حقیقہ حیات پوچھ رہی تھیں۔  
”ہا نہیں اماں نا!“ وہ بے زار سی ہو گئی۔ ”دو سالوں سے یہی سن رہی ہوں کہ بس آنے والا ہوں“ آنے والا  
ہا نہیں وہ ٹرین کب پہنچے گی؟“  
”ان نہیں خالہ جانی! اور دیکھیں۔“ راتر نے پیچھے سے اس کے گلے میں بانیں ڈال دی تھیں۔  
”اسلام علیکم۔“ تینوں نے کورس میں سلام کیا تھا۔  
”ایم علیکم السلام۔“ سب نے ہی جواب دیا۔  
”ہاں کہاں ہیں؟“ ایقان نے بہن کی بابت دریافت کیا۔  
”ای! مبہلہ کو لے کر ذرا ٹھلنے نکلی ہیں۔ بس ابھی آجائیں گی۔“ وردہ قریب کھڑے مومن کے بال بکھیرنے  
”اسم علیکم۔“ بھاری مروانہ آواز پر سب ہی نے نگاہیں اٹھائی تھیں۔  
”اگر۔“ آخر میاں سے بڑے روز بعد آئے۔ ”حقیقہ حیات خوش دلی سے بولیں جبکہ ایقان سن بیٹھی رہ گئی  
اس شخص کی وجہ سے وہ میاں کتنا کم آتی تھی لیکن نجائے کیا بات تھی جب بھی آتی سامنا لازمی ہوتا تھا۔  
”ہی بڑی آنکھیں اس پر بے خوبی سے جمائے ہوئے تھا۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں سی چلنے لگیں۔  
”ہاں کی رستہ بھی فی الوقت سجھائی نہ دیتا تھا۔  
”اسم علیکم! کہتے خوش تو ہیں آپ؟“ وہ اسی سے پوچھنے لگا۔

باقی اسٹوریٹ سٹاک میں





اس بھری دنیا میں ربیعہ صرف ایک رشتہ جانتی تھی۔ دادی کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ دادی کے انتقال کے بعد پڑوسی اس کا خیال رکھتے تھے۔ خصوصاً "نفیسہ" خالہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے اپنے گھر لے جانا چاہا لیکن ربیعہ نے انکار کر دیا۔ دادی کے انتقال کے بعد ربیعہ تو اتر سے ایک خواب دیکھتی ہے کہ دادی کسی صحرائ میں ہیں اور شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی طلب کرتی ہیں۔ ربیعہ کی آنکھ کھل جاتی تو۔ سوچ کر پریشان ہو جاتی کہ دادی سے کیا غلطی ہو رہی ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ پریشان ہیں۔ شفیقہ حیات اپنی بہو عذرا بیگم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی بیٹی بیوہ ہو چکی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں۔ ایقان۔ شوہر عاشق رہا ہر نوکری کرتے ہیں۔ ایقان کو عاشق کی بہت محسوس ہوتی ہے۔

## دوسری قسط

”جی نہیں ٹھیک ہوں“ شکر سے خدا۔ ”اس نے لہجے میں جی بھڑک کر سنجیدگی سموئے ہوئے جواب دیا تھا۔  
”شریک حیات تو خوش ہوں گے آپ کے“ کب لوٹ رہے ہیں خیر سے؟ وہ عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔  
ایقان کوئی جواب نہ دے پالی۔ جبریز ہو کر رہ گئی۔

# Dua

for OneUrdu.com By Harfe



۱۷۱ "کہاں تھے اختر میاں! اپنی دنوں کے بعد دکھائی دیے ہو؟" شفیقہ حیات نے بیٹی کو مضطرب و سراسیمہ کا دھیان جاننے کی شعوری کوشش کی۔

”جی ہمارا کیا ہے بی بی جان! نہ کمر نہ دوس۔ کبھی یہاں پڑے ہیں تو کبھی وہاں سینہ۔“ وہ طنز سے ہنسا۔ ”میںوں بھی ہم دکھائی دیں نہ دکھائی دیں کون سی نظریں ہیں جنہیں کچھ فرق پڑے“ کس کی نگاہیں تلاشتی ہیں۔“

۱۶۔ ”ایسا کیوں سوچتے ہو بیٹا!“ شفیقہ حیات نے بساط بھروسہ داری نبھائی۔ ”اور کسی کو تم اپنا خیال کہو نہ کہو۔ سبھی بہن تو یہاں ہے تمہاری۔ وہ تو بھائی کو یاد کرتی ہی ہوگی۔“

”فردوس آیا!“ وہ پھر طنز سے ہنس دیا ”ہاں! مجبور ہیں بے چاری۔“ جب آجاتے ہیں انہیں ستانے تو بالکل خواستہ کمرہ صاف کروا دیتی ہیں۔ اس سے زیادہ اور ایک بہن کر بھی کیا سکتی ہے نکٹھو بھائی کے لیے۔“

”تو بیٹا! جب عاقل بالغ ہو، سب کچھ سمجھتے بھی ہو تو کسی روز گارے لگو۔ اپنا کچھ ٹھکانا کر لے۔ گھر بساؤ۔ خدا کے رسول کی سنت میں سے ہو تو اس کی سنت بھی پوری کر لے۔“

اس نے ایک گہری سانس بھر کر ہنسی ہنسی نظروں سے، 'اودھراد سر دی بھتی ایقان کو' مہر سے پیر تک جی بھر کر دیکھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہہ اٹھ گیا۔

”ہم نے تو بہت چاہا لیکن۔۔۔“ وہ ہنسنا بھر منہ ہی منہ میں کچھ گنگناتے ہوئے۔ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔  
دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک بار بھر رکا تھا۔

”اچھا بی جان!... اچھا ہوں! آپ کی خدمت میں سلام عرض کرنے آیا تھا۔ یہ سلام کسی دن سکھ سے گزر جائے گا۔ یہاں بن گیا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ وہ منہ ہی منہ میں پھرے اور حور اگیت گنگنا تا، پیرم گھسیتا

ایقان نے نجانے کتنی دیر سے کھینچی ہوئی سانس برآمد کی تھی۔

”توبہ ہے۔ ایسے گھورتے ہیں خالہ جانی کو جیسے نظروں سے کھا ہی تو جا میں گئے۔“ ناعقین نے وانت پیسے۔

”نہیں بچی تو نہیں ہوں اپا۔۔۔۔۔“ اس نے برا سنا منہ بتایا۔ ”اثر یاس بکر چکی ہوں۔۔۔“

”جی نہیں۔۔۔ ابھی آپ کا زلٹ نہیں آیا۔۔۔ کیا پتا یاس ہوتی بھی ہیں یا نہ زوی میں سے پرانے نوٹس دوبارہ

اسٹھی کرتی پائی جاتی ہیں۔“  
ہنستا ہوا راج اچانک برآمد ہوا تھا۔

”اللہ رافع بھائی! آپ کے منہ میں جھاگ ہے۔ وہ بھی آریں گے“ وہ سلگ اٹھی۔ ”ساری گند بلا صاف ہو جائے ایکسار میں ہی ہے“

ایقان بے ساختہ ہنس دی تھی۔  
 ”وہی اچھے تو سننے کے لیے آتی ہوں میں۔ طبیعت فریض ہو جاتی ہے۔“

”فریش سن کرتو ہری ہری چیز کا خیال آتا ہے پھیوس۔“ علی بھی بروقت نازل ہوا ”گویا آپ طبیعت ہری کروانے آتی ہیں؟“ (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰) (۲۱) (۲۲) (۲۳) (۲۴) (۲۵) (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) (۳۱) (۳۲) (۳۳) (۳۴) (۳۵) (۳۶) (۳۷) (۳۸) (۳۹) (۴۰) (۴۱) (۴۲) (۴۳) (۴۴) (۴۵) (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹) (۵۰) (۵۱) (۵۲) (۵۳) (۵۴) (۵۵) (۵۶) (۵۷) (۵۸) (۵۹) (۶۰) (۶۱) (۶۲) (۶۳) (۶۴) (۶۵) (۶۶) (۶۷) (۶۸) (۶۹) (۷۰) (۷۱) (۷۲) (۷۳) (۷۴) (۷۵) (۷۶) (۷۷) (۷۸) (۷۹) (۸۰) (۸۱) (۸۲) (۸۳) (۸۴) (۸۵) (۸۶) (۸۷) (۸۸) (۸۹) (۹۰) (۹۱) (۹۲) (۹۳) (۹۴) (۹۵) (۹۶) (۹۷) (۹۸) (۹۹) (۱۰۰)

ایقان پیر کھل کھلا کر نس دی۔

www.ck12.org

17111

SEARCHED 38 INDEXED 38  
SERIALIZED 38 FILED 38  
MAR 1961  
FBI - NEW YORK

(39)



عریشہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ماں کی صلیح والی بات اسے بھی اب تک یاد تھی۔

”نچلو نیچو جلدی۔ وہ دھماچو کڑی پچھلے لان میں جمع گئے۔ خوب زور زور سے باتیں ہو رہی ہیں۔“

”ارے یا رے ہم کل کی بیت بازی کی تیاری کر رہے ہیں۔“ سدرہ جھلائی۔ ”تم لوگوں کو جاسوسیوں کی پڑی

ہے۔“

”اویسے بدھو۔ بڑے مزے مزے کے راز افشا ہو رہے ہیں۔ اور تو اور عباد اور رہبر بھی آئے ہیں۔“

”ہائے اللہ!“ ناعمہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”عباد بھی آیا ہے۔ ہائے میرا دل!“

”ہائے ہائے مری جاؤں میں۔ جو وہ حال دل سے واقف ہو جائے تو۔“ وہ شرمائی۔

سب کی سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔

”پھر جماعت دعا کریں اس سے تمہارے نکاح کی؟“ سدرہ شرارت سے بولی تھی۔

”کڑی مروارید!“ ثانیہ نے اسے ایک دھپ لگائی۔ ”اس کا پردہ اوسے بڑی بہن نہیں دکھائی دیتی

تجھے؟“ ایک اور قہقہہ لگا۔

”چلو جی سسہ ماں تو سب کی سب اس کی شہید نکلیں!“ ایک طنزیہ آواز سیڑھیوں کے قریب بنے چھتچے کے نیچے

سے ابھری تھی۔

”چند لمحوں کے لیے وہ سب کی سب ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر آواز اور وردہ دونوں کو پہچان کر ان سب کی جان میں

جان آئی تھی۔“

”ہائے اللہ۔ وردہ آئی۔ سچی دُر اکرز کھ دیا!“ سدرہ کے حواس بحال ہوئے۔ ”اب تک آپہیں؟“

”لاؤ نہیں تو کب سے یہاں بیٹھی تم ست کی کار گزاریاں دیکھ رہی ہوں۔ منہ سب کے کھلے ہوئے ہیں اور آنکھیں

ساروں کی بند ہیں۔“ وہ ان کے قریب چلی آئی۔ ”اور جو میری جگہ کوئی لڑکا یہاں آجاتا تو کیا کچھ بکواس نہ سنتا؟“

”وہ نہیں آنے والے تھے۔ وہ سب پچھلے لان میں جمع ہیں۔ ابھی تو ہم ان کی موٹگائیوں کا روہ چاک کرتے

”خار ہے ہیں۔“ عریشہ اطمینان سے بولی۔ ”میں آپ کے کمرے کی کھڑکی کھول کر اور کلائٹ آف کر گئی تھی ہوں۔“

”چھتچہ چھتچہ کرو سروں کی باتیں سننے سے اللہ منع کرتا ہے۔“ وردہ نے انہیں عقل دلانی چاہی۔

”محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔“ ناعمہ نے عریشہ کو آنکھ ماری۔

”تم محبت کر رہی ہو یا جنگ؟“ وردہ نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا۔

”ہائے!“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”میرا درونہ جانے کوئی۔“ سب کی کھی کھی شروع ہو گئی۔

”مجھے لگتا ہے منیزہ آنٹی سے بات کرنا ہی پڑے گی۔“ وردہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

”ہلے عباد سے تو بات کر لیں۔“ عریشہ ہنسی۔ ”وہ تو اسے ناعمہ باجی کہتا ہے۔“

”تمہیں بھی تو عریشہ باجی ہی کہتا ہے۔“ وہ چڑ گئی۔

”ہاں تو میں کب اس کے قصیدے پڑھتی ہوں؟“ وہ باجی چھوڑ مجھے دادی کہے۔ ”وہ بے نیازی سے بولی۔

”ارے وہ تو کیا مولوی ہے۔ وہ تو مجھے بھی باجی کہتا ہے۔ حالانکہ میں تو یقیناً اس سے چند ایک سال چھوڑ

ہوں گی!“ سدرہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اچھا مٹی!“ اچلو نیچے نیچے جو کچھ ہاتھ لگتا ہے وہ بھی نکل جائے گا۔“ ثانیہ نے جھلا کر کہا۔

سب کی سب سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔

42





لے کے جذبات کا کچھ خیال کر لیتا جا ہے۔ بے شک جواب میں چاہت نہ دیں کہ یہ دل کے ان اس طرح کے بے مروتانہ القاب! یعنی آپ نے ان کو بھینسا بنا ڈالا؟ رائے رائے تھانے

کلم ہیں وہ؟" ایقان اپنے الفاظ واپس لینے پر تیار ہی نہ تھی۔ "اس سے اس قدر بے لوث محبت کر سکتا ہے؟" "اس سے کتنا ہی ہو گا۔" "اس کی پس دی۔"

یہاں تو پھر بات آپ ہی آتی ہے۔" "اس نے منہ بنایا۔" "مجھے تو معاف رکھو۔ اپنی ہونے والی ہاں کو ذہن میں رکھو۔" "کتنے برس بیت گئے آپ کی شادی۔"

ایقان آخر کار زنج ہو گئی۔ "تار گاڑ سیک!" "یہاں تو پھر بات آپ ہی آتی ہے۔" "اس نے منہ بنایا۔" "مجھے تو معاف رکھو۔ اپنی ہونے والی ہاں کو ذہن میں رکھو۔" "کتنے برس بیت گئے آپ کی شادی۔"

ایقان اپنے ماموں کی حالت زار پر ترس کھا کر کوئی نہ کوئی ذکر نکال لیا کرتی تھی۔ ایقان یا تو اپنے ان سے پر سنجیدگی سے کوئی جواب دے دیا کرتی یا پھر تنگ آکر اسے ڈانٹ بھی دیتا کرتی تھی۔ یعنی کبھی وہ

تہن جاتی اور کبھی پچھو پچھتی کا رشتہ استوار کر لیتی۔ ضرورت کے مطابق رویہ اختیار کرنے میں وہ ماموں کی ماہر تھی۔ ماموں کے ساتھ کبھی کبھار پچھو پچھنے کی ضرورت اسے محض ماموں کی بچکانہ طبیعت اور

سے پڑتی تھی لیکن رائے کے ساتھ اس کی مثالی اندر اسٹینڈنگ بھی ان دونوں کے درمیان کی۔ خالہ بھانجی کے تعلقات میں وہ نہ بڑی تھیں۔ صرف اتنا تھا کہ رائے اپنے ایقان خالہ یا خالہ

میں ماموں بھی اسے پچھو پچھتی تھی۔ درحقیقت ان تینوں کی عمروں میں چند برسوں کا ہی فرق تھا۔ ان کی ان کے بعد ایک جگہ اکٹھا ہو جانے کا لطف اٹھاتے تھیں۔ ماموں اور رائے بھی اپنے اپنے

رواں کی رخصت لے کر آئی تھیں اور ایقان بھی گھر کی شادی سے آکر کچھ روز کے لیے چلی آئی تھی۔ ماموں نے اتنا کہ وہ یوں بے فکری سے بٹا کر تھیں۔

اب کو تار کے گانے کتنے پسند تھے۔ "ماموں کو زیر لب گنگنا تے ہوئے اچانک یاد آیا۔ "اسکول" میں آپ ہر وقت لٹا لٹا کرتی رہتی تھیں۔ گریموں کی لمبی دھڑکیوں میں "انکھوں کے جھروکوں

حصہ لیا اور جبے زاوی سے بولے۔ "اس کا تو ان لوگوں کے اس جاسوسی پروگرام میں شریک ہونے کا بھی کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسی کے کمرے کی کھڑکی پچھلے جانب پچھلے اس وسیع وعریض اور آجائز قسم کے لان میں کھلتی تھی جہاں بیٹھ کر یہ لڑکے

اپنی محفل جمایا کرتے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتا تھا کہ ان کی اس قسم کی جاسوسی بھی کی جا سکتی ہے۔ "میں بھی دورہ اپنی سنجیدہ طبع اور شائستگی کی بنا پر پورے خاندان میں علیحدہ ہی نظر آتی تھی۔ اس سے کسی بھی لڑکے کو یہ توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

"ارے تو ہم کون سا دیکھ رہے ہیں۔ بس یہ دیکھنا ہے کہ فلم کی ہیروئن کون ہے۔" عریضہ کو گہرا تجسس تھا۔ "نہ ویسے ہم دیکھ بھی لیں تو کیا ہے؟ وہ لڑکے ہو کر دیکھ سکتے ہیں تو ہم لڑکی ہو کر بھی اپنی ہم جنس کو لے کر جہنم نہیں دیکھ سکتے کیا؟" ثانیہ نے تنک کر تکیہ اٹھایا۔

"جی نہیں!" وہ نے منہ بنا کر کہا۔ "پچلو ہم کھو گھٹ نکال کر دیکھ لیں گے۔ پردے کی اوٹ سے!" ناعسم نے حل پیش کیا۔ "گویا دیکھو گی ضرور!" "وہ دیکھ سکتی۔" "ہاں ضرور!" "کوڑن میں جواب آیا۔" "کھی کھی کھی کھی۔" "وہ پھر خیر نہ ہو گئیں۔"

شادی کے بعد کی زندگی کے لیے کتنے خواب دیکھتی ہیں لڑکیاں! اس نے دھیرے سے گلاب کے پتیلے پھول کی مٹھلیں پی کو چھوا۔ "اور شادی کے بعد بے فکری اور الہام کے افسانوں سے ہی زندگی خواب و خیال ہو جاتی ہے۔ شادی سے پہلے مستقبل کے خواب انکھوں میں سجے ہوتے ہیں اور شادی کے بعد ماضی کی زندگی دور آسمان

پر اڑنے والے پھلکے جھلکے سفید روئی کے گالوں جیسے بادلوں کی طرح دیرین سے دور اور خوبصورت نظر آتی ہے۔" "کیا بات ہے خالہ جان!" رائے نے جس کر اس کے صبح چہرے پر پھیلی سنجیدگی کو دیکھا۔ "آج بڑا یاد کیا جا رہا ہے شادی سے پہلے کی زندگی کو؟ خیر پتہ تو ہے؟"

"ماموں جو آئے ہوئے ہیں۔" ماموں شرارت سے بولی۔ "رائے کو بہت زور ہے ہنسی آئی جبکہ ایقان ملا متی نظروں سے اپنے دیکھنے لگی۔ "ویری ٹی ماموں! پھر شکایتی انداز میں بولی۔ "اس سے گھٹیا مذاق اور کوئی نہیں ملا کرنے کے لیے؟"

"سوری۔ سوری ڈیر پچھو۔" اس نے دونوں ہاتھ اپنے دفاع میں اٹھادیے۔ "اب میں زبان کو لگا دیتی ہوں۔" یونہی ایک خیال سا اٹھایا تھا ویسے کتنا ترپایا ہے آپ نے میرے سیدھے سادے سے ماموں کو۔ بے چارے اب تک مجنوں بنے پھرتے ہیں۔"

"سیدھے سادے؟" ایقان نے آنکھیں نکالیں۔ "مائی گاڈ! کہاں سے سیدھے ہیں وہ۔ صرف چلتے تاک کی طرف بڑھ رہے ہیں۔" "بھئیے! کی ماموں کو کر کے تھوڑے سیسے سہاگے آ جانے والا اپنا دفاع خود کرتے تو کرے ان کی طرف سے کوئی گارنٹی نہیں۔"

رائے کو ہنسی چھڑ کر تیار ہوا گیا جبکہ ماموں اب شکایتی انداز میں ایقان کو دیکھنے لگی تھی۔ "پچھو!" "فرمائیے!" "وہ بے نیاز ہیں مگر تیار رہیں گے۔" (46)

Scanned with - 112110

© 1995 by J. Edgar Hoover, Inc.

وہ پھر آگے بڑھ جاتی۔  
 پھر وہ کتنی دیر اندھیرے میں چلتی رہتی تا وقتیکہ اگلادروازہ آجاتا۔  
 دادی کی آواز پھر قریب آجاتی ہے تھراتی ہوئی، کانپتی ہوئی، لرزتی ہوئی آواز۔ وہ بے چینی سے آگے بڑھتی۔  
 کمرے میں جھانکتی مگر کمرہ خالی ہوتا۔  
 یونہی چلتے چلتے وہ تھک کر چور ہو گئی۔ اس کے تلووں تلے چھپا ہٹ آگئی۔ اس کے کاندھے ٹوٹنے لگے۔  
 تب اس نے دیکھا۔  
 راہداری کے اختتام پر ایک کمرہ تھا۔ وہ ایک تاریک کمرہ تھا۔ اس میں بالکل روشنی نہ تھی۔ دادی کی آواز شاید  
 وہ اس کی آخری امید پر آگے بڑھی۔ وہ ہر صورت اپنی دادی سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ کب سے ان سے نہیں ملی  
 تھی۔ اس نے کب سے دادی کو نہ دیکھا تھا۔ وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔  
 ”ربیعہ! اور ربیعہ! آؤ!“  
 آواز اسے بلاتی گئی وہ کھینچتی چلی گئی۔  
 وہ کمرے کے دروازے پر جا رہی۔  
 اندر گھسے اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بٹھائی نہ دیتا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ آچانک وہ ٹھٹھک کر رہی۔ اسے احساس  
 ہوا تھا کہ اس کی نگاہیں آہستہ آہستہ سبکڑے کے اندھیرے سے مانوس ہو رہی ہیں۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کمرے  
 میں موجود چیزوں کو دیکھ سکتی ہے۔ لیکن کمرہ تو خالی تھا۔ کمرے میں تو کچھ بھی نہ تھا۔  
 پھر دادی کہاں تھیں؟ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔  
 ”دادی! دادی کہاں ہیں؟ ایک؟“  
 آچانک ہر منظر واضح ہو گیا۔ کمرہ آپ ہی آپ تیز روشنی سے بھر گیا۔  
 ربیعہ نے دیکھا۔  
 خالی کمرے کے ایک کونے میں ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ وہ اسے پہچان نہ  
 سکتی تھی۔  
 ربیعہ کو اس تنہا خالی کمرے کی اس واحد ٹلپک سے خوف محسوس ہوا۔  
 آخر وہ کون تھی۔  
 اس عورت نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ ربیعہ کے لبوں سے چیخ نکل گئی۔ اس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ اس کے  
 آنکھیں سرخ خانگاہ آنکھیں اس کی چمچی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں بے بسی تھی۔ التجا بھی۔  
 ”ربیعہ! میرے پاس آؤ۔ ربیعہ!“ وہ بولی۔  
 ہاں! وہ دادی کی آواز تھی۔  
 ربیعہ نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ اس کی دادی تھیں۔  
 ”ربیعہ!“  
 ”ربیعہ! یہاں آؤ۔ یہاں آؤ۔“  
 ”دادی! دادی! اس کا تعاقب کر رہی تھی۔“  
 ”ربیعہ! یہاں آؤ۔ یہاں آؤ۔“  
 ”دادی! دادی! اس کا تعاقب کر رہی تھی۔“







محمد محمود کی خوشبختی کے خوں  
 کھانا پکانے کی مزیدار ۱۰۰  
 ترکیبوں کی  
 ایک کتاب

۱۰۰ : ۳۷. افسانہ دار کا پی

55. Dura

[illegible]



اس بھری دنیا میں ربیعہ صرف ایک رشتہ جانتی تھی۔ واوی کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ واوی کے انتقال کے بعد پڑوسی اس کا خیال رکھتے تھے۔ خصوصاً "نفیسہ" خالہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنے گھر لے جانا چاہا لیکن ربیعہ نے انکار کر دیا۔ واوی کے انتقال کے بعد ربیعہ تو اتر سے ایک خواب دیکھتی ہے۔ واوی کسی صحرائ میں ہیں اور شدید پیاس کے عالم میں اس سے اپنی طلب کرتی ہیں۔ ربیعہ کی آنکھ کھل جاتی تو سوچ کر پریشان ہو جاتی کہ واوی سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ پریشان ہیں۔ حقیقہ حیات اپنی ہر عذرا بیگم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی بیٹی بیوہ ہو چکی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں۔ ایقان۔ شوہر عاشق رہا ہر نوکری کرتے ہیں۔ ایقان کو عاشق کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔

ایقان میکے آئی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی بھانجیوں کے ساتھ بیٹھی تھیں تب ہی وہاں اختر میاں آگئے۔ اختر اور بھانجیوں کے بیگم کے بھائی تھے اور ایقان کو بہت چاہتے تھے لیکن آٹھویں پاس بے روزگار نوجوان کو لڑکی دیتا تھا۔ ایقان کی بیٹی ہے اور رات کو اس کی بھانجی ہے۔ ایقان اپنے بھانجوں بھتیجیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی۔ اختر وہاں آجاتے ہیں اور اس کو فضول اشعار سناتے ہیں۔







پراسے اپنی ماں کی طلب ہو رہی تھی۔ اس کا دل ماں کے بازوؤں میں چلنے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ وہاں کی گود میں سر رکھ کر پرسکون کی نیند سونا چاہتی تھی۔

ماں کے حواسے جنم دیتے ہی ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی۔

\*\*\*

”میں کل تمہارے گھر آئی تھی۔“ رات کو اس نے سمیعا کو بتایا۔ ”تو یہ بتا رہی تھی تم خانا کے گھر گئی ہو۔“

سمیعا کے لب مسکرانے لگے۔

”پھر تم کیا سمجھتی تھیں؟“

”میں سمجھ گئی تھی کہ تم تمہارے گھر آئی ہو۔“

”یہ تو سنا چکر لگا کر آگئے تھے۔ اس نے مجھے پنے کی چاٹ کھلائی اور بول پلائی۔ بندے بھی خرید کر لے۔ تم آؤ گی تو دکھاؤں گی تمہیں۔“

”تمہیں ڈر نہیں لگتا سمیعا! رعبہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ سمیعا نے ایسے اس طرح دیکھا جیسے وہ اس حق اعظم ہو۔

”ڈر؟“ پھر وہ ہنس دی تھی۔ ”ڈر کا ہے کا تمہیں سے ڈروں۔ مجھے تو صرف اس کی جدائی کے خیال تھے ڈر لگتا ہے۔“

”تمہیں حاکم چاہا ہے ڈر نہیں لگتا۔ اگر ان کو بتا چل جائے یا اگر نفیسہ خالہ کو پتہ چل جائے؟“

”تو کیا ہوگا۔ اس سے کچھ بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ سب کو بتا چل جائے۔ سب مل کر ہمارا انکل پر ہوا دیں گے۔“

”وہ بے فکری سے ٹانگیں ہلاتے ہوئے بولی۔

”رعبہ! یہ بھون بھونے کے قریب ہو گئی۔ منہ کھولے ہو نقول کی مانند اس کی بے فکری اور بے نیازی کو دیکھتی رہی۔

”تمہیں۔۔۔ تمہیں ان بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا سمیعا! تمہارے ابا کو پتہ چل جائے کہ تمہیں ڈر سے ملتی ہو۔ اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔ تمہارے ابا کیا سوچیں گے سمیعا! ساری زندگی وہ جب بھی تمہارا چہرہ دیکھیں گے انہیں یہی بات یاد آئے گی۔“

”افوہ! سمیعا اس کی تنقید سے جراسا ہان کر بولی۔ ”کیا قیامت ہو گئی ہے؟“

”میں نے تو بچے بیٹھے ہیں۔ ساری عمر میری ماں جلتی کر رہی ہے! یہ روگ لگا دے! تمہاری بے چارگی۔ میں نے تو بچے دل سے محبت کی ہے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ جس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہوں! اسی کے ساتھ شادی کروں گی! اسی کے گھر میری ڈولی جائے گی! کسی کی سچ سچاؤں گی۔“

رعبہ کے گل تپ گئے، نگاہیں جھک گئیں۔

”جائے بناؤں تمہارے لیے؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”ایک تو رعبہ! تم بھی نا۔“ سمیعا نے اس کی حالت دیکھ کر ان کی کم عمری پر تاسف سے سر ہلایا۔

”چاہے تمہیں ابا کیا کہہ رہے تھے؟“

”کیا؟“

”یہ تمہاری شادی کروانا چاہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ تمہاری لڑکی یوں بھلا کب تک خالی گھر میں رہ سکتی ہے؟“

”کی مراد کے شمار ہے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ان کی نظر میں کوئی رشتہ ہے تب ہی وہ اتنے وثوق سے کہہ رہے تھے۔“

التم بند کر کے اس نے واپس صندوق میں رکھ دی پھر اس نے کاغذات نکالے۔ ان میں مختلف چیزیں تھیں۔ بینک کے کچھ کاغذات تھے، کچھ پرانے خطوط تھے۔ ایک فائل تھی، نجانے کس چیز کی۔ رعبہ کو کاغذات سے دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔ وہ تو بڑی فراغت کے ساتھ توجہ کے ساتھ دیکھے جانے والی چیزیں تھیں۔ اس نے کاغذات کو بھی واپس رکھ دیے۔

وہ پینٹل بیک پر تن اٹھا اٹھا کر دیکھتی رہی۔ سرمہ والی دودھ پینے کا پیالہ ہاون دستہ ٹوٹا چراغ چند ایک گلاس اور پلیٹیں۔ نجانے وادی نے یہ برتن کیوں رکھے ہوئے تھے۔

وہ کچھ دیر بیٹھی خالی الذہنی کے عالم میں صندوق کے اندر دیکھتی رہی پھر اس نے زمین کی پوٹلی اٹھا کر باہر نکالی اس کے اندر کسی بھاری سی چیز کا احساس ہوا تھا۔

رعبہ نے پوٹلی کھنٹی، اندر ایک چھوٹا سا ڈبہ اور ایک سرخ جوڑا رکھا تھا۔ اسے قدرے حیرانی ہوئی۔ وہ سر جوڑا کام سے مڑتی تھا جواب تک کالانیہ پڑا تھا۔ اس کی چمک ضرور دھم پڑ گئی تھی پھر رعبہ نے وہ ڈبہ کھولا اس کے دل دھک سے رہ گیا۔ اس ڈبے میں طلائی زیورات تھیں۔

”رعبہ! نے گندن کے کام کا بھاری گلو بند اور جھمکے استھان سے دیکھے۔ سنگنوں کو ہاتھ میں لے کر ان کے بھار پن اور مالیت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر رعبہ نے اس بات پر اس نے سنگنیں پس لیے گلو بند لگے ڈال کر کسا، جھمکے کانوں میں پہنتے اس کے بعد اس نے سرخ دپٹہ کھولا اور سر ڈال کر آئینے کے سامنے جا کر بولی۔

”آجائیک! اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ ابھی ابھی اس نے یہی روپیہ دیکھا تھا بالکل ایسی۔ اس کے ذہن میں جھمکا ہوا۔

کچھ دیر قبل وہ جس تصور کو دیکھ کر بے اختیاری کے عالم میں رو رہی تھی وہ بالکل ایسی ہی تو تھی جیسی رہا آئینے میں نظر آ رہی تھی بالکل ایسی ہی۔

رعبہ تادیر اپنا عکس دیکھتی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کبچ چیزیں اس کی اپنی تھیں بالکل اپنی۔ وہ چہرے کے کسی بہت ”پائے“ کی تھیں۔ آنسو ایک مرتبہ پھر بڑی روانی سے اس کے چہرے پر پھسلنے لگے۔

چیزوں کو چھو چھو کر محسوس کرتی رہی اور بڑتی رہی۔

”ماں! کیا ایک اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

”ماں! پھر اس نے چیخ ماری تھی۔

”ماں! ماں! ماں! وہ دھچاڑیں مار مار کر رو دی۔

زندگی میں پہلی بار پہلی بار اسے ”ماں“ کے وجود کا احساس ہوا تھا۔ اسے اپنی ماں یاد آئی تھی۔ وادی کی شفقت کا وہ بڑا دل غائب ہوا تھا تو ماں کی محبت کا چمکتا مانتا ہوا ظہور ہو گیا تھا۔

آج اسے وادی کی نہیں اپنی ماں کی یاد آئی تھی۔ آج پہلی مرتبہ وہ اپنی وادی کے لیے نہیں اپنی ماں کے لیے رو رہی تھی۔

”لو، لو، لو! ماں! سر جیسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

”یاں جیسے اس نے بھی محسوس نہ کیا تھا۔

”ماں! خیر کی الہیہ کبھی ضرور برکت ہی محسوس نہ ہوئی تھی۔

”خیر! جس ذات کو چکھانہ ہو، جس خوشبو کو محسوس ہی نہ کیا ہو، جس شے کو کبھی نہ کھایا نہ ہو بھلا اس کی کب ہوتی ہے۔

انہی نے محبت سے اس کا کلابی نرم چہرہ دکھا اور شرارت سے اس کے بال بگاڑ دیے۔  
 "میں نہیں بات کرتا آپ سے۔" وہ بولے چکا تھا۔ "آپ میں جیتے ہی والا تھا، آپ نے سب کو نہیں بکھرا  
 "جانو! میرا ہاتھ غلطی سے لگ گیا۔ میں نے جان بوجھ کر تو نہیں آگوشیں بکھیری ہیں۔" اس نے بڑی معصومیت  
 سے کہا۔ "اور آپ کو ہمیشہ یہ غلط فہمی کیوں رہتی ہے کہ آپ جیتنے والے تھے؟ کیا پتا آخر میں میں ہی جیت  
 جاتی۔"

منیہہ بیگم نے مسکراتے ہوئے خالہ بھانجے کی باتیں سنیں۔  
 "کیوں تنگ کرتی ہو انیہہ میرے بچے کو۔" انہوں نے عمر کو بانٹوں میں بھر لیا۔  
 "دیکھیں، نانا نوا! پیشہ میرے ساتھ ہے ایمانی کرتی ہیں۔" اس نے صحت شکایت لگائی۔  
 "آپ تک اپنا مغز کھائیں، اس کو تو شرف چکا پھینکا آتا ہے۔ سب کی گوشیں بھی میں چلاؤں اور اپنی  
 بھی۔ اور آخر میں جیتیں بھی لازماً" یہ حضرت اور ایک مرتبہ جیت کر تو موصوف کا جی ہی نہیں بھرتا۔ آٹھ دن  
 بازار ہی کھیل جائیں۔ اس نے آگیا کر پیر پھیلائے منیہہ بیگم اس کی۔  
 "تم میرے ساتھ کھیلا کرو۔ میرا بچہ جیتی مرتبہ کے گا میں اتنی ہی مرتبہ کھیلوں گی۔"  
 "نہیں نانا! آپ کے ساتھ صرف سونے میں مرنا آتا ہے، کھیلنے میں تو عباد ماموں اور انیہہ خالہ جاتی کے ساتھ  
 مرنا آتا ہے۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ منیہہ بیگم مسکرا دیں۔ انیہہ ہنسنے لگی۔  
 "وہ کیوں بھی؟" اس نے پتے پتے پتے پوچھا۔  
 "نانا کو ہر اک کوئی اچھا لگتا ہے، نانا کو ہر اک بھی اچھا نہیں لگتا۔ صرف آپ کو اور ماموں کو ہر اک مرنا آتا ہے۔"  
 انیہہ کی ہنسی رک گئی۔ وہ ہنٹ بھنٹ کر مصنوعی غصے سے اسے دیکھنے لگی۔ منیہہ بیگم نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔  
 "نانا! کیا آپ کی؟" وہ پوچھنے لگا۔  
 "بس بیٹا! آئیے والی ہیں تمہاری ماما! پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے۔"  
 "ماما کو اپنا اسپتال اچھا لگتا ہے، گھر اچھا نہیں لگتا۔ انہیں اپنے مریض اچھے لگتے ہیں، ہم اچھے نہیں لگتے۔"  
 "انہی باتیں نہیں ہے جانو! آپ کی ماما! کتنی ہیں اور ڈاکٹر کا کام ہی بیماروں کی خدمت کرنا ہے۔ تم یہ بھی تو  
 سوچو جب تمہاری ماما! کی پیار کو ٹھیک کرتی ہوں گی تو انہی کا میں دیکھوں گا اس کے گھروالے کتنا خوش ہوتے  
 ہوں گے۔"

انیہہ نے اسے خود سے قریب کر کے سمجھایا۔  
 "خالہ جانی! آپ بھی ڈاکٹر بن جائیں گی پھر آپ بھی ہاسپتال میں رہا کریں گی۔" اس نے منہ سورا۔ "عباد  
 ماموں تو ویسے بھی کبھی کبھی آتے ہیں۔ جب ان کے کان کی چھٹیاں ہوتی ہیں تو رشتہ تو دلا ہور میں ہی رہتے ہیں۔  
 میں کیا اکیلا ہی رہا کروں گا؟"  
 "کیوں بیٹا! میں جو ہوتی ہوں آپ کے ساتھ۔" منیہہ بیگم بولیں۔  
 "آپ کے ساتھ میں پور ہوتا ہوں نانا! انیہہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔ اندر آتی ہوئی شملانے دلچسپی  
 سے کمرے کا ماحول دیکھا۔  
 "کون سے لطفے سارے ہو اپنی خالہ کو؟" اس نے بیک کار زئیل پر رکھا اور ماں کے قریب بیٹھ گئی۔  
 "آپ کا بڑا اپنی علیست کا بھرپور مظاہرہ کر رہا ہے۔" انیہہ ہنس رہی تھی۔ "اور صاف گوئی اپنے عرق چڑھ  
 ہے۔ نانا کی بھرپور محبت کے جواب میں بے پناہ صاف گوئی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔"

رہے تھے کہ ایک ناک کے اندر اندر تمہاری شادی ہو جائے گی۔  
 ریحہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔  
 "لیکن کیوں؟" وہ ہراساں ہو کر بولی تھی۔  
 "لیکن ایسے ہی خوش ہوں سمیہہ! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ مجھے اکیلے ڈر نہیں لگا۔" BY  
 "جی۔" سمیہہ نے سر ہلایا۔ "ریحہ بی بی! یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ کوئی ایسی خوفناک بات بھی نہیں کی کہ تم  
 خوف کے مارے جان دے دو اور پھر اگر تمہیں اکیلے گھر میں ڈر نہیں لگتا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ساری  
 عمر تم بونہی گزار دو۔ شادی کر کے مزے کے ڈبو بیٹھ کر۔" ریحہ خاموش بیٹھی اس کی گفتگو سنتی رہی۔  
 "دیکھو نا! ابھی تمہاری ذمہ داری سارے محلے پر غارت ہے، غلطی ہی سی۔ تمہاری شادی کسی بھلے مالٹے  
 ہو جائے تو سب لوگ اطمینان کا سانس لیں گے۔ سب ہی کو یہ بوجھ ہلکا محسوس ہوگا۔" اس نے بغور ریحہ کے  
 اثرات کا مشاہدہ کیا۔  
 "آخر تم اکیلی رہ کر کیا کرو گی، تمہارے پاس کون سے کام ہیں؟" وہ آگیا کر بولی تھی۔  
 ریحہ آفسروسی ہو گئی۔  
 "میں تو رہنا چاہتی ہوں سمیہہ! ابھی تو عمر بڑی ہے شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کے لیے۔ میرے ذہن  
 میں یہ سب کچھ نہیں ہے، میں نے کبھی اس طرح سے نہیں سوچا اس لیے میرا دماغ ان باتوں کو بھول نہیں کرتا۔  
 مجھے اپنا ذہن بنانے میں کچھ وقت لگے گا۔ تب تک میں سکون سے اپنی پرہائی مکمل کرنا چاہتی ہوں۔"  
 اونہ۔ "اتل نے ہر جھکا۔" تمہارے سر میں خشکی نہیں ہوتی، منیہہ بیگم کی کتابیں پڑھ کر، تمہاری دواؤں نے تو  
 تمہیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بنا دیا ہے۔ تمہیں کبھی کوئی بڑھنک کا کپڑا پہنے دیکھا ہے؟ کبھی کوئی بناؤ سنگھار کا شوق  
 ہی نہ لگتا۔ ہمیشہ ہی ساری ہی چٹا باندھے کوئی بلکے سے رنگ کا سوٹ پہنے رہتی ہو۔ اشکوں پر پردہ لیا کالج پڑھ لیا۔  
 اب اور کیا رہ گیا ہے پڑھنے کے لیے؟"  
 ریحہ مسکرا دی۔ سمیہہ ہمیشہ اسی طرح اسے تارا کرتی تھی۔ وہ دونوں بچپن کی سٹی ساتھی تھیں، اس لیے  
 اس نے کبھی سمیہہ کی باتوں کا برا نہ بنانا تھا۔ پھر اس کی ذہنی سطح سے بھی آگیا۔ "اپنے پرہائی لکھائی سے مطلق  
 دلچسپی نہ تھی۔ ایسے مواقع پر وہ جو کچھ خوشی کی مثال دیا کرتی تھی۔ جتنا کچھ بھی وہ پڑھ سکتی تھی، ڈانٹ ڈیٹ اور  
 سختی کے پردے کی تھی اور نہ اسے خود محض خط لکھ لینے کا شوق تھا۔ اس سے آگے اس کی سوچ کے پر جلتے تھے۔  
 ریحہ اس کی ذہنی دلچسپی اور میلان سے واقف تھی، سمیہہ کی ایسی باتوں کو مسکرا کر نظر انداز کر دیا کرتی  
 تھی۔  
 "ابا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں شادی کے متعلق تمہاری رائے معلوم کروں۔" اب کے اس نے صاف گوئی  
 سے کہا۔ "بلکہ یہ چاہ رہے تھے کہ تم بس ہاں کرو۔ اب تم جانتے کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔" ریحہ پریشان  
 ہو گئی۔  
 "سمیہہ! تم انہیں منع کر دو، میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ چند ماہ بعد یونیورسٹی میں اینڈیشن ہوں گے تو میں  
 اردو اور انگریزی کے لکچرر بن جاؤں گی۔" اس نے سر کو تھپکاتھا۔  
 "پھر تم ہمارے ساتھ رہنا شروع کرو۔ اپنا گھر بند کر دیا کرتے ہو چڑھا۔ یوں اکیلی تو تم نہیں رہ سکتیں۔"  
 ریحہ بے چارگی کے عالم میں ہنسنے لگی۔  
 "نہیں بیٹا! خالہ جانی! آپ ہر اک رشتہ سے لگی کرتی ہیں۔" وہ اگلے منہ سورا کر دیکھنے لگا۔







”وہ تو سب ٹھیک ہے بیٹی! لیکن مجھے سی بدھیوں کو تو دوسو سے ستائے ہی ہیں۔ تم ماشاء اللہ جوان ہو بہادر ہو تم دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتی ہو جو معصوم اور شگ سے گھرا ہوا ہے۔ ہم بوڑھے لوگوں کو تو وقت یوں بھی شکی مزاج بنا جاتا ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”اور پھر تمہیں بھلا زمانے کی کیا پہچان! یہاں تو شیطان بھی فرشتے کا بہروپ بدل کر آتا ہے۔ شیطان بن کر آئے تو لوگ ماحول بڑھ کر بھگتے دیں!“

”رہیجہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ آج نفیسہ خالہ کی باتوں میں فلسفے کا کچھ زیادہ رنگ ملا ہوا تھا اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب ان کے پاس کونے کو کوئی اہم بات ہوتی۔ ورنہ زیادہ تر تو وہ محفلے میں گردش کرتی خبروں پر تبصرے سے گفتگو کا آغاز کیا کرتی تھیں۔“

”کیا بات ہے خالہ؟“

”اے لوب بات کیا ہوتی ہے۔ کچھ نہیں بھلا بتاؤ! وہ چپکلی سی ہنس ہنس دیں۔ ”پریشان ہو گئیں؟“

”نہیں پریشانی کی کیا بات خالہ جان! آپ جیسے بھلے لوگ میسر ہیں۔“

”بھلے مانسوں میں بھی بڑے لوگ پیچھے پیچھے ہوتے ہیں بیٹی! وہ تذبذب سے بولیں۔ ”یہ بھلاؤ! تمہارا دور پار کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں جس کے پاس تم یہ تنہائی کے چند دن گزار لو اور دنیا کی بری نظروں سے بھی بچی نہ ہو۔ کوئی آیا! ماما چچا بھینچا کوئی تو ہو گا؟“

”چچا نہیں خالہ!“ وہ اس ہو گئی۔ ”دادی جان تو کبھی اس موضوع پر بات ہی نہ کرتی تھیں مجھے تو اب ہوش آیا ہے کہ دنیا میں انسان کے اتنے رشتے ناکتے ہوتے ہیں۔ میرے ذہن نے تو حالات و احوال کے خور بخور سے یہ اخذ کیا ہوا تھا کہ دادی جان کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے نہ کبھی میں نے بوجھا نہ انہوں نے چاہا۔“

”دادی کے کسان سے تمہیں ایسا کچھ نہ ملا جو تم اندازہ کر لیں اس بات کا؟ کوئی خط کسی کی کوئی چٹھی۔“

”رہیجہ کے ذہن میں وہ نظارہ برادر کاغذات گھوم گئے جو دادی کے صندوق میں پڑے تھے۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے عید کا تحفہ

**مخصوصیت و مقبول ناول**

☆ میر خواب ریزہ ریزہ مایامک 300/- \* الامامیہ شہر 180/-

☆ ایک دینا جلائے کھانا مایامک 300/- \* شہر دل کے دروازے شہر چوہدری 250/-

چادروں مناول ایک مسکاتہ ہینگوانے پر ڈاک خرچ فرماتے

☆ خوبصورت سرورق • خوبصورت چھپائی • مضبوط جلد • آفٹ میسر

**نشریات ہو گئے اہلیں**

آج ہی قریبی بیکسپتال سے حاصل فرمائیں

مکتب عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی

2216361 فون

”اس نے بھی بلا لود عورت اطالیہ اڑانے کو۔“

”اللہ۔ آپ سارے دن مجھے تو ہماری دوش کا دیوالیہ نکل جائے گا!“ کانیتہ گھبرائی۔

”نکل جائے گا نہیں نکل چکا!“ نافع اور علی بھی چلے آئے۔

”کانیتہ اور سدرہ ٹھنڈی سانس بھر رہی تھیں۔“

”جاؤ کانیتہ! ورنہ اور نافع کو بھی بلا لاؤ۔ ہاشم کو بھی دیکھو گھر پر ہوتا ہے بھی بلا لود۔ سب مل کر کھاؤ۔“ عذرا

”جی آئی!“ اس نے سر ہلایا اور بے بسی سے اٹھ کر چل دی۔

اس نے اپنی سب کتابیں اور نوٹس وغیرہ نکالے ہوئے تھے اور اب بیٹھ کر انہیں تسلی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ان سب کی درجہ بندی کر کے ترتیب سے رکھنا چاہتی تھی۔ کئی دنوں سے وہ یہ کام کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن ہر مرتبہ سستی آڑے آجایا کرتی۔ آج اس نے یہ کام کرنے کا تہیہ کر ہی لیا تھا۔

یوں بھی اب وہ سوچتی تھی کہ فاسر اوقات میں زیادہ سے زیادہ پڑھائی کرے۔ اے کا امتحان اس نے تو نہیں معمولی سی تیاری کے ساتھ دے دیا تھا لیکن ایم۔ اے وہ پوزیشن کے ساتھ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے مکمل توجہ کے ساتھ پڑھائی کی ضرورت تھی جو وہ دادی کی اچانک وفات کے بعد سے اب تک نہ کر سکی تھی۔ اس کا ذہن متاثر ہوا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مغلوب ہوئی تھیں۔ سوا ب وہ اطمینان اور تسلی سے بیٹھ کر اسی کئی کو پورا کرنے کا عزم کیے ہوئے تھی۔

دروازہ بجاتا تو اسے کوفت ہوئی۔ کتنے بوڑھے ساتھ وہ کتابیں لے کر بیٹھی تھیں ہر مرتبہ اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ بھلے والے اس کا زیادہ سے زیادہ خیال نہ کیے کے چکر میں اس کے آرام اور سکون میں بھی دخل ہو جایا کرتے تھے۔

اس نے اٹھ کر دروازے کی چٹنی کرائی۔ باہر نفیسہ خالہ کھڑی تھیں۔

”آئیں خالہ!“ اس نے پھرتے پڑے سر پر اٹھ سجال۔

”ٹھیک ہو بیٹی؟“ وہ پیر تھکتی چلی آئیں۔

”جی نہ بگڑ رہے خدا کا!“

”بڑھ رہی تھیں ہاں بہنوں نے حالات کا بغور معائنہ کیا۔“

”جی۔“ وہ سننائی۔

”جانتی تھی کہ اب خالہ گھنٹہ بھر سے پہلے نکلنے والی نہ تھیں۔ وہ تو جاتے جاتے دروازے پر ہی آؤ تھا گھنٹہ نماشا کرتی تھیں۔ کئی مرتبہ ”خدا حافظ“ کہتیں اور پھر انہیں کوئی نیا خیال چھیر جاتا۔“

”اچھا اچھا۔“ رہیجہ بڑھوتے میں تو یوں ہی نگاہ مارنے چلی آئی تھی! ”وہ جا رہی تھیں گئیں۔“ مکیلی بچی ہو بار بار ”دھیان تمہاری طرف جا رہی تھی میں تو اسے سکون سے لے لے لے۔“ بھلا بتاؤ! چین کی نیند سو سکتی ہوں۔ دھیان تو تم میں انکار کرنا ہے۔“ رابعہ مسکرا دی۔

”کیوں فکر کرتی ہیں خالہ جان زمین نے کتنی مرتبہ سمجھایا ہے آپ کو۔ میں بالکل اطمینان سے رہتی ہوں۔ نہ کوئی خوف نہ ڈر نہ گھٹکا نہ اندیشہ۔ آپ سب لوگ میرے آس پاس بٹے ہیں۔ دیوار سے دیوار ملتی ہے۔ پھر بھی میں ہر وقت دروازے کھڑکیاں بند کر کے رہتی ہوں۔ کسی آپ کو دروازہ کھلا ملا؟“

# قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا یہی صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق یہ حسرت متی سے محفوظ رکھیں۔

خوبصورت لگتا تھا۔

لیکن آج اس بیدار دم کی ہیئت تبدیل ہو چکی تھی۔

دیواروں پر بٹکتا چلتی رنگ ہو چکا تھا۔ فریج پر تبدیل ہو گیا تھا۔ فریج میں گرین کمر کا کاربٹ دیوار تا دیوار اپنی بہار دکھایا تھا۔ جیسے پیروں تلے شہر بھر گھاس ہو۔ پردے مونگیا رنگ کے تھے جن پر سنہری بیٹے دھیرے سے اپنی چٹک بکھی دکھاتے تھے۔ سائڈ ٹیبلز پر خوبصورت سنہری میٹ بچھے تھے۔ فینسی لائٹس کی مدد سے گرم حسین رنگینی میں سنہری بوجھ رنگ ماحول کو بہت پرسوں اور روان انگیز بنا رہے تھے۔

اس نے لبہ نظیر غائر ہنسنے کا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر کمرے سے نکل آئی۔ ایمان اور مومن لاؤنج میں بچے کاربٹ پر بیٹھے "مسلائی" کے پکٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان تک چلنے والے

"میرے بھائی پر بارے بچے کیا کر رہے ہیں! اس نے دونوں گویا ٹھوں میں بھر لیا۔

"مما! مسلائی کھائیں! انہوں نے اس کے منہ میں ڈالی سوہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

دونوں سے وہ اسی "مصروفیت" کا شکار تھی۔ دیوار گھیر دیں ڈالا تھا۔ ہر ٹکڑے میں اس کی پسند کا خیال رکھا تھا۔ اپنے لیے بھئی اونگائی بنیادوں پر ایک سبز سوٹ خرید کر لائی تھی۔ ساتھ میں سفید اور ہرے موتیوں والی خوبصورت چٹیل بھی لی تھی۔ سپارکر کے پیشگی بھی کر دیا تھا۔ یعنی کہ ہر طرح کی تیاری مکمل تھی۔ بس اب اس کی آمد کا پل پل گنتا رہ گیا تھا۔

"مما! مومن نے اسے دھیان سے جو نکالیا۔

"ہوں! آئی! مومن نے گہری سوچ سے باہر آ کر بیٹے کی صورت دیکھی۔

"بھابھ! آئی! مومن نے گہری سوچ سے باہر آ کر بیٹے کی صورت دیکھی۔

"کل!"

Scanned By HarfeDua for Urdu

"ہاشم! تیرا لونا گاڑی! وہ جھلائی تھی "یہ لگتا ہے گدھا گاڑی میں بیٹھی ہوئی۔

"یہ راجہ جو آگے بیٹھا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "گدھا گاڑی ہی ہے۔"

"یہ بے گاڑی آپ کی بیٹی ہے۔" اطلاع "سرخس" نے۔ "اڑوہ طنز ہے بولا۔

"یہ ذرا مختلف قسم کی گاڑی ہے۔ اس میں گدھا برابر میں بیٹھا ہوتا ہے۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

راجہ نے سیاہ گاسٹ کے عقلمند سے اسے دیکھا۔

"تم کہاں! میرے ہینڈ سم نظر آنے سے جل رہے ہو۔"

"ہینڈ سم بیدارشی طور پر ہوتے ہیں، جیسا کہ میں جینز پہن کر کالا چشمہ چڑھالینے سے کوئی ہینڈ سم نہیں بن سکتا۔

جاتا! ہاشم نے اسے چڑھایا۔

"ہاں! خالہ جان! کچھ خط وغیرہ بڑے تو ہیں لیکن میں نے ابھی پڑھے نہیں۔"

"بھلا بتاؤ! انہوں نے اس کی کم عقلی پر ماتھا پٹیا "اے ہے بیٹی! ایسی مصیبت بھی انسان کو نفع نہ دے۔"

نقصان ہی دے۔ بڑھ کر دیکھو تو کیا لکھا ہے ان میں۔

"جھپٹا میں آج دیکھتی ہوں خالہ! وہ پریشان سی ہو گئی۔

"لیکن بات کیا ہے؟ آسپتاتی کیوں نہیں؟"

"دیکھو بیٹی! آیات یہ ہے کہ تمہاری سیکنہ بوا کے جو ہنوی ہیں عرفان شوکت صاحب ان کی نظر اب تمہارے

مکان پر ہے۔ سیکنہ کے مکان اور تمہارے مکان کو ملایا جائے تو اچھا بھلا رقبہ بن جائے۔ یہ جہاں بڑے پیمانے پر

چوڑیوں کا کام کرنا چاہتے ہیں تاکہ محلے کی غریب عورتوں کو کم اجرت دے کر زیادہ نفع کمایا جائے۔ اب سیکنہ تو اپنا

مکان بچنے پر تیار ہے وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی اپنا مکان اونے پونے انہیں بیچ دو تاکہ وہ دونوں مکان ملا کر بڑی جگہ پر

تعمیر کر سکیں۔ تم کے نام کے تھیلوں کے دام سیکنہ آج میرے پاس آئی تھی اس پر تو ہنوی کا جادو چل گیا ہے۔

چاہتی ہے کہ تم بھی مکان بچنے پر رضامند ہو جاؤ۔"

لیکن! لیکن خالہ جان! میں کیوں اپنا گھر بیچوں؟ اور پھر میں جاؤں گی کہاں یہ گھر تو میری پناہ گاہ ہے۔ میری

داوی کی نشانی۔

"جب ہی تو کہتی ہوں تمہیں کسی عزیز تر شہزادے کے گھر جا کر رہو۔ یہاں تالا ڈال دو۔ ورنہ یہ لوگ تمہیں تنگ

کر دیں گے وہ تم پر سختی سے والا آوی ہے۔ یہ بھی بورا بد معاش۔ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

ربیعہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس طرح کے حالات کا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نام و نشان نہ تھا۔

"اور سیکنہ بوا! اسے یقین نہ آتا تھا۔ "وہ بھی؟"

"(کرکے بیٹی! اچھے اچھوں کا ایمان ڈگر کا جانا ہے۔ سیکنہ کو اس نے اسٹے سیدھے خواب دکھائے ہیں کہ

کارخانے کی انتہا پر پہنچے گا۔ بعد میں کہیں گھر بنوانے میں بھی مدد دے گا۔ بس وہ آگئی اس کی باتوں میں اور پھر

اس کا تو ہنوی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کوئی رعایت مروت برتے۔ لیکن تم نے اسے اس کا کیا واسطہ۔ تمہیں تو

وہ دوا چھلنے کی کوشش کرے گا۔" ربیعہ مزید پریشان ہو گئی۔

"میں سوچتی ہوں خالہ جان! وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

ہر رنگ اسے پسند تھا۔ بے حد پسند تھا۔ بقول اس کے اس نے جب ایقان کو پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ ہرے رنگ کا

لباس پہنے ہوئے تھی۔

یوں بھی وہ زندگی کی لڑائی مڑی باتوں میں بھی اپنی پسند کا اظہار کر دیا کرتا تھا۔ کوئی چیز خریدتا؟ اپنی پسند کے رنگ کو

ضرور ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔

ایقان کو ایقان کی دوا اور دیک کر کے رنگ کے لبو سات کے بھری پڑی تھی۔ اس کی جیوری میں زیادہ تر ہرے موتی

یا نگ ہوتے تھے۔ ہری چوڑیوں سے ڈبے کے ڈبے آئے بڑے تھے بچوں کے کپڑوں میں بھی اسی رنگ کا تناسب

رہتا تھا۔ زیادہ تر خالہ جان کے ہاتھ لگا کر اس کے پاس

ایقان کو گلابی رنگ پسند تھا۔ ان کی شادی ہوئی تو عاشر نے بیدار دم میں گلابی پینٹ کر دیا۔ فریج پر بھی گلابی اور

سینہ پر رنگ میں تھا۔ بڑے گھر کے گلابی رنگ کے لباس پہنے۔ اس پر مگر بھول گلابی تھے۔ ان کا بیدار دم نے حد

"خیر اب یوں تو مت کہو۔" پیچھے بیٹھی ایقان اچھیند رہی تھی۔ "رافع تو خاندان کا سب سے وجیہ تھی۔" رافع نے کہا۔  
 "یہ تو ذات زیادتی کر گئیں پھپھو!" ہاشم خفا ہوا۔ "یعنی آپ نے مجھ سے حسین نوجوان کو نمبر دو کر دیا!" رافع نے کہا۔  
 اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔  
 "ہاں۔ تم بھی گڈ لکنگ ہو۔" وہ بولتی تھی۔  
 "ہاں۔ مزید زیادتی، جیسے دل رکھ رہی ہوں۔" وہ مزید خفا ہوا۔  
 "جائیں۔ میں تیز گاڑی چلاتا۔ گھنٹہ بھر انتظار کرو اور آؤں گا۔ آپ کے صاحب کو۔" اس نے رفتار بالکل نرم کر لی۔  
 "اللہ ہاشم اچھ بولنے کی تو سزا نہیں جوتی ہے سزا تو جھوٹ بولنے کی ہونی چاہیے۔"  
 "کس دور میں جی رہی ہیں ڈیر پھپھو؟" وہ ہنسا۔ "آپ تک پرانی اقدار میں زندہ ہیں۔ ہاں تو بچ بولنے والے کے لیے گولی ہے۔" رافع نے کہا۔  
 "بھئی۔ مجھ سے خطرناک باتیں مت کرو۔ میرا موڈ آج بہت اچھا ہے۔"  
 "وہ تو آپ کی تیاری سے ظاہر ہے۔" اس نے بیک ویو مرر سے اسے دیکھا۔ "بس نیٹھ ٹیکے کی کسر ہے۔" ایقان کو ہنسی آگئی۔  
 "رافع! ذرا ایک چیت لگاؤ اس بد تمیز کے۔" رافع نے جھٹ ایک مکہ اس کے بازو پر رسید کیا۔  
 "ارے بد تمیز شخص! وہ بلبلایا ہے۔" ڈیر پھپھو نے چیت کہا تھا۔ "میں چیت اور مکے میں فرق نہیں پتا۔"  
 "نہیں!" اطمینان سے جواب دیا۔  
 "یہ مکہ اور یہ چیت!" اس نے گیت چھوڑ کر اسے دونوں اشیاء سے نوازا۔ رافع نے بلبلایا اسے دیکھا۔ ایقان کی ہنسی چھوٹ گئی۔  
 "توبہ توبہ ایک سے بڑھ کر ایک ناکول ہے۔" "حیات ولا" میں۔  
 "آپ تو بہت خوش ہیں۔" "حیات ولا" سے جا کر آؤ رافع ہنسا۔  
 "ہاں۔ خوش تو ہوں۔" اس کے لبوں پر پھر ولفریب مسکراہٹ برتھاں ہو گئی۔  
 "وہ باہر گزرتے مناظر دیکھنے لگی۔" ایر پورٹ کی عمارت دور سے نظر آ رہی تھی۔  
 "کافزات سناٹے پھیلا کر اس نے ان کا بغور جائزہ لیا۔ ان میں کئی خطوط تھے۔ اس نے ایک خط منتخب کیا اور کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔  
 "یار می امی جان!  
 السلام علیکم  
 ربیعہ نے حیرانی سے کافزات سے لگایا۔  
 "امی جان! کیا مطلب ہے؟"  
 (باقی انشاء اللہ آئندہ ماہ)  
 (54) UrduPhoto.com



"داؤی! امیری ای کیسی قیس؟" ایک قد بڑے سمجھ دار لڑکی سوال کرتی۔  
 "داؤی! چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو جاتی ہیں؟"  
 "جی ہاں! اچھی تھیں؟ پیاری تھیں؟ جانیں؟"  
 "ریحہ! داؤی کی آواز میں اتنی پیہمیہ ہوتی۔  
 ریحہ یکدم چپ ہو جاتی۔ پھر وہ یہ سوال کرتا ہی بھول گئی۔  
 "داؤی! میرے ابو آپ کے اکلوتے بیٹے تھے؟" کسی رنگ میں اگر وہ پوچھ بیٹھتی۔  
 کام کرتی داؤی جان کے ہاتھ رک جاتے۔  
 "ان کے علاوہ آپ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی؟"  
 داؤی جان کی جانب سے کوئی جواب نہ آتا۔  
 "ایک ایسے احساس ہو گیا کہ داؤی جان دور ہی ہیں۔ ان کے چہرے پر خاموش آنسو بہ رہے ہیں۔  
 وہ جلدی سے اٹھ کر ان سے پلٹ جاتی۔  
 "سوری داؤی! اب نہیں پوچھوں گی۔"  
 ایک مہر تھی جو کبھی نہ ٹوٹی۔ ایک نقل تھا، کبھی نہ کھانا۔ ایک راز تھا، سوا ب سو رہا تھا۔ داؤی کے ساتھ ان کی قبریں۔  
 ریحہ خط کو سینے سے لگا کر آنکھیں ہوند کر لٹ گئی۔ فی الحال وہ احمد جہاں زیب کے چند لمحوں کے لیے جی اٹھنے  
 کے احساس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔  
 "یہ سب عاشر بھائی! چار سال سے زار سون سوں کرتے ذاتوں سے اپنی زبان کو روکنا نہیں سوزا لگے جو آپ  
 بھول گئے ہیں۔ مجھے تو آپ کی مسکراہٹ تک بھکی بھکی لگ رہی ہے۔" سحر کہہ رہا تھا۔  
 عاشر نے ہنستے ہوئے سالن کا ڈونگا تھا اور سالن سے کبھی ایقان کو شریر نگاہوں سے دیکھا۔  
 "ڈانٹے کھولا تو نہیں۔ ترس ضرور گیا ہوں۔" اس کے لیے جس بھی شرارت تھی۔  
 ایقان جزبزی ہوئی۔ کن آنکھیں سے اس نے حاضرین محفل کے مشکبات نوٹ کیے۔ پھر نظریں بچا کر اسے  
 اٹل کی شریر مسکراہٹ شریر تر ہوئی۔  
 ایقان ہاتھ میں تھا، ہوا نوالہ منہ تک لے جانا بھول گئی۔ گہری سیاہ آنکھیں آؤندگی کے احساس سے جھمکتی  
 ہوئی سیاہ موچھوں تلے مسکراتے گلابی ہونٹ، خاموشی میں بھی بہت کچھ کہتے ہوئے، لوگوں کی پروانہ کرتے گرم  
 جوشی احساسات، شدتوں سے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے جذبے۔  
 وہ سب کچھ بھول بھال کر اسے دیکھ گئی۔  
 "اول ہوں۔" وہ کھٹکھٹا کر ایک  
 ایقان چونک اٹھی۔ چوری سن کر کھانا کھانے لگی۔  
 وسیع ہال کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پتھر خوان بچھا ہوا تھا۔  
 عاشر کو ان پتھر خوان سے لے کر وہ لوگ سیدھے "حیات دلا" چلے آئے تھے جہاں شفیقہ حیات بیگم نے ان کے

وہ اپنے بڑے بڑے اور اپنی سہیلیوں (سہیلیاں اور ریحہ) کے والد عالم بھٹکے پتھر کو دیتی ہے۔ جس پر وہ خوشی سے کھل اٹھتی ہیں۔  
 باہر کے معاملات ان کے پتھر کو کھکھکے کھرکھر توڑ دیتی ہے تو اسے کہنے کے ایک پتھر کی پٹلی ہے جس میں کچھ کاغذات، تصویریں  
 اور زلورات وغیرہ ہوتے ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے۔  
 ڈاکٹر شہلا ابھی ماں میز پر بیگم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کا بیٹا اپنے باپ کے باسے میں اکثر سوال کرتا ہے۔  
 "اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ خط میری پیچھو کا ہے؟"  
 نہ جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہونے جا رہا تھا کہ  
 اس کے خونی رشتے موجود ہیں۔  
 "آپ کا خط بھلا اور ایک مرتبہ پھر سیدھا کر کے اس نے سطور پر نگاہ ڈالی، لکھا تھا۔  
 "پتہ دیتے ہیں۔ احمد جہاں زیب سے کہیے کہ دنیا میں ایک حسن ہی سب سے بڑی حقیقت نہیں ہے۔ حسن چاروں کا  
 قصہ ہے۔ کاش میں آپ کے پاس ہوتی تو معاملات کو سمجھانے کی کوشش کرتی۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ سالن لینے  
 پہلے منور میاں سے اجازت لینا پڑتی ہے۔ پھر حال ہے آپ کی جانب سے احمد جہاں زیب کو کوئی بھٹوٹ یا نرمی کا  
 رویہ نہ ملے۔ اتنا کہے دیتی ہوں اس کی آنکھوں پر جو پٹی بندھی آجے چند روز میں اتر جائے گی۔ آپ خاطر جمع  
 رکھیے۔  
 تصور اور تمدن نانی اماں کو سلام لکھواتے ہیں۔ ترانہ اور تمنا کو بھی آپ کی جانب سے جنت پیار دیا تھا۔ ابھی  
 بھی کھیلنی پھر رہی ہیں باقی سب خیریت ہے۔  
 آپ کی بی  
 بلیس باؤ۔  
 "ریحہ حیرت سے خط کو دیکھتی رہی۔ اور کتنی لڑی۔ احمد جہاں زیب اس کے لیے بے حد پرستش نام تھا۔  
 اس خط میں اس کی سمجھ میں آسکے والی کوئی بات نہ تھی۔ پھر بھی وہ خط پر دھنا اسے بے حد اچھا لگا تھا اس میں احمد  
 جہاں زیب کا ذکر تھا۔ اس خط میں احمد جہاں زیب کے وجود کا احساس بند تھا۔ خط پڑھنے سے وہ احساس چند لمحوں  
 کے لیے جی اٹھا تھا۔ چند لمحوں کے لیے جیسے احمد جہاں زیب جی اٹھا تھا۔  
 "ریحہ! احمد جہاں زیب! آج تک وہ محض اپنے نام کے آگے یہ نام لکھتی آئی تھی اور بس وہ اتنا جانتی تھی کہ  
 نام کے آگے باپ کا نام لکھا جاتا ہے۔ اسے محض اتنا ہی علم تھا کہ اس کے باپ کا نام احمد جہاں زیب تھا۔  
 "داؤی! میرے امی ابو کتناں آہیں؟" ایک ننھی بچی سوال کرتی۔  
 "بہت دور۔ بہت دور۔" داؤی نے جواب دیا۔  
 "بہت دور؟" ریحہ نے پوچھا۔  
 "جواب میں انکس سر ہوا۔" ریحہ نے پوچھا۔  
 "رہا تو جو ابھی رات ہوئی تھی۔" ریحہ نے پوچھا۔  
 "ریحہ! آنکھیں موندتی۔" ریحہ نے پوچھا۔  
 "رہا تو جو ابھی رات ہوئی تھی۔" ریحہ نے پوچھا۔

شفیقہ حیات نے ہو کو کڑے تیوروں سے دیکھا ضرور پھر باد کی موجودگی کا خیال کر کے خاموش ہو گئیں۔  
 "عجب تھے جاواں۔" علی نے ام کی قاشوں سے بھری پیش آتی دیکھیں تو تعجباً بلند کیا۔ "اصل چیز تو اب آتی ہے۔" کہا۔  
 "ابا! دیکھو خون کی رونق معدے کی ٹھنڈک۔ کنگ آف فرولس آسے آسے۔"  
 اس کا "آم" مکمل ہونے سے پہلے ہی ناعمد اور ثانیہ اسے منہ چڑاتی آگے بڑھ گئیں۔ ڈش کو تھانے کے لیے  
 دیکھا اس کا ہاتھ بھی ہوا میں لہراتا رہ گیا تھا۔  
 "تھیں تھیں۔" اس نے احتجاج کیا۔  
 "یہ لوڈ نہ۔" نافع نے ڈش پکڑ کر اس کی جانب بڑھا دی۔  
 "ہاں۔" اسے اطمینان ہوا۔ "یہ لڑکیاں تو میری خوراک دیکھ کر جلتی ہیں۔ خود این ہے تو چوٹی جتنا بھی  
 نہیں کھایا جاتا۔"  
 "یہ چوٹی جتنا۔" عاشر نے آنکھیں پھیلائیں۔ "یہ چوٹی جتنا کون کھا سکتا ہے میرے بھائی؟"  
 "آم ہوں تو میں چوٹی جتنا بھی کھا سکتا ہوں۔" وہ مزے سے قاشیں اڑانے لگا۔ "غضب کی شے بنائی ہے  
 میرے مولائے صدمے جاواں۔"  
 "یہاں غ کا گوشہ ہو اور ایک بڑا سا "سندھڑی" ہو اور منہ کے کو کیا چاہیے۔" اس نے مزید گل افشانی کی۔  
 "جی ہاں۔" نافع، چل کر بولی۔ "سندھڑی" ختم بھی ہو جائے تو یہ کھلی بر تادیر ماوتھ آر کن بجاتے ہیں۔  
 حاضرین محفل اس سے سب سے پہلے ہی جانتے تھے وہ آم کا دیوانہ ہے۔  
 کھانے کے بعد چائے کافی کا دور چلا جس کی نے گرمی سے گھبرا کر چائے کافی سے مخدویت کی۔ اسے  
 کو لڑو دیکھ بھادی گئی۔  
 "ہاں ابھی۔" کچھ اشعار ہمیں بھی سناؤ۔" عاشر نے بیک گروپ سے فرمائش کی۔ "یقین ایسے ایسے من کھرت  
 شعر سنائی سے تم لوگوں کے کہ میں شدت سے تمہاری محفل میں شرکت کا خواہاں تھا۔"  
 "رائع! کیا غزل بنائی تھی۔"  
 عید الفطر کی رات تھی شب بھر ہوا خرچا ہوا۔  
 "عاشر بھائی! پوری رات بیک جھپکے گزر جائے گی آپ کی! اگر یہ موضوع چھیڑا آپ نے۔" ہاشم نے کہا۔  
 "رات۔" وہ زرب لب بڑھایا پھر چونک کر اس نے رست واپس دیکھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔  
 "رات تو کسی کے نام ہے بھی۔" وہ بہت دھیرے سے بولا۔  
 سوائے اس کے کوئی نہ سن سکا۔ اس کا چہرہ سن ہو گیا تھا۔  
 \* \* \*  
 سوئی ہوئی ایمان کو اس نے مومن کے برابر لایا اور جھک کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔  
 "کتنی چھاری ہو گئی ہے۔ چھوٹی سی تھی جب گیا تھا میں۔ اسی بچے نے منے ہاتھ پاؤں یاد آتے تھے تو میرا گل  
 اسے پیار کرنے کے لیے گل اٹھاتا تھا۔ اب تو گل مٹل سی ہو گئی ہے اور گندنی بچی میرے پاس آتی بھی نہیں۔  
 بھی اسے بتاؤ میں اس کا پیلا ہوں۔"  
 اس نے چہرہ گھما کر اس بیٹی ایمان کو دیکھا۔ وہ چپکے سے اسے بچوں کے پاس بیٹھا دیکھ رہی تھی۔  
 ایک ہاتھ گال کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ عاشر نے اس کی شرقی آنکھوں میں ہلکورے لگی محبت کی مٹھاس کو دیکھا۔  
 بحر کے اندر اس کا موڈ تبدیل ہو گیا۔

اعزاز میں دعوت کی تھی۔  
 اس وقت پورا خاندان بستر خوان پر جمع تھا۔  
 فاروق حسن فردوس بیگم ان کے تینوں بیٹے ہاشم حمزہ اور علی ماہین اور اس کا شوہر ہاشم بھی مدعو تھے۔ اس کا  
 بیٹا احسان عرشہ کی گود میں بیٹھا کھلکھلا رہا تھا۔  
 سلجوق حسن اور ان کی اہلیہ عذرا بیگم نے دعوت کا اصل اہتمام کیا تھا۔ نافع، ثانیہ اور سدرہ بھی موجود  
 تھیں۔  
 رابعہ بیگم بھی اپنی تینوں بیٹیوں کے ہمراہ صبح سے وہیں تھیں۔ بلکہ دعوت کا سارا انتظام انہوں نے ہی سنبھالا  
 تھا۔ رات کے کل سے آئی ہوئی تھی۔ اس کے شوہر انتھار بھی آفس سے سیدھے وہیں آگئے تھے۔ درود اور نافع  
 ثانیہ سدرہ کے ہمراہ کھڑی منتظرین کا رول پلے کر رہی تھیں۔  
 گویا "حیات ولا" سے تعلق رکھنے والے سب ہی افراد وہاں موجود تھے۔ دسٹر خوان پر رنگ ڈشیں لڑکیوں  
 کے لیے بناہ شوق کی مہربان منت تھیں۔ سب ہی کے بل جل کر سارا کام انجام دیا تھا۔  
 "جتنی کسے ہر چیز اعلا درجے کی بنی ہوئی ہے۔" عاشر نے کھانے کو سراہا۔ "لیکن اس چکن برانی کا جواب نہیں  
 میرا تو اس سے جی نہیں بھر رہا ہے کسی خاص منہ کے کی پکائی ہوئی لگتی ہے۔"  
 اس نے "منتظرین" کی جانب دیکھا۔  
 "پھر آپ نہ لے گئیں۔" ثانیہ نے درود کو گھوڑا دیا۔  
 وہ مسکراتے ہوئے۔  
 "بھئی۔ سب نے گل جل کر ہی سارا کام کیا ہے۔ مجھے اکیلی کا کیا کام اس میں ہے۔"  
 "زیادہ انکساری نہ جاتیں۔" حمزہ نے اسے دیکھا۔ "یہ برانی اپنی زبان آپ کہہ رہی ہے کہ کیا ہے کس نے پکایا  
 ہے۔"  
 "ورنہ شواہد اس آف یو۔" عاشر نے اسے دیکھا۔  
 وہ شرمندہ شرمندہ سی نظر آتے ہوئے۔  
 "چکن بروسٹ عرشہ نے بنایا ہے۔" فردوس بیگم بولی تھیں۔ "کھا کر دیکھو عاشر عرشہ بھی بہت ماہر ہے نہ  
 نے کھانے بنائے ہیں۔"  
 ماہین قہقہہ مار کر تھن دی تھی۔  
 "جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی عرشہ کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ چنے کی وال کون سی ہوتی ہے اور ماش کی  
 کون سی۔ ماش کی وال پکاتے تو ناک بھوں چڑھا کر کھتی چنے کی وال کا صرف طوہ اچھا لگتا ہے آپ یہاں کیوں  
 بنائیں ہیں اس کا؟"  
 سب ہی اس سے ہنسنے لگے۔ عرشہ جھینپ گئی۔ ماہین کی نظریں ہال سے بکرا رہیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ اسے  
 کڑے تیوروں سے گھور رہی ہیں۔ اسے اپنا قصور تو سمجھ میں نہ آ سکا البتہ کسی غلطی کے پرند ہو جانے کے  
 لیے اسے احساس کی ہو گئی کہ اس کو کھانا کھانے کے لیے لایا گیا ہے۔  
 "خیر تمہاری نظر نہیں آسے۔" تنیم کو خیال آیا۔ "کہاں ہوتے ہیں خالہ جان؟"  
 اس فردوس بیگم خاشی پریشان لگی ہوئی تھیں۔ سب کی لوگ خاموش ہو گئے تھے۔  
 "ہاں۔" اس غریب کو کس نے پوچھا۔ "نہیں ایک ہی جواب ہو جھا۔"  
 (40)

”اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہارا کون ہوں؟“ وہ اس کے قریب ہوا۔  
وہ ہنستے ہوئے قدرے دور ہوئی۔

”میرے ہر جانی ہو۔“  
”اچھا چلو پھر۔ تمہیں اپنی آؤفا کا یقین دلاتے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یوں بھی معاملات برداشت سے نکلے جاتے ہیں۔“

”اُٹنی شتابی بکس لیے۔“ وہ اس کے جارحانہ عزائم کی بھٹک بپا کر چپکے سے دروازہ کے سمت ہوئی۔  
”کیونکہ آج تمہاری تصویر نہیں تم رو رہو۔“ وہ مزے سے مڑا۔  
اپنے پیچھے خالی کمرہ دیکھ کر اسے ہنسی آگئی۔

”کیو تر۔“ وہ بڑبڑایا۔

بچوں کے کمرے سے نکل کر اس نے دیکھا۔ وہ لاؤنج میں بھی نہیں تھی اس نے بیرونی دروازہ لاک کیا۔ کچن کی

لاٹ آف کی۔ لاؤنج کی ٹیبل کلائنٹس آف کر کے زیرِ پاؤر کے بلب روشن کیے پھر اپنے بیڈروم کی جانب بڑھا۔

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی تازہ گلابوں کی مٹکت کا بھرپور جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔

”واؤ۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے ساکت ہی رہ گیا۔ استقبال کا یہ انداز اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔

پورا کمرہ سرخ گلابوں سے سجا ہوا تھا۔ کمرے کا سابقہ نقشہ قطعاً تبدیل شدہ تھا۔ کمرہ اسکیم سے لے کر فرنیچر

کے ڈیزائن اور سیٹنگ تک ہر شے بدل گئی تھی۔

لاٹ گرین اور وِل گولڈن کا حسین امتزاج ہر شے میں نمایاں تھا۔ اس پر سرخ گلابوں کی معنی خیز سجاوٹ کسی کا

بھی دل دھڑکا سکتی تھی۔

وہ کچھ دیر دروازے کے پیاس کھڑا معطر فضاؤں سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل

تک آ کر وہاں وِشک کارڈز سجے ہوئے تھے۔ اس نے ایک کارڈ اٹھایا، لکھا تھا۔

کیس بھی گینا لوٹا تو مرے پاس آیا  
ہر جانی

عاشق کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اچانک ہی دوبارہ نہایت نرمی سے اس کے گلے سے آ لپٹے تھے۔ اس کی پشت پر گداز وجود کا احساس مہکنے لگا۔

”شاکہ! جا شہر نے اس کی کلائی تھامی اور نرمی سے کھینچ کر اسے اپنے مقابل کر لیا۔

شرقی آنکھوں میں محبت کی جوت جگائے لبوں پر حسین مسکان لیے وہ اسے شبِ اول کی مانند نوخیز اور حسین

نظر آئی۔ روزینک ناٹی میں اس کا ہر مریں وجود غضب ناک حد تک حسین اور خطرناک لگ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس

کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر کوئی شریر خیال اس کے لبوں پر مسکان بن کر بھرا۔

”ایکٹ کی رہ گئی۔“ وہ سر ہلا کر تاسف سے بولا۔ ”بانتا کچھ اوھوری ہے۔“

”اے۔“ ایتقان جیسے خواب سے چونکی تھی۔ ”کمی۔؟ کیا؟“ اس کا چہرہ اتر گیا۔ نجانے اسے کس چیز کی کمی

محسوس ہوئی تھی۔

بہرِ رُخ ہو جھوٹو جانیں۔ وہ توبیذ کی جانب بڑھ گیا۔

ایتقان اپنی جگہ پر ایستادہ سوچ میں گم ہو گئی۔

زر زہر مٹکتے گلابوں سے سجا ہوا کمرہ، مٹکتے جذلوں سے سرشار حسین بیوی خاموشی کی زبان بولتی تنہائی نجانے اسے

"عاشق! کیا ایک ہی اس کی پٹلیں جھجک گئیں۔ گل سرخ پڑ گئے۔" نہیں بھی! "HarfeDua for One Urdu  
 "بلیر ایقان۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "وہ سب کچھ نہیں کہاں رکھا ہے عاشق! فرمائش نے اسے کھینچا ڈکڑا تھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "یاد کرو۔" اس کا اطمینان قابلِ رد تھا۔ "HarfeDua for One Urdu  
 "وہ اسٹور میں پڑا ہے عاشق! اور اسے سلیکچر۔ اتنا بھاری سوٹ کیس ہے۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "پادشاهت آپ کی مزدوری کریں گے میڈم! اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ایقان نے کہنے میں ہو کر اس کی جانب دیکھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "کچھ ہی دیر میں سرخ زرد لہانیں اس کے ہاتھوں میں تھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "جاؤ جلدی سے بہن کر آؤ۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ایقان مسکراتے ہوئے ڈرنک روم کی جانب بڑھ گئی۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ایک پیرہلاتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں تھا جب ایقان نے پرہ کھاکر سرا ہر نکالا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "عاشق! وہ جیسے کسی مشکل میں تھی۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "آپ! کہہ چوٹا۔" "وہ اسے سانسے وہاں جھپ کر کھڑی ہو۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "میں نہیں آسکتی۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "دیکھو! وہ سخت حیران ہوا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "میں خود آتا ہوں۔" "وہ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے وہاں تک پہنچ گیا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ایقان نے جھجکے میں اس نے پرہ ہٹایا تھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ایقان سرخ زرد لہانیں میں شرمندہ شرمندہ کھڑی تھی۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "وہ چند لمحوں سے دیکھا رہا پھر اس کی ہنسی نکل گئی۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ایقان والی شرٹ اس نے بڑی کو ششوں سے کھینچ کر پہن تو لی تھی لیکن اب عجیب ہی عالم تھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ایقان! ایسا لگ رہا ہے کہ چھوٹے سے تھیلے میں ڈھالی من کی پوری چیزیں کر دی ہے۔" "اس نے تبصرہ بھی کر ڈالا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ایقان بھی ہنسنے لگی۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "کروان کی بے ساختہ ہنسی کی پھواریوں نے بھیک چلا جا رہا تھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "وہ دڑتے دڑتے اس نے خود کو اکیلا پایا تو رک کر پیچھے دیکھنے لگا۔ وہیں ٹھنک گیا تھا جہاں اکثر ٹھہرایا کرتا تھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "رافع مڑ کر واپس اس تک آیا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "دونوں ہاتھ سینے پر لیٹے وہ سفید جھلکے کی عمارت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وڑنے کی وجہ سے سانسوں کی آمدورفت سخت تھی لیکن وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "اسے سسرا! رافع کے لیے اسے مخاطب کیا ہاشم اسے دیکھنے لگا مگر وہ کچھ نہیں دیکھتا۔" "HarfeDua for One Urdu

"د By HarfeDua for One Urdu  
 "س کی کا خیال آیا تھا۔ اپنی جانب سے تو اس نے کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "سہیلی بوجھ پھیلی۔" "اس نے اپنے پھر اسے چھیڑا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "مجھے نہیں پتا۔" اس نے ہونٹوں پر پیرچہ اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ کتنے ارمانوں کے خود کو سرتاپا سنوار کر اس "HarfeDua for One Urdu  
 "کے قریب آئی تھی۔ وہ محبت کا رتی برابر اظہار کیے بنا نہیں ہو گیا تھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ایقان نے خفا خفا نظروں سے اسے دیکھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ارے بھائی۔ او صبر تو آؤ کچھ! " "HarfeDua for One Urdu  
 "میں نہیں بھائی وائی۔" "وہ اور چڑھی۔" "کوئی سرکارشتہ نہیں ہے پکارنے کو۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "او ہو! بھئی یہ وہ والا بھائی! نہیں ہے! برادر! نہ جذبات والا۔ یہ وہ سرا بھائی! ہے۔ چلو! من بھائی! او صبر تو "HarfeDua for One Urdu  
 "آؤ اب خوش۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "اسے ہنسی آگئی ہنسنے ہوئے وہ اس تک چلی آئی۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "فرمائیے ہر حال۔" "وہ اس کے قریب پہنچی۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "وہ نہیں لگتا ایسے پکارتے ہوئے۔" "عاشق نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "او ہوں۔" "اس نے مزے سے ہنسی میں سر ہلایا۔" "پابہ زنجیر کیا آؤں! اسے چھوڑ دیا۔ ہم تو اس تصور کے تحت "HarfeDua for One Urdu  
 "مڑے رہتے ہیں۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "وہ فوج اس قدر بے فکری۔" "اس نے سر ہلایا۔" "ایقان نے اس کی سیاہ "HarfeDua for One Urdu  
 "جھوپٹا ہونے لگی تھی نہیں جاتا اور جو چلا جائے وہ اپنا نہیں اچھوتا۔ فکر سے کیا حاصل۔" "ایقان نے اس کی سیاہ "HarfeDua for One Urdu  
 "آنکھوں میں جھانکا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "اور پھر تمہاری آنکھیں تو سیاہ ہیں! " "وہ مسکراتے ہوئے بولی۔" "کہتے ہیں ہر جانیوں کی آنکھیں براؤں ہوتی "HarfeDua for One Urdu  
 "ہیں! " "HarfeDua for One Urdu  
 "تمہاری آنکھیں تو براؤں ہیں۔" "وہ بھی مسکرایا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "پھر غلط کہتے ہوں گے۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "یعنی سیاہ بھی ہو سکتی ہیں۔" "اس نے مضبوطی فکر مندی سے کہا پھر دونوں ہی ہنسنے لگے۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "وہ نکال چھوٹا اس ریسرچ کے لیے تمہیں ایک یہی اثرات ملی ہے۔ اتنا خوبصورت کمرہ سجایا ہے اور باتیں "HarfeDua for One Urdu  
 "کر رہی ہو ہر جانیوں کی! " "HarfeDua for One Urdu  
 "جناب! ایقان نے اسے کھوڑا! " "اس جرم کے وارنٹ آپ کے نام نکلنے چاہئیں۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "میں نے تو ایک کی کا ذکر کیا تھا۔ تم دو سرے چکراؤں میں پڑ گئیں۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "بھئی! کیا کی ہے آخر۔" "وہ چڑھی۔" "تم مرد بھی نا! کبھی غلط نہیں ہوتے! ہمیں تعریف نہیں کرتے۔ بیش "HarfeDua for One Urdu  
 "عورت کی خامیاں ہی ڈھونڈتے ہو۔ اچھا! بتاؤ ذرا کیا کی ہے! " "HarfeDua for One Urdu  
 "عاشق نے اس کا بازو تھام کر اسے قریب لایا۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "وہ شہ زفاف کا سا اہتمام کیا ہے۔ دس گن کی طرح خوشبو لگ رہی ہو اور عروسی لباس کی جگہ یہ ناٹک بات "HarfeDua for One Urdu  
 "نہیں رہی! " "HarfeDua for One Urdu  
 "زر زعفرانی لباس! ایقان حیران ہوئی۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "ہاں! کہاں ہے تمہارا شادی کا ڈر! میں تجھ پر کمر آؤں۔" "HarfeDua for One Urdu  
 "وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔" "HarfeDua for One Urdu





منور میاں کو سب قہقہے کا علم ہو چکا ہے وہ سخت طیش میں ہیں۔ یہ دن تو دیکھنا ہی تھا۔ میرے ساتھ کچھ براہو اتو  
 ۱۔ میری بددعا ہے۔ بھی سکھ چیں سے نہ جینے دے گی۔ مجھے احمد جہاں زیب سے یہ امید نہ تھی۔ انسان کو حقیقت  
 پسند کی ہے کچھ نہ کچھ تو واسطہ ہونا چاہیے۔ اس سے مینا کا قصور تو چھ کر مجھے بتلا دیں۔ آخر مجھے بھی آگے والوں کو  
 منظرین کرنا ہے۔  
 خت پر شانی کے عالم میں ہوں میرے لیے دعا کیجئے۔

آپ کی بیٹی  
 بلقیس بانو

ربیعہ نے بے دلی سے خط کو باہر تھہر کیا۔ یہ جو قحاط تھا جو اس نے پڑھا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا  
 تھا۔ احمد جہاں زیب سے بلقیس بانو کی کیا ناراضی تھی؟ احمد جہاں زیب نے آخر کیا کیا تھا؟ بلقیس بانو ان سے کیوں  
 سخت خفا تھیں؟ اس کا باغ الجھ الجھ جاتا۔  
 اتنا سے ضرور اندازہ تھا کہ یہ خطوط اس کی پیدائش سے قبل لکھے گئے تھے یا شاید اس کے ماں باپ کی شادی  
 سے بھی قبل ورنہ کسی خط میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا۔  
 ایک خط ایسا بھی تھا جس میں بلقیس بانو نے اپنا پتہ بھی تحریر کیا تھا۔ وہ پتہ لاہور شہر کا تھا۔ ربیعہ نے لاہور کو بھی نہ  
 دیکھا تھا۔ اسے لاہور دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس نے کئی مرتبہ دادی جان سے لاہور دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔ وہ  
 اس کی فرمائش کے جواب میں کچھ نہ کہتیں۔ انہوں نے بھی اپنی بیٹی کا ذکر نہ کیا تھا۔ حالانکہ وہ ربیعہ کی  
 فرمائش کے جواب میں اتنا تو بڑی کشتی تھیں کہ بلقیس بانو نامی ان کی ایک بیٹی ہے جو لاہور شہر میں رہتی ہے۔  
 ایک جمعہ تھا جو ربیعہ سے حل نہ ہوتا تھا۔ دادی جان کی وفات سے سوالات سے بھری ایک پٹاری کھل گئی تھی۔  
 سچی۔ اس کے چاروں جانب مختلف سوالات چکر رہے تھے۔ سب سے بڑا سب سے تشنہ سوال یہ تھا کہ دادی  
 جان نے جس سے اس کے دیگر رشتہوں کے متعلق کیوں نہ بتایا تھا؟

”عزیز! مجھے نے سلجوق حسن کو چائے کی پیالی تھما دی تھی۔“  
 ”شکریہ۔“ انہوں نے آخرا ایک جانب رکھ دیا۔ ”تو نے کیا کر رہے ہیں؟ پھر میں کہنے ہی نہیں۔“  
 ”رائع تو اپنے یونیورسٹی کے کام سے ہی گیا ہے تمہارے لئے کتنے چند محنت پہلے ہی نکلا تھا۔ نافع شاید حمزہ  
 اور علی کے ساتھ ہے۔ دونوں لینے تو آئے تھے اسے اب کیا خبر کہاں گئے ہیں۔“  
 ”عزیز! تم نے مجھے بے غصہ حیات نے جواب دیا تھا۔“  
 ”جیسے نیک لڑکے لیے ہیں پرووڈو گار بنے۔ شکر ادا کیا کرو۔“ وہ دوسو سو میں نہیں پڑا کرتے۔ انہوں نے  
 نزدیک کیا۔  
 ”تو چائے کا برا سا پیالہ تھا۔ گھونٹ گھونٹ لی رہی تھیں۔“  
 ”ارے نہیں! مانا آدھ سوے کیے۔ میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔ کئی روز ہو گئے کسی سے تفصیلی بات ہی نہیں  
 ہوئی۔“ وہ شام کی طرف سے بولے۔  
 ”اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ میں کسی قسم کی فکر میں نہیں پالتا۔ جانتا ہوں میری اولاد میری  
 نگاہ رکھنے کے لیے میری ماں ہمہ وقت جو کس وہ شیار رہتی ہے۔ جہاں کوئی کمزوری نظر آئی وہی مجھے مطلع کر دے  
 گی۔ بیٹے میری سرحدیں ہیں اور ماں میری محافظ۔ میں اطمینان سے ہوں۔“

”آپ اتنی گوری ہیں ماما!“  
 ”میرے بیٹے کو گورا رنگ پسند ہے۔ ہوں۔ دھیان رکھنا پڑے گا۔“  
 ”اور۔ اور۔ انوسینٹ بھی ہیں۔“ عمر نے مزید غور کیا۔ ”مجلز انوسینٹ ہوتے ہیں نا؟“  
 ”یقیناً ہوتے ہوں گے۔“ اس نے تائید میں سر ہلایا۔  
 ”اور آپ کے بال کتنے اچھے ہیں۔“ اس نے قریب آکر اس کے بال اچھوئے۔ ”مجلز کے پروں جیسے۔“  
 ”وہ مائی گاڑ۔“ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی انیقا بلبلا کر مڑی تھی۔ ”آئی! یہ آپ کا بیٹا ہے یا مستقبل کا شاعر۔“  
 کب سے میرا دھیان اس کی باتوں میں لگا ہوا ہے کیا اس کے حسن کی اس قدر مدح سرائی کر رہا ہے؟ محبوبہ کی تعریف  
 میں تو زمین آسمان کے قلابے ملاوے گا۔ کیوں جناب! خالہ جانی کے لیے بھی ایک آدھ قصیدہ ہے آپ کے غیر  
 مطبوعہ دیوان میں یا نہیں۔“  
 ”شہلا بے ساختہ ہنس دی تھی جبکہ وہ منہ نہ کرا سے دیکھنے لگا۔“  
 ”ماما جیسی تو ہیں آپ بھی الگ سے کیا بتاؤں۔“  
 ”انیقا کو بھی ہنسی آگئی۔“  
 ”یعنی ماما کی تعریفوں سے اپنی بیٹی تھینا کر لوں اپنا۔ آپ اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔“  
 ”نہیں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”آپ تو خیر ماما سے بھی زیادہ پیاری ہیں لیکن مجھے اپنی ماما زیادہ اچھی  
 لگتی ہیں۔“  
 ”اور۔“ انیقا نے جوتھٹ سکڑے۔ ”کیا غضب کی صاف گولی ہے۔ بڑے ناکام قسم کے سیاستدان ہوں گے  
 آپ۔“  
 ”تو کون ہوتے ہیں؟“ وہ سنجیدہ ہوا۔  
 ”بٹاؤ! شہلا نے پھر سے رسالہ اٹھالیا۔“  
 ”انیقا سر کھجانے لگی۔ ”ایک قسم کا پروفیشن ہے۔ جیسے ڈاکٹر ہوتے ہیں، وکیل ہوتے ہیں، قوی اسبلی کے ہیر  
 ہوتے ہیں۔“  
 ”چچا۔“ وہ سوچ میں گم ہوا۔ ”میرے پاپا کیا تھے؟“  
 ”رسالے کے قہقہے میں شہلا کی پلکیں کانپیں پھر اس نے پورا چہرہ چھپا لیا۔“  
 ”تمہیں کوئی آواز آرہی ہے عیر!“ انیقا نے اچانک پوچھا۔ ”والز کا میوزک ہے نا۔“  
 ”ہاں۔“ وہ یکدم خوش ہو گیا۔  
 ”انیقا پوچھ رہا ہے۔ میرے لیے کارنیوے لو۔“  
 ”چچا خالہ جانی! اس نے بے در لگادی۔“  
 ”انیقا نے گہری سانس بھری۔ ”میرا پاپا شاعر تھے۔“  
 ”اور پاپا کی بیٹی تھی۔“  
 ”اللہ علیہم۔“  
 ”آپ کا خط ملا۔ پاپا کو ان کا بیٹا ہے۔ احمد جہاں زیب کو اب وقت ہی سمجھائے گا۔“

"جیتے رہو۔" انہوں نے بیٹے پر شفقت بھری نگاہ کی۔ "بوڑھے ماں باپ کو اور کیا چاہیے اولاد سے۔ ذرا سی لگاؤ دے ذرا سی محبت ذرا سا اظہار۔ مشکل گھڑیاں آسان ہو جاتی ہیں۔"  
 انہوں نے گہری ہنسی بھری۔  
 "کیسی مشکل اماں!"  
 "کوئی مشکل نہیں بیٹے! اللہ کا احسان ہے۔ بس یہ برہنہ پادرات خود ایک مشکل ہے۔ ساری عمر انسان اپنی مشکلات کا سامنا کر کے ان سے جو کبھی لڑ سکتا ہے لیکن بچت برہنہ آجائے تو اسے آسان بنانے کے لیے دوسروں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ برہنہ ایسی مشکل ہے بیٹا! جسے انسان خود آسان نہیں کر سکتا جب تک دوسرے نہ چاہیں۔"  
 "آپ کو کوئی شکایت ہے اماں!" عذرا بیگم نے تباہی کی صورت دیکھی۔  
 "جی نہیں آرہی ہوں بیٹیوں جیسی بی بی رہی ہو ساری عمر شکایت کیسی۔ میں تو یونہی ایک بات کر رہی تھی۔ اللہ کا احسان اس نے دو بیٹے دیے دو بیٹیوں دیں۔ ایک نے دھتکارا تو دوسری نے گل لگایا۔ کبھی سوچتی ہوں ایک بیٹا ہوتا اور ایک ہی ہوتا تو میں کہاں جاتی۔"  
 "ایسا نہ کہیں اماں! یہ تو نصیبوں کے کھیل ہیں۔ کبھی ایک بیٹے کی ماں بھی مسکھ رہتی ہے تو کبھی گیارہ بیٹیوں کی ماں بھی آٹھ آٹھ آنسو روٹی ہے۔" سلجوق حسن نے خالی سیالی بیوی کو تھمائی۔  
 "درست کہتے ہو بیٹا! خدا کا شکر ہے اس نے مقدر میں شکھ ہی شکھ لکھا۔" شفیقہ حیات اطمینان سے بولیں۔  
 "ہاشم کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں بھابھی جان! اماں اس لیے فکر مند ہیں۔" عذرا بیگم نے شوہر کو تان کی بے سکونی کی اصل وجہ سے آگاہ کیا۔  
 "تو اس میں پریشانی کی کیا بات؟" وہ حیران ہوئے۔  
 "میں تو یہ کہتی تھی بچے کہ اپنے گھر بی بی روشنی ہی روشنی ہو تو آدمی پر ایسا چراغ غائب گئے کیوں نکلتے۔ ماشاء اللہ ہاشم لڑکیاں کو دیکھو تو نظرد سے بچاؤ کی دعا یاد آتی ہے۔ میں تو فوراً پڑھ کر دم کرتی ہوں۔ ایسا اچھا ذہین بچہ اپنی بچیوں میں سے کسی کا مقدر کیوں نہ بنے۔"  
 "چھوڑیں اماں۔" سلجوق حسن نے سر ہلایا۔ "ان کا بیٹا ان کی عمر بھر کی نکلائی تہم کیوں اپنی نیتیں کھوٹی کریں جیسے ان کی خوشی ہو۔ خدا ہماری بچیوں کا مقدر بھی چکائے گا انشاء اللہ۔"  
 "بس بیٹا! بوڑھی جان ہوں کوئی اور کام تو ہے نہیں بیٹی یہی سوچتی رہتی ہوں۔" شفیقہ حیات ہنستے ہوئے بولیں۔  
 "آپ کے سوچنے سے کیا ہوگا اماں! جو ہونا ہوگا رقم ہو چکا۔" سلجوق حسن بھی ہنس دیتے۔ "فکر لا حاصل کیا حاصل۔"  
 "انہوں نے تائید کی۔" شاید میرا ایمان ہی کمزور ہے۔"  
 \*\*\*  
 دروازہ کھلتا تھا اس نے کمر میں ہندی سے گھڑی کی جانب دیکھا۔  
 "کون ہے؟" دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے وہی آواز میں پوچھا۔  
 "کیفیت طاری رہا کرتی ہے۔"

دور اساجھ کر بڑی رازداری سے گویا ہوئیں۔  
 ایک رشتہ بھی لائی ہوں تمہارے لیے۔ جیسا لڑکا ہے۔ اپنا کاروبار ہے۔ سنو گی تو خوشی کے مارے  
 پھوٹی تہہ تاؤ گی۔ لیکن وہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ مکان کا کام تو ایک طرف ہو جائے۔  
 ربیعہ خاموش ہو گئی۔ اس کے دل میں ٹائم بم کی ٹیک ٹیک راز کی تھمتی سے خطرے کا الارم سنائی دے رہا تھا۔  
 عرفان شوکت کی سرد چالاک نظر پر چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے اس نے ہمارے ہی وہ گھر  
 خرید لیا تھا۔  
 ”تو لو بیٹی! ایک رقم دیں تمہیں؟“  
 ”بات دراصل یہ ہے بواب“ وہ شر کر بولی۔ ”یہ گھر میری پھپھو کا ہے۔ ان کے نام سے ہی اس کے کاغذات  
 بنے ہوئے ہیں۔ اور پھپھو لاہور میں رہتی ہیں۔“  
 ”لیکن بوا اور عرفان شوکت کو جیسے ایک دھچکا لگا تھا۔ ان کے چہرے اتر گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب  
 دیکھا۔  
 ”پھپھو؟“ پھر سیکندہ بوا بولیں۔ ”کون پھپھو؟ ہم نے تو کبھی نہیں سنا کہ تمہاری کوئی پھپھو بھی ہیں۔ نہ کبھی  
 اتنے سالوں میں تمہاری دادی نے ہی کوئی ذکر کیا۔ اگر ان کی کوئی بیٹی ہوتی تو کیا ان کے مرنے پر بھی نہ آتی؟ تمہارا  
 سارا اثاثہ؟“  
 ربیعہ پھر خاموش ہو گئی۔  
 ”اب میں آپ کو کیا بتاؤں بواب؟ وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ ”دراصل یہ سب کچھ بہت پرانی چیقلش کا  
 نتیجہ ہے۔ پھپھو بھلا سے دادی جان کی لڑائی تھی بہت زیادہ لڑائی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لڑواؤ دینے تھے۔ اسی  
 لیے پھپھو کبھی یہاں نہیں آئیں۔ مجھے بھی یہ سب باتیں ان کے خطوط سے پتا چلیں۔ لیکن اب میں نے پھپھو کو  
 خط لکھا تو ان کا جواب آیا وہ اور منور پھو بھلا بہت جلد یہاں پہنچ رہے ہیں۔ شاید چند ہی ہفتوں میں۔ میں آپ کو ان سے  
 ملاؤں گی اور مجھے یقین ہے وہ آپ کی چیقلش پر ضرور غور کریں گے۔ کیا کہا تھا آپ نے؟ ایک ساٹھ ارے ہاں  
 زیادہ آیا۔ پھپھو نے لکھا ہے کہ پھپھو جان بھی جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ پھر تو سمجھ لیں بات سن رہی  
 تھی۔  
 عرفان شوکت کھڑا ہو گیا۔  
 ”چھالی بی! ہم پھر آئیں گے اور یہاں رہیں گے۔“  
 ”اگر اس سے ہوتی ہوئی لگا ہوں سے سیکندہ بوا کی جانب دیکھا۔  
 ”پہلے پھپھو کو دیکھنا۔ کیا ملے۔ تین لاکھ۔“  
 ”تین لاکھ؟“ ربیعہ نے آنکھیں پھیلائیں۔ اتنے زیادہ پیسے اس چھوٹے گھر کے؟  
 ”ارے ایک سو بیس گز کا پلاٹ ہے۔“ سیکندہ بوا نے ساختی میں بول گئیں پھر جیسے انہوں نے دانستوں میں  
 زبان ڈالی۔  
 ”چھالی بی! پھر پھر؟“ عرفان شوکت نے سیکندہ بوا سے پوچھا تھا۔  
 ”ہاں! وہ بے ہوش کھڑی ہو گئیں۔  
 ”اگر اس سے ہوتی ہوئی لگا ہوں سے سیکندہ بوا کی جانب دیکھا۔  
 ”پہلے پھپھو کو دیکھنا۔ کیا ملے۔ تین لاکھ۔“  
 ”تین لاکھ؟“ ربیعہ نے آنکھیں پھیلائیں۔ اتنے زیادہ پیسے اس چھوٹے گھر کے؟  
 ”ارے ایک سو بیس گز کا پلاٹ ہے۔“ سیکندہ بوا نے ساختی میں بول گئیں پھر جیسے انہوں نے دانستوں میں  
 زبان ڈالی۔  
 ”چھالی بی! پھر پھر؟“ عرفان شوکت نے سیکندہ بوا سے پوچھا تھا۔  
 ”ہاں! وہ بے ہوش کھڑی ہو گئیں۔

دیکھو بوا بی! میں ہوں تمہاری بوا“ سیکندہ۔  
 پان زوہ کبھی میں شہید بھلا ہوا تھا۔ ربیعہ نے چٹنی گرا دی۔  
 باہر سیکندہ بوا کے ہمراہ کوئی اور بھی تھا۔ سیکندہ بوا کے پیچھے کھڑے اس آدمی کو دیکھ کر وہ بچائے کیوں خوف زدہ سی  
 ہو گئی۔  
 ”کلف“ لگے ہوئے سفید لباس میں بلوس وہ شخص پیچھے دفعتی سا معلوم ہوتا تھا۔ سیاہ خضاب سے اس نے ہر جگہ  
 بالوں اور موٹھوں کو گہرا سیاہ رنگا ہوا تھا۔ گلے میں سرخ رومال تھا۔ بالوں کو اس نے تیل کی مدد سے نہایت سلیٹے  
 سے جمایا ہوا تھا۔  
 اس کی آنکھوں کی چمک نے ربیعہ کو خوفزدہ کر دیا۔ سیکندہ بوا منہ میں پان لیے کہہ رہی تھیں۔  
 ”یہ عرفان میاں ہیں میرے بہنوئی ہیں مگر بھائیوں جیسے ہیں۔ تم سے ذرا ایک کام کے سلسلے میں ملنے آئے  
 ہیں۔ تمہیں ذرا سی فرصت ہو گی بیٹی!“  
 انہوں نے ربیعہ کو دروازے کے پتھوں پر ایستادہ پا کر پوچھا۔  
 ”جی“ ”جی“ ”جی“ ”جی ہاں“ ”آئیں۔“  
 بادل خواستہ اس نے ان دونوں کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ پتھوں کے پیچ میں پڑی چارپائی پر وہ دونوں بیٹھ گئے تو  
 ربیعہ اپنے لیے کچن سے اسٹول لے آئی۔  
 ”کیسے سیکندہ بوا!“ وہ اسٹول پر بیٹھ گئی۔  
 ”دیکھو بیٹی! بات سراسر تمہارے بھلے کی ہے اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر غور  
 کرنا۔“ انہوں نے بیٹھ کر اوپر اوپر دیکھ کر نکل ہی گئی۔  
 ”ہاں۔“ پھر وہ کھنکھاریں لے ”بات کچھ یوں ہے کہ میں نے اپنا گھر انہیں بیچ دیا ہے۔ لاکھ روپیہ انہوں نے  
 نقد دیا ہے۔ بقیہ پچاس ہزار قسطوں میں دے دیں گے۔“  
 ربیعہ پلکیں جھپکاتے بنا نہیں دیکھتی رہی۔  
 ”ہاں تو۔ بات کچھ یوں ہے کہ یہ میرے گھر کو اگر جوڑی کا کارخانہ بنانا چاہتے ہیں۔“ سیکندہ بوا کچھ نرم  
 تھیں۔ ”تو سب بات کچھ یوں ہے کہ جگہ نام پر رہی ہے۔“  
 انہوں نے گردن کھجا کر ان صاحب کی جانب دیکھا تھا۔  
 ”دیکھو بیٹی! وہ دھوکا دینا شروع ہوئے۔“ اس جگہ کی مارکیٹ ویلیو کچھ خاص نہیں اس لیے میں  
 زیادہ سے زیادہ ڈیرہ لاکھ دے سکتا ہوں۔ لاکھ نقد پچاس ہزار قسطوں میں۔ سیکندہ بوا کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا  
 ہے۔ تمہارے ساتھ بھی۔ بلکہ مزید نرمی کی جا سکتی ہے۔ میں تمہیں ایک ساٹھ کروڑوں گا۔“  
 ”اگر تو مجھے ایک ساٹھ کروڑوں گے؟“ ربیعہ سمجھ کر بھی انجان بنی تھی۔ ”میں سمجھی نہیں انکل!“  
 عرفان شوکت نے ایک نگاہ اس کے بھولے چہرے پر ڈالی۔  
 ”میرا مطلب ہے میں تمہیں ایک لاکھ ساٹھ ہزار دوں گا۔ سیکندہ بوا کو دی گئی رقم سے دس ہزار زیادہ۔“  
 ”یہ تمہارا گھر خرید رہے ہیں نا بیٹی۔ اتنے اچھے دام لگ رہے ہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ فوراً ہاں بھرنو۔ پھر  
 (وہی ذات ہو) تمہیں تو تو شرمناک بنانا ہے یا نہ کرنا۔ اچھا ہے تمہارے لیے جینز کی رقم کا بندوبست ہو جائے گا۔ اور  
 ہاں۔“



اس سیکھنے کو خناس نے دیوانہ کر دیا؟ لا حول ولا قوۃ الا باللہ! ارے یہ نہ سوچا، بے ماں باپ کی بچی بے چھت کی  
 بھی ہو گئی تو کہاں جائے گی؟ بھلا بتاؤ تمہارے ذہن میں اگر ایسی چالاکی کی بات نہ آتی تو وہ مواتو تمہیں ٹھکے ہی  
 لیتا۔ بار سال ٹھیکہ کے گھر کی قیمت چار لاکھ لگی تھی لیکن وہ نہ مانی اس کا تو مکان بھی خراب حالت میں تھا۔ تمہارا تو  
 اللہ رکھے ایسی اچھی حالت میں ہے کہ پانچ میں چلا جائے، لیکن میرے منہ میں خاکہ کیوں جائے بھلا بتاؤ۔  
 ربیعہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن عجب بھول بھیلوں میں الجھا ہوا تھا۔  
 "مگر تمہارا دور پرانے کا کوئی رشتہ دار ہے تو خط لکھ کر اسے بلواؤ ان کمپنیوں کو کچھ تو کان ہوں گے کہ بچی تنہا  
 نہیں۔ یہ تو سمجھ رہی ہیں جیسے لوٹ کا مال ہے۔ بھلا بتاؤ۔"  
 ربیعہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔  
 "دیکھو کاپتہ ملا تو ہے ایک خط میں۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ میں اس پتے پر خط بھیج کر دیکھوں کیا جواب  
 آتا ہے۔"  
 "تب تلک ان مووں کو یونہی الجھائے رکھو۔ ناس پیٹوں کو۔" پھر انہوں نے بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھا۔  
 "ایک بات کہوں بٹی! برا تو نہیں مانو گی؟"  
 ربیعہ نے مسکرا کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔  
 "نہیں خالصہ۔ برائے والی بات اول تو ہو گی نہیں اگر ہوئی بھی تو میں ہرگز برا نہیں مانوں گی۔"  
 "تم کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ خالصہ کے دل میں کوئی لالچ ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات والا حساب ہے۔ میرا بیٹا کسی  
 طور تمہارے لائق تو نہیں پھر بھی تمہاری حفاظت کے خیال سے کہتی ہوں۔ اگر تمہاری منتہی بدر سے ہو جائے  
 تو۔۔۔" وہ دُور سے دُور سے بولی۔ پھر انہوں نے ربیعہ کا تیزی سے سفید پڑتا چہرہ دیکھا۔  
 "نہ نہ بٹی! کوئی زور زبردستی کا سودا نہیں۔ تمہاری اپنی خوشی ہے۔"  
 "اچھا چھوڑو بٹی، رہنے دو میں بھی دیوانی ہوئی بھلا بتاؤ۔" وہ اس کی حالت سے شرمندہ تھیں۔  
 "نہ جانے کہاں رکھ دے سب درازیں الٹ پلٹ کر دیکھ چکی ہوں۔ جیسے گدھے کے سر سے سینک۔ ایک  
 میری یہ تختہ کمرے میں بھی لگم بختی کی ماری ہوئی۔ چیزیں رکھ کر بالکل بھول جاتی ہوں۔"  
 عریشہ نے بے فکری سے لی۔ دی دیکھتے ہوئے ایک نگاہ بڑبڑ کرتی ماں پر ڈالی پھر دوبارہ لی۔ دی کی جانب متوجہ  
 ہو گئی۔  
 "ان کو دیکھ لو اللہ کا نور۔ ارے میں کہتی ہوں تمہارے داغ اگر یہی رہے تو سسرال جا کر کیا غضب دھاؤ گی  
 ان غریبوں پر منہ بھر بھر مجھے گوسیں گے کہ ماں نے یہی تربیت کی ہے۔"  
 اس کی بے پروائی دیکھ کر انہیں جلال ہی آگیا۔  
 "یہی ہے اب مجھ غریب کی شامت آئی۔" وہ چڑ گئی۔ "چیزیں آپ رکھ رکھ بھولیں سسرال میں طعنہ مجھے ملے  
 لوئی تک بتی ہے آئی!"  
 "ارے ماں سے دو لفظ تسلی کے تو کہہ سکتی ہو۔ پوچھ تو سکتی ہو کہ کیا کھو گیا۔ کتنے لیے گھنٹہ بھر سے ریشمان  
 پر ہو رہی ہوں۔ سناؤ وہ کتنا غریبہ بات ہے کہ تم نے ہم زبان تو ہلا سکتی ہو۔ پھر کے بت کی سی بے پروائی ہے۔  
 ارے آگے لگے ان بی۔ وی والوں کو۔ لڑکیوں کو بالکل ہی سنگما کر چھوڑا ہے۔ بس فیشن کی باتیں کرنا۔ یہ "ان"  
 کہے یہ تو ہوتے ہیں۔ لیکن کہتی ہوں سسرال میں جا کر خبر ہو گی "ان" ہو یا "اونٹ" ہو۔"  
 54

سیاہ جینز اور رست مگر شرٹ مین اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ گھنے بالوں کی سیاہی، چمک بن کر بکھری تھی۔ صاف ستھرا، دھلا دھلایا وہ جیسے لائڈری لٹنے لگن کر گیا تھا۔

فردوس بیگم کی نگاہوں نے دروازے تک اس کا تعاقب کیا۔

”ہائے ہائے!“ انہوں نے دینے سر آہ بھری۔

عریشہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اس سر آہ کا مطلب وہ بخوبی جانتی تھی۔

آج اس نے خط لکھنے کا مکمل تہیہ کر لیا تھا۔

وادی جان کے صندوق میں اتنے بھلے خطوط تھے۔ وہ محض چند ایک ہی پڑھ پائی تھی۔ وہ سب خط پیچھو کے نہیں تھے۔ کسی ایک کے متعلق تو وہ سمجھ ہی نہ سکتی تھی کہ خط کس نے بھیجا تھا اور اس کے متن کا کیا مقصد تھا۔

کانڈ قلم لے کر وہ یاد دہانی پر سوچتی رہی۔ اسے کیا لکھنا تھا اور کیسے لکھنا تھا اس نے کب کسی کو خط لکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار تو وہ خط لکھنے بیٹھی تھی۔

پھر بہت سوچ سوچ کر اس نے لکھنا شروع کیا یا پنا تعارف کرایا۔ وادی کے انتقال کی بابت لکھا اپنے اکیلے بن اور شہابی کا ذکر کیا۔ محلے والوں کی بدتمیزی کا احوال لکھا۔

”آخر میں اس نے اپنی اندیشہ کا ذکر کیا کہ نہ جانے یہ خط بلقیس بانو تک پہنچا بھی ہے یا نہیں، حالانکہ اس ذکر کی چداں ضرورت نہ تھی کیونکہ خط نہ پہنچنے کی صورت میں وہ یہ جملہ پڑھ ہی نہیں سکتی تھیں اور خط مل جاتا تو اس خط کی ضرورت نہ تھی۔

خط مکمل کر کے اس نے لفافے میں رکھا اور بند کر کے کچھ سوچنے لگی۔

جس خط میں اسے پیچھو کا پتہ ملا تھا وہ تو اس نے بے پروائی سے دوبارہ لکڑی کے صندوق میں ڈال دیا تھا۔ اسے پھر سب کچھ از سر نو لکھنا پڑا تھا۔ اس میں تو بہت کاغذات تھے۔

لیکن سہر حال یہ کام تو کرنا ہی تھا۔

اس نے پھر الماری سے چابی نکال کر صندوق کو کھولا اور سب کاغذات باہر نکال لیے۔ پرانے بلوں، تاروں، بینک کی رسیدوں اور خطوط کا وہ ایک بے ہنگم مجموعہ تھا اس میں سے کچھ دھوڑے خاصا مشین کا کاغذ تھا۔

وہ تمہ شدہ کاغذ کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ ایک پرانے تار نے نجانے کیوں اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تھی۔

ربیعہ نے تحریر دیکھی، لکھا تھا۔

”اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ کی بیٹی بلقیس بانو چند دن علالت کے بعد انتقال کر گئی ہیں۔ جلد ہی پہنچیں۔“

آپ کا رانا

منور امین

ربیعہ کی نگاہوں نے اندھیرا چھا گیا۔ امید کی روشن شمع کسی نے پھونک مار کر گل کر دی تھی۔ چکراتے میرا در بے قابو ہوتے دل کے ساتھ وہ بڑی مشکل سے بستر تک پہنچی تھی۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ)

Harfel

فیشن سے متعلق چٹا ہوا پروگرام دیکھتی عریشہ کو انہوں نے بالکل جی بے زار کر دیا۔

رموٹ سے ٹی وی آن کر کے اس نے خفگی سے ماں کو دیکھا۔

”سرال نامہ“ نہ جانے کب تک پچھلے گا، آپ کا۔ ”پوائنٹس“ ختم ہی نہیں ہوتے۔ لہذا ایک نیا نکتہ سننے کو

”ماں کا جی جلاؤ گی تو یہی کچھ سننے کو ملے گا۔“ وہ اس کے برابر بیٹھ کر اپنی باتیں دہرائے گئیں۔

”کیا کو گیا ہے؟“ اسے تو جھٹکا ہی پڑا۔

”ارے تمہارے باپ کے کچھ کاغذات تھے ایک خاکی لفافے میں، چند روز قبل مجھے تمہارے گھر میں بھول کے نہ جانے کہاں رکھ بیٹھی تھی، اب مل کر نہیں دیتے۔“

”یہ کن میں جو بیگمیں والا کیبنٹ ہے۔ اوپر، چھوٹا کیبنٹ اس میں بھی ایک براؤن لفافہ پڑا ہے وہی تو نہیں؟“

فردوس بیگم نے لحظہ بھر سوچا پھر ان کا چہرہ کھل اٹھا۔

”ارے ہاں! وہی تو رکھ دیے تھے اس دن۔“

”اب کا بھی جواب نہیں اپنی! عریشہ مسکرا دی۔

”کوئی بھلی سی جگہ تو دیکھ لیا کریں، چیز رکھنے سے پہلے کل ہاشم بھائی کے دوست آئے تھے تو میں نے بیگٹ لینے کے لیے کھولا تھا کیبنٹ اب اگر میں نہ دیکھتی تو دن بھر کی خواہی تھی دھوڑے دھوڑے کر بیزار ہو جاتے سب لوگ۔“

”ہاں! یہ تو ہے۔“ نہیں اعتراف کرنا پڑا۔

”لاؤں گا ورنہ کھول کر رافع اندر چلا آیا۔

”السلامو علیکم بہت تالی ای ہاشم گھر ہے؟“ وہ کچھ جلدی میں تھا۔

”نہیں ہاشم تو نہیں ہے، ہم کہاں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو تاؤ وہ گھڑی بیٹھو تو تھوڑے پابل خواستہ اندر تک چلا آیا۔“

”اس کے ساتھ حیدر جو کہ تک جاتا تھا ایک دوست سے ملنے میری بابتک مبالغے کیا ہے۔“

”چھانٹو یوں کہو ہاشم کی نہیں، موٹر سائیکل کی ضرورت ہے۔“ رافع قدرے جبر ہوا۔

”عریشہ اجاؤ علی کی دراز سے اس کی موٹر کی چابی نکال لاؤ وہ تو سو رہا ہے گھر کے گاؤ تین گھنٹے بعد۔“

رافع نے قدرے سکون کا سانس لیا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”عریشہ آگئے کر علی کے کمرے کی سمت برہہ گئی۔ فردوس بیگم ہنست رہیں۔

”تم لڑکے تو بن گئے ایک تم ہو، ایک تمہارا ہوائی گھوڑا ہو اور کسی شے کی ضرورت نہیں تمہیں جسے دیکھ لو اس کا یہی حال ہے۔ ہمارے والے تو ایسے تھے ہیں، الگ الگ موٹریں لے کر دی ہیں باپ سے اور معمولی سا کام تو ہر کسی کو دیکھ لو، بکھوڑے تھے۔“

رافع خاموشی سے بیٹھ کر سننے پر مجبور تھا۔ عریشہ چابی لے کر باہر نکلی تو اس کی صورت دیکھ مسکرا دی۔

”نہیں رافع، ہائی لائٹ کا جیڑ جو کہ والا کیبنٹ انتظار کر رہا ہو گا۔ جلد ہی سے چلے جائیں۔“

”تھینک یو!“ وہ منونیت سے گویا ہوا۔

"میں جانے کے خیال سے اداس ہوں؟" وہ بچوں کی طرح پوچھنے لگا۔  
 "یقیناً کچھ بول نہ پائی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "تم بھی اداس ہو ایتھان؟" اس کے لہجے میں محبت کی گرمی جاگنے لگی تھی۔  
 "میں تو نہیں ہوں۔" وہ جان بوجھ کر ہنس دی تھی۔ "میں آنے والی جدائی کا سوچ کر قہریت کے لحوں کی خوشی نہیں کرتی۔ اور آنے والے ملن کی گھڑیوں کا سوچ کر وقتی جدائی کا دکھ بھول جاتی ہوں۔ آپ کی طرح قنوطی ہوں کیا؟"  
 "اچھا!" وہ بھی ہنسا۔ "اور وہ میرے فون سے مونے مونے آنسو کسی کے نکلنے تھے؟ بس کے لبوں پر ایک گراہٹ لانے کے لیے میں اپنی توانائیاں صرف کرتا تھا؟ میڈم رجائیت پسند!"  
 ایتھان شرارت سے ہنسنے لگی۔ وہ شخص اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی۔  
 "ارے وہ تو یونہی تمہیں یہ یقین دلانے کے لیے کہ تمہاری پیاری بیوی کسی قدر با وفا ہے۔ دن رات تمہاری انی میں آہیں بھر بھر کر ملک میں گرمی کی شدت کم کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔" عاشق کو ہنسی آگئی۔  
 "یعنی مجھ کو ملن بھی ہے۔ ٹوان دن!" اس نے سر ہلایا۔  
 پھر چند لمحوں میں وہ بخند ہو گیا۔  
 "شاید تمہیں احساس نہیں ہے ایتھان! اپنے ملک میں اپنے بچوں کے ساتھ اپنی چھت کے نیچے رہتی ہوئی رات ان جذبات و احساسات کا اندازہ نہیں لگا سکتی جو ایک رائے دہس میں پرانے لوگوں کے درمیان رہ کر بنوں کی یاد میں دن گننے والے مرد کے ہوتے ہیں۔ بہت مشکل ہے یا۔ بہت مشکل سخت قسم کی مزدوری کے گھر لوٹنے والے مرد کو بیوی کی کتنی ضرورت ہوتی ہے محض "وقتی جدائی" کے وہاں میں ڈوبی ہوئی عورت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔"  
 وہ بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔ ایتھان پیار سے اس کا ہاتھ ہٹلانے لگی۔  
 "تو پھر لوٹ آؤ۔ ہمیشہ کے لیے۔ یوں بھی تمہارا کانٹریکٹ تو دو سال کا تھا عاشریہ۔"  
 عاشریہ سے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایتھان کو اس کی نظریں سمجھ میں نہ آئیں۔  
 "کیا بات ہے عاشریہ؟"  
 "میرا ایک نئی کمپنی کے ساتھ چار سال کا کنٹریکٹ ہو گیا ہے ایتھان!" اس نے بتایا۔  
 ایتھان کو یوں لگا جیسے عاشریہ نے اسے خبر نہ سنائی ہو۔ زور سے دھکا دیا۔ وہ ہنسی ہوئی تھی پھر بھی اس نے خود کو کھڑا ہوا محسوس کیا۔ اس نے آنکھیں زور سے بند کیں پھر کھولیں۔ پھر بند کر لیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ سانس لینے کی کوشش۔  
 "ایتھان! عاشریہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔  
 "پلیز عاشریہ! کچھ مدت کہو!" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ پلیز کر رہی تھیں۔ جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔  
 "ایتھان! میری بات سنو!"  
 "کچھ نہیں سننا چھو۔ کچھ بھی نہیں۔" اس نے شہت سے آنکھیں میچ کر نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے تمہارے اپنے جتنے جتنے بغیر مجھ سے پوچھے بغیر نیا کانٹریکٹ سائن کر لیا؟ کچھ نہیں سوچا میرے بارے میں؟ کچھ بھی نہیں! کتنی آس سے کتنی امیدوں سے روزیاد رہ سکتی ہوں۔ سوچی ہوئی جدائی کا ایک دن گزر گیا۔ پھر ایک

تاریخ خالق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ ایسے بہ گھر پہنچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا تہنوی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگا تا ہے۔ غالبہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔  
 ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائیں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ترک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزر رہے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے بلیٹیں ہانپا اس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی تدریہ نہیں ہو جاتی ہے مگر ان کے اشتعال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔  
 ڈاکٹر شہلا اپنی ماں منیزہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔  
 پانچویں قسط  
 شہری شام اپنے خوبصورت پردوں کو آہستہ آہستہ بند کرتی جا رہی تھی۔ موسم میں خنکی اور ٹھنڈا کا احساس بڑھنے لگا۔  
 "چلیں اب؟" ایتھان بے برابر میں بیٹھے ہوئے عاشق کو دیکھا۔  
 "اوں ہوں!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔  
 دونوں نے ان سے قدرے فاصلے پر بیٹھے اب تک گھروندے بنا رہے تھے۔  
 "اس قدر حسین شام سے میں اتنی آسانی سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ اس کے ایک ایک لمحے سے لطف و مسرت کشید کر کے اپنے اندر بھر لینا چاہتا ہوں۔"  
 اس کے لہجے میں اضطراب سا تھا۔ ایتھان کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ دور اٹھتی ہوئی کمریوں پر نگاہ جمائے کھانچے کے کیا سوچ رہا تھا۔  
 "عاشریہ! اس نے نرمی سے پکارا۔  
 "ہوں!" اس نے نگاہوں کا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔  
 "کیا بات ہے۔ اچانک اداس کیوں ہو گئے؟"  
 "دیکھتی رہی ہر بات جھوٹ کیوں لگنے لگتی ہے ایتھان! دوست خوشی، مسرت، اپنا آپ۔ میں کہیں بیٹھے بیٹھے اچانک خلاؤں میں متعلق ہو جاتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جیسے مجھے کسی شے کی طلب ہو اور اس شے کا نام سمجھ میں نہ آئے جیسے میں کچھ جانتا چاہتا ہوں کچھ ایسا جس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں خوش ہوتے ہوئے اچانک اداس کیوں ہو جاتا ہوں؟ میں ایک ہنسنے والے شخص سے اچانک غائب ہو جاتا ہوں کیوں ایتھان؟ یہ کیسی کنفیوژن ہے؟"  
 ایتھان اداس سے مسکراؤں لگی۔  
 "اپنی کیفیات کو تم سمجھ نہیں پاتے عاشریہ! تم میرے ساتھ ہو اپنے بچوں کے ساتھ ہو بھڑوں طریقے سے یہ وقت انجانے کر رہے ہو لیکن تمہارا شعور کم نہ رہا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد تمہیں اس بھرپور خوبصورت منظر سے غائب ہو کر کہیں اور ظاہر ہونا ہے۔ تمہارا شعور نہیں خوش رہے رہا ہے اور لا شعور اداسی۔ اس کی ساری کنفیوژن ہے۔"  
 (38)

دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ حاکم چاند چلے آئے۔  
 "کیسی طبیعت ہے اب اس کی؟" مائیک نے لیٹے ہوئے نفسیہ حالہ سے مخاطب ہوئے۔  
 "نہی ہے! وہ بیماری سے بولیں۔" "قلینا ایکسٹرنل"۔  
 اگلا جملہ انہوں نے کمال مہارت سے یوں ادا کیا تھا کہ ان کے اپنے کانوں سے آگے نہ جانے پائے۔  
 "ڈاکٹر کو لایا؟"  
 "ہاں! تمہیں تو میاں! تمہارے ڈاکٹر کو۔ میں اس بچی کو قدر سزا دے دوں کہ ڈاکٹروں کے پیچھے دوڑتی پھوٹے آئے۔"  
 "اپنے کسی بیٹے کو کہا ہوتا۔ میں تو دکان سے ابھی لوٹا ہوں تو سمجھنے لگے خبر دی۔ خیر میں ڈاکٹر کو لے آتا ہوں۔"  
 پھر انہوں نے جبکہ کر ریبیجہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔  
 "اوہ! وہ ہے۔ جل رہی ہے! انہوں نے تشویش سے کہا۔ "میں ابھی ڈاکٹر کو لانا ہوں۔"  
 اسی لمحے ڈاکٹر ایک شخص کو لے کر اندر داخل ہوا۔  
 "السلام علیکم چچا جان! اس نے حاکم چچا کو دیکھ کر موربانہ انداز اپنایا۔  
 "ہوں! انہوں نے ناگواری سے شخص اشاری کہا۔ "یہ کون ہے؟"  
 "ڈاکٹر ہے۔ اے محلے کا ڈاکٹر تو چھٹی پر ہے۔ میں تو بڑے اسپتال سے لایا ہوں ڈاکٹر صاحب کس۔"  
 "بڑا تیر بار ہے! اب حاکم چچا زیر لب بڑبڑائے۔  
 ڈاکٹر ریبیجہ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے چند ایک سوالات کر کے وہ نسخہ لکھنے لگا۔  
 "کیا بات ہے ڈاکٹر؟" حاکم چچا پوچھنے لگے۔ "یہ بخار کیسی ہے؟"  
 "کچھ خاص وجہ نہیں۔ بظاہر اندرونی کمزوری اور ذہنی پریشانی کا نتیجہ معلوم ہو رہا ہے۔ یہ دوائیاں استعمال کروائیں۔ انشاء اللہ چند ایک روز میں آرام آجائے گا۔ خوراک کا دھیان رکھیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ کھانے پینے پر بالکل توجہ نہیں دیتے۔"  
 "بھلا جان! یہ بے چاری کیا توجہ دے۔ توجہ دینے والی تو اللہ بخشنے قبر میں جا لیٹی۔" نفسیہ حالہ نے مائیک نے اسے سہلایا۔  
 "ہم اس کا پورا خیال رکھیں گے۔" حاکم چچا نے ڈاکٹر سے نسخہ لے لیا۔  
 ڈاکٹر کی نہیں بھی انہوں نے ہی ادا کی تھی۔  
 آسمان سرسبز بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ صبحی ہوئی شام کا سماں بے حد خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ٹیرس پر بڑی آرام دہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔  
 اس پاس کے جنگلوں کی دیواروں اور ٹیرس کے جنگلوں کے لپٹی سرسبز بیلین نگاہوں کو تراوت بخش رہی تھیں۔  
 اکاد کا ٹیرس یا چھت پر بے ٹکری کے شعلی ہوئی خوش باش لڑکیاں بھی دکھائی پڑتی تھیں۔ ہر موسم کی مناسبت سے رنگین لباس زیب تن کئے ہاتھ میں چائے یا کافی کے مکے، تھامے، الہڑیے، قمری، بے پروا لڑکیاں جن کلین تیلیوں کی مانند لگ رہی تھیں۔ اندر کمرے میں انہیں اپنی پسند کا رنگا رنگ کپڑا لگا رہی تھی۔ نیو نور کی آواز سے اپنے اندر

ملنے والے دن کو گزارنے کے طریقے سوچتی ہوں۔ لیکن تم یہ سب کہاں سمجھ سکتے ہو۔ تمہارے نزدیک تو یہ سب کچھ محض "رومانس" ہے۔ حقیقت تو وہ ہے جس کا سامنا تم کرتے ہو پر کیا دیں، پرانے لوگ، تھکن سے چور مرد کی ضرورتیں۔ باقی سب کچھ "رومانس" ہے۔  
 "ایقان! ایقان! پلٹر" عاشر نے آگے زری سے تھا۔  
 "وہ خاموش ہو کر ہانپنے لگی۔ عاشر نے پاس پڑی بوتل سے گلاس بھر کر اسے تھمایا۔ ایک سی سانس بھی سارا پانی پی گئی۔  
 "میں نے اپنی خوشی سے یہ کانٹریکٹ سائن نہیں کیا ہے ایقان! بہت سوچا میں نے۔ بہت غور کیا اپنے بچوں کے لیے میں نے یہ قربانی دی ہے۔ ابھی یہ چھوٹے ہیں، ان کی ضروریات محدود ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ ہم اپنے "آج" کی قربانی دے کر اپنا "کل" محفوظ اور خوشحال بنالیں۔ کل کو ہمارے بچے بڑے ہو کر اگر اعلیٰ اور دنیا میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں نظریات نہ آگھیریں۔ ہم نے اپنی تیاری مکمل رکھی ہو۔ اگر چند ایک سال ایک دوسرے سے جدا کر دیتے کہ ساتھ محفوظ کر لیا جائے تو یہ نقصان کا سودا نہیں ہے ایقان! میں ایسی لیے تمہارے اپنی کیفیت کا ذکر کر رہا تھا کہ تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ صرف تم میری سہی کو محسوس کرتی ہو۔ یہ دوری مجھ پر اثر انداز نہیں ہوگی؟ میں تمہاری تمہارے جذبات کی بہت قدر کرتا ہوں۔"  
 "چار سال۔" اس کی آواز رندہ تھی۔  
 "میں آتا ہوں گا۔"  
 "دیکھتی بار آؤ گے؟ چار سالوں میں زیادہ سے زیادہ دوبارہ ملے۔ اس نے سر جھٹکا۔  
 "بس یہی چار سال ایقان! اتنی برامس۔ ہمارے بچوں کے اچھے مستقبل کی خاطر۔"  
 ایقان خاموش ہو گئی پھر اس کی گھبرا کر سراٹھایا۔  
 "بچے! بچے کہاں گئے؟"  
 "کچھ جھوٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ ایقان اس کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی۔  
 ایمان اور مومن کہتے ہوئے قدرے فاصلے پر چلے گئے تھے۔ وہ دونوں تقریباً "دوڑتے ہوئے ان تک پہنچے۔  
 ایقان ایمان کو اٹھالیا اور عاشر جھک کر بیٹے کا چروچو منے لگا۔  
 "آئے ہائے! بھلا بتاؤ!" مگر مندرسی نفسیہ حالہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "بے چاری بچی کو بیمار کر ڈالو۔ فکروں نے۔ میں تو جی بچی جتنی یاد دینا کرتی تھی اس کی بہت کو۔ ایسی دھان پان، باز کیے مزاج بچی اور حالات کی اتنی سختی یوں مردانگی سے جھیل گئی۔ مگر نتیجہ یہ بھی تھا آتی ہے! بھلا بتاؤ! ایک تو دادی کی ہے بے وقت موع سے بچی پریشان اور ادھ موٹی اس پر لاچ، کہنے لوگوں کی برکتی نظریں بھی جان کو چٹ گئیں۔ بچی بیمار نہ ہو تو اور ہوتا۔ اتنا تیز بخار بھلا بتاؤ!"  
 ریبیجہ نے ادھ کھلی آنکھوں سے ان کا پریشان چہرہ دیکھا۔  
 "اس کی آواز حد درجہ دھیمی تھی۔  
 "نفسیہ حالہ نے شاید اس کا جملہ ٹھیک سے سنا بھی نہیں۔  
 "اس کی آواز حد درجہ دھیمی تھی۔  
 "تو وہ ایوں کی اتنی سوچ بھی نہیں۔ کوئی ایسی سلسلی دو اٹھا کر دے دی تو بچی تو پہلے ہی اتنی کمزور ہے۔"  
 (40)



اردو.com scanned by Ha  
Dua  
اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔  
جگمگی ہم خوبصورت تھے۔  
کتابوں میں ایسی خوشبو کی مانند سانس ساکن تھی  
ہست سے ان کے لفظ آواز ہے تصویریں بناتے تھے  
برندوں کے پروں پر نظم لکھ کر  
آواز کی چیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے۔  
جو ہم سے دور تھے لیکن ہمارے پاس رہتے تھے۔  
شہلانے سرکرسی کی پشت سے نکال کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ریکارڈ اسے بھی بے حد پسند تھا۔ لیکن ہمیشہ اسے  
رلا دیتا تھا۔ نہ جانے انہی کو یہ ریکارڈ کیوں پسند تھا؟  
انہیں مانتے تھے کہ ہم کو تکیوں کے، جگنوؤں کے دیس جاتا ہے  
ہمیں رنگوں کے جگنوؤں روشنی کی قتلیمیں آواز دیتی ہیں  
گئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ کھڑکی سے بلاتی ہے۔  
انہیں مانتے تھے کہ ہم کو تکیوں کے، جگنوؤں کے دیس جاتا ہے  
ہمیں مانتے تھے کہ ہم کو تکیوں کے، جگنوؤں کے دیس جاتا ہے  
آنسو خاموشی سے اس کی آنکھ کے گوشوں سے بہہ رہے تھے۔  
کسی نے نرمی سے اس کے چہرہ صاف کیا تو وہ چونکا اٹھی۔  
”امی! آپ!“  
”شہلا! شہلا! پیچی! اینا دل یوں مت جلایا کرو۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے!“ منہ زہ بیگم کی آنکھیں بھی نم  
ہو گئیں۔  
وہ اداسی سے مسکرا دی۔  
”آپ کو پتا نہیں ہون امی! میرا دل نہیں جلتا۔ میں بہت زیادہ ریٹیکل ہوں۔ یہ تو بس یونیورسٹی ہے۔“  
”باسبان عقل کو تنہا چھوڑ دیا کرتا ہے۔ نا آتی!“ انہی کو ہال چلی آئی تھی۔ شہلانے اسے گھورا  
”تمہیں بھی کوئی اچھا دل کو بہلا لینے والا ریکارڈ نہیں ملتا۔“  
”جو ریکارڈوں سے دل کو بہلاتے ہیں وہ خود کو دھوکا دیتے ہیں۔ آپ کیا خود کو دھوکا دے رہی ہیں؟“  
”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ منہ زہ بیگم نے اسے جھاڑ پلا دی۔ ”سوچ سمجھ کر نہ کریں بولتیں۔“  
”میں تو خوب سوچ سمجھ کر بولتی ہوں امی!“ اس نے ماں کے گلے میں باہن ڈال دیں۔ ”بعض امراض کا علاج  
نشتر ہی ہوا کرتے ہیں۔ آخر کو میں بھی میڈیکل اسٹوڈنٹ ہوں۔ یہ اگر ڈاکٹر ہیں تو کیا ہوا والدہ کیا کہا ہے شام  
”صاحب نے بربادی دل جبر نہیں فیض کسی کا۔“  
”یہ کونسی نہیں مانے گی۔“ منہ زہ بیگم عاجز ہوئیں۔ ”میں چاہئے لے کر آتی ہوں۔“ ان کے جانے کے بعد  
انہی نے سنجیدگی سے بہن کا چہرہ دیکھا۔  
”امی! آپ ہمیشہ بہت مضبوط نظر آتی ہیں اور کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ یہ مضبوطی محض ظاہری ہے اندر  
”آپ آج بھی اتنی ہی کمزور ہیں۔“  
”شہلا! بھئی! امی! امی! امی!“

(42)

"جنتابہ کی دوست کی بڑی بہن مایون بیٹھ رہی ہیں اور ایک ہزار ایک مسئلے لکھ بیٹھے ہیں کہ ذرا جلدی سے ان کا  
 حل تلاش کیا جائے۔ ہفتہ بھر بعد شادی ہے موصوفہ کی لڑکی بیٹھی بیٹھی بٹھائے ہم پوٹیشن کے مقام پر فائز ہو سکتے ہیں اس لیے  
 رسالوں کا ذکر کر لیتے ہیں ان کی مدد کے لیے۔" ورنہ کوئی نالی۔  
 "مسئلہ کیا ہے؟" "عریشہ بھنائی۔" مسائل بلکہ مسائل کا انکار کیا ہے۔ ناخن بڑھتے نہیں پیسے بہت بڑھ گیا ہے۔  
 "حکمت کلا سے رات پہلے ہیں بال سفید ہیں۔" یہ لکھ لکھ کر کوئی چیز اپنے اور بچل کر میں دستیاب نہیں ہے۔  
 "بتاؤ یہ کیا لکھ کر لکھ رہے ہیں؟" "میں تو کہتا ہوں کہ شادی پھر بھی ہو رہی ہے۔" نئی نئی ہے بولا۔  
 "ہائیں ثانیہ نے اسے گھورا۔" یہ تم بڑے وقت کی مانند بغیر بتائے کیسے نازل ہوئے؟ مظلوم نہیں یہاں  
 "خواتین کے کچھ خاص مسائل ڈسکس کیے جا رہے ہیں۔" "تجارتی انٹری قطعاً" منظور ہے۔  
 "رہے۔" "میں کون سا تم سے" "سحر البیان" سنئے آیا تھا۔ "وہ چڑ گیا۔" "میں تو عریشہ لی لی کوای جان کا خاص پیغام  
 دینے آیا تھا جس میں انہوں نے اسے گدھے کے سینک قرار دیا ہے۔"  
 "اور تمہیں یقیناً گدھا قرار دیا ہو گا۔" "یہ کیا ہے عریشہ سے بولی۔  
 "جی نہیں۔" "وہ مزید چڑا۔" "میری امی نہ ہو میں تو ان کے جملے ارشادات تمہارے گوش گزار کرتا کہ تمہیں  
 علم ہو تاکہ وکسن عمل کو کیا کچھ قرار دیتی ہیں۔"  
 "ثانیہ اور سدرہ کے چروں کے تمام زانوئے بگڑے جبکہ درہ بننے لگی۔  
 "کیوں لگ گئی چپ؟" "وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔" "اور جیہ جو خواتین کے مسائل کا ذکر ہو رہا تھا انہیں تو میں  
 چیک کر رہی ہوں کہ ان کو لکھا ہوں۔ تم لوگ بے وجہ اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہو۔"  
 "کیوں؟" "آج چکر نہیں۔"  
 "نہیں یہ خطرہ جان لیں۔"  
 "وہ عریشہ کی سب زور سے اس دیں۔  
 "تم سب کیا کچھ کر رہی ہو؟" "میں سہاں میرا کوئی یا مددگار نہیں تو تم لوگ مجھ پر ہنس لو گی؟" "وہ اطمینان سے بولا۔" "یہ  
 ایسا ہی ہے جیسے بکریوں کے ریلوے میں شیر۔"  
 "چھما۔ تو پہلے تو ریسے ہوئے بیت کا اعلان کیا۔" "عریشہ نے مسئلہ نمبر ایک لکھا۔  
 "دیکھتے ہیں کیا ہوتا تو خود نہ کرنا اعلان۔" "سدرہ ہنس۔  
 "برص ہوئے ہیں کا اعلان ہے نا چلنا۔ گردن موڑ کر نا چلا کریں۔  
 "لڑکیوں کو ہنس آگئی۔  
 "اس کو بھگاؤ یہاں سے۔" "عریشہ بھنائی۔" "یہ ایسی ہی ہائے کے گا۔"  
 "بال سفید ہیں تو وہ لگاؤ۔" ہر قسم کی وگ بازار میں دستیاب ہے۔ رنگ کالا ہے تو فائز وڈیشن کا استعمال کرو۔ لو  
 جی اچکی بجائے ہر مسئلے کا حل موجود۔  
 "اس کی" "ہونے والی" کو بتانا یہ سارے کر۔" "ثانیہ نے عریشہ کو ہدایت کی۔" "رات کو جب وہ اپنی وگ اتار کر  
 ایک طرف رکھے گی اور منہ دھو کر داش روم سے نکلے گی چپ اسے اپنی حکمت کے فوائد کا پوری طرح آگاہ  
 ہو گا۔"  
 (45)

"انسان اگر پتھر میں فرق کرنا سیکھو گی!" پھر بولی۔ "نہاں یہ مکان کے احساس سے عاری انسان پس اپنی پتھر کی ہوتی ہے۔  
 انسان کے جذبات چاند کی طرح ہوتے ہیں سمندر کی طرح ہوتے ہیں۔"  
 "ایک بات سچ بتائیں آپ!" "ہاں۔" "موت پوچھنا؟" "بھاری ہے بولی۔  
 "بار بار اس لیے پوچھتی ہوں کہ اس مسئلے میں مجھے تختہ لاش کی کیفیت ورنہ لاحق ہے۔" "وہ چڑ گئی۔" "مگر آپ  
 کو حضرت یاد نہیں آتے تو تب تنہائی میں روکیوں پر پڑتی ہیں اور اگر یاد آتے ہیں تو۔"  
 "انفصاف" شہلا نے خفگی سے آگے دیکھا۔ "بس بہت ہو گیا۔" ختم کرو یہ فضول ٹاپک۔ میں نے کہا نا مجھے کوئی  
 یاد نہیں آتا۔ بس کبھی کبھی گزرے ہوئے وقت کا راز ایسا جاننا ملا دیتا ہے۔ کہ کاش میں نے اپنا اتنا وقت ضائع نہ  
 کیا ہوتا۔ تم کچھ اور نہ بھگا کرو۔ پلیرز! "انفصاف خاموش ہو گئی۔  
 "مما۔" "سفید شرٹ اور نیکر میں بلوس عمریکٹ ہلا تاجلا آیا۔  
 "مما کی جان!" شہلا نے آگے ہاتھوں میں بھڑک دیا۔  
 "وہ بھی" میں آج راجہ سے جیت گیا ہوں میں نے اسے ہر اوہ ہے۔ وہ پوائنٹس سے بچا ہے۔  
 "بے ایمانی بھی کرتا ہے پھر بھی ہار گیا۔"  
 "وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔" "انفصاف نے اس کا کان کھینچا۔  
 "آپ کے خیال میں بے ایمانی کرنے والے جیت جاتے ہیں۔" "چہ خوب۔"  
 "وہ بیٹھ کر ایمانی سے جیتتا ہے خالہ جانی!"  
 "تو وہ جیت ہوتی ہی نہیں!" شہلا نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھڑک دیا۔ "وہ جیت تو ہمیشہ سچائی سے مشروط ہوتی ہے۔  
 میرے چاند!"  
 "آج آپ ضرور اس کو بھڑک کر چھوڑیں گی۔" "آپ آپ بھول جاتی ہیں اور یہ جناب کی سولی سولی باتیں ہیں فیڈ  
 کرتے ہیں۔"  
 "انفصاف ہنس دی اور شہلا کو بھی ہنس آگئی۔  
 "تینوں مڑخکے زور و شور سے اظہار خیال کر رہی تھیں۔  
 "عذرا ٹیکم نے یونہی دروازے سے جھانکا۔  
 "یہ تم تینوں ایسی کون سی سینک کر رہی ہو؟" "بہرورہ بیٹھی ہے۔"  
 "وہ زور سے آئی کو بھی اندر بھیج دیں۔" "موصوفہ نے انداز میں جواب دیا گیا۔  
 "تم ساری کی ساری مایوں بیٹھ گئی ہو کیا؟" "نہیں غصہ آیا۔"  
 "ارے امی جی! جس نے مایوں بیٹھنا ہے اس کی مشکل کا حل دھونڈ رہے ہیں۔"  
 "میں کو مشکل آن پڑی ہے۔" "میں کو بھی دیکھو۔" "وہ اندر چلی آئی تھی۔" "یہ اتنے رسالوں کا ذکر کر لے جیج  
 کیا ہوا ہے۔ ضرور کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔"  
 "یہ سدرہ کی بیٹی ہے۔ روزنت نے مسئلے لے آئے۔" "میں نے اسے لے آئی تھی۔" "یہ اتنے رسالوں کا ذکر کر لے جیج  
 ثانیہ نے دانت کچکا۔  
 "ہوا کیا؟" "وہ قریب بیٹھ گئی۔  
 (46)

دو بیٹے سخت خفا تھیں۔  
 "اگر وہ بچوں میں شرم نہ پائی۔ بچوں دیکھو نو جوان تھے۔ ایک خالی۔ مانگے گھر والی بھلا جاؤ!"  
 بدر کو ماں کی بڑی کھٹ سے ملحق رہی تھی نہ پروا۔ وہ بچہ گنگناہتے ہوئے نشی نظروں سے بار بار ان کی طرف دیکھتا تھا۔  
 ربیعہ کو سمجھ سے اس کے تغلق خاص کا علم تھا پھر بھی اسے بدر کے وہاں آئیٹھنے سے کوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ چائے کا خال تک رکھنے کے بجائے وہاں سے اٹھ کر فقیر خال کے پاس بچن میں چلی آئی۔  
 "ارے بیٹی! تم کیوں نہ نہیں۔ چکر نہ آجائے۔ جسم میں ابھی نقاش ہے۔ کچھ خیال کرو۔"  
 "کچھ نہیں ہو خالہ!" وہ مسکرا دی۔ "دیکھئے، دیکھئے بھی اکٹائی ہوں۔"  
 وہاں کے پاس بڑی پیڑھی پر بیٹھ کر جوئے میں ابھرتے آگ کے شعلوں کو دیکھنے لگی۔  
 "تمنا ہے کہ اپنی اہلیہ چاہے پانی کا خرچہ بھی تمہارے سر پر ڈال دے" وہ چائے بنانے پر شرمندہ تھیں۔  
 "خالہ! ربیعہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ اتنے دن سے بے لوث خدمت کر رہی ہیں میری۔ مجھ پر آپ کا اتنا بھی حق نہیں۔"  
 "میں نے کیا کیا بیٹی۔ بھلا بتاؤ۔"  
 وہ شرمندہ سی ہنسی نہں کر چائے کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ ریتخیز خیالات کے دھارے کے ساتھ ساتھ بے جاہر صحن میں بدر سمجھ کے قریب جا بیٹھا تھا۔  
 "ارے بھئی! رات سے رات سے ارے عذرا! کہاں ہو۔" فردوس بیگم ہانپی کا ہنسی اور ادھر ادھر دلتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ سارے گھر اہٹ کے انہیں تخت پر بیٹھی بیچ کرٹی ہوئی ساس بھی نظر نہ آئی۔  
 "حقیقتہً حیات نے جلدی جلدی ہتھیلیاں لپٹے پر پھیریں۔"  
 "ارے فردوس! کیا ہوا ہے؟ خیریت تو ہے؟"  
 اتنی دیر میں عذرا بیگم بھی بے جاہٹ اندر سے برآمد ہو گئیں۔ رات بھی اتفاق سے اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ تالی کی خبر لائی ہوئی آواز سن کر اپنے کمرے سے نکل کر پیڑھیوں پر آکھڑا ہوا۔  
 "اے بیٹی! کیا ہوا؟"  
 "ارے رات سے میرے بچے جلدی آؤ۔ ہاشم کو اسپتال لے کر جانا ہے۔"  
 "ہاشم! وہ عذر دہیز عیال کا تر تیا چلا آیا۔"  
 "کیا ہوا، کیسے ہوا؟"  
 ہر طرف سے سوالات برسنے لگے تھے۔ فردوس بیگم آنسو پونچھنے لگیں۔  
 "سو سنا سنا ہے کہ گھر گیا، مانتا پھٹ گیا ہے۔ بھل بھل خون بہہ رہا ہے جلدی چلو۔"  
 وہ سب کے سب نہایت تیز رفتاری سے باہر کی جانب بڑھے تھے۔ رات سب نے آگے تھا۔ تقریباً دوڑتے ہوئے اس نے دونوں پور شتوں کا درمیانی فاصلہ طے کیا۔ ہاتھ مار کر اس نے مرکزی لاؤنج کا دروازہ کھولا اور تیزی سے اندر داخل ہوا۔  
 ماتھے پر برف کی گور کر رہتے ہاشم کو دیکھ کر اس نے بے اختیار سکون کا سانس لیا تھا۔ تھے ہوئے اعصاب یکدم

ہوئے۔ "اگر وہ بچے صدمے جاواں!" اس نے پورے دانتوں کی نمائش کی۔ "کیا ذکر چھیڑا ہے۔ بل خوش کر دیا ہے میری ہونے والی" جسے ہو جائے گی تب تم لوگ جل جل کر راکھ ہونا اور اس راکھ سے پیلے مانجھنا۔ ارے وہ تو ایسی ہوگی۔ ایسی ہوگی۔ کیسی ہوگی؟" پھر وہ دروہ سے پوچھنے لگا۔  
 "لوگ پس فاؤنڈیشن سے۔" جواب کہیں اور سے آیا۔  
 "ہو نہ ہو۔ جل جل کر تم لوگ اور کالی ہو جانا۔"  
 "چھا بھئی! تم جاؤ یہاں سے۔"  
 لڑکیوں نے اسے بہت مشکوں سے بھر نکالا تھا۔ پھر وہ سر جوڑ کر دوبارہ مسائل کا حل لکھنے بیٹھ گئیں۔  
 "رات کو سوتے وقت ناخنوں پر لسن کے جوئے ملیں۔" عرشہ لکھنے لگی پھر اس نے عین ایک طرف رکھ دیا۔  
 "سارے کام اس نے چاری کورات کو ہی کرنے ہیں۔ ناخنوں پر وہ لسن مل لے گی چہرے اور گردن پر لکھو گی بالائی سے مساج کرتے گی، بالوں میں تیل آکر سر کی مالش کر لے گی۔ تو رات کیا نکلے گا؟"  
 "دو بار دسرے کرے میں سوئے گا۔" نانیہ نے سوچ کر دہرائے جواب دیا۔  
 "ہاں! پائے! پھر یہ سب کچھ کرنے کا ناندہ؟"  
 وہ بے چارگی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگیں۔  
 اس کی طبیعت کافی بہتر ہو چلی تھی۔ نفسہ خالہ اور سمجھ نے اس کی ہر طرح سے دل جوئی کی مٹتی اور اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔  
 اس وقت بھی وہ دونوں اس کے پاس موجود تھیں۔ نفسہ خالہ اس کے لیے کچھ بڑی بہاری تھیں جبکہ سمجھ اپنے اور اس کے لیے چائے بنا لاتی تھی۔  
 "دونوں چائے کے مک تھامے اور ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں جب دروازہ بجا۔"  
 "ماں! آجائیں؟" بدر کی آواز آئی۔ پھر وہ جواب کا انتظار کے بغیر اندر چلا آیا۔  
 سمجھ کے چہرے پر ایک محسوس کی جانے والی تازگی اور شرمیلیں مسکراہٹ اچھپنے لگی۔  
 "نفسہ خالہ سوالیہ نظروں سے بیٹے کا چہرہ دیکھنے لگیں۔  
 "دیکھئے؟ وہاں کو اپنا آپ تو لیا ہوا محسوس کر کے کچھ جھل سا ہوا ہے؟" ماں۔ گھر پر کچھ پکایا نہیں کیا؟ مجھے بھوک لگی ہے۔"  
 "تو نے! میں نے یہاں تو تندور لگایا نہیں۔ گھر آکر ہی پکاؤں گی روٹی۔ ابھی شام کے چھ بجے ہیں اور تجھے بھوک بھی لگ گئی سچ کہتے ہیں فراغت میں لڑکے کو روٹیوں کے خیال ہی آتے ہیں۔" وہ جڑ بڑھوا۔  
 "تو رتے بھارتیہاں اب یہاں کچھ کھانے کو ہے؟" وہ لڑکیوں کے منہ میں درگت بننے پر چڑ گیا۔  
 سمجھ منہ دبانے نہیں دیتی تھی۔ ربیعہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔  
 "جی ہاں! کچھ کھانے کو نہیں ہے تو چل کر لے آؤ۔ ابھی آخر اس کی ماں تھیں۔"  
 "چھا! میں نے سر کھا کر ادھر ادھر کھا۔ ایک تڑپری نگاہ ان دونوں پر بھی ڈالی۔  
 "پھر ایسا کر کے چائے ہی پلاؤ۔" وہ گونے میں رکھے مٹکے پر جانا بیٹھا۔  
 سمجھ پھر ہنسی سے بے حال ہونے لگی جبکہ ربیعہ بخجیدگی سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔  
 نفسہ خالہ مجبوراً چائے بنانے لگیں۔ لیکن زیر لب ہندوئی بھی جاری تھیں۔ جوان لڑکیوں کے مقابل آئیٹھنے پر

ڈھیلے ہوئے تھے۔ صورتحال اتنی خطرناک نہیں تھی جتنا کہ اس کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔  
 ”کیا ہوا یا ر! ڈرا دیا چچی نے تو۔“  
 ”کیا کئی بات نہیں۔۔۔ اپنی روڈ کے کارز پر تھا۔ ایک بچی سامنے آگئی بائیک سلف ہو گئی۔“ رافع قریب  
 جا کر اس کا زخم دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں باقی افراد بھی چلے آئے۔  
 ہاشم بھی سوالات کے بہاؤ کی زد میں آگیا۔  
 رافع نے اس کے ماتھے پر وقفے وقفے سے ابھرتے والے خون کی بوندوں کو دیکھا۔ اس کی کہنی پر بھی اچھا بھلا زخم  
 آیا تھا۔ پینٹ کا پانچواں اس نے موڑا ہوا تھا۔ ٹانگ پر پڑی خراشیں بھی نظر آرہی تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر پیچھے سے اڑ  
 اور کسی کی نگاہ میں آئے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔  
 ”دادی جان! میں ٹھیک ہوں مجھے کچھ نہیں ہوا۔“ ہاشم شفیقہ حیات کے تفکرات سے اظہار کے جواب میں  
 ”ارے لہجے! نا تھا بیٹ گیا ہے اور تم کہہ رہے ہو کچھ نہیں ہوا! میں کہتی ہوں اسپتال جاؤ۔ کوئی ایک  
 لگواؤ۔ ماتھے کی مرہم پی کر آؤ۔ ان چوٹیوں کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔“ ہاشم ہنسنے لگا۔  
 ”یاری دادی! کیوں فکر کرتی ہیں۔۔۔“  
 ”ڈھیک تو کہتی ہیں۔“ فردوس بیگم بھی خفگی سے بولیں۔ ”درد کی کہنی دیکھو اپنی۔ کیسی سو جن ہو رہی ہے۔ رافع  
 تم اسے لے کر جاؤ۔“  
 وہ مڑیں پھر حیران رہ گئیں۔  
 ”دیکھو! یہ کہاں رفو چکر ہو گیا۔“ انہیں سخت تاؤ آیا۔ ”وہ لگے بھی رہا ہے بچے کی حالت پھر بھی بنا پوتھے کچھ  
 کھسک لیا۔ دیکھو آج کل کے لڑکوں کا احساس ذمہ داری۔“  
 ”صبر کرو ہوا اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔ کسی کام سے ہی گیا ہو گا۔“ شفیقہ حیات نے انہیں تسلی دے کر ٹھنڈا  
 عذرا بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے جذبات قابو میں کیے۔  
 اسی لمحے لاؤنج گاؤر دروازہ کھول کر رافع اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ سبھی اس کا  
 جانب متوجہ ہو گئے۔ اس کے پیچھے شہلاہ حسن علی تھی۔ اس نے وہاں آدھ اور آل پہنا ہوا تھا۔ گلے میں اسٹیکو  
 تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی ڈیوٹی کے لیے لوٹی۔  
 ”السلام علیکم۔“ اس نے ہلکے بھلکے انداز میں سب کو سلام کیا۔  
 یہ گھر اور اس گھر کے سیکین اس کے لیے کبھی بھی اجنبی نہ رہے تھے۔ بچپن سے وہ یہاں آتی جاتی رہی تھی۔  
 ایقان سے اس کی دانت کالے کی دوستی رہی تھی۔  
 سب ہی نے اس کے سلام کا پر جوش و پر خلوص جواب دیا تھا۔ سوائے فردوس بیگم کے۔ جن کے ماتھے پر  
 شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ آنکھوں میں محسوس کیے جانے والا شکر و کرم آیا تھا۔ مارے غصے کے ان کا سانس  
 پھولنے لگا۔  
 ”کیا ہو گیا آپ کو؟“ شہلاہ ہاشم سے پوچھنے لگی۔  
 ”میرے انداز میں وہ اپنا فرسٹ ایڈ باکس بھی کھولنے لگی۔  
 ہاشم خواب کے لیے عالم میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے شہلا کی جانب بھٹکی اس وقت دیکھا تھا جب وہ دروازہ کھول  
 (48)



شام کرتے ہیں کہ کوئی آکر اپنی خیریت دے جائے اور ہمیں پوچھ جائے۔ "وہ مسکرائی۔  
 "جہاں میں چلتی ہوں۔" اس نے فرسٹ ایڈ باکس اٹھانا چاہا۔  
 رافع نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے باکس تمام لیا۔  
 "میں آپ کو گھر تک پہنچاؤں گا۔" وہ مسکرائی۔  
 "میں ایک اور رافع! اچھا جی اللہ حافظ۔"  
 "اللہ حافظ۔" کسی پیاری بچی ہے اور بے چارگی کا نصیب۔ "حقیقہ حیات نے اس کے نکلنے کے بعد کہا۔  
 ہاشم کنگلی باندھے اس دروازے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے وہ نکل کر گئی تھی۔  
 صحن میں بکھرے ہوئے ہار سنگھار کے پتے اور میر جھائے ہوئے پھول اکٹھے کر کے اس نے ڈسٹ بن میں  
 ڈالے اور پانی پک کر کھاری میں گئے ہوئے پودوں کو پانی دیئے گئے۔  
 کئی دن کی بیماری کے بعد آج وہ خود کو بہت فریش اور توانا محسوس کر رہی تھی۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے کام  
 نمناتے ہوئے اسے عجب لطف محسوس ہو رہا تھا۔  
 "موتو ہم بھی بے حد خوشگوار ہو چلا تھا۔ گرمی کے شانے آمار خشک، تازہ ہواؤں نے تقریباً "ختم ہو کر ڈالے  
 تھے اس کا موڈ اچھا تھا۔ ہولے ہولے گنگناتے ہوئے وقت کی ہر سختی کو وقتی طور پر فراموش کیے وہ اپنے کام میں  
 منہمک تھی جب دھیرے سے دروازہ کھلا۔  
 رشیہ چونک اٹھی۔ شام کا وقت تھا۔ "اس وقت معصومہ اپنے گھر کا تمام کام نمنائے کر آیا کرتی تھی۔ اس  
 نے اپنے جوتے دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دھک سے بیٹھ گئی۔  
 باہر عرفان شوکت کچھ اٹھایا وہ اپنے مخصوص حیلے میں تھا۔ سفید کلفنگ کا سوٹ اور گلے میں سرخ رومال سیاہ  
 بال نہایت سلیقے سے جمائے ہوئے تھے اور آنکھوں میں وہی چمک تھی جو کسی خوشخوار بھتیجیہ کی آنکھوں میں  
 رہتی تھی۔ رشیہ نے غیر معمولی انداز میں دھڑکنے شروع کر دیا۔  
 "مگر رانی! اتھوڑا سا وقت تو کی نہیں؟" وہ بے حد اپنا نیت سے بولا۔  
 رشیہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ قدرت بتاتی ہے۔ پھرے ہوئے سمندر میں پھینک دیا تھا اور وہ تیرنا نہ جانتی  
 تھی۔ بہت اور جو صلہ اس کا واحد سہارا تھا جسے کی تمنا اس کا واحد ہتھیار۔  
 وہ چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے دروازہ کھولا۔  
 "تشریف لائیے۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔  
 عرفان شوکت کو شاید اس قدر آسانی کی امید نہ تھی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔  
 "بھئیے۔" اس نے صحن کے بیچوں بیچ پہنچی ہوئی چارپائی کی طرف اشارہ کیا اور خود کو نے میں پڑا موڑھالے  
 آئی۔  
 "جی فرمائیے۔" اس نے اپنے انداز میں بے حد جے گا لگی سمو کر پوچھا۔  
 "کچھوٹی بات میرے لیے بیٹیوں جیسی ہو اسی لیے میں بنا کسی تکلف کے پھر چلا آیا ہوں۔" اس نے تلمیذی

"مگر میرا یہ کونسی تھی۔ اس کے بعد اس کی نگاہیں قائلین پر پڑیں۔ "اللہ ری تھیں۔ وہ بالکل خالی تھی۔  
 کی سرسری سی بات کا اس نے کوئی جواب ہی نہ دیا تھا۔  
 "مگر یہاں چاہیے۔" شگلا نے اس کے ماتھے پر گے زخم کا جائزہ لیا۔ "میں صغالی کر کے  
 "میں جینڈنگ کر دیتی ہوں۔" حفاظت کا ٹیکہ بھی لگا دو بیٹی! حقیقہ حیات بولیں۔ "ایسی چوٹوں کو معمولی نہیں سمجھ  
 چاہیے۔" شگلا مسکرائی۔  
 "ارے اماں! آپ تو آدمی ڈاکٹر لکھیں۔ میں ٹیکہ بھی لگاؤں گی۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔"  
 عذرا بیگم ایک پناہ لے کر آئیں۔ شگلا ہاشم کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔  
 رافع نے ہاشم کا زور جائزہ لیا پھر مسکراہٹ کی بے ساختہ پھونکنے والی دھار کو روک نہ سکا۔ وہ کسی غی فولی دلس  
 کی مانند گویا سانس بھی روکے بیٹھا تھا۔ جیسے وہ اسی حرکت اس کے خواب کو توڑ دیتی ہے اس کے برابر بیٹھی  
 اس کے جذبات و احساسات سے قطعاً "عائلہ" وہ پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ اس کی جینڈنگ کر رہی تھی۔  
 کی جینڈنگ کے بعد وہ اس کے گہنی پر آئے زخم صاف کرنے لگی پھر ٹیکہ اس نے مسکرائی۔  
 "آپ اتنے ٹیکس کیوں ہو رہے ہیں۔ سوؤنٹ وری یہ تو بالکل معمولی سے زخم ہیں۔ اتنا سیریس نہ لیں۔ پلینز۔"  
 پہلی مرتبہ ہاشم کے انداز میں قدرے ڈھیلا پن نمایاں ہوا۔ اس نے مسکرائے کی کوشش بھی کرنا چاہی۔  
 "میں ٹیکس تو نہیں ہوں۔"  
 "لگ رہے ہیں۔" وہ اس کے بالکل قریب بیٹھی اس کے زخموں پر دالگاری کی۔  
 "یہ جو ہیں وہ نہ لگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" رافع بڑھتے بولا تھا۔  
 ہاشم کو چپٹی ہانگی۔ شگلا نے بھی مسکرا کر بالکل نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔  
 فردوس بیگم بھٹا کر اچھٹی اور وہاں سے واک آؤٹ کر گئیں۔ حقیقہ حیات اور عذرا بیگم ہر مات سے ناواقف  
 آرام سے بیٹھی اس کی کارروائی ملاحظہ کر رہی تھیں۔ کسی نے بھی فردوس بیگم کے موڈ کو محسوس نہ کیا تھا۔ "ماسوائے  
 ہاشم اور رافع کے۔"  
 "اچھا جی! آپ اپنا کام ختم کر کے کھڑی ہوئی۔" "اب مجھے اجازت ہے؟"  
 "ارے بیٹی! کوئی چائے پانی تو پیتی جاؤ۔" حقیقہ حیات کو خیال آیا تھا۔ "ہم نے تو تمہیں بالکل ہی ڈاکٹر سمجھا  
 "میں تو نہیں اماں! چائے پر تو امی اور انقہ میرا رستہ دیکھتی ہوں گی۔ میں ابھی ہاسپٹل سے لوٹی ہی تھی۔ رافع مجھے  
 دروازے پر ہی مل گئے تھیں۔ تو امی کو بتایا تک نہیں۔"  
 "پھر بھی بیٹی! یوں اچھا نہیں لگتا۔ حقیقہ حیات کو شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ نہیں ہماری وجہ سے زحمت ہو  
 "مگر اگر ہم نے تمہیں پانی تک نہیں پلایا۔" وہ کوئی توجہ  
 "تو تمہیں کیسی اماں! وہ حیرانی سے بولی۔" "آپ سب تو میرے بیٹے ہیں۔ بھول گئیں میں اور ایتنا  
 رر سارا دن آپ کو ٹیکہ کرواتے تھے۔" شگلا مسکرائی۔  
 "جی رہو۔ تم بھی میرے لیے ایقان جیسی ہو۔ آئی جاتی رہا کہ بیٹی! ہم بوڑھے لوگ تو اسی آس میں صبح



ایقان نے بے ساختہ انداز میں اسے گھوڑا۔ مبادا وہ اس کا راز فاش کر دے۔  
 "خالی کی خبر دیجئے۔" علی نے اپنا کان اس کے قریب کیا۔ ایقان نے اس کا دھڑکنے والا منہ دیکھ کر اسے اپنی جانب کیا۔  
 "حال کے بچے۔۔۔ نہیں گاتے۔ کاتجس ہے؟ مجھ سے ڈائریکٹ پوچھ لو۔"  
 "ارے آپ آدھے پونے انچ کی ڈنڈی ضرور پاریں گی۔"  
 "ڈرائیو سے ریسٹ۔۔۔" عاشر بھی ہنسنے لگا تھا۔ "وہی ایقان کا ایراد ہے کہ تمہاری برأت میں یہ اپنا ویڈیو ڈنڈی سے لے کر لیں گے۔ کیوں ایقان؟"  
 "آپ کم ہیں ان مسخوں سے۔ وہ جل کر وہاں سے اٹھ ہی گئی۔"  
 "میں ذرا باجی سے مل کر آتی ہوں۔" وہ عاشر کو نشانہ کرتے ہوئے کہتی تھی۔  
 اس وقت وہ لوگ سبوح حسن اور عذرا بیگم کے پورشن میں تھے۔ شفیقہ حیات اپنے چھوٹے بیٹے سبوح حسن کے ہمراہ رہتی تھیں۔ بڑی بیوی سے ان کی کچھ خاص نہ بنتی تھی۔  
 وہ اپنے دھیان میں درمیانی لان عبور کر رہی تھی۔ سامنے سے آتے اختر میان کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اگرچہ اب وہ ایک خود اعتماد عورت تھی پھر بھی برسوں پرانا ایک واقعہ اس کے "اند" کو چھیڑ گیا۔ وہ نگاہیں اچڑا کر گزرتی تھی۔  
 "سلام عرض کرتے ہیں آپ کی خدمت میں۔"  
 "جیتے رہے۔" وہ طنزاً بولی۔  
 "آپ کی بد دعا تو نہ دیں ایقان بیگم!"  
 وہ ذرا کی ذرا رک کر آگے بڑھنے کو تھی کہ یکدم پلٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔  
 "اپنی ہڈ حرامی کا کریڈٹ کیوں خواہ مخواہ کسی بے قصور کے سر ڈالتے ہیں اختر میان! کسی دھندے سے لگیے۔"  
 جب تک سنی ہی رہے ہیں تب تک تو جینے کا عملی ثبوت پیش کیجئے۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔  
 خود نمائی تو نہیں۔۔۔ شادی ارباب وفا  
 جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں  
 کھٹ کھٹ کرتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔  
 "ہائے!" اختر میان وہیں گھاس پر دھب سے بیٹھ گئی تھیں۔ "تجھے کیا خبر ظالم! ہم چراغوں کی طرح شام کے جل جاتے ہیں۔۔۔ ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں۔ ہم چراغوں کی طرح۔۔۔ ہم چراغوں کی طرح۔"  
 وہ دیوانوں کی مانند سر ہلاتے جا رہی تھیں۔  
 ڈبل ڈوبلی ننھا کر وہ بے حد تھکی ہوئی لوٹی تھی۔  
 گاڑی لاک کر کے وہ اندر کی جانب بڑھنے لگی۔ جب اس کی نگاہ لان میں بیٹھی انیقا اور اس کی دوست پر پڑی۔  
 وہ اس کے سلام دعا کرنے کی غرض سے لاک میں چلی آئی۔  
 "کیسی ہو ارم؟" انیقا نے پوچھا۔  
 "ایک دم فرسٹ کلاس۔ آپ سنا ہے بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔"  
 (54)





کچن میں رکھے چند ایک گندے برتن دعو کر اس نے جگہوں پر رکھے پھر کچن کا دروازہ بند کر کے صحن میں چلی  
 دوپٹے کو کھول کر وہ صحیح طرح سے اوڑھ رہی تھی جب دروازہ بجا۔  
 "اس وقت کون آیا؟" اسے الجھن ہوئی۔  
 "کون ہے؟" آگے برہ کر اس نے پوچھا تھا۔  
 "بدر!" مختصر جواب آیا۔  
 ربیعہ نے دروازہ کھول دیا۔ باہر بدر کھڑا چوروں کی مانند اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔  
 "کیا بات ہے؟" اس نے شکے مانتے پر شکنیں پڑ گئیں۔  
 "وہ۔۔۔ ذرا سی بات کرنا تھی۔ میں اندر آ جاؤں؟"  
 ربیعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اکثر اسے بدر کے محبت نامے سمعیہ تک پہنچانے پڑتے تھے۔ یہ کام اسے  
 سخت ناپسند تھا پھر بھی وہ بحالت مجبوری از حد کراہیت سے یہ کام کیا کرتی۔ اصل میں اسے بدر ہی ناپسند تھا لیکن  
 اپنی بچپن کی دوست کو یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیے خفا کر دینے کی ہمت اس میں نہ تھی۔  
 "ہاں" کہو کیا بات ہے۔" ربیعہ نے اس کے اندر آ جانے کا رستہ تو دے دیا لیکن وہ چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد وہاں  
 سے چلا جائے۔  
 "وہ۔۔۔ بات کرنا تھی۔" اس نے دانت نکالے۔  
 "ہاں تو کرو۔ کیا کہنا ہے سمعیہ؟ میں وہیں جا رہی ہوں۔"  
 "نہیں۔۔۔ سمعیہ سے میں بھلا کیا بات کروں گا۔ مجھے تو تم سے بات کرنی ہے۔" اس کے دانت اندر دھکے جاتے  
 "مجھ سے؟" ربیعہ کو حیرانی ہوئی۔ "چھا کہو۔"  
 "وہ۔۔۔ تم ناراض تو نہیں ہوگی؟"  
 "جی جی" ربیعہ کو سخت الجھن ہوئی۔ "دیکھو بدر! مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔"  
 "وہ۔۔۔ کچھ عرصہ پہلے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔" ربیعہ نے اس سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا اور ربیعہ نے انہیں صاف انکار بھی کر دیا تھا۔  
 "اوہ!" ربیعہ پر منوں اُونک پڑ گئی۔  
 نفیسہ خالہ نے اس سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا اور ربیعہ نے انہیں صاف انکار بھی کر دیا تھا۔  
 "وہ۔۔۔ کچھ عرصہ پہلے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔" ربیعہ نے اس سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا اور ربیعہ نے انہیں صاف انکار بھی کر دیا تھا۔  
 منع بھی کر دیا تھا۔ تم اس بات کی فکر مت۔"  
 "لیکن تم نے کیوں منع کیا؟" اس کی بات اس کے لبوں میں ہی رہ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔  
 "میں کیا تمہیں برا لگتا ہوں ربیعہ؟ تم تو تمہیں مجھے بہت پیاری لگتی ہو بہت زیادہ۔ وہ سمعیہ چڑیل تو  
 زبردستی میرے گلے پڑ رہی ہے۔ لیکن مانو مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ تم اماں کو ہاں کہہ دو میں تو تم سے شادی  
 کرنا چاہتا ہوں۔"  
 ربیعہ آنکھیں پھاڑے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی بدر تھا جس کے طویل ترین محبت نامے سمعیہ اسے  
 زبردستی سنایا کرتی تھی جن میں اپنی محبت کی سچائی کا ثبوت پیش کرنے کے لیے وہ ہر طرح کی قسم اٹھانے کو تیار رہا  
 رہ کر رہا تھا۔ "کو تو نارہم ربیعہ! میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟"  
 "دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔  
 (باقی آئندہ ماہ)  
 58

تلخ حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھرنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا بہنوئی عرب شہرت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔  
 زینہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرا میں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے انیس کوئی گھڑی ہو جس کے پٹ وا کر کے وہ اپنے اندر کے جس کو کم کر سکے۔  
 دادی کے ٹرنک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شباب محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ جلیقں بانو اس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔  
 ڈاکٹر شہلا اپنی ماں معنیذہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

### چھٹی قسط

”سایا بنا گھر سونا... سیاں بنا گھر سونا...“  
 مغنیہ کی آواز سی ڈی پلیئر سے نکل کر پورے گھر میں پھیل رہی تھی۔ وہ بیڈ پر آنکھیں بند کر چکی تھی۔  
 گھر واقعی بے حد سونا معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چند کہ وہاں محض ایک شخص کی کمی ہوئی تھی۔ کل شام کی ملازمت سے واپس گیا تھا اور ایقان کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ آیا ہی نہ تھا۔ جیسے اس نے اپنے گھر کو آنکھ لگ جانے پر کوئی خواب دیکھا تھا۔ آنکھ کھلنے پر سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔ سونا گھر سونا دل خالی گھر خالی آنکھیں۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر درختے میں آکھڑی ہوئی۔ نیچے سڑک پر ٹرنک رواں دواں تھا۔ لوگوں سے بھری ہوئی دیکھیں، بیسیں گاڑیاں۔ رات کی آبر کا اعلان ہوتے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں کو بھاگ رہے تھے۔ سب ہی کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ سب کے گھروں میں ان کی بیوی بچے منتظر تھے۔ وہ وہیں کھڑی بے مقصد ہی سوچنے لگی۔  
 کام کاج سے فارغ ہو کر نہائی دھوئی صاف ستھری عورتیں ہر گھوڑی دیر بعد چونک کر گھڑی کی سمت دیکھتی ہوں گی۔ میاں لگے بندھے نام پر گھر لوٹا ہو تو منٹ منٹ کا بھی حساب ہوتا ہے اور کچھ نہیں تو چھوٹا بچہ ہی پوچھ لیتا ہے۔

### PICTO

”پہا ابھی تک نہیں آئے؟“  
 مخصوص وقت ہوتے ہی بج اٹھنے والی نیل یا انتظار کے تناؤ کو سمجھتی ہادی کی آواز سننے لگتی ہوئی۔  
 ”آنسو یوں نہ بہاؤ۔ یہ موتی نہ لٹاؤ۔“ سی ڈی پلیئر پر مغنیہ کی آواز ابھری تو وہ چونک اٹھی تھی۔  
 ”رکتا نہیں ہے وقت کا دھارا اس پل پل بدے جیون پیارا۔“  
 اس نے پلیئر آف کر دیا۔  
 وقت کا دھارا واقعی نہیں رکتا لیکن کبھی کبھی بہتا ہو اپنی بھی ساکت لگتا ہے۔ بہاؤ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ گھڑی کی سوئیاں چلتی رہتی ہیں مگر وقت جیسے ایک جگہ رکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ انتظار کی جان لیوا کیفیت کو وہی جان سکتا ہے جو اس کیفیت سے گزرتا ہے۔  
 ”میں نے چار سال کا کاسٹریکٹ کر لیا ہے۔“  
 ”چار سال!“ اس کی کنٹیاں درود کرنے لگیں۔  
 ”میں تمہاری طرح قنوطی نہیں ہوں۔“ اس نے کہا تھا۔

اس وقت وہ شدید ترین قنوطیت کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کے اندر شدید ترین جس ہو رہا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ اسے کوئی گھڑی ہو جس کے پٹ وا کر کے وہ اپنے اندر کے جس کو کم کر سکے۔  
 سالانہ گزرتے گزرتے انسان چار موسموں سے لطف اندوز ہو لیتا ہے۔  
 جلیقں میں بس ایک انتظار کا موسم ہے، مگر ان کی گھڑیاں تو جیسے پل بھر کے لیے آتی ہیں۔ اس کے بعد پھر وہی موسم۔  
 ”بیات ولا“ کے سب ہی مکینوں نے کل اس سے بے حد اصرار کیا تھا کہ وہ عاشر کو سی آف کرنے کے بعد ان کے ساتھ ”حیات ولا“ چلے لیکن اس نے انکار کر دیا تھا اور اپنے گھر چلی آئی تھی۔  
 اسی اتنی زیادہ تھی کہ خود کو کسی طور بہلانے کو بھی جی نہیں ماننا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بھی روٹھی ہوئی تھی۔  
 ”مومن نے اسے پکارا تھا۔“  
 ”بیٹا!“ وہ چونک اٹھی۔

آپ کے سر میں درد ہے؟“ وہ اسے ترحم بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایقان کے لبوں پر اداس سی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔  
 ”ہاں!“ اس نے بار بار اس کا گل سہلایا۔  
 ”آپ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟“  
 ”اے جی رانی ہوئی۔“  
 ”جی رانی کی شکل بناؤ۔“ اس نے ماں کی ٹھوڑی چھوئی۔  
 ”کو بے سہانگی نہیں آتی۔“ وہ کچھ دیر ہنستی رہی۔  
 ”مما! جب معمول میں جی رانی من کے سر میں درد ہوتا ہے تو وہ ایسی ہی شکل بنا لیتی ہیں۔ سب بچے ڈر کر ہانپتے ہیں۔“  
 ”ہاں!“ اس نے لٹی میں سر ہلایا۔  
 ”مما! آپ کی باتیں سن کر میں کو خود سے قریب کر لیا۔“ ”بائی داوے“ کبھی آپ نے اپنی مس سے نہیں کہا؟“ اس نے لٹی میں سر ہلایا۔  
 ”ہاں!“ پوچھنا بھی بہت۔ ہم سب دیکھی عورتوں کے ”سرورد“ ایک سے ہوتے ہیں۔ بس ناموں کا فرق ہوتا ہے۔“  
 ”اچانک ہی اس کی کیفیت تبدیل ہو گئی۔“  
 ”کس کے ناموں کا؟“  
 ”سرتاج“ وہ میرا مطلب ہے ”سرورد“ کے ناموں کا۔ ”وہ شرازت سے مسکرا دی۔  
 ”آپ مشکل مشکل باتیں کر رہی ہیں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“  
 ”ہاں بچے۔ آخر سپوت کس کے ہو۔“ اس نے مومن کا سر ہلایا۔ ”یہ باتیں تمہاری سمجھ میں کیوں آنے لگیں۔“  
 ”جی رانی کی شکل نظر آ سکتی ہے۔ جتنا ہوا دل دیکھائی نہیں دیتا۔ ہاں۔“  
 ”آپ کا دل جل رہا ہے ممما!“ وہ فکر مند ہو گیا۔  
 ”اس نے بھولی سی صورت بنا کر اثبات میں سر ہلایا۔“

”مساوون کے اندھے کو ہری ہری سوچنے لگی؟ ویسے میں عشق کرنا بھی چاہوں تو اس کے لیے ایک عدد شخصیت کا رہو گی اور آج کل تو محض ایک ہی شخصیت کے متعلق سوچا جاسکتا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ سمعیہ نے از حد اشتیاق سے پوچھا۔

”عرفان شوکت۔“ وہ تلخی سے بولی تھی۔

سمعیہ نے برا سامنہ بنایا۔

”تو میں سبجانے کیا سمجھ بیٹھی۔ اچھا بات تو سنو۔“ وہ اس کے قریب ہوئی تھی۔ ”ایک کام کرو میرا۔“

ربیعہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”دوسرا۔ کو ایک پیغام دینا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے متعلق پوچھ رہا تھا تو اس سے کہنا۔“

”سمعیہ! ربیعہ نے اچانک ہی اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”میں بد رسے کوئی بات نہیں کروں گی۔“

”کیوں؟“ اسے حیرت سے جھٹکا لگا۔ وہ فکر فکر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

ربیعہ کو بچاؤ چاہتا تھا۔ سمعیہ اس کی بچپن کی سنگی تھی۔ اس کو دکھ دینے کا خیال ہی تکلیف دہ تھا۔

”کیا؟“ ربیعہ نے سمعیہ سے اس طرح سے کیوں کر رہی ہو ناراض ہو مجھ سے؟“

”پلیس! میں تم سے نہیں کہہ رہی تو وہ آہستہ سے ہنس دی۔

”وہاں! میرا پریشانیوں کی وجہ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی ختم ہوتی جا رہی ہیں۔“

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ پریشانیوں نے اسے سوچنا سکھا دیا تھا۔ زندگی کے جن پہلوؤں پر غور کرنے کی اسے

کبھی ضرورت ہی نہ پڑی تھی اس پر اسے سوچنا بھی تھا اور فیصلے بھی کرنا تھے۔

”زندگی! سمعیہ نے کبھی غم کی چیز ہے۔“ ربیعہ سوچوں میں گم تھی۔ ”جنہیں تیرا نہیں آتا، انہیں اٹھا کر

سندھ میں پھینک دینا ہے۔“ وہ ب جانیں یا لہروں کو شکست دے کر ہر تیراک بن کر ابھریں یہ ان کی اہمیت

تھی اور ان کی اہمیت تھی۔

سمعیہ نے اس کے چہرے پر غور کیا۔ اس کے سبب محبت کا

”اس کے پھیلاؤ کے لیے۔“ اس پر ستاروں کا جال بچھ گیا۔ ربیعہ صحن میں پنچھی چارپائی پر لیٹی

ہوئی تھی۔ اس کا من سخت اس کے عالم میں تھا۔ اس کا دل یہاں بالکل نہیں لگ رہا تھا لیکن عرفان شوکت کی

سرد اور خاموش دھمکیوں سے اس پر بہر حال اتنا اثر ضرور ہوا تھا کہ اب وہ اکیلے گھر میں تنہا رہنے کا خطرہ مول لینا نہ

چاہتی تھی۔ سوا اب وہ کچھ دنوں کے لیے یہاں چلی آئی تھی۔ یہاں ہر چند کہ افراد زیادہ تھے لیکن اسے سخت بورت

محسوس ہوتی تھی۔ اسے اپنا آپ بھی بے مقصد دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن میں بنی کھڑکی سے اندر نگاہ کرتی تو یہ دکھائی دے رہی تھی۔ ساتھ واٹ کے بلب کی لمبی روشنی میں اس کا

وجود پڑ مر رہا اور یہاں نظر آتا تھا شاید اس کی اپنی ذہنی کیفیت ہی پڑ مر رہی ہو رہی تھی۔

سمعیہ اس کی جانب سے اپنی بات کا کوئی خاص رد عمل نہ پا کر خود ہی کسی بہانے سے نفیسہ خالہ کے گھر چلی

ہوئی تھی۔ ان دونوں کا چھوٹا بھائی غیب کرے میں بیٹھا زور زور سے اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔

ربیعہ چارپائی پر تاروں کو شمار کرنے میں مصروف تھی۔ دروازہ بجاتا تو یہ کچن سے نکل آئی۔

”سلام بابا! اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے گائیے؟“

”مجھنا بھی برا ہے بچے! اسے جلنے ہی دو۔“ اس نے آہ بھری۔

”میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔“ وہ کچن کی جانب دوڑ گیا۔

ایقان مسکرا دی تھی۔ کچھ دیر قبل اس نے وجود کا جس ختم کرنے کے لیے ایک کھڑکی کی ضرورت محسوس

تھی۔ اپنے بیٹے کی بھولی بھالی باتوں سے اسے احساس ہوا تھا جیسے کوئی کھڑکی چپکے سے کھل گئی تھی۔ تازہ ہوا

جھونکوں سے یاسیت کی سیلن زدہ لباس ختم ہو گئی تھی۔ اس نے کھڑکی کی پشت سے سر نکا دیا۔

\*\*\*

”کیا بات ہے تم کچھ پریشان لگتی ہو خیر تو ہے؟“ چائے کا گھونٹ بھرتی سمعیہ نے غور سے اس کی صورت

دیکھی۔

وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی دھڑلے خاموش بیٹھی تھی۔ سمعیہ کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسے کیا جواب

دیتی؟ اپنی پریشانی کی وجہ سے جاکر وہ اپنی واحد دوست کو کھونا چاہتی تھی۔ وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ بد رسے

مقابلے میں وہ کبھی ربیعہ کو سچا نہ جانتی۔ ساری بات سن کر وہ اسے دل میں ربیعہ کو قتل دار ٹھہرائی۔ خواہ زبان

وہ اس کا اظہار کر لی یا نہ کرتی۔

وہ ساری رات جاگتی رہی تھی۔ سوچ سوچ کر اس کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ بد رسے کی بات نے اسے

صدے سے دوچار کیا تھا۔ حالانکہ یہی بات نفیسہ خالہ نے بھی کی تھی لیکن ان کی بات دوسری تھی۔ سمعیہ

اور سمعیہ کے مابین قائم بے نام رشتے کا علم نہ تھا پھر انہوں نے محض ربیعہ کی ہمدردی میں اور اسے سہارا

کے لیے یہ بات کی تھی لیکن بد رسے۔

اس کی سوچوں کے تار دکھ سے ٹوٹنے لگتے تھے۔ اس نے سمعیہ کے ہاتھ لکھے گئے اس کے سبب محبت کا

پڑھے ہوئے تھے۔ وہ نہ پڑھتی تو سمعیہ زبانی اس کے لکھے ہوئے ڈائیلاگ سناتی رہتی۔ پڑھ پڑھ کر اسے وہ

انہر جو ہو جاتے تھے۔ وہ ان دونوں کی ہر خفیہ ملاقات سے واقف تھی۔ سمعیہ کے ٹونک میں چھپے ہوئے

تھانف کا احوال اسے پتہ تھا کہ وہ کب اور کس موقع پر دے گی۔

ربیعہ پسند تھی۔ سمعیہ میں اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ دعوائے محبت کے لیے خود اس سے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔

وہ اس سے بیزار ہے۔ ربیعہ کو مرد ذات سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ذات کے اندر دھوکہ بازی چھو

غریب کھونٹ کے سب ہی حساب کتاب غیر محسوس طریقے سے فیڈ ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں کھل

تھیں۔ اسے دنیا دکھائی دے رہی تھی۔

”اے۔ کہاں کھو گئی ہے؟“ سمعیہ نے اس کا کانڈھا لایا۔ ”میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں۔“

”کیا پوچھ رہی ہو؟“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”کیا بتاؤں آخر؟“

”تمہیں ہوا کیا ہے؟“

”کچھ ہوا ہو تو بتاؤں خواہو! ہی۔“

”ایسی تو نہیں ہو تم! خیر تو ہے؟“ پھر وہ شوخی سے بولی۔ ”کہیں کسی سے عشق دشت تو نہیں کر بیٹھی؟ ایسی حالت

تو پیار میں ہی ہوتی ہے بندے کی۔ نہ اپنی خبر نہ دنیا کا ہوش۔“

ربیعہ نے طنز سے اسے دیکھا۔

”والسلام“ کبیرہ آواز آئی۔

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ حاکم چچا اپنا بھاری بھر کم وجود سنبھالتے چلے آ رہے تھے۔ ربیعہ نے بھی اٹھ کر اسلام کیا تھا۔

”والسلام۔ والسلام۔“ انہوں نے گرمجوشی سے اس کا سر تھپکا۔ ”بہت خوشی ہوتی ہے تمہیں یہاں ہو کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ تمہارا دل بھی خوب لگتا ہوگا“ آخر کو تمہاری بچپن کی سکھیاں ہیں یہاں۔ کیوں بھی؟“ جی! وہ نظریں جھکا کر رونا روی میں بولی۔

”کسی بھی بات کی شکایت ہو، مجھ سے کہو۔ کوئی تکلیف ہو، میں بیٹھا ہوں۔ ہم سب ہیں نا تمہارا خیال رکھ لیں۔“

”شکایت کیسی چچا جان! آپ لوگوں کا تو بہت احسان ہے مجھ پر۔“

”ہا ہا ہا۔“ وہ ہنس دیے۔ ”احسان۔ لگی احسان کیا! اپنوں میں بھی کوئی احسان و حسان کا چکر مارتا ہے؟“

”میں تو بس اپنا بن ہوتا ہے۔“

”آپ کھانا کھالیں چچا جان! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ ہنسی سے بولی۔

حاکم چچا لمبے بھر کو چوٹے۔

”بات۔ کیسی بات؟ اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے، میں روٹی کھا کر پھر کر رہی ہوں۔“

وہ آستینیں جڑھاتے ہوئے صحن کے گوشے میں بنے دواش رسم کی طرف برہ گئے تھے۔

ربیعہ اندر کمرے میں چلی آئی۔

اس نے پچھلی چند راتوں میں بہت سوچا تھا، بہت غور و خوض کیا تھا۔ تب ہی ایک واضح اور منطقی فیصلہ تک سکی تھی پھر اس کے سوا کچھ چارہ بھی تو نہ تھا۔

کچھ ہی دیر میں حاکم چچا کاندھے پر بڑے رومال سے مونچھیں صاف کرتے اندر چلے آئے۔ ”اچھا ہوتا اگر کھانا کھانے سے پہلے ہی بات کر لیتیں۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ ”مجھ سے تو پریشانی میں ٹھیک سے کھانا نہ کھایا گیا۔“

”اوہ۔“ ربیعہ شرمندہ ہو گئی۔ ”مجھے خبر ہوتی تو آپ سے پہلے یہ بات کہہ دیتی۔“

”چلو تم بات تو بتاؤ کھانا بیٹا تو ساری عمر ساتھ لگا ہے۔“ وہ بہت بے چین نظر آ رہے تھے۔

ربیعہ نے انہیں سیکھ بوا اور عرفان شوکت کے متعلق سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ حاکم چچا بغور سنتے رہے۔

کبھی کبھار اپنی مونچھوں کو تانے بھی دے لیتے تھے۔

”پولیس میں میرے کچھ جاننے والے ہیں۔“ ساری بات سن کر وہ بولے۔ ”میرا خیال ہے میں ان سے بات کرتا ہوں۔“

”پولیس۔؟“ ربیعہ نے ناپوسی سے سر ہلایا۔ ”نہیں چچا جان! وہ شخص بہت بار سوخ نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے اس سے الجھنا درست نہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو پہلے تو سیدھی انگلی سے ہی گھٹی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہیں انگلی ٹیڑھی کرنے میں دیر نہیں لگتی۔“

”تو پھر تم گھر پر تالا ہی پڑا رہے دو۔ تم یہیں رہو، تالا توڑ کر ناجائز قبضہ کرے گا تو پھر دیکھ لیں گے۔“

”میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔“ ربیعہ بولی۔ ”لیکن پہلی بات تو یہ کہ ایسا آخر کب تک ممکن ہے؟ جلد یا بدیر جانا تو ہو گا پھر یہ کہ جلد ہی اسے علم ہو جائے گا کہ میں یہاں ہوں اور وہ یہاں آنے میں بھی تامل نہ کرے گا۔“

”پھر تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟“

”میرا خیال ہے کہ میں۔۔۔“ ربیعہ خاموش ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بولو۔“

”چچا میاں۔۔۔“ اسے شرم آڑے آ رہی تھی۔ ”میری شادی کر دیں۔“

”اوہ۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ”بس اتنی سی بات؟ کوئی مشکل ہی نہیں۔ یوں سمجھو چٹ منگنی پٹ بیاہ! لیکن یہ مکان کا قرضہ تو وہیں رہے گا۔“

”مکان بھی میں بیچ دوں گی۔“ اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی لیکن پھر سر اٹھا کر ایک عزم سے بولی۔

”لیکن عرفان شوکت کو ہرگز نہیں۔ کم از کم وہ مجھ سے اس ایگریمنٹ پر سائن نہیں کروا سکتا۔ میں آپ سے یہی بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن یہ میرے بس کا کام نہیں۔ آپ۔ اس مکان کے لیے ایک اچھا گاہک ڈھونڈیں اور میرے لیے کوئی نیک شریف لڑکا۔“

”ہا ہا ہا۔“ وہ بے کلی سے ہنستے۔ ”ہاں ہاں ضرور، کیوں نہیں۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میری اپنی نظر

میں ایک مناسب رشتہ ہیں۔“

”اچھا کھڑے ہوئے تھے۔“

”تو یہ ہمارا آرام سے بے فکر ہو کر رہو، کسی تردد کی ضرورت نہیں۔ میں اس عرفان شوکت کو بھی دیکھ لوں گا۔“

”سالے کے باب کی جاگیر ہے کیا جو اکڑ رہا ہے۔ بھی ہمارا مکان ہے ہم جس کو مرضی بچیں۔“

وہ بڑے اڑتے کی جانب بڑھے پھر رک گئے۔

”اور وہ تمہاری کیا شرط وغیرہ ہو۔ میرا مطلب ہے کیسا رشتہ چاہتی ہو، کوئی خاص خوبی؟“ ربیعہ سر جھکا کر رہ

”آپ ان اطمینان۔“

”وہ سکے۔“ یوں کہنے سے حاکم چچا کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ اس کے لیے سوچتے ہیں، یقیناً ویسا ہی

میرے لیے بھی سوچیں گے۔“

”وہ۔۔۔“ وہ ہنس دیے۔ ”تمہیں جلد ہی اندازہ ہو جائے گا۔“ وہ

کندھے پر ہار و بال جھاڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ربیعہ گہرا سانس بھر کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

\*\*\*

”بہت دن ہوئے یہ فردوس بیگم نے چکر نہیں لگایا۔“ شفیقہ حیات نے ٹانگیں سمیٹ کر سو کو بیٹھنے کے لیے

جگہ دی۔

”بس اماں! مرضی کی مالک ہیں۔“ وہ روٹی پکا کر آئی تھیں۔ ماتھے پر پسینے سے چپکے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے

بیچھے کرتے ہوئے بولیں۔ ”مرضی ہوگی تو دن بھر میں دو دو چکر لگائیں گی اور نہ ہفتہ بھر صورت نہیں دکھائیں۔“

”چلو ہم ہی چلتے ہیں اس دن کے بعد ہاشم کی بھی خبر نہ لی ہم نے۔“ غریب کتنی چو میں کھا کر آیا تھا اس دن۔

”ہاں ضرور۔ میں ذرا سالن سے فارغ ہوں، ابھی آؤ ڈالے ہیں، گلے میں کچھ دیر لگے گی۔“

”لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟“ انہوں نے سو کا جائزہ لیا۔

”لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟“ انہوں نے سو کا جائزہ لیا۔

”لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟“ انہوں نے سو کا جائزہ لیا۔

”لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟“ انہوں نے سو کا جائزہ لیا۔



”مانیہ نے چمت پر مشین لگائی ہوئی ہے۔ سدرہ شاید ناعمہ کی طرف گئی ہے۔ رزلٹ آنے والا ہے نا ان کا“ اسی کا پتہ کرتی پھر رہی ہیں۔“

”ہوں!“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”یہ چھوٹی والی یوں بھی کم دھیان دیتی ہے گھر کے دھندوں میں۔ دیدہ نہیں نکلتا اس کا گھر یلو کاموں میں۔ ادھر ادھر پھر کر رہی دن پورا کرتی ہے۔“

”بس اماں! کیا کریں۔ جدھر دیکھو لڑکیوں کا یہی حال ہے۔ بھابھی کی چھوٹی والی کو دیکھ لیں۔ اپنی عریشہ وہ بھی کہاں لگتی ہے ماں کے ساتھ یا توئی وی دیکھتی ہے یا پھر یہاں بیٹھی کپڑوں اور میک اپ کی باتیں کرتی رہتی ہے۔“

”اب لڑکیوں پر کیا الزام دھرتا مٹی! ان کی تو بچسی تربیت کرو گی ویسا پاؤ گی۔ مجھے ہی دیکھ لو۔ رابعہ میری بڑی بیٹی تھی اس پر میں نے شروع سے کڑی نگاہ رکھی کام کاج میں لگائے رکھا، ادھر ادھر کی باتوں میں الجھنے نہ دیا۔ ایقان سب سے چھوٹی تھی پھر شادی کے طویل عرصے کے بعد ہوئی۔ تین اولادیں تب تک جوان ہو کر اپنے گھروں کی

ہو چکی تھیں۔ اس کا میں نے ایسا لاڈ کیا جیسے پہلو تھی کا لڑکا ہو۔ اب دونوں میں فرق دیکھ لو۔ ایقان بھیچہ ماشاء اللہ سلجھی ہوئی، سلیقہ مند بن گئی ہے مگر اس میں رابعہ والی سنجیدگی اور بردباری نہیں ہے۔ ابھی بھی بچوں جیسا بچا کر جاتی ہے۔ خد پر اڑ جائے تو یاد شاہ کو خاطر میں نہ لائے۔ رابعہ کا رشتہ میں سے بھانجے سے کر کے لڑکوں کی طرح

میں اچھا بھلا فرق تھا۔ رنگ کا بھی اللہ بخشے وہ بچہ بڑا پاک تھا۔ رابعہ ہماری گڑبگڑ جیتی تھیں بہن نے جھگڑا پیسلائی تو میں انکار نہ کر سکی۔ مجال ہے جو اس بچی نے آف کر دیا۔ خود بخود اس کے سر پر اس کے سنگ چل

دی اور یہ ایقان۔ آخر میاں کا پیغام کیا لائیں فردوس بیگم اس کی قیامت بچاؤ والی۔ ارے میں کون سا کر رہی رہی تھی مگر اس نے تو حشر اٹھا دیا۔ اپنی پسند بٹلائی اور وہیں شادی کی۔ تم سے کیا چھپا ہے سب تمہارے سامنے کی باتیں ہیں مگر میں تو یونہی تربیت کا ذکر کر رہی تھی کہ سگی بہنوں میں بھی اتنا فرق ہو جاتا ہے اگر تربیت میں کچھ

کو تا ہی رہ جائے تو۔“

”وہی بات اب تک دل سے لگائے بیٹھی ہیں فردوس بھابھی۔ عذرا بیگم نے گہری سانس بھری۔“

”حالانکہ یہ تو انیسب کی باتیں ہیں۔ اللہ کی طے کر رہ ہیں۔ اب آپ بھی گواہ ہیں اماں! میری بھلا بھابھی سے کیا چیقلش تھی یا عریشہ میری بیٹیوں جیسی بچی ہے اس کے لیے میرے دل میں کیا بغض ہو سکتا تھا؟ رافع سے آپ نے خود پوچھا تھا اس کے لیے۔ جب لڑکے نے ہی ہاں نہ بھری تو بھلا ماں باپ زبردستی کہہ سکتے تھے۔“

انہوں نے جی کا ناسور بنائی ہیں۔ تب سے ہی آنا جانا کم ہے ان کا۔“

”چلو خوش رہیں۔ ہمیں یاد آئے گی تو ہم خود جا کر پوچھ لیں گے۔ نہیں تو اپنے بچے عزیز ہیں نا۔ اس دن ہاشم کی خبر سنی تو مانو من من بھر کے ہو گئے پیر۔ جی یوں ہوا جیسے پانی ادھاں تک گرتی پڑتی جیسے بچی ہوں مجھے ہی خبر ہے۔ بچے کو خیریت سے چنگا بھلاؤ کیا تو دل مطمئن ہوا۔“

”وہ بھی بھابھی جان ہی کچھ زیادہ جذباتی ہو گئی تھیں۔“ عذرا بیگم نے منہ بنایا۔ ”انہوں نے تو نقشہ ہی ایسا کھینچا تھا کہ دل بہلا دیا۔“

شفیقہ حیات مسکرا دیں۔

”ماں ہے جس نے کوکھ سے جنا ہو اس کو درد بھی زیادہ ہوتا ہے مٹی! بیٹے کے سر سے بہتا خون دیکھ کر ہر ماں ایسے ہی دیوانی ہو کر بھاگے گی۔“

”خیر تو بچ کہا آپ نے؟“ انہوں نے ساس کی تائید کی۔

”چلو پھر تم ذرا سالن کی خبر لو میں ظہر پڑھ لوں پھر چلتے ہیں ان کی طرف۔“

عذرا بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

سیر جیوں پر آہٹ سن کر اخبار پر دھتی سنیوہ بیگم نے سر اٹھایا تھا۔

وہ نہاد ہو کر فریش ہو گئی تھی۔ اب نیچے آرہی تھی۔

”السلام علیکم امی!“ وہ ان کے سامنے آ بیٹھی۔

”وہ بیگم السلام۔“ انہوں نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔ ”نہند کچھ پوری ہوئی؟“

”کچھ نہیں بہت کچھ۔“ وہ فسن دی۔ ”دیکھ لیں بارہ گھنٹوں سے تو سو رہی ہوں۔ آپ نے جگایا بھی نہیں۔“

”کیوں جگاتی بھی! ہفتہ بھر سے جاگ بھی تو رہی ہو۔ بارہ گھنٹے سویں تو کیا ہوا۔ چلو اچھا ہوا فریش تو ہو گئیں۔“

انہوں نے محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بلکہ گلابی سلک کاشن کے کپڑوں میں اس کا گلابی چہرہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ حیلے سیاہ بالوں کے حصار میں وہ اور بھی اجلی اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ سیاہ کمان دار بھنویں اور ٹھوڑی پر

اہوا سیاہی اسے مزید دلکش عطا کرتے تھے۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں اس کی نظر اتاری۔

وہ اخبار لے کر دیکھنے لگی تھی پھر اس نے گھڑی کی جانب دیکھا۔

”آج کیسے کیا ہے یہ عمر ابھی تک نہیں آیا؟“

”کی بھار دس پندرہ منٹ لیٹ ہو جاتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی تھیں۔

”کیوں لیٹ ہوتا ہے؟“ وہ حد درجہ فکر مند ہو گئی۔ ”آپ نے دس والے سے نہیں پوچھا؟“

”پتہ نہیں چلتا کیوں ہو گئی ہو میں خود ہر طرح سے خیال رکھتی ہوں۔ سوزو کی والے سے بھی میں نے پوچھا ہے۔“

اس کے چہرے سے محنت کی کے آثار نہ ملے تھے۔

4 **URDU PHOTO**

**شعاع ہو گئے ہمیں**

آج ہم قریبی بکسٹال سے حاصل فرمائیں

مکتب عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی

2216361 فون

اسی لمحے یاروین کا بارن بجا۔  
 ”یہ لو! ابھی گیا۔ تم یونہی ذرا سی بات دل پر لے لیتی ہو۔“ منیڈہ بیگم ہنس دیں۔  
 وہ اچھلتا کودتا چلا آ رہا تھا۔

”مما۔۔۔ ممما۔۔۔“ وہ اگر اس سے لپٹ گیا۔ ”آج آپ گھر پر ہیں، کتنا اچھا دن ہے۔ منڈے بہت اچھا دن ہوتا ہے۔“

شہلا مسکرا دی۔ پیر کو عموما ”اس کا ریسٹ ہی ہوتا تھا۔“  
 ”یہ! اگر پہلے ٹانو کو اور ممما کو سلام کرتے ہیں پھر ادھر ادھر کی ہانکتے ہیں۔“  
 ”السلام علیکم ٹانو، ممما!“ اس نے فوراً ”تمیل کی۔“  
 دونوں نے ہی جواب دے کر اس کا ماتھا چوما تھا۔

”اللہ سلامت رکھے اپنی ماں کی آنکھوں کا نور ہو۔“ منیڈہ بیگم بولی تھیں۔ ان کی پلکیں نم ہو گئی تھیں، جنہیں انہوں نے مہارت سے چھپا لیا۔  
 ”آپ کتنی اچھی لگ رہی ہیں ممما! پنک کلر کے کپڑے کتنے اچھے ہیں۔“ وہ اس کا بغور جائزہ لے لے لگا۔

”تمہاری خالہ تمہیں مستقبل کا شاعر ٹھیک ہی کہتی ہے۔“ اس نے غور سے سر پر چپٹا لیا۔  
 فون کی تیل بج اٹھی تھی۔ شہلا نے چونک کر فون کی جانب دوڑا۔ فون میں منیڈہ بیگم کے پھو ہوشیار ہو گئے تھے۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ منیڈہ بیگم اٹھ گئیں۔  
 وہ تذبذب کے عالم میں انہیں فون کی جانب جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر جیسے ہی انہوں نے ریسیور پر ہاتھ رکھا،  
 وہ چیپترہ رہ سکی۔

”آئی۔ بات سنیں۔“  
 ”ہاں، کو۔“ وہ فون اٹھانے سے قبل اسے دیکھنے لگیں۔  
 پھر اس کی جانب سے کچھ جواب نہ پا کر انہوں نے بجتا ہوا فون اٹھایا۔  
 ”ہیلو۔ ہال۔۔۔ کو۔“

وہ غائب دماغی سے انہیں بات کرتا دیکھتی رہی۔ ذہن یکدم خالی ہو گیا۔ منیڈہ بیگم ریسیور رکھ کر واپس آئیں تو وہ گم حسی بیٹھی تھی۔  
 ”انیقہ کا تھا۔ کہہ رہی تھی دوست کے گھر جا رہی ہے، مل کر اسائنمنٹ تیار کرنا ہے۔ رات تک، واپسی ہوگی۔“

انہوں نے رک کر اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔  
 ”شہلا۔۔۔“ انہوں نے دیکھا۔

”جی! وہ چونکا اٹھی۔“ کیا انہی سے انیقہ کیا کہہ رہی تھی؟  
 ”تم کہاں ٹھوٹی ہوئی ہو بات کیا ہے؟“  
 ”کچھ نہیں۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

باب تک فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ انہیں ”اس“ کے فون کے متعلق بتائے یا نہ بتائے۔ دراصل اسے خود ہی اندازہ نہ ہو پایا تھا کہ ”اس“ نے اتفاقاً ہی فون کر لیا تھا یا یہ اس کی کوئی سوچی سمجھی اسکیم تھی۔

”وہ کہہ رہی تھی، مرم کے گھر جا رہی ہے۔ دیر سے لوٹے گی۔“  
 ”بلجی نہ اچھا۔“ اس نے چونک کر اپنے آس پاس دیکھا۔ ”یہ عمر کہاں گیا؟“  
 ”تمہارے سامنے ہی تو اپنے کمرے میں گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے، تمہیں ڈیوٹیاں بھگتا بھگتا کر تمہارا دماغ کمزور تو نہیں ہو گیا؟“

اس نے ہنس کر سر جھکا لیا۔  
 ”میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ باتوں میں دھیان ہی نہ رہا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

چائے چھان کر ناعمہ کیتی کوئی کوزی سے ڈھک رہی تھی جب ان تینوں کی آمد ہوئی۔ وہ ان کی آمد سے بے خبر آگے بڑھ کر کینٹھ کھولنے لگی۔

علی، خنزہ اور نافع نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کاؤنٹر پر بڑے سخی ہوئی رکھی تھی۔ پکوڑے، تلے ہوئے پاپڑ، بسکٹ اور مٹھائی کی پلیٹیں لبالب بھری ہوئی تھیں۔

ناعمہ سب کچھ تیار کر کے اب کینٹھ سے چائے کے مک نکال رہی تھی۔ مک ٹرے میں رکھ کر وہ مصروف تھا۔ انداز میں پتلی پتا سے اچانک کسی کی کا احساس ہوا۔

”جی! اس نے بغور ادھر ادھر دیکھا اور پھر وہ بری طرح سے چونکا اٹھی۔ کاؤنٹر پر سے لوازمات کی ٹرے غائب تھیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سارے کچن کا جائزہ لیا جیسے اسے اپنی بصارت پر کوئی شک ہو پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے کچن سے نکل آئی۔“

ایک نالی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ شفیقہ حیات اور عذرا بیگم بھی ان لوگوں کے پورشن میں چلی آئی تھیں۔ نیو اور سید بھی آگے آئے۔ وہ ان ہی سب لوگوں کے لیے شام کی چائے اور امنیٹس وغیرہ تیار کرنے کے لیے کچن میں ایک کھٹے سے مشغول تھی۔

”آئی! اس نے سامنے سے آئی دروازہ کو مخاطب کیا۔“ کچن سے بڑے اٹھا کر آپ لے گئی ہیں؟“  
 ”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں تو یہی دیکھنے آ رہی تھی کہ تم کہاں تک پہنچی ہو۔ نالی امی کہہ رہی ہیں۔“

”جی! یہی ہے۔“ پھر سب چیریں کھانسی گئیں؟“  
 ”وہیں ہوں لیکن ان کے کیا پیراگ آئیں گے۔“ دروازہ اس کی پریشان صورت دیکھ کر ہنس پڑی۔

”میں دروازہ آئی، وہاں نہیں ہیں۔“  
 وہ اس کے پیچھے پیچھے کچن میں آئی۔

”یہ دیکھو یہ تو پڑی ہے۔“ دروازہ نے بڑے کی جانب اشارہ کیا جواب دوبارہ کاؤنٹر پر دھری تھی۔  
 ”ہائے اللہ! یہ کیا معاملہ ہے؟“ ناعمہ کو حیرت ہوئی۔

پھر وہ چلائی تھی۔ ”لیکن یہ چیزیں تو آدمی ہو چکی ہیں۔ یہ اتنے سے پکوڑے؟ میں نے تو ڈھیر سارے بنائے تھے اور یہ مٹھائی کی پلیٹ سے گلاب جامن کہاں گئے؟ یہ تو صرف لڈو اور بالوشاہی رہ گئی ہیں۔“

”لڈو اور بالوشاہی ہم پسند نہیں کرتے لڑکی!“ نہایت بھاری آواز کچن میں گونجی تھی۔  
 ”دونوں نے حیران نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر دروازہ کچھ کچھ سمجھ کر کچن سے باہر کھلنے والی کھڑکی کی جانب بڑھی۔“

”تو یہ تم ہو شیطانو!“ اس نے باہر جھانک کر کہا۔  
 وہ تینوں نیچے گھاس پر براجمان موج اڑانے میں مصروف تھے۔  
 ”ناعمہ سے کہیں چائے پیس دے دے۔“ علی نے اس سے یوں کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔  
 ”وہ تو ہنسے لگی تھی لیکن اس کا آدھا خون جل گیا۔“  
 ”میں پوری سیتلی تمہارے سروں پر انڈیل دیتی ہوں۔“ اس نے دانت پیسے۔  
 ”نور ابلم۔“ حمزہ منہ چلاتا ہوا بولا۔ ”ہم سر اٹھا کر منہ کھول لیں گے۔“  
 ”بالکل۔“ یہ نافع تھا۔ ”آپ ان کی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہیں محترمہ!“  
 ”ابھی تم نے میری صلاحیتیں کہاں دیکھی ہیں۔“ وہ تلملائی تھی۔  
 ”کیوں نہیں سب کچا چٹھا کھل گیا ہے۔ یہ پکوڑے بنائے ہیں؟ نمک کم مرچ زیادہ۔ ہزاروں خضیا بہت ڈال دی ہے۔“

”اور یہ پار؟ آدھے جلے آدھے کچے۔“

”مٹھالی اچھی ہے۔“

”ہاں، حلوائی باصلاحیت تھا۔“

”اب چائے پتہ نہیں کیسی ہوگی۔“

”چلو زہر مار کر لو، کچا دل رہ جائے گا۔“

”میں سچ سن رہی ہوں۔“ ناعمہ غصے سے سرخ ہو گئی۔

”یعنی دو کی ضرورت طے ہوا۔“ انہیں اطمینان ہو گیا۔

پھر انہوں نے بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔

”چلو ناعمہ! دو روٹے ہوتے ہوئے بولی تھی۔“ زہر مار لے چلو جائے، ہنست دیر نہ لگے گی۔“ اس کا بس نہ چلتا تھا ان کا

خون پی جائے۔

دونوں چائے اور دیگر لوازمات لے کر اندر داخل ہوئیں تو راجہ بیلیم نے اسے گھوما۔

”ڈیڑھ گھنٹہ پہلے یہ ناعمہ بہت نیکی لڑتی ہو۔“ وہ خفا میں تھیں۔ ”اب انتظار کر کے بالآخر نماز کے لیے اٹھ گئی ہیں۔“

”امی جی۔۔۔ دھم۔۔۔“

”چلو اب جلدی سے سب کو چائے دو۔“ انہوں نے اسے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ”اور یہ کیا چیزیں بنائی ہیں۔“

ادھوری سدھوری حد بردی تم نے نکتے پن کی۔“ انہیں اس پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔

”امی جی۔۔۔ دھم۔۔۔“ اس کا دل پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ بات کرنے سے پہلے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ہائیں اب اس میں سوے بہانے کی کیا بات ہے؟“

”بیجئے۔“ ایقان بولی۔ ”باجی! آپ نے بلا وجہ اسے رلا دیا ہے۔ اتنا کچھ کر کے لائی ہے بے چاری۔“

”دراصل راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔“ ”وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ قافلہ تو لٹا پٹا آپ تک پہنچا ہے۔“ اس نے ٹرے کی جانب اشارہ کیا۔

”اوم۔۔۔ وہ ہنس پڑی۔ ”تو کیا ہوا وہ بھی اپنے ہی ہیں دھماچو کڑی کہیں کے۔ کون کون تھا؟“

”علی، حمزہ اور نافع۔“ ناعمہ نے ناک رگڑی۔ ”دیکھ لوں گی میں بھی بدلہ نہ لیا تو ناعمہ علی خان نام نہیں میرا۔“

”ابتلا غصہ نہیں کرتے۔“ شفیقہ حیات نماز پڑھ کر چلی آئی تھیں۔ ”لڑکیوں کو غصہ پینا آنا چاہیے۔“  
 ”جی ہاں۔“ ایقان نے شوخی سے ماں کو دیکھا۔ ”پھر ساری عمر یہی کام تو کرنا پڑتا ہے۔ نا اہلی جان؟“  
 ”ارے ہاں جانتی ہوں، جتنا غصہ پیتی ہو تم۔“ انہوں نے بیٹی کو گھورا تھا۔ ”سناؤ ناک پر دھرا رہتا ہے عینک کی طرح۔“

”ہائے اللہ ای! میں کہاں غصہ کرتی ہوں۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”اس قدر صابر و شاکر بیٹی سے بھی شکایت ہے آپ کو؟“  
 ”ماں ہوں تمہاری، ایک ایک پل کا حساب کتاب ماؤں کے حافظے میں درج ہوتا ہے۔“ ایقان شرمندہ سی ہو گئی۔

”صابر شاکر تو میری بیہ والی بیٹی ہے۔“ انہوں نے پاس بیٹھی رابعہ بیگم کو گلے لگا لیا۔ ”خدا کے حضور بھی صابر و شاکر رہی ہے۔ ماں باپ کے سامنے بھی کبھی ”اف“ نہیں کی۔ ہر قسم کے حالات دیکھے میری بچی نے لیکن کسی نے اس کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی۔“  
 ”یہ تو بچہ کہاں سے“ عذرا بیگم نے بھی تائید کی۔ ”زائدہ سے کچھ سیکھنا چاہیے، حوصلہ کہہ رہا ہے۔“ تقدیر پر صابر و شاکر کیسے رہتے ہیں۔“  
 رابعہ بیگم کی بلیکس جھجک چلی تھیں۔

”میں بھی نماز پڑھ لوں، وقت نکل رہا ہے۔“ وہ آستنی سے اٹھ کر ان کے درمیان سے نکل گئی تھیں۔  
 درود اور نعتیں پڑھ کر دیکھنے لگیں۔ دونوں کے چہروں پر سوچوں کے سائے تھے۔

”یہ لو۔“ انہوں نے بھائی کے سامنے کھانا گویا پٹا۔ ”کھاؤ پھر سو جاؤ۔“  
 انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھا کر ہنس کر دیکھا۔

”اتنے کڑوے نوانے ہمارے حلق سے کیسے اتریں گے باجی!“ وہ مسکرا کر بے ”کچھ تو مٹھاس سے بولا کرو۔“  
 ”کوئی خود سے کڑوایا مٹھاس نہیں ہو جاتا، آخر میاں! یہ تو سامنے والے کی مرضی ہے، وہ کڑوا سنا چاہتا ہے یا مٹھا۔ اے ہاں میں کہتی ہوں کپٹیاں سفید ہو گئیں تمہاری، چندیا پر سے بھجے ہو گئے ہیں، کھانے کی بجائے بچاؤ برس کے ہو پھر بھی تمہاری سوئی ہوئی عقل نہیں جاگی اور اب جو کچھ کھانا اٹھا رہی ہیں۔“  
 وہ وہیں ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں اور اپنا بازو دبائے لگیں۔

”اب ہم کیا کریں باجی!“ کچھ نہیں کرتے پھر بھی سب ہم سے خفا ہی رہتے ہیں۔“  
 ”ارے بھیا تو کرونا کچھ، ہنس ہوں تمہاری۔ جی دیکھتا ہے تمہیں یوں لاوارثوں کی طرح یہاں پر ادیکھ کر بھائی ہو بھائی تو بہنوں کا میکہ ہوا کرتے ہیں۔ ان کی عزت ان کا مان ہوتے ہیں۔ یہاں ہم لوگوں سے شرمندہ ہوتے پھرتے ہیں۔“

آخر میاں کا نوالہ منہ کی طرف لے جاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔  
 ”دیکھو شرمندہ ہوتی ہو باجی!“ انہوں نے نوالہ واپس رکھ دیا۔ ”دو ٹھڈے مار کر باہر کرو ہمیں۔“ وہ بے حد غمگین ہو گئے تھے۔ ”یہی سلوک روا ہے ہمیں۔“

”اے بھیا!“ انہوں نے ماتھا پیٹ ڈالا۔ ”تمہارے بھلے کو ہی کہتی ہوں۔ یہ دن بھر کی چار روٹیاں پکا کر جان نہیں نکل جاتی میری مگر جی چاہتا ہے کہ یہ روٹیاں وہی پکائے جس کا پکانے کا حق ہے۔ ماشاء اللہ جوان جہان ہو کون

کی عمر نکل گئی ہے تمہاری؟ ابھی بھی چاہو تو اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ ذرا سی ہمت پکڑو، گھر سے نکلو، کوئی روزگار سے لگو، چار پیسے لاکر ہاتھ پر دھرو۔“ لگے کہ مرد ذات ہو، کہیں رشتہ ڈالتے ہمارا بھی حوصلہ ہو۔ اب کہیں لڑکی مانگنے جائیں تو کیا کہیں؟ کون سے گن جتا میں تمہارے؟ سارا دن کسی کونے میں پڑے اینڈا کرتے ہیں، بھوک ستائے تو منظر عام پر چلے آتے ہیں، کچھ نصیحت کرو تو روٹھ جاتے ہیں، بادشاہ زادے نہ ہوسے۔“

وہ کہتے ہوئے بول رہی تھیں۔ آخر میاں کچھ دیر کو غمگین نظر آکر پھر کھانے کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔  
 ”اس گھر میں میری سنا کون ہے؟ خوار خانے کا طوطی ہوں۔“ اب انہوں نے اپنی ٹانگ دیوانی شروع کی۔  
 ”جو اپنی بات دوسروں کو سنانا چاہے، اسے چاہیے کہ بات میں وزن پیدا کرے۔ نری ہوا ہی نہ ہو۔“ بھاری لب و لہجے میں کہا گیا۔

وہ دونوں چونک اٹھے تھے۔  
 فاروق حسن نجانبے کس وقت چلے آئے تھے۔ ٹائی کی گرہ ڈھیل کرتے ہوئے وہ وہیں بیٹھ گئے۔ فردوس بیگم ان کی بات پر جل بھن کر اب منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی تھیں۔

”کہاں ہوتے ہیں آخر میاں آپ!“ فاروق حسن ان سے پوچھنے لگے۔ ”کوئی برابر روٹین نہیں ہے آپ کے نظر نے کا۔“ کبھی صبح سویرے نظر آجائیں تو رات گئے تک خبر نہیں ملتی آپ کی۔ کبھی آدھی رات کو بھی باغیچے میں اچلتے نظر آ جاتے ہیں، کبھی دو دو دن کے لیے غائب ہوتے ہیں، کبھی سارا سارا دن بیٹھنے کی وی سے شغل کرتے ہیں۔ کیا یہ زندگی گزار رہے ہیں آپ؟“

”ارے بہت کان کھینچے ہیں میں نے ان پر اثر نہیں ہوتا۔ مولیٰ طبیعت ہے کہ گینڈے کی کھال۔“  
 ”اچھا، خیاں سنے روٹیاں جھٹ پٹ معدے میں اتار لی تھیں۔ پانی سے بھرا گلاس بھی غٹا غٹ خیرھا گئے اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔“

”آفس چلا کریں، صبح آٹھ بجے پورج میں کھڑے ہوں آپ۔“ انہوں نے ان کا ارادہ ”کلن“ سے بھر دیا۔  
 ”کتنے بھانجے ہیں آپ کے، شکر و شکر سے اندوز ہوں گے وہاں۔“ انہوں نے طنز کیا۔ ”پڑھے لکھے بے

”سب آپ کے بھانجے ہیں، شکر و شکر سے اندوز ہوں گے وہاں۔“ انہوں نے طنز کیا۔ ”پڑھے لکھے بے  
 ”بھائی میاں! ہمارا حافظہ اب وہ نہیں رہا۔“ آخر میاں مظلومیت سے بولے۔ ”ہمیں کہاں شعر یاد رہتے ہیں اب۔ یوں بھی ہماری وجہ سے وہاں دفتر میں آپ کی بھداڑے گی۔“

”اڑنے دیجئے۔“ وہ مسکرا دیے تھے۔ ”ہمیں زیادہ اڑان بھرنے والوں کے پر کاٹنے خوب آتے ہیں۔ آپ بھر جاؤ کل صبح ہمیں پورج میں ملیں، ٹھیک آٹھ بجے۔“  
 ”کیا بھائی میاں! ہم وہاں کریں گے کیا؟“ وہ از حد پریشان ہو چکے تھے۔

”کہانا، شعر سنائیں گے سب کو۔ اس شعر و شاعری کو آپ کی نوکری بنا دیا جائے، تب ہی دل بھرے گا آپ کا۔“  
 تب ہی کسی دھمک کے کام کو آپ کی توجہ نصیب ہو گئی۔  
 آخر میاں نے از حد مظلومیت سے ہنس کی جانب دیکھا کہ شاید وہاں سے کسی قسم کی کمک دستیاب ہو سکے۔ وہ بھی بھری بیٹھی تھیں انہوں نے قلعاً ”لفٹ نہ کرائی۔“ بالا آخر وہ ٹھکے مارے جواری کی مانند ٹھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ وہاں سے نکل لیے۔



52

”میں عمر سے کانٹیکٹ میں رہنا چاہتا ہوں۔ تم یا تمہارے گھر سے کوئی بھی معترض ہو نہ روڑے اٹکائے۔“  
 ”میں سوچوں گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”میں تمہیں سوچنے کا ٹائم نہیں دے رہا ہوں، صرف اطلاع دے رہا ہوں۔“ وہ مذاق اڑانے والے لہجے پر بولا۔ ”تم عاقل، باشعور، سمجھ دار لیڈی ڈاکٹر ہو۔ ایک باپ کے جائز، قانونی حقوق تو سمجھتی ہو گی۔ میری نرمی نا جائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔“ اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔  
 شہلا کا دل اچھل کر اس کے تالو سے آچپکا۔ اس کی آواز بند ہو گئی، سانس رکنے لگی۔  
 ”گھر جا کر اپنی والدہ صاحبہ کو بھی اچھی طرح سمجھا دینا، میں جب بھی فون کروں، عمر سے میری بات کرائی جائے۔“

”ٹھیک، ٹھیک ہے۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔

”میں فی الوقت اس سے اپنے رشتے کی وضاحت نہیں کروں گا۔ میں بھی اس کے ننھے ذہن کو پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن آہستہ آہستہ اسے سب سمجھ میں آجائے گا۔“  
 شہلا نے مرے مرے انداز میں ریسپورر رکھ دیا تھا۔

وہ مغرب کا وقت تھا یا فجر کا، ایسے صحیح طور پر وقت کی پہچان نہ ہو رہی تھی۔ دھند لکا پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ یوں جیسے ابھی پو پھٹے کی اور سورج کی جانب سے پھینکی گئی پہلی کرن رات کو شیشے کی مانند کرچی کرچی کر ڈالنے کی یا یوں جیسے سورج اپنی قبا کا پلو پورے طور پر سمیٹ کر آسمان کا دروازہ بند کر لے گا اور ہر سو لگھنگھور اندھیرا چھا جائے گا۔ نجانے وہ کون سا وقت تھا؟

اسے اتنا احساس تھا کہ وہ ادا سی کا وقت تھا وہ حشر کا وقت تھا وہ جس کے زور پکڑ لینے کا وقت تھا۔ اس لمحے سے اجالے میں صحیح طور پر ہر شے واضح نہ ہوتی تھی۔ ربیعہ گھر میں کھڑی تھی، اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ وہاں روئی کے گالے اڑتے پھر رہے تھے۔ بھرے بھرے سرسبز باؤں اور تیز سے ادھر بڑی تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ وہ کھڑکی پر کھڑی تھی، بڑی اونچائی پر تھی۔ آسمان پر تیزی سے ہوتی ہوئی یہ حرکت توجہ طلب تھی۔ بادلوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ربیعہ سر اٹھائے آسمان کو دیکھتی رہی۔

تب اس کے گال پر پانی کا پہلا قطرہ آن کر، ٹھنڈا اٹھار قطرہ۔ ربیعہ کے پورے وجود میں ٹھنڈک کی لہر دوڑ گئی۔ اسے پہلی بار جس کے ٹھلنے کا احساس ہوا۔ جسم سے سرسراہٹ ہوا کا ایک جھونکا ہولے سے ٹکراتا ہوا گزر گیا۔ ربیعہ کو خوشی اور ظمآنیت سی محسوس ہوئی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں پھر تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ سرسبز باؤں اب سیاہ ہو رہے تھے۔ سب کے سب بڑی تیزی سے سیاہ ہوتے جا رہے تھے جیسے کسی نے مٹی بھر سیاہی تالاب کے پانی میں پھینک دی ہو۔

ربیعہ کو احساس ہوا کہ بادلوں میں سیاہی پھیلنے کی وجہ سے ماحول میں جو ملگجاسا اجالا تھا وہ غائب ہو رہا تھا۔ ہر سو اندھیرا چھا رہا تھا۔

پھر یکایک ہوائیں چل پڑیں۔ تند و تیز ہوائیں۔ ربیعہ کا پورا گھر ہواؤں سے بھر گیا۔ سب کھڑکیاں، دروازے ہواؤں کی زد میں آکر کھٹاک کھٹاک کھٹلنے اور بند ہونے لگے۔ چمن میں لگا ہار سنگھار کا درخت مست شرابی کی مانند جھومنے لگا تھا۔ اس کے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر ربیعہ کے وجود سے ٹکراتے اور پورے گھر میں بکھر جاتے۔  
 شائیں شائیں کرتی ہوائیں، سرسراتے ہوئے پتے اور بجتے ہوئے دروازے اور وہ گھر میں تنہا تھی۔

## قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور روایات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جو صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے غور و فکر کریں۔

سمعہ گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی تھی۔ اس کے خراثوں کے لے میں ڈوبے برابر فرق نہ آیا۔ ربیعہ کھڑی ہو گئی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی اور بنا آواز کیے دروازہ کھول کر صحن میں چلی آئی۔ برابر والے کمرے میں حاکم چچا اور فیب سویا کرتے تھے۔ اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو رہی تھی کہ اسے خالی صحن نے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ غالباً رات کا آخری پہر تھا۔ ربیعہ کو وقت کا اندازہ نہ ہو سکا۔ بڑی ہمت سے گھڑی تک آئی اور شکے سے پانی نکال کر پینے لگی۔ پانی پی کر اس نے گلاس جگہ پر رکھا اور مڑی۔ اس کے لبوں سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ اس کے عین پیچھے حاکم چچا کھڑے تھے۔

”ربیعہ! بلا نعمت سے بولے۔“ جاگ رہی ہو؟“

”جی ہاں میں۔ ڈر گئی تھی۔“ اس کا سانس کشول میں نہ تھا۔

”کس سے؟“

”میں سوئے میں۔ میں نے عجیب سا خواب دیکھا چچا جان! میں نے سوئی تھی۔“

”خواب؟“

”جی ہاں! میں نے اس کی بات میں محض ایک لفظ پر غور کیا تھا۔“ اچھا نہیں لگتا۔“ ربیعہ کا خوف بڑھ گیا۔ اس کی چھٹی حس پوری طرح بیدار ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں اس کے سامنے کھڑے چچا کی آنکھوں میں بڑی وضاحت سے اپنا مدعا بیان کر رہی تھیں۔ چچا دار حریفوں میں جو بیخام تھا، اس کے سامنے اس نے اپنے پوری طرح اور فوری طور پر سمجھا تھا۔

وہ خاموش رہا۔ اس نے سوچا کہ میں نے اسے پوری طرح اور فوری طور پر سمجھا تھا۔

”ربیعہ! تو سوچو میں ایک ماہ میں بیاہ دوں گا اس گھر پر راج کرنا تم! جتنا خیال میں تمہارا رکھوں گا کوئی دوسرا نہیں رکھ سکتا۔“

”میں نے مڑ کر کمرے کی جانب دیکھا۔ ربیعہ ان کی اگلی متوقع حرکت کا بھید پائی۔“

”سمعہ جاگ رہی ہے چچا جان!“ وہ پرسکون مدھم آواز میں بولی تھی۔ ”میں پانی پینے آئی تھی۔“

”آں! ہاں! اچھا! اچھا! میں بھی پانی پینے آتا تھا۔“ وہ آگے بڑھے۔

ربیعہ آرام سے ان کے قریب سے گزر کر اندر جانے لگی۔

”ربیعہ! کسی سے کہنا مت۔“ انمول نے خوشامد سے کہا۔

”نہیں چچا جان! آپ بے فکر رہیں۔“ اس نے تلخی سے کہا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

”ربیعہ! ربیعہ!“ دادی اسے پکار رہی تھیں۔

”دادی کہاں ہیں؟“ اس نے پریشانی سے سوچا۔ ”دادی تو گھر میں نہیں تھیں۔ دادی کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔“ آواز بہت دُور سے آرہی تھی۔ ربیعہ اپنے صحن میں کھڑی تھی۔

”ربیعہ! ربیعہ! یہاں سے جاؤ۔“ آواز پھر آئی۔

ربیعہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ آندھی کی شدت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ ہار سنگھار کا درخت یوں سرخ رہا تھا جیسے ابھی زمیں بوس ہو جائے گا۔

ربیعہ کا صحن خشک پتوں سے بھر چلا تھا۔

”کہاں جاؤں؟“ اسے خیال آیا تھا۔ ”میں کہاں جاؤں؟“

”ربیعہ! ربیعہ!“

پھر وہ مڑی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ ہار سنگھار کا درخت جیسے رسیاں تڑوا رہا تھا۔ ربیعہ نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ چٹنی چڑھائی۔ اسے لگا جیسے کچھ دیر کے لیے وہ کسی محفوظ جگہ پر آگئی تھی۔

بند دروازے سے پشت لگائے وہ آنکھیں بند کیے کھڑی ہوئی تھی۔ آندھی تھم گئی تھی۔ آوازوں اور ٹوٹ رہا تھا۔ ہوا کی شا میں شا میں اور پتوں کی سرسراہٹ بند ہو گئی تھی۔ وہ آوازوں کھڑکیوں کو قراؤں آیا۔ صرف کھڑکی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”ربیعہ! اسے پھر آواز آئی۔“

”اب کی باریہ آواز قدرے قریب سے آئی تھی۔ ربیعہ نے آنکھیں کھولیں، سامنے دیوار والی کھڑکی میں دادی کھڑی تھیں۔ وہ باہر گلی میں تھیں۔ ربیعہ کو صرف ان کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

”دادی!“ وہ نجانے کیوں ڈر گئی۔

”ربیعہ! ربیعہ! جاؤ یہاں سے۔“ دادی نے اسے اشارہ کیا۔

”کہاں جاؤں؟“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”جاؤ! بس جاؤ۔ میں نے کہا تھا جاؤ۔“ ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”جاؤ۔“ اس کی ہار شدت سے کہا گیا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورے جسم زلزلوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کھڑکی سے کود جائے۔

آنکھ کھل جانے کے بعد وہ کچھ دیر سیدھی جیت لیٹی چھت کو گھور رہی۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ خود کو اسی کمرے میں محسوس کر رہی تھی جس کی کھڑکی میں اس نے دادی کو کھڑا دیکھا تھا۔ اسے شدت سے خوف محسوس ہوا۔ کھڑکی کی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے ہر چیز کو دیکھنے لگی۔ اسے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر میں بھی نہیں تھی۔ وہ حاکم چچا کے گھر میں تھی۔

اسے یاد آیا وہ تو پچھلے کئی دنوں سے یہاں آکر سویا کرتی تھی۔ برابر والی چارپائی پر سمعہ لیٹی مدھم سے خراٹے لے رہی تھی۔ اس سے ذرا آگے ٹوبہ تھی۔

ربیعہ کو اپنے حلق میں کانٹے آگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا جسم سینے سے بری طرح سے بھیگا ہوا تھا۔ چارپائی سے پیر لٹکائے وہ کچھ دیر بیٹھی اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا آواز دے کہ سمعہ کو جگا لے۔ اسے اس وقت ایک سامع کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

”سمعہ!“ اس نے ہولے سے آواز دی۔

نقص جیت جاتا ہے۔“  
منیزہ بیگم کے آنسو خاموشی سے ان کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔ شہلا کی دکھ میں بھیگی ہوئی آواز ان کا دل چیر رہی تھی۔  
”بولیں نا امی!“ شہلا نے ان کے ہاتھوں کو جھنجھوڑا ”یہ کیسے فیصلے ہیں۔ کوئی حساس درو مند دل یہ فیصلہ کیسے کر سکتا ہے؟“  
”بیٹی۔۔۔ دنیا کے سارے فیصلے بس ایک بار ہی نہیں ہو جاتے۔“ منیزہ بیگم نے اس کا سراپے سینے سے لگایا۔  
”سب فیصلے ایک بار پھر ہوں گے۔ وہاں جہاں کسی کے ساتھ رتی برابر ظلم نہ ہو گا۔ جہاں پر کوئی اپنی رتی برابر جی بھی دیکھ لے گا اور رتی برابر ظلم بھی۔“  
شہلا خاموش ہو گئی۔

”میں نے ابو کا دل دکھایا تھا نا امی؟“ وہ پوچھنے لگی۔  
”نہیں بیٹی۔۔۔ ایسے نہیں سوچتے!“ وہ محبت سے اس کا سر تھپکنے لگیں۔ ”آپ کے ابو کی روح آپ کو افسردہ لکھ کر افسردہ ہو گئی۔ بس یہ سوچ کر خوش رہا کرو۔ انہیں ایصالِ ثواب کرتی رہا کرو۔ ویسے ایک بات پوچھوں؟“  
”جی ہاں۔“  
”شہلا نے اشیات میں سر ہلایا۔“

”میرے بچے! ان کی بات پریشان کر رہی ہے؟ میں کچھ دنوں سے تمہیں پریشان دیکھ رہی ہوں لیکن پوچھا نہیں۔ کیونکہ بسا اوقات انسان محض اپنے آپ سے گفتگو کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ ایسے میں کسی دوسرے کی ہمدردی کی ناگوار گزری۔“  
”میں نے سوچا تھا جب خود سے سب کچھ کہہ سن لوگی تب پوچھوں گی بلکہ تم خود ہی بتا دو گی۔ لیکن آج میں اس قدر افسردہ دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ پا رہی ہوں۔“ شہلا نے مجھ سے جس طرح کا سوال کیا اس سے میں خوفزدہ ہو گئی ہوں۔ آخر بات کیا ہے بیٹی؟“  
”شہلا سر جھٹکا کر کے مجرم کی طرح بیٹھ گئی۔“  
”کچھ دنوں سے جبکہ اب اس کا فون آواز نہیں دیتا۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

”یا اللہ!“ منیزہ بیگم دسکے سے رہ گئیں۔ ”وہ تو وہ بھلا رہی ہے!“  
”شہلا نے علی کی سے سراپا لٹا کر انہیں دیکھا۔“ آپ۔۔۔ کیا جانتی ہیں؟“  
”ہاں! میں نے سنا ہے کہ منیزہ بیگم کو دو تین مرتبہ فون سننے پایا ہے پوچھتی تو کہتا ”انکل ہیں۔“ میرے فریڈ ہیں۔ میں سوچتی رہ جاتی کہ کون سے انکل ہیں جو اسے ہر دو سرے دن فون کر لیتے ہیں۔ تم سے یوں نہ کہا کہ تم پریشان ہو گئی۔ بس پھر بیکل بجتی تو میں ہی فون اٹھاتی۔ دوسری جانب سے لائن ڈس کنکٹ ہو جاتی۔ مگر یہ تو کوئی دس رو دن پہلے کی بات ہے۔“

”اس نے ہاسپٹل فون کیا تھا اور وہ ٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ وہ عمر سے کانٹیکٹ میں رہے گا۔“ شہلا نے تھکے الفاظ میں بتایا۔  
”پھر تم نے کیا کہا؟“ وہ پریشان نظروں سے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔  
”میں۔۔۔“ وہ ہولے سے ہنس دی ”میں کیا کہتی؟ میں تو ماں ہوں۔ وہ اس کا باپ ہے۔“  
”منیزہ بیگم نجائے کہاں کھو گئی تھیں۔“  
”آج وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کل کو ملنے کی خواہش کرے گا۔“ شہلا ان کی کیفیات سے بے خبر بول رہی تھی ”پرسوں اسے گھمائے پھر ان کی بات کرے گا۔ اور۔۔۔ اور پھر۔۔۔ شاید قانونی طور پر اسے ساتھ۔“

”خدا“ حق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر بچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا بہنوئی عزراں شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔  
”رجحہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائیں شدید بیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ٹنک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شبابیت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ بلقیس بانو اس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔“  
”اللہ شہلا اپنی ماں منیزہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔“

## سلاوین قسطنطین

وہ اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھا اطمینان سے اپنے کھیلوں میں مگن تھا۔ بلا کس کے یہاں سے وہ اپنے پسندیدہ رنگوں کے بلا کس جمع کر کے کسی کھلونے کا ماڈل بنانے میں مصروف تھا۔  
”شہلا آرام کر سی رہی تھی اسے دیکھ کر جاری تھی پھر دو ایسوں سے اس کی تعلق کوئی معلوم آتا۔ ہم کامیگزین اس کی گود میں ادھ کھلا بڑا ہوا تھا۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ میگزین اس کی گود میں کھاتی رہی تھی۔ وہ اس میں سے ایک لفظ نہیں نہ پڑھ سکتی تھی۔ اس کا ذہن پچھلی زندگی کے اوراق گھٹکا لے رہا تھا۔ منیزہ بیگم نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھی میز پر دھیرے سے رکھا تب وہ چونکی۔“  
”ماحق تکلیف کی امی آپ نے۔“ وہ زبردستی مسکرائی ”میں کچھ دیر پہلے ہی افیقہ نے چائے بنائی تھی۔“  
”تمہیں کب اس کی بنائی ہوئی چائے پسند آتی ہے۔ میں کیا جانتی نہیں!“ وہ محبت سے بولیں۔

”سارا دن کام میں لگی رہتی ہیں۔“ شہلا نے ماں کے ہاتھ تھام لے کر تھکتی نہیں ہیں؟“  
”منیزہ بیگم مسکرائے لگیں۔“  
”بوڑھی جان ہو سکتا ہے کبھی تھک بھی جاتی ہو ماں نہیں تھکتی۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

PIOT

”ایک بات پوچھوں امی آپ سے۔۔۔“ شہلا ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔  
”ہاں پوچھو اجازت لینے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔“ وہ مسکرائیں۔  
”شہلا چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تو منیزہ بیگم اس کے چہرے پر اضطراب دیکھ کر فکر مند سی ہو گئیں۔“  
”کیا بات ہے شہلا؟ کیا کہہ رہی تھیں تم؟“  
”بچہ ماں کا ہوتا ہے یا باپ کا؟“ اس نے ابھی ابھی نظریں ان کے چہرے پر نکا دیں۔ منیزہ بیگم کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ وہ اس کی بات کا کچھ جواب نہ دے پائیں۔

”بچہ۔۔۔ باپ کا ہوتا ہے۔ کیوں امی؟ جو ماں نو ماہ تک ہر طرح کی تکلیف اکیلی جان پر ہنستے کھیلتے سہہ جاتی ہے اس خوش کن امید پر کہ اس کی گود میں ایک پھول کھل کر اس کے وجود کو گلستان بنا دے گا۔ جو ماں زچگی کا اذیت ناک بیسوں کو ایک کلکاری سننے کی خواہش میں آگ کا دریا سمجھ کر بار کر لیتی ہے جو اپنی راتوں کی میٹھی نیند سے بخوشی دستبردار ہو جاتی ہے محض اس خوف سے کہ ساتھ رکھا جھولا اگر رک گیا تو اس کا تخت جگر اپنی معصوم نیند سے چونک کر ڈر کر رونے لگے گا۔ وہ ماں ہار جاتی ہے امی؟ وہ ماں ہار جاتی ہے۔ اس شخص سے۔۔۔ جو محض چند لمحوں کی نشاط آفریں جاو گری سے باپ بننے کی پر غور مسرت حاصل کر لیتا ہے۔ ماں ہار جاتی ہے۔“



اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سبک اٹھی۔

”شہلا! میری جان!“ منیوہ بیگم گھبرا گئیں۔

عمر نے ماں کو روکنا ہوا تو بھلا کس رو نہ ہوا چلا آیا۔

”مما! آپ رو رہی ہیں۔ نانو! آپ نے میری ماما کو ڈانٹا ہے؟“ وہ منیوہ بیگم سے پوچھنے لگا۔

”نہیں بیٹا! میں بھلا اپنی بیٹی کو کیوں ڈانٹوں گی اور مہارو نہیں رہی ہیں۔ ان کی آنکھ میں کچھ چلا گیا۔ انہوں نے اسے بھلا ناچا ہا۔ عمر نے ماں کے ہاتھ پکڑ کر کھینچے۔

”دیکھا۔ مہارو رہی ہیں۔ نانو! آپ کو کچھ بتا نہیں چلا۔ آپ ایسے ہی کہتی رہتی ہیں۔ بے چاری ماما! کا چہرہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے صاف کرنے لگا۔ شہلا نے اسے سینے سے لگا لیا۔



”میری دور رس نگاہیں کہتی ہیں کہ اگر آپ کے بال کالے ہو جائیں اور آپ کا چہرہ بلا سنک سرجری سے فری کر دیا جائے تو ایتقان پھپھو آپ کے سامنے پانی بھریں گی۔“

حزہ شفیقہ حیات کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ علی اور نانو بھی ارد گرد موجود تھے۔ وہ سیب چھل کر کھانے لگے۔

”جانتی ہوں تمہاری دور رس نگاہوں کو۔“ انہوں نے بیان سے علی کے سر پر چپٹ لگائی۔ ”رزت! پھر پوچھوں گی۔“

”بتائیں دادی! علی نے بھی اشتیاق کا مظاہرہ کیا۔“ کیا آپ بہت خوب صورت تھیں؟ اصل میں وہ بھی

صورت ہوں گی آپ۔“ ”ہائیں! یہ اصلی نقلی خوب صورتی کیا ہے؟“ انہوں نے اپنے بھانکے ہاتھ کر گھورا۔

”آج کل کی جو بیوی ہے نادادی! وہ سب فراڈ ہے۔“ اوشا کوئی خوب صورتی ہے۔ رات کو گھر میں تقریب لڑکیاں صبح سے چہرے پر مختلف کریمیں مل مل کر ادھ موٹی ہو جاتی ہیں۔ تب کہیں جا کر ہلکی سی چمک نظر آتی ہے۔

چہرے پر۔“ ”جین میں کام کرتی ثانیہ اور سدرہ کے کان کھڑے ہوئے۔ ہماری عریشہ کو دیکھ لیں۔“ سیلی کے گھر رات آٹھ بجے جانا ہے تو صبح آٹھ بجے سے صبح کی تیاری کا

جاتا ہے۔ بالوں میں اینڈا منہ پہ اینٹن بازوؤں پر ہلیج کریم۔ گھنٹہ بھر تو ناخن فائل کرنے میں لگاتی ہے۔ مزے سے بھرے کر رہا تھا۔

ثانیہ نے سدرہ کو کہنی ماری۔ دونوں منہ دبا کر ہنسنے لگیں۔

”یہ نقلی بیوی ہی ہے نا! آپ تو بس نہادھو کر لمبے بالوں کی سادہ سی چوٹی بناتی ہوں گی۔“ نافع نے بھی کھاتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

”اور دادا ابو۔“ ہائے ہائے۔ کہتے ہوں گے صدقے جاواں!“ علی نے آنکھیں بند کر کے گویا برسوں پر ذہن میں لانے کی کوشش کی۔

شفیقہ حیات کا چہرہ لودے اٹھا تھا۔ لبوں پر بیگی بیگی مسکراہٹ چلی آئی تھی۔

”ہاں تو اور کیا۔“ وہ بولیں۔ ”یہ اٹنے سیدھے فیشنوں کا رواج تو اب نکلا ہے۔ ماما کو ناری اور بیانیہ ہی گیا۔ اسے منہ سے پوچھنا پڑتا ہے کہ اے بی! اللہ رکھے خیر سے شادی شدہ ہو؟ جواب آتا ہے ”نہیں۔ ابھی تو منگنی ہوئی ہے۔“ لڑکے خوب محفوظ ہوئے۔

”دیکھیں نادادی! بھلا کنواری لڑکیاں ناک میں لونگ پنے اچھی لگتی ہیں؟“ حمزہ جوش میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ہائے۔ برا جانتے تھے لوگ۔“ انہوں نے ہاتھ ہلایا۔

”اور۔۔۔ اتنا میک اپ کرنے کی اجازت ملتی تھی آپ کے زمانے میں؟“ نافع نے ٹکڑا لگایا۔

”تمہارے تو دادا ایتنا خفا ہوتے تھے۔ گالوں پر سرخی نہیں لگانے دیتے تھے۔ کہتے تھے بری عورتیں لگاتی ہیں۔

تو بس بیان کھالتی تھی۔ اسی سے ہونٹ سرخ ہو جاتے تھے۔ کرن لگا دوپٹہ اوڑھ لیتے تھے سادے سوٹ پر۔ اللہ خیر صلا۔“

”پھر بھی دادی! پھر بھی آپ اتنی پیاری لگتی ہوں گی کہ کیا یہ آج کل کی فیشن زدہ لڑکیاں لگیا سکیں گی۔ واہ واہ علی ذرا تصور کرو۔ پیاری دادی ہر اسوٹ پہن کر کرن والا دوپٹہ ماتھے تک اوڑھے پان کھا کر جب مسکراتی ہوں۔

کیا دل فریب منظر ہوتا ہو گا۔“ نیچل بیوی۔“ ”بیچارے۔ نیچل بیوی۔ اب تو تصور ہی محال ہے۔ ہر چیز جعلی ہے۔“

”والڈا بیوی کا زمانہ ہے یا۔“ نافع نے بھی مایوسی سے سر ہلایا۔ ”ڈر سنک نیبل پروس کریمیں تو محض وقتی طور پر

را نظر آنے کے لیے رکھی ہوئی ملتی ہیں۔ لپ اسٹک کے ڈھیر میں سے بیچنگ لپ اسٹک ڈھونڈنے میں آدھا لگتا ہے۔ پھر ہاتھ پیروں کی باری آتی ہے تو یہ گزر بھر کے ناخنوں پر دو دو تین تین کوٹ لگتے ہیں ناخن

کے نیچل کریمیں جا کر مطمئن ہوتی ہیں۔“ ”تو یہ تو یہ کتنی ہوں ان بچیوں کو۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ بھٹیر خیال بہت بڑھ گئی ہے دنیا میں۔ اب دنیا

ستوری کی ہے۔ پھر ہم جیسے سوچتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں بے چاریاں قد امت پسند کھلا کر زنجیکرٹ نہ کر دی

جیات۔ سوچو ڈاڑھی ہم بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔“ ”حیات! یہ تو یہ لڑکیوں کا بھی فیور کیا۔

اتنی میں مخالفت میں نیچے کے میدان میں اتر چکی تھی۔ ثانیہ اور سدرہ کچن کے پچھلے دروازے سے

کر دیں۔ اعمیہ اور شہلا کو لے کر گئیں۔ دو منٹ کے رستے میں انہوں نے خوب خوب مہرج مسالے لگا کر

کی باتیں سنائی تھیں۔“ ”اسلام علیکم۔“ انہوں نے اپنے اوار کے سر پر سلام کیا۔

شفیقہ حیات نے جواب دیا۔ ”ابھی۔“ کا اعمیہ نے انہیں دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ ”کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“

”بس یونہی۔“ اوشا دھڑکی ہانک رہے ہیں۔

”ہم دادی جان کی تعریف کر رہے تھے۔ اس عمر میں بھی کتنی خوب صورت نظر آتی ہیں۔“ علی جھٹ بولا۔

”نیچل بیوی۔ نیچل بیوی۔“ ثانیہ نے عریشہ کو کہنی مارتے ہوئے بتایا۔ ”یہی کہہ رہے تھے۔“

”ارے دادی جان! آج کل کے تو لڑکے بھی میک اپ کرتے ہیں۔ لڑکیاں بے چاریاں تو یونہی بدنام ہیں۔

علی؟“ علی اور حمزہ بغلیں جھانکنے لگے۔

”ہائیں!“ شفیقہ حیات انہیں گھورنے لگیں ”چھلنی بولے سوئی سے تیرے پیٹ میں چھید؟ چلو وہ تو لڑکیاں  
 بالیاں ہیں۔ ان کا تو فطری شوق ٹھہرا بننا سنو رنا تمہارے داغوں میں یہ کیا فتور پلنے لگا؟“  
 ”ارے واڈی جان! کہاں اس بی جھالو کی باتوں میں آ رہی ہیں۔“ حمزہ نے اسے آنکھیں دکھائیں ”یہ تو امی کا  
 کاربن کا پی ہے۔ بات کا بنگلہ بنانا کوئی اس سے سیکھے۔“  
 ”اور نافع بھائی! آپ اپنی کہنے!“ ثانیہ مزے سے بولی۔ ”آپ کے دوست کی منگنی تھی جس دن۔۔۔ آپ  
 مجھ سے کیا کروایا تھا؟“  
 ”چپ۔۔۔ خاموش۔ خبردار۔“ وہ گھبرا گیا۔  
 ”بتاؤ۔۔۔ بتاؤ۔“ لڑکیوں نے شور مچا دیا۔  
 ”فیصل کروا رہے تھے مجھ سے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی تو سب نے قہقہہ لگایا۔ نافع پر منوں پانی پڑ گیا تھا۔ شہ  
 حیات ہنس رہی تھیں۔  
 ”دیکھو ان دیوانوں کو۔ بیٹھے لڑکیوں پر باتیں بنا رہے ہیں۔ مجھے بھی ساتھ لگالیا۔“  
 ”آپ سے ادھار چاہیے ہو گا تا ئی امی ان کو۔“ ناعمہ نے منہ بنا کر کہا۔ لڑکوں نے خاموشی سے کھسک لینے  
 ہی عافیت جانی تھی۔  
 ”مما! یہ مجھے ہوم ورک نہیں کرنے دیتی۔“ مومن گہرا گلا سا کچن کے دروازے تک آیا تھا۔ سالن کی پتلی  
 میں بے دلی سے چیخ بھلاتی ہوئی ایقان چونکی تھی۔  
 ”کیوں بیٹا! کیا مسئلہ ہے؟“  
 ”بس کچھ گندھی لگی رہی ہے۔۔۔ میسرز پیپرز پڑھ رہی ہے۔“ وہ سخت خفا تھا۔ ایقان کچن سے نکل کر با  
 لاؤنج میں چلی آئی۔ لال فراک میں ملبوس چھوٹی سی ایمان مچھیریں سالن کے لیے بیٹھی تھیں۔  
 ”یہ میلا ہے۔“ اس نے ایقان کو دیکھتے ہی کہا۔  
 ”آپ کا تھی۔“ ایمان نے کہا۔ ”ایقان نے ایسا ڈانٹ لیا۔“ اس نے بھائی کو دیکھا۔  
 ”سُنیں!“ اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔  
 ”ایمان! تنگ نہیں کرتے بیٹا۔۔۔“ وہ خفگی سے بولی۔  
 ”میں نہیں دوں گی۔“ وہ اٹھ کر بھاگنے لگی۔ ایمان نے جھنجھلا کر اس سے جیومیٹری باکس چھینا اور اسے  
 چپت لگائی۔  
 ”خبردار جو بھائی کو تنگ کیا۔ گندی بچی!“ ایمان روتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی۔ وہ بیزار بیزار سی واپس کچن  
 آئی۔ اس کے اندر عجیب سی کیفیت بیدار ہو رہی تھی۔ وہ کچھ کچھ سمجھ رہی تھی کچھ کنفیوز ہو رہی تھی۔  
 چولہے کے قریب آتے ہی اسے سالن کی مہک سخت ناگوار محسوس ہوئی۔ اس نے فوری طور پر ناک پر ہاتھ  
 لیا۔ اسے ابکائی آگئی تھی۔ چند سیکنڈ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن دوسری مرتبہ ابکائی کے آتے  
 ہی وہ تیزی سے سنک تک آئی تھی۔ مسلسل ابکائیوں کے باعث وہ نڈھال سی ہو گئی تھی۔  
 مومن اس کی غیر معمولی آوازوں سے گھبرا کر کچن میں چلا آیا تھا اور اب اس کا دامن تھامے سوال پر سوال  
 تھا۔  
 ”مما۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ ممما ایسے کیوں کر رہی ہیں۔۔۔ ممما آپ نے کیا کھا لیا ہے؟“ وہ اسے جواب دینے کے

نہ تھی۔ اندر کمرے سے ایمان کے رونے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ اس کے رونے سے ایقان کا دل مزید خراب ہو رہا تھا۔ وہ اندر جا کر اسے پیار کرنا چاہتی۔ لیکن ابکائیوں کا سلسلہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔  
کچھ دیر بعد وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی۔ منہ صاف کر کے اس نے چہرہ دھویا اور فریق سے پانی نکال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ مومن اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔  
”مما! آپ تھیک ہیں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ایقان ہولے سے مسکرا دی۔  
”ہاں جانو! میں تھیک ہوں۔“ اس نے دھیرے سے اس کا گال چھوا۔ پھر وہ اٹھ کر تیزی سے اندر کی جانب بڑھی۔  
”نہی ایمان فرش پر بیٹھی سنک رہی تھی۔ ماں کی ڈانٹ کو اس نے بہت محسوس کیا تھا۔  
ایقان نے اسے بازوؤں میں بھر کر چوما۔ اس کا چہرہ صاف کیا۔  
”آپ گندی ماماں!“ اس نے ناک چڑھائی ”ڈانٹتی ہیں۔“  
”سوری!“ وہ معصومینہ لگی۔  
”مما! آپ کو کیا ہوا تھا؟“ مومن کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ ایقان کچھ سوچ کر مسکرا دی۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔۔۔“ رابعہ بیگم خوش ہو کر بولیں ”ماں جان کو کیا؟“  
”تب ہی تو آپ سے کہہ رہی ہوں۔“ وہ دم دم سروں میں بولی ”آپ بتا دیں نا۔“  
”گو تم اب بھی شراؤ گی؟“ وہ جی بھر کر نہیں ”چھا خیر۔ میں اس کے کئے دیتی ہوں۔ میں تم یہاں کیوں نہیں آجاتیں؟“  
وہ ایقان سے فون پر محو گفتگو تھیں۔ وردہ اور ناعملہ ان کی باتیں سن کر نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں۔  
”یاجی۔ ایک تو مومن کی اسکو لنگ کا مسئلہ ہے۔ وہاں اس کا سیکولر دور پڑتا ہے۔ پھر بھالی جان کے منظور نظر مجھے ایک آنکھ نہیں بھارتے۔ انہوں نے تو مجھ سے میرا منہ کھینچا ہوا ہے۔ جب آوان کے دیدار سے فیض یاب ضرور ہونا پڑتا ہے۔“ وہ چل کر بولی۔ رابعہ بیگم کو ہنسی آگئی۔  
”اتنی اتنی سی باتوں کو دل پر نہیں لیا کرتے ایقان! زندگی میں تو نجانے کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تم تو بہت نازک مزاج ہو۔۔۔ ماں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔“  
”بیجے! آپ بھی ماں کی ہم خیال ہو گئیں۔“ اس نے دہائی دی۔ ”میں یونہی خود کو بہت متحمل مروج خیال کرتا ہوں۔“  
”وہم ہے تمہارا۔۔۔“ وہ مسکرائیں ”اچھا خیر یہ تو یونہی مذاق ہوا۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں تم چلی آؤ تو اچھا ہو۔ اس حال میں تمہارا یوں تن تنہا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ دو سہرا بہت ضروری ہے۔“  
”کچھ نہیں ہوتا یاجی! بہت سی عورتیں رہتی ہیں۔“ وہ لا پرواہی سے بولی ”میں آؤں گی کسی روز!“  
”اچھا!“ اس نے تامل تھا۔ ”اللہ تمہارا ہو۔“ وہ سری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

وہ ہمیشہ ہی اپنے گھر کی سڑک کا موڑ یونہی بے پرواہی سے کاٹا کرتا تھا۔ موٹر بائیک کو فل اسپید سے دوڑاتے ہوئے اس نے جو بھی موٹر گاڑا سامنے سے آتے سفید آٹو کے ڈرائیور نے بے حد غلٹ میں بریک لگائے تھے۔  
ہاشم کو بھی بائیک روکتے روکتے سیکند زکی دیر ہوئی۔ بائیک گاڑی سے لگ گئی تھی۔ گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ

پر سوار ڈاکٹر شہلانے بھنا کر شیشہ نیچے کر کے سر نکالا۔

”بہت جلدی ہے آپ کو؟“ وہ غصے سے بولی۔ پھر ہاشم کو پہچان کر اس کے تاثرات بدل گئے۔ ہاشم بائیک سے اتر کر اس کے قریب چلا آیا۔  
”معذرت خواہ ہوں۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔ سن گلاسز میں چھپی ہوئی آنکھوں کا تاثر پوشیدہ تھا لیکن اس کے لبوں کے کنارے دم دم سا رُخا نمودار ہوا۔  
”سوری۔۔۔ میں نے آپ کو دیر سے پہچانا۔“ وہ بولی ”لیکن غلطی بہر حال آپ کی ہے۔“  
”تسلیم! میں پھر معذرت خواہ ہوں۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”آپ بائیک بہت تیز چلاتے ہیں۔ غلط بات ہے۔ اس دن بھی آپ سلف ہو گئے تھے۔ میں بار بار مفت علاج نہیں کرتی۔“ اب کی بار وہ کھل کر مسکرا دی۔  
ہاشم کچھ بول نہ سکا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے جی میں خواہش ابھری تھی کہ سن گلاسز کے پیچھے چھپی ہوئی اس کی آنکھیں دیکھ سکے۔

”ہیملٹ پنا کریں۔“ اس نے مشورہ دیتے ہوئے شیشہ چڑھا لیا تھا۔ گویا اشارہ تھا کہ وہ اپنی بائیک سامنے سے لے کر ہاشم سے قدموں سے بائیک کی جانب بڑھ گیا۔

”نہی۔ یہ وہ سٹہ مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔ صاف کئے دیتی ہوں۔“ دال صاف کرتے ہوئے فردوس بیگم نے ہاشم کی آواز سے بٹی کر دیکھا۔ ”اب اگر ان باتوں سے تمہاری ساس کا مقصد کچھ اور ہے تو انہیں ہماری طرف سے ہرگز بھنڈی دیکھا جائے۔“

ماہین نے خفا خفا ہاشم سے ہاں کو دیکھا۔  
”بیجے! میں نے ہاشم کی اور آپ نے اس میں برائی دیکھی۔ زمینوں سے پھل آئے تھے سب رشتہ داروں کو۔ ہاشم نے ہاشم کو بھیج دی تو کیا اس میں انہوں نے زرین کو بٹھا کر بھیجا ہے؟ نہیں بیجے تو آپ کہتی ہیں اس سے سرکار کو ملے تو بیجے ہیں بیجے!“  
”بیجے! میں نے ہاشم کی چلتر بازیال خوب دیکھی ہوں میں۔ جب تک ان کے دماغ میں یہ فتنہ نہ گھسا تھا، تو وہ یونہی ہی رہتا۔ کسی دعوت میں ملاقات ہوئی تو دعا سلام تک میں خود جا کر کرتی تھی۔ وہ بڑی بی اپنی جگہ نہ چھوڑتی تھیں۔ اب ماشاء اللہ ہاشم میاں کی پرہیزی پوری ہوئی اور اللہ نے عزت والی نوکری دی تو ان کی تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ کبھی پھل بھیجتی ہیں تو کبھی مٹھائی، جب آئیں گی بیٹی کو سجا بنا کر ضرور ساتھ لائیں گی۔ ہاں!“  
ماہین نے آکٹا کر ماں کو دیکھا۔

”تو امی! اگر ان کے دماغ میں ایسی کوئی بات ہے بھی تو اس پر سوچا تو جا سکتا ہے، زرین اب اتنی گہری بھی نہیں ہے۔ اچھے بھلے رشتے آتے ہیں اس کے۔ وہ تو۔۔۔ میرا خیال ہے۔ ہاشم بھائی کو دیکھ کر خود ہی انٹر سٹڈ ہو گئی ہے۔“

”اے ہٹو!“ فردوس بیگم اچھل ہی پڑیں ”خبردار جو اس بارے میں سوچا بھی تو۔ ماشاء اللہ! اللہ نظر بد سے بچائے شہزادوں جیسا میرا بیٹا۔ اس کے لیے وہ چھوٹی آنکھوں والی ہی رہ گئی ہے؟“  
ماہین کو سخت آؤ آیا۔

”خدا را امی! اتنا غور بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اچھی جگہ لکھنگ لڑکی ہے۔ آپ کو لے دے کر اس کی آنکھیں

”جی نظر آئیں؟ کتنا فیئر کا پیلکشن ہے اس کا۔۔۔ پڑھی لکھی ہے اور کیا چاہیے۔“  
 ”بس لی! تم رہنے ہی دو۔“ انہوں نے بیزاری سے تھاں پٹھا۔ ”میں خود دھونڈ لوں گی اپنے بیٹے کے لیے لڑکی۔ دو چار میٹھی باتیں کر کے انہوں نے تمہیں پھسلا لیا۔۔۔ تم کل کی پچی ”ان باتوں کو کیا سمجھو۔“

ماہین ہونٹ چباتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔  
 حقیقت یہ تھی کہ خود تسنیم نے اس سے اس سلسلے میں بات کی تھی اور وہ شوہر کی نظروں میں اپنا قد بلند رکھنا چاہتی تھی۔

”ہاشم بھائی سے تو پوچھ کر دیکھ لیں۔“ اس نے ایک رہی سہی کوشش بھی کر ڈالی۔  
 فردوس بیگم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ چہرہ غیض و غضب کا شاہکار بن گیا۔  
 ”ان سے کیا پوچھوں؟ شہزادہ سلیم سے! انارکلی پسند کی ہے انہوں نے۔۔۔ بلکہ انارکلی کیوں مہر النساء کہوں۔  
 نور جہاں لقب دیں گے اسے۔ ہمارے سروں پر لا کر بٹھائیں گے ایک بچے کی ماں کو۔“ ماہین حیران پریشان ان کی بے سربا گفتگو سننے لگی۔

”بھری دنیا میں انہیں وہی ہٹا لگی نظر آئی۔۔۔ میں سمجھتی تھی فتور لکھ گیا ہو گا داغ سے، مگر اب تو وہی ڈھاک کے تین بات۔“

”کیا کہہ رہی ہیں امی!“ وہ کچھ الجھتے ہوئے بولی۔ ”آپ بھائی سے بات کی تھی؟“  
 ”کی تھی! جب ہی تو سلگ رہی ہوں۔“ وہ اپنا بازو دبائے لگیں۔  
 ”پھر نہ کیا کہا انہوں نے؟“

”بتا تو رہی ہوں۔ اسی منحوس کے چکر میں ہے۔“  
 ”ہائے اللہ!“ ماہین نے سینے پہ ہاتھ رکھا ”وہ بھولے نہیں اب تک؟“ فردوس بیگم منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئیں۔

”پھر بھی۔ پھر بھی آپ زرین کے رشتے کی مخالفت کر رہی ہیں۔“ ماہین ماں پر غصہ نکالنے لگی۔ ”حالانکہ اس مطلقہ ایک بچے کی ماں سے تو زرین ہزار درجے بہتر ہے۔ کنواری تو ہے۔“

”ارے تو دنیا میں وہی ایک کنواری نہ گئی؟“ فردوس بیگم جل کر بولیں ”باقی سب بیاہتا ہوئیں؟ لڑکی! تیرا داغ ہے کیا ہے؟“

ماہین خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا منہ بن گیا تھا۔ اسی لمحے عریضہ گنگنائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ بے فکری اور المزین اس کے انگ انگ سے چھلک رہا تھا۔ جو گیارنگ کے پرنٹڈ سوٹ میں اس کا سراپا بہار دکھلا رہا تھا۔

”آگئیں لی پھر نہ!“ فردوس بیگم نے اسے گھورا ”بھال ہے یہ لڑکی گھر میں ملے۔“ عریضہ نے ماں اور بہن کے ثیور ملاحظہ کیے تو اس کی بے فکری میں قدرے کمی آئی۔ گنگناہٹ بھی رفو چکر ہوئی۔

”آئی۔۔۔ آپ کب آئیں؟“ وہ خفیف سی ہو گئی۔  
 ”تمہیں دعا سلام کی فرصت مل گئی؟“ وہ بھی بگڑی بیٹھی تھی۔ عریضہ نے شرمندہ سی ہو کر حسام کو اٹھالیا اور پیار کرنے لگی۔



”میں ہوتی تو محترم کا داغ درست کر دیتی۔ کمال ہے! کتنا بھی کانفیڈنس نہیں ہے آپ میں کہ اس کو کھری کھری سناتیں، شرم غیرت یاد دلاتیں۔“ انیقہ، پھری ہوئی تھی۔ شہلا مسکرا دی۔

”یہ طنز کہاں سے لاؤں؟ ایک ڈری سہی ماں میں بھلا اتنا رعب ہو سکتا ہے؟“  
 ”کمال ہے! ہم کیوں ڈریں؟ ہم نے کہیں ڈاکہ ڈالا ہے؟ کسی کی چوری کی ہے؟ اسے کوئی ڈر خوف نہیں۔ اپنے کیے پر شرمندگی نہیں، پچھتاوا نہیں۔ اتنے سالوں بعد یاد آیا کہ کوئی بیٹا بھی پیدا کیا تھا، واہ صاحب بہت خوب، شہلا خاموشی سے سنتی رہی اور بے بسی سے مسکراتی رہی۔“

”آئے تو سہی محترم کا فون! سب کس بل نکال دوں گی۔“  
 ”پلیز انیقہ۔“ شہلا نے التجا کی ”کچھ مت کہنا۔ اس کی بات عمر سے کروا دنا۔ دیکھو وہ شرافت کی جون میں ہے، کیا خبر! کب اس کا داغ الٹ جائے، عمر کی محبت میں نہ سہی، ہماری ضد میں وہ اسے اپنی کسٹڈی میں لینے کا دعویٰ دائر کر دے۔ میں تو مر جاؤں گی انیقہ! عمر کے بغیر۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔“

دو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ انیقہ کا سب جوش و خروش ہوا ہو گیا۔ وہ ہاتھ پر بل لیے اسے دیکھنے لگی۔  
 ”جانتی ہیں آپ! عورت کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ یہ آنسو۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”پتا نہیں!“ اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں ”میں نے تو انہیں سب سے اچھا دوست پایا ہے۔“  
 ”نہ نہ!“ وہ طنز سے ہنس دی ”دل کا نقصان، جاں کا زیاں، بینائی کا عدو۔ کیا دوستی کرتے ہیں یہ آپ سے؟“  
 ”نہ نہ گھرے گھرے سانس لیے۔“

”دل کا غم!“ انکھوں کے رستے نہ نکلے تو شاید اتنا جس اس قدر روج نہ سہہ پائے یہ غریب۔ دکھ کی شدت سے پھٹ جاتے، آنکھیں دھل کر صاف ہو جاتی ہیں تو سوچ، ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔“

”ماموں آگئے۔ ماموں آگئے۔“ عمر شور مچاتا اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہی چونک اٹھیں۔ اس کے پیچھے ہنستا مسکراتا عبا تھا۔

”وہ سلام کیا؟“  
 ”وہ سلام کیا؟“  
 ”وہ سلام کیا؟“

”اچانک آگئے اور ہونٹ منہ فون نہ کوئی پروگرام۔“  
 ”بس چاہا کہ سوجھ بوجھ نہ ہو۔ ذرا دن میں نکل کر دیکھیں۔“ اس نے عمر کو گود میں اٹھالیا۔  
 ”بہت خوب!“ شہلا، جس پر ”حدِ نظر سے بچائے۔“

”بچو، بچو، بچو!“  
 ”بچو، بچو، بچو!“  
 ”بچو، بچو، بچو!“

”پر بھائی کیسی چل رہی ہے؟“ شہلا نے محبت سے بھائی کا چہرہ دیکھا۔  
 ”زبردست! ہمیشہ کی طرح۔“ پھر وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”آئی!۔۔۔ آپ رو رہی تھیں؟“  
 ”ارے۔۔۔ نہیں یا گل!“ وہ ہنس دی ”میں کیوں رونے لگی۔“

”لگتا ہے۔۔۔ آپ کی آنکھیں۔“ منیذہ بیگم چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ عباد کی آمد کی خوشی کی داستان کہہ رہا تھا۔

”یہ لوہ۔ گرم گرم سمو سے کھاؤ۔ میں نے دو دن پہلے ہی بنا کر فریز کیے تھے۔ سوچتی تھی، جانے عبا کب آئے گا۔ بہت شوق سے کھاتے ہو نا؟“ انہوں نے پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔  
 ”یعنی صرف عبا کے لیے بنے ہیں۔“ انیقہ نے ناک بھوں چڑھائی ”ہم خالی چائے پر رخصتے جائیں گے؟“  
 ”کبھی تم سے کمی کی ہے میں نے؟“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر چیت لگائی تھی۔ انیقہ نے لاڈ سے ان



کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔  
 ”میں جانتی ہوں۔۔۔ تینوں میں آپ سب سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔۔۔ ہیں نا امی؟“ منیوہ بیگم مسکرا دی  
 تھیں۔ ان کی پلکوں میں نمی تھی۔



نفیسہ خالہ دم بخود بیٹھی تھیں۔ ربیعہ ان کے پاس ان کی طرح پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ دونوں کے درمیان  
 خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا تھا۔

”بھلا بتاؤ!“ آخر کار خالہ نے ایک آہ بھری۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے نا خالہ جان؟“ وہ متذبذب تھی۔

نفیسہ خالہ چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔

”خدا نے مجھے اپنی بہت والی بیٹی دے دی ہوتی۔ ایسے نکھٹو مردار لڑکوں سے تو بیٹیاں بھلی۔۔۔ مجھے منع کرتی  
 ہو بیٹی! اس لیے خاموش ہوں، ورنہ ایسی کی بیسی کروالوں کھڑے کھڑے۔۔۔ اس مردار کے سر سے عیش کا بھوت  
 بھی اُتار دوں اور اس بڑھے کے دماغ کی چوکیں بھی درست کر دوں۔۔۔ بھلا بتاؤ! اپنی بیٹی جیسے بچی کو شادی کا منہ  
 دے رہا ہے کینہ۔۔۔ پورے محلے میں ذلیل نہ کر دوں تو نفیسہ نہ کہے گی۔ تمہاری شہم سے خاموش ہو گئی  
 ہوں۔“

”بس خالہ۔۔۔ ابیری اور پتھر والا حساب ہے۔“ ربیعہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

”نہ بیٹی۔۔۔ پیری اور پتھر کا تو پتھر بھی کوئی جوڑ بنتا ہو۔۔۔ یہ تو قرب قیامت کی مثال ہوئی۔ بھلا بتاؤ!“ ان کا پس نہ  
 چلتا تھا وہ کچھ نہ کچھ ضرور ہی کروالیں۔

”ایک بات مانیں گی خالہ؟“ ربیعہ ہولے سے بولی۔  
 ”وس کو بیٹی۔ اللہ قسم میں نے تمہیں دل سے بیٹی سمجھا ہے، محض زبانی کلامی نہیں۔“ خالہ جذباتی ہو رہی  
 تھیں۔

”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔“ ربیعہ کو کہنے میں تامل تھا۔

”کو بیٹی! بتاؤ۔“ خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”آپ بدر کے لیے سمیعہ کا رشتہ مانگ لیں۔“

خالہ خاموش ہو گئی تھیں۔

ربیعہ نے سر اٹھا کر بڑی آس سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”کیا بات ہے خالہ! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟ آپ کو بری لگی میری بات؟“

”نہ بیٹی۔ بات بری نہیں تو بری کیوں لگے گی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ لڑکی کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، کہیں نہ  
 کہیں باپ پر گئی ہوگی اور باپ تو ایسا ہے کہ پتھر مار کر آنکھ نکال دے اس کم بخت کی۔ اب دیکھو نا۔۔۔ اولاد میں ہاں باپ  
 کا اثر تو آتا ہے نا۔“

”میں نے تو سنا ہے سمیعہ کی ماں بہت اچھی عورت تھی۔“ ربیعہ کہیں کھوسی گئی ”وادی بتاتی تھیں۔“

”اں۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ وہ تو جنتی عورت تھی۔“

ربیعہ نے اپنے خیال سے نکل کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”خالہ سمیعہ میری بہت اچھی سہیلی ہے۔ بچپن سے۔۔۔ ساتھ رہا ہے ہمارا۔ میں اسے جانتی ہوں۔

وہ بہت پر خلوص اور ہمدرد لڑکی ہے۔ پھر۔۔۔ پھر آپ کے بیٹے نے اسے بہت سے خواب دکھائے ہیں۔ وہ ان  
 خوابوں کے سہارے جی رہی ہے۔ بدر اس سے تخلص نہ سہی، وہ بدر سے تخلص ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے خالہ کہ  
 اس خلوص کی ناقدری نہیں ہونا چاہیے۔“

”تم بہت اچھی ہو ربیعہ!“ نفیسہ خالہ نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”پھر مانیں گی میری بات؟“ وہ آس سے بولی۔

”میں تو مان لیتی ہوں بیٹی! وہ بڑھا بھی تو راضی ہو۔“

”آپ رشتہ لے جائیے گا خالہ۔۔۔ باقی جوان دونوں کے نصیب میں اللہ نے لکھا ہو۔ ہونا تو وہی ہے۔“

”وہی منائے گی اپنے باپ کو۔ ہم کیوں اس کی منتیں کرتے پھریں۔“ خالہ پھر جل گئی تھیں۔ جب سے ربیعہ  
 نے انہیں سارا قصہ سنایا تھا وہ حاکم پچاسے بار بار نفرت اور کراہیت کا اظہار کرتی تھیں۔

”خالہ! مکان کو تالا ڈال کر اس کی چابی آپ کے حوالے کر جاؤں گی۔“ ربیعہ کو دھیان آیا تھا ”وکانوں کا کرایہ

بھی آپ رکھ لیا کرتا۔ میں نے ان لوگوں کو بھی بتا دیا ہے۔“

”تمہاری امانت ہے بیٹی! سب کچھ۔ جب آؤ گی اپنی امانت پوری پوری پاؤ گی۔“ خالہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔

”میں چلتا تو تمہیں کسی طور نہ جانے دیتی۔۔۔ نجائے تمہاری وادی کو اللہ نے اتنی مہلت کیوں نہ دی۔“ ربیعہ  
 نے اس سانس پر کھلب کھلب آنسو اپنے اندر اتار لیے۔

”خالہ! آپ کو یاد ہے کہ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“

”لو بیٹی۔ یہ بھی کہنے والی بات ہے۔ بھلا بتاؤ!“

ربیعہ کمری سوچ میں گم ہو گئی تھی۔



”سنا ہے نا۔۔۔ میں نے زندہ کیشت لائی ہے ہاشم میاں کے لیے۔“ شفیقہ حیات نے تسبیح روک کر پر خیال انداز میں  
 بسوسے چھاپا۔ وہ ریل کی شرت استری کر رہی تھیں۔ یکدم مڑی تھیں۔

”چھا!“ استری کا پلنگ ریل کے قریب چلی آئیں۔ ”آپ کو کیسے پتا؟“

”عزیزہ نے کچھ اڑنی اڑنی بولی تھی۔ وہ ثانیہ کو بتا رہی تھی۔ میں بھی وہیں قریب ہی بیٹھی تھی۔“

”ابھی۔۔۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

”نہ بیٹی۔ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“ ربیعہ نے اسے دیکھا۔

PHOTO

”رافع والی بات بھولی نہیں ہے وہ۔۔۔“

”جانتی ہوں اس میں کیا راز کی بات۔“

”پھر بھی۔۔۔ اگر ہم کوشش کریں تو معاملات شاید پھر سنبھل سکیں۔۔۔ دیکھو بیٹی! نیک عورتیں ہمیشہ گھر جوڑنے کا ہی سوچتی ہیں کیا سمجھا، کیا سسرال ہر رشتہ بنا ہنا پڑتا ہے۔“

عذرا بیگم اچھ سی گئیں۔ انہوں نے ساس کا چہرہ دیکھا۔

”بات کیا ہے اماں! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”میں کہتی ہوں رافع کے لیے نہ سہی نافع کے لیے مانگ لو عریشہ کو۔“ عذرا بیگم خاموش ہو گئیں۔ شفیقہ حیات ان کو دیکھ گئیں۔

”کیا کہتی ہو؟“

”اماں! وہ اب نہیں مانیں گی۔ بے وجہ ہماری زبان بھی خراب ہوگی اور جتنا بھرم ہے اتنا بھی جائے گا۔ باقی آپ کی مرضی۔“

وہ بے دلی سے بولیں۔ ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں ساس کا مشورہ قطعاً پسند نہ آیا تھا۔

”ارتے بیٹا۔۔۔ مجھ بڑھی کی کیا مرضی! آج سانس ہے کل کو نکل جائے گی۔۔۔ میں تو اس لیے کہتی ہوں کہ خاندان آپس میں جھگڑے رہیں تو اچھا ہے۔۔۔ اپنا لڑکا باہر بیٹھے کو بھرتی ہیں، تم اپنے بیٹے کا کہیں نہ کہیں تو کرو گی تو کیا ہی اچھا ہو بھائی! اچھا ہی آپس میں ایک دوسرے کا بوجھ ہوتا ہے۔“

عذرا بیگم کے سانس کی بات صحیح معنوں میں سمجھ میں آئی تو ان کے چہرے کے زاویے بدلتے۔

”لیکن اماں! ہم نافع کے لیے عریشہ کو مانگ لیں تو کیا ضرور ہے کہ وہ بھی ہارشم کے لیے ہماری لڑکی مانگیں؟“

”سوچیں گی تو ضرور!“ انہیں یقین تھا۔

”اور جو نہ سوچا۔۔۔“

”تو کیا ہوا ان کی سوچ ان کے ساتھ ہمیں کوئی لالچ تو نہیں۔۔۔“

URDU PHOTO

”امی جی! میری شرت اس سے سیلاں لگائیں دو لالیں۔“

”وہ بڑی ہے ذرا سی رہتی ہے کرنے کو۔۔۔“

”ہائیں یعنی میٹنگ اہم ہے۔ شرت ادھوری چھوڑ دی آپ نے۔۔۔“ وہ ہنسنے لگا ”بائی داوے ہاٹ ٹاپک کیا ہے؟“

وہ دونوں مسکرانے لگی تھیں۔

”اماں کا خیال ہے نافع کے لیے عریشہ کا رشتہ مانگا جائے۔“ انہوں نے بڑے بیٹے سے بھی تذکرہ کرنا مناسب سمجھا۔

”وہ خالصتاً زنانہ موضوع۔“ وہ بے نیازی سے شرت پر استری پھیرنے لگا۔

”پھر بھی کچھ رائے تو دو۔۔۔“ شفیقہ حیات نے بھی کہا۔

”میں کیا رائے دوں دادی!“ وہ ہنس دیا تھا ”رائے تو صاحب الرائے سے مانگیے!“ اس کا اشارہ نافع کی طرف تھا۔

”عریشہ اچھی لڑکی ہے نا۔“

”ارے دادی! لڑکیاں سب ہی اچھی ہوتی ہیں۔۔۔“ وہ شرت پین کر بشن بند کرنے لگا۔

”پھر تم نے انکار کیوں کیا تھا؟“ انہوں نے اسے چھیڑا۔

”لیجئے۔ میرا ذکر کیوں نکال بیٹھیں۔ رات گئی بات گئی امی! میں ذرا طفیل کے گھر جا رہا ہوں۔ کچھ دیر ہو جائے گی اچھا اللہ حافظ!“ وہ سٹی کی دھن از سر نو تازہ کرنا ہر نکل گیا۔  
 ”ان لڑکوں کے لیے تو ان کی دوستیاں اہم ہیں۔ گھریلو معاملات اہم نہیں۔“ شفیقہ حیات خفا ہوئیں۔  
 ”ہاشم سے اس کی ایسی کئی دوستی ہے یہ چاہے تو اس سے بات کر سکتا ہے۔“  
 ”نہ اماں! کبھی نہیں مانے گا۔ پھر اچھا بھی نہیں لگتا۔“ عذرا بیگم نے فوراً ”ان کا خیال مسترد کر دیا۔  
 ”پھر کو تو میں فردوس بیگم کے کان میں بات ڈالوں۔“ انہوں نے بات کا تصفیہ کرنا چاہا۔  
 ”کر دیکھیے۔“ وہ دھیرے سے بولی تھیں۔

\*\*\*

شہلا نے اس کالی بی چیک کر کے اپریش بند کیا۔  
 ”بہت اولڈ پریشر ہے۔ کیا بات ہے؟ کھانا پینا بند ہے کیا؟“  
 ”کچھ حلق سے اترے تو کھاؤں نا۔“ وہ بیزاری سے بولی ”جو کھاتی ہو“ اسی وقت حلق سے پس آجائے!  
 ”بری بات ہے ایقان۔! تم خود کو شش نہیں کرو گی تو آسمان سے فرشتے ہیں انہیں تم سے من و سلوئی کے تھال لے کر۔“

”میں بھی تو یہی سمجھاتی ہوں۔“ رابعہ خاتون بولیں ”یہ کسی کی کب سنتی ہے۔ بچھلے سفتے سے برابر فون کر کے بلارہی ہوں۔ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتی رہی۔ کل میں علی کو لے کر ملنے چلی گئی۔ دیکھا تو تقریباً بے ہوش پڑی تھی۔ بچوں کی الگ حالت خراب تھی۔ ماں بھیک نہ ہو تو بچوں کو کون پوچھے گا۔ اسے اتنا بھی اچھا نہیں۔“

”ڈانٹ لیجئے آپ بھی!“ وہ ہولے سے مسکرا دی ”میری سائیڈ کون لے گا؟“  
 شہلا نے اسے ملٹی بوٹا من کی گولیاں لکھ دی تھیں۔

”میں اب چلتی ہوں۔ مجھے ہاسپٹل بھی جانا ہے۔ تم اپنا خیال رکھو ایقان! تمہارے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ جلدی سے ٹھیک ہو کر انہیں توجہ دو۔“ اس نے ننھی ایمان کا گال پر ہونٹے ہونٹے کہا۔  
 ”عمر کیسا ہے؟“ ایقان نے پوچھا۔

”ہوں! اچھا ہے۔“ وہ مسکرا دی ”آج کل عباد کے آگے پیچھے پھرتا ہے۔“  
 ”ماموں کا تو دیوانہ ہے۔“ رابعہ بیگم نے تبصرہ کیا۔  
 ”ماموں بھی تو ایسے ہیں۔“ پیچھے بیٹھی ناعمد گنگائی تھی۔ وردہ کو ہنسی آگئی۔  
 ”کس بات پر ہنسا جا رہا ہے؟“ شہلا اپنا پاس لیے ان تک چلی آئی تھی۔  
 ”کچھ نہیں شہلا باجی!“ وہ گڑبڑا کر رہ گئیں۔

”بیلو نہیں بتانا تو نہ سہی۔“ وہ مسکرائی ”اچھا بھی خدا حافظ۔“

”آئی رہنا شہلا!“ ایقان ہولے سے بولی رابعہ بیگم شہلا کا لکھا ہوا نسخہ دیکھ رہی تھیں۔  
 ”میں بھی رافع سے منگوا لیتی ہوں دوایاں۔“ وہ بولیں ”کیا حال کر لیا ہے اس لڑکی نے اپنا۔“  
 ایقان نے آنکھیں بند کر کے سر تکیے سے ٹکایا تھا۔ آنکھوں میں کسی کی مسکراتی صورت پھرنے لگی تھی۔  
 ”آئی مس یوسنہ آئی مس یو عاشر!“ اس کی بند پلوں میں پانی بھرنے لگا۔

\*\*\*

”نہیں۔ میں تو بہت بریو بوائے ہوں۔ ڈرنا تو نہیں ہوں کسی سے۔“ وہ فون کے تار سے کھیل رہا تھا۔ اس کے قریب بیٹھ کر نوٹس بناتی انیقہ کے احساسات کے سب تار جھنجھار ہے تھے۔ وہ سارے صفحے پر نجانے کیا لکھے جا رہی تھی۔

”خالہ جانی کہتی ہیں، صرف اللہ میاں سے ڈرتے ہیں۔ بھوت اور چڑیلیں تو ہوتے ہی نہیں ہیں۔ سب جھوٹ ہے۔“

منیزہ بیگم بظاہر رسالہ دیکھنے میں مشغول تھیں لیکن ان کا دھیان اس کے لفظ لفظ میں الجھ کر کھٹکا تھا۔  
 ”میرے بابا! وہ تو ہیں ہی نہیں۔ بتا نہیں کہاں ہیں۔ ماما سے پوچھو تو وہ کہتی ہیں بعد میں بتاؤں گی۔“ انیقہ نے جھنجھلا کر قلم بچا اور خفگی سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی سے سر جھکا کر رہ گئیں۔

”سب بچوں کے پپا آتے ہیں پیرٹس میٹنگ میں، میری تو صرف ماما ہوتی ہیں۔ میرا دوست ہے ناککی اس کے پپا نہیں آتے کیونکہ وہ اللہ میاں کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ شاید میرے پپا بھی اللہ میاں کے پاس گئے ہوں۔“  
 ”عمر بے باس بیٹا۔ اب انکل کو خدا حافظ کہہ دو۔“ انیقہ نے آہستگی سے کہا۔ اس نے ریسیور کان سے ہٹا کر خالہ کو دکھایا۔

”نہیں! یہ کیوں ہوں نا انکل سے۔“

”آپ کھینچنے نہیں جا رہے راجہ کے ساتھ؟“

”نہیں!“ اس نے بے نیازی سے جواب دے کر پھر ریسیور کان سے لگا لیا۔

”ہاں! میری خالہ کجالی ہیں۔ یہ ایسے ہی مجھ سے لڑائیاں کرتی رہتی ہیں۔ ماما جیسی؟ نہیں ماما تو لڑائیاں نہیں کرتیں۔ آپ سے کتنی باتیں کرتی ہیں۔“

”اللہ بیٹی جگہ سے اٹھ کر آؤ۔“ نے عمر سے ریسیور چھپٹ کر واپس کر ڈیل پر رکھ دیا۔

”بیس منٹ!“ اس نے پوچھا ”کافی ہے اتنا۔“

عمر خفگی اور قدر کے ساتھ اس کے پاس سے گزرتی ہوئی دیکھتا رہا۔

”آپ نا اصرار کیا۔“ نے عمر سے خالہ جانی کہا۔

”انیقہ!“ منیزہ بیگم نے اسے سرزنش کی۔ ”بچے سے کیوں الجھ رہی ہو؟“

”میں تو باب کا دماغ بھی بھیک کر دوں ماما۔ لیکن شہلا آپ کی وجہ سے چپ ہوں۔“

”وہ بیا شعور سمجھ دار ہے۔ تم ابھی بچی ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔“ وہ رسائی سے بولیں۔

”اتنے اچھے انکل ہیں۔ اتنی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ آپ باتیں بھی نہیں کرتیں اور فون بھی نہیں کرنے دیتیں۔ بالکل اچھی خالہ نہیں ہیں آپ!“ وہ منہ بسور رہا تھا۔

”اچھا جی۔“ انیقہ کا غصہ اس کا منہ دیکھ کر فرد ہو گیا ”آپ تو بہت پیارے بھانجے ہو نا میرے۔ آپ اچھی اچھی باتیں کرو اپنی خالہ سے، گندی خالہ سے۔“

وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کا منہ چومنے لگی۔

”آئی ام مرتبہ جب عباد ماموں آئیں گے نا۔ میں ان کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا لاہور۔ پھر آپ مجھے یاد کیا کریں گی۔“

”آپ بھی مجھے یاد کریں گے جب میں چلی جاؤں گی۔“ وہ مزے سے بولی۔  
 ”آپ؟“ وہ الجھ کر بولا ”آپ کہاں جائیں گی؟“  
 ”سسرال!“ وہ شرمناک بولی۔  
 ”بد تمیز!“ منیوہ بیگم کو ہنسی آگئی تھی ”بچے کے ساتھ ایسی باتیں کرتی ہے۔“

\*\*\*

”لاہور؟“ سمیعہ کی چیخ نکل گئی تھی ”کیوں۔۔۔ کس کے پاس۔۔۔ وہاں کون ہے تمہارا؟“  
 ”میری پچھو کا گھر ہے وہاں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔  
 ”لیکن تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ شاکڈ تھی ”ایسے اچانک۔۔۔ چوروں کی طرح۔“  
 ربیعہ نے سر جھکا لیا۔

”اے بی! جب چور ڈاکو سینہ تان کر چلنے لگیں، دھڑلے سے پھریں تو شریف لوگ یونہی خاموش رہیں۔“  
 کی طرح اپنے کام کرتے ہیں۔“  
 نفیسہ خالہ بھٹنا کر بولی تھیں۔ سمیعہ کچھ نہ سمجھنے والی کیفیت میں گہری سوتی تھی۔  
 ”بچلو بیٹی۔! وقت کم ہے۔“ انہوں نے اس کا ٹرنک سنبھالا۔  
 ربیعہ اپنا بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔  
 ”ربیعہ۔۔۔ تم نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔“ سمیعہ کو بے حد گلہ تھا۔ ”اب جاتے جاتے کہہ رہی ہو۔ کس دل سے رخصت کروں تمہیں؟“ ربیعہ اس کے گلے لگ کر رو دی۔  
 ”مجھے معاف کر دینا سمیعہ۔! میری کچھ مجبوریات تھیں۔ یہ بات میں خود سے بھی چھپا رہی تھی۔“  
 سمیعہ بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ دونوں بہنوں کی طرح تھیں۔  
 ”اب کب ملاقات ہوگی؟“  
 ”اللہ کو علم!“ وہ مختصراً بولی ”وہاں مجھے میرے اپنے مل جائیں۔“  
 اسی لمحے سکندر اندر داخل ہوا۔  
 ”اماں رکشہ آگیا ہے۔“

PHOTO

ربیعہ سمیعہ کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آئی۔ نفیسہ خالہ نے دروازے کو بالادال لڑچاپی اپنے تئیں میں اڑس لی تھی۔ ربیعہ نے رکشہ میں بیٹھ کر دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اپنا گھر دیکھا۔  
 ”ربیعہ۔۔۔ جاؤ یہاں سے۔۔۔ ربیعہ! یہاں سے جاؤ!“  
 اسے رکشے کے شور میں وادی کی آواز آرہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں پر روانی سے بہہ رہے تھے۔

\*\*\*

ریل کے پہیوں کی چٹکھاڑ اس کے دل میں سوراخ کر رہی تھی۔ وہ اندر سے بے حد خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی۔  
 ”خالہ! آپ نے اس بے پرتار بھیج دیا تھا نا۔“ اس نے آخری مرتبہ پوچھا۔  
 ”آں ہاں بیٹی۔! بے فکر رہو۔ تار پہنچ گیا ہو گا۔ تم اطمینان سے سفر کرنا۔ میں نے ٹکٹ بھی مہنگے والے ڈبے کا لیا ہے۔ اس میں اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ تم بے فکر ہو کر اللہ پر بھروسہ کر کے جاؤ۔“

وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔  
 ”آپ مجھے بہت یاد آئیں گی خالہ۔“

”تو کیا میں نہ یاد کروں گی تمہیں۔۔۔“ وہ گلوگیر لمبے میں بولیں۔ ”بھلا بتاؤ!“  
 ”میرے گھر کا خیال رکھنا خالہ! وہاں وادی کی روح رہتی ہے۔“

”جتنا بس میں ہو سکے گا بیٹی! خدا ان بے حس انسانوں کو رسوا کرے گا۔۔۔ بچی کو اپنے گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کر دیا ظالموں نے۔ ایسی اندھیر نگری جسے دیکھو وہی دانت گاڑے بیٹھا ہے۔ بھلا بتاؤ۔“ وہ دکھ سے چور چور رہی تھیں۔

”میں خط لکھوں گی آپ کو۔“  
 ”کوئی پریشانی ہو تو لوٹ آنا بیٹی۔۔۔ آخر میں تو ہوں نا یہاں۔۔۔“  
 ”دعا کرنا خالہ! کوئی پریشانی نہ ہو۔“  
 اس نے ہاتھ میں پکڑے ٹکٹ کو غور سے دیکھا۔

\*\*\*

گاڑی کی اسٹیشن پر رکی تھی۔ عبادی فینڈ ٹوٹ گئی۔ وہ اٹھ کر رتھ سے نیچے آگیا۔ قہر موس سے پانی نکال کر اپنے لگا۔ اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔  
 ”دفعتم!“ اس کی نگاہ اس لڑکی پر پڑی۔ وہاں پان سی وہ لڑکی سرتاپا سیاہ چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔ صرف اس کا سر جھکدار ہنر آہستہ چادر سے باہر تھا۔  
 اس کے چہرے پر فرشتوں کی ہی معصومیت تھی۔ حجاب آلود سیاہ آنکھیں ایک بار اس کی آنکھوں سے ٹکر آئیں۔ پھر جھٹک کر اٹھ گئیں۔  
 عبادی نے اس کے ساتھ سفر کی تلاش کی پھر وہ ناکام ہو گئیں۔ بقیہ دو ہم سفر تو کراچی سے ہی اس کے ساتھ تھے۔

وہ لڑکی شاید اسی چھوٹے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوئی تھی۔ وہ تنہا تھی۔ اس کے انداز میں نا محسوس سی آہستہ آہستہ ایک گود میں رکھے وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔  
 ”آپ اکیلی ہیں؟“ وہ بچانے کیوں اسے مخاطب کیے بغیر نہ رہ سکا۔  
 ”جی!“ اس نے خوف زدہ آنکھوں سے اسے دیکھا تھا ”جی۔۔۔ جی ہاں!“ عبادی نے مسکرایا۔  
 ”کوئی بات نہیں۔ کہاں جا رہی ہیں آپ؟“  
 ”لاہور۔“ اس نے تھوک نگلا۔

”میں بھی لاہور جا رہا ہوں۔“ وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ”چلیں سفر خوشگوار ہو گا! میرا نام عباد ہے۔ آپ کا؟“  
 ”ربیعہ!“ وہ دھیرے سے بولی۔  
 اس کے وجود میں بے پناہ کشش تھی۔ عباد اسے دیکھنے گیا۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ ماہ)



مخ حقائق سے ہٹا کر کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھربچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔  
ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائ میں شدید بیاس کے عالم میں اس سے پالی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے نرنگ میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ بلیٹیس بانوا اس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔  
ڈاکٹر شہلا اپنی ماں منیزہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

## ۸۔ اڑھویں قسط

آہستگی سے دستک دے کر ہاشم اندر داخل ہوا۔  
کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے رافع نے ذرا کی ذرا کی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا پھر اپنے کام میں منہ دے ہو گیا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر حرکت کر رہی تھیں۔  
ہاشم اس کے مقابل گداز صوفے میں دھنس کر بیٹھ گیا۔ رافع نے چند لمحوں بعد پھر ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ غائب دماغی سے پی۔ سی کے مانیٹر پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف پتا چلتا تھا کہ اس کا دھیان کسی اور فضا میں محو پرواز ہے۔  
رافع کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ اپنے کام کی جانب متوجہ ہو گیا۔  
دکھیا کر رہا ہے یا را؟ بڑی دیر بعد ہاشم اپنے خیالوں سے نکلا۔  
”پرو جیکٹ کھلیٹ کر رہا ہوں۔“ وہ مصروف انداز میں گویا ہوا۔  
گہری سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔ ناقدانہ نگاہوں سے وہ رافع کو دیکھنے لگا۔  
سیاہ ٹراؤزر اور سفید ٹی شرٹ میں وہ خالصتاً اپنے گھریلو حلقے میں تختہ بازی تھا۔  
کرنے کے لیے اسی ڈریس کا انتخاب کرتا تھا۔ ماتھے پر بڑی سٹیل اس بات کا ثبوت تھی کہ اس کا پورا دھیان اپنے کام کی جانب تھا۔ مہارت سے چلتی انگلیاں اس کی سوچ کے بھرپور رول ادا کرتی تھیں۔  
کی آمد کو قطعاً لفٹ نہ کرائی تھی۔ ہاشم نے بالآخر اکتا کر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

”یار رافع!“

”ہوں۔“ کچھ دیر بعد مختصر ترین جواب آیا۔  
”چائے پلا!“ رافع کی انگلیاں ایک لخت تھم گئیں سوہ ریو الونگ چیئر کو گھما کر اسے دیکھنے لگا۔  
”میں پلاؤں؟“ وہ حلقے سے اسے گھورنے لگا۔

”ہاں۔ اور کیا؟“ ہاشم کو حیرت ہوئی۔  
”یعنی ایک ”فارغ البال“ قسم کا بندہ از حد مصروف شخص سے یہ فرمائش کرتا کس قدر برا معلوم ہوتا ہے۔“  
انداز ہی نہیں۔  
”یہ بات نہیں ہے۔“ ہاشم نے احتجاج کیا۔ ”ایک بہت پریشان خیال شخص ایک بے حد پرسکون بندے سے یہ فرمائش کر رہا ہے۔ یہ پریشانی شیر کرنے کی استعداد ہے یا را؟“

”پرسکون بندہ؟ اس پرو جیکٹ کو کمپیوٹ کرنے کے خیال نے میری رات کی نیند اور دن کا سکون برباد کر رکھا ہے اور تو کہتا ہے پرسکون بلکہ بے حد پرسکون بندہ۔“  
”ارے ہم نے بھی کیے ہیں بڑے بڑے پرو جیکٹ۔“ ہاشم نے مکھی اڑائی ”دو دن میں دو مارے تھے۔ پر اس روگ کا کوئی علاج بتا میرے دوست!“

”کسی ڈاکٹر سے رجوع کرو۔“ رافع معنی خیز انداز میں بولا۔

”ڈاکٹر سے رجوع کرنے پر تو اماں ناراض ہے۔“ ہاشم بے چارگی سے بولا۔

”اب یا تو روگ کا علاج پوچھ لویا اماں کو منانے کا۔ ایک وقت میں میں ایک علاج تجویز کر سکتا ہوں۔“ رافع نے کرسی ہاشم کی جانب سے مکمل طور پر موڑ لی اور انگلیاں چٹانے لگا۔ گویا ہاشم کی آمد کو شرف مہمانی عطا کر دیا گیا تھا اور اب وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

”سناے ماہین بیگم؟“ تنسیم بھائی کے ہمراہ آنے والی ہیں؟“ ہاشم نے اصل مسئلہ سے اسے آگاہ کیا۔

”سویار آئیں ان کا گھر ہے۔“ جھے کا ہے کے مروڑاٹھ رہے ہیں؟“ رافع نے بھنوس اچکا کر اسے دیکھا۔

”ڈاکٹر اصل تنسیم بھائی کی چھوٹی بہن کا نام ہے میرے لیے۔“ ہاشم نے طنزاً کہا۔

”سی“ اس نے سر ہلایا۔ ”میری اور کنکروالا معاملہ ہے۔“

”کنکرو؟“ اینٹ دل میرے بھائی۔ میری تو کمر لوٹ جائے گی۔“ اس نے دہائی دی۔

”کنکرو؟“ سیلنگ فین پر نگاہ جمائے وہ کچھ دیر مسکراتا رہا۔ ہاشم بری سی صورت بنائے بیٹھا تھا۔

”تیری نہیں تیری خود ساختہ عشق کی کمر ضرور ٹوٹے گی۔“ وہ اسے ڈراتے ہوئے بولا۔

ہاشم اسے گھورتا رہا اور رافع کے لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ ہاشم کے گھورنے کا جواب اس نے جھٹکا۔

”بھئی؟“ ہاشم پر بہت رشک آتا ہے رافع! چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔

”بھئی؟“ تنسیم بھائی کا تھا۔

”ہاشم؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”بھئی؟“ کبھی کبھی؟ یہ مہربانی کیوں ہوتی ہے؟“

”محبت نامی“ شیخ ابتر نے مجھے اسے ”سندباد“ کہا۔ کیوں آخر؟ یہ بلا میرے کاندھوں پر اس بے تکلفی سے

”بھئی؟“ کبھی کبھی مجھے ”بھئی“ پر بہت سخت قسم کا تاؤ آتا ہے۔

”نہیں یار۔“

”سندباد پر؟“

”او فوف۔ الو کی دم۔“ وہ چر گیا۔

”ڈاکٹر شہلا؟“

”ہاں۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

رافع نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ ہاشم نے بات سمجھ کر اسے مڑکا دکھایا۔

”بے گامیرے ہاتھ سے۔“

رافع نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی قابو میں کی۔

”بھئی؟“ کبھی کبھی رشک آتا ہے اس پر کبھی کبھی سخت قسم کا تاؤ آتا ہے۔ وضاحت کسی بات کی نہیں ہے۔

تمہارا مسئلہ کیا ہے آخر؟“

”میرا مسئلہ؟“ وہ خاموش ہو گیا۔ ”یہی تو میرا مسئلہ ہے یا راکہ کبھی کبھی مجھے تم پر رشک اور ڈاکٹر شہلا پر سخت غصہ آتا ہے۔ دس ازرا پوائنٹ۔“

اس کے لب و لہجے میں بے پناہ سنجیدگی تھی۔ رافع بھی سنبھل گیا۔  
”وضاحت کرو۔“ پہلی بار اس نے ہاشم کو سنجیدگی سے دیکھا۔

”سوچتا ہوں رافع! کاش میں بھی تمہاری طرح ہوتا۔ زندگی کو میں نے اسی نظر سے دیکھا ہوتا جس نگاہ سے اسے تم دیکھتے ہو۔ چند مخصوص قسم کے مقاصد پر رہنا ہے، اچھی نوکری کرنی ہے، ماں باپ کی پسند سے شادی کر کے بچے پیدا کرنے ہیں، ان کو بڑا کر کے ان کی شادیاں کرنی ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ذہن میں دھند نہیں بھرتی، آنکھوں میں خواب نہیں بستے، سوچوں میں تلاطم برپا نہیں ہوتا، جذباتوں میں بھنور نہیں پڑتے سب کچھ صاف، سیدھا غصہ کے بندے ہو یا رافع! مجھے تم پر کبھی کبھی بہت رشک آتا ہے۔“

”یہ کبھی کبھی کی تکرار کہتی ہے کہ بہت کچھ بین السطور بھی ہے۔“ رافع نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔  
”ہاں۔ بس کبھی مجھے تمہارا وجود بے مقصد بھی تو لگتا ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔

رافع ہنس دیا۔ ”وضاحت کرو۔“

”یاس۔ کوئی فرق ہو تیل میں اور بندے میں آنکھوں میں بٹی بندھی ہے۔ گول گول گول رہے ہو۔ آدمی اندر تو رسیاں تڑوا کر بھاگے۔ چچ! لیکن بس کبھی کبھی محبت مست کرنا اور رافع! کاش میں بھی محبت انسان اپنی پسند سے کرنا ہے، مقدر اللہ تعالیٰ اپنی پسند سے لکھتا ہے۔ جو بھی Clash ہو جائے تو بڑا نقصان ہوتا ہے بندے کا۔“

رافع گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اپنے دوست کا بکھرا روٹھا اور ٹھاٹھ انداز سے از حد اچھا لگ رہا تھا۔  
”اور تم مجھے اتنے اچھے لگ رہے ہو میاں راجھے! کہ میرا بھی جی چاہ رہا ہے کسی کو چاہ دیکھنے کا“ اس نے جی ہی جی میں سوچا۔  
”اچھا!“ پھر وہ کھنکھار کر بولا۔ ”اور ڈاکٹر صاحبہ پر کس بات کا غصہ آتا ہے؟“

ہاشم چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ رافع نے اس کی آنکھوں میں دھنک سی اترتی دیکھی۔ غالباً ”یہ محبوب کے تصور کا کمال تھا۔“  
”بولو نا۔ اس پر غصہ کیوں آتا ہے؟“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔  
”کبھی اس نے دیکھا ہی نہیں میری طرف اتنے اتنے بے بسی سے یہ میرا سب سے بڑا عیب ہے۔“

خوردگی سے بولا۔  
”محبت کی تو نہیں ہے ہاشم! لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ محبت کبھی بھی قیمت کی محتاج نہیں ہوتی۔ انمول شے کا مول کوئی کیسے دے سکتا ہے؟ چاہو مگر چاہے جانے کی تمنا مت کرو، یہی اصل بنیاد ہے محبت کی۔ جو دام ہائے دہ کیسا عشق؟“

ہاشم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

ہاں مگر کوئی تمنا پس واماں وفا  
مجھ سے پوشیدہ میرے پیش نظر ہوتی ہے

”محبت کرنا الگ بات ہے شادی کر کے گھر سانا الگ معاملہ ہے۔ ان دونوں کو جوڑتے کیوں ہو؟“  
”واہ!“ ہاشم نے چمک کر اسے دیکھا۔ ”میاں ابھی گلی نہیں ہے تمہیں دعا کرو نہ لگے۔ وودھ کا وودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ محبت کر کے تو انسان خدا کو پانے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ وہ محبت کیا جو وصل نہ مانگے۔“

”پھر وہ محبت نہیں ہے۔“ رافع اطمینان سے بولا۔

”پھر وہ کیا ہے؟“

”قرب کی خواہش۔“

”کسی سے قرب کی خواہش کیوں بیدار ہوتی ہے؟ کس جذبے کے تحت؟“

”عورت کے قرب کی خواہش مرد کے خمیر میں گند جی ہے اس لیے۔“

”گویا کسی بھی عورت سے کام چل سکتا ہے؟“

”ہاں۔ شادی کر کے دیکھ لو بھول جاؤ گے سب کچھ۔“

ہاشم چند لمحے اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔

”تم سنجیدہ ہو؟ یہ خیالات واقعی تمہارے ہیں؟“

”آف کورس ہنڈرڈ پرسنٹ۔“

”محبت خواہ کسی سے ہونے شادی کسی اور سے کر کے آدمی ہر بات بھول سکتا ہے؟“

”ہر اتویہی خیال ہے۔“ رافع نے کانڈھے اچکائے۔ ”بھلا ان دہ باتوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟“

”شم اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں خفگی تھی۔“

”یہ کچھ رافع! تمہیں بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“

رافع پھر سے ہنس دیا۔

”ان لمحوں میں تیل نہیں۔“ وہ بولا۔ ”ویسے دعا دینے کا شکریہ!“

”یہ کچھ رافع! تمہیں دعا نہیں بد دعا دی ہے۔“

”آئی۔“ اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ”میں نے ہر حال تمہیں نیک نیتی سے مشورہ دیا ہے۔“

”ہاں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کرلو۔“

”ورہاں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو۔“

”تھینکس!“ وہ مسکراتے ہوئے باپ پر نکل گیا۔

URDU PHOTO

نجانے کتنی دیر بعد اسے بھوک نے ستایا تھا۔ اس نے ایک نگاہ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے نوجوان پر ڈالی۔ وہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ نجانے تھک گیا تھا یا سو گیا تھا۔

بڑے میاں برتھ پر سونے کے لیے جا چکے تھے۔ ان کی بیگم تسبیح کرتے ہوئے اونگھ رہی تھیں۔

ربیعہ نے اپنا لٹچ باکس کھولا۔ نفیسہ خالہ نے بڑے اہتمام سے اس کا کھانا تیار کیا تھا۔ تلی ہوئی چھلی، شامی، کباب، آلیٹ اور پرائے۔ ساتھ میں ان کا وہی مزیدار اچار تھا جو ربیعہ کو ہمیشہ سے پسند تھا۔ ہر رشتے میں ان کی محبت مہلک رہی تھی۔

ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ نجانے کس بڑے ہوئے لمحے میں جا پہنچی تھی۔

”آہم!“ عمار کھنکھار رہا۔

”وہ چونک اٹھی۔ جلدی جلدی اس نے اپنے سیاہ پلو سے اپنی آنکھوں کو رگڑا اور یوں اپنا کھانا نکالنے لگی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔“

”بہت بے مروت ہیں آپ!“ وہ بے تکلفی سے بولا۔

”جی؟“ اس نے حیران نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

”اتنا سارا کھانا باندھ لائی ہیں اور اتنا بھی لحاظ نہیں کہ کسی ہم سفر کو جھوٹے منہ ہی پوچھ لیں۔“

”اوہ!“ اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”وہ اصل میں مجھے۔“ اس سے بات نہ بنائی گئی۔

”بھوک بہت لگی ہے۔“ اس نے مسکرا کر اس کا ادھورا جملہ مکمل کر دیا۔

ربیعہ ہنس دی۔

”نیچے ناکچھ۔“ اس نے خالی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں، بہت کچھ لوں گا۔“ اس نے بے تکلفی سے پلیٹ تھام لی۔ ”لیکن ذرا ٹھہریے۔ غالباً“ میری امی جی

نے بھی کچھ زاوراۓ ہمراہ کیا ہے۔“

اس نے اٹھ کر اپنا لفٹن نکالا۔ اندر مزید ارچائیز رائس اور فرائیڈ چکن تھے۔

”واؤ!“ عباد بے اختیار بولا۔ ”جیستی رہے ہاں میری۔ دیکھا آپ نے ربیعہ! ماؤں کو اپنے بچوں کی پسندنا پسند کا

کتنا خیال ہوتا ہے؟ غالباً“ آپ کی امی جی بھی ساری چیزیں آپ کی پسند کے مطابق بناتی ہیں۔ ہے نا؟“

ربیعہ نے نظر اٹھا کر اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھا۔

”میری امی کا انتقال ہوا ہے۔ وہ رستائیت سے بولا۔

عباد کی جلتی آنکھوں کی جوت یکا یک مدھم پڑ گئی۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں۔“

ربیعہ نے اپنی پلیٹ میں کھانا نکالا پھر دونوں خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

”کھانا بہت مزیدار ہے۔ کس نے پکا یا ہے؟“ عباد کو کھانا بے حد پسند آیا۔

”میری خالہ نے۔“ اس نے آہستگی سے بولا۔

”آپ یہ چاول لیں نا۔ اس میں مال کے ہاتھوں کی خوشبو ہے۔“

ربیعہ نے لفٹن تھام لیا۔

چاول واقعی بے حد لذیذ کپے ہوئے تھے۔ ربیعہ نے اس طرح کے کپے ہوئے چاول پہلی مرتبہ کھائے تھے۔ وہ

شوق سے کھاتی گئی۔

”آپ کس کے پاس جا رہی ہیں لاہور؟“ عباد ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اپنی پھپھو کے گھر۔“ وہ حیرت سے سمیٹنے لگی۔

”کہاں ہے آپ کی پھپھو کا گھر؟“

ربیعہ خاموش ہو گئی۔ اس نے ذہن میں لکھا ہوا پتادہرا نے کی کوشش کی اور قدرے کامیاب ہوئی۔

”باغبان پورہ۔“

”اچھا! میرا ایک دوست وہیں رہتا ہے۔“ عباد کو خوشی ہوئی۔

”آپ!“ ربیعہ نے نگاہیں اٹھا کر اس کا پر خلوص چہرہ دیکھا۔ ”آپ کس کے پاس جا رہے ہیں؟“

”میں پڑھتا ہوں وہاں۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کر رہا ہوں سہاگل میں رہتا ہوں۔“



عذرا بیگم نے مائے کا جوس نکال کر مشین کا پلگ نکالا اور جوس گلاس میں اندیلنے لگیں۔

”بھابی جان! ذرا سائمنک اور کالی مرچ ملا دیں۔“ اسٹول پر بیٹا ریزاری بیٹھی ایتان نے کہا۔

”ہاں ہاں۔ ملائے دیتی ہوں۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔ ”ویسے نمک بہت کھارہی ہوتی ہے۔“

وہ کسمندی سے بیٹھی تھی۔ عذرا بیگم نے جوس میں اس کے حسب خواہش اشیاء ملا کر گلاس اسے تھما دیا۔

”مومن آیا نہیں اب تک؟“

”نہیں۔ شہلا کے بیٹے سے خوب گاڑھی چھٹی ہے اس کی۔ پہلے ماہ میں دوستانہ تھا اب اولاد کی قدم

پر چل رہی ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

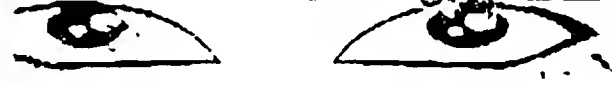
ایتان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ خلی آئی۔

”یاد ہے بھابی جان! یا تو میں شہلا کے گھر میں ہوتی تھی یا شہلا ہاں آمو جو ہوئی۔ علیحدہ علیحدہ وقت گزارنے کا

تو تصور تک نہ تھا ہمارے پاس۔“

”ہاں تو کیا بھول گئی ہوں؟ امتحان تم لوگوں کے ہوتے تھے شامت میری آجاتی تھی۔ کبھی کمرے میں کھانا

منگوایا جا رہا ہے کبھی چائے کبھی ٹینڈا ہاسٹم اور رافع بھی مل جاتے تھے تم لوگوں کے ساتھ۔“



ایتان ہنس دی۔

”ہاں۔ ہاسٹم! وہ پھر قدرے سنجیدہ ہو گئی۔

نگاہوں کے سامنے سے کئی منظر کے بعد دیگرے گزر گئے تھے۔

”یہ ہاسٹم کے لیے بھابی جان نے کوئی لڑکی پسند نہیں کی اب تک؟“

”اللہ جانے کہاں بیٹا ہے کارا رہ رکھتی ہیں۔ سنا ہے ماہین اپنی

”وہ جھوٹے برتن سنگ میں جمع کرنے لگیں۔“

”اچھا! ایتان کچھ سوچنے لگی۔ ”ہاسٹم کیا کہتا ہے؟“

”اس کو کیا کہنا ہے غریب نے جہاں ماں کے گے ہوئے گا“ وہ سادگی سے بولیں۔

”اتنا بھی غریب نہیں ہے۔ وہ طنزاً بولی۔

”ارے بڑی زور آور ماں ہے اس کی۔ وہیں کرے گی جہاں اس کے جی میں آئے گا۔“ شفیقہ حیات نے ان کی

”مشتگو سن لی تھی۔ سو وہ بھی وہیں چلی آئیں۔

”میں تو عذرا سے کہتی ہوں ان کی چھوٹی کو اپنے جھوٹے کے لیے مانگ لو۔ شاید ان کے جی میں بھی نیکی آجائے

تو وہ بھی کچھ پیش قدمی کر لیں۔ مجھے تو ہاسٹم اتنا بھلا لگتا ہے جی کہتا ہے گھر کا بچہ باہر کیوں جائے آخر گھر کی بچیاں

”بھی تو ہیں۔“

”عریشہ کو نافع کے لیے؟“ ایتان بولی۔ ”ناٹ آئیڈ آئیڈیا۔“

عذرا بیگم برتر ہو کر ان کی جگہوں پر رکھنے لگیں۔

”بھئی میں تو نافع سے پوچھ کر ہی کوئی قدم اٹھا سکتی ہوں۔ جوان بچہ ہے۔ آخر اس کی بھی کوئی پسند ناپسند ہوگی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ جو بھی کرو اولاد کی رضا مندی سے کرو۔ لیکن عریشہ میں کوئی خرابی تو نہیں جو وہ انکار

کرے۔ خوبصورت ہے کم سن ہے پڑھی لکھی شائستہ بچی ہے۔ آج کل کے لڑکے تو یہی کچھ دیکھتے ہیں۔ پھر

فردس بیگم کے گلے شکوے بھی دور ہو جائیں گے۔“

ایتان گھونٹ گھونٹ جوس پی رہی تھی۔

اسی لمحے سدرہ دوڑی آئی۔

”پچھو جان! آپ کے میاں جی کا فون ہے۔“

ایتان کا سستی سے بھرپور رویہ یک لحظہ تبدیل ہو گیا۔ وہ جوس کا گلاس وہیں رکھ کر فافٹ دوڑ گئی۔

”آئے ہائے بچی! ذرا سنبھل کر شفیقہ حیات نے اسے ٹوکا۔ ”یوں بھاگ رہی ہے جیسے۔“ لقیہ جملہ انہوں

نے لبوں میں ہی دبایا۔

”ہیلو۔“ اس نے فون کا ریسور اٹھایا۔ ”السلام و علیکم“

الت ایسی تھی کہ ذرا سائمنک سے سانس بے قابو ہو رہا تھا۔

”و علیکم السلام۔ خیریت تو ہے۔ آخر میاں کو تو نہیں دیکھ لیا؟“ وہ شرارتاً بولا۔

”ار فوف۔“ وہ جھجھکی ہوئی تھی۔ ”کوئی ڈھنگ کی بات نہ سوچی آپ کو؟ اتنے دن بعد فون کیا ہے وہ بھی الٹی

”سوچی مادام! سوری۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔ ”بندہ معذرت خواہ ہے آپ کا تصور گھر پرانے پر۔ خیر یہ تو

بتاؤ بچے کیسے ہیں؟“

”کچھ ہیں۔“ وہ غرور سے بولی۔

”بچوں کی ماں؟“

”بہت اچھی ہے۔“ اس نے مسکراہٹ جھپائی۔

”وہ کون سی ہے؟“ وہ بھی ہنس دیا۔ ”یہ تو ہم روز خواب میں دیکھتے ہیں۔“

”کیا خبر؟“ وہ بے نیازی سے فون سے کھینٹنے لگی۔ ”خوابوں کو کون چیک کر سکتا ہے کہ وہ جو جی میں

URDU

”آئی۔“ وہ بے نیازی سے فون سے کھینٹنے لگی۔ ”خوابوں کو کون چیک کر سکتا ہے کہ وہ جو جی میں

”آئی۔“ وہ بے نیازی سے فون سے کھینٹنے لگی۔ ”خوابوں کو کون چیک کر سکتا ہے کہ وہ جو جی میں

”آئی۔“ وہ بے نیازی سے فون سے کھینٹنے لگی۔ ”خوابوں کو کون چیک کر سکتا ہے کہ وہ جو جی میں

”آئی۔“ وہ بے نیازی سے فون سے کھینٹنے لگی۔ ”خوابوں کو کون چیک کر سکتا ہے کہ وہ جو جی میں

”آئی۔“ وہ بے نیازی سے فون سے کھینٹنے لگی۔ ”خوابوں کو کون چیک کر سکتا ہے کہ وہ جو جی میں

”اول ہوں۔“

”پھر کیا ہوا ہے؟“ وہ فکر مند ہوا۔

”نہیں آئی۔“

”ابھی تو خیر کچھ نہیں ہوا۔“ وہ معنی خیزی سے بولی۔ اس کے ادھر رے جملے میں بہت کچھ تھا۔



وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اچھل پڑا۔  
 ”ریلی ایتان! آریو شیور؟“ اس کی آواز میں خوشی تھی۔  
 ”ہیس۔“

”گڈ نیوز جانو! میرا جی چاہ رہا ہے اڑ کر پہنچ جاؤں تم تک۔“  
 ایتان خاموش ہو گئی۔ اس کا دل یکایک ہی افسروگی سے بھر گیا۔  
 ”میرا تو نجانے کب سے یہی جی چاہ رہا ہے عاشر! لیکن محض جی کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔

”ہیلو۔ ہیلو۔“ دوسری جانب سے وہ پکارنے لگا۔ ”اور سب لوگ کیسے ہیں؟“  
 ”سب ٹھیک ہیں، خیریت ہے ہیں۔“ وہ بولی۔  
 ”بچے یاد کرتے ہیں مجھے؟“

ایتان چپ رہی۔ بچے اس کے بنارہنے کے عادی تھے۔ پھر بھی وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر بولی۔  
 ”ہاں۔ بہت یاد کرتے ہیں۔“  
 ”اور تم؟“

وہ محض ہنس دی۔  
 اسی لمحے لائن ڈیس کنکٹ ہو گئی تھی۔ ایتان نے گہری سانس بھر کر ریلوے سٹیشن کی طبیعت پر پھر دی  
 سستی غالب آ رہی تھی۔

آنکھوں پر سے سن گلا سزا تار کر اس نے متلاشی نگاہوں سے اسے کھوجا۔ پھر وہ اسے دکھائی دے گیا۔ گراؤنڈ  
 میں کھیلے ہوئے بست سے بچوں میں وہ اسے دور سے ہی نظر آ گیا تھا۔ وہ بچوں جیسا تھا۔ اسی کا ہم عمر لڑکا تھا۔  
 طرح اسکول ڈریس میں ملبوس۔ لیکن شہلا کو وہ سب میں منفرد لگا۔

”عمر؟“ اس نے آواز دی۔  
 عمر نے مڑ کر دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑی بال پینٹنگ کروڑتا چلا آیا۔  
 ”مما۔“ وہ اس سے لپٹ گیا۔  
 ”مائی ڈارلنگ!“ اس نے جھک کر اس کا گل چوما۔ ”ہاؤ آریو؟“  
 ”فائن ممما۔“ اس کا چہرہ خوشی سے جبک اٹھا۔ ”آپ مجھے لینے آئی ہیں؟“

”ہیس۔ آف کورس۔“  
 ”میں اپنا بیگ اور بیج باکس لاتا ہوں۔“ وہ اندر کی جانب دوڑ گیا۔  
 چند لمحوں بعد وہ گاڑی میں بیٹھے گہری سانسوں میں رواں دواں تھے۔  
 ”آج دین والا نہیں آیا ممما؟“ اس نے سوال کیا۔  
 ”میں نے اسے منع کر دیا تھا۔“ اس نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا۔ ”آج میرا موڈ تھا اپنے بیٹے کو پک کر لے گا۔“

”آج آپ کا ہاف ڈے تھا ممما؟“  
 ”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔  
 ”میرے سب فرینڈز آپ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سب آپ کو لانگ کرتے ہیں۔“

”اچھا!“ وہ کھٹکھٹا کر ہنس دی۔ ”کوئی خاص وجہ؟“  
 ”سب کہتے ہیں تمہاری مہارت پاری ہیں۔ یوٹی فل ہیں۔“  
 ”اوہ۔“ وہ اتر آئی۔ ”خیر یہ تو ہے۔“  
 ”لیکن۔“ وہ کچھ الجھا۔ ”ایک رابلم ہے ممما!“  
 ”کیا؟“ اس نے سرک پر سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔  
 ”ان سب کے پاس پیہا بھی ہیں۔ میرے پاس صرف ممما ہیں۔“

شہلا نے گہری سانس بھر کر اپنا دھیان ٹریفک کی جانب مرکوز کیا اس نے عمر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ وہ  
 کن اکھیوں سے ماں کا چہرہ دیکھتا رہا۔  
 ”مما!“ اس نے کچھ دیر بعد پکارا۔  
 ”ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔  
 ”میرے کوئی پیہا بھی تھے؟“

”جی ہاں۔ اتنا سوال پر اسے بے طرح ہنسی آئی۔  
 ”نہیں تو۔ آپ تو کثرت میں آگے ہوئے تھے۔ میں تو ڈرلائی۔“ ہنسی پر بمشکل قابو پا کر اس نے کہا۔  
 ”میرے براہ راست بنا کر اسے دیکھا۔  
 ”اے اسٹوڈنٹ آفسر ممما!“ وہ خفگی سے بولا۔

”لی پریور سلف عمر!“ شہلا نے سنجیدہ ہو کر اسے تنبیہ کی۔  
 ”سڈری۔“ لیکن آپ مجھے کچھ بتاتی کیوں نہیں ہیں؟“ وہ مزید ہوا۔  
 ”کیا جانو؟“ وہ ہنسی۔ ”آپ دنیا کے واحد بچے نہیں ہو جس کے پاس صرف ممما ہیں۔ دنیا میں ہزاروں بچے  
 ہیں جن کے پاس ممما پیہا دونوں نہیں ہیں۔ وہ بھی تو جی رہے ہیں یا؟ آپ کے پاس تو تانویں خالہ جانی  
 ماموں اور ان بچوں کے پاس ان کا اپنا ایک رشتہ بھی نہیں ہے۔ وہ یمیم خانوں میں رہتے ہیں جہاں انہیں  
 صرف وقت کی دکان ملتی ہے۔ بہت سا کام کرنا پڑتا ہے۔ نو اسکولنگ، نو گیمز، نو پیس نہیں۔ کیا وہ بچے نہیں  
 ہیں؟ انہیں جی تو کچھ میال ہے۔ کیا یہ ایسی اللہ نے جس نے آپ کو اتنے رشتے دیے ہیں اتنا پیار دیا ہے  
 انہیں؟ انہیں جی تو کچھ میال ہے۔ لیکن عمر! ایک بات بتاؤں آپ کو۔ اللہ تعالیٰ سے شکایت کرنے کا  
 حق تو ہر انسان کا ہے۔ تو پھر آپ کن خیالوں میں رہتے ہو؟“

اللہ تعالیٰ نے جس کو جس جگہ پیدا کیا ہے وہاں اسے صبر و شکر کے ساتھ رہنا ہے۔ آپ کے اسکول میں بھی  
 بہت سے بچے ایسے ہوں گے جن کے پاس صرف ممما ہوں گی یا صرف پیہا ہوں گے یا ممما پیہا دونوں نہیں ہوں گے۔  
 تو کیا وہ بچے نہیں جیتے؟ خوش نہیں ہوتے؟ کسی محرومی کو روگ بنا لینا درست نہیں ہے بیٹا! آپ سمجھ رہے ہیں میں  
 کیا کہہ رہی ہوں؟“

وہ باہر دیکھنے لگا۔ شہلا نے بھی گہری سانس بھر کر اسپید برہادی۔  
 ”مما!“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔  
 ”ہوں۔“

”جن بچوں کے پاس ممما یا پیہا نہ ہوں وہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جاتے ہیں نا۔“  
 شہلا خاموش رہی۔ وہ سوال کے غیر معمولی پن کو بھانپ گئی تھی۔  
 ”ہوئیں نا ممما!“

”ہاں ہے پھر؟“ اس نے مجبوراً کہا۔  
 ”جن کے ماما بھائیوں میں ہوں وہ تو بچوں سے الگ نہیں رہتے نا؟“  
 شہلا نے نچلا لب دانوں سے ڈالیا۔

”پھر میرے پاپا الگ کیوں رہتے ہیں؟“  
 شہلا کا چہرہ ہلکا اٹھا تھا۔ اس نے سن گلاس اتار کر ڈیش بورڈ پر پھینکے۔ عمر سہم کر رہ گیا۔ شہلا نے غصے سے اسے دیکھا۔

”تمہارے پاپا اس لیے الگ رہتے ہیں عمر کہ انہوں نے تمہاری ماما کو طلاق دے دی ہے ڈائی ورس۔ ڈیو  
 انڈر اسٹینڈ؟ اب وہ کبھی تمہاری ماما کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ تمہارے پاپا ضرور ہیں مگر میرے  
 لیے ایک اجنبی ہیں۔ اگر تم اتنے ہی بڑے ہو گئے ہو تو سن لو کان کھول کر۔ اور آئندہ مجھ سے یہ فضول سوالات  
 مت کرنا کبھی نہیں۔“  
 اس نے ماں کا شرارے برساتا یہ روپ پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ خوف زدہ ہو کر اس نے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔  
 گاڑی سڑک پر فرارے بھر رہی تھی۔

”ہائے اللہ۔“ عریشہ نے ناعمہ کو شوکا دے کر متوجہ کیا۔  
 ناعمہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ پیر میں سینڈل پہن کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے بے حد ناپسند  
 کیا۔

”کیا ہے تمہیں؟ میری پسلیاں چھید رہی ہو مسلسل۔“  
 سیلز مین مسکرانے لگا۔ عریشہ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئی۔ دکان کے گلاس ڈور کے باہر کھڑے وہ تینوں صاف  
 نظر آ رہے تھے۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بڑی بے فکر اور ذرا غصے سے کھڑے ہنس رہے تھے۔

ناعمہ اور ثانیہ کی پوزی توجہ دکان میں بھی سینڈلوں کی جانب تھی۔ یوں بھی مارکیٹ میں پہنچ جانے کے بعد ان  
 کے بقعہ حواس کام کرنا چھوڑ دیتے تھے صرف بھاؤ تاؤ والی حس پھر کٹی رہ جاتی تھی۔

”کیسی ہے؟“ ناعمہ سفید سینڈل کے متعلق ان دونوں کی رائے جاننا چاہتی تھی۔  
 ”اپنا پیر دیکھو۔“ ثانیہ نے سرگوشی کی۔ ”نی کالا سیاہ کالا لگ رہا ہے سفید چیل میں۔ یوں لگے گا جیسے ہم نے کسی  
 اور کے پیر لگائے ہوئے ہیں۔“  
 ناعمہ نے ہنسا کر اسے دیکھا۔

”اور کالے پیر دیکھ کر دیکھنے والے کا دھیان تمہاری طرف ہی جائے گا کہ ہونہ ہو یہ ثانیہ کے پیر ہیں۔“ وہ ترکی  
 یہ ترکی بولی۔

”یہ بے لاگ تبصرہ تھا۔ اب بھی تم سینڈل خریدنا چاہتی ہو تو ضرور خریدو۔“ اس نے کانڈھے اچکائے۔  
 ”تم تاؤ عریشہ!“ اس نے دکان سے باہر دیکھتی عریشہ کو دیکھا۔

”آل بس۔“ ”نا۔“ ”وہ چونکی۔“ ”سیج ہے۔“  
 ”کیا سیج ہے؟“ وہ چڑ گئی۔ تم دونوں کے ساتھ آکر بہت بڑی حماقت کی ہے میں نے اچھا بھلا اور آپ کے  
 ساتھ۔۔۔۔۔۔ کوئی ڈھنگ کا مشورہ ہی نہیں دیتیں۔“  
 ”نفاق تم نے کی ہے نا ابھی اس کا بھگتان دیکھ لوگی۔“ عریشہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

ناعمہ کو غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو اس نے بھی دکان سے باہر دیکھا۔  
 ”ہائے اللہ!“ اس کا رد عمل بھی ہو ہنسا ہی تھا۔  
 ”سمجھ میں آئی۔“

ناعمہ نے سینڈل اتار کر پرے کر دی۔  
 ”دے دوں آئی؟“ سیلز مین نے پوچھا۔  
 ”آئی؟“ اس نے چیخ ماری۔

عریشہ اور ثانیہ کی ہنسی نکل گئی۔  
 ”نہیں چاہیے“ وہ جھٹلا کر کھڑی ہوئی۔ ”چلو لڑکیو۔“  
 ”لے لیں باجی!“ سیلز مین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”سیل میں مل رہی ہے۔“  
 ”منت تو نہیں مل رہی نا“ وہ تنگ کر بولی۔

”چلاؤ اب لے لو۔“ عریشہ نے کہا۔ ”یہ کم بخت تو دفعان ہوں جب تک۔“ اس نے اس کے کان میں سرگوشی  
 کی۔ ناعمہ کا غصہ بھی فرو ہو گیا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ دے دو۔ ہم اور سینڈل پسند کر لیں۔“ اس نے سیلز مین سے کہا۔

”اور کرس باجی!“ اس نے سعادت مندی سے ”باجی“ پر زور دیا۔  
 وہ سیلز مین کے پاس ٹھٹھنے لگیں۔

”یہ کیا مصیبت لگے رہ گئی۔ بیٹھے بیٹھائے“ ناعمہ نے سرگوشی کی۔  
 ”تمہارا اچھوتا آئیڈیا تھا۔“ ثانیہ نے جل کر کہا۔

”یہ کھڑکیوں کی ہیں؟“ وہ پریشان تھی۔  
 ”تم کو تو بیٹھنا ہی جائیگا۔“ عریشہ نے اسے گھورا۔

”دور لگ کر۔“ ”جی۔“ ”منہ بانی۔“  
 ”کانڈھے پر؟“ ناعمہ نے جوش مارا۔ ”میں ابھی ایک چمڑے کا جوتا خرید لیتی ہوں۔“ وہ دونوں ہنس  
 پڑیں۔

”آج تمہاری ہنسی ہے شاندار۔“ ناعمہ نے شاندار ہنسنے کے ساتھ شاپنگ کلر کو گراہم بنا کر گھر سے نکلی تھیں۔ رستے میں ان تینوں میں  
 ہنسنے کی جگہ نہ مل سکی۔ وہ سوار ہوئے گاڑی کا کرایہ بچانا چاہتی تھی جبکہ ثانیہ اور عریشہ ہنسند  
 تھیں کہ ٹیکسی میں جایا جائے۔

”اری کم بخت۔ اتنے کرائے میں دو سینڈل آجائیں گی۔“ اس نے انہیں سمجھایا۔  
 ”بس کے اسٹاپ تک وہی سینڈل لیں گھنسی بھی پڑیں گی۔“ تنگ ہوگی وہ الگ ”عریشہ اڑ گئی تھی۔ ایسے میں سڑک  
 کے کنارے کھڑی ہنڈاسوک کو دیکھ کر نجانے ناعمہ کو اچانک کیا ہوا تھا۔

”سنسن بھائی۔“ گلف تک چھوڑ دیں گے؟“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔  
 ”وہ کچھ دیر بے یقینی سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”آف کورس! اشریف رکھیے۔“  
 عریشہ اور ثانیہ ہکا بکا تھیں اور وہ دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ مجبوراً وہ دونوں بھی گاڑی میں  
 کھس گئیں۔

”یہ کیا جہالت ہے؟“ ثانیہ بڑبڑائی۔

”خاموش رہو۔ لفت ہی لی ہے نا۔“  
 ”کسی نے دیکھ لیا تو جوتے پڑیں گے۔“ عریشہ کو تین عدد جوان بھائیوں کا خوف تھا۔  
 ”کوئی نہیں جھانکتا چلتی گاڑی میں۔“ وہ مطمئن تھی۔ ”دوپٹے آگے کرلو۔“  
 ”اور جو یہ لفتا کہیں اور لے گیا تو؟“ عریشہ بھنائی۔

ناعمل نے اسے کہنی ماری۔  
 ”شش۔ بری بات ہے۔ بے چارہ اکیلا ہے نہم تین ہیں۔“ اس نے سرگوشی کی۔  
 ”مجبوراً“ وہ دونوں چپکی ہو رہیں۔

ایک ایک اس نوجوان نے گاڑی ایک جگہ روکی تھی۔ وہاں انتظار کرتے دو لڑکے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئے۔ ان تینوں کی سانس گلے میں اٹک گئی تھی۔  
 وہ دونوں حیران ہو کر پیچھے دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور مسلسل مسکرا رہا تھا۔  
 ”ان کی تعریف؟“ آگے سے سرگوشی آئی۔  
 ”کرنیامت۔۔۔ پٹ جاؤ گے۔ وہ تین ہیں ہم اکیلے ہیں۔“ مطمئن انداز میں جواب دیا گیا۔ لڑکیاں تلملا کر رہ گئیں۔

”تیری قسمت کو میں نے جگا دیا ہے؟“ پھر ایک سوال ہوا۔  
 ”ارے ہمارے اپنے نصیب کمال ہیں۔“ ٹھنڈی لہجہ بھری گئی۔ ”یہ تو بھیا کی سوک کا کمال ہے۔“  
 ”سینے!“ ناعمل پھر کر بولی۔ ”بس روک دیں یہیں۔ ہمیں یہیں اترنا ہے۔“  
 ”منزل تو کچھ اور طے ہوئی تھی؟“

وہ زچ ہوئی۔ ٹائپ اور عریشہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔  
 ”میں نے کہا تھا میں یہیں اترنا ہے۔ گاڑی روکیں۔“  
 ”یہ آٹومینک گاڑی ہے محترمہ! سیٹلائٹ سے کنٹرول ہوئی ہے۔ اس خزانہ کی نشان دہی کر چکا ہوں۔ معاملہ ستاروں تک جا پہنچا ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“  
 اگلی سیٹ سے ایک دانا بھائی تھم رہا تھا۔ لڑکیاں حواس باختہ ہو گئیں۔  
 ”دیکھیے ہم دروازہ کھول کر کود جائیں گے۔“ عریشہ نے ہمت کر کے کہا۔ ”آپ ہمیں غلط سمجھ رہے ہیں۔“  
 کھٹاک کی آواز کے ساتھ دروازے لاک ہوئے۔  
 ”آپ بندے کو غلط سمجھ رہی ہیں جناب! آرام سے تشریف رکھیے۔ انشاء اللہ بحفاظت منزل پر پہنچیں گی۔“  
 وہ مسکرا رہا تھا۔

دروازے لاک ہوتے دیکھ کر ان کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر گری جاری تھیں۔ گاڑی کن پرستوں پر دوڑ رہی تھی انہیں خبر نہ تھی۔  
 جب گاڑی واقعی گلف مارکیٹ کے سامنے جا رکی اور آٹومینک لاک سے دروازے کھلے تو تینوں کو ہوش آیا۔  
 بڑی تیزی سے وہ دروازے کھول کر نیچے اتریں۔

اپنے اپنے پرس سنبھال کر وہ بنا کچھ کہے نہ آگے بڑھ گئیں تب ہی پیچھے سے پکارا گیا۔  
 ”مخفی سینے!“

فوری رد عمل کے نتیجے میں تینوں نے ہی مڑ کر دیکھا۔  
 ”لفٹ لینے کا شکریہ۔“ وہ تینوں دانت نکال رہے تھے۔

اور سان بحال ہو چکے تھے اس لیے انہیں ہنسی آگئی۔ بنا جواب دیے وہ آگے بڑھ گئیں۔ لیکن اب شاپنگ کے دوران انہیں اپنا بیچا کرتے دیکھ کر وہ نئے سرے سے پریشان ہو گئیں۔  
 ”اب اگر ان مردوں نے کوئی بد تمیزی کی تو بھری مارکیٹ میں بے عزتی کروں گی۔“ ناعمہ بڑبڑاتی۔ ”ناعمہ علی خان نام ہے میرا۔“



اسے بیٹھے بیٹھے کب غنیمت آگئی تھی اسے خبر نہ تھی۔  
 اس کی آنکھ انجمن کی چٹکھاڑ سے کھلی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رک کر اب دوبارہ آگے بڑھی۔ ربیعہ کو جو اس بحال کرنے میں کچھ دیر لگی۔  
 لیکن اگلے ہی لمحے اس کے رہے سے اور سان بھی خطا ہونے لگے۔ اس کے علاوہ کپار ٹمنٹ میں وہ نہایت خطرناک قسم کے آدمی موجود تھے اور ان تینوں کے علاوہ کپار ٹمنٹ میں کوئی نہ تھا۔ بڑی بڑی ہونچھوں اور کاندھوں تک لمبے بال لیے وہ دونوں آدمی اپنی سرخ آنکھوں سے اسے اسی گھور رہے تھے۔ ربیعہ کا دل اس کے منہ میں آن لگا۔ ساتھ پر لمحہ بھر میں پسینہ پھینکنے لگا۔

اسے وہ پر خلوص نوجوان یاد آیا، جس کی موجودگی اس کے لیے نجات تھی۔ بائیس تھیں تھیں۔ وہ بوڑھے میاں بیوی بھی اس کے ہم سفر تھے جواب کپار ٹمنٹ میں نہ تھے۔  
 وہ جاننے لگتی دیر ہوئی تھی۔ رستے میں کون کون سے اسٹیشن آکر گزر گئے تھے اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ کون سے ہم سفر کا ساتھ کہاں چھوٹا تھا اسے علم نہ تھا۔  
 اور اب جو وہ اشخاص سامنے موجود تھے ان کی نظریں اسے چھیدے ڈال رہی تھیں۔ اس نے اپنی سیاہ چادر کا پلوڈر اس آگے کھینچ کر چہرہ چھپانے کی کوشش کی تھی۔  
 وہ دونوں ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ربیعہ سخت پریشان ہو گئی لیکن وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ اس کی پریشانی اس کے کسی انداز سے عیاں نہ ہو۔ اسے یاد آیا۔ اس کے ہینڈ بیگ میں ایک رسالہ تھا جو اس نے سفر کے دوران وقت گزاری کے خیال سے سمعیہ سے لے کر بیگ میں رکھ لیا۔  
 اسی کیساتھ ہوتے ہاتھوں کو اس نے چادر کے اندر رکھ کر ان کی کھانسی کو سننے کی کوشش کی۔  
 نکال کر بیگ کی زپ کھولنے لگی۔

اس کی نگاہ ابھی تو اسے احساس ہوا وہ اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ربیعہ نے اپنے ہاتھ دیکھے۔ سیاہ چادر کے اندر سے سفید کنول جیسے ہاتھ یوں نکلے ہوئے تھے جیسے گھنی رات میں ہاتھوں میں سے چاند نکل آئے۔ اس نے ٹافٹ رسالہ نکالا اور ہاتھ دوبارہ چادر میں لپیٹ لیے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا اپنا چہرہ بھی چادر میں چھپالے لیکن اب ایسا کرنا حماقت کے زمرے میں آتا۔

رسالہ کھول کر اس نے کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ اسے الفاظ دکھائی نہ دیے۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔  
 ”میں اس قدر خوفزدہ کیوں ہو رہی ہوں؟“ اس نے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔  
 ”یہ صرف مجھے دیکھ ہی سکتے ہیں نا۔ نگاہوں سے کوئی کسی کو نقصان تو نہیں پہنچا سکتا۔“  
 ”شاید اس کپار ٹمنٹ کی تنہائی اور ہر پہیلی سیاہی سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کوئی بات نہیں میں کسی جھگڑ میں تو نہیں ہوں نا۔“  
 اس نے اپنے آپ کو ڈھیروں تسلیاں دے ڈالیں۔

”کہاں جاؤ گی؟“ یکایک ان میں سے ایک آدمی اپنی بھاری آواز اور کرخت لب و لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔  
 ربیعہ نے بد مزگی سے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ اسے انداز تھا کہ وہ درجہ برا محسوس ہوا تھا۔ ”جی؟ مجھے کچھ کہا آپ نے؟“  
 اسے خود پر حیرت ہوئی۔ خوف کے اس عالم میں بھی وہ اتنے اعتماد سے گفتگو کر سکتی تھی اسے اس سے پیشتر اندازہ نہ تھا۔

”پوچھا ہے کہاں جاؤ گی؟“ اس شخص پر ربیعہ کے رویے کا مطلق اثر نہ ہوا۔  
 ربیعہ نے اسے کوئی سخت جواب دینا چاہا پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ بدل لیا۔  
 ”لاہور۔“ وہ مختصراً بولی۔

دونوں نے اس کا جواب سن کر نجانے کیوں ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔  
 ”اکیلی ہو؟“ اگلا سوال سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا گئی۔  
 رسالہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر پڑا۔ ربیعہ نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے وہ سوال سنا ہی نہ ہو۔ وہ جھک کر حالہ اٹھانے لگی۔

کیل ہو۔“ وہ ال بھر دہرایا گیا۔  
 ربیعہ کا دل اس سوال پر سن ہونے لگا۔  
 ”جی نہیں میں ہوں ان کے ساتھ“ برتھ سے عباد نے سر نکالا۔  
 اسے دونوں نے حیرانی سے اوپر دیکھا اور ان کے چہرے اتر گئے۔ وہ برتھ سے نیچے اتر آیا۔  
 ”بقیہ آپ کو ہینڈ بیگ سے کر لیں۔“ ہینڈ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ قدرے ترش لہجے میں بولا۔  
 ”ہینڈ کی جیبوں میں اس کے آنسو بھر آئے۔ اسے دنیا صاف نظر آنے لگی تھی۔  
 ”دونوں نے اس کو سلام کیے۔  
 ”انداز سے اس نے سر ہٹا لیا۔

”کچھ نہیں سائین، تو یوں ہی جی بی بی کو ایڈجسٹ کر دے گیالے خیال سے کچھ باتیں پوچھ رہے تھے۔“ ایک نے  
 ”ہاں میں کھڑے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھا۔  
 ”تھینک یو۔“ اس نے منمننا کر کہا۔  
 اس سے زیادہ کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ تھا بھی نہیں۔  
 ”ویل کم۔“ رسالہ سیدھا کر لیں۔“ اس نے سرگوشی کی۔  
 ربیعہ نے ہڑبڑا کر رسالہ سیدھا کیا تھا۔



”مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ اس نے دہائی دی۔  
 ”کچھ ہو گا تو نظر آئے گا۔“ حمزہ مزے سے بولا۔ ”اپنا رول نمبر انہی کو نظر آتا ہے جن کا رول نمبر چھپتا ہے۔“  
 ”خدا کے لیے حمزہ! بری بری باتیں مت کرو۔“ ورنہ وہ ہانسی ہو گئی۔ ”میں نے دن رات ایک کر دیے تھے میں فیل تو نہیں ہو سکتی۔“



”مدرسے جاواں ان ہی خوش گمانیوں میں کوئی چیز تو کھلاؤ۔“ علی نے دانت نکالے۔ ”جب اتنا ہی یقین ہے تو پہلے منہ میٹھا ہو جائے۔“

”تم دیکھو نا علی! پلیز“ وردہ نے اخبار اسے تھمانے کی کوشش کی۔  
 ”وردہ آلی! میری قریب کی نظر کمزور ہے۔ میں بے وجہ ہی کہہ دوں گا کہ آپ پاس ہیں۔ بعد میں آپ کا دل ٹوٹے گا۔“

”نئے منہ!“ ناعمہ نے بھنا کر اخبار چھینا۔ ”تم دونوں تو ہو ہی بد شکوے! اچھی بات منہ پہ آہی نہیں سکتی۔“  
 ”حقیقت چھپ نہیں سکتی بناؤںٹ کے اصولوں سے۔“ اس نے تدریس سے سر ہلایا۔  
 ”کہ گھبرایا نہیں کرتے کبھی چند ایک پسلیوں سے۔“ حمزہ نے ٹکڑا لگایا۔

ناعمہ اخبار پر جھکی ہوئی تھی۔  
 ”لاؤ ناعمہ! میں دیکھتا ہوں۔“ رافع کے نرم لہجے پر اس نے سر اٹھایا۔  
 ”رافع بھائی! وہ خوش ہو گئی۔“ آپ دیکھیں نا۔ یہ وردہ آلی کے تو حواس مفلک ہو جاتے ہیں روزانہ کاسن کر۔  
 اوپر سے یہ دونوں بد تمیز انہیں اور تنگ کر رہے ہیں۔“

”لیجئے! پورے شہر میں جوار ہو کر تو اخبار لائے ہیں۔ اس کا یہ صلہ کیا؟“ علی نے آنکھیں پٹیٹھائیں۔  
 منہ بد تمیز بد شکوے علی! اب از نو بی نوڈ۔“ حمزہ نے منہ پر ہاتھ پٹیا۔

”میری ڈائری بڑی اب نوڈیٹ ہے چھوٹے بھائی! نوڈوٹس اور۔“ اس نے سر ہلایا۔  
 ”مبارک ہو!“ رافع نے رول نمبر ڈھونڈ کر اس کے گرد دائرہ کھینچا۔ ”فرسٹ ڈیرشن ویل ڈن وردہ!“  
 ”ہرے ہرے۔“ ناعمہ کے ساتھ وہ دونوں بھی تالیاں پیٹنے لگے۔

”دیکھا وردہ آلی! بری بری باتوں کے بعد اچھی چیز اور بھی قیمتی لگتی ہے محسوس کیا آپ نے؟“ وردہ نے حمزہ کے سر پر چیت لگائی۔ وہ بے حد خوش تھی۔

”جتنے والوں کا منہ کالا“ ناعمہ نے منہ چڑایا۔  
 ”ارے جلتے ہیں ہمارے دشمن۔ لاؤ مٹھائی کھلاؤ۔“ علی نے آستین چڑھائیں۔ وردہ دوڑی دوڑی گئی اور کمرے سے کلک کا ڈھونڈ اٹھا کر لے آئی۔

”میں نے منگوا کر رکھا تھا۔“ وہ جھینپ کر بولی۔  
 ”اور جو سہلی آجاتی تو؟ اس کی کریم سے آنسو پونچھتیں آپ؟“  
 ”بس نا! بار بار سہلی کا ذکر۔“ اس کی بارود چڑ گئی۔ سب ہی ہنس دیے۔  
 راجہ بیگم بھی کچن سے نکل آئی تھیں۔ انہوں نے بیٹی کا سر جو م کر مبارک باد دی۔ ناعمہ رانمہ کو فون کرنے بھاگ کھڑی ہوئی۔

کچھ ہی دیر میں پورے ”حیات ولا“ میں اطلاع پھیل چکی تھی۔ وردہ کو مبارک باد دینے کے لیے سبھی چلے آئے تھے۔ شفیقہ حیات نے اسے بہت خوبصورت جوڑا دیا تھا۔ عذرا بیگم اور فردوس بیگم نے پانچ پانچ سو روپے دیے۔ سناٹم نے نازک سی رسٹ داچ دی۔

”رافع بھائی! جیسا ڈھیلی کریں۔“ علی نے سرگوشی کی تھی۔  
 ”نا۔ کئی ہوئی چیز کیسے ڈھیلی ہو۔“ وہ مسکرایا۔ ”کل صدر میں کٹ گئی تھی۔“  
 ”کتنی تو وہ سے جواڑ رہی ہو۔ ہلکے پن سے اڑ رہی تھی کیا؟“  
 سب کو ہنسی آگئی تھی۔

PHOTO

”چلو بھئی وردہ! تمہارا گفٹ ادھار رہا۔“ رافع کو اعلان کرنا پڑا۔  
 ”ادھار؟ یہ تو کسی قسم کی قینچی کا نام ہے یا؟“ حمزہ نے کان کھجایا۔  
 ”بد معاشو! نمٹوں گا تم سے۔“ رافع مسکرایا۔



فاروق حسن نے چائے کا کپ سامنے رکھتی عریشہ کو ایک نگاہ دیکھا۔  
 ڈارک پریل کپڑوں میں اس کی گلابی رنگت چمک رہی تھی۔ غلابی آنکھوں میں اب تک نیند کا خمار تھا۔ باپ کو چائے دے کر وہ اب اپنے لیے کپ میں چائے ڈال رہی تھی۔

”یونیورسٹی کب سے جاؤ گی؟“ انہوں نے کچھ دیر سوچتے ہوئے پوچھا۔  
 ”بس بابا۔ اگلے ماہ سے کلاسز اسٹارٹ ہیں۔ پھر مصروفیت ہی مصروفیت۔“  
 ”ہوئی!“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”یہ اپنی ناعمہ بھی تو تمہارے ساتھ ہے؟“  
 ”ج ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”نامیہ اور ناعمہ میرے ساتھ ہیں لن کے اور میرے سبھی ککلس جیسے ہیں۔“

اس بتانے کے بعد وہ اپنا کپ لے کر اندر چلی گئی تھی۔ اور تب ہی کچن سے فردوس بیگم برآمد ہوئیں۔  
 ”یہ ان کا مخصوص ٹھکانا تھا۔“ وہ ان کے قریب آ بیٹھیں۔

”ارے بھئی کسی اچھے ڈاکٹر کا پتا کرو یہ جوڑ تو بالکل ہی بے کار ہوئے جاتے ہیں کم بخت۔“ وہ اپنا کانڈھا دبانے لگیں۔  
 فاروق حسن نے جیشٹ کوٹ سے انہیں دیکھا۔

”تم سے کیا آپ کے والے تمہارا۔“ شام کو فارغ ہوئے۔  
 ”عشیں! تمہاری سے کرنا چاہتا ہوں تو ہاں کو پوچھیں۔“ وہ منہ ہی منہ میں بدبوائی۔

فاروق حسن نے اپنی بریبر کو جیب سے نکال کر دیکھا۔  
 ”آپ کے ہمارے ہمارے کیا غائب ہو گئے ہیں؟“ آفس جانے کا سن کر ان کی تکی گم ہو گئی کیا؟۔“ انہوں نے

”ارے اسے چھوڑو اس کے حال پر وہ نہیں سدھرنے کا۔“ جنے کہاں غائب ہے اس دن سے۔ اب کسی وقت فقیروں کا سا حلیہ لیے کھڑا ہو گا میرے سر پر۔“ انہوں نے جل کر کہا۔  
 ”انہیں اس حال تک پہنچانے کا کریڈٹ آپ کو ہی جاتا ہے فردوس بیگم!“ انہوں نے اخبار تھمہ کیا۔ ”ایک وقت تھا جب آپ ان کے خلاف ایک لفظ کہنے والے کی گردن پکڑ لیتی تھیں۔ آج ان کے ذکر پر آپ کی اپنی گردن جھک جاتی ہے۔ وقت کسی کو معاف نہیں کرتا۔“

”میاں! اٹم میزے قصور معاف کرو۔“ انہوں نے تنک کر ہاتھ جوڑے۔ ”تمہارے قریب آ بیٹھنا تو ایسا ہے جیسے بندہ قبر میں جا لیٹے اور منکر نکیر سرہانے کھڑے ہوں۔ بس ہر وقت (وقت) ہمارا اعمال نامہ ہی تمہارے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“

فاروق حسن کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ آ گئی۔  
 ”آپ کو کبھی احساس نہیں ہوتا کہ اپنے بھائی کے اس بگاڑ میں آپ کس قدر حصہ دار ہیں؟ ایک اچھے بھلے فرد



”وقت نے اجازت دی۔“ وہ برعکس آیا۔ ”وقت کا ہی تو کھیل ہے سارا شہلا جی!“  
گرے لباس کی چمک لمحہ بہ لمحہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی اور اس کا ہنستا مسکراتا دلکش چہرہ اس کے تصور میں ابھر رہا تھا۔

\*\*\*

”بیجے جناب! منزل آپ ہی ہے۔ دس منٹ بعد ہم لاہور اسٹیشن پر کھڑے ہوں گے۔“ عباد نے کہا تو ربیعہ کا دل غیر مانوس انداز میں دھڑک اٹھا۔  
”اپنا سامان چیک کر لیں۔ میں آپ کے لیے بھی ایک عدد قلی ہار کر لیتا ہوں۔“ وہ مذاقاً بولا تو ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا اور چیزیں سمیٹنے لگی۔

”کون لینے آئے گا تمہیں؟“ کیا ایک اس نے پوچھا۔

”مجھے۔“ وہ انکی۔ ”مجھے شاید۔ پھر سہا جی۔ یا۔ شاید۔ شاید۔“

عباد نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا پھر خاموش ہو رہا۔

اسٹیشن پر اتر کر ربیعہ کا ذہن بالکل خالی ہو گیا تھا ”قطعا“ خالی۔ عباد نے اس کا سامان قلی سے اٹھا لیا اور وہ

لوگ وینٹنگ ہال میں پہنچ گئے۔

ربیعہ بار بار اسے دیکھتی اور اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہو جاتا تھا۔ وہ اس کے لیے جیسی جیسی بددیوانہ کی مانند

تھا۔ وہ اس کے لیے تحفظ کا احساس تھا۔

”تم نے اپنی آمد کی اطلاع کر دی تھی؟“ عباد نے پوچھا۔

”ہاں“ تار بھیجا تھا۔

”تار۔“ اسے اچھٹھا ہوا۔ ”فون وغیرہ۔ میرا مطلب ہے کوئی بدکلیئر صورت حال؟ کس کو آتا ہے؟“

کب آتا ہے؟ تم پہچانتی تو ہونا نہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اور وہ تمہیں؟“

سر دوبارہ نفی میں ہلا تھا۔

”مالی گاڈ!“ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ ”پچاس برس پرانی دوشیزہ آتم شکی کہاں ہے؟“

ربیعہ نے جھٹ مٹھی میں دبی پرچی اسے سہما دی۔ عباد کاغذ سیدھا کرنے پر پڑھنے لگا پھر اس نے سر اٹھا کر اسے

دیکھا۔

”تمہیں یقین ہے یہ پتا درست ہے؟“

ربیعہ کا سر پھر نفی میں ہلا تھا۔

عباد نے سر تمام لیا۔

\*\*\*

دو گھنٹے کی طویل جدوجہد کے بعد وہ اصل مکان ڈھونڈ پائے تھے۔ دونوں تھکن سے چور تھے۔ ربیعہ نے بالآخر

اسے اپنی مختصر ترین داستان سنا دی تھی اور عباد اس کی ہمت اور حوصلے سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

ربیعہ کے پاس موجود پتہ ایک نہایت خستہ حال پرانے مکان کا تھا۔ جہاں سے علم ہوا تھا کہ پچھلے مکین و مکان

بچ کر محلہ تبدیل کر چکے ہیں۔ عباد کی مستقل مزاجی اور بھرپور کوشش سے آخر کار وہ نیا مکان ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب وہ دونوں ایک درمیانے درجے کے مکان کے گھرے سبز رنگ کے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے جس کے دروازے پر ”منور امین“ کی تختی نصب تھی۔

”یہی گھر ہے۔“ ربیعہ نے تصدیق کی۔ ”منور امین میرے پچھلا کا نام ہے۔“

”پھر بھی۔“ تم اپنا اطمینان کر لو میں کھڑا ہوں۔“ وہ بولا۔

ربیعہ نے اس کی آنکھوں میں موجزن بے پایاں خلوص دیکھا۔

”میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھلا پاؤں گی بھائی!“ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”بس بھائی کہا ہے نا پھر احسان کیسا؟“ عباد کی آنکھیں چمکیں۔

پھر اس نے جیب سے کارڈ نکالا۔

”یہ کارڈ رکھ لو اس پر میرا موبائل نمبر ہے اور کراچی میں میرے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی۔ کبھی بھی کسی قسم کی ضرورت پڑے تو جھجھکا مت۔“

ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا اور مڑ کر تیل پر انگلی رکھ دی۔

\*\*\*

اس کی شٹ کا ٹائم ختم ہو چکا تھا۔

واش روم میں اپنا حلیہ درست کرنے میں اس نے پندرہ بیس منٹ لگائے تھے پھر اپنی کیپ سر پر جھاتے ہوئے

دوبارہ چلا۔

بہت سے عورتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کی سوچ کسی خاص نقطے پر مرکوز نہ تھی۔ وہ بس یونہی

چھوٹی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ چلا جا رہا تھا۔

پارک میں اس کی نظر ایک عورت پر پڑی۔ وہ جیسے جالی نکالتا ہوا اپنی گاڑی کی جانب بڑھتا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ اس چھوٹی

سفید گاڑی پر جا پڑی۔

اس کے لیے یہ گاڑی سناٹا نہیں برآمد ہوئی اس کے کپڑے جالی دوبارہ جیب میں ڈال لی اور قدم اٹھا کر اس سفید گاڑی

کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سناٹا سیٹ پر وہ موجود تھی۔ سفید جالی کے لباس میں لمبوس و سینٹ سے سر نکائے چہرے کو

بڑے سے سفید ہیٹ سے ڈھانپے بیٹھی تھی۔

یہ شاید نہایت طویل انتظار کا اظہار تھا۔

عاشق نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”ہیلو۔“ ویل کم سوئٹ ہارٹ۔ ”ہیٹ میں سے سر ہٹا کر آواز برآمد ہوئی تھی۔

”واہ! آ اسٹوڈیو! از دس لڑا؟“ اس نے اس کے چہرے پر سے ہیٹ اتار دیا۔ اس نے اپنی خوبصورت مخمور

نگاہوں سے اسے مسکرا کر دیکھا۔

”اسٹوڈیو؟“ وہ ہنسی۔ ”اٹ از لومائی ڈار لنگ۔“

عاشق نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔

سبحان حق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھریبچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا ہونا اور شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔

ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائ میں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ دادی کے ٹنک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہے کہ بقیہ با اس کی بچھو پھو ہیں اور ان کا ایڈریس یا کردہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط یہ کردہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں منبیزہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شہلا کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے سے باتیں کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔

ربیعہ اپنی تنہائی اور لوگوں کو بدلتے رویوں سے تنگ آ کر اپنی بچھو کے گھر لاہور جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ ربیعہ کی ملاقات عباد سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ربیعہ تنہا سفر کر رہی ہے وہ از خود اس کی بچھو کے گھر پہنچ جاتی ہے۔

عاشرا (یقیناً کا شوہر) اپنے دفتر سے نکلا تو لیزا گاڑی میں بیٹھی اس کی منتظر تھی۔

### نویں قسط

لباس تبدیل کر کے وہ باہر نکلا تو وہ صوفے پر نیم دراز لی وی دیکھ رہی تھی۔ عاشرا سے گہری نظروں سے دیکھ ہوئے سامنے والے صوفے پر جا بیٹھا۔

لزا نے لی وی کا ویو دھیمہ کر دیا اور اس کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”تم کیوں میرے لیے اتنی زحمت کرتی ہو لزا؟“ عاشرا نے مدھم لہجے میں کہا۔

”تمہارے آفس سے میری فیکٹری تک کا روٹ کتنا لمبا ہے پھر ہماری ٹائمنگز میں اچھا بھلا فرق ہے۔ میرے پاس کار ہے میں خود یہاں تک آسکتا ہوں۔ پھر تم یہ زحمت کیسے کرتی ہو؟“ لزا نے اذیت سے منہ پھیرا۔

”جو وقت تمہارے بغیر گزرے۔ وہ مجھے فضول ہی لگتا ہے عاشرا! وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ”تم پاکستان گئے تو مل پاگل ہو گئی تھی۔ لگتا تھا میرے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ آفس سے مجھے دو مرتبہ وارنگ دی گئی تھی میں اپنا کام صحیح طریقے سے نہیں کرتی۔ مجھے شدید ڈپریشن ہو گیا تھا۔ پھر تم لوٹ آئے سب کچھ ٹھیک ہو گیا بالکل ٹھیک!“

وہ مسکرا دی۔ اس کے سفید دانت چمک اٹھے۔

”تم غلطی کر رہی ہو لزا! پچھتاؤ گی!“ وہ اپنی آستین کے مٹن بند کرتے ہوئے بولا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفے کے بازو پر آ بیٹھی اور اس کے گلے میں بائیں حائل کرتے ہوئے اپنا چہرہ ان کے بالوں پر رکھ لیا۔

”پچھتاؤ وہ ہے عاشرا! جو غلط کو صحیح سمجھ کر کرتا ہے۔ مجھے پتا ہے میں کیا کر رہی ہوں۔ اس کا زیادہ سے زیادہ خطرناک سے خطرناک نتیجہ کیا نکلے گا۔ مجھے اندازہ ہے۔ پھر بھلا پچھتاؤ کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔“

پچھتاؤ ہے سے پہلے ہی خود کشی کر لوں گی۔“

عاشرا نے ایک گہری سانس لی۔

”اچھا چلو کافی بناؤ میں بہت تھک گیا ہوں۔“ اس نے اسے وہاں سے اٹھانا چاہا۔

وہ اس کے مزید قریب آنے لگی۔

”اگر تھک!“ عاشرا کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

”عجیب مرد ہوں تم۔“ وہ علیحدہ ہو کر پھیکے سے لہجے میں ہنسی ”تمہیں اپنی بیوی سے علیحدہ رہتے ہوئے بھی فرق نہیں پڑتا؟ شاید تم اپنی بیوی سے بہت زیادہ ڈرتے ہو۔ ذہنی طور پر خوف زدہ ہو۔ ہاں؟“

”ہاں۔ میں اپنی بیوی سے خوف زدہ ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولا ”اب جاؤ کافی تیار کر کے لاؤ۔“

وہ برا سامنے بنا کر اٹھ گئی اور ذرا سے فاصلے پر بنے کاؤنٹر کے پیچھے جا کھڑی ہوئی جہاں چولہے نصب تھے اور چند کینشس نے وہاں چھوٹے سے کچن کی صورت اختیار کر لی تھی۔

عاشرا وہاں بھلا کر لیٹ گیا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ اسے غیند آرہی تھی۔ لزا کے کافی بنا کر لانے تک وہ سوچکا تھا۔

یہاں تک کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔

یار! کیا ملاقات ہے یہ؟“ وہ بے بسی سے بولا۔

”چپ چاپ رہو۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

”یار۔“ عاشرا نے اسے پرے دھکیلا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”میں کرو نکاح پر دھواں لوجھ سے۔ کم سے کم یہ احساس

”کیسے؟“ اس نے حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ عاشرا مسکرا دیا۔

”تم سمجھو گی۔“ اس نے ہنسی بکھتی۔ اس قسم کے احساس جرم سے تم لوگوں کا واسطہ کم ہی ہوتا ہے۔“ اس نے ہنسی بکھتی۔ اس قسم کے احساس جرم سے تم لوگوں کا واسطہ کم ہی ہوتا ہے۔“

”اس نے ہنسی بکھتی۔ اس قسم کے احساس جرم سے تم لوگوں کا واسطہ کم ہی ہوتا ہے۔“

”میرا جی چاہتا ہے میں پاکستان جاؤں۔ وہاں جا کر تم لوگوں کا لافٹ اسٹائل دیکھوں تمہاری ذہنیت بحیثیت

موم کیا ہے اس کا اندازہ کروں۔ تب کہیں جا کر میں تمہیں مکمل طور پر سمجھ پاؤں گی۔“

عاشرا کچھ سوچ کر شرارت سے مسکرا دیا۔

”وہاں جانے کا سوچا بھی مت کرو لزا! میرا“

”کیوں؟“ اس نے سر کو استغما میں انداز میں جنبش دی۔

”وہاں گئیں تو بچ کر نہ آسکو گی۔ کوئی نہ کوئی پرزد وہیں رہ جائے گا۔“

”سوری؟“ وہ حیران ہوئی۔

عاشرا نے اپنی سوچ پر خود ہی ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”وہاں میری بیوی رہتی ہے۔ جو اس قدر خطرناک ہے کہ میں ذہنی طور پر اس سے خوفزدہ رہتا ہوں۔ پھر سوچو

کہ وہ کیا کچھ نہ تمہارے گھر پر؟ تمہاری یہ حسین زلفیں تو ضرور وہیں رہ جائیں گی۔“

”وہم آن۔“ اس نے اسے خفگی سے گھورا۔



اس عورت نے ایک طرف ہو کر اسے رستہ دیا۔ ربیعہ اپنا بیگ اٹھا کر گھر میں داخل ہو گئی۔ ایک براسرار قسم کے سنائے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وسیع و عریض صحن جامن کے پتوں سے اٹا ہوا تھا۔ لال رنگ کا فرش ربیعہ کو بہت عجیب معلوم ہوا۔ وہ اس عورت کی پیروی کرتی اس کے پیچھے چلتی گئی، جو برآمدے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔

برآمدے میں اندھیرا تھا۔ ربیعہ کی آنکھوں کو سکون میسر آیا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا سامنے لائن سے تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ برآمدے کے ایک کونے میں باورچی خانہ تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور جو لمبے پر رکھی پٹیلی بھی دکھائی دے رہی تھی جس کے نیچے کافی تیز آگ تھی۔ وہ عورت شاید کچھ رکاتے رکاتے دروازے تک گئی تھی۔ باورچی خانے کے مخالف سمت میں چھوٹا اسٹور تھا۔ جس میں رکھے ہوئے ٹرنگ دکھائی دے رہے تھے۔

”مینا! کون ہے۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔ ارے میں کب سے پوچھ رہا ہوں کون ہے؟۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔“

ربیعہ جھپک جھپک کر آنکھیں کھلی تھیں۔ کونے والے کمرے سے بے تحاشا کھانستے ہوئے کوئی شخص پوچھ رہا تھا۔

”اے کون ہے؟۔۔۔ میں جہما کا سا ہوا تھا۔“

”اے کون ہے؟۔۔۔ میں جہما کا سا ہوا تھا۔“

ربیعہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ہر قدم پر ایک نیا امتحان منتظر تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے

کمرے کے دروازے پر ایک جھونکے نے اس کا سر چکرا دیا۔ ایک لمبے کے لیے اس کے قدم

وہ ایک غلطی سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھوں کی جانب بڑھتے ہوئے ہاتھ کو سختی سے روک لیا۔

اس شخص نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

”میں۔۔۔ میں ربیعہ ہوں۔۔۔ ربیعہ جہما کا بیٹا۔“

”کھوں۔۔۔ کھوں۔۔۔ کھوں۔۔۔“ منور امین پر یکایک ہی کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

مینا نے آگے بڑھ کر وہ بالٹی اٹھا لی جو غلاظت کے ڈھیر سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اسے کمرے سے باہر لے گئیں۔

ربیعہ کو بے حد سکون کا احساس ہوا۔ بدبو کے تھپیڑوں میں بہت کی واقع ہوئی تھی۔

”تم۔۔۔ تم کہاں کیوں آئی ہو؟“

”ابھی وہ خود کو سنبھال ہی رہی تھی کہ منور امین نے ترش لمبے میں پوچھا۔ ربیعہ یکدم ہی گڑبڑا گئی۔

”جی۔۔۔ میں۔۔۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”شاید بڑھیا گزر گئی۔“ اچانک ہی وہ ہنسے۔

ربیعہ ایک سنائے میں رہ گئی۔ ان کا جملہ اسے چیرتے ہوئے گزرا تھا۔ اس پر وہ طنز نہی اسے اچانک ہی

”بھئی ہمارے ہاں یہی رواج ہے۔۔۔“ اسے سوچ کر منہ آ رہا تھا۔ ”میاں کی سہیلیوں کے بال خاص طور پر نثار بنائے جاتے ہیں۔“

لڑائے غیر ارادی طور پر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔

”ان ہی زنجیروں میں مقید کرتی ہوں تم لوگ اپنے شکار کو؟“

”یو سلی مین!“ لڑائے اس کا مذاق سمجھتے ہوئے اسے گھورا۔ ”اب تو میں ضرور جاؤں گی پاکستان اور تمہاری بیوی سے تو خاص طور پر ملوں گی۔۔۔ دیکھوں تو تمہارے جیسے ڈیشننگ پر سنائی رکھنے والے مرد نے کس طرح کی عورت کا انتخاب کیا ہے۔“

عاشق کی آنکھیں مسکراتے لگیں۔

ان آنکھوں میں ایک چاند چہرے کا تصور ابھر رہا تھا۔

دروازے کے ساتھ دیوار پر نصب سنگ مرمر کی تختی پر کند ان الفاظ نے اس کے اندر ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔

جانے کیوں منزل پر پہنچ کر اس کا جی رونے کے لیے چل اٹھا۔ گہرے کمرے میں بھپک بھپک سے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ بند کیوں اور بٹن دیا۔ کال بیل شاید بیرونی دیوار سے ملحقہ صحن میں ہی نصب تھی۔ ”ٹائ!“ کی کرخت آواز نے خود ربیعہ کو ہی سنا دیا۔ جامن کے پیر پر بیٹھے

پرنڈے بھی اڑے تھے۔

کافی دیر کے انتظار کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ربیعہ نے متذبذب ہو کر ذرا سامڑ کر دیکھا۔

بیٹھا عباد اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ربیعہ کو قدرے اطمینان ہوا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بٹن دبایا۔

”کون ہے؟“ ایک کال بیل سے زیادہ کرخت آواز گیت کے قریب بھری تھی۔

ربیعہ نے جواب دینے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

کسی نے بے حد جارحانہ انداز میں دروازہ کھول کر باہر جھانکا تھا۔ پھر ربیعہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ عورت

شاک سے دوچار ہوئی ہو۔

چالیس پینتالیس کے سن والی وہ عورت سانولی رنگت اور بڑے بڑے گہرے لبوں کے گوشوں پر سخت مزاحیہ سے گہری سلوٹیں بڑھ گئی تھیں۔ بال سفید کا ایسا امتزاج تھے کہ ان کو نظر بھر کر دیکھ لینے سے جھجھکی سی آتی تھی۔ وہ مکمل طور پر ایک تنگ مزاج اور سخت گیر خاتون نظر آتی تھیں۔

ربیعہ کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے یوں تک رہی تھیں گویا پتھر کی ہوں۔

ربیعہ نے مڑ کر دیکھا۔ عباد ہنوز حالت انتظار میں تھا۔

”مم۔۔۔ میرا نام ربیعہ ہے۔۔۔ ربیعہ جہما کا بیٹا۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”جانتی ہوں!“ اس بہت سے یکایک تنفر بھری سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی۔ ربیعہ چونک اٹھی۔ اس لیے یہ حیران کن بات تھی۔

”آپ؟۔۔۔ آپ کون ہیں؟“ ربیعہ نے اس کی پتھر آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

”اندرا آجاؤ۔ کون ہے تمہارے ساتھ؟“ اس کی نگاہیں اب ربیعہ کے عقب میں دیکھ رہی تھیں۔

”کک۔۔۔ کوئی نہیں۔“ وہ ہکلا کر رہ گئی۔

احساس ہوا کہ اس نے وہاں آکر غلطی کی ہے۔  
وہ اب تک ہنس رہے تھے۔ رسیہ کے اندر غم و غصے کا طوفان اٹھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس اپنا سامان کہاں رکھا تھا۔ وہ شاید برآمدے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔  
وہ مڑ کر دروازے تک پہنچی تو یکایک ان کی ہنسی رک گئی۔  
”مینا مینا۔۔۔ بچی کے لیے کھانا بناؤ۔ بے چاری تھک گئی ہوگی۔“  
وہ پیچھے سے بولے تھے۔

\*\*\*

فون کی بیل بہت دیر سے بج رہی تھی۔ جھنجھلائی ہوئی عریشہ ہاتھ روم سے برآمد ہوئی۔ اس کے چلنے سے ہوتا تھا کہ اس نے بے حد عجلت میں کپڑے پہنے تھے۔ کیلے بال اس کی ٹیپس میں پھنسے ہوئے تھے اور کپڑے سے جکے ہوئے تھے۔

”ہیلو! اس نے ریسور اٹھایا۔“

”جی و علیکم ہیلو! دوسری طرف سے چمکتے ہوئے کہا گیا۔“

عریشہ لمحہ بھر کو متعجب ہوئی۔

”جی۔۔۔ کون؟“ وہ محتاط ہوئی۔

”انتظار کی سوئی رہ لگتا جاں باب۔۔۔“ سرد آہ بھرتے ہوئے گداز لہجے میں کہا گیا۔

”مجھے تو محلے کے چھبے پر لٹکے فیوزیل معلوم ہوتے ہیں۔“ وہ بھی کہاں چپ رہنے والی تھی۔

”ہا ہا۔۔۔ ویل سیڈ ویل سیڈ۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ محترمہ جس مزاج بھی رکھتی ہیں! ادھر سے سراہا گیا۔“

”جی میں خدا کے فضل و کرم سے تین عدد جوان بھائی بھی رکھتی ہوں۔۔۔ نگرے قسم کے۔۔۔“

بولی۔

”کوئی بات نہیں۔“ بیٹھے لہجے میں فرمایا گیا۔ ”بھائیوں پر چنداں اعتراض نہیں۔ بس اتنا خیال رہے کہ

برداشت نہ ہوگا۔ جیسے روسیہ کہتے ہیں۔“

عریشہ کو بے ساختہ ہنسی آئی۔

”اس بد تمیزی کا مقصد کیا ہے آخر؟ آپ ہیں کون؟“ وہ بھی پورا پورا گھونٹنے لگی۔

”در حسن پر صدا دیتا گدا۔“ بھرپور آواز لگائی گئی۔

”گدھا؟“ عریشہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ”جی ہاں جی ہاں۔۔۔ میں نے پہچان لیا۔ آواز ہے۔“

”فرہاد کی آواز قصر شیریں میں محض شیریں ہی پہچان پاتی ہے۔“ وہاں ہنسی قسم کی شرمندگی کا شائبہ تہنہ

”ورنہ ہم تو ہفتہ بھر سے کالیں ضائع کر رہے ہیں۔ آپ کے ٹیلیفون کے دربان کی آواز بہت بے سُر کی ہے شیریں

یہ کام آپ سنبھال لیجئے۔“

”اے مسٹر! آپ ذرا اپنی زبان سنبھالیں۔ دو باتیں کیا کر لیں آپ تو منہ کو آنے لگے۔“

”اجی ہمارے ایسے نصیب کہاں۔“

اس کے کانوں میں وہ لہجہ اور وہ جملہ گونج رہا تھا۔ اسے گلف مارکیٹ تک کا سفر یاد آگیا۔

”یہ تو بھیا کی سوک کا کمال ہے!“

”ہائے اللہ!“ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ سر ہٹ بھاگی۔

اپنے پورشن سے نکل کر وہ اپنی پیچھے کے پورشن کی طرف آئی تھی۔

”ارے ارے بچی۔ کہاں دوڑی جاتی ہے۔ سائنس تو لے۔“ شفیقہ حیات دروازے پر ہی مل گئیں۔

”علیکم السلام دادی جان!“ وہ دادی کو دیکھ کر ٹھہری۔

”وعلیکم السلام۔۔۔ جیتی رہو۔۔۔ کون سی بلا دیکھ لی؟“ وہ شاید واپس جا رہی تھیں ”یوں ہانپتی کانپتی پھرتی ہو۔“

”وہ۔۔۔ میں تو ناعمہ سے ملنے آئی تھی۔“ وہ شرمندہ ہوئی۔

”ہاں تو بچی! خدا نے پیر دیے ہیں پر نہیں دے! چلو مگر اڑو مت!“ وہ نکل گئیں۔

دروازے پر ہی کلاس لے لی گئی تھی اس لیے وہ خود کو قابو میں رکھ کر اندر داخل ہوئی۔ لاؤنج میں بیٹھی پیچھو کو

سمام کرتی وہ بچن کی جانب بڑھ گئی جہاں دروازے پر کڑھی میں ڈالتی جا رہی تھی۔

”ہائے۔۔۔ کڑھی۔“ عریشہ چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول گئی۔

”تم کب آئیں عریشہ؟“ ورنہ نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا ”ناعمہ کڑھی لے کر تمہاری طرف آنے والی

تھی۔“

”اور اس بلی خوشبو سے میں خود کھینچی چلی آئی۔“ عریشہ۔۔۔ خالی پلیٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ ”ذرا

چکھا۔“

ورنہ کھانسی ہوئی پورے خاندان میں مشہور تھی۔ عریشہ وہیں بیٹھ کر کڑھی کھانے میں مشغول ہو گئی۔

ناعمہ بچن سے داخل ہوئی، ہوئی تو چونک اٹھی۔

”ہائیں میں تو تم سے ملنے آرہی تھی۔“

”ہاں تو تم کھینچیں تو کڑھی کھا کر جا رہی ہوں۔“ وہ انگلی سے خالی پلیٹ چاٹنے میں مشغول تھی۔

”کڑھی کھا کر آئی تھی۔“ ناعمہ نے اسے گھورا۔

”ابا۔۔۔ آں نہیں۔ اصل بات یاد آئی تو وہ سٹپٹا گئی۔“ وہ تو میں تمہیں۔۔۔“

پھر وہ اشارے سے اشارے سے بولی۔

”یہ کیسے دیدے منکار رہی ہو؟“ ناعمہ نے اسے گھورا۔

”کیا بات ہے عریشہ؟“ بچہ سے کچھ چھیاری ہوئی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں تو ورنہ آئی۔ میں میں تو۔“

ناعمہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ ورنہ دو ٹکے میں کڑھی نکال کر عذر راہیگم کو دینے کے خیال سے چل دی۔

عریشہ نے لپک کر ایک دھمکا کا ناعمہ کی کمر پر رسید کیا۔

”کیا بتی۔۔۔ اب نہیں بتاؤں گی تجھے۔ مرنی رہنا سہیجہ میں۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔“

ناعمہ نے کمر کی ٹیس برداشت کرتے ہوئے اس کا بازو تھما۔

”اچھا تا تم کو بھی غصہ لیکن اپنے ہی منہ پر۔“

عریشہ کو ہنسی آگئی۔ دونوں بچن سے نکل کر کمرے میں چلی آئی تھیں۔

”اب بولو کیا بات ہے؟“ ناعمہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔

”تیرے اس ڈرائیور کا فون آیا تھا۔“

”میرا ڈرائیور؟“ ناعمہ حیرت سے قطعاً ”فراموش کر چکی تھی! لہجہ کر بولی۔“

”وہی سوک والا۔“ وہ جل کر ہوئی۔  
 ”ہائے“ ناعمہ نے دل تھام لیا۔ ”اس نے کیوں فون کیا؟ اور اس کے پاس نمبر کہاں سے آیا؟“  
 ”گھر تک پہنچا جو کیا تھا منہ سوں نے۔ نمبر پر کرنا کیا مشکل ہے اور رہی بات کہ فون کیوں کیا تھا تو اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔“

”تو نے پوچھا ہوتا۔“ ناعمہ نے شوخی سے اسے چھیڑا۔  
 ”اگلی مرتبہ تیرا نمبر دلوں گی۔ پوچھ لینا۔“  
 ”نمبر ضرور دیتا لیکن جوتے کا۔“ ناعمہ نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں تو چھکے چھڑاؤں گی موصوف کے

ناعمہ علی خان نام ہے میرا۔“  
 ”کہتا تھا ہفتہ بھر سے فون کر رہا ہے۔“ عریشہ نے فکر مندی سے کہا۔ ”نبھا نے اس کی ڈسب کالز کس نے کی ہوں گی۔“

”سی ایل آئی پر نمبر تو آیا ہو گا نا؟“ ناعمہ نے سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”ہاں۔ لیکن موبائل نمبر ہے۔“  
 ”گالیاں دیں؟“ اسے انوکھا خیال سوچھا۔

”شی اس نے بھی جواب میں کچھ کہہ دیا تو کیا عزت رہے۔“  
 ”زبان کھینچ کر ہاتھ پر رکھ دوں گی کہنے کی۔“  
 ”اسی فون سے ہاتھ نکال کر وہ بھی تمہاری کھائی مرو رہے گا۔“ عریشہ طنزاً بولی ”باتیں بناتی ہو۔“

ناعمہ سوچ میں پڑ گئی۔  
 ”خیر کیا کر لے گا؟ دو چار کالیں ہی کرے گا نا۔ پھر علی اور حمزہ کی گالیاں سن کر خود ہی ٹھنڈا ہو جائے گا۔“  
 ”وہ لڑکے ہیں لڑکے وہ بھی آج کے دور کے۔ اس سے کھڑکھڑائی جائیں گے اور سر پھاڑ دیں گے۔“

”تو پھاڑیں نا۔ اچھا ہے مزہ آئے۔“  
 ”اور جو وہ اس سفر کی داستان سنا ڈالے پھر؟“ وہ جل کر ہوئی تھی۔  
 ”تب کی تباریکھیں گے۔“ اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے گویا قصہ ختم کیا۔ ”جلیکڑی منی ایل کورنگ۔“

”PHOTO“  
 وہ تیزی سے ساوے صفحے پر قلم چلانے میں مصروف تھا جب کمرے میں کسی کی آمد سے سر سر اٹھ پیدا ہوئی۔  
 اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھائیں۔  
 فردوس بیگم اور ماہین کو ایک ساتھ اپنے کمرے میں پا کر اس کا ہاتھ ٹھنک۔ اس نے قلم کو پھر اسی تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔

”آہم۔“ فردوس بیگم نے گلا صاف کیا تھا ہاشم کو مجبوراً ”نظر میں اٹھانی پڑیں۔“  
 ”آئیں امی۔ بیٹھیں۔ بیٹھو ماہین!“ اس نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔  
 ”ہاں ہاں بیٹھتے ہیں۔ بیٹھنے ہی آئے ہیں۔“ فردوس بیگم اپنا ٹیمپ ٹیمپ وجود سنبھالتے ہوئے صوفے کی جانب بڑھیں۔ ”تم تو ایسے اپنے کمرے کے ہوئے مانو نیا نو بھلا دو لہا ہو۔ ہم تو باہر سے تمہارا دروازہ ہی دیکھتے ہیں اب کھلے کہ تب کھلے!“

”بس امی۔ آفس کی طرف سے کام کا کچھ دباؤ ہے آج کل۔“ وہ انگلیاں چٹکانے لگا۔

بھربا غیچہ میں پھرا کرتی تھی 'اری ایقان! خدا تیرا بھلا کرے۔ میرے بھائی کی زندگی تباہ کی اور اس پچھل پیری گھر کا رستہ دکھا کر میرا پیچہ پاؤلا کر ڈالا۔ ارے میں کہتی ہوں ناروق حسن! آؤ دیکھو اپنے لاڈلے کی گل افشائیاں اس کو پھولوں کا سہرا بیاہ کر لاؤ اس منحوس کو۔'  
 'ای۔ ای۔' 'ماہین نے انہیں جھجھوڑا۔' 'خدا کا واسطہ چپ کریں۔' انہوں نے ہڑبڑا کر ڈیویشہ آنکھوں سے ہٹایا۔ ہاتھ کب کا کمرے سے جا چکا تھا۔  
 'مستیاناں ہو تیرا جادو کرنی۔' وہ بڑبڑانے لگیں۔



سفید آٹو کو پورچ میں پارک کر کے اس نے برابر کی سیٹ پر رکھا اپنا سیاہ لیدر بیگ اٹھایا اور گاڑی سے نکل کر اسے لاگ کرنے لگی۔  
 آج وہ ہاسپٹل سے مارکیٹ چلی گئی تھی۔ عیر کتے ہی دن سے ضد کر رہا تھا کہ اسے نئے کلرنگ مارکرز کا سیٹ چاہیے۔ سو آج وہ اس کے لیے مارکرز کا نیا سیٹ لیتے ہوئے آئی تھی۔ اس نے لاؤنج کا دروازہ کھینچ کر اندر سے پکارا۔  
 'نعم۔ عیر۔ عیر۔ آریو مائی چائلڈ!'  
 اسے پکارتے ہوئے وہ لاؤنج میں پڑے سیاہ صوفے پر جا بیٹھی۔ اس کے جسم میں دیکھنے والا احساس تھا۔ تسلسل سے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔  
 منیڈر بیگم کچن سے نکل کر آئیں تو وہ صوفے کی پشت سے نکلتے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔  
 'شہلا! انہوں نے آہستگی سے پکارا۔

وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔ اس کی نگاہ ان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالی پر گئی۔  
 'جیے میری ماں! وہ خوش ہو گئی۔' 'شدت سے جی چاہ رہا تھا آپ کے ہاتھ کی پیالی چائے پینے کا۔' ان کے لب لہجہ تمام لیا۔  
 'یہ عمر کہاں ہے؟ آواز دینے پر بھی نہیں آیا۔ راجہ کی طرف گیا ہے کیا؟'  
 'ہوں! انہوں نے آہستگی سے ہنکارا بھرا۔  
 'انفقا کہاں ہے؟' اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔  
 'اپنے کمرے میں ہے۔' وہ آہستگی سے بولیں۔  
 یکدم اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اس نے ماں کا چہرہ غور سے دیکھا۔  
 'ای۔ ای۔'

**PHOTO**

انہوں نے نگاہیں چرائیں۔  
 'ای۔ ای۔' شہلا نے کپ میز پر رکھ دیا۔ 'اوہر دیکھیں میری طرف۔'  
 'شہلا! بیٹا دھندلا غور سے میری بات سنو۔' وہ بے بسی سے بالا خر گویا ہوئیں۔  
 'ای۔ ای۔' عمر کہاں ہے؟' اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔  
 'بیٹا دھندلا آج دوسرا اس کے اسکول سے پرنسپل کا فون آیا تھا۔'  
 شہلا کا چہرہ سننے کی طرح سفید پڑ گیا۔ منیڈر بیگم کے ہاتھوں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔  
 'نعم۔' اس کے لب کا پتہ تھہر گیا۔ 'کہاں ہے وہ؟'  
 'اس کا باپ اسے لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی پرنسپل نے یہی کفرم کرنے کے لیے یہاں فون کیا تھا کہ آیا۔'

وہ۔ وہ۔ اسے لے گیا؟ لے گیا۔ لے گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔  
 'شہلا! میری بات سن لو۔ ابراہ نے مجھ سے خود بات کی۔ وہ اسے چھوڑ جائے گا۔'  
 'وہ لے گیا اسے۔' وہ پانگلوں کی طرح چیخی۔ 'وہ میرا پیچہ لے گیا۔' وہ کٹے ہوئے تنے کی مانند ان کی بانہوں میں گری۔  
 'شہلا! شہلا! انفقا! وہ بے طرح گھبرا کر چیخنے لگیں۔

انفقا اپنے کمرے سے نکل کر بھاگی آئی۔  
 'آپ نے بتا دیا نا ای! میں نے منع کیا تھا آپ کو۔'  
 اس نے شہلا کو صوفے پر لٹایا اور اس کے گال تھپتھپانے لگی۔  
 'دیکھا کہتی؟' ان کے آنسو جھرجھر بننے لگے۔  
 اسی لمحے باہر ایک ٹانائوس ہارن بجا۔ ساتھ ہی کال بیل بھی بجی۔ انفقا نے خوش امید سے ماں کو دیکھا۔  
 'میرا خیال ہے، عمر آگیا ہے۔' وہ اٹھ کر گیٹ کی جانب بھاگی۔  
 اس کا ہندازہ درست تھا۔ عمر گیٹ پر موجود تھا۔ دو درجائی ایک گاڑی کی سرخ بتیاں چمک رہی تھیں۔  
 'خالد جانی! وہ چکا۔' وہ میرے بیٹا تھے۔  
 انفقا اسے بانہوں میں بھر کر اندر چلی آئی۔  
 'وہ کون ہے آپ کی ماما کو کیا ہو گیا ہے۔ اپنی ماما کو آواز دے۔ جگاؤ انہیں۔' اس نے عمر کو شہلا کے قریب بٹھا دیا۔

'منہیں! عمر نے ننھے باتوں سے اس کا چہرہ تھما۔' 'ماما! آنکھیں کھولیں نا۔ دیکھیں میں آگیا۔' شہلا نے آہٹیں کھول دیں۔ چند لمحوں کے بعد یقینی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اسے خود سے چمٹا کر زور سے رونے لگی۔  
 'میری جان! وہ چٹا چٹا اس کا چہرہ اور اس کے ہاتھ جو منے لگی۔  
 انفقا نے بوسہ بوسہ کی بجائے چل دی۔ صوفے پر بیٹھی منیڈر بیگم بالکل ساکت تھیں۔ ان کے خالی ہاتھ ان کی گود میں دھرتے تھے۔ ان کی آنکھیں کیڑی مرنے لگی تھیں۔ آنسو ان کے دل پر گر رہے تھے۔

**URDU**

اس نے وہ بچہ جس پر تصویریں بن اور بگڑ رہی تھیں۔  
 وہ بند آنکھوں کے نیچے آباد ایک جہان سے گزر رہی تھی۔  
 کتنی ہی لاتعداد بے شمار تصاویر تھیں۔ متحرک تصاویر مربوط اور غیر مربوط۔  
 اس کا چھوٹا سا صحن تھا جس میں ہار سنگھار کا درخت تھا۔ اس کے پھول ربیعہ کے اوپر گر رہے تھے۔ ربیعہ ہنس رہی تھی۔ صحن میں چمچی چارپائی پر وادی اور نفیسہ خالہ بیٹھی تھیں۔ وہ بھی ربیعہ کی خوشی میں خوش نظر آ رہی تھیں۔  
 مجمعہ نے دیوار پر چڑھ کر اسے اشارے کرنے شروع کر دیے۔ ربیعہ اس کے اشارے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ یکایک دروازے پر عرفان شوکت نمودار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ حاکم چچا تھے۔ ان دونوں کے چہرے سخت اور آنکھیں لال تھیں۔ ربیعہ کو ان کے ارادے ٹھیک معلوم نہ ہوتے تھے۔ وہ ڈر کر بھاگی تھی۔ ٹرین کے کپے بہت بڑے بڑے تھے۔ ربیعہ کو ان آہنی بنجوں سے خوف محسوس ہوا۔ دانتا ریل گاڑی چٹکھاڑی ربیعہ کی آنکھ یک تخت کھل گئی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہاتھ پر پینے کا احساس تھا۔ اسے کچھ سرگوشیاں سنائی دیں۔ کوئی کمرے



میں دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ ربیعہ کو سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں تھی؟ وہ بے حس و حرکت لیٹی ٹائمنوس چھت کو گھورتی رہی جس پر گندہ سا پنگھا لٹکا ہوا تھا۔ سرگوشیوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ چند نفوس اس کے سر ہانے مدھم آوازوں میں جو گفتگو تھیں انہیں ربیعہ کے جانے کا علم نہ ہو سکا تھا۔

ربیعہ کو یاد آیا کہ وہ اپنے پیچھا منور امین کے گھر میں تھی۔ وہ سفر سے بے حد تھک گئی تھی اس لیے کھانا کھاتے ہی سو گئی تھی۔ ان دونوں نے اس سے سفر کے متعلق کوئی بات نہ کی تھی۔

نجانے وہ کتنی دیر تک سوتی رہی۔ اپنی جسمانی کیفیت سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے سوئے ہوئے بہت وقت ہو گیا تھا۔ وہ خود کو بالکل تروتازہ محسوس کر رہی تھی۔ ذہن مکمل طور پر چوکس تھا اور مزید سوسنے کی کوئی خواہش محسوس نہ ہو رہی تھی۔

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سرگوشیاں ایک لخت معدوم ہو گئیں۔ ربیعہ نے دیکھا اس کے سر ہانے بجھے پلنگ پر تین خواتین موجود تھیں۔ ان میں سے ایک مینا تھیں۔ ایک مینا سے بے حد مشابہ صورت کی بیس بیس سالہ لڑکی تھی جو ان کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ دوسری لڑکی بھی اس کی ہم عمر تھی لیکن اس سے قدرے مختلف تھی۔ وہ تینوں اسے بیدار دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ پھر دوسری لڑکی مسکراتے ہوئے اٹھ کر ربیعہ کی آئی اور اس سے اپٹ گئی۔

”میں ترانہ ہوں۔ تمہاری پھپھو زاد۔“ اس نے کہا تھا۔ اس کے گلے لگ کر ربیعہ کو داوی کے بعد پہلی مرتبہ کسی نے اس کی پلکوں پر موتی چمکنے لگے۔

دوسری لڑکی بھی اٹھ کر اس تک آئی تھی مگر اس نے محض ربیعہ سے ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔

”یہ صولت ہے۔ مینا پھپھو کی بیٹی۔“ ترانہ نے بتایا۔ ”مینا پھپھو سے تم مل رہی چکی ہو۔“ ربیعہ نے مسکرا کر صولت کو دیکھا لیکن اس کی آنکھوں سے چھپتی سر دھری سے اس کی مسکراہٹ منتشر کر دی۔ صولت اسے عجیب سے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کی آنکھوں میں جھانکنے کے بجائے وہ اس کے چہرے کے نقوش کا بغور جائزہ لے رہی تھی جیسے وہ ایک جیتی جاگتی ہستی کو نہیں بلکہ کینوس پر پینٹ کیے گئے کسی چہرے کو دیکھ رہی ہو۔

ربیعہ کنفیوزی ہو گئی۔

”امی کہہ رہی ہیں انہوں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کیونکہ انہوں نے تمہاری ہاں کو ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ تم بالکل اپنی ہاں جیسی ہو۔“

”نہیں۔“ تب ہی کرخت لہجے میں مینا بولیں۔ ”اس کی ہاں اتنی خوب صورت نہیں تھی۔ وہ سافٹی تھی۔ اس نے رنگ اپنے باپ سے لیا ہے۔ ہاں نقوش سب ہاں پر گئے ہیں۔“

”تو نقش بھی تو کتنے پیارے ہیں پھپھو!“ ترانہ نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ میری ممانی بہت خوب صورت تھیں۔“

”ہو نہ ہو!“ مینا نہیں۔ ان کی ہنسی میں نفرت اور تضحیک تھی۔ ”حسن ہی سب کچھ نہیں ہوتا بی بی! مگر بھی ہونے چاہئیں۔“

ربیعہ ایک مرتبہ پھر چونک اٹھی۔ نجانے کیوں یہاں آکر اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کئی انکشافات اس کے منتظر ہوں۔ وہ بے چین ہو گئی۔

”مجھے پیاس لگی ہے۔“ اس نے ترانہ سے کہا۔

”پلو پلو میں چلیں۔ میں چائے بھی بناتی ہوں۔“ ترانہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اس کے ہاتھ میں خلوص اور محبت کی حدت تھی۔ ربیعہ کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔

\*\*\*

”یہاں لوگ جلدی سو جاتے ہیں؟“ ربیعہ نے سوئے ہوئے ماحول کو دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں۔ ہم لوگ بھی نوبتے تک سنبھو سو ہی جاتے ہیں۔ کبھی کبھار ہی ساڑھے نو دس کی نوبت آتی ہے۔“

وہ دونوں چھت پر ٹہل رہی تھیں۔ فضا میں جس تھا اور گرمی کا واضح احساس ہو رہا تھا۔ دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔

”تم دن بھائی اور تصور بھائی دیر سے لوٹے ہیں۔ پھر پھپھو ہی اٹھ کر روزانہ کھولتی ہیں۔“ ترانہ نے مزید کہا تھا۔

”ویسے اب وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ اچھا ہے تم بھی مل لینا۔“

ربیعہ خاموش رہی۔ اسے اپنی پھپھو کے لگے ہوئے خطوط یاد آ رہے تھے۔

”تم نہیں ہونا؟“ اسے یکایک یاد آیا۔

”میں نہیں۔“ ترانہ اواسی سے بولی۔ ”مجھ سے بڑی بہن تھیں۔ ان کا لڑکپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔“

”اب ربیعہ کو نفوس ہوا۔“

”ان کے بچہ کی بھی چلن بسیں۔ ہم لوگ۔۔۔ چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ مینا پھپھو کو طلاق ہو گئی تھی۔ ان کی ایک ہی اولاد ہے صولت۔ یہ ہمارے ساتھ ہی رہا کرتی تھیں۔ امی کے بعد انہوں نے ہی گھر سنبھالا۔ لیکن بس گزرا زانیہ۔۔۔ جیسے ایک ماں اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے وہ بات تو نہ تھی نہ ہے۔ خیر وقت گزر گیا۔ اب

کا گیارہ کر رہا ہے۔“

دونوں نے مل کر منہ منہ بات کی۔ آگئیں۔ دور ننھی ننھی روشنیاں دیوں کی مانند جلتی نظر آ رہی تھیں۔ ربیعہ کو وہ ماحول سخت سوگوار محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”تم اپنی سہیلیاں ان کے ساتھ لے کر آئی ہو؟“

”ہارٹ ایک۔“ ربیعہ اواسی سے بولی۔ ”میرا اپنا آخری پرچہ دے کر لوٹی تو گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم

نہیں۔۔۔ کہنے کے لیے مل سکا۔ مجھے نہیں سہارا دی جانے لگے۔ مجھے بھی تم لوگوں کے متعلق کیوں

میں بھی جانتا تھا۔۔۔ میں نے ابھی میرے ابو امی کے متعلق بھی کچھ نہیں بتایا۔ میں تو ہوا میں اڑتے پتے کی مانند ہو گئی تھا اور لاوارث۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ ترانہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”پھر مجھے ایک صندوق سے پھپھو کے خطوط ملے۔ تمہاری امی کے خطوط تب مجھے علم ہوا کہ میں اتنی بھی لاوارث نہیں۔ میرے بھی خونی رشتے موجود ہیں۔ ماں باپ نہ سہی۔ باپ کی بہن کے اہل خانہ تو ہیں ایک

ڈھارس بندھی۔ دل کو سکون ملا۔ پتہ نہیں پتہ نہیں۔ دادی نے ایسا کیوں کیا۔“

”مائی امی اور ابو کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔“ ترانہ نے آہستگی سے انکشاف کیا۔

ربیعہ چونک اٹھی۔

”دونوں نے تا عمر ایک دوسرے کا چہرہ نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی۔ مائی امی نے اپنی قسم پوری کر لی۔“

”لیکن ایسا کیوں ہوا؟“ ربیعہ گم صم سی ہوئی۔

اس کے ذہن میں اپنی شفیق دادی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

”بڑھیا مر گئی۔“ ایک مکروہ ہنسی اس کے کانوں میں گونجی تھی۔  
 ”نانی امی نے کبھی تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“ ترانہ نے اندھیرے میں اس کا چہرہ کھوجنے کی کوشش کی۔  
 ”نہیں، ابھی بھی نہیں۔“

”مینا پھوپھو۔۔۔ تمہارے ابو کی منگیتر تھیں۔“ ترانہ نے انکشاف کیا۔ ”امی ابو کی شادی کے ساتھ ہی ان کی منگنی ہو گئی تھی۔“

ربیعہ گم صدمہ سی سننے جا رہی تھی۔  
 ”لیکن یہ منگنی اس وقت ختم ہو گئی جب ماموں نے اپنی پسند سے شادی کر لی تمہاری امی سے۔ سو ابو اور نانی امی کے مابین بہت بڑی رنجش پیدا ہو گئی۔“

اندھیرے میں پیدا ہونے والی آواز نے دونوں کا دھیان بٹایا۔ سیرھیوں پر کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ جیسے کوئی بیساکھی کے سہارے سیرھیوں پر چڑھ رہا ہو۔

”تہن بھائی آگئے۔“ ترانہ یکا یک بولی۔  
 چند لمحوں میں اندھیری سیرھیوں پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ میں اسٹک تھی۔

”ترانہ! ایک بھاری آواز گونجی۔  
 ”جی ہن، آجائیں۔“ ترانہ بولی۔

اسٹک کے سہارے چلتا ہوا سایہ ان تک پہنچا۔ دیوار پر کے چائیس ڈاٹ کے بلب کی ملگجی بیارندہ شیشی نے اس کا سراپا واضح کرنے کی کوشش کی۔

وہ ایب پر اسرار قسم کا شخص تھا۔ ربیعہ کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا۔ گھنی بھنوں کے نیچے چمکتی پراسرار نگاہیں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔

”اسلام علیکم۔“ ربیعہ نے آہستگی سے سلام کیا۔  
 ”وعلیکم السلام۔“ وہ نوزائے گھور تارہا۔

”بھائی! یہ ربیعہ ہیں۔ جہاں ذہب ماموں کی۔“  
 ”معلوم ہے۔“ اس نے بہن کی بات کالی ”مجھے روٹی دو۔“

وہ واپس مڑ گیا۔ اسٹک کی آواز لمحہ بہ لمحہ ہم ہوتی گئی۔ ترانہ شرمیلی ہوئی۔  
 ”معاف کرنا ربیعہ! یہاں سب لوگ بس ایسے ہی ہیں۔ اکھڑ اور بند مزاج سے۔ لیکن تمہیں کوئی کچھ نہیں

کے گئے۔ تم فکر مند مت ہونا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ سمجھو میں تمہاری بڑی بہن ہوں، یہاں کا ماحول تو ایسا ہے کہ مجھے خود شدت سے ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔“ وہ اداسی سے بولی۔

”تہن بھائی کو کھانا دو۔“ وہ آہستگی سے بولی ”میں نہیں بھوک لگی ہوگی۔“  
 ”ہاں۔۔۔“ ترانہ ہنس دی۔ ”میں نہیں بھوک بہت لگتی ہے۔“

”ترانہ اور صولت دونوں نوکری کرتی ہیں۔ ترانہ ٹریولنگ ایجنسی میں کام کرتی ہے، صولت اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے تو صولت ترانہ سے کافی چھوٹی ہے۔ لیکن بے چاری کم عمری میں ہی روزگار سے لگ گئی ہے تہن اور تصور کپڑے کی دکان چلاتے ہیں۔ پہلے بھائی یہ کام کرتے تھے لیکن فارغ کے انیک کے بعد وہ تو بس ایک پلنگ کے ہی ہو رہے۔ اب انہیں چھوٹے بچوں کی طرح پالنا پوسنا پڑ رہا ہے۔ لڑکوں پر وقت سے پہلے ذمہ داری آ پڑی

”ترانہ اور صولت دونوں نوکری کرتی ہیں۔ ترانہ ٹریولنگ ایجنسی میں کام کرتی ہے، صولت اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے تو صولت ترانہ سے کافی چھوٹی ہے۔ لیکن بے چاری کم عمری میں ہی روزگار سے لگ گئی ہے تہن اور تصور کپڑے کی دکان چلاتے ہیں۔ پہلے بھائی یہ کام کرتے تھے لیکن فارغ کے انیک کے بعد وہ تو بس ایک پلنگ کے ہی ہو رہے۔ اب انہیں چھوٹے بچوں کی طرح پالنا پوسنا پڑ رہا ہے۔ لڑکوں پر وقت سے پہلے ذمہ داری آ پڑی

”ترانہ اور صولت دونوں نوکری کرتی ہیں۔ ترانہ ٹریولنگ ایجنسی میں کام کرتی ہے، صولت اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے تو صولت ترانہ سے کافی چھوٹی ہے۔ لیکن بے چاری کم عمری میں ہی روزگار سے لگ گئی ہے تہن اور تصور کپڑے کی دکان چلاتے ہیں۔ پہلے بھائی یہ کام کرتے تھے لیکن فارغ کے انیک کے بعد وہ تو بس ایک پلنگ کے ہی ہو رہے۔ اب انہیں چھوٹے بچوں کی طرح پالنا پوسنا پڑ رہا ہے۔ لڑکوں پر وقت سے پہلے ذمہ داری آ پڑی

”ترانہ اور صولت دونوں نوکری کرتی ہیں۔ ترانہ ٹریولنگ ایجنسی میں کام کرتی ہے، صولت اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے تو صولت ترانہ سے کافی چھوٹی ہے۔ لیکن بے چاری کم عمری میں ہی روزگار سے لگ گئی ہے تہن اور تصور کپڑے کی دکان چلاتے ہیں۔ پہلے بھائی یہ کام کرتے تھے لیکن فارغ کے انیک کے بعد وہ تو بس ایک پلنگ کے ہی ہو رہے۔ اب انہیں چھوٹے بچوں کی طرح پالنا پوسنا پڑ رہا ہے۔ لڑکوں پر وقت سے پہلے ذمہ داری آ پڑی

اس لیے کچھ چیزیں ہو گئے ہیں۔ تصور تو خیر بہتر ہے اپنی پڑھائی بھی کرتا ہے۔ اسی لیے کافی دیر سے لوٹا ہے۔ لیکن تہن! چلو خیر! روزگار پر لگاؤ کا ہے مزاج کا تیز ہے تو کیا ہوا۔“

انہوں نے رک کر ربیعہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ دھیان کچھ بے دھیانی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔  
 ”اس گھر میں کوئی کسی کو کچھ دینے کا روادار نہیں ہے۔ لڑکے جو کماتے ہیں جیب میں رکھتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ گھر میں سوداؤالودیتے ہیں، مہینے کا بجلی، گیس کا بل دے دیتے ہیں۔ ترانہ کی تنخواہ تو ادھی سے زیادہ باپ کے علاج پر اٹھ جاتی ہے۔ پھر آنا جانا، ملنا برتنا، عید تہوار۔۔۔ یہ سب بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ اور صولت بے چاری کی تو تنخواہ ہی کتنی ہے۔ کرایوں میں پوری ہو جاتی ہے۔“

ربیعہ کو اب ان کی بات پر مکمل دھیان دینا پڑا۔ ان کا مطلب کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس نے چائے کا کپ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

”ترانہ نے بی اے کیا ہے۔ ایک جاننے والے کے توسط سے اسے یہ نوکری مل گئی۔ صولت بے چاری تو دسویں سے آگے پڑھ ہی نہ سکی۔ ایسے حالات میں آدمی یا تو پڑھ لے یا کھالے۔ پھر بھی تھوڑا بہت جو بھی ہے اپنا کما لیتی۔ تم نے بھی تو بی اے کیا ہے نا؟“

”جی ہاں، میں نے ہاتھ میں زبان کی سی تیزی سے چلتی چھری کو چند لمحوں کے لیے روکا۔ وہ بالک کاٹ رہی تھیں۔  
 ”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”ہاں تو تمہیں بھی مل جائے گی نوکری۔ میں ترانہ سے کہوں گی۔ تمہارے لیے بات کرے!“ وہ اس کا جھکا ہوا سر دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہاری؟“ اس نے کیا بھی ہے تمہیں تمہاری ماں کے متعلق؟“ دفعنا مینا نے سوال کیا۔  
 ”جی ہاں، میں نے بھی نہیں۔“ وہ قدر سے خوفزدہ سی ہو کر گئی۔

وہ چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا۔ ”ان کی نظروں میں ابھرتا طنز اور تحقیر کا جذبہ ربیعہ کو اندر تک سن کر رہتا تھا۔“

”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

”جی! اب یہ کچھ بولیں سے آہ کی صورت نکلا۔“

PIOTO

PIOTO

PIOTO

PIOTO

PIOTO

PIOTO

PIOTO

PIOTO

میں سونا چاہتی ہوں۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں ماما؟“

”نہیں عمو۔ بس میں بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔

”اچھا۔ نہ کریں بات۔ بس سنتی جائیں۔ مجھے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔“ وہ معصومیت سے گویا ہوا۔

شہلا نے آنکھیں کھول کر اسے حق سے گھورا۔

”میرے بیچے میں اتنا دم نہیں ہے۔“

”ماما! غصے سے کیوں بول رہی ہیں۔“ وہ سہم گیا۔ ”میں نے تو نہیں کہا تھا نا کہ آپ پیپا کو اسکول بھیجیں۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ میرے پیپا ہیں۔“

شہلا نے بے بسی سے سانس بھری بچے سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ خاموش ہو رہی۔

”ویسے وہ اچھے ہیں ماما۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ ”آپ کبھی ملی ہیں ان سے؟“

شہلا کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اس نے نچلا لب دانٹوں تلے دبا کر ہنسی روکی۔

”آپ اگر کبھی ملیں ان سے تو۔“

”عمرا! شہلا نے اسے گھورا۔ ”پتا نہیں تم کب بڑے ہو گے اور مجھے ان فضول سوالوں سے نجات ملے گی۔“

”میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی ماما۔ آپ یو ٹیوٹا سنتی رہتی ہیں جو پیپا تو میری بہنوں سے بہت خوش ہے۔“

”پہا کے سگے“ اس کی جان جل کر کباب ہو گئی۔ ”ایک دن باپ نے چوپچلے اٹھائے تو لگا ہے قصیدہ خوانی کرنے پوچھا نہیں اس سے اتنے سال کہاں گم تھا؟“

عمر سہم کر خاموش ہو گیا۔ شہلا کا دل لمحہ بھر میں موم کی طرح پگھل گیا۔ اس نے اس کا سر سینے سے لگا لیا۔

”سوری بیٹا! آئی ایم سوری۔“

”ماما! وہ گلو کیر لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھ سے ایسے نہ بات کیا کریں۔ میں نے پیپا کو بھی بتایا تھا کہ میری ماما بہت سوفا اسپون ہیں۔ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔“

”پھر انہوں نے کیا کہا؟“ اس نے خود سے بھی چھپ کر ہنسی سے پوچھا۔

”انہوں نے؟“ وہ سوچنے لگا۔ ”کچھ نہیں ماما۔ کچھ نہیں بولے۔“

شہلا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”جھوٹ بول رہے ہو؟“

”نہیں ماما! جھوٹ بول رہے تھے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”کیا؟“

”کہہ رہے تھے۔ تمہاری ماما ایف سکسٹین اور جیوئیٹ کے جیسی ہیں۔“

”کیا؟“ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”میں نے نہیں کہا ماما! پیپا کہہ رہے تھے۔“ وہ جلدی سے کبل میں گھس گیا۔

شہلا غصے سے کانپنے لگی۔



وہ اپنی شادی کی تصاویر کا البم کھولے بیٹھی تھی۔ اس کا جی نہ جانے کیوں گھبرا رہا تھا۔ کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو

یہی مشغلہ نکال کر بیٹھ گئی۔

اس کے ویسے کے سوٹ کا رنگ گرین تھا اور شادی کا جوڑا گلابی رنگ کا کچھ یا دیس دھنک کی طرح اس کی آنکھوں میں بکھر گئی تھیں تو ایک سنہری مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

”یار ویڈنگ ڈریس گرین ہونا چاہیے۔“

”کیا؟ تمہارا گل ہوئے ہو؟ شادی کے دن ہر جوڑا پہن لوں؟ میں طوطا ہوں کیا؟“

”طوطا تو روز پہنتا ہے تم بس شادی کے دن پہنتا۔“ وہ مزے سے بولا۔

”میرا داغ خراب نہیں ہے۔ میں لال جوڑا پہنوں گی۔“

”خبردار! میں کمرے سے نکال دوں گا۔“

”میں کمرے میں آؤں گی ہی نہیں میں تمہارے گھر ہی نہیں آؤں گی۔ بلکہ تم سے شادی ہی نہیں کروں گی۔“

”جو مرضی کو۔ میں گرین ڈریس بھجواؤں گا۔“

”میری اٹھا کر پھینک دوں گی۔“

”ضرور پھینکنا مگر شرط یہ ہے کہ جوڑے میں تم بھی موجود ہو۔ میں کچھ کر لوں گا۔“

”جین کو نہیں لگتی۔ اس کی نگاہ ویسے کی تصویروں پر جمی ہوئی تھی جس میں اس نے عاشق کا بہت چاہتوں سے خرید کر لیا تھا۔ اس نے یاد تھا ویسے پر اس کے حسن کی دھوم مچ گئی تھی۔ سبز جوڑے میں اس کے من کی باتیں اپنے عروج پر تھیں۔“

”میں نے کی پشت سے سر ہٹا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کا شہ پکاتا، محبت بھرا لہجہ اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔“

”ویسے کچھ نہ کہہ رہے تھے۔ تمہاری شد جیسی رنگت کے لیے، شریقی آنکھوں کے لیے، احمریں کے لیے۔“

”نہا، وہ جوڑا بھی۔“ اس نے البم سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دروازے کی سمت چلی۔ باہر کفری فردوس بیٹھا اور ماما کی طرف سے کچھ کہہ کر حیران مگر خوش ہوئی تھی۔

”صدر شہلا کو کون کون سا میرا خیال ہو گیا تھا۔“

”نہا، وہ جوڑا بھی۔“ اس نے البم سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دروازے کی سمت چلی۔ باہر کفری فردوس بیٹھا اور ماما کی طرف سے کچھ کہہ کر حیران مگر خوش ہوئی تھی۔

”نہا، وہ جوڑا بھی۔“ اس نے البم سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دروازے کی سمت چلی۔ باہر کفری فردوس بیٹھا اور ماما کی طرف سے کچھ کہہ کر حیران مگر خوش ہوئی تھی۔

”نہا، وہ جوڑا بھی۔“ اس نے البم سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دروازے کی سمت چلی۔ باہر کفری فردوس بیٹھا اور ماما کی طرف سے کچھ کہہ کر حیران مگر خوش ہوئی تھی۔

”نہا، وہ جوڑا بھی۔“ اس نے البم سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دروازے کی سمت چلی۔ باہر کفری فردوس بیٹھا اور ماما کی طرف سے کچھ کہہ کر حیران مگر خوش ہوئی تھی۔

”نہا، وہ جوڑا بھی۔“ اس نے البم سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دروازے کی سمت چلی۔ باہر کفری فردوس بیٹھا اور ماما کی طرف سے کچھ کہہ کر حیران مگر خوش ہوئی تھی۔

”نہا، وہ جوڑا بھی۔“ اس نے البم سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دروازے کی سمت چلی۔ باہر کفری فردوس بیٹھا اور ماما کی طرف سے کچھ کہہ کر حیران مگر خوش ہوئی تھی۔

بتائیں لیا خاطر تواضع کروں آپ لوگوں کی۔ کھانا بھی تیار ہے۔“  
 ”کھانا ہم کھا کر آئے ہیں چھینو!“ ماہین جلدی سے بولی۔ ”اور تکلفات رہنے دیں۔ امی بہت ضروری کام ہے آئی ہیں آپ کے پاس۔“

”سن جاتی ہے جائے بھی“ فردوس بیگم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا ”تم ذرا دو گھڑی بیٹھو ادھر بڑا وقت نکال کر ہمت باندھ کر آئے ہیں ورنہ تمہارے گھر کی تو میٹریوں کے خیال سے ہی میرا جی ہولتا ہے۔“

ایقان حیران نگاہوں سے بھانج کی بہت دیکھے گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔  
 ”یہ جو تمہاری ہم جولی ہے، ڈاکٹری اس کا ہاشم میاں کے ساتھ کیا چکر ہے؟“ وہ بغیر حیران کی سمجھ و دیکھ رہی تھیں۔

”رہنے بھی دو۔“ وہ برامان گئیں۔ ”تم کب اپنی سہیلی کی بات کہو گی ہم سے۔ بھلا ایسے تو نہیں کوئی کسی کا دیوانہ جاتا ہے کہ اپنی زندگی خراب کرنے پر تل جائے۔“

”بات کیا ہوئی؟“ اچانک نے سنے کے لیے ماہر کا سمت دیکھا۔

مائی کا وہ ایقان کے سر حاکم کیا ہاں اب تلب یہ۔  
”چلو اس کی شادی سے پہلے کہتا تو کوئی بات بھی تھی۔ اس کا تم سے دوستانہ تھا، کھرا اسی جاتی تھی ہمیں بھی بھلی  
تھی۔ پر اس لڑکے کے تو تیور ہی جدا تھے۔ تمہاری تو دانت کانٹے کی دوستی تھی، تم سے کیا پوشیدہ ہے۔“  
وہ نے اشاروں اور اشاروں میں اسے پھیل رہا تھا۔ ”جھاگ جھاگ کر کہنا کہ تمہارے لیے ایک گھر بنا دیتا ہوں۔“

ایقان کیا کہتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ ہر چند کہ اس کے اپنے دل کو اس خیال سے راحت سی ملی تھی۔ اس کی

54

”ارے ہمارا کیا مناسب کیا نامناسب ہم تو اس لیے آئے ہیں کہ ہمارے لیے یہ سب کچھ ہو جائے۔“ وہ کہنا کھڑا ہوا۔

”لیکن بھالی جان۔۔۔ میرا یقین کریں، شہلا کو ہاشم کے جذبوں کا بالکل قصور نہ تھیں۔ کوئی بات کہہ کر ہی چلے جائے۔“

”اب کوئی اور چچ کو اپنی پانٹ اس سے بیوں سے دبا کر پتھپکا کرنا ہی کرنا ہے۔“ ماہین نے اسے شش و پنج میں ڈال دیا۔

مردوں کے ساتھ رہیں۔ مائیں دیر نہ ٹھہریں۔ مائیں کے سوا ہر

نیل دوبارہ بھی توند بری طرح چوگی۔ یہ وقت تو کسی کی آمد کا نہ تھا۔ وہ اور پھر ہر کھڑے ہاتھ اور رافع کو دیکھ کر اس کا ہاتھ اٹھنکا۔ بظاہر اس ”واہ بھگے آج تو بھاگ جاؤ گے ہمارے۔“

”ہمارے پیچھا سامان کے کسا جا جا، ہر فنون لاؤں کر تے ہر ہا قاعدہ

”ہمارے پیچھے میان کے کیا حال ہیں فون دیون کرتے ہیں باقاعدگی

(55)



”بے قاعدگی سے!“ ایقان نے تصحیح کی۔

”کوئی آیا تھا کیا؟“ اس نے لوازمات سے بھری ہلٹیوں پر نگاہ کی۔ ایقان لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو کر رہ گیا۔

”ہاں۔“ پھر وہ بولی۔ ”یڑوس کی فیملی تھی۔“

”چلیں اچھا ہے۔ فلیٹ سسٹم بڑا کامیاب ہے اسی لیے۔“ وہ بھٹی ہوئی مونگ پھلی کھانے لگا۔

”پچھو کا خیال آگیا یا کسی کام سے آئے ہو؟“ اس نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا ”ایسے تو آنے والے نہیں ہوتے لوگ۔“

رافع ہنس دیا۔

”ٹھیک۔“ مجھیں ڈیڑ پچھو! بے حد ضروری کام سے آئے ہیں۔“ اب وہ سوسوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔

”لیکن ذرا بیٹھ کر بات کرتے ہیں آرام سے۔“

”او فوہ کسی لڑکی کا چکر ہے کیا؟“ وہ ہنسی۔

رافع کام نہ تک جاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

”فٹا شک! یو آر گرےٹ۔“ وہ تحیر سے بولا۔

ایقان مسکرا دی۔

اپنے اپنے کپ لے کر وہ تینوں ٹیرس پر پڑی کر سینیٹر پر ہنسنے لگے۔ جہاں آسمان اور نیچے روشنیوں سے سجا شہر بہت خوب صورت معلوم ہو رہا تھا۔ ایقان نے دیکھا وہ دونوں نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے اشارے کر رہے تھے۔ اس نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی اور سنجیدہ سی صورت بنا کر بیٹھی رہی۔

”اُہم!“ بالا آخر رافع کھنکھنسا رہا۔ ”ڈیڑ پچھو! ایک گنہگار سا مسئلہ درپیش ہے جس کے لیے آپ کے رخصت اور پرزور تعاون کی اشد ضرورت ہے۔“

”اچھا!“ وہ اتنا ہی بولی۔

ان دونوں نے پھر نگاہوں کا تبادلہ کیا۔

”کیویڈ کے متعلق تو آپ نے سنا ہوگا؟“ رافع پھر بولا۔

ہاشم کو ہنسی آئی۔ ایقان بھی ہنس دی۔

”بد میز!“ ہاشم نے اسے گھورا۔ ”ٹھیک طرح بات کرونا۔“

”بھئی میں تمہید باندھ رہا ہوں۔“ اس نے وضاحت کی۔

”کون شکار ہو گیا کیویڈ کے تیر کا؟“ ایقان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بہت پرانی بات ہے پچھو جانی۔“ رافع نے سرو آہ بھری۔ ”لیکن زخم ہے کہ بھرتا نہیں، بریان شاعر۔“

جس کو بھولے وہ سدا کیا روگ فراز آیا

”تم اپنی بات کر رہے ہو یا ہاشم کی؟“ ایقان نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”باپ رے باپ!“ رافع نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”اپنا تو یہ ڈپارٹمنٹ ہی نہیں ہے نا۔ عشق کا دیوتا تو منہ سے بیٹھا ہے۔ یہ آپ کا عزت از جان، جیجی۔“

ایقان نے ہاشم کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

”اور وہ کون ہے؟“

”میاں راجے! اب پھوٹو بنا کچھ۔“ رافع نے اسے گھرا۔ ”اپنی بارات میں نہیں بیٹھے ہو۔“ ہاشم نے سراٹھایا۔

اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔

”یار پچھو! میں محبت میں ہنڈرڈ پرنسٹ رازداری کا قائل ہوں لیکن اس جذبے کے ہاتھوں ایک مرتبہ بہت سخت تقسیم کا نقصان اٹھا چکا ہوں۔ اب تک دل تاوان بھرتا ہے اس لیے اس مرتبہ بہت مجبور ہو کر اس کا ہاتھ لے رہا ہوں۔“

”لو۔“ ایقان نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا ”کیا نام ہے؟“

”شہلا!“ وہ بے ساختگی سے یوں بولا تھا جیسے لبوں کے جنبش سے کنول کھلایا ہو۔ اس کی نظروں سے خوشبو پھوٹی تھی۔ چہرے پر سے جیسے کوئی ستارہ گزرا تھا۔ ایقان مبہوت رہ گئی۔

”بہت چاہتے ہو نا اسے؟“ اس نے بے ساختگی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”بہت پچھو!“ وہ بے بس ہو گیا۔

”ایسی؟“

”ٹھیک ہوں پچھو؟“ اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

”بہت ڈپارٹمنٹ!“ وہ یقین سے بولی۔

”آپ میرے ساتھ ہیں؟“

”ڈپارٹمنٹ!“ اس نے ہاشم کے ہاتھ دبائے۔ رافع ہونقوں کی مانند ان دونوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ وہ تو

ملوٹل جتنے کاسوں کا آیا تھا مگر یہاں تو لمحہ بھر میں سب معاملات طے ہو گئے تھے۔ ”پھر میں کیا کروں پچھو؟“

”لوں کو لے جاؤں؟“

”نہا یا رہا!“ وہ بات تو یوں کہتی تھی۔ ”اس نے چٹکی بجائی۔“

”یار پچھو! آپ کو بڑا دل ہے۔“ رافع کے لہجے میں ستائش تھی۔

”چل بد عوا!“ ایقان نے اسے پیچھے سے لٹکایا۔ ”تیرا تو یہ ڈپارٹمنٹ ہی نہیں۔“

# URDU PHOTO

رات بے حد خوب صورت تھی۔ نور سے سجی ہوئی محبت بھری ہواؤں سے لبریز ہاشم تادیر درپے میں کھڑا رہا۔

ایک بازو کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹکائے دو سرا ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے وہ نچانے کیا کچھ سوچے چلا جا رہا تھا۔

ٹھنڈی ہوا بار بار اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں سے اٹھکھیلیاں کرنے چلی آتی تھی۔

یہاں تک کہ دیوار پر لگے کلاک نے بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ ہاشم نے ابھی ابھی سی نظروں سے کلاک کی سمت

دیکھا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا فون تک چلا آیا۔ ”تو آج یہ دریا پار کر ہی لو!“ اس نے خود سے کہا اور ریسیور

اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

دوسری جانب بیل جا رہی تھی۔ ہاشم کو اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

”ہیلو۔“ چند لمحوں میں نیند سی بھری آواز ریسیور سے ابھری تھی۔ ”ڈاکٹر شہلا! ہیلو۔“

”ہیلو۔“ اس نے دوبارہ کہا تھا۔ ہاشم دھیرے دھیرے مسکرا دیا۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ ماہ)

”ملاح تھا اُن سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھریبچے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔  
ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائی شہید بیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ٹرنک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شبہات محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے ان خطوط سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ بلیکس بالواس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکوہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا کا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں منبہہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

ڈاکٹر شہلا کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے سے باتیں کرتا ہے۔

فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔

ربیعہ اپنی تنہائی اور لوگوں کو بدلتے رویوں سے تنگ آکر اپنی پھوپھو کے گھر لاہور جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

ربیعہ کی ملاقات عباد سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ربیعہ تنہا سفر کر رہی ہے وہ از خود اس کی پھوپھو کے گھر تنہائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔

عاشق (ایقان کا شوہر) اپنے دفتر سے نکلا تو لیزا گاڑی لیے اس کی منتظر تھی۔

دشویں قیصر

”ہیلو....“ پھر آہستگی سے بولا۔ ”میں ہاشم بات کر رہا ہوں۔“

دوسری جانب چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر اس کی ابھی ابھی آواز آئی۔

”کون ہاشم؟ سوری میں نے پہچانا نہیں۔“

ہاشم نے گہری سانس بھری۔

اجنبی جسے اجنبی سے ملے

کتنا طویل سفر تھا اور کس قدر کڑا! جس کی صورت اس کی آنکھ کی تکی پر نقش تھا۔ وہ اسے نام نہان پہچان رہی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ فون بند کر دے۔

محبت کے خوبصورت اور انمول جذبے کا اظہار وہاں ہونا چاہیے جہاں کوئی اپنی سماعتیں یہی سننے کو وقف کیے بیٹھا ہو۔ ایسے میں اظہار اور بھی انمول اور قیمتی ہو جاتا ہے۔

یہ اس کا فلسفہ محبت تھا جس پر وہ گزرے ہوئے کل تنگ قائم تھا لیکن آج اسے اپنا نظریہ بدلتا رہا تھا۔ بحالت مجبوری یہ مجبوری حالات کی سختی کی عطا کر رہی تھی۔ آج وہ اپنا قیمتی انمول سیپ میں بحفاظت رکھے ہوئے موتی جیسا اظہار ان سماعتوں کی نذر کرنے جا رہا تھا جنہوں نے اس کے نام کو اجنبی جانا تھا۔

”آپ۔۔۔ آپ ہاشم فاروق حسن تو نہیں؟“ یکایک نیند سے جاگی ہوئی شہلا کی کسی سوئی ہوئی جس نے کام کیا تھا۔

”شکر ہے۔“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ ”ورنہ میرا دل تو بڑی شدتوں سے آپ کی بے مہری کا ٹکڑہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس طرح کہ زبان میں قوت گویائی تک نہ رہی تھی“ شہلا دھیرے سے ہنس دی۔

”سوری ہاشم۔ ویری سوری! دراصل میں کچھ دیر پہلے نیند کی گولی لے کر سوئی تھی۔ میرے حواس پوری طرح

کام نہیں کر رہے تھے۔ لیکن دیکھیں دیر سے ہی سہی میں نے پہچان لیا ہے۔ خیر تو ہے نا گھر میں؟“  
”آپ سے رُکنا تو ضروری ہے؟“ ہاشم نے اس کے سوال کے جواب میں سوال داغا۔ وہ بھی نہایت حیرانی کے ساتھ۔

”کبھی کبھار۔۔۔“ وہ مختصر ”بولی۔“ ”ایقان تو ٹھیک ہے نا؟“

”سب ٹھیک ہیں آپ بے فکر رہیں۔“ وہ ہنس دیا۔ ”میں نے اس وقت آپ کو بطور ڈاکٹر زحمت نہیں دی ہے۔“

”او۔۔۔“ وہ بھی ہنس دی۔ ”کیا کروں۔۔۔ بارہ بجے کے بعد تو جو بھی فون آئے وہ میں بطور ڈاکٹر ہی ریسپونڈ کرتی ہوں۔ ذہن میں اور کوئی بات ہی نہیں آتی۔ کیسے! کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

ہاشم چند لمحوں کے لیے خاموش ہو رہا کتنے جملے ترتیب دیے تھے درتپے میں کھڑے ہو کر چاند کو تسکتے ہوئے اس کی آواز نے برسات کی صورت خیالوں کا سب غبار دھو ڈالا تھا۔ وہ خالی الذہنی سے ریسپونڈ تھا۔

”ہاشم۔۔۔ میں کنفیوژن کا شکار ہو رہی ہوں۔ آخر آپ کچھ کہتے کیوں نہیں؟“ وہ بالآخر الجھ سی گئی۔

”شہلا! میں۔۔۔ میں آپ کو پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ بلکہ کر رہا ہوں۔ آپ میری زندگی میں شامل ہونا پسند کرتی ہیں؟“

”ہاں۔۔۔“ وہ اپنے دل کی دھڑکنیں گھنٹے میں یوں مصروف ہو گیا جیسے نہ اس نے کسی کو فون کیا اور نہ ہی کچھ کہا۔

دوسری جانب اندھیرے میں کھڑی شہلا کے حواس اچانک پوری طرح جاگے تھے۔ اس کے تھکے تھکے گھول کی شہلا نے اس کے بوجھ سے لدے ہوئے ذہن کو اس کی کسی ہوئی بات سے جھجھوڑ کر ہکا بکا کر چھوڑا تھا۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

”میرے دل میں۔۔۔“ اس نے اپنے جھنجھکیے ہوئے دل سے اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔

تھی۔ دونوں ہم جماعت بھی تھیں۔ وہ اکثر آیا کرتی تھی لیکن آج اس کی زلفوں کی مہک اور ہاتھوں کی نرمی نے اسے ایک نئے بے حد عجیب سے احساس سے دوچار کیا تھا۔ اس نے کبھی اس طرح محسوس نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی کسی چہرے کو اتنے قریب سے نہ دیکھا تھا۔ دل نے کبھی پہلے اس طرح کی فرمائش نہ کی تھی۔ وہ باد صبا کی نرمی سے ایک منہ بند کلی کو کھول گئی تھی۔ اس کے اندر خوشبو بکھر رہی تھی۔

اس نے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا بٹن غائب تھا۔ اس کے لبوں پر خوشی مسکراہٹ بن کر چمکی۔ بٹن ٹوٹ جانے سے اسے بے حد خوشی ہوئی۔ اس حقیقت کا اور اک اس پر جلد ہی ہو گیا تھا کہ وہ اپنی سیاہ لٹوں میں اس کا بٹن نہیں بلکہ دل باندھ کر لے گئی ہے۔ کسی گم گشتہ ستارے کی مانند وہ اب تک اپنی سیاہیوں میں گہیں پوشیدہ تھا۔

سنائے گم شدہ چیزیں جہاں کھولی جاتی ہیں وہیں پر مل بھی جاتی ہیں۔ اس نے اس رات پہلی مرتبہ اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔ ایک بے حد معمولی سا واقعہ اپنی ہی باز گشت بن کر اس کی ہستی پر چھا گیا تھا۔

اپنی بدولت کا بالکل نئے فیشن کے مطابق سلا ہوا لباس ماں کو دکھانے کی غیبت میں گہری ایقان اس کی حالت کا احاطہ کر پائی نہ ہی اس کے بٹن میں اب بھی زلفوں کے ٹوٹنے کا افسوس کرتی شہلا ان لطیف احساسات کو چھو سکی۔

نجات کے لیے وہ اکیلا ہی ان تمناؤں سے ننھے ننھے نازک نازک پودوں کی طرح دل کے گلستان میں گمداشت کرتا رہا تھا۔

وہ ایقان کے پاس کیپٹن اسٹڈی کے لیے آتی تو وہ بھی چپکے سے اپنی کتابیں لے کر وہاں جا بیٹھتا۔ "اچھا ہوا ہوا آگے" ایقان کھل اٹھتی۔ "پڑھ پڑھ کر سر دکھنے لگا ہے۔ ذرا منوں حلوائی کے قیمہ بھرے لاؤ۔" "جائے جاؤ ہوں۔"

تھپا اور اس کی چاکری کی پٹی جذبوں بھری نگاہ لمحہ بھر کے لیے اس پر ڈالتا۔ وہ تیزی سے اپنی نوٹ بک پر قلم چلائی رہی۔ "کا" کے برے کا شوق تھا۔ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن حاصل کرنا اس کا دیرینہ خواب تھا جس کے حصول کے لیے وہ رات بھر سوچا کرتی تھی۔ ایقان کی طرح اسے تھوڑی تھوڑی دیر میں حلوائی کا ذائقہ چھوٹا ہوتا تھا۔ وہ ہی ہر گز سے لڑکتے کسی ریڑھی والے کی آواز اس کے ار تکاڑ میں مل داس لٹوئی کی جگہ ایقان کی نگاہ کتاب پر اور کان چار دیواری کے اندر باہر ہوتے واقعات پر غور کرتے رہتے۔

"مائے شہلا! گول گھے والا آگیا۔" وہ خوشی سے کھل اٹھتی۔ "تم خود گول گپا بن جاؤ گی ایقان کی بچی۔" وہ اسے ڈانٹتی۔ "ڈسٹرب مت کرو خواجواہ!" "میں تو چلی۔" وہ کتابیں پھلانگتی باہر نکل جاتی۔

شہلا بے بسی سے اس کی پشت پر جھولتی چوٹیاں دیکھتی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کتاب پر جھک جاتی۔ ہاشم چپکے سے اس کے گال کو چھوئی لٹ کو دھتارتا۔

محبت کی اس اچھوتی اور مقدس مئے کو دل کے آگینے میں اس نے حفاظت سے یوں رکھا کہ قطرہ بھی چھلکنے نہ پائے نہ نگاہوں سے خار چھلکنے نہ کوئی جملہ لڑکھائے۔ نشہ بس لبوں کر رگوں میں دوڑتا رہے۔ دھڑکنیں بس ایک ہی نام الا تیا رہیں۔

"شہلا۔ شہلا۔ شہلا۔"

"دوسری بات یہ کہ پسندیدگی اور محبت کا یہ جذبہ آج کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ ایک تناور درخت کی مانند اپنی لاتعداد جڑیں میرے دل کی گہرائیوں تک میں پیوست کیے ہوئے ہے۔ خون دل نے برسوں اس کو سینچا ہے۔ تمنا نے سالوں نگہداشت کی ہے۔ دھڑکنوں نے مدتوں حفاظت کی ہے۔ اس طرح کہ سوائے تمہارے تصور کے دل میں اور کچھ اگر ہے تو وہ تمہیں پالنے کی خواہش ہے۔"

وہ خواب و خیال میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ وہ شہلا سے کبھی یہ سب کچھ کہہ پائے گا۔ جذبوں کا لاوا ذرا سی راہ پا کر یوں بہہ نکلے گا۔

شہلا میں مزید تاب نہ تھی۔ اس نے فون بند کر دیا۔ اس کا جسم سینے سینے ہو رہا تھا۔ حلق بالکل خشک تھا اور سانس بے قابو ہو اندھیرے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی رہی۔ "مذتوں۔۔۔ برسوں۔۔۔ سالوں۔۔۔ اس کی آنکھیں حیرانی سے کھلی ہوئی تھیں۔ "مجھے کبھی احساس تک نہ ہوا؟ یہ کب کی بات ہے؟ ایسا کب ہوا؟ کیونکر ہوا؟"

"آؤ۔۔۔ آؤنا میں تمہیں اماں سے ملواؤں!" ایقان اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تقریباً "کھینچے ہوئے لیے آ رہی تھی۔ یہ ہائی ہیل سینڈل کی وجہ سے بہت تیز نہیں چل پارہی تھی لیکن لاٹلی ایقان کی بات کی پروا نہ تھی۔ "میں گرجاؤں گی ایقان۔" وہ روپائی ہوئی۔

دردانہ کھول کر باہر آتا ہاشم ان دونوں کو نہایت تیزی سے اپنی جانب آتا دیکھ کر پھرتی سے پرے ہوا۔ ایقان اس کے پاس سے ہوا کے جھونکے کی مانند گزر گئی جبکہ اپنی پینل ہیل پر ڈولتی ہوئی شہلا کا سر اس کی شرٹ سے مس ہوتا ہوتا رہ گیا۔ وہ بھی آگے بڑھ گئی تھی لیکن اگلے ہی لمحے ایک دلہنہ جین کے ساتھ رک گئی۔ ایقان کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ نکل گیا۔

"پائے میرے بال۔۔۔ اف اللہ!" ہاشم کی سفید شرٹ کے بٹن نے ان کھلی گھنیری سیاہ زلفوں کے ساتھ یکایک ہی شرارت کر ڈالی تھی۔ دراز لٹ اس کے بٹن میں الجھی ہوئی تھی۔

"اؤف۔۔۔ ہاشم کے سچے۔۔۔ چھوٹا اس کے بال۔" ایقان غصے میں برسی چلی وہاں سے۔ "مہم۔۔۔ میں نے نہیں۔ اس بٹن نے۔" اس کے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے۔

سیاہ زلفوں سے سجا ایک دلکش چہرہ اس کے اتنے قریب تھا کہ اس کی سانس جہاں تھی وہیں رک گئی۔ شہلا اس کی حالت سے بے خبر اس کے بٹن سے اپنی لٹ آزاد کروانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس کے نرم ہاتھوں کی جنبش اسے اپنے سینے پر محسوس ہو رہی تھی۔

"تم بھی تو جو گنوں کی طرح بکھرائے رکھتی ہو یہ زلفیں۔" ایقان کو پتہ نہیں دیکھ کر مزید تاؤ آیا۔ "باندھ نہیں سکتیں۔ میری اماں ہوں تو اتنی کس کر جھیاں بنادیں کہ پورا ہفتہ نہ کھلے۔"

ان دونوں کے پاس کھڑی وہ تقریر میں مصروف تھی۔ ہاشم کا بٹن ٹوٹ گیا لیکن اس کے بالوں سے نہ نکلا۔ زلفوں کو رہائی بہر حال مل گئی۔ ایقان پھر اسے اسی طرح کھینچتے ہوئے آگے لے گئی۔

ہاشم پتھر کے بت کی مانند وہیں کھڑا رہ گیا۔ لمحوں کی فسوں خیزی اپنا کام کر چکی تھی۔ وہ ایقان کی بچپن کی ہم جولی

رافع اس کا بار غار تھا۔ دونوں میں کوئی بات چھپی نہ تھی۔ لیکن ہاشم نے اپنے جذبات کی ہوا سے بھی نہ لگنے دی تھی۔ یوں بھی وہ دونوں اور طرح کے لڑکے تھے۔ ان کے درمیان فزکس اور کیمسٹری کے مختلف ٹاپکس زیر بحث رہتے یا قدیم شعراء کی غزلیں۔ لڑکیوں کی باتوں سے انہیں سروکار نہ تھا۔ عشق عاشقی کے قصے وہ گفتگو میں نہ لاتے تھے۔

رافع بے حد مختلف تھا۔ اسے آنچلوں کے دھنک رنگ متوجہ کرتے تھے نہ ہی ہنسی کی جھنکار پر وہ کبھی پلٹ کر دیکھتا تھا۔ لڑکیوں کے معاملے میں وہ نرا کورا اور قدرے بے حس تھا۔ ایسے میں اپنے جی کی بات اس سے کہنا ہاشم کے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا اور نہ شاید اپنے آپ سے گھبرا کر وہ کبھی اس سے کچھ کہہ سکتا تھا۔

لیکن بہر حال خوشبو کہیں نہ کہیں اپنا سراغ چھوڑ ہی جاتی ہے۔ رافع نے ایک دن اس کی چوری پکڑ لی تھی۔ ایقان اور شہلا کا رزلٹ آیا تھا۔ دونوں نے بہت اچھے نمبروں سے امتحان پاس کیا تھا اور اب وہ دونوں مل کر سب سہیلیوں کو دعوت دے رہی تھیں۔ بہت دن تک دونوں کے مابین یہ جھگڑا چلتا رہا کہ دعوت ایقان کے گھر ہوگی یا شہلا کے گھر۔ پھر حسب معمول ایقان جیت گئی تھی۔ شہلا بحث میں اس سے ہمیشہ ہار جاتی تھی۔

دعوت کا دن آگیا۔ ان دونوں نے کچھ چیزیں گھر پر تیار کیں اور کچھ بازار سے منگوائیں۔ رنگ برنگے آنچل لان میں لہرائے گئے۔ تقریباً چھ گھنٹے ہر طرف بڑبڑ رہی تھی۔ ہاشم اپنے گھر سے بیٹھا ایک پرانا ریڈیو ٹھیکہ کر رہا تھا جب چیم کرتی ایقان اس کے سر پر آکھڑی ہوئی۔

ہاشم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسے ہنسی آگئی۔ وہ بچی چھوڑی گئی تھی گویا کسی شادی میں جا رہی ہو۔ دھماکی رنگ کا جھڑا گھونٹے سے سجا ہوا تھا۔ وہ بچے میں ابجا گھونٹے ہوئے تھے۔ گولڈن بالیاں پہنے اور بہت سا میک اپ کیے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ہاشم نے ہنسنے پر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے ہاشم کا کان پکڑ لیا۔

## URDU PHOTO

”کیوں بھتیجے؟ میں تو توں ہو رہی ہوں۔“ اسے مزید ہنسی آئی۔  
 ”میں نہیں صرف لگ رہی ہوں۔“ اسے مزید ہنسی آئی۔  
 ”اچھا یہ بات ہے؟ بھائی جان سے کہتی ہوں۔“ وہ خطرناک طور پر لے مڑی تھی۔  
 ”ارے پھپھو! میری کیوٹ سی پھپھو! ایسا غضب نہ کریں۔“ وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ”جو چاہیں سزا سادیں۔ کہیں تو منوں حلوائی کی دکان سے کوئی موسٹ فیورٹ آئٹم لاؤں۔“ ایقان ہنس دی۔  
 ”بد تمیز کہیں کے“ آج منوں حلوائی کے سارے موسٹ فیورٹ آئٹم نیچے ٹیبل پر موجود ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ایک عدد فوٹو گرافر درکار ہے جو ہم سہیلیوں کے اچھے اچھے فوٹو بنا دے۔  
 ”اوہ نو۔ پلیز پھپھو! یہ اپنے بس کا کام نہیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔  
 لیکن وہ ایقان ہی کیا جو کسی کی معذرت کو خاطر میں لاتی۔ اسے کھیچتے ہوئے حسیں کے جھر مٹ میں لے گئی جہاں لڑکیوں کو ہنسنے ہنسنے اور صرف ہنسنے کا کام تھا۔

شہلا نے آج پھر اپنی گھٹاؤں کو کسی کے دل پر برسنے کے لیے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ میرون، بلیک اور وہائٹ کنٹراسٹ کے امیر اینڈ ڈسٹ میں وہ بے تحاشا لوہے رہی تھی۔ میرون آئی شیڈ سے جی سیاہ آنکھیں چند ایک بار نہایت بے نیازی سے اس کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں اور ایک شناساسی چمک کے سوا ان میں کچھ نہ تھا۔



وہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔ میڈیکل میں اس کا داخلہ یقینی ہو چلا تھا۔ ہاشم نے تصویریں مکمل کر کے کیمرو ایقان کے حوالے کیا اور دل کے فریم میں اس کی مسکراتی تصویر سجا کر چلا آیا۔ چند دن بعد رافع اس کے پاس پہنچا۔  
 ”تم پچھو کی دوست میں انٹرنل ہو؟“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔  
 ہاشم کی شہ گم ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر جلدی سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔  
 ”تمہیں کس نے بتایا؟“ اس نے حواس باختگی سے پوچھا۔  
 رافع لب بلیچ کر مسکرا دیا۔

”تمہارے بھوت بنے۔ رات کو میرے پاس آیا تھا۔ شہلا شہلا کرتا ہوا۔“  
 ”بے چپ کر۔“ ہاشم نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کوئی سن لے گا۔“  
 ”اور جو کوئی یہ سب دیکھ لے؟“ اس نے ایک لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”وہ کیا کہے گا؟“

”تمہاری خاموش محبت کا منہ لولتا بلکہ حلق پھاڑ کر چیختا شہوت۔“

ہاشم نے لفافہ جھینٹا اور میز پر الٹ دیا۔ پوری میز پر شہلا کی تصویریں بکھر گئی تھیں۔ وہ سب ہی شہلا کی تصویریں تھیں۔  
 ”پچھو نے مجھے بعد اصرار بھیجا تھا رول دھلوانے کے لیے وہ دعوت کی تصاویر دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے دعوت میں سوائے شہلا کے کوئی شریک نہیں ہوگا اب تم کہو تو میں یہ تصاویر پچھو کو دے دوں؟“

ہاشم سر تھامے بیٹھا تھا۔ اپنی اس بے اختیار حرکت سے وہ خود لا علم تھا۔ اس روز وہ شہلا کو سنا سنا کر دیکھ کر بے خود ضرور ہوا تھا لیکن اتنا بے خود ہو گیا تھا کہ اسے خبر نہ تھی۔ اس نے ادھر ادھر اس کی تصاویر بنا ڈالی تھیں۔ اپنی باتوں میں مگن، قہقہے لگاتی ہلرڈ شیرازوں کو اس حادثے کی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ البتہ چند ایک گروپ فوٹو جھڑپتے جھڑپتے انہوں نے خاص طور پر ساتھ کھڑے ہو کر بنوائے تھے۔

”کیا کہتے ہو؟“ رافع نے اسے گھورا۔

”اب کہنے کو کیا بچا ہے؟“ وہ شرمساری سے بولا۔

”یہ سوچو جو تولوں سے کیسے بچو گے؟“

”تم سوچو۔ دوست ایسے وقت میں ہی کام آتے ہیں۔“

”یہ دوستی اس وقت کہاں تھی جب پیٹ میں واٹر ہی ہال رہے تھے؟“ رافع نے سر جھٹکا۔

”بدستی ہے تو ہے ورنہ تم یہ تصاویر مجھے نہیں پچھو کو دیتے۔“ ہاشم ہنسا۔

رافع نے اسے غصے سے گھورا۔

”شرم تو نام کو نہیں ہے۔“

”شرم ہی تو ہے۔“ ہاشم منمنایا۔

”اب یہ تصویریں رکھو گے یا پھاڑ ڈالو؟“ اس نے اکتا کر پوچھا۔

اس بار ہاشم نے اسے غصے سے گھورا تھا۔

ایقان کو بالآخر اطلاع دی گئی کہ رول خراب تھا۔ چند ایک گروپ فوٹوز ٹھیک آئے ہیں باقی سب تصاویر ضائع ہو گئی ہیں۔

ایقان کو مبینوں اس حادثے کا غم رہا تھا۔

\*\*\*

شہلا کا داخلہ میڈیکل میں ہو گیا تھا۔ ایقان کو سائنس کے خشک سبجیکٹس میں دل چسپی نہ تھی۔ اس نے آرٹس کے مضامین منتخب کر لیے۔ یوں ان دنوں کی راہیں قدرے جدا ہو گئیں۔ اس کے باوجود وہ جب بھی ملتیں اتنے ہی والہانہ پن سے ملا کرتیں۔ ایک دوسرے سے اپنی باتیں شیئر کرتے ہوئے۔ آدھی آدھی رات تک سردی گرمی سے بے نیاز لان میں چل قدمی کرتیں، سرگوشیوں میں باتیں کیے جاتیں۔ ان دنوں ان دنوں کے انداز بے حد رازدارانہ ہو گئے تھے۔ ان کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ شہلا کے گھر سے بار بار فون آتے تب وہ گھر جانے پر رضامند ہوتی تھی یا ایقان اگر اس کے گھر گئی ہوتی تو اسے واپس لانا دشوار ہو جاتا تھا۔ ہاشم سے اکثر بستر اس کا سامنا ہوتا تھا۔ اس کا حسن ان دنوں دو آتشہ ہو گیا تھا۔ وہ اسے اتنی اچھی اتنی خوبصورت لگتی تھی کہ وہ گھبرا کر سر جھٹکا لیا کرتا۔

”تم کب تک یونہی بے وقوفوں جیسی محبت کرتے رہو گے؟“ رافع اسے سوچ میں گم دیکھ کر جڑ جاتا۔

ایقان مطلب؟ میں نے کیا بے وقوفی کر دی؟“

”تم اس سے کچھ کیوں نہیں؟“

”کیا؟“ وہ حیران ہوتا۔

”وہی یاد جو فلم میں ایرو، ہیروئن سے پہلی یا دوسری ملاقات میں ہی کہہ ڈالتا ہے؟“ رافع ہیزاری سے کہتا۔

”آئی لوبو۔“

”شہلا؟“ وہ بے ہوش ہوتا۔ ”اپنے آپ کو اس کی نظروں میں ذیلن کروں؟“

”پھر اس کو شہلا کا انجام کیا ہو؟“ رافع کے سوال پر ہاشم سوچ میں پڑ جاتا۔

ایک دن ایک بے ڈرامائی انداز میں اس عشق پوشیدہ کا انجام سامنے آیا تھا۔ شہلا نے اپنے کلاس فیلو سے لوبو کی شہادت لی تھی۔

میڈیکل کے میسرے بھالی میں ہی ایقان نے شہلا کی شہادت کی کہلی تھی۔ ”حیات دلا“ میں جس نے خبر سنی

ہاشم کی محسوسات بے تدرج چاہت کے لیے یہ جبر ایک شدید شاک جیسی تھی۔ اس کے وجود میں زلزلہ آیا تھا۔ اور

سب کچھ جیسے لمبا میٹ ہو گیا۔ شدید ڈپریشن کے باعث اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کر دینا پڑا۔ یوں ”حیات دلا“ کے

بچوں میں جگے جگے یہ خبر پھیلی تھی کہ ہاشم ایقان کی سہیلی کو بے حد وحساب چاہتا تھا۔

ایقان چپکے چپکے پھرا کرتی۔ اپنے گھر والوں کی نگاہوں سے بچتی پھرتی تھی۔ پھر عاشر کا رشتہ آیا اور وہ دنوں میں بیاہ کر لیا

رہیں بدحار لگی۔

کچھ دنوں میں سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔ وقت کی دھیرے دھیرے گرتی پھوار ہریاد کو دھندلا کرتی گئی۔ لوگ

بھول بھال گئے۔ شہلا کی لومیرج ایقان کا قصہ، ہاشم کا ڈپریشن، قصہ پارینہ بن گئے۔ ہاشم ایک بے حد سنجیدہ طبع

نوجوان کے روپ میں اپنی زندگی کو از سر نو ترتیب دینے میں مصروف ہو گیا۔ تب سال بھر بعد خبر ملی تھی کہ شہلا

طلاق لے کر اپنے والدین کے پاس لوٹ آئی ہے۔ وہ ماں بننے والی تھی اور اس نے پڑھائی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے

جوڑ لیا تھا۔

\*\*\*

PHOTO

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ ٹہرس پر کھڑی خود سے اور پانچل ہواؤں سے الجھ رہی تھی۔ فضا میں بے حد خنکی تھی۔ اسے سردی لگنے لگی لیکن اس نے توجہ نہ دی۔ یونہی دونوں بازو اپنے گرد لپیٹے ہوئے دونوں کے اور اتر پلٹنے کی کوشش کرتی رہی۔

ایک خاموش طبع سنجیدہ سالزکا۔ جسے اس نے کبھی اس بات سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی کہ وہ اسی گھر میں رہتا ہے جس میں اس کی عزیز ترین سہیلی رہتی ہے۔ بس ایک سوہوم سا واقعہ اس کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ اس نے سفید رنگ کا بے حد اسٹائلش سوٹ سلوایا تھا۔ اس کے متناسب جسم پر وہ لباس بچ گیا تھا۔ کمر تک لائے سیاہ بال کھولے وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی جب ایتقان چلی آئی۔

شہلا نے اسے شہر کے مشہور ٹیلر کا نام بتایا۔  
”دیکھا میں بھی کہتی ہوں یہ تو سارا سلائی کا کمال ہے۔ افسوس میری اماں بھی نا“ محلے کی درزن کی جان نہیں چھوڑتیں۔ مجھ سے کہتی ہیں تم خود سلائی سیکھو اور اپنے کپڑے سیاہ کر دو۔ پچھلی صدی کی باتیں کہیں رہیں۔ آؤنا شہلا! میں اماں کو تمہارے کپڑے دکھاؤں گی۔ ان سے پوچھوں بھلا ان کی درزن سی سکتی ہے۔ شہلا ڈر لیں۔  
”لیکن ایتقان میں۔“ اس کی بات لبوں میں ہی رہ گئی۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے اپنی دھن میں بولتی اسے ”حیات وہاں تک کہ“ شہلا کو بال لپیٹ کر جوڑا تک نہ بنانے دیا تھا۔ تب وہاں کھڑے ہاشم کی شریٹ کے ٹن میں اس نے پال پھنس گئے تھے۔  
اف! اسے کس قدر شرمندگی ہوئی تھی۔ بال کھینچنے کے دوران اس کی ٹیپس کا ٹن بھی ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن اس نے بے چارے نے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ وہ بے حد سیدھا سا اور سادہ جوان تھا۔ خود میں مگن رہنے والا، سچی نظروں کے ساتھ مخاطب کرنے والا۔ بعد میں جب بھی اس کا سامنا ہوتا، شہلا کو وہ یاد آتا۔ اس کے لبوں پر ہنسنا ہی مسکن آجاتی لیکن وہ دنیا ہی سنجیدہ رہتا تھا۔

اور اب اتنے سال بعد وہ کہہ رہا تھا کہ اسے شہلا سے محبت تھی! بھلا کیسی محبت تھی یہ؟ لوگ اس طرح بھی کسی کو چاہ لیتے ہیں کہ بوند بھری نہ برے؟ محبت تو وہ ہے جو ٹوٹ کر برے۔ جل تھل کر ڈالے۔ تن من بھیگ جائے۔ سانس لینے کی سکت نہ رہے۔

وہ محبت جو ابراہیم جیلانی نے اس سے کی۔ وہ محبت جو شہلا نے ابراہیم جیلانی سے کی۔  
کالج میں پہلے دن پہلی نگاہ میں اس کا سیر ہونے والا ابراہیم جیلانی بھی ایسا نہ تھا کہ نظر انداز کیا جاتا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ دونوں پورے کالج کی گفتگو کا محور بن گئے تھے۔ پروفیسرز تک ان کی طوفانی محبت سے واقف تھے۔ وہ دونوں ہر جگہ ہر بل ساتھ ہوتے تھے۔

ابراہیم کا تعلق اندرون ملک سے تھا۔ اس کے والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ گاؤں میں ان کی شاندار حویلی تھی جہاں ان کا پورا خاندان آباد تھا۔ ابراہیم پڑھائی کی غرض سے شہر میں رہتا تھا۔ لیکن اس کے والد اسے شہر بھیج کر اس سے بے خبر نہ تھے۔ بہت جلد ان کے عشق کی خوشبو شہر بھر میں پھیل گئی تھی۔

”یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ ہم خاندان والوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟“ ابراہیم کی ماں نے سخت احتجاج کیا تھا۔  
”شہلا بیٹی! اپنے رستے اس سے علیحدہ کر لو یہ ایک بوڑھے باپ کی عاجزانہ استدعا ہے۔“ حسن علی صاحب نے تھکے تھکے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

ابن دونوں نے بنا سوچے سمجھے کورٹ میرج کر لی تھی۔ محبت کا زہر نس نس میں پھیل چکا تھا۔ اسے رگوں سے

PHOTO

نکال کر پھینک دینے کا بارادونوں میں نہ تھا۔

ابراہیم اسے اپنے فلیٹ پر لے آیا تھا۔ وہ دونوں ساتھ کالج جایا کرتے، ساتھ لوٹتے، دونوں جانب کے خاندان والے حالت سکتے کے حالت میں تھے اور وہ ”سکتے“ کی اس حالت کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔  
شہلا کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

اس کا چاہنے والا اسے ہر لمحہ سرائے والا اب دن رات اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کی جھولتی لٹ کو ہٹا کر اس کے کان میں سرگوشیاں کرتا، وہ اپنی گردن پر اس کے سانسوں کی مہک محسوس کرتی تھی۔ ساری دنیا اس کی ہتھیلی پر سمٹ آئی تھی۔

تب ایک دن ابراہیم کے والد انہیں لینے آ گئے۔ انہیں اپنی ضد مہنگی پڑی تھی اب وہ سستا سودا کرنا چاہتے تھے۔ وہ شہلا کو اپنی بہو کے روپ میں قبول کرنے پر آمادہ تھے۔

ابراہیم نے حد خوش تھا۔ اپنے باپ کے بغیر وہ کچھ بھی نہ تھا اور باپ کے ساتھ بہت کچھ۔  
وہ جیلانی ہاؤس چلی آئی۔ دھن کی طرح سج سنور کر۔ سرخ جوڑا پہن کر، ڈھیر سارا زیور پہن کر۔ ”جیلانی ہاؤس“ میں اس کی ہاتھ لیا گیا۔

”ری سہلی! میں۔“ اسے ایک معمر عورت سے اسے ملواتے ہوئے بتایا گیا۔  
شہلا نے بولی نظروں کے ساتھ سلام کیا۔ انہوں نے اسے گلے سے لگا کر نوٹوں سے بھرا تھال اس پر سے واز کر ملازمہ کو بکرا دیا۔

”اس سے آؤ۔“ ٹائیک اور عورت اس کے مقابل تھی۔  
”خاتون بی بی! میں۔“ ابراہیم پہلی بیوی۔  
”کے سر پر ہین ٹوٹا۔“ اسے سامعیتوں پر دھوکہ ہوا۔

”اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔“ عورت کو دیکھا جس کے چہرے پر دیرانی تھی۔  
”کوئی؟“ اس نے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”نکون ہیں یہ؟“

”تمہاری سوت۔“ ابراہیم کی عجمانی بیوی۔ ”انہوں نے پھر اطمینان سے بتایا تھا۔“ اسے اپنی بڑی بہن کی طرح شہلا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا گیا تھا۔ اسے پھر کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کیا رسمیں ہوئیں، کس نے کیا منہ دکھائی دی، اسے علم نہ تھا۔ اسے صرف آنے والی رات کا انتظار تھا۔

ابراہیم جیلانی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ اس نے بری طرح سے جھٹک دیے تھے۔ وہ چند لمحوں کے لیے حیران ہوا پھر سکر اڑا۔  
”یار! پہلے بندے کو کلینر نس کا موقع تو دو۔“

”اگر بڑا دھوکا“ اتنی چیٹنگ! اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں، لہجہ بھر گیا۔  
”کوئی دھوکا نہیں ہوا۔ کوئی چیٹنگ نہیں ہوئی۔ تم میری بات سن لو۔“ وہ مصالحانہ انداز میں بولا۔  
”مجھے کچھ نہیں سنا۔ تم جاؤ یہاں سے!“ وہ چیختی تھی۔

”آہستہ آہستہ!“ تنبیہ ہوا۔ ”یہاں یہ برتاؤ نہیں چلے گا۔ تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نہ جائے۔“  
شہلا نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”میں خود اس کمرے سے چلی جاتی ہوں۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”تم جسے چاہو بلاؤ!“

”اوفوہ!“ اس نے سر تھام لیا۔ ”شہلا! اڑائی تو انڈر اسٹینڈ! میری اس سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے پورے سات سال بڑی ہے۔ میرا نکاح چودہ برس کی عمر میں کر دیا گیا تھا جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور مجھے شادی بیاہ رسوں و رواجوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ مجھے بس اتنا پتا تھا کہ میری بہن کی شادی اس کے بڑے بھائی سے ہو رہی ہے اس لیے اسے ہمارے گھر آنا ہے۔ تم خود سوچو چودہ برس کے لایا بالی لڑکے کو بھلا ان باتوں سے کہ سروکار؟ مجھ سے مولوی نے ہاں کہلوا دیا، میں نے کہہ دیا۔ نکاح نامہ میرے آگے کر دیا گیا۔ میں نے اپنا نام لکھ دیا۔ کیا تم اس کو دھوکا فریب اور چپشننگ کہو گی؟“

”لیکن تم یہ سب کچھ مجھے بتا بھی سکتے تھے۔“ وہ آنسوؤں کا گولہ نکلے ہوئے بولی۔

”بیانا تو رہا ہوں۔“

شہلا نے شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ تو وہ ہنس دیا۔

”مجھے ڈر تھا شہلا! میں تمہیں کھونہ دوں۔ اس معمولی سی بات سے میرا اتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی! تمہیں اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اس بات کو کسی اور موقع تک بے پرواہی سے ڈال دیا جائے۔ بہر حال آج وہ موقع آ گیا۔“

”میں ابرار! تمہیں بتانا چاہیے تھا۔“ اس کا دکھ بھرا ہوا تھا۔

”ہاں میری جان! مجھ سے غلطی ہوئی سن میں نے تمہارا دل دکھایا۔ لیکن پھر شہلا! ماں باپ کے جاہلانہ فیصلوں کی سزا مجھے نہ دو۔ تم اس سے ملی ہو نا کیا وہ ایسی ہے کہ تم اس سے کوئی خطرہ محسوس کرو؟“

شہلا خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔

”تم نے اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات۔ میرا مطلب ہے۔“

”ہاں! ہمارے دوست ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

شہلا نے رخ موڑ لیا تھا۔

”فلاسٹ بچھاؤ۔ میں سونا چاہتی ہوں۔“

”شہلا!“ اس نے اسے چھوا۔

”ابرا! پلیز!“ اس کے اندر آنسو گر رہے تھے۔

وہ آنکھوں سے پیچھے ہٹ گیا۔

PHOTO

\*\*\*

”مجھ تو بہر حال اسے کرنا ہی تھا اور یہ بات ابرار جیلانی بھی بخوبی جانتا تھا۔ وہ اسے لانے سے پہلے اس کے پر کاٹ چکا تھا۔“

ابرار کی یقین دہانی ایک طرف لیکن ”جیلانی ہاؤس“ میں مختار جیلانی کا حکم چلتا تھا۔ شہلا اور خاتون بی بی کے مابین ابرار کی راتیں اور دن تقسیم کر دیے گئے تھے وہ ایک رات اور ایک دن شہلا کے ساتھ گزارتا اور اگلی رات اور اگلے دن اپنی پہلی اور خاندانی بیوی کے ہمراہ۔ شہلا میں لب کشائی کی تاب نہ تھی۔ وہ محض آنسو بہانے پر قادر تھی۔

”دیکھو جانو! چند دنوں کی بات ہے۔“ وہ اسے بھلاتا۔ ”ہمیں شہر لوٹنا ہے۔ اپنی پڑھائی مکمل کرنا ہے وہاں ہمارے بیچ صرف اور صرف ہماری محبت ہوگی سب دن سب راتیں ہماری ہوں گی۔“

شہلا روئے دل کو اس کی دلیلوں سے منانے کی کوشش کرتی۔ وہ مانتا نہ مانتا مگر شہلا کو ماننا پڑتا تھا کہ آخر چھٹیوں کے وہ بے کیف و بے مزہ دن تمام ہوئے۔ کالج کھلنے کی تاریخ قریب آگئی شہلا کے چہرے پر بہت دن کے بعد رونق لوٹ آئی تھی۔

وہ اپنا سامان باندھنے میں مصروف تھی جب حاجیانی بیگم یعنی اس کی ساس کمرے میں آئیں۔

”یہ کیا کرتی ہو؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”جی۔“ وہ سیدھی ہوئی۔ ”اماں! کالج کھل گئے ہیں نا۔ اب شہر جانا ہے۔ میں اسی کی تیاری کر رہی ہوں۔“

”ہوں!“ انہوں نے ایک لمبی ”ہوں“ کی اور کمرے سے چلی گئیں۔ بیکنگ مکمل ہو گئی تو ابرار اندر آیا تھا۔

”شہلا!“ اس کا انداز تھکا تھکا سا تھا۔

”جی!“

”اپنا سامان کھول دو۔ شہر صرف میں جا رہا ہوں۔“

شہلا دم بخود رہ گئی۔

”اتنی کڑی سزا مت دو مجھے۔ میں۔ میں۔ میں۔ مرجاؤں گی یہاں۔“

”اتنی محنت سے کیا حاصل کرو گی؟ بابا! تمہیں پرہیزی چھوڑنی ہوگی۔“ وہ بیزار نظر آ رہا تھا۔ ”اور۔ اور۔ اتنی محنت سے کیا حاصل کرو گی؟ بابا

میں اس کی بجائے نوکری نہیں کرنے دیں گے۔“ ”جیلانی ہاؤس“ کی بہنوں بیٹیوں کا یہ کام نہیں کہ وہ عورتوں

کے بچے پیدا کر لیں پھر۔ پھر ٹھیک ہی تو ہے۔ تم اپنا بچہ سنبھالو گی یا پڑھو گی؟ یہاں تمہیں ہر طرح کا آرام ہے ہر

کام کے لیے۔ اس دس نوکریں۔ تم رانی بن کر پیش کرو، کن چکروں میں خوار ہو رہی ہو۔ میں ویک اینڈ پر آؤں گا۔“

شہلا کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ ساکت بیٹھی غلاؤں میں گھور رہی تھی۔ سپنا دیکھنے کی یاداش میں اس کی بینائی

کھینچ لی گئی تھی۔

جند کے دل پر کھتا ہوا ہر تذبذب کی حالت میں باہر چلا گیا۔

شہلا نے اپنے دل میں ختم درد عشق کے

مراں راتوں کے بعد

شہلا نے اپنے دل میں ختم درد عشق کے

مراں راتوں کے بعد

شہلا نے اپنے دل میں ختم درد عشق کے

مراں راتوں کے بعد

شہلا نے اپنے دل میں ختم درد عشق کے

مراں راتوں کے بعد

شہلا نے اپنے دل میں ختم درد عشق کے

مراں راتوں کے بعد

شہلا نے اپنے دل میں ختم درد عشق کے

مراں راتوں کے بعد

شہلا نے اپنے دل میں ختم درد عشق کے

اور ایسے میں دل کے تالاب میں ایک اور پتھر آگرا تھا۔ دائرے در دائرے اس کے اندر چکرار ہے تھے۔ نیند گولیاں بھی اس کے پریشان ذہن کو سکون بخشنے سے قاصر تھیں۔



”ربیعہ!“ گہری دھند میں آہ سے مشابہہ آواز ابھری تھی۔  
وہ آواز بے حد دکھی تھی۔ برف کی مانند سرد اور شعلے کی مانند دھواں دیتی ہوئی آواز۔  
ربیعہ کا جسم کانپ کر رہ گیا۔ اس آواز نے اس کے دل کو تیز دھار چھری کی طرح اندر تک چیر ڈالا تھا۔  
”ربیعہ! پانی دور بیچ۔۔۔“ آواز میں حسرت تھی بے چارگی تھی۔  
ربیعہ نے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ دور کہیں سے پانی کرنے کی آواز آرہی تھی۔ کہیں پر کوئی جھرنابہ رہا تھا۔ یا شاید برسات ہو رہی تھی۔ ربیعہ اس دھند میں آگے بڑھی۔۔۔ بڑھتی چلی گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اندھوں کی طرح ٹٹوتے ہوئے وہ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔  
”آہ!“ ایک سرد آواز اس کا دل ہلا کر رکھ دیا۔  
”جلتی، جلتی، تپتی آہ۔۔۔ جیسے آبلہ پا اپنی تخری امید بھی کھو بیٹھے۔“  
”ربیعہ! پانی کرسے جلد۔۔۔“  
ربیعہ دیوانوں کی طرح دوڑنے لگی۔

پانی کی آواز آگئی۔۔۔ جھرنابہ جھرنابہ رہا تھا۔۔۔ پانی کہیں سے بے حد قریب تھا۔  
لیکن اس کے چاروں طرف گہری دھند بے بسی بن کر پھیلی ہوئی تھی۔ اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے بے بسی کا انتہا پر پہنچ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔  
اور اس کی تکی تکی گئی۔۔۔ دیوانوں کی طرح اس نے دوڑنے لگا۔ وہ کمرے میں بالکل اکیلی تھی۔ ساتھ والے کمرے سے آتی ہوئی کھانسی کی آواز نے اسے احساس دلا دیا۔  
خالی خالی آنکھوں سے وہ کچھ دیر بیٹھی کمرے کی چیزوں کو گھورتی رہی۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

”شاید۔۔۔ شاید۔۔۔ میں پاگل ہو رہی ہوں۔“ اس نے کوفت سے سوچا۔ ”مجھے ایسے خواب کیوں آتے ہیں۔ ان خوابوں کا پس منظر کیا ہے۔ کوئی الجھن؟ میرے اندر دکھ ضرور ہیں لیکن الجھن کوئی نہیں۔ ان خوابوں کا رشتہ کیا میرے دکھ سے ہے؟ میرے دکھ سے؟ یا کسی اور کے دکھ سے؟ کس کا دکھ دادی؟ دادی کا دکھ لیکن کیا؟“  
اسے دادی یاد آگئیں۔ گوری جیٹ میڈے سے گندھی ہوئی اس کی پیاز دی دادی جان۔ جن کی کوئی نماز قضا ہوتے اس نے نہ دیکھی۔ جو اکثر بیشتر تلاوت کرتیں یا ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گراتی رہتیں ہاتھ میں اگر تسبیح نہ ہوتی تب بھی ان کے لب ہلا کرتے۔ وہ کیا پڑھتی تھیں؟  
ربیعہ اکثر غیر شعوری طور پر ان کی بدبواہٹ پر کان لگا دیا کرتی۔

”استغفر اللہ۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ معاف کر دے میرے رب۔۔۔ معاف کر دے۔ گنہ گار ہوں، خطا کار ہوں، سیاہ کار ہوں، مجھے معاف کر دے رب العالمین۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔“  
وہ اپنی کلمات کا ورد کیے جاتیں۔ ربیعہ کو اس لمحے ان کا چہرہ بہت بھلا معلوم ہوتا۔ سفید نورانی چہرے پر اور ہی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ گالوں پر لہو کی سرخ گہری بھرنے لگتی۔ ہاتھ پر ننھے ننھے قطرے چمکتے۔  
ربیعہ بے حد محویت سے ان کا استغراق دیکھتی۔ پھر اس کا دل نماز پڑھنے کو چاہتا۔ اس کا دل بھی اتنے ہی



انہماک سے اپنے رب کو یگانہ کرنے کے لیے ہمت کرتا۔ وہ وضو کرتی۔ اہتمام سے دوپٹہ باندھتی اور جاء نماز پر بیٹھ جاتی پھر وہ دعا کو ہاتھ اٹھا کر ادائی کے سے انداز میں کہتی۔

”معاف کر دے اللہ میاں جی۔ پیارے اللہ میاں جی۔ مجھے معاف کر دے۔ میرے اچھے اللہ میاں۔“ وہ کہہ جاتی لیکن اس کے ہاتھ پر قطرے نمودار نہ ہوتے۔ اس کے گالوں پر پیش محسوس نہ ہوتی۔ وہ منہ ہاتھ پھیر کر جاء نماز سے اٹھ جاتی۔ اس کا جی ذرا سی دیر میں ہی اپنے اللہ سے مطمئن ہو جاتا۔

”ادائی! میں سمجھتا ہوں کہ تو اس کے لیے پھلکے پھلکے انداز میں پوچھتی۔“ وہ آہستہ سے سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیتیں۔ وہ دروازے تک پہنچتی تو پیچھے سے ان کی آواز آ جاتی۔

”جی ادائی۔“ اس کے قدم تھم جاتے۔

”جلدی آجائے۔ میں روٹیاں پکا رہی ہوں۔“

”جی اچھا! ادائی جان۔“ وہ نماز پڑھ کر بڑی سعادت مند بنی ہوئی ہوتی۔

دروازہ کھول کر مینا اندر آئی تھیں۔ ربیعہ اپنے خیالوں سے چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک گھری ہوئی سونے کی چوڑی پر ڈال اور چند لمحے دیکھتی رہیں۔ نجانے وہ ایسا کیوں کرتی تھیں۔ وہ جب اس کی بیخبر نگاہ ڈالیں چند لمحے اس کے چہرے پر دھیان سے ٹکا کر لی تھیں۔ ربیعہ ان کی آنکھوں میں جھلکتی آنکھیں دیکھ کر اندر بھاگ کر چلی گئی۔ لیکن وہ پھر نگاہیں اس کے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیتیں۔ ان پتھریلی نظروں نے اسے جسی خود سے گزر جانے کا اذن نہ دیا تھا۔

”میں نے کہا جگادھ! تمہیں۔ دن کے دس بج رہے ہیں۔ تم گھوڑے بیچ کر سوئی پڑی ہو۔ اپنے گھر میں تم آ جا۔“

ربیعہ شرمندہ ہو کر ستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چادر کو تہہ لگانے لگی۔

”آپ رہنے دیں میں کرلوں گی پھپھو۔“

”پھپھو! وہ بھڑک اٹھیں۔ میں کس رشتے سے تمہاری پھپھو بن گئی ہوں؟ مجھے پھپھو و پھو کہہ کر مت پکارنا۔“

ربیعہ کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ چہرے پر سفیدی چھا گئی۔ وہ بے طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔

”سوری! آئی۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”وہ ترانہ آپ کو پھپھو کہتی ہے تو میں نے سوچا۔“

”خیر۔ آئندہ خیال رکھنا۔ جلدی سے منہ دھو لو۔ میں نے تمہارے لیے ناشتہ بنا دیا ہے۔“ وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ربیعہ نے آنکھیں بند کر کے بے بسی سے سر ہلایا۔ یہ عورت اس کے لیے ایک منغمہ ثابت ہو رہی تھی۔

پل میں تولہ پل میں ماشہ والا مزاج سمجھنا اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔

اسے ترانہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا اسے بھی اس گھر میں ایک سہارے کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ ربیعہ نے محسوس کیا تھا مینا اور صولت نے مل کر گھر اور اس کے کیمنوں کو اپنے دباؤ میں اس طرح سے لیا ہوا تھا کہ کوئی بھی ان کے مشترکہ محاذ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ایک فوج زدہ شخص اپنے کمری میں پڑا کھانتا، کھنکھارتا رہتا تھا، کسی کو اس کی اور اسے کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ دونوں لڑکے پر اسرار شخصیتوں کے مالک تھے۔ کم کم دکھائی دیتے۔ کسی سے کمری مخاطب ہوتے۔ ایسے میں ترانہ ”نو حقیقتاً“ ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی۔ وہ گھر کی واحد ہستی تھی جس نے ربیعہ کی آمد کو بے حد

خوشی سے قبول کیا تھا۔

منہ دھو کر وہ بچن میں چلی آئی۔ ایک پلیٹ میں پراٹھا بنا رکھا تھا۔ دوسری پلیٹ میں رات کا بچا ہوا سالن تھا۔ چوڑے پر پڑے سلور کے گندے سے ساس پین میں غالباً ”چائے کا پانی کھول کھول کر آدھا ہو چکا تھا۔ ربیعہ کا جی متلایا۔ اسے کبھی بھی ایسی گندگی کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔

ادائی کی صفائی پسندی تو خیر محلے بھر میں مشہور تھی، لیکن اس کے آس پڑوس کے گھروں میں بھی گھروں کا عموماً اور باورچی خانے کا خصوصاً بے حد دھیان رکھا جاتا تھا۔

ربیعہ نے کھولتا ہوا پانی سنک میں گرا دیا اور ساس پین کو مانجھنے لگی۔ صاف ستھرا ساس پین اس نے چوڑے پر رکھا تو اسے قدرے اطمینان ہوا۔

وہ پیرھی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی۔

مینا کچھ دیر بعد پین میں داخل ہوئی تھیں۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر ایک نظر انہیں دیکھا۔

”تم ناشتہ کر لو تو ذرا اپنے پھوپھا کا کمرہ صاف کر لو۔“ وہ بولیں۔

ربیعہ کے ذہن میں وہ کمرہ اور اس کی اشیاء گھوم گئیں۔ اس کا نوالہ حلق سے اترنا مشکل ہو گیا

”اچھا۔“ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

”وہ تو میری بڑی سی کام کرتی ہوں۔ لیکن کھانا پکاتے پکاتے وقت زیادہ ہو جاتا ہے۔ اب تم آئی ہو تو ظاہر ہے گھر کے باقی افراد کی طرح تمہیں بھی کوئی نہ کوئی ذمہ داری سنبھالنا ہوگی۔ تم اپنے پھوپھا کا کام کر دیا کرو۔ باقی کام تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔ جائے بن گئی ہے۔ چوہا بند کر دوں؟“

”نہیں۔“ وہ پھپھو کر سر اٹھایا۔ ”کر دیجئے۔“

”ان کے“ میں جھپٹتی پڑی ہے اسے روز صاف کیا کرو۔ گندگی باہر گلی میں پڑی بالٹی میں گرا دیا کرو۔ جمعہ دار روزہ روزہ ہے۔ صبح دھو کر صاف کر کے واپس کمرے میں رکھا کرو۔ وہ بے چارے اب اٹھ کر ہاتھ دھو کر صاف کر لیں۔“

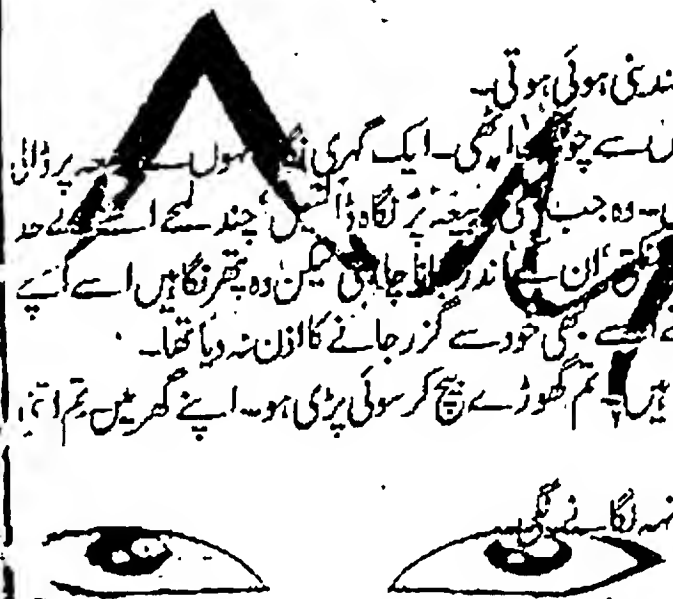
ربیعہ نے اس کی باتیں سن کر اس کی پلیٹ میں پراٹھا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ سالن پر

”ان کے بستر کی چادر ہر دو سرے روز تبدیل کر دیا کرو۔ ان کا ایک جوڑا روز استری کر کے ٹانگ دیا کرو۔ لڑکے رات کو آتے ہیں، خود ہی تبدیل کروائیں گے۔ یہ ہم عورتوں کا کام تو ہے نہیں۔ باقی یہ ہے کہ ٹب میں پانی بھر کر ان کا ہاتھ منہ دھو لو، تمہارا کام ہے۔ ان کی دوائیوں کا حساب کتاب میں تمہیں بتا دوں گی۔ کس وقت کون سی دوائی کتنی مقدار میں دینی ہے، ذہن نشین کر لینا۔“

انہوں نے خود ہی چائے چھان کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ربیعہ کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اس نے کبھی اپنے گھر کا ٹوا ٹکٹ نہ دھویا تھا۔ ایسے کاموں سے اس کی جان جاتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہیں بھاگ جائے یا پھر حواں دھار روئے۔ بس وہ کام اسے نہ کرنا پڑیں۔ جن کی فہرست اسے سنائی جا رہی تھی۔

”اور بال۔ منور بھائی کو پیاس کی بیماری ہے۔ انہیں ہر وقت بس پیاس ہی لگی رہتی ہے۔ کورود بار بنتا ہے ان کے کمرے کا۔ خیال رہے، کبھی وہ کور خالی نہ ہونے پائے ورنہ سمجھو تمہاری شامت ہے۔ تم سن بھی رہی ہو نہیں کیا کہہ رہی ہوں؟“ وہ جھلائیں۔

ربیعہ نے جھکا ہوا سر اثبات میں ہلادیا۔ سر اٹھانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی



PHOTO

تھیں۔ وہ انہیں اپنے آنسو نہ دکھا سکتی تھی۔ وہ چپ چاپ انہیں حلق سے اتارنے کی کوشش میں مصروف رہی۔  
 "میں نے ترانہ سے کہا ہے۔ تمہارے لیے کسی نوکری کا بندوبست کرے۔" وہ پھر گویا ہوئیں۔  
 ربیعہ کا دل اچانک مطمئن ہوا۔ گھر سے باہر کی نوکری یقیناً گھر کی اس نوکری سے بہتر ہوتی۔ اسے اپنی عافیت کی ایک راہ نظر آنے لگی۔  
 "لیکن میں نے اس سے کہا ہے کہ نوکری شام کی ہونی چاہیے۔" انہوں نے مزید کہا۔ "صبح میں تو مجھے تمہارا ضرورت ہے۔ میں اکیلی اس گھر میں جان کھپا کھپا کراؤں، موتی ہو، بھلی ہوں۔"  
 وہ اطمینان سے بچن سے باہر نکل گئیں۔  
 ربیعہ نے سر ڈال دیا۔



وہ کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اندر جانے کے لیے کڑے حوصلے کی ضرورت تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کیا اور اندر داخل ہو گئی۔  
 "کھوں کھوں کھوں۔" بستر پر والا چاروہ جو دہری طرح کھانسن رہا تھا۔  
 ربیعہ کے اندر ہنروری اور خلوص کی لہریں اٹھیں۔ بھان کے قریب ہی تھی۔  
 "پھوپھو بھاجی۔" وہ ان کے پاس بیٹھنے لگی لیکن اگلے لمحے اس نے اپنے آپ کو روک لیا۔ ان کے لقمہ زور بستر پر بیٹھنا اتنا آسان کام نہ تھا۔ بستر کے نیچے کی ہوئی بالٹی پر کھیاں بھینھنا انہیں تھیں اور اس کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔  
 بے درپے ابکائیوں سے ربیعہ کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ وہ اٹھ کر ایک لمحہ سے پیشتر کمرے سے باہر نکل گئی اور دروازے سے ٹیکہ لگا کر ناپسے لگی۔

"یا اللہ۔" اس کے دل سے دردی کی صورت نکلا تھا۔ "مجھے معاف کر دیجئے۔"

اسے گالوں پر تپش کا احساس ہوا۔ ہاتھ پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ خدا کو پکارنے پر جواب اگر اتنے قریب سے ملے تو کیا کیفیات ہوتی ہیں۔ اسے اندازہ ہو گیا۔

اس نے ایک نگاہ پھر کمرے کے اندر ڈالی۔ بستر پر ادا ہوا وہ شخص ایک انسان تھا۔ اس کے اندر بھی حیات کام کرتی تھیں۔ اسے بھی اچھے برے کی تمیز اگر اب نہ رہی تھی تو کبھی ہوگی۔ وہ گھر کے اندر گھس گئی۔ ذہن کو بالکل خالی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے وہ بالٹی اٹھائی اور تقریباً "بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔ بالٹی کو باہر گلی میں رکھی بڑی بالٹی میں اوندھا کر وہ تیزی سے ٹواٹکٹ میں چلی گئی۔ وہاں بڑے برش سے اس نے اچھی طرح اس گندی بالٹی کو صاف کیا تھا۔  
 اسے دھو کر اس نے ٹواٹکٹ میں رکھا فائنل چھڑکا اور کچھ دیر کے لیے وہیں چھوڑ دیا۔ پھر وہ واپس کمرے میں چلی آئی۔

وہ کمرہ کم اور کباڑ خانہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ فرش ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں سے اس پر جھاڑو نہ دی گئی ہو اور جنا بیگم کا دعوا تھا کہ وہ روز اس کمرے کو صاف کیا کرتی تھیں۔

ربیعہ کو وہ سب کچھ صاف ستھرا کرنے میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ اس نے دوائیوں سے الٹی ہوئی بڑے صاف کی جس میں پرانی خالی اور بھری شیشیاں تھیں۔ ایک پیار ہو جانے والی دوائی تھیں۔ ضروری اور غیر ضروری سب کچھ اس نے بے حد محنت سے وہ بڑے صاف ستھری کر کے منور امین کے سرہانے رکھی۔ دیواروں سے مٹی اور جالے صاف کیے۔ ڈسٹنگ کر کے دیگر اشیاء کو چمکایا۔ جھاڑو لگا کر کچرا سمیٹا اور رگڑ رگڑ کے پونچھا لگا کر

گندافرش چمکانے کی اپنی سی کوشش کی۔ کور میں رکھا ہوا پانی بدبو دے رہا تھا۔ غالباً "اس کو لڑ کو کبھی دھل کر صاف ہونے کا شرف حاصل نہ ہو یا تھا۔ ربیعہ نے کوکر کا پانی پیمینک کر اسے اچھی طرح دھوا نچھ کر صاف کیا اور تازہ پانی میں برف ڈال کر اسے واپس کمرے میں پہنچایا۔  
 پھر وہ ٹب میں پانی بھر کر کمرے میں لے گئی تھی۔  
 "پھوپھو بھاجی! ہاتھ منہ دھولیں۔"

انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔ ایسی ہی پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اسے پچھلے روڈھائی گھنٹے سے جان توڑ محنت کرتا دیکھ رہے تھے۔  
 "میں صابن اور تولیہ لاتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے گئی تھی۔



رات کو ترانہ اپنے باپ کے لیے پھل لائی تھی۔ اسے غالباً "آج تنخواہ ملی تھی۔ اس کے چہرے پر تازگی سی تھی۔

منور امین کو نسخے کے مطابق گولیاں کھلا رہی تھی۔ ترانہ کمرے میں داخل ہوئی پھر ٹھنک کر رک گئی۔ اس نے غلطی کا احساس لکھا تھا۔ پھر اس نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا اور خود کو یقین دلایا کہ اس سے کچھ نہیں ہوئی تھی۔ وہ واقعی اپنے باپ کے کمرے میں ہی داخل ہوئی تھی۔

خفاف ستھرے بستر پر اس کا باپ صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹا ہوا تھا۔ کمرہ روشن معلوم ہو رہا تھا۔ فرش بالکل صاف اور آج صبح سے پاک تھا۔ کمرے میں شاید اگر بتی جلائی گئی تھی۔ ہلکی ہلکی بھینکی بھینکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ آئی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی ثابت تھی۔

ربیعہ نے اشبات میں سر ہلا کر اس کے چہرے پر روکھی سی چمکی تھی۔  
 "خدا کا اہم کا جھلا کر ہے۔ کھوں کھوں۔" منور امین نے پانی کا گلاس خالی کر کے اسے دیا۔

ان کا دایاں حصہ کام نہ کرتا تھا لیکن بائیں ہاتھ سے وہ اپنے تقریباً "بھی کام کر لیا کرتے تھے۔ ترانہ کی آنکھوں میں آنسو جھک رہے تھے۔ اس نے پھلوں کا لفافہ باپ کے سرہانے رکھی میز پر رکھ دیا۔  
 "تھینک یو ربیعہ!" وہ ممنونیت سے بولی۔

رات کو وہ دونوں چھت پر چلی آئی تھیں۔ صولت صحن میں ماں کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ ترانہ نے اسے بھی چھت پر چل قدمی کی پیش کش کی تھی جسے اس نے ناک چڑھا کر رد کر دیا تھا۔  
 "میں کھانا کھا کر سوؤں گی۔" وہ روکھائی سے بولی تھی۔

اس کے انداز میں اپنی ماں کا سا اکھٹرس تھا۔  
 "میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں ربیعہ۔ میں ان کی بیٹی ہوں لیکن یقین مانو کتنے دنوں سے میں اس کام کے لیے ہمتیں مجتمع کر رہی تھی جو تم نے پلک جھپکاتے میں کر دکھایا۔ ابو کا کمرہ اور انہیں یوں صاف ستھرا دیکھ کر میرے دل سے بے اختیار تمہارے لیے دعا نکلی۔ جس گندگی کو صاف کرنے کی ہمت بیٹی اور بہن میں نہ

تھی۔

”نہیں بھی تو ان کی بیٹی جیسی ہوں ترانہ۔“ ربیعہ خلوص سے بولی۔ ”انہیں یوں مجبور اور لاچار دیکھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ یہ وقت تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔“

”تم بہت اچھی ہو ربیعہ۔“

ربیعہ مسکرا کر رہ گئی۔

”پتھپتھو کا ہلوک تم سے کیسا ہے؟“ دونوں چھت کی دوسری منڈیر تک چلی آئی تھیں۔

ربیعہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو رہی۔ شرکی روشتیاں جگنوؤں کی مانند چمک رہی تھیں۔ جھینگروں کی آواز سے خاموش ماحول میں اداسی سی پھیل رہی تھی۔

”یہاں بہت جیس رہتا ہے۔“ ربیعہ بولی۔

”ہاں۔“ کچھ دنوں میں زور کی برسات پڑے گی۔ پھر موسم اچھا ہو جائے گا۔ خیر، موسم کا کیا ہے ساری بات من کے موسم کی ہے۔ تمہارے من کا موسم کیسا رہتا ہے ربیعہ؟“ ربیعہ سوچ میں پڑ گئی۔

”شاید ایسا ہی۔“ وہ رک رک کر بولی۔ ”اداس، اداس، جس زور۔“

”کبھی تم نے اپنے اندر پھول کھلتے محسوس کیے ہیں؟“ ترانہ نے پوچھا۔

اس کے لمحے میں خوابوں کی سی بے یقینی تھی۔ ربیعہ نے چونک کر اٹھ کر دیکھا۔ اندر کمرے میں بھی وہ اس کے چہرے پر رقم کیفیت دیکھ سکتی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ مسکرا کر چہرہ دیکھ رہی ہو اور سمجھتا اس سے بدرجہا باتیں کر رہی ہو۔

”پھول تمہارے اندر کھلے ہوئے ہیں ہیں نا؟“ ربیعہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”شاید! وہ مسکرائی۔“

”لگتا ہے گلستانِ دل میں کوئی ”مالی“ پائنت ہو گیا ہے۔“ ربیعہ شہر سے ہنس پڑی تو ترانہ چونک کر بچ پڑی۔

دونوں زور سے ہنس دیں۔

”بے وقوفوں کی طرح مت ہنسو۔“ کوئی ڈپٹ کر بولا۔

وہ دونوں ہی خائف ہو گئیں۔ تمدن سب سے اوپری سیڑھی پر کھڑا تھا۔ وہ کب اوپر چلا آیا انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ شاید وہ اپنی باتوں میں کچھ زیادہ ہی مگن ہو گئی تھیں ورنہ اس کی اسٹاک پر آٹا اس کی ہاتھوں میں اس کے ہاتھوں میں دیا کرتی تھی۔

”آواز دوسرے گھروں میں جاتی ہے۔“ پھر مزید بولا۔ ”مجھے روٹی دو۔ بھوک لگی ہے۔“

اپنی بات کہہ کر وہ مڑ گیا تھا۔

”مجھے یہ لفظ ”بھوک“ بہت برا لگتا ہے ربیعہ۔“ ترانہ دھیرے سے بولی۔

”کیوں؟“ اس کا دھیان تمدن کی جانب تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے بولی۔

”بس نفرت ہے مجھے اس لفظ سے۔ اسے استعمال کیے بغیر بھی تو کھانا مانگا جاسکتا ہے، ہے نا؟“

ربیعہ نے نا سنجھی سے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔

”چلو۔ نیچے چلیں۔“

\*\*\*

”خنے کون کم بخت ہے۔“ فردوس بیگم نے تملاکر ریپور پٹنا۔

اپنے کمرے سے نکلتی عریشہ کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ فون کی گھنٹی کی آواز سن کر باہر آئی رہی تھی جب فردوس بیگم نے ریپور اٹھالیا۔ دوسری جانب سے ان کی آواز سن کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

”میا مری اس کی۔ ہم اپنے کو مشکل سے سنبھالتے ہیں انہیں مستی سو جھتی ہے۔ دوڑتے بھاگتے ہانڈی چھوڑ کر اس مردار کو سننے آؤ تو دوسری طرف سے ”ٹوں ٹوں ٹوں ٹوں“ ہونے لگتا ہے۔“

عریشہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی جسے ماں سے چھپانے کے لیے وہ پھر کمرے میں چلی آئی۔ وہ کبھی جھکتی واپس لیکن میں جا چکی تھیں۔

عریشہ نے کمرے سے جھانک کر ان کے نہ ہونے کا یقین کیا پھر تیزی سے چلتے ہوئے فون تک آئی۔ سب سے پہلا کام اس نے فون کی آواز کم کرنے کا کیا تھا۔ اگلے ہی لمحے پھر ”گھر گھر“ ہوئی۔ اس نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھتے ہوئے فون اٹھالیا۔

”بہت ہی ڈھیٹ شخصیت ہیں آپ۔“ اس نے ریپور اٹھا کر وائٹ کچکچائے۔

”عاشقی کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے جناب! اس وصف کے بناء عاشقی ناممکن۔“ چمک کر کہا گیا۔

”دن گالیاں بڑ گئیں تو عاشقی دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

”آپ بسم اللہ کیجئے۔ گالیاں کھا کر بے مزہ نہ ہونے کی قسم اٹھائی ہے ہم نے۔“

”کام میرا۔“ والدہ زیادہ اچھا کرتی ہیں۔ کیسے تو فون انہیں دے دوں؟ اس نے شرارت سے لب دبائے۔

”والدہ! اس کے دامن میں خوشیاں بھرے۔ ہم پھر بھی انہیں اور آپ کو یہی دعا دیں گے۔“ عریشہ کو بات سمجھ کر ہنسی آگئی تھی۔

”نہیں خدا کی۔ محنت کا پھل مل گیا۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”یہ مدھر جھنکار پچھلے گھنٹہ بھر کی محنت کا صلہ لگی ہے۔“

”آپ جانتے ہیں۔“ وہ تار کو انگلی پر لپیٹنے لگی۔

”کسی دن جانتا۔“ اس نے فرمائش کی گئی۔

”کادل۔“ جاندار پر بولا۔ چاروں اور رنگ برنگ ستارے چمکنے لگے۔

”دعائیں بند ہو۔“ اس نے غصے سے دھمکی دی۔

”کل کس وقت کروں؟“

”وہ تو تمہارے لیے خاموش ہوئی۔“

”بویس ما۔ پیئیر۔“

”فہرہ دیجے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اچھا۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”میرا نام فراز ہے۔ آپ کا؟“

”عریشہ۔“

ماں کو بچن سے نکلتا دیکھ کر اس نے جلدی سے ریپور رکھ دیا۔

\*\*\*

”نافع۔“ عذرا بیگم نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے نافع کو پکارا۔

”خیر گیا۔“ جی ای۔ کیسے۔“ وہ مڑ کر ان تک آیا۔

”کیس جاز ہے ہو؟“

”جی ہاں دوست کی طرف جا رہا ہوں۔ کیسے کوئی سبزی یاد آگئی؟ آکو، مٹر، بھنڈی، کیا لاؤں؟“

”چلو ہٹو میرے منہ پر سبز یوں کے نام لکھے ہیں کیا؟“ وہ برہان کر بولیں۔  
 ”جی نہیں میرے منہ پر لکھے ہیں۔“ اس نے وائٹ نکالے۔ ”مے دیکھتے ہی آپ کو سبزی مارکیٹ یاد آجاتی ہے۔“  
 انہیں ہنسی آگئی۔

”اب بھلا بیٹوں سے اپنے کام نہ کہوں گی تو کس سے کہوں گی۔“ انہوں نے دلار سے اس کی ٹھوڑی پھوٹی۔  
 ”بیٹوں کے ابا سے کہہ کر دیکھیں۔“ وہ شرارت سے بولا۔ ”وہ بھی کبھی انکار نہ کریں گے۔“  
 ”شریر کہیں کا۔“ انہوں نے اس کے سر پر پیار سے چیت لگائی۔ ”اب کچھ عقل سیکھ لو۔ بیاہ کر دیں تو سال بھر میں باپ بن جاؤ گے اور باتیں سنو تو نو عمر لڑکوں کی سی۔“  
 ”اب بیاہ سے پہلے تو لڑکا ہی رہنے دیں امی!“ وہ ہنسا۔  
 ”جی بات کے لیے زور کا تھا تمہیں۔“ وہ بیٹھتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آئیں۔ ”مقلنی کر ڈالیں تمہاری؟ کوئی اعتراض تو نہیں نہیں؟۔“  
 وہ ہٹ پٹا کر رہ گیا۔

”آپ سنجیدہ ہو چلیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا اور ابھی تو کافی وقت ہے۔“ ان خرافات کے لیے لیس ٹھہریے  
 خدا را سب سے پہلے مجھے اس خوش قسمت کے نام سے آگاہ کر دیجئے کہ کاش نام قرعہ فی بین یقیناً وادی جہنم نے نکالا ہے۔ کون ہے وہ؟“  
 ”عمریشہ۔“

”اوہ نیس۔“ اس نے آنکھیں میچیں۔ ”جس کا ڈر تھا۔“  
 ”تو کوئی برائی سے بچی میں؟“ انہیں برا لگا۔  
 ”سوائے بچنے کے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

”تم میں کم ہو پکچنا تو کہو۔“ انہوں نے طنز سے اسے دیکھا۔  
 ”دوبچے مل کر آپ کو بہت ستائیں گے امی! فیصلے پر نظر ثانی کی اپیل ہے۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھا۔  
 ”نافع بیٹا! بات سن لو تسلی سے۔“ انہوں نے اسے پکارا۔ ”دیکھو میں صاف صاف بوجھ رہی ہوں تم سے پھر تمہاری وادی بات آگے بڑھائیں گی۔ ابھی اگر دل میں کچھ اور کچھ ہے تو فوراً کہہ دو۔“

”نہیں کہوں گا۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔  
 انہیں اپنی بات کا جواب مل گیا تھا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا یہ تم ہی ہو۔“ انہوں نے بے اختیار اسے شانوں سے تھام کر دیکھا۔ ایتان مسکرا دی۔  
 ”متبادل گئی ہوں آنٹی؟ اب اتنی بھی موٹی نہیں ہوئی ہوں۔“ وہ شرارت سے بولی۔  
 ”بدلتی نہیں ہو۔“ وہ کسی ہی پیاری ہو۔ لیکن اس لیے نہیں آتا کہ بدلتی ہو بعد اس گھر میں قدم رکھا ہے تم نے بناو رستہ ہی بھول گئیں۔“ منیزہ بیگم پیار سے بولیں۔  
 ”رستہ کب بھولتا ہے آنٹی! وہ بھی بچپن کی ہم جولیوں کے گھر کا رستہ۔ آپ کو بھی اب تک یاد ہوں گے اپنے

بچپن کے سب رستے۔“ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔  
 منیزہ بیگم چلتے چلتے رک سی گئیں۔  
 ”شہلا گھر پر نہیں ہے؟“ ایتان نے پوچھا۔

”ہاں آنے والی ہے۔“ تم بچھو تب تلک ہم باتیں کرتے ہیں۔“  
 ایتان ان کے ساتھ لاؤنج میں پڑے صوفوں پر بیٹھ گئی۔  
 ”تمہارا بیٹا عمر کا بہت اچھا دوست ہے۔“ وہ خوش ہو کر بتانے لگیں۔  
 ”جی ہاں۔“ وہ ہنس دی۔ ”یہاں آتے ہی آپ کے گھر بھاگتا ہے کہ عمر سے مل کر آتا ہوں۔“  
 ”چلو اچھا ہے۔“ ماؤں نے بچوں کو درے میں بہ دوستی دی ہے۔ چائے بناؤں تمہارے لیے یا ٹھنڈا پیوگی؟۔“  
 ”کھانا کھاؤں گی۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”لیکن شہلا کے آنے کے بعد۔“  
 شہلا کچھ ہی دیر میں آگئی تھیں۔ ایتان کو دیکھ کر وہ خوشی سے کھل اٹھی۔  
 ”تمہاری یادداشت لوٹ آئی ہے ایتان؟“ وہ اس سے لیٹ کر خوش دلی سے بولی۔  
 ”ہاں سب کچھ یاد آگیا ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔ ”تمہیں بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ تم میری بات کبھی نہ ٹالتی

تھی۔“ وہ بھڑکے ہوئے سنجیدہ ہوئی۔ ایتان کی بات میں گہرائی تھی اور اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ پھر وہ  
 ”میں اپنے بدل کر آتی ہوں۔“  
 ”نہیں ایتان میں مسکرائی۔“

شہلا نے اسے دیکھا۔ ایتان کی آمد یقیناً کسی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ کچھ پریشان ہوئی۔ ہاشم کا فون  
 ”میں نے اپنے بدل کر آتی ہوں۔“  
 ”نہیں ایتان میں مسکرائی۔“

”اب اس نے پوچھا۔“ ”کسے خیال آگیا؟۔“  
 ”کچھ کہوں تو مجھے بھیجنا ہے۔“ ایتان نے اس کی نگاہوں سے اسے دیکھا۔  
 ”نہیں جانیں میں۔“ ایتان نے ڈانٹا۔

”ایتان پلیز!“ شہلا نے لجاجت سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”میری زندگی میں کسی مرد سے تعلق  
 جوڑنے کی رتی برابر جگہ نہیں ہے۔ تم مجھ سے جہاں بھر کی باتیں کر لو لیکن پلیز ایہ بات مت کرنا۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

ایتان دم بخود رہ گئی۔ اتنے واضح افکار کے متعلق اس نے سوچا بھی نہ تھا۔  
 ”شہلا۔“ اس کے لبوں پر اس کا نام دم توڑ گیا۔

(باقی آئندہ)



خیال رکھتے ہیں۔ دود کا نہیں اور ایک گھر اس کی ملکیت ہے۔ حاکم چچا کو دکانوں کا کرایہ لانے کی ذمہ داری پر  
قدرے فکر و غاش سے آزاد ہو جاتی ہے۔ بوا سیکھنے بھی پڑوس ہونے کا حق بھر پور طریقے سے ادا کر رہی  
ان کی گفتگو میں ربیعہ کو تلخ حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس پر اسے یہ گھر بیچنے کا مشورہ دے دیا  
خریدار ان کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس  
خیر خواہی میں سے ہیں۔

ربیعہ متواتر ایک جواب دیکھ رہی ہے کہ داوی کسی صحرا میں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی پیا  
ہے۔ اسے داوی کے رنگ میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اس  
شہادت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی  
خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلیکٹیس بانواس کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے  
کے انتقال کی خبر اننا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں سنیوہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا  
ڈاکٹر شہلا کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے سے باتیں کرتا ہے۔  
فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قسطوں میں لے کر دیتا ہے۔  
ربیعہ اپنی تنہائی اور لوگوں کے بدلتے رویوں سے تنگ آ کر اپنی بیٹی بیگم کے گھر لا کر جاکر کایفیلہ کر رہی ہے۔  
میں ربیعہ کی ملاقات عبادت سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر بیگم شہلا سے گھر کر رہی ہے۔ وہ از خود اس کی پھوپھو کے  
رہنمائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔

## گیارہویں قسط

ایقان دکھ کے احساس میں ڈوبی بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ شہلا اپنے آنسوؤں کی خوشی سے  
ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ماں یا بہن کے دل میں ان آنسوؤں کو دیکھ کر استفہام پیدا ہو اور بات  
بڑھے۔ اصرار کو مزید افراد کی کمک حاصل ہو جائے۔ وہ اس بات کو محض اپنے اور ایقان کے مابین ہی ختم کر  
چاہتی تھی۔

”تم نے۔۔۔ اسی سے کچھ کہا تو نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔“  
”نہیں۔۔۔“ ایقان سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ”میں صبح سے پہلے تمہاری رائے معلوم کرنا  
تھی۔ ہاشم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اس کی بات سن کر فون بند کر دیا تھا اسے کوئی جواب دیے بغیر۔ وہ اس خانہ  
کو تمہاری رضامندی پر محمول کر رہا ہے۔ وہ بہت بہت خوش ہے شہلا! تم کیوں ایک پر خلوص سچے انسان  
اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین رہی ہو جبکہ اس کی خوشی تمہاری مانگ کی افشاں بھی بن سکتی ہے۔  
تمہارے بیٹے کے سر کا سائبان بن سکتی ہے۔ بے وقوفی منت کرو شہلا! زندگی کی حسین ترین تمنائے سچا  
ہاتھ تمہاری طرف بڑھا ہوا ہے۔ اس تمنائے کو اٹھا کر اپنے دل میں رکھ لو اور اس ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دو۔ میں ایک  
دوست کی حیثیت سے تمہیں یہ مشورہ دے رہی ہوں یہ راہیہ کی سی زندگی کب تک گزارو گی۔ آئینے میں اپنا  
کبھی غور سے نہیں دیکھا تم نے؟ عمر کے جس دور سے تم گزر رہی ہو وہاں ہمیشہ ایک ساتھی کے مضبوط سہارے  
ضرورت ہوتی ہے شہلا! میں۔۔۔ میں۔۔۔ اور کیا کہوں تم سے؟“

ایقان بے بسی سے اس کا جھکا ہوا سر دیکھ کر بولی۔ شہلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی پلکوں پر نمی اور لبوں  
اداس مسکراہٹ تھی۔

”کچھ مت کہو ایقان! جو کچھ تم کہہ رہی ہو سچ ہے! لفظ لفظ معتبر ہے کیونکہ مجھے تمہارے پر خلوص ہونے پر رتی  
برابر بھی شک نہیں ہے۔ لیکن ایقان چہو چاہے جو کچھ آئینے میں خواہ کچھ بولیں، انسان مجبور محض دل کے ہاتھوں  
ہوتا ہے اور مدت ہوئی میرے دل نے بولنا چھوڑ دیا ہے۔ کچھ نہیں کہتا گونگا ہو گیا ہے۔ اس کی خواہشات سوئی  
نہیں ہیں کہ میں ان کے جاننے کی امید رکھوں۔ ساری خواہشات مر گئی ہیں ایقان! بس ایک تمنائے جلتی ہوئی لو  
سے میرے راکھ ہوتے دل میں کچھ روشنی ہے۔ میرا بیٹا! میری ہر امید کا واحد مرکز میری زندگی کی واحد وجہ۔  
میرے ہونے کا کلوتا ثبوت۔ میں کسی مرد کی زندگی میں شامل ہو کر اسے کچھ نہ دے پاؤں گی ایقان! کچھ بھی نہیں  
دے سکتی میں۔ میں اس کے لبوں پر کبھی ایک مسکراہٹ تک نہ لاسکوں گی، پھر میں کیوں خود کو اور اسے یہ سزا  
دے سکتی ہوں؟“

ایقان نے قدرے ناراضی سے اسے دیکھا۔  
”جنھوٹ بولتی ہو تم شہلا! زندگی میں نشیب و فراز سب کے ساتھ ہیں۔ حادثے بہت سوں کا مقدر بنتے ہیں  
لیکن لوگ ہنسنا بولنا، جینا نہیں چھوڑ دیتے۔“ آئندہ ”تو ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس حقیقت سے نگاہیں  
کیسے جھکتی ہو تم؟ تمہارا ”آئندہ“ تمہارے بیٹے کا ”آئندہ“ کیا سوچا ہے تم نے اپنے والے کل کے بارے  
میں سوچا ہے؟ بہن بیاہ کر اپنے گھر چلی جائے گی، تمہارا بھائی اپنی زندگی کی شروعات کرے گا۔ اس گھر میں اس کی  
کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم اور تمہارا بچہ ناقابل قبول ہوں گے۔ وہ اپنے بچے پر تمہارے بچے کو نظر انداز نہ بھی  
کرے۔ تم کہیں ضرور ایسا محسوس کرو گی۔ اس وقت کیا کرو گی شہلا! جب اس گھر میں تم خود کو مس فٹ  
تصور کرو گی۔“

شہلا کا چہرہ کرب سے سیاہ پڑنے لگا۔  
”مجھے۔۔۔“ ایقان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔  
”تمہارے دل پر غم کی ایک بھاری چھائی ہے۔ لیکن اپنے ”آئندہ“ کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے ”کل“ کے مفاد  
کی خاطر کسی حد تک اسودا اپنے مرہ اخراجات کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ اگر میرے اندر اس خوشی کو  
پانے کا جذبہ ابھرنا تو اسے ضرور ہرگز نہیں صرف اس لیے کہ مجھے ایک مضبوط ساتھ میسر آجائے اور عمر کو  
باپ کے نام کا سائبان مل جائے۔ صرف اس لیے نہیں کسی کی نیک پر خلوص تمنائوں کو اپنی مرہ دل کا تحفہ پیش  
کرنا۔“

”اے آزمائش یا اپنی بے مہری کو؟ دوست کی محبت میں تم جتنے کے ساتھ کچھ زیادتی نہیں کر رہی ہو ایقان؟  
میری مانگ ستاروں سے بھر کر اپنی آرزوؤں کے دیب جلائے کو وہ مجھ سے کچھ نہ چاہے گا؟ میرے اندر جذبوں کے  
الاؤ سرد اور خاموش ہو چکے ہیں۔ ہلکی سی چنگاری بھی نظر نہیں آتی۔ میں اس کے جذبوں کی گرمی کے جواب  
میں اسے کیا دے پاؤں گی؟“

ایقان بولنے لگا ”خاموش ہو گئی۔ اس بات کا کوئی جواب اس سے بن نہ پایا۔  
”مرد کی محبت نے مجھے بہت دکھ پہنچایا ہے ایقان! اتنا دکھ کہ اب میں کبھی بھی ذہنی طور پر کسی مرد کی محبت کو قبول  
نہیں کر سکتی۔ مجھے مجبور مت کرو پلینز! رہی بات میری اور میرے بیٹے کے مستقبل کی تو خدا کا شکر ہے کہ اس نے  
ایک بہتر زندگی عطا کی ہے جو دو سروں کی خدمت میں گزر رہی ہے۔ مجھے اتنا آسرا بہت ہے کہ میں اپنے بیٹے کو اچھا

۱۸۱ کھانا چھی تعلیم چھا مستقبل دے سکتی ہوں۔ بس اللہ کسی کا محتاج نہ کرے۔

دونوں کے مابین خاموشی کا طویل وقفہ در آیا۔ ایقان کی نگاہوں میں ہاشم کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی روشنی اس کے لبوں کی وہ مدھم مسکراہٹ چہرے کی لہر کتنا خوش تھا وہ اسے سب کچھ بتاتے تھے۔ اس کے انگ انگ سے خوشی چھلکی پڑتی تھی۔

”میں نے کہہ دیا پچھو! سب کچھ کہہ دیا۔ جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا تھا برسوں سے سب کہہ ڈالا۔ میری رہبر ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔“

”اس نے کیا کہا؟“ وہ بے حد پر تجسس تھی۔

”اس نے؟“ وہ لہجہ بھر کے لیے مدھم پڑا تھا۔ ”خاموشی نیم رضامندی۔“

وہ ہنس کر بولا تھا۔ اس کی ہنسی میں یقین تھا۔

ایقان نے گہری سانس بھری۔ اس کی زندگی کی حسین تناسل سے سچی ہتھیلی پر اسے شہلا کا انکار رکھنا تھا۔ کس قدر مشکل کام تھا جو اسے کرنا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی جوت پھونکنا مار کر بھائی تھی۔

اس کی وہ دلی دلی خوبصورت مسکراہٹ اس کے لبوں سے مٹھ ہوئے دیکھتی تھی۔

”اتنا جو صلہ کیسے کروں شہلا!“ وہ بول اٹھی۔ ”کیسے مایوس ہو جاؤ گے؟ اس لیے لہجہ تمہارا قریب کی تمنا کی ہے۔“

”جانتی ہوں ایقان! لیکن میرے قریب سے اسے خود نہیں نکال سکتی۔“ شہلا اداہنی سے بولی۔ ایقان نے غور سے اس کی سمت دیکھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

”اچھا۔ ایسا کرو۔ کچھ دن سوچ لو غور کر لو۔ کیا خبر تمہارا دل کوئی مڑ نہ سادے۔“

شہلا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور مسکرا دی۔

”بہت خوش امید ہو ایقان تم ہمیشہ کی طرح۔“

”اور تم کسی ہی کٹھنوس۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”تمہیں احساس نہیں ہے شہلا! کہ تم کسی کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر رہی ہو۔ اپنے آپ کو مناد شہلا! دل کے دیپ جلاؤ جلاؤ کی کوشش تو کرو۔ اپنی سیاہ آنکھیں غور سے دیکھا کرو اپنے تراشے ہوئے لبوں پر دھیان دو ذرا۔ اپنی زلفوں سے پوچھو اتنا حسن تم سے شکایت نہیں کرتا کبھی؟ کہ اسے ایک سراپنہ والا درکار ہے چاہنے والا درکار ہے۔“

شہلا کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس کے گال سرخ ہو گئے تھے۔ ایقان خوش ہو گئی۔

”دیکھا آئی تالاج اس تصور سے؟ پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ جذبول کے الاؤ سرو پڑ گئے ہیں۔ رخساروں پر بکھرتی حرارت جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

”ایقان پلیز۔“ شہلا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”میں تمہیں وقت دے رہی ہوں شہلا! خوب سوچ لو۔ ہاشم کا بچھا ہوا چہرہ دیکھنے کی تاب نہیں ہے مجھ میں۔“

میں اسے یہی کہوں گی کہ تم نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔“

”نہیں ایقان!“ وہ بے باکی سے بولی۔ ”وہ نجانے کیا سمجھ بیٹھے۔ اپنے اندر اس کے مزید لیے جلا لے۔“

”کیا خبر کسی دیے سے تمہارے اندر کا الاؤ ہی بھڑک اٹھے۔“ ایقان نے اسے گھورا۔ ”میں کچھ نہیں جانتی۔“

اسے یوں اچانک ہی مایوس اور نامراد مت کرو۔

پھر اس نے لا چاری سے سر جھکا لیا۔

ایقان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ قریباً ”تین ٹھنڈے وہاں گزار کر آئی تھی۔“

”ہاشم!“ پھر وہ ہمدردی سے بولی۔ ”کسی کو چاہو ضرور لیکن چاہت میں خود کو نظر انداز مت کرو۔ اپنی ہستی کو پہلے مقدم جانو۔ وہ غریب کی طلب میں خود کو مٹانے کا فلسفہ میری نگاہ میں تو سرا سر غلط ہے۔ بہر حال زیادہ بے تاب

”حیات ولا“ کے بڑے سیاہ گیسٹ پر اپنی فہ اس کے مقابل تھا۔ ایقان ٹھنک گئی۔

”کیا تمہیں اس نے؟“ وہ بے باکی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”نہیں! دم تو لینے دو میرا سانس پھول رہا ہے۔“

”میرا دم نکل رہا ہے پچھو! آپ کو سانس لینے کی بڑی ہے۔“ وہ چڑ گیا۔

”ہائیں۔“ وہ رک کر اسے گھورنے لگی۔ ”یعنی پچھو مرنے لگی ہے تو مرے تمہیں زندگی کی نوید مل جائے۔“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔

اس کے چہرے پر شرمندگی اور بے قراری کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ایقان کھڑی اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کے اندر توڑ پھوڑی ہونے لگی۔ اپنا یہ بےوقوف ساجھتیجا جو تقریباً اس کا ہم عمر تھا اسے بے حد عزیز تھا۔

”اس نے منع کر دیا پچھو؟“ وہ ویسے ہی نظریں جھکائے ہوئے پوچھنے لگا۔

ایقان ہولے سے مسکرا دی۔

”نہیں۔“ وہ سانییت سے بولی۔

”ہاشم!“ اٹھا۔ اس کے چہرے پر روشنی سی لپکی۔

”مطلب ہاں! اس نے۔“ اس نے۔“

”ایقان! اطمینان سے کہہ کر پھر چل دی۔“

”ہاشم! چند منٹ اپنی جگہ پر کھڑا اس کی بات پر غور کرتا رہا پھر پھرنا کر اس کے پیچھے چل دیا۔“

”پچھو! اللہ کا واسطہ ہے آپ کو۔ مجھے اس طرح جاگل بنا کر آپ دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہی ہیں؟ پلیز اپنا یہ حق سناں پھر کھینچو اور اگریں۔“

اس نے اس کا بازو دھریا۔ ایقان رک گئی۔

”آپ کو میری انتظار بغینت کا احساس نہیں ہے ورنہ آپ کبھی ایسا مذاق نہ کریں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”آپ کی نگاہ میں میں بے باکی۔“ اس نے نگاہیں جرابی کیں۔

”اس نے ہاں کھینچ لیں۔“ اس نے۔“

”نہیں! نہ تال۔“ اس نے۔“

”وہ دیکھ لے۔“ وہ دیکھ لے۔“

”نہیں! نہ تال۔“ اس نے۔“

”وہ دیکھ لے۔“ وہ دیکھ لے۔“

”نہیں! نہ تال۔“ اس نے۔“

”وہ دیکھ لے۔“ وہ دیکھ لے۔“

”نہیں! نہ تال۔“ اس نے۔“

”وہ دیکھ لے۔“ وہ دیکھ لے۔“

”نہیں! نہ تال۔“ اس نے۔“

”وہ دیکھ لے۔“ وہ دیکھ لے۔“

ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ پھر چل پڑی۔ ”یہ یاد رکھنا ہاشم! کہ فیصلے میں ہاں، ناں کا چانس فنی فنی ہوتا ہے اور عقلمند لوگ ناں کو سیونٹی فائیو پرسنٹ دیتے ہیں تاکہ نتائج کا اثر مثبت ہی رہے۔ دل و دماغ پر اثر انداز نہ ہو اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اگر وہاں سے انکار ہوا تو میں تمہاری ایک نہ سنوں گی اور مہینے بھر میں بیاہ کروں گی تمہارا“

ہاشم وہیں کھڑا سے جاتا دیکھتا رہا۔

”اللہ آپ کا حفظہ سلامت رکھے۔ پتہ نہیں ہمارے پھوپھا سے اتنی محبت کیسے کر لی آپ نے؟“ وہ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے سوچ رہا تھا۔



”آج کیسے سہیلی کی یاد جاگی من میں خیر تو ہے؟“ شفیقہ حیات نے اسے آنا دیکھ کر اپنے پاؤں سمیٹے۔ وہ سلام کرتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑا سا جلنے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔

”یاد تو خیر ایسی چیز ہے اماں! بنا ٹکٹ کے جب چاہے چلی آتی ہے لیکن اس حال میں اتنا چلنے کی ہمت کہاں تھی مجھ میں ہاشم کے اصرار پر گئی تھی۔“

”ہاشم کا اصرار سبب؟“ ان کا ماتھا ٹھنک رہا تھا۔ ”کیا ہے پراسرار کرتا ہے؟ تمہارے وہاں جانے سے اس کا کیا تعلق؟“

”بھول گئیں آپ شہلا نے جب برابر جیٹانی سے شاہی چلی تھی تو کیا حال ہو گیا تھا اس کا؟ مرنے والا ہو گیا تھا۔ اب بھلا جان اس سے شاہی کے لیے اصرار کیسے جانی توں یاد اس کی سولی وہیں انکی ہوئی ہے۔ کہتا ہے شہلا سے ہی کرے گا۔ مجھے بھیجا تھا اس کی زائے لینے کے لیے۔“

شفیقہ حیات ٹھوڑی پرانگی رکھے خیرالی سے اس کی جانب دیکھتے رہے۔

”اس نے بھیجا اور تھیں چلی گئیں؟ ارے لڑکیاں! بچوں والی ہو گئی تھیں۔ قبل سیکھے گی ایقان؟“

ایقان چونک سی گئی۔ قدرے حلق سے اس نے ماں کو دیکھا۔

”لیجئے بے عقلی کا کون سا مظاہرہ سرزد ہوا مجھ سے؟ وہ اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ تو اس میں میرا کیا ہاتھ؟ اور اس میں برائی بھی کیا؟“

**URDU PHOTO**

”جو بھی برائی ہے وہ اس کی ماں تمہارے کھاتے میں ڈال دے گی سیدھے سیدھے۔“ وہ بگڑ گئیں۔ ”بڑی قابل بنی پھر رہی ہو۔ ہاشم سے کہا ہوتا اپنی ماں بسن کو بھیجے اس کے گھر۔ وہ جا کر رشتہ ڈالیں وہاں۔“ ہاں، ہوئی تو ہم بھی شرکت کر لیں گے منگنی بیاہ میں۔“

”جی ہاں۔“ وہ طنز سے بولی۔ ”وہ بھیجے گا اور وہ چلی بھی جائیں گی۔ اتنی ہی سیدھی ٹھہریں آپ کی ہو بیگم۔ زمین و آسمان ایک کر ڈالیں گی پہلے تو پھر جا کر ڈھیر صلواتیں سنا آئیں گی اس غریب لڑکی کو جس کا رتی برابر قصور نہیں اس سارے قصے میں۔“

”اب تم سینا اور ڈھیر صلواتیں۔“ وہ جل کر بولیں۔ ”اور تمہارے ویسے ہم بھی سن لیں گے۔“

”افوہ اماں! ایسا کچھ نہیں ہوا، چسپا آپ سمجھ رہی ہیں۔“ وہ بیزار سی بولی۔ ”کون سا رشتہ جوڑ آئی ہوں میں۔ ذرا سی رائے معلوم کرنے گئی تھی وہ بھی قطعاً مثبت نہ ملی۔ بھابھی کو تو پتہ بھی نہ چلے گا۔“

”اچھا۔“ شفیقہ حیات کو قصے میں کچھ دلچسپی نظر آئی۔ ”منع کر دیا اس نے؟ چلو تو ٹھیک ہے۔ اب اسے اپنا بچہ پالنے کی فکر ہونی چاہیے کہ نو عمروں کے سے شوق کرے گی۔ ہاشم کا تو دماغ چل گیا ہے۔ گھر میں ایک سے ایک ہیرا لڑکی ہے لیکن وہی بات ہے دور کے ڈھول سنانے۔ گھر کی مرغی وال برابر۔“

مالک تھا۔ ربیعہ کو اپنا آپ اجنبی لگنے لگتا تھا۔

لیڈی: "اے ان لوگوں کی اسٹ سے نکال دیتیں جنہیں جینے کی تمنا کرنی چاہیے؟"

اس کی بات برائوں نے تدرے خفگی اور بے حد اذیت سے اسے دیکھا۔ غالباً ”وہ سمجھ رہے تھے کہ ربیعہ اپنی بچھلی زندگی کی کوئی بات جاننا چاہتی ہے“ اسی لیے انہوں نے بے حد بڑے پن سے اسے اجازت دی تھی اور اس نے اسے غصے سے دیکھ رہے تھے۔

”خیر تو ہے؟“ وہ ہنس کر پوچھا۔ ”کس بات پر آج ایقان کو بہت دن بعد ڈانٹ پڑ رہی ہے؟“

”ڈانٹ تو مجھے ستر برس کی عمر میں بھی پڑ سکتی ہے بھابھی جان!“ اور بے شک پڑے۔ میں محسوس نہیں کرتی۔ اماں ہیں میری مار بھی لیں تو کوئی بات نہیں آئیگی۔ وہ کہہ کر گزرتی رہا۔

”تو بیٹا! سچ تو یہی ہے کہ ہاشم رشتہ دے کہاں بہن کو روانہ کرے۔ تمہیں کیوں اتنی دور سے بھیج لایا ہے؟ اور اگر ماں بہن راضی نہیں تو پھر یہ سچ کیسے ہو گیا؟ پہلے گھر والوں کو تو منائے ماں سے توجیت کھائے یا دوسری مرتبہ کورٹ میں جکروائے گا تمہاری سہیلی سے۔“

وہ حنفی سے کہنے لگیں۔ ایقان چند لمحوں کے لیے چیپ سی ہو گئی۔  
 ”تم جوش میں آ کر مدعی سے زیادہ چست ہو جاتی ہو۔ خود بھی باتیں کرتی ہو“ نہیں سمجھتی ہو۔“  
 ”ویسے میں نا بھما بھی!“ ایقان نے بے لگم ہو کر بھلا کر کہا۔

اتنی؟ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں بنتا؟ اگر وہ اتنی شدید خواہش رکھتا ہے شہلا کے لیے تو اس کی ذرا سی اخلاقی ہند سے مجھے انکار کر دینا چاہیے؟ اماں کہاں ان معاملات کو سمجھ سکتی ہیں۔ دل کے معاملات سے تو انہیں یوں بھی پیرو باے؟ مہربانی ہو کی طرح۔“

عذرا بیگم تھیں۔ شفیقہ حیات کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ آگئی۔  
 ”ہاں بیٹا! درست کہا۔ پیر رہا ہے مجھے ان معاملات سے۔ تب ہی تھیں پیادہ راجا شرمیاں کے ساتھ۔ کوئی زور  
 دوستی نہ کی کہ بٹھی خوش تر رہے، ہنسنا اور کھا جا۔“

”نہیک ہی تو ہے۔“ عذرا بیگم بولیں۔ ”زندگی پاشم کو گزارتا ہے۔ اگر وہ ایسا چاہتا ہے تو بھلا بھی بیگم کو روڑے لگانے چاہیں۔ کیا حال ہوا تھا اس کا، بھول گئیں کیا وہ؟ میرا بیٹا اگر تیرے ساتھ کسی کو چاہے تو میرے ریل بیٹا بنے جاؤں اسے۔“

”آپ کا بیٹا ہے؟“ ایقان نے منہ بنا کر انہیں دیکھا۔ ”بیل ہے وہ تو، نازک احساسات سے اسے کچھ واسطہ۔ مجھے کتنا ہے۔“ اپنا تو یہ دُپار ٹمنٹ ہی نہیں۔“

یقیناً انے بے بسی سے ان کو دیکھا۔

ایک بات پوچھوں آپ سے؟ ”ڈرتے ڈرتے ام نے کہا تھا۔

یہ افراد عجیب پر اسرار تھے۔ کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ ربیعہ کو یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور سیارے پر  
وہ جہاں الفاظ اپنا مفہوم بدل چکے ہوں اور روسیے اپنی سمت کھو بیٹھے ہوں۔ ہر شخص ایک عجیب انداز کا



سب لوگ غصے میں رہتے ہیں، سوائے ترانہ کے۔ قصور بھائی تو کبھی کبھی بات کر بھی لیتے ہیں لیکن آپسے۔  
انے عجیب سے انداز سے دیکھ رہا تھا۔ ربیعہ جھینپ کر خاموش ہو گئی۔

\*\*\*

”ڈرازا سایا دپڑتا ہے مجھے۔ میں شاید تین برس کی ہوں گی یا چار برس کی۔ تمنا آئی مجھ سے دو برس بڑی تھیں  
ہم گھر کے صحن میں بھاگتے پھرتے تھے، دھندلے دھندلے سے خاکے بنتے ہیں ذہن میں اور مٹ جاتے ہیں  
پچھو بتاتی تھیں کہ آپ کی اچانک ہی شدید بخار ہوا۔ اتنا تیز بخار کہ لگتا تھا بدن کسی آگ سے جل رہا ہے۔  
دن کی کیفیت طاری رہی۔ امی ان کی چارپائی کی بیٹی سے لگی بیٹھی رہیں۔ انہیں آپ سے بے حد محبت تھی۔  
دن تک نہ آپ کے منہ میں دانہ گیا، نہ ہی امی نے کچھ کھایا پیا۔ تیسرے دن آپ نے تڑپ تڑپ کر جان دے  
دی۔“

ترانہ گلو گریں لہجے میں بولی۔

ربیعہ بھی افسردہ ہو گئی۔ وہ دونوں بڑے سے پرانے برگد کی چھانوں تلے بیچ پر بیٹھی تھیں۔ گھر کے  
نزدیک ہی تھا۔ آج ترانہ کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے یہاں تک آئی تھیں۔  
”اور پچھو؟“ ربیعہ نے سوگواروں سے پوچھا۔

”امی“ آپ کی موت کے بعد زیادہ عرصے زندہ نہ رہیں۔ آپ کا گھر اٹھ دھکی رہا کرتی تھیں، اکثر روتی  
کرتیں، اندر ہی اندر گھلتی گئیں۔ امی کی وفات سے تم کو بھائی کے دماغ پر برا اثر پڑا۔ انہیں راتوں میں جلنے  
عادت ہو گئی۔ آدھی رات کو نیند میں اٹھ کر جھٹ پر جلے جاتے تھے۔ ایک دن سیر میوں سے گر گئے، ٹانگ کی  
ٹوٹ گئی۔ کئی دن بستر پر پڑے رہے لیکن اباجی سے۔ ”وہ ایک گری سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔“

”اباجی بھی ہمارے بس اپنے نام کے ایک ہیں۔ مینا بستر پر دس دن تڑپ رہا لیکن اباجی کو اپنی بیٹی کی موت سے  
فرصت نہ ملی۔ پچھو ہی ترس کھا کر ایک دن کسی جراح کو بلا لائیں۔ اس نے الٹی کیدھی پی کر کھٹے اپنی ٹیسٹی اور  
چلتا بنا۔ بعد میں ہڈی کسی طور سیدھی نہ ہوئی، ہمیشہ کا نقص رہ گیا۔“

ربیعہ کے ذہن میں منور امین کا چہرہ اور ان کے الفاظ گھوم گئے۔  
”آخر کس باپ کی بیٹی ہو، یا سہا ہی مارو گی۔“  
وہ اپنے باپ کے متعلق کچھ نہ جانتی تھی لیکن وہ الفاظ اس کی زبان میں بڑے دھڑکتے ہوئے نکلے۔

”ترانہ!“ وہ کسی سوچ میں گم ہو کر بولی تھی۔  
”ہوں، کو؟“ وہ اپنی سوچ سے نکلی۔

”تم میرے متعلق کیا جانتی ہو؟ میرے امی ابو کے متعلق؟“ وہ نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔“ ترانہ کچھ  
دیر سوچی رہی۔ وہ گھاس کا تنکا چبانے میں مگن تھی۔

”میں سے کچھ زیادہ تو نہیں جانتی ربیعہ! بس مجھے یہ علم ہے کہ مینا پچھو، تمہارے ابو سے منسوب تھیں۔ اجو  
جہانزیب سے۔ میرے ماموں سے۔ پھر ماموں نے اچانک تمہاری امی سے شادی کر لی۔ تمہاری امی نے“

کچھ تذبذب کا شکار ہو کر خاموش ہو گئی۔  
”ہاں۔ بولونا۔“ ربیعہ نے اسے پکارا۔

اچانک ہی اس کا ذہن دوسری جانب متوجہ ہوا تھا۔ اس کے سامنے والی بیچ پر عباد بیٹھا۔ اپنے کسی دوست کے

ساتھ باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اس کی نگاہیں ربیعہ کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں پھر اس نے چند لمحوں بعد نگاہ  
بٹائی تھی اور اپنے دوست کی جانب دیکھنے لگا۔

ربیعہ کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے  
اس نے عرصے کے بعد کسی اپنے کو دیکھا ہو۔ خوشی کی سنسنی لہر کے زیر اثر وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ عباد نے اسے  
دیکھا ہوتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار ہی وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں لمحوں میں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

”آپ۔ عباد۔ آپ یہاں۔“ ربیعہ کا لہجہ بے قابو ہو گیا۔  
”میں۔“ اس نے ایک محتاط نگاہ پیچھے بیچ پر بیٹھی ترانہ پر ڈالی تھی۔ ”میں روزیہاں آتا ہوں ربیعہ!

روزانہ میں آپ سے بات کر سکتا ہوں نا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں؟“  
”مسئلہ؟“ ربیعہ نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ”اوہ نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ترانہ ہے۔ میری  
پھوپھی زاد بہن۔ وہ بہت اچھی ہے۔ آپ کچھ محسوس نہ کریں۔“

”مجھے بے چینی سی تھی۔“ تعینک گاڈ کہ آپ کو خیریت سے دیکھ رہا ہوں۔ نجانے کیوں ربیعہ! میں۔ میں  
ذہنی طور پر آپ سے انٹیج منٹ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کچھ اور خیال مت کیجئے گا۔ اس ایک ذرا سے سفر نے ان  
حال میں تعلق جوڑ دیا ہے ہمارے بیچ۔ میں اتنے دنوں پریشان رہا کہ قدرت نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی، پتہ نہیں  
میں۔ آپ سے نبھایا بھی یا نہیں۔ کبھی مجھے وہم ستاتے کہ میں نے ایک چھوٹی سی، معصوم سی، فرشتوں  
جیسی لڑکی کو ایسے ایک اجنبی گھر میں کیوں جانے دیا۔ کبھی میں سوچتا جا کر آپ کی خیریت دریافت کروں لیکن پھر  
خیال آتا کہ میرا آپ کا تعلق ہی کیا ہے؟ چند گھنٹوں کا ساتھ بھلا کب اتنا استحقاق بخشا ہے کسی نے کچھ غلط سمجھ  
لیا تو آپ کو مشکل ہو جائے گی۔ آپ سے میرے متعلق اٹے سیدھے سوال کیے جائیں گے۔ خیر، شکر ہے خدا کا۔  
خیریت ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”بھی کتنی مسکراؤ۔“ اتنی دیر تک وہ اسے بولتا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ اس کے لیے اتنا پریشان تھا، وہ اتنے  
دنوں سے سب سے زیادہ تھکتا ہے۔ وہ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ عباد کے چہرے سے روشنی اتر کر اس کی  
نگاہوں میں جذب ہو رہی تھی۔

”وہ نجانے کس چیز سے متغایب ہو کر بولی۔“ اور آپ اگر آتے تو مجھے کوئی مسئلہ نہ  
ہوتا۔ میں۔“ وہ نے میرا بھاگی ہے۔“  
عباد نے سب اختیار اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میں اتنے دنوں سے یہاں صرف تمہارے لیے آتا ہوں ربیعہ! اس امید پر کہ شاید تم کبھی یہاں آؤ، یہاں  
سے گزرو تو میں تمہاری خیریت معلوم کر لوں۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرائی۔  
”گھر والے کیسے ہیں؟“ وہ قدرے تذبذب کا شکار ہوا۔

”ٹھیک ہیں۔“ وہ یہی کہہ پائی۔ ”وہ ترانہ ہے نا، وہ بہت اچھی ہے۔ میرا خیال رکھتی ہے۔“  
”میرا نمبر ہے نا تمہارے پاس؟“

”ہاں، وہ کارڈ میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔“  
”میں۔“ اسکتا ہوں ملنے؟ تمہارے گھر؟“

ربیعہ نے چند لمحے سوچا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال مینا کا آیا۔

”میں ترانہ سے پوچھ کر بتاؤں گی۔ ہم کچھ دن بعد پھر آئیں گے یہاں۔“ عباد مسکرا دیا۔

”میں معلوم کیوں رہی تھی جیسے الہام ہوا ہو کہ قدرت نے ہمیں یونہی نہیں ملایا۔ میں سوتے سوتے تمہارے خیال سے جاگ اٹھتا ہوں۔ جیسے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری سوچی ہو خدا نے مجھے۔ بس اسی احساس کے زیر اثر میں نے گھر آنے کے متعلق پوچھا ہے۔“

”مجھے کوئی وہم نہیں ہے عباد بھائی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ گھر۔ میرا نہیں ہے۔“

”اٹس اوکے! اچھی لڑکی۔ اب چلتا ہوں پھر ملیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“

وہ مڑ کر اپنے دوست تک گیا پھر دونوں اٹھ کر پارک کی عقبی سمت چل دیے۔ ربیعہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”کون تھا یہ؟“ ترانہ کی آواز میں بھرپور حیرت تھی۔ ”یہاں لاہور میں تم کسی کو کیسے جانتی ہو؟“ ترانہ اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔

”ہم ٹرین میں ملے تھے ساتھ ہی لاہور اترے تھے اور تمہارا دوست ڈبے میں اپنے مری کی تھی۔“

”اوہ“ ترانہ معنی خیزی سے بولی۔ ”اور یہ حضرت یہاں کیسے گشت میں رہ رہے تھے؟“

”میرے لیے۔“ ربیعہ بھرپور اطمینان سے بولی۔ ”میں نے ان کو مختصراً اپنے متعلق بتایا تھا۔“

”گھر آنے کی ہمت نہ ہوئی جناب کی؟“ ترانہ کی شوخی معنی رکھتی تھی۔

ربیعہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اس کا کان پکڑ لیا۔

”مالی ڈیر ترانہ بی بی! اپنے یہ بڑے بڑے کان صاف کر کے سننا۔ کل نام عباد ہے اور میں اسے بھائی کہتی ہوں۔ بھائی۔ سناتم نے؟ عباد بھائی۔“

”اور وہ تمہیں ”منٹی“ کہتا ہے؟“ اس نے ناک چڑھائی۔ ربیعہ مسکرا دی۔

”چلو گھر چلیں۔“

وہ دونوں گھر کی سمت چل دیں۔ ربیعہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے باری بھائی کے ساتھ ہو۔ فضا صاف اور اجلی ہو۔

”پتا ہے ترانہ! میرے من کا موسم آج بہت بہت اچھا ہو رہا ہے۔“

”اپنے ”بھائی“ سے ملنے سے پہلے یا ملنے کے بعد؟“ وہ بے نیازی سے پوچھنے لگی۔

”ملنے کے بعد۔“ ترانہ ٹھٹھک کر رکی۔

”خدا کے لیے ربیعہ! یہ غضب مت ڈھانا۔ پیچھو اور صولت تمہیں کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے پر مجبور کر دیں گی اور تمہیں بھائی! خدا کی پناہ! ایسے ایسے سوال پوچھیں گے کہ تمہاری روح کانپ اٹھے گی۔ مجھے اس کا انتہائی برا تجربہ ہے۔“

ربیعہ خوفزدہ ہو گئی۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں عباد بھائی کو سختی سے منع کر دوں گی۔“

”ایک مرتبہ میں بہت بیمار پڑ گئی۔“ ترانہ بتانے لگی۔ ”باری میری خیریت پوچھنے گھر چلا آیا، بس سمجھو

قیامت ہی۔“ پیچھو تو اتنے دن تک۔“

”باری؟“ ربیعہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”باری کون؟“

”عبدالباری۔“ ترانہ جھنجھپ کر بولی۔ اس کے گل سرخ ہو گئے تھے۔

”گلستانِ دل کا مال؟“ ربیعہ نے شرارت سے پوچھا۔

اس نے شرعیہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دی تھیں۔

آج وہ پھر اسے لینے چلی آئی تھی۔ بلکہ گلہاں رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔ بے پردائی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اپنی اڑتی ہوئی زلفیں بھی سمیٹتی جا رہی تھی۔

موسم خالص خوبصورت ہو رہا تھا۔ عاشر اسے دیکھ گیا۔

”اے سسر! اس نے عاشر کو جھپٹا۔“ یہ تم مجھے اتنا گھور کیوں رہے ہو؟ لگتا ہے آج میں بہت خوبصورت لگ رہی ہوں۔“

”خلاف توقع فوراً مان گیا۔“ یہ لباس تم پر اچھا لگ رہا ہے اور اس موسم میں تم اچھی لگ رہی ہو۔“

”ابا! اچھا! اچھا! اچھا! اس کے چہرے پر موسم کے سب رنگ اتر آئے۔“

”عورت عورت ہے! عاشر مسکرایا۔“ ”کیا پاکستان کیا ولایت! لڑا! یہ تم عورتیں تعریف سے اتنا خوش کیوں ہو جاتی ہو؟“

وہ چند لمحے شرارت سے مسکراتی رہی پھر بولی۔

”جیسے تمہیں محبت کا مار سن کر مغرور ہو جاتے ہو! بس یہی بات ہے۔ اصل میں عاشر تعریف کرنے کا جذبہ نے مردوں میں اور تعریف کروانے کا جذبہ عورت کے دل میں، تم مرد اپنی ڈیولی بھول گئے تو عورتیں اولیں ہوتی ہیں۔ اب تم کہنا۔“

”اے سسر! تم جیسے مغرور مرد کو اپنی ڈیولی یاد آجائے تو ہم عورتیں تو خوش ہوں گی نا!“

”اے سسر! تو محترمہ کی تعریف نہ کرنا۔ زمین آسمان کے ملا نا ہم مردوں کی ذمہ داری ہے۔ واہ ویل

”اے سسر! تو محترمہ کی تعریف نہ کرنا۔ زمین آسمان کے ملا نا ہم مردوں کی ذمہ داری ہے۔ واہ ویل

”اے سسر! تو محترمہ کی تعریف نہ کرنا۔ زمین آسمان کے ملا نا ہم مردوں کی ذمہ داری ہے۔ واہ ویل

URDU PHOTO

برابری کا جذبہ پایا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مغرب کی عورت گھربانا نہیں جانتی، بسنا نہیں جانتی بچے نہیں پالتی، کیا نہیں کرتی مغرب کی عورت؟ تمہاری عورتیں تو جنت میں رہتی ہیں اپنے گھروں میں ملکوں کی طرح حکومت کرتی ہیں۔ کام ملازموں کے سپرد ہوتے ہیں اور گھر چلانے کی ذمہ داری مرد کی ہوتی ہے۔ ہم تو گھر میں بھی کام کرتے ہیں اور گھر سے باہر ملک چلانے میں بھی مرد کے شانہ بشانہ ہوتے ہیں۔ ابھی تو ترقی یافتہ ممالک کے عوام کہلانے کا لطف اٹھاتے ہیں۔“

”ویش اٹ۔۔۔ ویش اٹ!“ عاشق نے تالیاں بجائیں ”بھئی لا جواب کر دیا تم نے تو ایسے ایک بات پوچھوں لڑا؟ تم اکیلی کیوں ہو؟ میرا مطلب ہے تمہارے والدین بہن بھائی؟“

”میں بتا تو چکی ہوں تمہیں۔ ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ ہم تین بہن بھائی تھے دو بہنیں ایک بھائی بھائی، بی بی ازم سے متاثر ہو کر ساری دنیا میں مارا مارا پھرتا ہے اور میری بہن یو کے میں ہی سیٹل ہو گئی۔ مجھے کمپنی نے یہاں بھیج دیا اور یہاں تم سے ملاقات ہو گئی۔ یہی اسٹرائیکنگ موڑ ہے زندگی کا۔ اس سے آگے اب کچھ دیکھنے کی تمنا اگر ہے تو وہ ہے تمہارا ملک تمہاری بیوی۔“

”سنو عاشق! مجھ سے شادی کر لو!“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”میں بہت زیادہ سیریس ہوں تمہارے لیے۔“

”ننلا! میری بیوی مجھ سے بے پناہ عشق کرتی ہے۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”میری زندگی مکمل ہے اس میں کسی رنگ کی کمی نہیں ہے۔ تم اپنے آپ کو مجھ سے خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگے یہی ہمارے لیے بہتر ہے۔ بہت سوں کے لیے بہتر ہے۔“

”اگرچہ میں اس وقت تک یہاں ہوں رہیں گے۔ بس! اس سے زیادہ میں انور ڈ نہیں کر سکتا۔“

”وہ کچھ دیر بالکل خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد عاشق کا گھر آ گیا۔ لڑا نے پارکنگ ایریا میں گاڑی روکی۔“

”سنو عاشق! اچانک وہ بولی۔ ”تم نے مکمل شادی بیوی سے بے پناہ عشق کرتی ہے۔ میں منتظر رہی کہ تم کہو گے میں بھی اس سے بے پناہ عشق کرتا ہوں۔ میری زندگی میں وہ میری بہن ہے۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کہا۔ جانتے ہو کیا؟“

”میرا گھر نہیں ہوتا۔ اس میں ہمیشہ پورے دروازے ہوتے ہیں۔ اگر تم مجھے اس دروازے سے بلاؤ گے میں سب سے پہلی آ جاؤں گی! میری بات یہ تو برا کر رہا!“

وہ گاڑی ریورس کر کے تیزی سے لے گئی۔ اور عاشق اس کے الفاظ پر غور کرتا رہ گیا تھا۔



کروٹیں بدلتے بدلتے رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اسے کسی طور آرام نہ آتا تھا! نجانے من کو کیا بے کلی تھی۔

وہ بستر سے اتر کر دروازے تک چلی آئی۔ باہر لاؤنج میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ اوپری کمروں کی بتیاں بھی گل ہو چکی تھیں۔ ابھی کچھ دیر قبل علی اور حمزہ کے کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ لیکن اب وہ بھی بجھ چکی تھی۔ سب بتیاں گل ہو گئیں تو عریشہ کے من میں ایک چراغ کی روشنی ہوئی۔ اندھیرا پھیلا تو اس نے جانا کہ دل کو آج لگی ہوئی ہے کسی نے دل لگی میں اس کا دل ہتھیالیا تھا۔

چھوٹی سی تھی تو فروس بیگم دن رات رافع کے قصیدے پڑھا کرتی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی خوبیوں کا ذکر کرتیں۔ اس کا لانا قد انہیں بھاتا تھا اس کی خوبصورتی کی وہ مذاح تھیں۔ اس کے ادب و آداب سے وہ بے حد خوش رہتیں۔ عریشہ کا ذہن ماں کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ اسے بھی رافع اچھا لگنے لگا۔ محبت و محبت کی اسے سمجھ تھی نہ





”باری ملا تھا نا؟“ انہوں نے رازداری سے پوچھا۔  
 ریجہ خاموش رہی۔ وہ اپنی بلاؤں کے سر ڈالنے کی روادار نہ تھی۔  
 ”ترانہ سے ملنے آیا تھا؟ ترانہ نے بلایا تھا اسے یا خود آگیا تھا۔ دیکھو لڑکی مجھ سے تیزی طراری مت کرنا۔ ہم دھڑکتی ہوں موقع پر پھر کہیں کا نہیں چھوڑتی میں سچ کچھ کہو مجھ سے؟“  
 ”ہاں تو کوئی بھی نہیں آیا پیچھو!“ ریجہ نے اچانک ہی بے حد اطمینان سے کہا اور سر جھکا کر چادر صاف کرنے لگی۔  
 وہ چیخ کر رہ گئی تھیں۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔ وہاں ایک لڑکے نے تم لوگوں سے باتیں کی ہیں۔ مجھے بتایا ہے کسی نے۔“  
 ”جی ہاں۔“ اس نے سراٹھایا۔ ”ایک لڑکا ہم سے کسی کا پتا پوچھ رہا تھا۔ ترانہ سے نہیں مجھ سے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں یہاں کسی کو نہیں جانتی۔ یہ باری کون ہے پیچھو؟“  
 ”باری؟ اور تم نے پھر مجھے پیچھو کہا۔“ وہ چڑ گئیں۔ ”میں منع کرتی ہوں اور تم بولے جا رہے ہو بولے جاتی ہو تم کس قدر ڈھیٹ لڑکی ہو۔“  
 ”لیکن پیچھو اس میں حرج کیا ہے؟ وہ سکون سے پوچھنے لگی۔ ”کتنا اچھا رشتہ ہے۔“  
 ”بکو مست۔“ وہ اسے جھٹک کر کہیں سے باہر نکل گئیں۔  
 باہر صحن سے ان کے بڑبڑانے کی آواز آرہی تھی۔ ”خانی پر سے سوکے کپڑے جھلاتے ہوئے اپنا راز دہا رہیں۔ ریجہ نے اپنی مسکراہٹ دہائی۔

دوڑتے دوڑتے وہ پھر رک گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔  
 رافع نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔ دونوں ہاتھ پیچھے پر باندھے ہوئے سفید عمارت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔  
 رافع اس تک چلا آیا۔  
 ”اسے میاں راجھے۔“ اس نے ہاشم کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

وہ چونک اٹھا۔  
 ”میاں بس۔ جب اپنی بارات لاؤ تب رکنا یہاں۔ ابھی میرا خیال ہے ہم جا لنگ لڑے نکلے ہیں۔“  
 ہاشم نے اسے ایک چیت سے اسے نوازا۔  
 ”تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے صاحبزادے۔“  
 دونوں پھر دوڑنے لگے۔

”معاملہ کہاں تک پہنچا؟“ رافع نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔ ”تم آج کل بہت خوش نظر آتے ہو؟“  
 ہاشم نے اس کی بات کا ثبوت فوری طور پر مہیا کیا۔ وہ مسکرائے لگا۔  
 ”اس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔“ وہ جھک کر پیروں کو چھونے لگا۔  
 ”تو ٹھیک ہے۔“ رافع نے بھی اس کی تقلید کی۔ ”اب تمہارا بوتھا ایسا تو ہے نہیں کہ ایک خوبصورت باؤ قار خاتون فوری طور پر“ ہاں“ کہہ دے۔ اسے یقیناً کافی سوچنا ہوگا۔“  
 ”ہا ہا ہا۔“ اس نے ہاشم کو چڑاتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ”ہا ہا۔ شاعر نے کہا ہے۔“

”سوچو۔“ جب میرے بارے میں تنہائیوں میں  
 ”نفسر باؤ“ میرے بھی میری پرچھائیوں میں  
 جانتے ہو رافع! اس نے میرے اعتراف کا اظہار کا لفظ لفظ سنا۔ پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے انکار نہیں کیا وہ برہم نہیں ہوئی کہے برا نہیں لگا۔ یہ خوشی کیا کہ میرے لیے؟“  
 رافع مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ دونوں بیچ پر جا بیٹھے۔  
 ”رافع! تو اظہار کی طمانیت اور خوشی سے ناواقف ہے! کاش تو واقف ہوتا! میرے اندر جو خوشی ابھرتی ہے میں تجھ سے شیر کرنا چاہتا ہوں لیکن کر نہیں سکتا۔“  
 اس نے تانسف سے سر ہلایا۔

”کیوں نہیں کر سکتے؟“  
 ”اس لیے کہ تجھے تجربہ نہیں ہے۔ جب تو نے کسی کو چاہا ہی نہیں تو تجھے اظہار کی خواہش اور اس خواہش کی بے پناہ شدت کے کرب کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یا رافع! تو چاہتا کیوں نہیں کسی کو؟“ رافع دور سفید سے نیلے ہوئے مکان کو دیکھنے لگا پھر بیچ سے سر ہٹا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔  
 ”مجھے پوچھنا چاہتا ہے پورے خاندان سے۔“ پھر مسکرایا۔  
 ”میرا چاہنا تو نہیں چاہتا مگر تو میرا یہ ہے نا۔“  
 ”ہاں۔ میں ابھی رہا ہے۔“

”کیا رافع نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔  
 ”میرا کیا پتا ہے! رک کا مزد۔“ وہ مزے سے بولا۔

خدا نے قلعہ بند نہیں کیا۔  
 ”چل۔“ وہ بے چارہ! ہم بند رہی سہی! ایسی اور ک کے مزے کیا لیتا جو منہ کاٹ کر رکھ دے۔ بالی دا  
 ”آپا! اب تو بات کرنا ہے تم سے؟“  
 ”ہاں۔“  
 ”تم ضرور میرے خیالوں کا مزہ لے رہے ہو۔“  
 ”نہیں۔“

”مجھے صرف اس کی پروا تھی یا ر! وہ مان جائے تو کوئی مشکل، مشکل نہیں اور رہے یہ چھوٹے موٹے معرکے تو وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے۔“  
 ”معرکہ گرم تو ہو لینے دو تو نر نری کا پلے تلواری کے نیچے تم جی جا بیٹھیں گے! رافع ہاشم کی آنکھوں میں کچھ دیر دیکھتا رہا پھر نری سے مسکرا دیا۔  
 ”یار راجھے سچ کچھ کہوں؟“  
 ”ہوں۔“ ہاشم نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ”خیریت؟“  
 ”بھئی بھئی مجھے کبھی تم پر بہت رشک آتا ہے۔“  
 ”ہاشم نے؟“ ہاشم کھلکھلا دیا۔

موتوب سے انداز میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ہولے سے کتبکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس نے ہمت مجتمع کی۔

”ابو جی! آپ نے بلایا تھا؟“

فاروق حسن نے چشمے کی اوٹ سے اسے دیکھا اور کتاب بند کر دی۔

”آئیے! میاں صاحبزادے! بیٹھے! کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“

”گھر ہی میں ہوتا ہوں ابو جی۔“ وہ ان کے مقابل جا بیٹھا۔

”ماں تو آپ کی آپ کے ذکر پر بردہ لگتی ہیں۔“ انہوں نے غور سے ہاشم کا چہرہ دیکھا۔ ”بیٹوں کے بیٹوں کے متعلق اندازہ ان کی ماؤں کے انداز سے لگا لیتے ہیں ہاشم! آج کل آپ کی اماں آہ سے خوش نہیں ہیں۔ کیوں؟ وضاحت کریں گے آپ؟“

ہاشم نے ایک نظر اٹھ کر دیکھا۔

”نہیں! میں کیا وضاحت کروں ابو جی؟ ای نے مجھ سے تو کبھی ذرا نہیں کیا اپنی ناراضی تاہاں! اگر آپ کی وجہ بھی بتائیں تو میں ضرور وضاحت کر سکوں گا۔“

”آپ کے سر پر سہرا سجانے کی خواہش مند ہیں وہ اور آپ کا زکارتی؟“ وہ بہت توجہ سے بیٹے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

”میں ہرگز انکار نہیں ہوں ابو جی! میں تو خود شادی کا خواہش مند ہوں۔“

”اچھا! ثانیہ سے شادی کریں تمہاری؟“

”جی!۔“ حملہ اچانک ہوا تھا وہ گڑ بڑا گیا۔ ”نہیں ابو جی! میں ثانیہ سے ہرگز شادی نہیں کر سکتا۔“

عریشہ جیسی تہہ۔۔۔

”نہیں ابو جی!۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”وہ بھی عریشہ جیسی لگتی ہوگی۔ اچھا۔“ انہوں نے چشمہ اتارا۔ ”ڈاکٹر شہلا کے علاوہ کوئی ایک اور مجھے کوئی ایک لڑکی جو عریشہ جیسی نہ لگتی ہو تمہیں۔“

”ابو پلینز۔“ اس نے سر جھکا لیا۔ ”میرے جذبات کا مذاق مت اڑائیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ آپ نے سچ کہا میں ڈاکٹر شہلا کے علاوہ کوئی نام نہیں لے سکتا۔“

”تم فیصلہ کر چکے ہو؟“ انہوں نے کب بھیج لیے۔

”جی۔“ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ ہاشم کو اپنے چہرے پر ان کی نظریں بخوبی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ حتی الامکان سیاہ چہرہ لیے بیٹھا رہا۔

”اس لڑکی کا ہاضی ٹھیک نہیں ہے ہاشم! دفعہاً وہ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

”ہاضی؟“ ہاشم نے حیرت سے ان کی بات کاٹی۔ ”کیا ہوا ہے اس کے ہاضی کو ابو جی! اس نے شادی کی چلیں

مان لیا۔ پسند سے کی ٹھیک ہے اسے طلاق ہو گئی اور اس کے پاس اس کی پہلی شادی کی نشانی بھی موجود ہے، لیکن

ان سب باتوں سے کہیں یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس کا ہاضی درست نہیں تھا۔ خدا نخواستہ وہ کوئی کریٹ لڑکی تھی۔ اس نے غلطی کی۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اسے قدرت کی جانب سے غلطی کی سزا مل گئی۔ اب وہ آئینے کے مانند صاف، پتھدار کردار رکھتی ہے گزرے ہوئے پانچ سال اس بات کا ثبوت ہیں۔ بابا! ایک مطلقہ بچے کی ماں سے شادی اگر کوئی بری بات ہوتی تو ہمارے پیئیر کی زندگی میں اس کا نشان نہ ملتا۔ ہم تو ان کی خاک پا بھی نہیں پھر ہم کیوں ایسا گمان رکھیں؟ بخدا کسی مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اس چیز کو غلط سمجھے برا کہے۔

فادق حسن کی نظروں میں ابھرنے لگی۔ چشمے کی کافی منہ میں دبائے وہ اسے دیکھتے رہے۔

”تمہاری ماں کو کون سمجھائے گا؟ وہ اس لڑکی کا نام سننا پسند نہیں کرتی۔“

”ہیلے! اس“ جانب سے کوئی مثبت جواب آجائے بابا!۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”امی سے پھر بات کر لیں گے۔“

”وہاں کھلاؤ چکے ہو؟“ انہوں نے اسے گھورا۔

وہ گڑ بڑا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

”پچھپچھو کو بھیجا تھا یونہی ذرا رائے معلوم کرنے کے لیے۔ کوئی رشتہ تو نہیں بھجوا یا بابا میں نے۔“

”رشتہ بھی بھجواؤ تو ہم کیا کر لیں گے بر خوردار۔“ انہوں نے چشمہ پھر لگا لیا۔ ”بہر حال اپنی والدہ صاحبہ کو آپ کا کام ہے مجھ سے یہ درو سری نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ۔۔۔“

چند لمحوں کے بعد۔۔۔

زیادتی ہو جائے۔

آسانی سے۔۔۔

پتھر سے۔۔۔

مگر۔۔۔

رکھا ہوا۔۔۔

افیقہ کمرے میں۔۔۔

”غون۔۔۔“ وہ سخت بگڑی ہوئی تھی۔

”کس کا؟ ہاسپٹل سے؟“ اس نے چاور ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

”پاگل خانے سے۔۔۔“ مینٹل ہاسپٹل سے۔۔۔ داغی مریض آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ وہ بھینسی ہوئی شیرینی لگ رہی تھی۔

”کیا مطلب؟“ وہ گم صم سی ہوئی۔ ”ابراہار کا فون ہے؟“

”جی ہاں۔۔۔“

”کیا کہتا ہے؟“ اس کا دل اندیشوں کا شکار ہوا۔

”عمر کو لینے آ رہا ہے۔ کہتا ہے تیار کر دیں۔“

شہلا چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر وہ پھر کراٹھی۔ تن فٹن کرتی وہ فون تک پہنچی۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ وہ فون اٹھا کر دھاڑی۔ ”کیا چاہتے ہو ابراہار جیلانی؟ مجھ سے میرا بچہ چھین لینا چاہتے ہو اپنے سات جنموں کے بدلے چکانا چاہتے ہو؟ تڑپا تڑپا کر میری بے بسی کا تماشا دیکھ کر جان لینا چاہتے ہو میرا ٹھیک ہے میں بھی دیکھتی ہوں تم کہاں تک جا سکتے ہو لے جاؤ اسے لے جاؤ۔ تمہارا بیٹا ہے نا وہ میری سب سے ہستی پر تمہاری نوازش کے لمحوں کا ثبوت۔ ٹھیک ہے لے جاؤ اسے۔ میں سک سک کر جان دے دوں گی۔ لیکن تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی۔ رو رو کر اندھی ہو جاؤں گی، لیکن تمہاری چوکھٹ کو سجدہ نہیں کر سکتی۔“

وہ دم بخود اس کو سن رہا تھا۔

”شہلا! اس کے خاموش ہونے پر وہ آہستگی سے بولا۔ ”آئی ایم سوری، میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ یقین جانو میں ایسا کچھ نہیں چاہتا جیسا تم سوچ رہی ہو۔ بخدا میں تو صرف عمر کی محبت سے مجبور ہو کر چند گھنٹے کے ساتھ گزار کر سکون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم اس طرح سے سوچو گی مجھے اندازہ نہ تھا۔ بھلا میں تم سے کب بات کا بدلہ لوں گا؟“

وہ چپ ہو کر گھرے گھرے سانس بھر رہی تھی۔

”کہاں تھے تم؟“ پھر وہ بولی۔ ”اتنے سالوں سے کہاں تھے؟ وہ اٹھا ہوا اس نے گھنٹوں پہنا سیکھا ہے ہوا قدم اٹھاتا سیکھا، ماں کہنا سیکھا اپنے گشہ باب کے بارے میں سوچا سیکھا۔ اتنے عرصے میں کہاں تھے ابراہار؟ اب تمہیں اس کی یاد آئی جب اس کا معصوم ذہن ہر طرح کے گمان سے پاک تھا۔ اس کا سوال اس کے جواب بن کر آئے ہو؟ یہ محبت پہلے کہاں تھی؟“

اس نے گہری سانس بھری تھی۔

”شہلا! پچھلے سال بابا سا میں چل بسے اور چند ماہ قبل اماں بھی رخصت ہو گئیں۔ بابا نے مجھے قسم دی تھی تم سے کوئی رابطہ نہ رکھنے کی، وہ تمہاری اولاد کو اپنی جائیداد میں سے کوئی حصہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے جیتے رہنے میں مجبور تھا۔ لیکن اب میں مجبور نہیں ہوں۔ میں اس سے مل سکتا ہوں، اسے چاکر کر سکتا ہوں۔ اسے اس کا ہاتھ حق دے سکتا ہوں۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں میں باقی زندگی بھی دل پر پتھر رکھ کر گزار سکتا ہوں۔ تم خوش رہو۔“

شہلا کا گلا رندھ گیا۔

”بہت پروا ہے تمہیں میری خوشی کی؟“

**PHOTO**

”ہاں ہے۔“ وہ بولا۔ ”تم یقین کر دیا نہ کرو۔ جس بیٹے کو میں نے کبھی دیکھا، چھوٹا نہ تھا۔ اس کی محبت نے مجھے اتنا عرصہ کیوں پریشان رکھا۔ اس بات کا جواب میں اکثر خود سے پوچھتا ہوں۔ تم بھی خود سے پوچھنا دیکھو کیا جواب ملتا ہے۔“

شہلا سے کچھ بولا نہ جا سکا۔

”میں فون رکھتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تیار کر رہی ہو؟ اسے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لے جاؤ۔“

اس نے گہری سانس بھری تھی۔

”اب تک نہ کسی ہی ہو۔“

شہلا نے ریسیور رکھ دیا۔ ہل میں بے تماشا درد محسوس ہوتا تھا۔ آنکھوں میں بے حد و حساب جلن تھی۔ وہ آ دیر کھڑی اپنی سکیوں کا گلا کھولتی رہی۔

”السلام علیکم۔“

بابا دار کو آواز پر حقیقہ حیات اور عذرا بیگم دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

فردوس بیگم اپنا بھاری بھر کم وجود سنبھالنے چلی آ رہی تھیں۔

”و علیکم السلام۔ جیسی رہو۔“ حقیقہ حیات مسکرا میں۔ ”کہو! اچھی ہو۔“

”شکر ہے۔“ ان بیٹھ گئیں۔ ”بس یہ جوڑ بے کار ہوئے جاتے ہیں۔ جلتے پھرنے کے نہ رہے ہم۔ آپ تو ایسی

رو نہیں بس چھوٹی بہو کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہم صورت کو ترستے ہیں ایک ہی گھر میں رہ کر۔“

”ارے بی! اب اس عمر میں کیا روٹھنا، ماننا اپنے دن پورے کر رہے ہیں۔ یہاں دن کٹے کہ وہاں کٹے بس چل

چلاؤ گا۔ قتب۔ تم اپنی ساؤ با فاروق حسن کیسے ہیں؟ دو دو تین تین دن ماں کو پوچھنے نہیں آتے؟ بیٹے سے اچھے

میرے پوتے ہیں۔ دن میں دس چکر لگاتے ہیں۔“

”آپ ہی کے بیٹے ہیں وہ میری تو ایک نہیں سنتے۔“ وہ بیزار سی بولیں۔ ”ابھی بھی علی کا پتا کرنے آئی

تھی۔ بیٹے کے بل کی آخری تاریخ ہے وہ لگ جائے گی کیا کہتے ہیں جرمانہ سوز پیر اور پھر نا پڑے گا۔ ابھی تو باوا

بھرتے ہیں تو فکر نہیں انہیں اپنی جیب سے بھرے گا تو میا یاد آئے گی۔ اسے ہاں۔“

وہ بیاؤں داسے نہیں۔

”ارے بی! ابھی نہیں آرہے؟“ انہوں نے گردن گھمائی۔

”دونوں پورے ہو گئے ہیں۔“ عذرا بیگم نے جواب دیا۔ ”علی اور حمزہ کی کلا میں شروع نہیں ہو گئیں؟“

”کیا خبر ہے؟“ پوچھ رہی تھی کالج بھی ان کے باوا کی جاگیر ہوئے۔ جب جی ہو امنہ اٹھا کر چل دیتے ہیں ورنہ بے

ہوتے قتل طرح سے ہوتے ہیں۔“

”اچھا! چلی گئی ہو۔“ ایک صلاح دو۔ ”حقیقہ حیات اچانک ہی بول پڑیں۔“

انہوں نے نظروں کی نظروں میں عذرا بیگم سے اجازت چاہی۔ وہ مسکرا کر رہ گئیں۔

”بھئی! ابھی نہیں ہو گئیں۔“

”ہم نافع سے ملے۔“ طرف۔ ”انہیں نہ آئیں؟“

وہ قہر کر لے ہوئے۔ ”بھئی! ابھی نہیں ہو گئیں۔“

”ارے بھئی۔ عرشہ کا ہاتھ مانگتی ہیں عذرا بیگم تم سے اپنے نافع کے لیے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

”کہو تم راضی ہو؟“

اندر آئی ہوئی ناعمہ کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ کان کھڑے کر کے سننے لگی۔ فردوس بیگم تذبذب کا شکار

تھیں۔

”اب اماں! ایسے جلتے پھرتے کیا جواب دوں۔ آپ کے بیٹے کی رائے لینا بھی ضروری ہے۔ پھر ہی کچھ کہہ پاؤں

گی۔ ویسے مجھے تو نافع بھی پسند ہے۔ اپنا گھر کا بچہ ہے۔ نظروں کے سامنے ہی پلا بڑھا ہے۔ لیکن پھر بھی۔“

”ہاں ہاں فردوس! تم تسلی سے سوچو۔“ حقیقہ حیات نے انہیں مطمئن کیا۔ ”ہم تو یونہی ذرا ذکر کر رہے تھے تم

سے۔ تم سوچ سمجھ لو۔“

ناعمہ پلٹ کر بھاگی۔ ایک اچھی خبر اس کے ہاتھ لگی تھی۔

خیالی رکھتے ہیں۔ دود کاغذیں اور ایک گھر اس کی ملکیت ہے۔ حاکم چچا کو دکانوں کا کرایہ لانے کی ذمہ داری سونپ کر وہ قدرے فکر و غاش سے آزاد ہو جاتی ہے۔ بوا سیکھنے بھی پڑوس ہونے کا حق بھر پور طریقے سے ادا کر رہی ہیں لیکن ان کی گفتگو میں رجبہ کو تلخ حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر بیچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریدار ان کا بہنوئی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔

رجبہ متوا۔ ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرا میں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے رنگ میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے ایک شہابت محسوس ہوتی ہے۔ یہ بوسیدہ خطوط میں جفتے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلقیس باغیچہ کی پھوپھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں سنبھوہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شہلا کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے سے بات کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔ رجبہ اپنی تنہائی اور لوگوں کے بدلتے رویوں سے تنگ آگئی ہے۔ پھوپھو کے گھر لاہور جانے کا ارادہ کرتی ہے۔ جس میں رجبہ کی ماں قات غبار سے ہوتی ہے۔ یہ بیان کر کے رجبہ کی آنکھوں میں آنسو کی پھپھو کے گھر تنگ رہنمائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔

۱۲

بارہویہ قیصر

”فدنا شک نیونسہ“ وہ چلا جگ گا کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ چائے پیتی ہوئی رابعہ بیگم اور کڑھائی کرتی ہوئی وردہ چوٹک اٹھیں۔ ”لوکی!“ رابعہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”چلا وہ ہو کیا؟ پلک جھپکی حاضر پلک جھپکی غائب! ابھی تو تم ٹانیہ کی طرف گئی تھیں۔“

”گئی تھی ای جان اب بالکل گئی تھی۔ وہیں سے تولائی ہوں چپٹی خبر اس نے بچھا رہی۔“ ”ہاں۔ دیکھ آئی ہوگی کوئی نیا سوٹ یا نئی ڈش۔“ وردہ نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ ”تمہارے لیے تو یہ بھی ”خبر“ ہوتی ہے کہ ٹانیہ نے بہت اچھا سوٹ سلوایا ہے اور پھر اس ”خبر“ کے ساتھ ایک عدد فرمائش ٹانک کراچی کو سنا دیتی ہو۔“

”جی نہیں جناب! اس بار میں اصلی سے سچی خبر لائی ہوں۔ میرے ان بے گناہ کانوں نے خود سنا ہے۔ لیکن جانیے! میں نہیں سنا آپ لوگوں کو۔ یہاں تو کسی کو کوئی دل چسپا ہی نہیں۔“ ”ہاں نہیں ہے ہمیں پرانے گھروں کی باتوں میں دل چسپی!“ رابعہ بیگم نے اسے گھورتے ہوئے جانے کا مھونٹ بھرا۔

”پرایا گہ؟“ اس نے احتجاج کیا۔ ”میں سلجوق ماموں کی طرف گئی تھی۔ وہاں ثانی امی اور فردوس ممانی۔ خیر جانیے میں نہیں بتائی۔ رائے آئی ہو تیس ٹانیہ تو اتنے ذوق و شوق سے پوری بات سنیں۔“ وردہ آئی تو بالکل ہی بوا

اس نے ناک چڑھا کر کہا۔ وردہ کو ہنسی آگئی۔

”اچھا چلو۔ بکواب!“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”میں بے حد دل چسپی سے سن رہی ہوں۔“ ”پتا ہے کیا۔“ وہ پھر بڑبڑا جوش ہو گئی۔ ”ثانی امی عرصہ کا رشتہ مانگ رہی تھیں نافع بھائی کے لیے۔“ ”اچھا!“ وردہ چونک اٹھی۔

”واقعی؟“ رابعہ بیگم نے بھی دل چسپی لی۔ ”پھر بھابی جان نے کیا کہا؟ وہ تو بڑی خفا خفا سی رہتی ہیں عذر راجہ بھابی سے۔“

”انہوں نے کوئی خفا خفائی نہ لگی نہیں دکھائی۔“ وہ مزے سے بولی۔ ”بلکہ ان کا تو دل چاہ رہا تھا فافٹ ”ہاں“ کہہ دیں۔ بس ضبط کر گئیں۔“

”بد تمیز!“ وردہ ہنس پڑی۔ ”تم نے ان کے اندر جھانک کر دیکھ لیا؟“

”میں نے تو کمرے میں بھی نہیں جھانکا۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”باہر ہی کھڑی تھی۔ لیکن ان کی آواز میں جو بے تابی اور خوشی تھی میں اسی سے سمجھ گئی کہ ممانی جان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔“

”طلب؟“ رابعہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”یہ تم ساری گفتگو چھپ کر سن رہی تھیں؟ کہاں تھیں تم؟“ ”ای۔ جی! میں کوئی ارادہ تھوڑا ہی تھا چھپ کر سننے کا۔ میں تو سچ سچ ٹانیہ سے ملنے ہی گئی تھی لیکن جب میں گھر آئی تو مجھے ممانی جان کی آواز آئی۔ وہ تو میری صورت سے چڑتی ہیں۔ اسی لیے میں نے واپس آئے کا اعلان کیا تب ہی کچھ جملے میرے کان میں پڑ گئے۔“

وہ معصومہ بن کر وضاحتیں دینے لگی، لیکن رابعہ بیگم اسے کڑی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وردہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑی۔ ”وہ اپنے بچے کی جانب متوجہ ہو گئی جس پر وہ پھول کاڑھ رہی تھی۔“

”غصہ! تم نے اسے بد عزت کیا؟“ ”نہیں۔“ ”ذرا لے جاؤ۔“

”کس انداز سے؟“ ”کچھ لیتا تو کیا خیال کرتا تمہارے متعلق؟ یہی سوچتا کہ ماں نے ایسی تربیت کی ہے بھابیوں کے گھر میں پورے لینے کے لیے۔“

”پوری بات سن کر آئی ہو اور کتنی باتیں سن لیں۔“ ”ایک آدھ جملہ سنا جاسکتا ہے۔ جس کا کوئی منہ موزم نہیں۔“

”کیا، ہالو کیس کی۔“ ”وردہ نے اسے چڑایا۔

”بیٹے!“ رابعہ بیگم اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر نرم پڑ گئیں۔ ”جس طرح پیسے چوری ہوتے ہیں اسی طرح بات بھی چوری ہوتی ہے۔ تم بات چرا کر لائی ہو۔ اتفاقاً“ ”سنا تھا تو اپنے شک رکھتیں، ہمیں بتانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”وہ بھی چکارے لے لے کر۔“ ”وردہ نے اضافہ کیا۔

”دیکھیں نا امی۔“ وہ آخر کار بے طرح چڑ گئی۔ ”یہ آپلی! مجھے کیوں چھیڑ رہی ہیں۔“

”اسی سے عقل سیکھو۔ اتنی سمجھ دار بنی ہے میری۔ اور تم ہو کہ ہر دوسرے منٹ ڈانٹ کھاتی ہو۔“ ”اچھا سو رہی۔“ وہ منمنائی۔



ورد مسکراتے ہوئے اسے نظروں ہی نظروں میں گویا جیسٹرنے لگی۔  
 ”میں عریضہ کے پاس جاتی ہوں۔“ اچانک ہی اسے نیا خیال سوچھا۔ ”نکھوں تو اسے علم ہے یا نہیں۔“  
 ”میٹھو آرام سے۔“ رابعہ بیگم نے پھر ڈانٹ پلائی۔ ”بھی کیا بات سمجھائی ہے میں نے۔ اس کان سے سنی اور  
 ذرا سا غور کیے بغیر اس کان سے نکال دی۔ خبردار جواب اس بات کا ذکر کسی سے کیا تو۔“

”لیکن امی! اسے تو بتانا ہی چاہیے۔“  
 ”ہاں تو اس کی ماں بتائیں گی۔ باپ بتائیں گے۔ تم کہیں خوشی میں دوڑی بھاگی جاتی ہو؟ دیوانی کہیں کی۔ اس کا  
 ماں جب پوچھے گی کہ تمہیں کس فرشتے نے آکر اطلاع دی تھی تب کہنا اسے کہ چھپ کر بات سنی تھی۔ اچھڑ  
 عزت افزائی ہوگی تمہاری۔“

”اچھا نا۔“ وہ نجل ہو گئی۔ ”آرام سے سمجھا دیا کریں نا۔ غصہ کیوں ہوتی ہیں۔“  
 ”آرام سے سمجھنے والی ہو تم؟“ انہوں نے مزید گھورا۔  
 ”ناعمہ نے سر جھکا لیا اور وردہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔  
 ”دیکھ لوں گی۔“ اس نے مکا دکھایا۔

آج وہ نہانے کے بعد لیمن کلر کا جکن کا سوٹ پہن کر باہلی کھانے چھت پر پہنچی۔ موسم اچھا ہو رہا تھا۔  
 آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے اُدھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ ہو گا بھی خوب چل رہی تھی۔ اکثر گھروں کی چھتیں آبا  
 آ رہی تھیں۔ آسمان پر رنگ برنگ پتنگوں کا جھوم تھا۔ ربیعہ سر اور پر کے انہماک سے پتنگوں کی لڑائی دیکھنے لگی۔  
 اچانک ہی اسے غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ آسمان سے پھٹکتی اس کی نظر برابر میں کھڑے تصور پر پڑی۔  
 ”نجانے کس وقت بالکل خاموشی سے اس کے بے حد قریب سے کھڑے ہو گیا تھا۔  
 وہ ڈھیر آکر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تصور خنسے لگا۔  
 ”کیا ہوا؟“ ڈر گئیں؟“ وہ چند قدم مزید آگے آگیا۔

ربیعہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے فوراً بولی۔  
 ”میں تو بھوت سے نہیں ڈرتی“ آپ تو انسان ہیں۔“ وہ قدر در قدر بولی۔  
 پھر وہ دانستہ رخ موز کر چھت کے دو سری جانب چلی گئی۔ تصور سے وہ اکثر ایسی مذاق لیتی تھی۔ تمدن کی بس  
 وہ خاصا بے ضرر اور شوخ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن آج اس نے عجیب حرکت کی تھی۔ ایسی حرکت جس پر واضح طور  
 پر کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

ربیعہ کو بدریا د آگیا۔ وہ بھی اکثر جان بوجھ کر بالکل قریب آکر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اتنا قریب کہ ربیعہ کو جھجک کر  
 ہٹنا پڑ جاتا۔ شاید صنف مخالف کو یوں جھجکتا کر مروانگی کو کسی قسم کی تسکین ملتی ہو۔  
 ربیعہ کا خوشگوار موڈ اچانک ہی خراب ہو گیا تھا۔ شاید تصور کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اس سے قدر  
 فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

”پتنگیں اچھی لگتی ہیں تمہیں؟“ وہ خوش دلی سے پوچھنے لگا۔  
 ربیعہ نے چند لمحے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے اپنی غلط حرکت کا احساس ہو جائے۔  
 خاموش کھڑی رہی۔

”بھی اڑائی ہے پتنگ؟“  
 ”نہیں۔“ وہ مختصراً بولی۔

”آتا ہی نہیں ہو گا اڑانا! وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔ ”سیکھو گی تو آجائے گا۔ میں سکھا دوں گا۔“  
 ”مجھے شوق بھی نہیں ہے۔“ وہ ہنوز خشک لہجے میں بولی۔

”اچھا اچھا۔“ ہاں لڑکیوں کو کم ہی شوق ہوتا ہے۔ ”وہ بے وجہ ہنسا۔ ”لڑکیوں کو تو اور ہی طرح کے شوق ہوتے  
 ہیں۔ تجھے سنو رتنے کا شوق، گورا ہونے کا شوق، بال بڑھانے کا شوق، ترانہ کو بھی بال بڑھانے کا شوق ہے اور وہ  
 صولت ہا ہا ہا۔“ سنجی کبوتری۔ اس کے بال ایسے ہی ذرا ذرا سے رہتے ہیں۔ بڑھتے ہی نہیں۔ ہا ہا ہا۔“  
 پھر وہ سنجیدہ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں ربیعہ! اتنے لمبے، اتنے سیاہ، اس قدر ملائم۔“ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ  
 ہاتھ بڑھا کر اس کے بال چھو لیتا۔

ربیعہ تھلا کر رہ گئی۔ اس نے کب کسی مرد کے لبوں سے ایسی بے باک تعریف سنی تھی کہ اس نے خفگی بھری  
 نظروں کی جانب دیکھا۔

”نجانے کس نے ایسی طرح کی باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔“ اس نے حتی الامکان پرسکون رہنے کی کوشش  
 کرتے ہوئے کیا۔

”اچھا اچھا۔“ وہ پھر بے وجہ ہی ہنسنے لگا۔ ”لڑکیوں کو تو تعریف بہت پسند ہوتی ہے۔ تمہیں پسند نہیں۔ خیر کیا  
 پسند ہے تمہیں؟“

”کبھی کبھار اس کا نام۔“ اس نے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بھی بھی کی جی چاہ رہا تھا اس لیے اوپر آئی تھی۔“  
 ”نجانے کا چہرہ کچھ۔“ وہ اس کے مطلب سمجھ گیا تھا۔

”میں نے چاہا تھا، پتنگیں دیکھنے۔“ مجھے علم نہیں تھا کہ اوپر تم ہو۔“  
 ربیعہ حاکم کی دھن پر سٹی بجاتا تھا، پھر آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا

وہ سری جانب چلا گیا۔  
 ”سری جانب چلا گیا۔“

ربیعہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے فوراً بولی۔  
 ”میں تو بھوت سے نہیں ڈرتی“ آپ تو انسان ہیں۔“ وہ قدر در قدر بولی۔

پھر وہ دانستہ رخ موز کر چھت کے دو سری جانب چلی گئی۔ تصور سے وہ اکثر ایسی مذاق لیتی تھی۔ تمدن کی بس  
 وہ خاصا بے ضرر اور شوخ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن آج اس نے عجیب حرکت کی تھی۔ ایسی حرکت جس پر واضح طور  
 پر کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

ربیعہ کو بدریا د آگیا۔ وہ بھی اکثر جان بوجھ کر بالکل قریب آکر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اتنا قریب کہ ربیعہ کو جھجک کر  
 ہٹنا پڑ جاتا۔ شاید صنف مخالف کو یوں جھجکتا کر مروانگی کو کسی قسم کی تسکین ملتی ہو۔

ربیعہ کا خوشگوار موڈ اچانک ہی خراب ہو گیا تھا۔ شاید تصور کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اس سے قدر  
 فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

”پتنگیں اچھی لگتی ہیں تمہیں؟“ وہ خوش دلی سے پوچھنے لگا۔  
 ربیعہ نے چند لمحے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے اپنی غلط حرکت کا احساس ہو جائے۔  
 خاموش کھڑی رہی۔

ربیعہ نے سنک میں ہاتھ دھوئے اور کھڑکی تک چلی آئی۔  
 ”کیا ہے۔ اندر کیوں نہیں آتیں؟“  
 ”آہستہ! اس نے لبوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”پھیپھو کہاں ہیں؟“

”سورہی ہیں۔ کیوں؟“ اسے اس کے انداز پر تعجب ہوا۔

”مصولت؟ وہ کیا کر رہی ہے؟“

”مصولت تو گھر پر نہیں ہے۔ اسکول سے اب تک نہیں لوٹی۔“

ترانہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

”اچھا میں آتی ہوں۔“ وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔

ربیعہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے برآمدے میں چلی آئی۔ ترانہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ

میں ایک پیکٹ تھا جس کو خوبصورتی سے پیک کیا گیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ ربیعہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

”شئی۔ خاموش!“ وہ سرگوشی میں بولی۔ اور سیدھی اپنے باپ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ پیکٹ اس نے

الماری کے نچلے خانے میں رکھ دیا۔ منور امین اپنے بستر پر آنکھیں موندے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔

ان کا زیادہ تر وقت اسی انداز میں گزرتا تھا۔

وہ دونوں کمرے سے باہر نکل آتے۔

”تم نے کھانا کھالیا؟“ ترانہ نے شگفتہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔ مجھے تو بہت بھوک لگی ہوئی تھی تمہارے لیے کھانا نکالوں؟“ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کچن میں

آچکی تھیں۔

”نہیں۔“ وہ مسکراتی۔ ”میں برگر کھا کر آئی ہوں۔“

”اچھا۔۔۔“ ربیعہ سادگی سے بولی۔ ”چائے بناؤں تمہارے لیے؟“

”ہاں چائے پیوں گی۔ لیکن ٹھہرو، کچن کا نقشہ بتا رہا ہے کہ تمہارا شمار آؤں آج نہیں تمام ہوا ہے۔“ ترانہ

نگاہیں چاروں طرف دیکھنے لگیں۔

”یہ دھلی دھلائی بریاں اور بوتلیں۔ صاف ستھرے شیٹ بے بخوبی ہوئے برتن اور یہ چمکتا ہوا چولہا خوب

محنت ہوئی ہے۔“

”مجھ سے گندہ کچن براشت میں ہوتا۔“ وہ مسکراتی۔ ”اس نے کہا نہیں تھا یہ سب کچھ کرنے

لیے۔ بس وقت گزارنے کے لیے کوئی مصروفیت تو ہونا چاہیے نا۔“

”ٹھیک ہے بھئی، ٹھیک ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس پھری۔ ”اب کم از کم میں تمہیں چائے بنا کر تو پلاؤں

ہوں نا؟“

”نہیں۔“ ربیعہ بولی۔ ”میں بناتی ہوں چائے ذرا یہ چولہا صاف کر لوں۔“

”تم سے نہیں جیت سکتی۔ چلو میں تب تک کپڑے بدل لوں پھر چھت پر چلتے ہیں۔“ وہ کچن سے نکل گئی۔

ربیعہ نے مسکرا کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ آج ترانہ بے حد خوش تھی۔ وجہ غنیمت

اسے معلوم ہونے والی تھی۔ چھت پر اسے لے جا کر ترانہ بھی چھت کی طرح ہو جاتی تھی۔ کھلی کھلی اور روئے

روشن۔ ربیعہ سے وہ اپنے دل کی سب باتیں کہہ ڈالتی تھی۔

ربیعہ نے چولہا صاف کر کے چائے کا پانی رکھ دیا۔ باورچی خانے کا آجلا پن اس کا من اجال رہا تھا۔ سب

صاف ستھرا اور نکھرا ہوا دیکھ کر اسے روحانی خوشی مل رہی تھی۔ اسے محسوس نہ ہوا کہ کچن کے دروازے پر کھڑا

ترانہ مسکراتے ہوئے اسے اپنی محنت پر خوش ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

## قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے محفوظ رکھیں۔

ترانہ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے نیازی تھی۔

”جتنی سخت حکومت اتنی سر پھری بغاوت۔ اتنی سی بات نہیں سمجھتیں ربیعہ ڈیرا سانس لینے کو روزانہ میسر نہ ہو تو دیواریں ڈھادی جاتی ہیں۔“

ربیعہ کو باغی ترانہ سے خوف سا محسوس ہوا۔ اچانک ہی وہ چونکی۔ سیڑھیوں پر اس نے بالوں کی سیاہی دیکھی، پھر اسے لال کپڑوں کی جھلک نظر آئی۔ کوئی چھپ کر واپس جا رہا تھا۔

”انسے کسی نے ہماری باتیں سنی ہیں۔“ وہ اچانک ہی ڈر گئی۔

”انہ نے مڑ کر دیکھا۔

”کون تھا؟“

”سرخ کپڑوں کی جھلک تھی۔“

”مصلحت!“ ترانہ نے لب سکوڑے۔ ”یہ لڑکی کسی دن نقصان اٹھائے گی میرے ہاتھوں۔“

”نیکے ڈر لگ رہا ہے ترانہ!“

”بدلتا ترانہ سے گھورا۔

”سنو رولر! جلدی ہو سونا۔ ہم رات کو چھت پر گفٹ کھولیں گے۔ پتا نہیں باری نے میرے لیے کیا خریدا۔“

”وہ سب متعلق سوچ رہی تھی جبکہ ربیعہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔“

”جس رات کے کھانے پر منیوہ بیگم نے سب کو اطلاع دی تھی۔

شہلا اور انیقہ کے چہرے کھل اٹھے۔ عمر نے خوشی سے نعروں لگایا۔

”عباداموں! ہرے نانوں میں انہیں اپنے پیہا کے بارے میں بتاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔“

شہلا اپنی پلیٹ پر جھک گئی، جبکہ انیقہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ منیوہ بیگم نے پیار سے ساتھ بیٹھے ہوئے

”اواسے کا کال تھپکا۔

”نانو!“ اس نے پھر کچھ بولنا چاہا۔

”عمر!“ شہلا نے اسے ٹوک دیا۔ ”خاموشی سے کھانا کھاؤ۔“

”کیوں جھمکتی ہو بچے کو بار بار۔“ منیوہ بیگم نے دھیرے سے اسے ٹوکا۔ ”اس کے معصوم ذہن میں بدگمانیاں نہ پیدا کرو۔ بول رہا ہے نا۔ بولنے دو۔ کیا لیتا ہے تمہارا۔ ہر طرح کے حالات کو ذہنی طور پر قبول کرنا سیکھ لو شہلا بیٹی! انسان پھر اتنا پریشان نہیں رہتا۔ بہتی دھارا کے ساتھ بنے دسب کو۔“

”بہت خوش ہو؟“ اس نے پوچھا تو ربیعہ چونک اٹھی۔

”ہاں! وہ ہنسی۔ ”لیکن تم سے زیادہ نہیں۔“

ترانہ چونکی اسے گہری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”تم سے کس نے کہا میں خوش ہوں؟“

ربیعہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اور چائے کا گلاسے اٹھا دیا۔

”تم کوئی لیکن چھت پر چل کر۔“

ترانہ جینپ کر ہنس دی۔

”آج میری سالگرہ ہے۔ عبد الباری نے مجھے لیچ کرایا اور گفٹ بھی دیا ہے۔“ اس نے چھت پر چل قدمی کرتے ہوئے اسے بتایا۔

”پسند کرتی ہو تم عبد الباری کو؟“ ربیعہ نے اس کی آنکھوں کی جلتی ہوئی جوت دیکھی۔

”بدلتا!“ ترانہ نے اسے گھورا۔ ”یہ بھی پوچھنے کی ضرورت ہے۔“ پسند نہ کرتی تو اس کے متنی پھرتی، تنھے لیتی خواہاں میں۔“

”شادی کیوں نہیں کر لیتے تم دونوں۔ اس سے کہنا دینا آئی ہے بات کر رہی۔“

ترانہ کی آنکھوں کی جوت مدھم مدھم پڑ گئی۔ وہ اس سے ہونٹیں

”میں نے شادی کر لی تو ابو کا کیا ہو گا ربیعہ! بھائیوں کے متعلق تو تم جان ہی گئی ہو۔ انہیں گھر سے جتنی

پسند ہے وہ وہی چھپی بات تو نہیں۔ رو دو کر مہینے کا راشن لے آتے ہیں اور بس! ابو کی وہائیاں دیکر اخراجات

یہ سب کچھ میری تنخواہ سے چلتا ہے۔ پھر ابھی باری کی پوزیشن بھی اتنی اسٹرونک نہیں ہے۔ ہم کچھ عرصہ تو

شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”دینا آئی جانتی ہیں اس کے متعلق؟“ ربیعہ نے پوچھا۔ ”وہ مجھ سے بھی پوچھ رہی تھیں باری کے متعلق۔“

”ہاں۔ معلوم ہے مجھے یہ صولت ایک نمبر کی جاسوس ہے۔ میں کبھی کبھار اس سے اپنے دل کی کہہ سن لیتی تھی۔

مجھے علم نہ تھا کہ یہ میسنس پیچھو کو پوری رپورٹنگ کرتی ہے۔ اس نے انہیں خوب بھڑکایا۔ پیچھو نے مجھے

دھمکی دی کہ اگر میں نے باہر کسی لڑکے سے روباہا رکھے تو وہ تصور اور تہن کو تار کھری خوب ٹھکانی کروائیں

گی۔“

ربیعہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے حد لاپرواہی سے سب کچھ کہہ رہی تھی۔

”لیکن سہو اتنی سخت کیوں ہیں ترانہ؟“

ترانہ زور سے ہنس دی۔

”وہ ظالم سماج ہیں ربیعہ! ظالم سماج، محبت کے گلابی سپنوں سے انہیں سخت نفرت ہے۔ کسی کی آنکھوں میں

رنگین سپنے دیکھ کر ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ ان آنکھوں کو نوچ کر اندھا کر دیں۔ لبوں پر ہنسکتی ہنسی سے ان کے

کانوں میں زہر بھرنے لگتا ہے۔ آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ ایک ایسا قانون پاس کر دے

دیں جس کے تحت محبت کا نام لینے والوں کی زبانیں کھینچ دی جائیں۔ خواب بننے والی آنکھوں میں سلاسیاں

پھوادی جائیں۔ ”نئے سننے والے کانوں میں سیسہ بھر دیا جائے۔“

ربیعہ دم بخود سنتی گئی۔

”بہت بہت والی ہو۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

شہلا نے نشو سے منہ صاف کیا۔

”بیٹھا لے لو۔“ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر بولیں۔ ”تمہیں تو بے حد پسند ہے بادام کا حلو۔“  
”بس امی! ابھی موڈ نہیں ہے۔“ وہ ڈانٹنگ ٹینل سے اٹھ گئی۔ ”انیقہ! اپنے لیے چائے بناؤ تو مجھے بھی دینا ایک کپ۔“

”جی ایسا!“ اس نے بھانجے کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

”نانو!“ وہاں کے جانے کے بعد نانو۔ ”مما کو کیا ہوا ہے۔ مجھ سے ناراض ہی رہتی ہیں۔“  
”نہیں بیٹا!“ وہ پیار سے بولیں۔ ”وہ تو آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ ماں تو اپنے بچوں سے ناراض نہیں ہوتی۔ ماں تو اپنے بچوں کو بہت چاہتی ہے۔“

”اور بیٹا؟“

”ایک تو اس کی سوئی!“ انیقہ نے دانت پیسے۔ ”انک جی تو بس انک گئی۔“

”نہ کرو انیقہ! بچہ ہے۔“ انہوں نے خفگی سے دیکھا۔

”بچہ نہیں ہے امی! پورا اچھا پار ستم ہے۔ میں تو چلی چائے بنا رہی۔“

وہ پتلی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ منیڑہ بیگم نے عمر کو گود میں اٹھا لیا۔

”بادام کا حلو کھلاؤں آپ کو؟“ وہ دلار سے پوچھنے لگیں۔

”نہیں نانو۔“ ماما روز صبح کھلاتی ہیں۔ ماما کہتی ہیں اس سے دماغ منجمود ہوتا ہے۔ خالہ جانی ان سے کہتی ہیں۔

اس کا دماغ تو پہلے ہی بہت تیز ہے ایسا۔ اسے مزید تیز نہ کریں۔“ اس نے خالہ کی نقل اتاری۔

”ماشاء اللہ! کیوں نہ ہو۔“ انہوں نے اس کا ماتھا پیسا۔

”نانو۔ آپ سب سے اچھی ہیں۔ آپ مجھے بالکل نہیں ڈانٹتیں۔“ نانو ایک بات بتاؤں آپ کو۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ہاں ہاں بتاؤ!“ وہ اسے اپنے بستر تک لے آئیں۔

”میرے پیٹا بھی مجھے بالکل نہیں ڈانٹتے۔“

”اچھا!“ وہ خاموش سی ہو گئیں۔

”بتاے نانو! وہ مجھے زو بھی لے کر گئے تھے۔“ سندباد بھی لے کر گئے تھے۔

”مجھے آکس کریم کھلائی۔“ کتنے اچھے پیٹا ہیں میرے۔“

”منیڑہ بیگم نے گہری سانس بھری تھی۔“

”اب سو جاؤ عمر! صبح اسکول جانا ہے نا۔“

”ہاں نانو! صبح میں ضرور اسکول جاؤں گا، میں اسے سارے فرینڈز کو بتاؤں گا اپنے پیٹا کے بارے میں۔“

”عمیرہ!“ کمرے کے دروازے پر شہلا کھڑی تھی۔ ”چلو میں سلاؤں تمہیں۔ امی کے قابو میں کہاں آنے والے ہو تم۔ خود بھی جاگو گے ساری رات!“ انہیں بھی جگاؤ گے۔“

وہ بستر سے چھلانگ لگا کر ماں کی گود میں لٹک گیا۔

”نانو! شب بخیر!“ اس نے ماتھا مایا۔

”شب بخیر میری جان!“ وہ محبت سے مسکرا دیں۔

شہلا اسے گود میں لیے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے محبت سے اسے بستر پر پھینکا اور خود اس کے

نگہمدی کرنے لگی۔

”شیطان کیس کے۔ شکایت لگاتے ہو۔ ماما کی نانو سے ہاں۔ ماما ڈانٹتی ہیں تمہیں۔“

وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔

”مما! ماما میری بات سنیں۔“

”ہاں سناؤ۔“ اس نے ہاتھ روکے۔

”میں کبھی آپ کی شکایت نہیں کرتا۔ مجھے تو آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔ پتا ہے کتنی؟“

شہلا نے مقصودیت سے نفی میں سر ہلایا۔

”اتنی۔۔۔“ اس نے چھوٹے چھوٹے ہاتھ حتی الامکان دور کیے۔ ”بلکہ اس سے بھی زیادہ بہت زیادہ پیار سے بھی زیادہ۔“

اس نے کن اکھیوں سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ شہلا مسکرا دی۔

”مگر مجھے تمہارے پیٹا بالکل پسند نہیں ہیں۔ تم میرے سامنے ان کا ذکر مت کیا کرو، سمجھے۔“

اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ اپنی معصوم نگاہوں میں حیرانی بھر کر اسے دیکھنے لگا۔

”پیتا تو آپ کو بہت لائیک کرتے ہیں سوہ مجھ سے آپ کی باتیں کرتے ہیں۔“

شہلا کا دل بھٹکا۔ انداز میں دھڑکا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں غم ہو گئیں۔

”مما!“ اس نے میری باتیں مت کیا کرو عمر!“ وہ اس سے دور ہو گئی۔

وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”کیوں نہ کروں؟“ اس کے انداز میں ضد تھی۔ ”ہمیں اچھا لگتا ہے آپ کی باتیں کرنا۔“

”بے بسی کے شہلا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ دانتوں سے لبوں کو چپکنے لگی۔“

”مما! پیٹا کتنے ہیں آکس کریم بہت پسند ہے۔ میں نے کہا جھوٹ! میری ماما تو کبھی آکس کریم نہیں کھا۔“

”کھا۔“ ماما بولے۔ ”مگر پسند ہے۔ میں نے کہا غلط! میری ماما کے پاس ایک بھی ڈریس ریڈ کٹر کا نہیں ہے۔“

وہ کتنا جا رہا تھا۔ شہلا کانوں سے ہنستے ہنستے اس کی آواز دور۔ بہت دور ہوتی چلی گئی۔ وہ کہیں اور جا پہنچی۔

”وہ دھندلے دھندلے منظر گزر رہے تھے۔ روٹی کے گالوں جیسے منظر۔“

”کیا کرتے ہو۔“ پیرا برابر۔ ”اس کی ہنسی کی جھنکار سے پورا کمرہ گونج رہا تھا۔“

وہ ٹھنڈی ٹھنڈی آکس کریم اس کے گالوں پر مل رہا تھا۔

”کھاؤ۔“ نہاؤ۔ پوری ختم کرو۔ مجھے رات کے ڈیرہ بچے آکس کریم لینے بھیجا ہے نا تم نے۔ اب کہتی ہو۔“

”کیا نہیں جاتی۔ ختم کرو۔“

”ابرا۔۔۔!“ وہ اٹھ کر بھاگنے لگی تھی۔

اس نے اس کا لال پتھر پکڑ لیا تھا۔ وہ بیٹہ اس کے گلے سے نکل کر اس کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ وہ اسے رومال کی طرح گلے میں باندھ کر بیٹھ گیا۔

”اب لے کر کھاؤ۔“

”بہت برے ہو تم۔“ وہ ہتھیلیاں سے گال رگڑتے ہوئے بولی۔

”چیک و کرو۔“ اس نے شرارت سے آنکھ میچی تھی۔ ”ایسے ہی کہہ رہا؟“



48

شہلانے سہم کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

”دیکھا! آئی نالاج اس تصور سے؟“ ایقان کہہ رہی تھی۔ ”کیسے کہہ سکتی ہو شہلا کہ جذلوں کے الاؤ سرد پڑے ہیں۔ رخساروں پر بکھرتی حرارت جھوٹ نہیں بولتی۔“

”ایقان! اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔“ کیسے سمجھاؤں تمہیں یہ بات تو میں اپنے آپ سے کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ جذلوں کے الاؤ سرد نہیں ہیں مگر جنگاریاں جو چھپی ہوئی ہیں۔ ان تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس رُتج رستے پر بس ایک مسافر ہی منزل تک پہنچا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ منزل کو منزل نہ سمجھا۔ وقتی پڑاؤ سمجھا۔ لیکن اس کے قدموں کے نشان آج تک۔۔۔“

وہ سسک پڑی۔

”اب تک ویسی ہی ہو۔“ کسی نے ہنس کر کہا۔

شہلا ڈر گئی۔ یہ کس نے جی کا چور دیکھا تھا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ جالی کے سفید پردے چپکے چپکے مسکرا رہے تھے۔



”یہ ایریو پلین کی تصویر یہاں لگاؤ اور یہ ٹرین یہاں۔“ ایقان بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔

”مما! یہ ایمان برابری گلو! (Glu) صانع کر رہی ہے۔“ مومن نے اس کی توجہ ننھی ایمان کی جانب مبذول کروائی۔ ”تو نکال نکال کر کاربٹ بر لگا رہی تھی۔“

”ہائیں۔“ وہ جلدی سے اٹھی۔ ”گندی بچی یہ کیا کیا تم نے کاربٹ کا ناس مار دیا۔ اب یہ کیسے صاف ہوگا۔ تمہارے ابا جاپان سے آئیں گے یہ صاف کرنے۔“

ایمان ہنسنے ہوئے اٹھ کر کھاگی۔ ایقان اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے چلا نکلا۔ کی۔ کمر میں درد کی شدید لہر اٹھی تھی جس نے اس کے پورے وجود میں آگ سی بھردی۔ وہ سینے سینے ہو گئی۔ اس کا حسی خشک ہو گیا۔

”مما! مومن جو غور سے ماں بیٹی کے درمیان ریس ملاحظہ کر رہا تھا چونک اٹھا۔ ”مما! کیا ہوا؟“ ایقان بمشکل ہونے لگا۔ ”مومن! اس کے قریب نہ آنا۔“ ایمان پردے کے پیچھے جا چھپی تھی۔

”مما! آپ کی طبیعت خراب ہے؟“ وہ فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

ایقان محض اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں رہ رہ کر اٹھ رہی تھیں۔“

”میں پانی لاتا ہوں۔“ وہ کچن کی جانب دوڑ گیا۔

ایقان نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر رہا تھا۔

دفعۃً ”فون کی بیل بجنے لگی۔ مومن نے جا کر فون کا ریسور اٹھایا۔

”ہیلو۔ ہیلو۔ جی پیما۔ میں مومن ہوں۔“

ایقان چونک گئی۔

”مما کی طبیعت خراب ہو گئی پیما۔! میں انہیں پانی پلا رہا ہوں۔“ اس نے اپنی مستعدی کے متعلق بتانا

ضروری خیال کیا۔

ایقان اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے فون تک گئی۔

”ہیلو۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

"ایقان! کیا ہوا ہے یار؟" وہ فکر مندی سے پوچھنے لگا۔  
 "پتا نہیں عاشر! بس اچانک ہی کمر میں ٹیسس سی اٹھنے لگی ہیں۔ بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ کرایا۔  
 "تم۔ تم فون کر کے رافع یا ہاسم کو بلاؤ۔ ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔"

"اچھا! اس نے کہا۔  
 اس کی پلکیں نم ہو گئی تھیں۔ لب کا نیپے لٹکے تھے۔ عجب موسم تھے جدائی کے۔ پوری زندگی پر محیط دکھائی دیتے تھے اس کو، تو شخص آواز سے کب تک خود کو تسلیاں دیتی وہ۔ ایقان نے اس لمحے خود کو بے حد تنہا اور ملول محسوس کیا تھا۔

"ایقان۔ ایقان۔۔۔" وہ آواز سے دے رہا تھا۔  
 "ہاں! اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ "میں سن رہی ہوں عاشر!"  
 "آئی لو یو جانو!" یہ بھی گویا تسلی دینے کا انداز تھا۔

ایقان کی تسلی اب اس جملے سے نہ ہوتی تھی۔ درد بہت عرصے تک تو وہ یہی لفظی جملہ سن رہا تھا۔  
 کرتی تھی۔ دل ان ہی لفظوں کی تکرار کیا کرتا تھا۔ وہ خوش خوش پھرا کرتی تھی۔  
 وہ سری جانب سے سلسلہ منتقل ہو گیا تھا۔ ایقان نے مرے مرے آواز میں ریپورر کر کے۔ دل کو اب اس کی تسلی کافی نہ تھی۔ جی بھر کر رو لینے کے لیے ایک کاندھا دے رہا تھا۔  
 ٹیس پھرا تھی تھی۔ وہ "حیات دلا" کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ "میں عذرا ہاسم نے اٹھایا۔

"ہیلو بھائی جان!" وہ بولی۔ "ایقان بات کر رہی ہوں۔ جی میری طبیعت کچھ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ کمر میں درد ہو رہا ہے۔ جی رافع کو بھیج دیں۔ بھائی جان کی گاڑی لے آئے۔ جی اچھا۔" اس نے ریپورر رکھ دیا۔  
 "ہم بے چاری عورتیں!" صوفے کی پشت سے سر نکا کر سوچنے لگی۔ "اکیسویں صدی کا تصور لگا کر شخص کی آزادی کی باتیں کرتی ہیں۔ سینما دھوتے ہیں، ٹیکسز دے جاتے ہیں۔ لڑکیاں ہوتی ہیں۔ آزاد کی باتیں کرتی ہیں۔ عورت آزاد ہے، عورت کی محتاج نہیں، عورت اکیلے رہ سکتی ہے، بچے پال سکتی ہے، نوکری کر کے اپنا گھر چلا سکتی ہے۔ سب ہی کچھ کر سکتی ہے بے چاری خواہ! سب کچھ کر گزری مگر آدم کے شکنجے سے آج تک اپنا دل آزاد نہ کروا پائی۔ آزاد وجود کے اندر قیدی دل لیے پھرتی ہے۔ وہاں سے محض ایک جملہ کہہ کر فرض پورا ہو جاتا ہے۔ آئی لو یو جانو! کتنی بڑی بات ہے نا۔ یہ بول رہی ہوں، یہ دل کی بات ہے۔  
 دیوانہ ساری ساری رات اسی ایک جملے کا تعاقب کرتا ہے، یہی سننے سننے رہنے کی خواہش میں عمر گزار دیتا ہے۔ اور بے چاری عورت! کہتی ہے، میں آزاد ہوں! جن کا دل زنجیر کی چھٹک کا غلام ہو۔ ان کے وجود آزاد نہیں، وہ کرتے دیوانی عورتوں!"

\*\*\*

وہ "حیات دلا" چلی آئی تھی۔ ڈاکٹر نے دس پندرہ دن ہڈی ریسٹ کی ہدایت کی تھی۔  
 "نو عمر لڑکیوں بالیوں کی طرح تو اچھلتی کودتی پھرتی ہو تم!" شفیقہ حیات نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "شوہر پر دس میں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ تمہیں تو دہری ذمہ داری بھانی ہے۔ اپنا خیال خود نہ رکھو! ٹوٹی لی! خدا فرشتے تو اتارے گا نہیں جو بل پل تمہارا ہاتھ پکڑ کر سارا دس۔ ہرنی کی سی قلا تھیں بھرتے میں نے بار بار دیکھا ہے تمہیں۔ میرا جی دھڑک دھڑک جاتا ہے پر تم بے دھڑک چھلانگ لگاتی ہو یہاں سے وہاں تک کی۔"  
 وہ کان لپیٹے بیٹھی رہتی۔

"میرے منہ میں خاک! کچھ التا سیدھا ہو جاتا تو میاں سے کیا کہتیں؟"  
 "اونہ! میں نے ٹھیکہ لیا ہے ناسب کچھ سیدھا سیدھا رکھنے کا۔" وہ جھٹلائی۔ "یہاں ہمارا دل التا سیدھا آڑا ترچھا سب ہی کچھ ہو جاتا ہے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اور اماں! عورت اپنے دل سے مرد کی باندی ہے۔ اسے مرد ہی بھاتا ہے ہر روپ میں، بھائی ہو، بیٹا ہو، اور تو اور داماد ہو۔ بس وہی صحیح ہے۔ آپ کو بیٹی کی فکر نہیں، داماد کی سوچ کی تشویش ہے۔ حد ہو گئی۔"

"ارے ارے کیسی نامعقول ہو رہی ہو تم۔" انہوں نے بیٹی کو گھورا۔ "وہ ہمیں ہی سونپ کر گیا ہے تمہاری خبر گیری۔ لگرنہ کریں گے کیا؟ اور تمہیں یہ کا ہے کا بھوت سوار ہے؟"  
 "پتا نہیں! بس غصہ آ رہا ہے ہر کسی پر۔"

"بیٹی! وہ نرم پڑ گئیں۔" کیوں جان ہلکان کیے رکھتی ہو۔ چار پیسے کمانے پر دیس گیا ہے بچہ۔ آجائے گا۔ ساتھ بننے کھیلنے کو عمر بڑی ہے۔"

ان تھیں۔ جال سے بے حال ہوئی بیٹی کے احساسات سمجھ گئیں۔  
 "بہن! درست کہا اماں! پیر میرے قبر میں لٹکے ہوں گے اور میں کھیلتی بھڑوں گی لاٹھی کے سہارے۔"  
 "تم کھلا کر ہنس دیں۔ وہ اس کے لیے شیک بن کر لائی تھیں۔  
 "اس کا نام کیا ہے؟" شفیقہ حیات بھی مسکرا دی تھیں۔

\*\*\*

فرانک پین میں رکھے ہوئے کبابوں کو احتیاط سے پلٹتے ہوئے انہوں نے ایک نگاہ عباد پر ڈالی۔ بچن میں پڑی تھی۔ گول میر ککڑی پر بیٹا، مزے سے پلاؤ اور رستے کا لطف اٹھ رہا تھا۔  
 "کمال کباب! کمال کباب!" نکال کر لے آئیں۔ اس کے سامنے پلیٹ رکھ دی۔  
 "کمال کباب! کمال کباب!" گرم گرم شامی کباب کھاتے ہوئے بولا۔ "جس نے بھی کھا چ کھا کہ معدن دل سے سکے دھو لے۔" وہ بولی۔ "اسی راہ" سے گزر کر جاتی ہے۔ مائیں تب ہی تو راج کرتی ہیں بیٹوں کے دلوں پر۔ کھلا کھلا کہہ سکتی ہیں۔ وہاں سے پلٹتی ہیں۔"

انہوں نے تیار ہو کر اس کے پیچھے لگا لی۔  
 "ایقان! ایقان! پین اپنے راج دلا روں گا۔ جو لہے پر پلاؤ تو بہت بعد میں بنتا ہے۔ لاتعداد خیالی پلاؤ جی ہی تیاں بناتی ہیں کہ اس بار کیا پکانا ہے اور کب کب کھلانا ہے۔ اولاد اتنے شوق سے کھائے تو ماں کا بٹا کھائے ہی یہوں خون برہہ جاتا ہے۔"

"پتا ہے ای جی! اس بار آپ کے فرائیڈ رائس اور چکن نے بڑا لطف دیا رستے میں۔" اسے اپنا سفر یاد آیا اور ساتھ ہی ہم سفر بھی۔

وہ چچ بھڑک کر منہ میں ڈالنا بھول گیا۔ منیہہ بیگم نے غور سے اسے دیکھا۔  
 "کیا بھول گئے؟" انہوں نے ٹوکا۔

اس نے جلدی سے چچ منہ میں ڈالا اور مسکرائے لگا۔  
 "بھول نہیں گیا، کچھ یاد آ گیا تھا۔" اس نے تھپکی۔  
 "اچھا! میں بھی رستے میں کچھ بھول آئے۔" وہ مطمئن ہو گئیں۔  
 "ای جی! اس نے کچھ دیر میں پکارا۔"

”کہو بیٹے“ وہ اب اس کے لیے چائے دم کرنے لگی تھیں۔  
 ”ایک لڑکی ملی تھی لاہور جاتے ہوئے۔ ٹرین میں ساتھ بھی میرے۔ رہینہ نام ہے اس کا۔“  
 ”اچھا!“ ان کے ہاتھ رک گئے۔ لبوں پر متنی خیز مسکراہٹ جاگ اٹھی۔

”امی!“ وہ سوچ میں گم ہو گیا۔  
 منیوہ بیگم اس کے کچھ کہنے کے انتظار میں کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر کھنکھاریں۔ وہ چونک اٹھا۔ کچھ کہے بنا وہ دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ وہ بھی چائے بنانے لگیں۔  
 کھانے اور چائے سے فارغ ہو کر وہ حسب معمول ان کے کمرے میں چلا آیا اور ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔  
 ”امی جی! وہ بہت اچھی ہے۔“ وہ چیمت کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”بہت حوصلہ مند، خوددار، باوقار“ اس کی بات چیت میں بے حد شائستگی ہے، مسکراہٹ میں بچوں کی سی معصومیت، آنکھوں میں وہ روشنی جو صرف کردار کی بلندی سے ہی ملتی ہے۔ زندگی نے اس کے ساتھ بہت سختی برتی لیکن وہ عزم اور ہمت کی مثال ہے۔ مجھے اس نے بہت متاثر کیا ہے۔“

منیوہ بیگم مسکراتی رہیں۔  
 ”پتا ہے امی! اسے اپنی منزل کا علم نہ تھا پھر بھی وہ اگلی کسی سے مدد اور خواست کی بجائے اپنی چل پڑی تھی مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو خود بر ترس نہیں کھاتے، بلکہ مظاہریت سے احساس سے روئے نہیں لگتے ہمت سے سرائی کر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وقت کا چیلنج قبول کرنے والے لوگ۔“  
 منیوہ بیگم کچھ نہ بولیں۔ ان کی آنکھوں میں رچھائیاں سی پھرنے لگی تھیں۔  
 ”چڑیا کے سے دل پر اس نے ہمت اور حوصلے کا شیر کا سا خول چڑھا رکھا ہے۔ دل تو قدرت عطا کرتی ہے نا امی! اس پر بس نہیں مگر خول انسان خود چڑھاتا ہے۔ یہ تو تعریف کا مقام ہے نا امی جی؟“  
 ”ہاں!“ وہ چونک اٹھیں۔ ”ٹھیک کہتے ہو بیٹے۔ مگر وہ ہے کون؟“  
 ”ربیعہ!“ وہ سادگی سے بولا۔

”کہاں رہتی ہے۔ کیا کہانی ہے اس کی؟“  
 ”ابھی تو میں خود ٹھیک طرح سے نہیں جان پایا۔ بس جو اندازہ لگا سکتا ہوں وہ یہ ہے۔“  
 ”تو پتا معلوم کر لو تو تمہارا رشتہ لے جاؤں“ وہ مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا۔  
 ”رشتہ؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”مائی گاڈ! میری پیاری، بھولی بھالی امی جان! ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ آپ سے یہ کس فرشتے نے کہا کہ دیا کہ میزے ذہن میں ایسی کوئی بات ہے؟“  
 ”تعریفیں تو ایسے ہی کیے جا رہے ہو“ وہ برامان کر بولیں۔  
 ”امی جی۔ امی جی۔“ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”پتا ہے آپ کو مجھے اس میں سب سے زیادہ کس شے نے متاثر کیا؟“

وہ بتا جو اس لیے اسے دیکھتی رہیں۔  
 ”اس کی آنکھوں میں روشن بلند کرداری کے جگنوؤں نے۔ اور جانتی ہیں یہ جگنوؤں نے اور کہاں دیکھے ہیں آپ کی ان پیاری پیاری آنکھوں میں۔ اس کی جا بھری آنکھیں دیکھ کر مجھے آپ کی آنکھیں یاد آئیں۔ اور رخصت ہوتے سے اس نے مجھے پکارا۔ عباد بھالی۔ مجھے بہت بہت اچھا لگا۔“

”اچھا!“ انہوں نے سانس بھری۔ ”تو تیسری بہن مل گئی تمہیں۔“  
 ”ہیں ایش۔“

”میں تو سمجھی ایک ذمہ داری سے جان چھوٹی میری۔ اب تمہارے رشتے کے لیے خوار نہیں ہونا پڑے گا۔“

”آپ خدا نخواستہ کیوں خوار ہونے لگیں۔ یہ میری اچھی اچھی بہنیں کس مرض کی لدا ہیں۔“ وہ مزے سے بولا۔

منیوہ بیگم چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

”عباد! جانتے ہو برابر اب اکثر عمر کو لے جاتا ہے۔“

وہ بھی گم صم سا ہو گیا۔

”اور ایسا!“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”رو رو کر دیوانی ہو جاتی ہے بے چاری۔ پر کیا کرے ڈرتی ہے کہیں وہ کوئی دعوانہ کر بیٹھے۔“

”پتا ہے تو کرے۔“ وہ بگڑا۔ ”ہم بھی دیکھ لیں گے۔“

”بیٹا! مردوں کے اس معاشرے میں ایک دکھی ماں کے دل کی فریاد کس نے سنی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”پتا ہے وہ کیا ہے۔“

”کتنے یاد آیا ہے؟“ وہ بھی مجروح لہجے میں یہی کہہ سکا۔

”دیکھو اب کب تک یہ کھیل چلتا ہے۔“ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

دل شکنے کا۔ بہت یاد آیا

تیرے یاد بھی اب یاد آیا

”پتا ہے!“ وہ بے غرضی سے غزل پڑھتا تو تیرے دل کی عجیب سی حالت ہونے لگتی ہے۔ میرا دل مضطرب ہو جاتا ہے۔

”سنا سنو۔“ وہ گتے لگتے ہیں میرے سینے میں۔ اور جب یہ شعر آتا ہے کہ۔

”میں بہت روئے وہ جب یاد آیا

تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

”میں کیا جانوں۔ اپنے آنسوؤں سے پوچھو۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”آنسو کہتے ہیں دل سے پوچھو۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے دل سے پوچھو۔“

”پوچھ تو رہا ہوں۔“

عریشہ کے گل تپ گئے۔ کان کی لوسن پر گئی۔

”بولو نا میرے دل۔ کوئی جواب؟“

”فرانس۔ پکیزا ایسے مت بات کرو۔“ وہ جھینپ کر بولی۔

”ہم کب میں گئے عریشہ؟“ اس نے اس کی کیفیت بھانپ کر ٹھیک بدلا۔ ”اب تو تم تلف مار کیٹ بھی نہیں



جائیں؟“

”جاتی ہوں مگر اپنے خرچ پر۔“ وہ کھلکھلائی۔ ”ایک مرتبہ کا تجربہ کافی ہے۔“  
”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے اتفاق کیا۔ ”اس طرح کا تجربہ تو بس ایک ہی ہونا چاہیے لائف میں۔ ایک ہی تجربہ جیب پر بھاری ہے۔ موبائل کا خرچ دو گنے کو کراس کر چکا ہے۔“  
”ثومت کرو خرچا۔ کس نے کہا ہے۔“ وہ بے نیازی۔

”عریشہ! میں نے اپنی بہن کو تمہارے متعلق بتایا ہے۔ اس کا نام فریحہ ہے۔ میں اسے تمہارے گھر بھیجوں؟“  
”ہائے اللہ! وہ گھبرا گئی۔ ”لیکن تم نے اسے کیوں میرے متعلق بتایا؟ اور اور میرے گھر کیوں بھیج دو گے اسے؟“  
فراز میرے تین بھائی ہیں اور تینوں مل کر میرا گلا دبا دیں گے اگر کچھ ایسا ویسا ہوا تو۔۔۔ اور میری امی بہت سخت مزاج ہیں۔“

”ہاں تو مجھے علم نہیں ہے کیا۔ ان ہی کو تو میں تمہارے ٹیلیفون کا دربان کہتا ہوں۔ وہ ”ہیلو“ کہتی ہیں تو میرے کانوں میں خارش ہونے لگتی ہے۔ رات کو سونے سے پہلے ایئر ڈرائس ڈالنے پڑتے ہیں۔“  
”بہت بد تمیز ہو تم۔“ وہ جھلائی۔ ”میری امی کے بارے میں ایسے کہہ رہے ہو؟“  
”قسم لے لو۔ میں تو اپنی مستقبل کی باتوں کے متعلق گواہ افشانی کر رہا ہوں۔“ وہ مزے سے بولا۔ ”اور یار! تم تو ایسے ڈر رہی ہو جیسے میری معصوم سی بہن ڈھول تاشوں کے ساتھ چلی آرہی ہوگی۔ ارے وہ تو تمہاری سہیلی بن کر آئے گی تمہیں پیچھے نہ چھوڑے گی۔ تمہاری امی کو میرے متعلق کچھ کہنے نہیں آرہی۔“  
”لیکن ابھی نہیں پتہ ہے۔“ اس نے منت کی۔

”او کے بابا! جب تم کہو۔“ وہ مان گیا۔

”اچھا میں فون کر رہی ہوں۔“

”یہ مہربانی کیوں؟ ابھی میرے کارڈ میں چند روپے باقی ہیں۔ اس۔۔۔ ٹھنڈی ہے بھر کر کہا۔“

عریشہ کھلکھلا کر ہنسی اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر وہ وہیں بیٹھی مٹھی مٹھی گنگا ہوں سے دبا دبا کر تکتی رہی اس کی مٹھی مٹھی پائلیں کانوں سے ابتر کراس کے دل میں گونج رہی تھیں۔ ٹھنڈے ہی عریشے میں وہ اس نام اور اس آواز کی دیوانی ہو گئی تھی۔ جس دن وہ محبت بھرا لہجہ، شرارت بھرا انداز سنائی نہ دیتا وہ بے کل بے کل پھرا کرتی تھی۔

اس کی باتیں یاد آئیں تو اس کے من میں ایک خیال ابھرا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے سلپر زپنے اور روپے ٹھیک کرتے ہوئے فردوس بیگم کے کمرے تک چلی آئی۔ وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھیں۔

”امی جی!“ اس نے دھیرے سے پکارا۔

”ہوں!“ وہ کچھ غنودگی میں تھیں۔

”میں ناعمہ کے پاس جا رہی ہوں۔“

”ہوں!“

وہ چپکے سے باہر نکل آئی۔ بڑا سا صحن عبور کر کے وہ پھوپھی کے پورشن میں چلی آئی تھی۔ رابعہ بیگم برآمدے میں بیٹھی لیوی دیکھ رہی تھیں۔

”السلام علیکم پیچھو۔۔۔ ناعمہ کیا کر رہی ہے؟“

”و علیکم السلام۔۔۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”ناعمہ شاید۔۔۔“

ان کے الفاظ لبوں میں ہی رہ گئے تھے۔ ناعمہ کچن سے نکل کر چلی آئی۔

”آگئیں۔ چھپی رستم!“ اس نے لتاڑا۔ ”ضرور کوئی خبر سنانے آئی ہوگی۔“

”ناعمہ!“ رابعہ بیگم کے لمبے میں اچھی بھلی تنبیہ تھی۔  
عریشہ کے چرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ جلدی سے ناعمہ کو کمرے میں کھینچ لائی۔  
”کیا ہو گیا۔ یہ تم پچھو کے سامنے کیا بک رہی ہو؟“ وہ اپنے دل کے چور سے ڈر گئی تھی۔  
”کیا مطلب؟“ ناعمہ نے غصے سے بازو چھڑایا۔ ”میں نے امی کے سامنے ایسا کیا کہہ دیا؟“  
”تم نے مجھے چھپا کر رستم کیوں کہا؟“

”کیا چھپایا ہے میں نے تم سے؟“ وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔  
ناعمہ نے بولنا چاہا پھر اسے ماں کا چہرہ یاد آگیا جنھوں نے سختی سے کچھ نہ کہنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ آنکھیں  
جھما کر رہ گئی۔

”بولو نا۔“ عریشہ غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔  
”کچھ نہیں۔ یونہی تمہیں چھیڑنے کو جی چاہ رہا تھا۔“ وہ بات بدل گئی۔  
عریشہ کی جان میں جان آئی۔ وہ نجانے کیا سمجھ بیٹھی تھی۔  
”اور یہ تم کیوں رات کے دس بجے افتال و خیزاں دوڑی۔“ عریشہ نے اس کا  
جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”مولیٰ جینس!“ عریشہ نے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔ ”جلی چکر دو کر نہیں۔ وہ میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ  
تمہارے پاس میڈم نور جہاں کی دو دو والی غزل ہے۔ دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا۔“  
”تمہارا دل دھڑکنے لگا ہے کیا؟“ وہ ہنسی۔  
”ہاں بابا! دھڑکنے لگا ہے۔“ وہ اس کے آگے بے بس ہوئی۔ ”میں تجھے کیسٹ دے دو۔“

”کس کی یاد سے یہ ناممکن کام ممکن ہوا۔ پہلے یہ بتاؤ۔“  
”ناعمہ جاؤ! میں نہیں بولتی تم سے۔“ وہ بیزار ہوئی۔ ”بال کی کھال اتارتی ہو۔“  
”اچھا اچھا جاتی ہوں۔“ وہ احسان کرتے ہوئے بولی۔ ”ویسے تم یہ مت سمجھنا کہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ اندر ہی  
اندر جو کچھ دیکھ رہی ہے نا۔ اس کی خبر ہے مجھے۔“

عریشہ جو بمشکل مطمئن ہوئی تھی پھر ریشاں ہو گئی۔  
”تمہیں قسم ہے ناعمہ! سچ سچ بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“  
”او نہ!“ اس نے ریک میں لگی۔ کیسٹوں میں سے مطلوبہ کیسٹ کھینچ کر نکالی اور اس کے حوالے کی۔ ”جیسے  
جانتے نہیں۔“ وہ طنز یہ بولی۔

عریشہ نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی، خفگی سے سر جھٹکا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔  
”مجھوں کی بیٹا تم سے۔“ وہ اس کے جانے کے بعد بزدلانی۔ ”ناعمہ علی خان ہے نام میرا۔ دل دھڑکنے کا  
سبب یاد آیا۔“

”بس بھائی جان! جو اماں نے کہہ دیا وہی میری خوشی، وہی میری اولاد کی خوشی۔“ سلجوق حسن مسکراتے ہوئے  
کہنے لگے۔

شفیقہ حیات بھی مسرت سے بھرپور انداز میں مسکرائیں۔  
”جیتے رہو! میرا تو خرد غرور ہو تم لوگ، بوڑھے لوگوں کو اور کیا چاہیے جتنا مان تم لوگ مجھے دیتے ہو میری عمر  
برسا جاتا ہے۔“

”اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے اماں! آپ کی دعاؤں کے طفیل ہی اس گھر کے سب افراد  
ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔“ فاروق حسن مسکراتے ہوئے بولے۔ ”اور اللہ نے چاہا تو آپ کے  
جوڑے ہوئے ان رشتوں سے یہ یا بھی اتفاق اور محبت بڑھتی ہی رہے گی۔“

”بس بیٹا! میں نے اسی لیے تم لوگوں کو یہاں اکٹھا کیا ہے کہ ایک ہی بار سب کی رائے معلوم کر لی جائے۔“ ہال  
کمرے میں شفیقہ حیات، فاروق حسن، فردوس بیگم، سلجوق حسن، عذرا بیگم، رابعہ بیگم اور ایقان موجود تھے۔ سبھی  
کے چروں پر مسکراہٹیں تھیں۔ ماحول بے حد خوش گوار تھا۔  
”عریشہ سے بھی پوچھا ہے کسی نے؟“ ایقان کو خیال آیا۔

”ہاں پوچھ لیا ہے۔“ فردوس بیگم بے اعتنائی سے بولیں۔ ”ہماری بیٹیاں ہمارے سامنے نہیں بولتیں۔“  
شفیقہ حیات کے چہرے پر سایہ سالہا گیا۔ ایقان ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ فردوس بیگم ہی کیا جو کوئی موقع  
باتھونے دیتیں۔

”تو توں سب کے سوجانے کا اطمینان کر کے چمت پر چلی آئی تھیں۔“ چالیس واٹ کے بلب کے ملگجی روشنی میں  
ترانہ نے بے حد بے تالی سے وہ پیکٹ کھولا تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھی لیکن پوری احتیاط کے ساتھ سپر اتار رہی  
تھی۔ مبادا وہ کھسکے پھٹ جائے۔ شاید اسے وہ رہنمائی پیر بھی عزیز تھا۔ ربیعہ سوچ کر مسکرا دی۔  
پیکٹ کے اندر ایک عام سا کائن کا بھری پیس سوٹ تھا جس کے مدھم مدھم رنگ ربیعہ کو تھیک طرح سے  
پکچر بننے آئے۔

”اگر سارا۔“ ترانہ نے محبت سے سوٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ”وہ کھار بیچہ تم نے! اسے کس طرح میری  
پند کا خیال رہتا ہے۔“  
”ہوں!“ ربیعہ مسکرا کر ان کا ہاتھ کھسکی۔

”ابا! اب بھی نہ جانے گا۔“  
”ابا! اب بھی نہ جانے گا۔“

ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ترانہ کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی جس پر بکھرے ہوئے رنگ سوٹ سے زیادہ واضح  
اور خوبصورت تھے اور چالیس واٹ کے بلب کی ملگجی روشنی میں بھی بے حد صاف نظر آتے تھے۔ ترانہ کا پورا  
وجہان سوٹ کی جانب تھا۔ وہ بار بار اسے کھولتی، اچھی طرح سے دیکھتی۔ کبھی قمیص کا پرنٹ دیکھنے لگتی تو کبھی  
”سے کا۔“

”گفتا پیا ر سوٹ ہے ناربیچہ!“ اس نے ایک مرتبہ پھر بے حد اشتیاق لیے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔  
”بال بابا! کیسے کہوں، پیارا ہے، اچھا ہے، خوبصورت ہے۔“ ربیعہ ہنسنے لگی تھی۔  
ترانہ نے خفت سے اس کی جانب دیکھا۔

”خداق اڑا رہی ہو؟ اڑا لو۔“ پھر اچانک ہی وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔  
”اسے ربیعہ! ایک بات بتاؤ۔ کسی لڑکے نے کبھی تمہیں گفت دیا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کسی نے محبت کا اظہار کیا؟“ وہ رشوق انداز میں پوچھ رہی تھی۔

ربیعہ کی نگاہوں کے سامنے سے یکے بعد دیگرے کتنے ہی مناظر گزر گئے۔ اس نے تفر سے سر کو جھٹکا۔

”پتا ہے ترانہ! مجھے بیزاری ہے اس لفظ محبت سے۔ کراہیت آتی ہے جب کوئی مرد نگاہوں میں ہوس ناکی بھر کر عورت کو دیکھتا ہے۔ اور اس سے آخری فیصلے بولنا شروع کرتا ہے۔“

”ارے بدھو!“ ترانہ خفا ہو گئی تھی۔ ”کیا بکواس کیے جا رہی ہو؟ میں محبت کی بات کر رہی ہوں ربیعہ! ہوس کی نہیں۔ تم محبت کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”ہر کسی کی زندگی میں ایسا کوئی جذبہ ہونا بہت ضروری ہے کیا؟“

”تو اور کیا؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”یہ تو توانائی ہے ربیعہ! توانائی جس کے سہارے انسان اپنی عمر تمام کرتا ہے۔ توانائی کے بارے میں جانتی ہو؟ یہ ششکلیں بدل لیتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی، مرتی نہیں۔ ایک رشتے سے دوسرے رشتے تک سفر کرتی ہے۔ اپنے رنگ بدل لیتی ہے لیکن ہر انسان کے اندر اس کا منبع ضرور ہوتا ہے۔ اس منبع کے بغیر

زندگی ناممکن۔ ناممکن کہ تم نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی؟“

”کی ہے۔ بہت زیادہ کی ہے۔ اپنی دادی جان سے۔“ وہ آزرہ ہو

”بس! ہے نا منبع۔ نکل رہی ہے نا کہیں سے توانائی ایسے ہی ایک دن اس منبع سے خالی ہو جائے گی اور رچا کی کرنیں۔ لیکن پھوٹنے کی ضرور۔ بے وقوف لڑکی! تم محبت کے لہجے کو انسان زندہ کیسے رہے؟“

ربیعہ مسکرا دی۔

”تمہاری پچھو کیسے جیتی ہیں؟“ وہ ازراہ تشن بولی۔ ”تم تو کہتی ہو! انہیں محبت کے نام سے نفرت ہے تو پھر کس توانائی سے جی رہی ہیں بھلا؟“

ترانہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں اس کی نا سمجھی کے لیے تائید تھا۔

”تم کیا سمجھتی ہو ربیعہ! پچھو کے اندر محبت نہیں ہے؟ انہوں نے کبھی کسی کو چاہا نہیں ہے؟ انہوں نے تمہارے ابو کو چاہا تھا۔ بے خدو بے حساب لیکن۔“

”لیکن کیا؟“ ربیعہ نے جیسے ایک خواب کے عالم میں پوچھا تھا۔

”لیکن ربیعہ! توانائی کو اگر صحیح طرح استعمال کرنا نہ آتا ہو تو حافظہ بکھیر دیتا ہے۔ پچھو نے مجھ سے کہا کہ وہ ٹھیک طرح سے اس کا مفہوم نہ جان سکیں۔ انہیں جلتی جلتی شیشی کی بوتلوں کے پانی سے شرب کر کے بجائے اس سے اپنے ہاتھ جلالے۔“

ربیعہ کو اس کی گفتگو بے مقصد اور طویل معلوم ہونے لگی لیکن ترانہ کسی اور ہی تصور میں کھو گئی تھی سواں نے ربیعہ کی اکٹھا ہٹ محسوس نہ کی۔

”پتا ہے ربیعہ! اگر عبدالباری تمہیں دیکھے اور تم سے متاثر ہو جائے تو میں کیا کروں گی؟“

ربیعہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔

”میں خوشی خوشی تمہیں اس کی دلہن بنا دوں گی۔“

”ترانہ!“

”ایک مثال دے لڑی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے توانائیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پچھو محبت کی جلتی شیشی سے اپنا دل جلا لیا۔ اپنا گھر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دیکھا۔ سنا۔ بہت حسین خاتون تھیں۔ تمہارے جیسی ہوں گی نا! ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میں جج

انہیں گھر لے آئے۔ پچھو نے یہ خبر سنی تو انہوں نے کپڑے مار دو آئی پی لی۔ بہت مشکلوں سے ان کی جان بچائی گئی۔ ابو نے جلد بازی میں پچھو کی شادی اپنے ایک عزیز دوست کے بھائی سے کر دی۔ وہ اچھا آدمی تھا۔ اس نے پچھو کو خوش رکھنے کی کوشش کی لیکن۔“

اس نے گہری سانس بھری۔

”پچھو نے اپنی محبت کو اپنی جان کا روگ بنا لیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ پچھو نے محبت کی کرنوں کا رنگ نفرت کے دھوپ سے سیاہ کر دیا۔ بالکل سیاہ۔ پتا ہے ربیعہ! پچھو میں محبت بہت زیادہ ہے۔ بہت زیادہ۔ لیکن سیاہ رنگ کی ہے۔“

”تم عجیب باتیں کرتی ہو ترانہ۔“ ربیعہ بولی۔ ”مجھے تمہاری باتیں کبھی کبھی سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”آئیں گی سمجھ میں! بس منبع سے کرنیں پھوٹنے کی دیر ہے۔“ اس نے معنی خیزی سے سر ہلایا۔

”مجھے خند آ رہی ہے ترانہ۔“ اس نے جمائی لی۔

”پتا ہے۔ مجھے آج ساری رات خند نہیں آئے گی۔“ ترانہ نے محبت سے سوٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

بہت زیادہ

دل بے حد پیچھا۔ ہو رہا تھا۔ نجانے کیوں۔ اسے خواہ مخواہ ہی غصہ آتا۔ کسی سے بات کرنے کا جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ درجہ محبت اور دل ہو رہی تھی۔

ایسے ہی غم میں بھر پور محبت کے ساتھ اس نے آپریٹر سے کال ملانے کے لیے کہا۔ اس کا دل عاشق کی آواز سننے کی فضا بن گیا تھا۔

”دو دو کی جانب سے بولی۔ آواز سننے لگی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھایا تھا۔“

”یہ کونسی کھنکھاتی ہوئی آواز تھی۔“

ایقان بے۔ ”یہ کونسی کھنکھاتی ہوئی آواز تھی۔“

”ایسا۔“ ”کیا میں عاشق کے ہاتھ پر کھنکھاتی ہوئی؟“ اس نے انگریزی میں پوچھا۔

”ہاں۔“ ”میں ان کی ڈال ہوں۔“ وہ اب تک بے یقین تھی۔

ریسیور عاشق نے لے لیا تھا۔ اس نے شاید اس عورت سے سخت لہجے میں کوئی بات کی تھی۔ ایقان کو ٹھیک طرح سے سنائی نہ دیا۔

”سیاوا!“ اب عاشق لائن پر تھا۔

”عاشق!“ اس کا جی بھر آیا۔ ”میں ایقان ہوں۔“

”ہاں جانوس۔ میں نے پہچان لیا ہے۔ کیسی ہو؟“

”کون ہے تمہارے پاس؟“ وہ مزید کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی۔

”بچے کیسے ہیں؟ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ اس نے سنی ان سنی کی۔

”مگر نے پوچھا وہ کون ہے۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

(باقی آئندہ)

رکتے ہیں۔ دوکانیں اور ایک گھر اس کی ملکیت ہے۔ حاکم چچا کو دکانوں کا کرایہ لانے کی ذمہ داری سونپ کر مذہب قدرے فکر معاش سے آزاد ہو جاتی ہے۔ بوا سیکھنے بھی پڑوس ہونے کا حق بھرپور طریقے سے ادا کر رہی ہیں لیکن ان کی گفتگو میں ربیعہ کو تلخ حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر بیچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریداران کا ہنسنی عرفان شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگاتا ہے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔

ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائیں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی کے ٹرنک میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیس یا اس کی بیوی بیویوں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شملہ اپنی ماں منیہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شملہ کو طلاق ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھروں کے اکثر اپنے بیٹے سے باتیں کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم ڈاکٹر شملہ سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔ ربیعہ اپنی تنہالی اور لوگوں کو بدلتے رویوں سے تنگ آ کر اپنی پیچھونکے علاقہ پر جانے کا ارادہ لیتی ہے۔ ربیعہ کی ملاقات عباد سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ربیعہ تنہا ہو کر رہی ہے اس کی جو پیچھونکے گھر تک رہنمائی دے ذمہ داری لے لیتا ہے۔

عاشق (ایقان کا شوہر) اپنے دفتر سے نکلا تو لیزا گاڑی لیے اس کی منتظر تھی۔

## ۱۳ تین سو تیس

”کیا ہو گیا ہے ایقان تمہیں؟“ وہ جیسے اسے چمکارتے ہوئے تھا۔ ”میری لینڈ لیڈی ہیں۔ اکثر آتی ہیں۔ والٹس براہم یار؟“ ایقان خاموش ہو کر گھرے گھرے سانس بھرنے لگی۔ کیا بتائی اسے کہ چند گھنٹوں میں ہی لیٹا تو ایسا کر کیا کچھ بیت چکا تھا۔ اس کی قربت میں کسی دوسری عورت کے وجود کا احساس کیا۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔

اس کا باتیں کرنا اس کا مسکراتا اس کا وہ گہری نگاہوں سے دیکھنا کہ وہ سمٹ کر رہ جاتی۔ زیر لب وہ شرر مسکراہٹیں جن کی پھوار اس کا تن من بھگودیتی۔ وہ سب کچھ ایک دوسری عورت کے قریب تھا۔ ایقان تصور سے ہی مجلس کر رہ گئی تھی۔

”ایقان! جانو بولو نا کچھ؟“ وہ پریشان ہوا تھا۔

”عاشق! اس کی آواز بھیگ گئی۔“ میرا دل بہت ادا ہو رہا تھا۔ میرا جی رونے کو چاہ رہا ہے۔ مجھے ہر وقت رونا آتا ہے عاشق۔“

وہ سچ رونے لگی تھی۔ عاشق کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیوں اداں تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بوکھلا سا گیا۔

”ایقان! ٹیک اسٹ ایزی یا رکھاں ہو تم؟“

”میں اماں جان کی طرف ہوں۔“ اس نے سسکی بھری۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر نے رسٹ کے لیے کہا تھا اسی لیے یہاں آئی۔“ اس نے بھیگی بھیگی آواز میں بتایا۔

”بچے؟ بچے کیسے ہیں؟ ایمان کیسی ہے؟ اور موس؟“

”سب ٹھیک ہیں۔ خیریت سے ہیں۔“

”اور! اس نے گہری سانس بھری۔“ پھر میری جان! رو کیوں رہی ہو؟ کیا ہوا ہے گڈے؟“

ایقان یکدم چپ ہوئی تھی۔ برسوں بعد اس نے اس انداز سے پکارا تھا۔ ایقان کے لبوں پہ پل بھر میں مسکراہٹ کی جوت جل اٹھی۔ وہ بہت محبت سے برس جانے کے موڈ میں اسے یونہی پکارا کرتا تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی یادگار تھا یہ لقب۔

”افسس گڈے! ادھر آؤ۔“ ایقان غصے میں بھی ہوتی تو نفیس پڑتی۔

اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔

”تجھے ہے یار!“ وہ ریلیکس ہوا۔ ”تم نے تو جان ہی نکال دی تھی۔ بھلا اتنی دور سے اس انداز میں پریشان کرو گی تو کیا ہو گا۔ پہلی فرصت میں ٹکٹ کٹا کر دوڑا بھاگا چلا آؤں گا۔ نوکری جائے بھاڑ میں۔“

”تو تو ٹھیک ہے پھر۔“ وہ شانت ہو گئی۔ ”میں روز یونہی پریشان کروں گی تمہیں۔“

”بھندے کا تصور؟“

”تم بندے ہو؟ ایسے ہوتے ہیں بندے؟ اتنے سالوں سے میرے حوصلوں کو یوں آزمارے ہو جیسے میری فوجی ٹینک ہے۔ تم اس بندی کا تصور بتاؤ؟ دن سے کھینچ کر رات کرتی ہوں اور رات کو کھینچ کر دن۔ کب ختم ہو گا؟ سزا؟ ملک میں تو زنگار نہیں ہے کیا؟ لوگ ریتے نہیں ہیں؟ کھاتے نہیں ہیں؟ جا کر بیٹھ گئے ہوا اتنی دیر۔ تجھے کرب خیزی سے لگا ہوا۔“ وہ پھر پڑی سے اترنے لگی تھی۔

”یار! میرے گھر آیا ہوں تمہاری خبر گیری کے لیے۔ یاں تمہارے پاس بھائی تمہارے پاس میرے بچے تمہارے ہیں۔“ وہ تنہائی سے ز میں گزرتا ہوں یا تم؟“

”تمہاری خونخواری ختم ہو گئی۔ تمہیں شکایت کا اعتبار نہیں۔ اور۔ اور۔ جو نام گنوار ہے ہو ان میں سے کسی ایک کو۔“ وہ تنہائی سے لگتا میرے لیے۔ تم تم ہو۔ میرے دن رات تم سے بندھے ہوئے ہیں۔ ایک تمہارا ہاتھ تمام کر میں ان تمام رشتوں سے منہ موڑ کر خوشی خوشی چل پڑی تھی اور تم کہتے ہو کہ سب لوگ ہیں تو سہی میرے پاس۔“

”آبا!“ اس نے چٹا رہ بھرا۔ ”لطف آگیا یا! ایسی پیاری پیاری باتیں اور مل بھی اپنا نہ بنے‘ ماسوجی کا بنے۔ مزے کی بات ہے نا۔“

”عاشق! میری جان پر نی ہے تمہیں مذاق سوچ رہا ہے۔“

”کیوں پریشان ہوتی ہو جانو! تھوڑا سا انتظار، تھوڑا سا صبر پھر سارا وقت ہمارا ہو گا‘ سب خوشیاں ہماری ہوں گی۔ پریشان نہ ہو کرو۔ تمہارے لیے اور بچوں کے لیے ہی کر رہا ہوں نا سب کچھ۔ میرے حصے میں یہ گلے شکوے تو مت ڈالو ایقان!“

اس کی آواز میں تھکن در آئی تھی۔ ایقان خاموش ہو گئی۔

”سوری عاشق!“ پھر وہ بولی۔ ”میں نے یونہی تمہیں پریشان کیا۔“

”میں سچ سچ پریشان ہو گیا تھا۔ آئندہ اس طرح روتے ہوئے فون مت کرنا ایقان۔ پلیر!“



”اچھا ٹھیک ہے۔ میں اب فون بند کرتی ہوں۔“  
 ”بس ایسے ہی؟“ وہ مسکرایا۔  
 ”آئی لو یو۔“ وہ ہنسنپ کر بولی۔  
 ”لو یو ٹویار۔“

ایقان نے ریسور رکھ دیا۔

دوسری جانب وہ گہری سوچ میں تھا۔ کارڈلیس کا اینٹیٹنا دانتوں میں دبائے وہ نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ لڑا اس کے قریب چلی آئی۔

”میں سوچ رہی تھی کاش میں اردو سمجھ سکتی۔“ وہ شرارت سے بولی۔  
 عاشق نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کی بات کے مفہوم پر چند لمحے غور کرنے کے بعد وہ مسکرا دیا تھا۔

\*\*\*

پھر وہی دھند تھی وہی سراب کی کیفیت۔  
 ربیعہ ننگے پاؤں گرم ریت پر دوڑ رہی تھی۔ آگے پانی تھا۔ شفاف پانی۔ ربیعہ دوڑتی جاتی تھی آگے سر قلابا جاتا۔  
 چھٹاڑیوں کے سر جھکے ہوئے تھے ٹیلوں میں دائرے دو دائرے تھے اور اس میں کسی جسم کی بھری سانس کی گونج تھی۔

”پانی۔ پانی۔ پانی۔“

ربیعہ دوڑتے دوڑتے تھک گئی تھی۔ اس کے گھٹنوں میں ہلکتی نہ رہی تھی وہ گرنا چاہتی تھی تھک کر ڈھیر ہو جانا چاہتی تھی۔

”تم نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی ربیعہ؟“ ترانہ نے ہنس کر پوچھا۔  
 سوال اس کے چاروں طرف چکرانے لگا تھا۔ لفظ ہنس رہے تھے۔  
 ”محبت نہیں کی؟ نہیں کی؟ کسی سے نہیں کی؟“

”کی ہے۔ بہت کی ہے۔“ ربیعہ نے دوڑنا جاری رکھا۔ ”میں پانی لاتی ہوں دادی جان! میں لاتی ہوں میں ابھی لاتی ہوں۔“

**PIOTO**

”پانی۔ پانی۔ پانی۔“ حسرت بھری آواز۔

ربیعہ نے ایک جھٹکا کھایا اور ساکت ہو گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ چھت کو گھورتی رہی۔ پٹیکے کی گھر گھر کو بہت دیر تک سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کے برابر والی چارپائی پر ترانہ بے خبر سو رہی تھی۔ سرہانے مینا کا پلنگ تھا۔ مینا کے پلنگ کے برلی طرف پڑے صوفے پر صولت تھی۔ ربیعہ کچھ دیر بیٹھی بے بسی سے سب کو پرسکون نیند کے مزے لوٹتا ہوا دیکھتی رہی۔ پھر پکد مود چوکی۔ اسے آوازیں آرہی تھیں۔ گھٹی گھٹی آوازیں جن سے مفہوم واضح نہ ہوتا تھا۔ وہ آوازیں کس کی تھیں کون گھنٹگو کر رہا تھا اسے اندازہ نہ ہوا۔ پھر اسے پھپھا کا خیال آیا۔ کہیں وہ پکار تو نہیں رہے؟ انہیں کسی مدد کی ضرورت تو نہیں۔

یہ خیال آتے ہی وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی۔ اپنا دوپٹہ سنبھال کر وہ ترانہ کی چارپائی کے قریب سے نکلتی چلی گئی۔ تیز مگر بنات قدموں سے وہ کمرے کے دروازے تک پہنچی مگر پھر اندر سے آئی ہوئی آواز پہچان کر وہ پیکاک اوت میں ہو گئی۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ ضدی لہجے میں بولتا یہ تمدن تھا۔ ”آپ کو رقم دینا پڑے گی۔“

”الو کے بیٹھے۔ گردھے کی اولاد۔ کھوں کھوں کھوں۔ ناخلف۔ مردار۔ کھوں کھوں کھوں۔ تو سمجھتا کیوں نہیں؟ تیرے دماغ میں اس بالٹی سے زیادہ گند بھرا ہوا ہے۔ کینہ ہے تو۔“ منور امین غصے کی شدت سے گھٹے جا رہے تھے۔

”ہاں ہاں کینہ ہوں۔ ہوں میں کینہ۔ میری زندگی تم نے تباہ کی ہے تم نے۔“ وہ نفرت سے پھنکارا۔  
 ”لیکن ایک بات یاد رکھنا جو بھی ہوں تمہارا بیٹا ہوں۔ میں رقم نکلا کر رہوں گا۔“  
 ”تو میری قبر کھودنا۔ میری قبر کھودنا آکر۔ اس میں سے نکلے گی رقم۔ سمجھا تو۔“  
 ”کھودوں گا۔ قبر بھی کھودوں گا لیکن پھوڑوں گا نہیں۔“

ربیعہ کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپے جا رہا تھا۔ ہاتھ تھر تھرا رہے تھے اور سانس دھونکنی بنا ہوا تھا۔

وہ بڑی مشکلوں سے اپنی چارپائی تک پہنچی تھی۔ رات کے تین بجے ہونے والی اس گفتگو کے پس منظر سے وہ ناواقف تھی لیکن فریقین کے تیور اور انداز اسے ہراساں کر گئے تھے۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ تمدن اسے شروع دن سے پرانا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی بدروح کی مانند لگتا تھا جو انسانی جسم میں حلول کر گئی ہو۔ اس وقت بھی اپنے باب اس کا طرز مخاطب نہایت جارحانہ تھا۔ ربیعہ بستر پر کھیس اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس میں ٹھنڈی سرائیت کر رہی تھی۔ وہ اپنا خواب بھول بھال کر اب اس واقعے پر غور کرنے لگی تھی۔

\*\*\*

پچھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے وہ بار بار پانی مانگ رہے تھے۔  
 ربیعہ آنکھوں میں پانی پانی کر رنج ہو گئی تھی۔ اسی حساب سے اسے بار بار وہ گندی بالٹی لٹاٹ میں لے جا کر خالی کر دیتی تھی۔ وہ پانی سے پھٹنا چاہتی تھی کہ آخر انہیں کس کی بددعا ہے؟ یہ پیاس کس گناہ کا خمیازہ ہے لیکن ایسا سوچنا خدائے خالی سے روکنے سے ماتھے پر بل پڑ سکتے تھے اور ماتھے کے بل انہیں فوراً دکھائی دے جاتے تھے۔

”تم نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔“

”ہاں۔ کچھ نہیں۔ تمہیں اپنی بوڑھی دادی یاد آ رہی ہے شاید۔ کیوں؟“

ربیعہ نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

”یا اپنی بنگوڑی ماں۔ بابا بابا۔ ہیں؟ کیوں؟“

ربیعہ نے چونک کر ان کی صورت دیکھی جس پر طنز کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ بے یقینی سے کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ یہ انہوں نے کیا کہا ہے۔

”کیا۔ کیا کہا آپ نے؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ”میری امی کے متعلق؟“

”امی؟ بابا بابا۔ امی۔ بہت گودوں میں کھیلی ہونا تم اس کی۔ امی جان کو اس کو۔“

ربیعہ کی آنکھیں اچانک ہی پانیوں سے لہلہا بھر گئیں۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے وہ پتھر میں چلی آئی اور سنگ میں جھک گئی۔ اس کے اندر درد کی ٹہسیں اٹھنے لگیں۔ اس نے غل کھول دیا تھا۔ پانی اسٹیل کے سنگ میں گر کر شور مچانے لگا۔ ربیعہ کے اندر آنسو شور مچا رہے تھے۔ سسکیاں چل رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر سنک کے پاس کھڑی رہی۔ سیاہر صحن میں مینا کے چلنے پھرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کسی کام سے پڑوس میں گئی تھیں اور اب واپس آچکی تھیں۔  
ربیعہ نے بے وجہ ہی چولہا جلایا۔  
”کیا کر رہی ہو؟“ انہوں نے اندر جھانکا۔

”چائے بنا رہی ہوں۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔  
”اچھا۔ ایک کپ سے زیادہ نہ بنے، پتی بہت مہنگی ہے۔ بار بار چائے کا شوق کوئی اچھی لت نہیں۔“ وہ چیل گھسیٹتے ہوئے باہر چلی گئیں۔

”پھپھو کے اندر سیاہ رنگ کی محبت ہے۔“ اسے ترانہ کے الفاظ یاد آئے تھے۔  
ایک زخمی مسکراہٹ اس کے لبوں پر سج گئی۔ اب وہ ترانہ سے کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی۔ یہ کہ ترانہ کے باپ کے اندر کس رنگ کی نفرت ہے؟ ربیعہ کے ذہن میں گہرا سبز رنگ آیا تھا۔



اسے غم زندگی، کچھ تو دے مشورہ  
میں کہاں جاؤں ہوتا نہیں فیصلہ  
اک طرف اس کا گھر، اک طرف مکان  
مغنی کی آواز، ساز کی جھنکار کے ساتھ گونج رہی تھی۔  
”یہ ہر وقت غم نہیں کیوں اسے رہتے ہو؟ اس روں۔“ وہ پتہ نہ لگا کر بولی۔  
”تمہیں پسند نہیں؟ مجھے تو بہت پسند ہیں۔ مجھے یہ آج کل کے بے سُرے پاپ سگرز ایک آنکھ نہیں بھاتے،  
اس پر عجیب قسم کی تنگ بندی۔ کم از کم اسے شاعری تو بہتر گزرتی ہے، کہا جاتا ہے۔ شاعروں کی ارواح دوبارہ اجتماعی خود  
کشی کر لیں اگر یا اپنے شکر کو سن لیں تو۔“  
عریشہ کو اس کی بات پر بے حد ہنسی آئی تھی۔  
”ارواح اور اجتماعی خود کشی؟“  
”یار! ارواح کے اجتماع کو کوئی بے دلی طریقہ تو دکاویں۔“  
”مجھے تو سب سگرز پسند ہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”جو بھی نئی کیسٹ آئے میں شوق سے خریدتی ہوں۔“  
”ارے بے حد بد ذوق ہو۔“

**URDU**

”تب ہی تو تم سے باتیں کرنے لگی ہوں۔“ وہ برجستہ بولی۔

”صرف باتوں سے کام نہیں چلے گا جناب۔ بد ذوقی کا پورا پورا ثبوت دینا پڑے گا۔“ وہ مزے سے بولا۔  
”یعنی؟“

”یعنی شادی بھی کرنا پڑے گی مجھ سے۔“

عریشہ بے ساختہ شرمائی۔ ”یہ تم یکا یک ٹریک کیوں بدل لیتے ہو؟ شادی وادوی کی باتیں مت کیا کرو۔“  
”کیوں؟ شادی بھی نہ کروں تم سے؟“

”فراز پلینر۔“

”میں سیریس ہوں عریشہ! لو ان فریٹ سائٹ کا شکار ہوا ہوں۔ تم مجھے اسی دن بہت اچھی لگی تھیں۔ تمہارا

انداز بالکل مختلف ہے۔“

”اس دن تو ہم تین تھیں۔“ وہ شرارت سے بولی۔ ”تم نے کیسے جان لیا کہ میں وہی ہوں؟“

”تمہاری آواز سے۔ غلطی کی گنجائش ہی نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا ”اور پھر اتنے دنوں سے ہم باتیں کر رہے ہیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔“

عریشہ پھر ہنس دی تھی۔ اچانک ہی وہ چونکی۔ بیٹھے کے دروازے سے باہر کھڑی شفیقہ حیات اور عذرا بیگم دکھائی دے رہی تھیں۔

”اچھا سنو، کل بات کریں گے۔“ اس نے جلدی سے ریسور رکھ دیا۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے دروازے تک گئی اور دروازہ کھول دیا۔

”السلام علیکم رابی جان۔ چچی جان۔“ اس نے جھکتے ہوئے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔“ دونوں اسے دیکھ کر کھیل سی گئیں۔

”ہاں کیا کر رہی ہیں تمہاری؟“

وہ صوفوں تک آ گئیں۔

”امی شاید اوپر ہیں میں بلاتی ہوں۔“ وہ مڑنے لگی۔

”اچھا سنو۔ رگوزرا۔“ شفیقہ حیات نے اسے پکارا۔

”یہ اٹکو بھی پہن کر دیکھو، یہی ناپ ہے نا تمہارا؟“

”اٹکو بھی؟“ اس نے دلچسپی سے ان کے ہاتھ میں ہلی مٹھلیں ڈبیا کو دیکھا۔

”ہاں۔ اور ذرا ڈیزائن بھی دیکھ لو۔ ہے تو پرانا مگر بے حد خوبصورت ہے۔“

”واؤ۔ کس قدر خوبصورت اور یونیک قسم کا ڈیزائن ہے۔ اینٹیک لگتا ہے۔ کس کی اٹکو بھی ہے یہ چچی جان؟“ وہ بہت متاثر ہوئی تھی۔

”میری مٹھلی کی ہے۔“ شفیقہ حیات ہنس دیں۔ ”برسوں سے سینت سنبھال کر رکھی ہوئی ہے ایسے ہی کسی موقع کے لیے۔ اب میری پوتی پہنے گی۔“

”کون سی پوتی دادی جان۔“ وہ شوخی سے ہنسی۔ ”میں بھی تو پوتی ہوں آپ کی یہ نظر کرم مجھ پر کیوں نہیں؟“

”اے ہاں تو کیا تمہارے فرشتوں کی بات ہے۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”تمہاری مٹھلی کا سامان ہی کرتے ہیں۔ عذرا تو نئی اٹکو بھی کا کہہ رہی تھیں مگر میں نے کہا۔ اتنی اچھی اور قیمتی چیز گھر میں موجود ہے تو الگ سے کیا پیسہ خرچ کرنا۔ وہی کسی اور مصروف میں آئے گا۔“

عریشہ گم صم سی ہو کر سن رہی تھی۔ ان کی باتیں اس کے سر کے اوپر سے سُر زدن بن گئیں۔

”ہم نے سوچا تمہاری رائے بھی معلوم کر لی جائے۔ آخر بچوں کے بھی سوشل ہوتے ہیں، لیکن تمہیں تو ہم سے زیادہ پسند آگئی۔“ وہ ہنسیں۔ ”اب تم اپنے جوڑے اور جوتی کا ناپ دو ہمیں۔“ ثانیہ ”سیدہ دوڑی آتی تھیں کہ ہم لاسٹے ہیں اپنی بھانجی کا ناپ۔ انہیں ڈانٹ کر بٹھایا کہ روٹی ہانڈی کرو گھر میں۔ ہمیں سو قسم کی باتیں اور بھی پتا کرنا ہیں۔“

انہوں نے متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”آخر مہیا تمہاری کس کو نے میں تمہیں ہے؟“ تب ہی فردوس بیگم اسٹور سے برآمد ہوئی تھیں۔ عریضہ اپنا بے

جان وجود کھینچتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے کان میں سا میں کر رہے تھے۔ کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔

بے دم سی ہو کر وہ بستر پر گر گئی۔ اس کے کانوں میں کسی کی شوخ ہنسی گونج رہی تھی۔ بے اختیار ہلکوں پر ایک قطرہ آن نکلا تھا۔

کبھی میں سوچتا ہوں اک سہانی صبح ایسی ہو کہ جب میں خند سے جاؤں

تو بیل بھر کو

مری آنکھوں کے آگے نور کی دیوار بن جائے

قدم رکھوں زمیں پر تو کوئی مجھ کو بلا تا ہو

مری ہستی کے چاروں اور اک گلزار بن جائے

بدھ جھنکار کے جگنو مرے دامن سے لپٹے ہوں

کسی کی مسکراہٹ ہی مری رفتار بن جائے

صبح کے نور سے روشن نگاہیں مجھ سے گھبراہٹیں

نظران سے ملے تو دفعتاً ”شیرما کے جھک جائیں

گنڈا برے تو میں لہراتے آچل میں سٹ جاؤں

میں اس کے مر مر میں پیکر کی خوشبو سے لپٹ جاؤں

میں انقبیوں میں دبائے وہ تادیر صغے پر ابھری ہوئی تحریر کو دیکھتا رہا۔

سب کے سب کے قلم سے سرزد ہوا تھا، اسے یقین نہ آ رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ کھڑکی میں جا کر کھڑا

ہو گیا۔ موسم نہایت دلغریب تھا۔ آسمان سیاہ گھاؤں سے ڈھک گیا تھا اور ہوا مستی بھری خنکی سے لبریز تھی۔

اس کی آنکھوں سے کاسنی پھولوں والی تیل کمرے میں گھسنا چاہتی تھی۔ تیل کی حرکت سے کبھی کبھی پانی کا ایک آدھ

قطرہ پڑتا۔ اس نے چپے چپا ہاتھوں سے لکڑا جاتا۔ وہ سوچتا رہا۔ اس نے وہ سب کچھ کیوں لکھا۔

”یار درخت، تجھ سے نہیں کرتا۔“ اس کے کانوں میں ہاشم کا جملہ گونجا۔

”بندر کیا کہتے ہیں؟“

”یہ نہیں جانتا۔“

خیال پر ساروں سے بھر پور تھا۔ آج موسم کی دلغریب نے وہ آچل اس کے پورے وجود پر ڈھک دیا۔ وہ

بے غور سا ہو گیا۔ سادے کاغذ پر لکھی سی باتیں چلی گئی۔ اور اب وہ بار بار اس تحریر کو پڑھتا تھا اور

اس سے اس کے ہونٹوں پر ہنسیاں اڑنا چاہا۔ ان خرافات کا وہ قائل نہ تھا۔ باہر بارش کی

چھماچھم میں تیزی آگئی تھی۔ کاسنی پھولوں والی تیل نے بہت سا پانی پھوار کی صورت میں اندر بھیج دیا۔ رافع نے

جلدی سے وہ صفحہ قائل میں رکھ دیا اور پھر کھڑکی بند کر کے لگا۔ آسمان پر سیاہیاں گہری ہوئی جا رہی تھیں۔ ہواؤں کا

شور بڑھنے لگا تھا۔ رافع کھڑکی بند نہ کر سکا۔ پانی اسے بہگورہا تھا۔ اس کی قمیص کے کھلے ہوئے بٹن سے بہت سا پانی

اس کے سینے کو بہاؤ گیا۔ اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال بھیگ گئے۔ وہ دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر جما کر کھڑا

ہو گیا۔ اس نے اچھنی طرح بھیگ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

\*\*\*

رودرو کر اس کی حالت غیر ہو چلی تھی۔ آنکھیں سوج کر آتھیں ”بندہ ہی ہو گئی تھیں۔ وہ بمشکل بھاری پوٹوں کو اٹھاتی تھی۔ فردوس بیگم بھی پریشان ہو گئی تھیں۔ ان سے اور کچھ نہ بن پڑا تو ماہین کو بلوا بھیجا۔ وہ بھی خبر سن کر

دوڑی بھاگی آئی اور اب ماں پر برہم ہو رہی تھی۔

”آپ نے بھی سترتھویں صدی کی ماؤں کو مات کر دیا ای جی! کم از کم اس غریب کے کان میں بات تو ڈال دی

ماہین سانس بھر کر رہی تھی۔

\*\*\*

”میں بہت دن سے دیکھ رہی ہوں تمہارے من کا موسم اب آلود ہے۔“ ترانہ نے اسے چھیڑا تھا۔ ”بات کیا ہے؟“ ربیعہ نے نظر بھر کر اسے دیکھا مگر خاموش رہی۔

”کتنے دن ہو گئے ہیں یہاں آتے ہوئے۔“ وہ پھر اودھرا دھڑکیٹھے لگی۔ ”تمہارا وہ منہ بولا بھائی بھی پھر دکھائی نہ دیا۔“

ربیعہ نے بھی اداسی سے گردن جھٹکادی۔ ترانہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کچھ دن سے وہ لوگ تقریباً ”روزانہ ہی وہاں آتی تھیں لیکن عباد اس دن کے بعد پھر دکھائی نہ دیا تھا۔“

”منہ بولی بہنوں سے بہت جلدی دل بھر جاتا ہے ان لڑکوں کا۔“ ترانہ شرارت سے بولی۔ ”تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ ویسے کچھ بتاؤ کیا اس کی وجہ سے اداس ہو؟“

”نہیں ترانہ۔“ زندگی کا کوئی مقصد بھائی نہیں دیتا۔ تم پلیز میرا ایڈیشن کروادو کسی پرائیویٹ ادارے میں۔“

”نہیں ترانہ۔“ پچھو پچھو نہیں پڑھنے نہ دیں گی۔ وہ تم سے نوکری کروانا چاہتی ہیں۔ کچھ دنوں سے وہ روز مجھے آفس جانے سے قبل یاد دہانی کرواتی ہیں کہ میں تمہارے لیے بھی اچھی سی نوکری ڈھونڈوں۔“ ربیعہ خاموش ہو گئی۔

”شاید ٹھیک ہی جاتی ہیں۔“ میں تم لوگوں پر ان چابا بوجھ ہوں۔“

”یہ نہ۔“ پچھو پچھو بہت مطمئن ہیں تمہارے آجانے سے۔ بھلا ان کا کیا نقصان ہے اس میں۔ دن بھر میں دو گھنٹے کھاتی ہیں۔ رات میں کام میں لگی رہتی ہو۔ ابو کی ساری ذمہ داری تم نے سنبھال لی ہے جو ہمارے گھر کا سب سے بڑا کام ہے۔ کوئی تمہاری جگہ نہیں لے سکتا۔“

”نہیں۔ اب وہ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔“ وہ دن بھر کھلے میں پھرتی ہیں۔ ورنہ تو وہ گھر سے نکل نہ پاتی تھیں۔

”بھئی۔“ وہ جب میری اور سوسائٹ کے روبرو تبتو اپنا یہ شوق پورا کرتی تھیں۔ وہ تمہارے آجانے سے خوش ہے۔ ہر ماہ وہ حاصل کرتی ہیں۔ تمہاری پڑھائی سے تو انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔“

ربیعہ سوچ میں پڑ گئی۔ ترانہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مینا سے ایسی خود غرض سوچ کے سوا کچھ امید نہ تھی۔

”منہ ترانہ۔“ وہ بولی۔ ”میں ہر ماہ انہیں کچھ رقم دے دوں گی۔ لیکن میں باہر نوکری کے لیے نہیں پڑھنے کے لیے جایا کروں گی۔“

”کیا مطلب؟“ ترانہ نے اسے گھورا۔ ”پھر نوٹ کیا کسی جادوئی درخت سے توڑ کر لایا کرو گی یا پھر تمہیں پڑھائی کے عوض وظیفہ ملا کرے گا؟“

”میرے پاس کچھ رقم ہے۔“ داؤدی کی وفات کے بعد ان کے بینک اکاؤنٹ سے مجھے اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ یہاں آنے سے قبل میں وہ پیسے نکالوا لائی تھی۔ تقریباً ”پچاس ہزار روپے ہیں۔“ ترانہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”تم نے۔“ تم نے وہ پیسے کہاں رکھے ہیں؟ ربیعہ! انہیں حفاظت سے رکھنا ورنہ تم ان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔“

ربیعہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”لیکن ترانہ میرے پاس زیور بھی ہے، میری امی کا زیور سوہ بھی اچھی خاصی مالیت کا ہوگا۔ میں نے سب چیزیں

ہوتی۔ اسے خبر تو ہوتی کچھ۔ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں ان باتوں کو بہت قیل کرتی ہیں۔“

”اے ہاں، ٹیل ہی مچایا ہوا ہے تب سے۔“ وہ جل کر بولیں۔ ”جا کر کہہ دیں باؤ کو جنہوں نے رشتہ پکا کیا ہے خوشی خوشی یا پھر دادی کی گردن پکڑیں جو ایسا خیال جی میں لائیں۔ ہم بے قصوروں کو کس بات کی سزا دے رہی ہے۔“

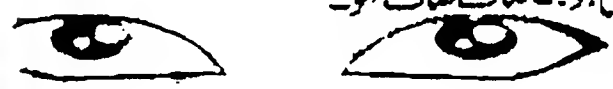
عریشہ پتنگ پردوں میں تھیں۔ سیمٹے بیٹھی ہوئی تھی۔ پاس ہی ٹشو کا ڈبہ رکھا ہوا تھا جس میں سے ٹشو نکال نکال کر وہ وقتاً فوقتاً ”آنکھیں اور ناک صاف کر رہی تھی۔“ ماں کی بات سن کر اس نے شکایت بھری نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔

”وہ بھی تاسف سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔“

”بس کہہ دیا ہے میں نے۔“ وہ ضد سے بولی۔ ”مجھے نہیں کرنی ہے متکلی و تکلی۔ بے شک ساری زندگی میری شادی نہ کریں لیکن نافع سے شادی نہیں کروں گی میں۔ میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میں اسے ذہنی طور پر قبول نہیں کر سکتی۔“

”اچھا تو بتاؤ ہمیں،“ کسے دیکھتی ہو ان نظروں سے تم؟ ہم اسی سے نکاح پڑھوا دیں تمہارا؟“

”خفگی سے گویا ہوئیں۔“ باؤ کو بڑا مان ہے بیٹی پر اور ہم بھی دھڑکتے سے کہہ چکے کہ ہماری بیٹیاں ماں باپ کے فیصلوں کے آگے سر نہیں اٹھاتیں۔ اب ہم بھی شرمساری سے سر اٹھائیں گے جب وہ مجھے طنز بھری نظروں سے ہمیں چھیدیں گے تو۔ غضب ہو گیا غضب۔ قرب قیامت۔ بیٹا ہے تو بغاوت۔ جتنی ابرار رہا ہے بیٹی اس سے دو ہاتھ آگے۔ ماہین! میں کہہ دیتی ہوں مجھے زہر لادو میں چھٹکا دو پاؤں ان سب جھمیوں سے۔ اسی لیے انہیں پال پوس کر اس قابل کیا کہ یہ ہمیں زہر کھانے پر مجبور کریں۔ ارے لڑکی! میں کہتی ہوں آخر کیا خرابی ہے نافع میں؟ خوبصورت ہے، جوان ہے، ذہین، باادب، بچہ ہے۔ اور تمہاری نظروں میں نہیں سہارا۔ تم خود کو کون سے پرستان کی پری جانتی ہو۔ اور مجھے بتاؤ کہاں مانکا جوڑے بیٹھی ہو؟ صاف صاف کہو۔“



”اے۔“ ماہین نے تینہی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

عریشہ دھواں دھار روئے ملی تھی۔

”اے ہاں۔ تو کیا سمجھوں؟ تم ہی کہو؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں چلتی ہوں، تم پوچھ کر بتاؤ ہمیں کیا مسئلہ ہے۔ اور اسے اپنے سسرال کے قصبے بھی سناؤ دو چار ذرا آنکھیں کھلیں لی لی کی۔ بہت افسانوں کی دنیا میں گم ہیں۔“



وہ اپنا وجود سنبھالتی، بکتی، جھکتی باہر نکل گئیں۔

ماہین اپنی جگہ سے اٹھ کر عیشہ کے پاس چلی آئی تو وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

”اپنا! بس مجھے نہیں کرنا متکلی۔ آپ کہہ دیں بابا سے۔“

”اچھا کہہ دیتی ہوں تم جی براست کرو۔“ اس نے پیار سے اس کا سر سہلایا۔ ”لیکن پتا بھی تو چلے آخر بات کیا ہے۔“

عریشہ نے چند لمحوں کے لیے سوچا۔ ابھی کسی سے کچھ کہنا قبل از وقت تھا۔ ابھی تو وہ خلا میں کھڑی تھی محض اپنی خوش گمانیوں کے پروں کے سہارے اور خوش گمانیوں کے بر تو موم سے بنے ہوتے ہیں۔ حقیقت کی ذرا سی پیش آن میں جا بجا سوراخ کر دالتی ہے۔ خواہشوں کا موم پکھل پکھل کر دل پر گرنا ہے۔ اور آبلے ڈال دیتا ہے۔

”بولو عیشہ!“ ماہین نے اسے کریدا۔

”بس اپنا۔ مجھے نافع اس لحاظ سے پسند نہیں ہے۔“ وہ منمنائی۔ ”وہ میرا آئیڈیل نہیں۔ میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ پاؤں گی۔“



اپنے سوٹ کیس میں رکھی ہوئی ہیں۔  
”سوٹ کیس کولاک رکھتی ہو؟“ ترانہ بے کل ہو گئی تھی۔

”ہاں۔ بالکل خالی میرے نمفے میں ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ دیکھو ریجہ! میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتی لیکن ہمارا گھر اس معاملے میں کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ پیسے تو یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے انہیں راتوں رات پر لگ گئے ہوں اور خفیہ چور کا بھی علم نہیں ہو پاتا۔ تم اپنا سب سامان حفاظت سے رکھو۔ میں جلد از جلد تمہارا بینک اکاؤنٹ کھلا دیتی ہوں تمہیں اپنی رقم بینک میں رکھنی چاہیے۔“

”ہوں۔“ ریجہ نے کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلایا۔

”اوس۔ اوس۔ پچھو کو اپنی رقم دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ قدرے شرمساری سے بولی۔ ”جو کچھ تم ہمارے لیے کرتی ہو۔ وہی بہت ہے۔ مجھے پچھو سے لڑنا بھی پڑ جائے تو میں تمہارا ایڈمیشن کروا دوں گی۔ تم بے فکر رہو۔“

”منیڈم۔ آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔“

وہ ایک مریض کی کیس، ہسٹری بغور دیکھ رہی تھی جب ہیرو نے شہلا کی ہسٹری اسٹاف کے کونسلر اور ننگا ہوں میں الجھن لیے باہر کی سمت چل پڑی۔

ہاسپٹل کے لیے کوریڈور میں چلتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ اس سے ملنے کی ضرورت کس کو پیش آئی اور وہ بھی ہاسپٹل میں۔

اپنے کمرے کے دروازے پر وہ رک گئی تھی۔ آنے والا دروازے کی جانب پشت کیے کھڑا تھا۔ شہلا دروازے پر ہی کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہی۔ اس کی پزل ہیل کی ٹک ٹک پورے کوریڈور میں گونجی تھی۔ سوپ کے کتبے نہ تھا کہ وہ اس کی آواز سے بے خبر ہوا۔

”ایکسکیوز می!“ وہ اندر چلی آئی۔ ”آپ۔“

وہ آہستگی سے مڑا۔ شہلا پتھر کی ہو گئی۔ میروں پلین شرٹ اور فان کلر کی جینز میں وہ ابر چلائی تھا۔ شہلا کی آنکھیں آہستگی سے پھیلیں پھر ان میں پانی بھرنے لگا۔ اس کے گلے پر لکڑی کے گلاب لگے تھے۔ وہ ایک ٹک سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی نمی اور چہرے پر شرمساری تھی۔ شہلا چند قدم آگے بڑھی اور اس کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔ ابرار کی نظریں اس کے وجود پر پھسل گئیں۔

فیروز پلین ساڑھی اور سفید اور آل پہنے گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے وہ آج سے پانچ برس پہلے کی شہلا سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔

”بہت بدل گئی ہو۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کیوں آئے ہو؟“ اس کے لبوں سے سرگوشی کے سے انداز میں نکلا تھا۔

ابرار کی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ انگلی سے میز کی سطح پر لکیریں بنانے لگا۔

”جاؤ یہاں سے ابرا۔ پلیز۔“ شہلا نے منہ دوسری طرف پھیر کر کہا۔

”شہلا میں میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں بس ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا تمہیں“ عمر۔ عمر تمہاری باتیں کرتا ہے مجھ سے صرف تمہاری ہی باتیں کرتا ہے۔ اس کی باتوں نے میرے من میں خلش کی چنگاری کو لاؤ میں بدل ڈالا

”میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے شہلا۔“

شہلا کی آنکھ سے آنسو کا قطرہ گر کر اس کے اوپر آل میں جذب ہو گیا۔

”اب سب کچھ بعید از وقت اور بعید از اختیار ہے ابرار! میرا مذاق مت بناؤ دنیا کے سامنے۔ اب ان باتوں کی بھی گنجائش نہیں رہی زندگی میں۔ جاؤ یہاں سے اور کبھی دوبارہ مت آنا۔ پلیز۔“

ابرار نے ایک نگاہ میں اس کے سیاہ بالوں کو اس کی بھگی آنکھوں کو اور شدت غم سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا۔

”ٹھیک ہی کہتی ہو تم۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”وہ اجنبی ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں لیکن ہم تو نہ شناسا رہے نہ اجنبی۔ چلتا ہوں۔“

وہ اس کے قریب سے ہو کر نکل گیا تھا۔ شہلا کو بڑے زور کا چکر آیا تھا۔ وہ سر تھام کر میز پر جھک گئی۔ ضبط کے بند عن ٹوٹنے لگے تھے۔



”ایسا ایہ کہانی ایسے ختم نہیں ہو سکتی۔ آپ کو اسے ایک فل اسٹاپ دینا ہو گا۔“ انیتھ پریشانی سے کہنے لگی۔  
”ملا دونوں ہاتھ گود میں رکھے بالکل بے بسی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اس کے ذہن نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“ اس نے من کے سامنے اپنا جی بالکا کرنے کا سوچا تھا۔ اس نے اپنی سب پریشانی اس کے سامنے رکھ دی تھی اور سب خالی دماغ لیے بت بنی بیٹھی تھی۔

”بھی تو اس نے ابتدا کی ہے اور آپ جانتی ہیں وہ دل مارنے کا عادی نہیں ہے۔ جو من میں آئے، کر گزرتا ہے۔“ اس نے من میں کچھ اور ہی سودا سایا ہوا لگتا ہے۔

”میں یہاں سے چلا جانا چاہتی ہوں انیتھ!“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”میں کسی اور شہر جانا چاہتی ہوں۔ اپنے گھر لے کر یہاں سے شہلا کی بستر سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ بس یہی ہے میرے بس میں۔ عمر نہ ہو تو شاید میں مرنے کی بات کر لوں میرا یہی زندگی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی میں۔“

”ایسا۔“ انیتھ نے اسے غور سے دیکھا۔ ”ایسا! ایک بات کہوں آپ سے؟“ شہلا چپ چاپ بے بس لگتی تھی۔

”انیتھ۔“ شہلا جھٹکائی تھی۔ ”کوئی ڈھنگ کی بات ہے تو کرو۔“

”ایسا! آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے وہ ایک مخلص انسان ہے۔ اس کا ہاتھ تمام کر زندگی کی ہر الجھن کو سلجھالیں۔ پھر ماضی کی کوئی پرچھائیں کالی بلی کی طرح آپ کا رستہ نہیں کاٹے گی۔ ایک سیدھی راہ پر چل پڑیں ایسا۔ یہی ہر مسئلے کا حل ہے۔“

”نہیں انیتھ۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میری زندگی میں اب کسی مرد کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں سب سے بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ میں عمر کے ساتھ لاہور چلی جاؤں گی۔ میں کبھی پلٹ کر یہاں نہیں آؤں گی۔ میں عمر کے ساتھ یہاں سے دور بہت دور چلی جاؤں گی۔ ضرورت پڑی تو یہ ملک بھی چھوڑ دوں گی۔“

”یہ حل ہے آپ کے مسائل کا؟“ انیتھ نے حقارت سے اسے دیکھا۔

”شاید۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”یقیناً۔“

ربیعہ چونکہ اٹھی۔ باورچی خانے کی کھڑکی میں تصور کھڑا تھا۔

وہ تو نجانے کب سے وہاں کھڑا تھا۔ اپنے کام میں مگن ربیعہ نے بے خیالی میں ہی نگاہیں ادھر اٹھائی تھیں۔

”تصور بھائی۔۔۔“ اس کے لبوں سے نکلا۔ ”وہاں کیوں کھڑے ہوئے ہیں آپ!“

وہ مسکرانے لگا۔ اس کی نظروں میں پیغام تھا۔ ربیعہ کی چھٹی جس بیدار ہو گئی۔ اس کے ابرو تن گئے۔ وہ چولے کے سامنے سے ہٹ کر کھڑکی میں چلی آئی۔

”تصور بھائی۔“ اس کا لہجہ سخت تھا۔

”ہول۔۔۔“ وہ لگاوٹ سے بولا۔

”آپ کو کچھ کام ہے یہاں؟“

”کام؟ نہیں تو۔“ وہ مسکرایا۔

ربیعہ نے کھڑکی زور سے بند کر دی۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ پھر سے چولے کے پاس آئی لیکن اسے یاد نہ آیا وہ ہانڈی میں کیا ڈالنا چاہتی تھی۔

”ربیعہ۔۔۔ دروازے سے آواز آئی۔

ربیعہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اب دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے لبوں سے مسکراہٹ گویا گوند سے چپکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں وہی اچک تھی جو اب معدوم ہوتی ہی نہیں تھی۔

ربیعہ جتنے لمحے اسے دیکھتی رہی۔

”آپ کچھ لکھتے کیوں نہیں؟“ وہ غصے سے بولی۔ ”کیا کام ہے آپ یہاں۔۔۔“

”مجھے چائے بنا دے۔“ وہ کچھ جھینپ گیا۔

”اچھا بنا دیتی ہوں۔“ اس کے ابرو ہنوز تنے ہوئے تھے۔ ”لیکن کیا آپ چائے بننے تک یہیں کھڑے رہیں گے؟“

وہ شرمندہ سا وہاں سے ہٹ گیا۔ ربیعہ نے ہانڈی کے نیچے سگن بج کر کڑی اور چائے کا پانی دوسرے چولے پر رکھ دیا۔ اس کا ذہن بٹ گیا تھا ورنہ وہ بے حد مگن سے سالن بنا رہی تھی۔ سوچوں میں گم رہے ہوئے اس نے چائے بنائی تھی۔

”تصور بھائی!“ پکن سے نکل کر اس نے آواز لگائی تھی۔ ”چائے لے لیں۔“

جواب بدارد تھا۔ ربیعہ نے یکے بعد دیگرے تینوں کمریوں میں جھانکا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ حیران پریشان سی برآمدے میں کھڑی ہوئی تھی۔

پھر اسے خیال آیا کہ وہ یقیناً چھت پر چلا گیا ہو گا۔ نجانے کیوں وہ گھر کے افراد سے چھپتا پھرتا تھا۔ وہ پیالی لے کر صحن میں نکلی۔

”تصور بھائی۔۔۔“ اس نے پھر آواز لگائی۔ ”یہ چائے لے جائیں۔“

مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ربیعہ کا جی چاہا چائے کسی کیاری میں گرا دے اور جا کر اپنا سالن پکانے لگے۔ پھر خود پر جبر کر کے وہ سپرٹھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

وہ اپنی پتنگوں کے پاس بیٹھا تھا۔ ان میں سوراخ کر کے دھاگا پرو رہا تھا۔

”یہ سبجے اپنی چائے۔“ ربیعہ نے چائے اس کے قریب رکھ دی۔

”سنو ربیعہ۔۔۔“ اس نے آواز دی تھی۔

”کیا مسئلہ ہو گیا؟“ ان کے کان کھڑے ہوئے۔  
”دکھتی ہیں، نافع سے منگنی نہیں کر لی۔ یہاں جوڑے اور انگوٹھی کا ناپ بھی جا چکا۔ بتلاؤ، کس قدر سبکی کی بات ہے۔“

فاروق حسن کچھ دیر سکتے کی سی حالت میں بیٹھے رہ گئے۔  
”کیا مطلب؟“ پھر وہ سنبھل کر بولے۔ ”آپ نے عریشہ سے پہلے پوچھا نہیں تھا؟“  
”اے ہاں، سب قصور میرے، مجھے کیا خبر تھی کتنے پر نکالے ہوئے ہیں اس نے۔ بالشت بالشت بھر کی چھو کر یاں خود کو عقل کل سمجھتی ہیں۔“

فاروق حسن چند لمحے ساری بات سمجھنے کی کوشش میں خاموش بیٹھے رہے پھر اٹھ کر اپنا گاؤں پہننے لگے۔  
فردوس بیگم نے کن اکھیوں سے انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ ان کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ بھی اٹھ کر ان کے پیچھے پیچھے چل دیں۔  
انہوں نے عریشہ کے کمرے کے سامنے رک کر دروازہ بجایا۔

”نور!“ یہی کھلی گئی۔ سفید شلوار قمیص اور سفید تیل لگے سیاہ دھوپے میں بلبوس عریشہ ان کے مقابل تھی۔  
”کیا نہیں مترمیم نہیں اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔“  
”جیسے سننے سے ہٹ گئی۔“ آئیں۔“

وہ آگے کا ہوا بنو دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ فردوس بیگم بھی دلی دلی سی چلی آئیں اور ایک کونے میں دبک گئیں۔  
”بیبا!“ وہ کھڑے ہوئے۔ ”بدھ کے روز آپ کی منگنی کی چھوٹی سی رسم کر رہے ہیں ہم۔“

”اے ساتھ ساتھ کوئی تہنناض تو نہیں؟“  
”یہاں کی نگاہیں ہوں۔“ سرخ لب کا نپے لگے تھے۔ ماں کے مقابل وہ کیسی شیریں جاتی مگر باپ کے سامنے چپ رہتی تھی۔

”بیبا!“ اس نے تکیہ کیا۔  
”ان کے انداز میں بے حد ٹھہراؤ تھا۔“  
”پہلے سے ہی کسی کس طرح نہیں سوچا۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”اچھی بات ہے، بہت اچھی بات ہے۔ شریف لڑکیاں ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنے والی بنیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ گھر میں ساتھ رہتے گزرتے کو بھائیوں کی طرح سمجھتی ہیں لیکن بیٹے شادی ایک بالکل علیحدہ قسم کا بندھن ہے۔ ایسا بندھن جو چند لمحوں میں دو اجنبیوں کو ایسا آشنا بنا دیتا ہے کہ ساری زندگی کے لیے اعتماد اور اعتبار کا تحفظ میسر آ جاتا ہے۔ سوچے بیٹا! جب دو اجنبی ایک دوسرے کے متعلق بالکل نئے انداز سے سوچتے ہیں تو آخر اس رشتے میں کوئی تو ایسی اچھوتی بات ہوتی ہوگی۔ انسان کی سوجوں کو ایک بالکل نیا رخ مل جاتا ہوگا۔ ابھی نافع کے حوالے سے آپ کے نو خیالات ہیں، وہ قابل قدر ہیں۔ لیکن اس بات کا یقین کر لیں کہ بعد میں آپ کے ذہن میں کوئی گروہاتی نہ رہے گی، آپ ویسا ہی محسوس کریں گی جیسا ایک شریک حیات کے لیے کرنا چاہیے۔ بچوں کو بہت سی باتیں اپنے والدین پر چھوڑ دینا چاہئیں۔ وہ عمر عقل اور تجربے میں اولاد سے بہت آگے ہوتے ہیں بہت آگے کا سوچتے ہیں۔ ہم آپ کی عمر سے گزر چکے ہیں، سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کے کیا احساسات و جذبات ہوں گے آپ

”جی۔۔۔؟“ وہ مڑ کر دیکھنے لگی۔  
”او، تمہیں پتہ لگا اڑانا سکھاؤں۔“  
”شکریہ۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔ ”میں نے آپ کو بتایا تھا مجھے شوق نہیں ہے۔“

”ربیعہ۔۔۔ ربیعہ بات تو سنو۔“ وہ پتنگ چھوڑ کر اس کے قریب آگیا۔ ”تم مجھ سے ناراض سی کیوں رہتی ہو؟“  
ربیعہ نے ناگہی سے اسے دیکھا۔  
”نہیں تو، میں تو آپ سے ناراض نہیں رہتی۔“ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے سرسری سا اس کی طرف دیکھا۔

”اچھا تو کچھ دیر بیٹھو یہاں، میرے پاس۔“  
”تصور بھائی! ترانہ اور صولت آتی ہوں گی۔ مجھے کھانا پکانا ہے۔ چولہے پر سالن رکھا ہے، جل جائے گا۔“ وہ رسائی سے کہتے ہوئے مڑی۔

”سنو، سنو ربیعہ۔۔۔“ وہ پھر آگے بڑھ آیا۔  
ربیعہ نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔  
”تصور بھائی! مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ؟“  
اس کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ تصور ڈر گیا۔  
”نہیں تو۔“ وہ بولا۔ ”مسئلہ تو کوئی نہیں، میں پوچھ رہا ہوں کہ چیز کی ضرورت تو نہیں۔ کپڑے، چپیل، پنیں وغیرہ۔ لڑکیوں کا جو سامان ہوتا ہے مجھے لسٹ بنا دینا، میں لادوں گا۔“

ربیعہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔  
”مجھے جو سامان چاہیے تھا تصور بھائی! میں نے ترانہ سے سب کچھ منگا لیا ہے۔ آپ کے پوچھنے کا شکریہ۔“  
”اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔ چائے کے لیے شکریہ ربیعہ!“  
”کوئی بات نہیں۔“

وہ پھر رکی نہیں تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ خاموشی سے بیٹھا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔  
ربیعہ کے ذہن میں گہری پڑ گئی تھی۔

PHOTO

تخت طیش کے عالم میں، ان کے قریب آکر بیٹھی تھیں۔  
فاروق حسن سونے کے ارادے سے چشمہ اتار دیں۔ مگر ان کے تیور بھانپ کر وہ رک گئے۔ بغور انہوں نے اپنی بھاری بھر کم بیگم کے بگڑے بگڑے انداز دیکھے اور گہری سانس بھری۔  
”ہائیم کے پاس سے آ رہی ہوں۔“ انہوں نے اپنی طرف سے بے حد ہیچ نشانہ باندھا تھا۔  
”یہاں جس کے پاس چلے جاؤ اس کی اپنی ہی کمائی ہے۔ آدمی کس کس کو پورا پڑے۔ اے ہاں، اپنی تو عمر بیت گئی سب کی لٹو پٹو کرتے کرتے۔“

”کس نے کیا کہہ دیا بھی؟“ وہ سونا چاہتے تھے اور کسی قسم کی بد مزگی کی داستان سننے کے قلعہ ”موذین نہ تھے۔“  
”بھیا رانی سے پوچھو جنہیں ہری ہری سوجہ زہی ہے۔ نئے سے نئے شوٹے نکل رہے ہیں اس گھر میں تو۔“  
فاروق حسن! اپنی اولاد سے تمہاری نمٹو میں کہہ دیتی ہوں۔“

ہماری عمر کو نہیں پہنچیں، آپ نگاہ کی اس گہرائی کو نہیں جانتیں۔ آپ کے ماں باپ نے آپ کے لیے ایک اچھا فیصلہ کیا ہے اس کا اندازہ آپ کو عمر کا کچھ حصہ گزار کر ہو گا اور ضرور ہو گا۔“

انہوں نے ٹھہر کر بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ فردوس بیگم ان کی گفتگو سے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلائے جا رہی تھیں۔ لیکن عریشہ کے تاثرات کی سختی ہنوز برقرار تھی۔ وہ مارے باندھے بیٹھی تھی جیسے اس کا بس چلتا تو اٹھ کر کمرے سے بھاگ جاتی۔

”اور ایک آخری بات۔“ اب ان کے لہجے میں ٹھہراؤ اور سختی دور آئی۔

عریشہ نے قدرے چونک کر انہیں دیکھا۔

”میں اپنی ماں اور اپنے بھائی کو زبان دے چکا ہوں، میں جانتا ہوں بیٹا! کہ آپ کی ماں نے آپ سے پوچھے بغیر ”ہاں“ کر کے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے جس کے لیے پورے خاندان میں رنجش کی ایک نئی گرد ڈال دی جائے۔ آپ کے دل کو اگر نہیں پہنچی ہے تو آپ کا باپ آپ کے سامنے کھڑا سذرت خواہ ہے۔“

”بابا۔“ اس کے لب کا نیے۔

”لیکن اب آپ کو اپنے باپ کا مان رکھنا ہو گا۔“ انہوں نے اس کی جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر عریشہ نے اپنے سر پر ایک بے حد گراں اور قیمتی شے محسوس کی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اتر رہے تھے اور دل ہر خواہش سے خالی اور دست بردار ہو گیا۔

”مائی گاڈ۔“ ہاشم کے لبوں پر مسکراہٹ چٹکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں تحیر تھا۔ چہرے پر خوشی کی الوہی سی چمک تھی۔

”بہت اچھے بھی ہیں۔“ اس نے کاغذ لہرایا۔

رافع جھینپ کر ہنس دیا۔

”لیکن یہ ”پوشیدہ ہستی“ ہے کون؟“

”جانتا نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا کسی کو۔“

”پھر یہ سب کچھ کس فرشتے نے لکھوایا تم سے؟“ کوئی تو حرکت میں ہوئی۔

”تحریک تو مجھے تمہارے عشق سے ملی ہے۔“ وہ قلم کو انگلیوں میں گھمانے لگا۔ ”جی بات ہے۔“

”گویا ادھار کے جذبات ہیں؟“ پھر تو یہ نظم مجھے ڈاکٹر صاحبہ کی خدمت میں اپنے نام سے پیش کر دینا چاہیے۔

رافع! وہ منت بھرے انداز میں بولا۔

رافع نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”یا سہ چند ایک نظمیں ایسی اور لکھ دو مجھے۔ میں سنجیدہ ہو گیا ہوں۔“

”اے! رافع نے آنکھیں نکالیں۔ ”میرے جذبات کو دھڑکتے سے ادھار کا کہہ کر مذاق اڑاتا ہے اور مجھ سے

میری ہی نظمیں مانگ رہا ہے۔ ادھار یہ ہے یا وہ۔“

”بھئی۔۔۔ میرے جذبات ہیں نا اس نظم میں۔“

”الفاظ تو میرے ہیں۔“

”محبوبہ تو میری ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”تم تو یہ نظم کسی کے نام بھی نہیں کر سکتے۔“

”ارے واس۔۔۔ محبوبہ کے محبوب“ وہ چڑکیا۔ ”میں پھاڑ دوں گا لیکن یہ چیٹنگ نہیں کروں گا۔ محبوبہ تمہارے پاس ہے۔ جذبات تمہارے پاس ہیں تو نظمیں بھی لکھ لو۔ الفاظ کسی فرد واحد کی ملکیت تو نہیں ہوتے۔“

”ٹھیک ہے شاعر صاحب! ایک نظم کیا مانگ لی تم تو طوطا بن گئے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ہم بھی کسی رڈی کی دکان پر ایک آدھ گھنٹہ ضائع کر کے کوئی شہسپا رہ ڈھونڈ ہی لیں گے۔ کسی مرحوم شاعر کی مثنیٰ بھی نہ کرنا پڑیں گی۔“

رافع قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”اور مزہ آجائے جب ڈاکٹر صاحبہ کی کسی ڈائری میں پہلے سے وہ شہسپا رہ محفوظ ہوا۔“

ہاشم بھی اس تصور سے لطف اندوز ہو کر ہنس دیا۔

”یار ہاشم۔“ رافع سنجیدہ ہوا۔ ”ہوا کیا؟“

”ابھی تک تو ہری اور لال دونوں بتیاں خاموش ہیں۔“ اس نے آہ بھری۔ ”دیکھو کون سی جلتی ہے۔“

”تم نے پھر بات نہیں کی؟ کیا خبر ادھر بھی انتظار کی کیفیت ہو کہ دوبارہ استفسار ہو تو جواب دیا جائے۔“

ہاشم قدرے سوچ میں پڑ گیا۔

”میں نے تو معاملہ پھپھو ڈیر کے سپرد کیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”استفسار تو اب ان ہی کو زیب دیتا ہے۔“

”او نہیں یار! رافع بولا۔ ”تمہارے کہنے کی بات اور ہے۔ صنف نازک کے نازک احساسات کو تقویت ملتی

ہے صنف قوی کو سوال کرنا دیکھ کر دل میں شگوفے کھلتے ہیں تو لبوں پر ”ہاں“ آتی ہے۔“

”یار رافع! تو ٹھیک ہے نا؟“ اس نے رافع کا چہرہ اور سینہ ٹٹولا۔

”ہاں! کیا جانتا۔“ وہ بھی گھبرا گیا۔

”یہ تو مجھے باتیں کر رہے آج تجھ میں کسی مرحوم شاعر کی روح حلول کر گئی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے۔“ رافع

”سے کہتے تو مجھے۔“ وہ بھی گھبرا گیا۔

”تمہیں دوپہر کی بات یاد ہے؟“ رافع نے آنکھ دیانی۔

پھر دونوں ہنس دیے۔

”حیات ولا“ میں چاندنی اتری ہوئی تھی۔ پوری عمارت رنگین قسموں سے بٹی ہوئی تھی۔ کمرے اور دالان قوسوں سے گونج رہے تھے۔ نہ نہ کرتے بھی بہت سے عزیز رشتہ دار بلوائے گئے تھے گھر کے سب ہی لڑکے انتظامات میں بھی مصروف تھے اور ایک دوسرے پر پیمبتیاں بھی کس رہے تھے۔

”یار عباد۔“ حمزہ بولا۔ ”دیگوں کا انتظام تمہارے سپرد ہے۔ خیال رہے کھانا یہاں سے وہاں بھی ہو جاتا ہے اور خرواؤں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔“

”اس کے سپرد انتظام کیا گیا تو یقیناً ایسا ہی ہو گا۔“ علی ہنس دیا۔

”پھر یوں کر کہ ایک خالی دیگ کے اندر علی کو چھپا دو۔“ عباد مزے سے بولا۔ ”میرے سر سے بھی نگرانی کا

بھگدڑ اترے گا اور دیگوں کی حفاظت بھی ہوتی رہے گی۔“

”گھنڈ آئیڈیا۔“ سب ہی نے اس کے مشورے کو سراہا تھا۔



”چلو علی۔ شاباش۔ دیکھ پسند کرو۔“ اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا تھا۔

”نصہ دے جاؤ۔“ اس نے دانت نکالے۔ ”تندرستی دوست کی دیکھ مناسب رہے گی۔“

”جی ہاں۔“ رافع وہاں چلا آیا۔ ”بلی کو دور کی چونکداری سوچو گے تو یہی جواب ملے گا۔ تم سب لوگ یہاں کھڑے باتیں بنا رہے ہو۔ وہاں رسم کی ادائیگی ہونے والی ہے۔ لڑکا وہاں دیا دے رہا ہے کہ میرے دوست کیا ہوئے۔ لڑکی اپنے بھائیوں کی راہ دیکھتی ہے۔ چلو سب اندر۔“

ایک دوست گود میں چھوڑ کر وہ سب اندر کی سمت چل دیے۔

”عزیزہ! ناعمہ نے اسے ٹھوکا دیا تھا۔“ دلہن تم ضرور ہو مگر منگنی کی رسم کی۔ بلا وجہ تم رخصتی کا خیال ذہن میں لیے بیٹھی ہو۔ اتنا ٹینس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

عزیزہ نے جواب میں صرف زور سے ”سوں“ کیا۔

”یہ زکام ہے یا کچھ اور۔۔۔؟“ وہ بھٹائی۔

وردہ ہنس دی۔

”ناعمہ! کیوں اس بے چاری کو تنگ کر رہی ہو۔ وہ پہلے ہی اداس ہو رہی ہے۔“

”وہی تو میں پوچھ رہی ہوں! اداسی کی وجہ کیا ہے؟“

”جب تم دلہن بنو گی تو سب سمجھ میں آجائے گا۔“

”اپنی منگنی والے دن تو میں ہرگز اداس نہ ہوں گی۔“ وہ بولی۔

”اس دن تمہارا دلہا اداس ہو گا۔“ ماہین بر جستہ بولی تو لڑکیاں ہنسنے لگا کر ہنس پڑیں۔ عزیزہ بھی مسکرا دی۔

”اللہ ماہین آئی! اس نے احتجاج کیا۔“ ایسے تو نہ کہیں۔ میں کیا اتنی بری ہوں؟“

کارینہ دور سے گزرتے ہوئے انیقہ کمرے سے نکلتے ہاشم کے مقابل آ کر کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم ہاشم بھائی! وہ مسکرائی۔

”وعلیکم السلام۔“ ہاشم کی نگاہیں اس کے عقب میں کچھ تلاش کر کے نامزد لوٹ آئیں۔ ”آپ کیلی آئی ہیں۔“ اس کے لیے میں لگا سا شکوہ تھا۔ انیقہ مسکرا دی۔

”جی۔۔۔ وہ اپنا کام مزاج کچھ اچھا نہ تھا۔“

”بد مزاج ہیں؟“ ہاشم نے اس کی بات کا لطف لیا۔

”بہت۔۔۔ وہ برجستگی سے بولی۔“ آپ سوچ لیں۔“

”ہمارا سوچنے کا وقت گزر گیا ہے انیقہ بی بی!“ ہاشم خوش دلی سے مسکرایا۔ ”بلکہ یوں کہیے کہ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ رہی۔“

انیقہ کی آنکھیں چمکی تھیں۔ اس نے غور سے ہاشم کا مسکراتا ہوا روپ دیکھا۔

”لیکن ڈاکٹر صاحبہ نے زیادتی کی ہے۔“ وہ بولا۔ ”انہیں آنا چاہیے تھا۔“ حیات دلا کی ہر تقریب میں وہ شریک ہوتی رہی ہیں۔“

”میں نے تو اصرار کیا تھا مگر۔۔۔“ وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔

”خیر۔۔۔ آپ بیٹھیے عزیزہ وہ سامنے والے کمرے میں ہے۔“

”شکریہ۔“ وہ آگے بڑھ گئی۔

بہت اداس اور ملعل سی وہ لان کی میز چیموں کے پاس بیٹھی، چاند کے زرد تھال کو آسمان کی سیاہ چادر پر رکھا ہوا

دیکھ رہی تھی۔

زردی تنہا چاند اسے اپنی طرح اداس محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی بے چارگی اور حزن تھا۔ شہلا خاموشی سے اسے تنگ لگتی۔

”مہا! عمر کارڈ لیس لیے باہر آیا۔“ آپ یہاں بیٹھی ہیں۔ میں پورے گھر میں آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔“

”کیوں؟“ وہ اپنے خیالوں سے باہر آئی۔

جواب! اس نے اسے کارڈ لیس شہلا دیا۔ اور اچھلتا کودتا اندر چلا گیا۔

”ہیلو۔“

”ابرا بات کر رہا ہوں۔“

شہلا جھنجھلا گئی۔ جن خیالوں کو خود پر سے نوج نوج کر، پیچھا چھڑا کر، بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی وہ مکڑی کے جالے کی طرح اسے مزید اپنے اندر لپیٹتے جا رہے تھے۔

”نارنگا! سیک ابرا۔!“ وہ رو دینے کو ہو گئی۔ ”تمہیں کیا ہوا ہے؟ تمہیں عمر سے بات کرنا ہے میں نے تمہیں اجازت دے دی ہے۔ تم اس سے ملنا چاہتے ہو میں تمہارے کہنے پر ہر مرتبہ اسے بھیج دیتی ہوں، لیکن اس طرح پریشان کرنے سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ آخر ہمارے درمیان کہنے سننے کے لیے بچا کیا ہے۔“

”شہلا! مجھ کو بے حد سب اور ذلیل محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اور شرمندہ مت کرو۔“

”مجھے اس طرح مت جھڑکو کہ میں اپنی نگاہ میں مزید ذلیل ہو جاؤں۔ میں پہلے ہی خود کو بے حد سب اور ذلیل محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اور شرمندہ مت کرو۔“

”میں اپنا دل ہو جاؤں گی۔“ وہ آنسوؤں سے بھری ہوئی آواز میں بولی۔

”آپ کی زندگی میں تم نے خود کو بھی اور مجھ کو بھی۔“ وہ شکایتاً بولا۔ ”کیوں کیا تم نے شہلا ایسا۔“

”میں۔۔۔“ وہ حیران ہو گئی۔ ”یعنی اتنے سالوں بعد بھی فرد جرم تم میرے کھاتے میں ڈال رہے ہو؟ ابرا۔“

”اپنے کھانے میں بھانسنے کی ہمت پیدا کرو خود میں۔“ سچ کی آنکھیں چہرے پر لگا کر پھر آئینہ دیکھو۔ میرے پر گاہے گاہے مجھے سوچنے سے بند کر دیا اور اب پوچھتے ہو کہ میرے دل نے اڑان بھرنے کی تمنا ہی کیوں کی؟ اس سے پہلے جتنا کہ تمہارا دل اس سوچنے کے پتھر سے میں مر جاتی، دم کھٹ جاتا ان تاریک کمروں میں میرا دل تھا۔ مجھے عمر بھر اس تاریک کمر سے جیلے گئے تھے۔“

”ابرا۔۔۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”میں بے حس نہیں تھا، تم سے بے پروا نہیں ہوا تھا۔ میں صرف مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ سب کچھ۔ لیکن تم میں انتظار کا حوصلہ ہی نہ تھا۔ اپنی جلد بازی میں سب کچھ تباہ کر ڈالا تم نے۔“

وہ خاموش ہو کر آنسو حلق سے اتارنے لگی۔

”ٹھیک ہے۔ میں مانتی ہوں میں نے غصے میں طلاق کا مطالبہ کیا تھا، زور اصرار کیا تھا۔ لیکن بیپر ز سائن کر کے تم نے بیٹھے تھے ابرا۔ تم نے وہ بھی اتنی عجلت میں جیسے تم یہی کچھ سننے کو بیٹھے تھے۔“ اس سے بولنا

شوار ہونے لگا۔ ”مطلق میں گولے پھینکنے لگے۔“

”میری خرابی کا تو تمہیں علم ہے شہلا!“ وہ شکست خوردگی سے بولا۔ ”بہت جلد چڑھنے اور بہت جلد اتر جانے والا غصہ۔۔۔“

”مطلب ہے میرے دل و دماغ میں آگ سی بھردی تھی۔ اور اس آگ کو بجھانے والا کوئی ہمدردی دلی قلائس میرے پاس نہ تھا۔ اس پاس جتنے بھی تھے جلتی پرتیل ڈالنے والے تھے۔ بابا سائیں، اماں، بہنیں، سب

میں نے یہ سے غصے کو خوب خوب ہوا دی۔ مجھ پر طعنے کسے مذاق اڑایا گیا میرا کہ میں نے ایک ایسی عورت سے

محبت اور شادی کی جو محبت کے رستے کی معمولی تکلیف نہ سہہ پائی بھلا زندگی کی دشوار گزار راہوں میں وہ ہاتھ تمام کر کہاں تک چل سکے گی۔ میں غصے میں تھا میرا ذہن کام نہ کر رہا تھا۔ سب اچھی سوچیں تم اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔

”بہر حال!“ شہلا نے آنسو پونچھے اور خود پر قابو پایا۔ ”محبت کے تناور درخت کو ہم نے خود مل کر کاٹ دیا اس کی کٹھری ہوئی شاخوں سے الجھنے سے کیا حاصل ابرار! اب ان شاخوں پر نہ پھل ہیں نہ پھول۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔“

”میں اور تم جس ڈور سے بندھے ہوئے ہیں شہلا! وہ دوسری جانب تمہارے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ یہ احساس مجھے جینے نہیں دے رہا ہے۔ میں ماضی میں چل رہا ہوں شہلا۔“

”ابرا۔ ابرار تم مجھے کیوں نہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”محبت کے اس تناور درخت کو مل کر سیدھا کرتے ہیں شہلا! اس کی جڑیں بہت اندر تک پوست ہیں۔“

”ابرا!“ وہ اس کا مطلب سمجھ کر سکتے میں رہ گئی۔ ”تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”ہم پھر مل جاتے ہیں شہلا!“

”فار گاڈ سیک! اس کے لبوں سے سرگوشی کے سے انداز میں نکلا تھا۔ ”تم نے ایسا سوچا بھی کیوں؟“

”اس لیے کہ دنیا میں ایسا جتنا ہے۔“ اب اس کا لہجہ مضبوط ہو چکا تھا۔

”ہوتا ہوگا۔“ وہ بے رخی سے بولی۔ ”میری زندگی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔“

”شہلا!“ وہ لجاجت سے بولا۔ ”صرف۔۔۔ صرف۔۔۔ عمر کے بارے میں سوچو۔ موت سوچو میرے بارے میں موت

سوچو اپنے بارے میں۔ اس بچے کا سوچو جو میرا ہے تمہارا ہے اور تمہارے نونوں کے درمیان جینا چاہتا ہے۔ ذرا سا

کشت اٹھا لینے سے اگر روٹھی خوشیاں پھر سے مل سکتی ہوں تو خود مل اٹھا لینا چاہیے۔“

”تم مجھے مرنے کے لیے کہہ دو ابرار!“ اس نے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ”میں محاولں گی۔“

”نیں ہمیشہ تم سے بیٹے کے لیے میرا رونا کا شہلا۔“

اس کے لہجے میں بے تحاشا سچ تھا۔ شہلا پتھر کی ہو گئی۔

”شہلا!“ وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”میرا ایک دوست ہے وہ یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ سب

کچھ تیار ہے شہلا!۔ بس تمہاری ایک ”ہاں“ چاہیے۔“

شہلا نے فون بند کر دیا۔ اس کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا۔



”پھوپھو۔۔۔ پھوپھا جان بلا رہے ہیں۔“ نافع نے کمرے میں جھانک کر شرارت سے کہا۔

آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں کمرے ٹانگتی ایقان کا ہاتھ کانپا اور دل عجب انداز میں دھڑکا۔ وہ بے تابی سے

مڑی۔

”نافع!“

”جی ہاں۔۔۔ مگر فون پر!“ اس نے دانت نکالے۔ ”میں وہاں دو لہا بن رہا ہوں پھوپھا مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں۔“

”بد تمیز کہیں کا۔“ اس کو ہنسی اور غصہ ایک ساتھ آئے۔ ”لے کر دل دھڑکا دیا میرا میں سمجھی۔“ وہ سر

جھٹکتی بڑبڑاتے ہوئے فون کی طرف بڑھ گئی۔

”ہیلو“ اس نے ریسپورڈ اٹھایا۔

”مبارک ہو“ پیچھے پیچھے کی منتی۔

”خیر مبارک!“ وہ تازے بولی۔

”منہ تو میٹھا کر لو“ ادھر سے شرارت ہوئی۔

”لڈو کھینچ ماروں؟“

”ہائے رے ستم ظریفی!“ اس نے شکوہ کیا۔ ”کس کی صحبت میں رہ رہی ہو جان من! تم اتنی ظالم تو نہ تھیں۔

اپنے بڑوس میں کوئی قصاص تو آکر نہیں بس گیا؟“

”آپ کس کی صحبت میں ہیں؟“ وہ جواباً بولی۔ ”بہت خوش مزاج ہوتے جا رہے ہیں۔“

عاشق دم خاموش ہوا۔

”اچھا یہ بتاؤ کون سے رنگ کے کپڑے پہنے ہیں تم نے؟“ پھر وہ خوش دلی سے گویا ہوا۔

”اپنے دل سے پوچھو۔“ بوجھ کر دکھائے ”وہ ہنسی۔

”اچھا!“ اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ”سنہری سنہری ہی لگتی ہو۔“

ایقان کا دل دھڑک کر رہ گیا۔ اس نے سامنے سے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور اپنے گولڈن کپڑے دیکھے۔

”بہت بے ایمان ہو عاشق تم۔“ وہ انتہائی کہہ سکی۔

دوسری جانب اس نے قہقہہ لگایا۔

”پکڑی گئیں نا۔ اچھا یہ بتاؤ میرے بچے کیسے ہیں؟“

”ایک دم فرسٹ کلاس!“ اس کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا۔

”سب کو سلام کہنا۔ دولہا پر لہن کو مبارکباد۔“

”اوکے سر!“

”اپنا خیال رکھا کرو۔“

”ہوں!“ وہ ہنسی۔

”خدا حافظ۔“ لوہو! سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ایقان بہت دیر تک ریسپورڈ لیے کھڑی رہی۔

”پوچھو۔“ نافع کمرے میں جھانک کر منمنایا۔ ”مجھے یہاں تیار ہونا ہے۔“

”اوہ!“ وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ ”ہاں ہاں آجاؤ نافع! میں نے بات کر لی ہے۔ تمہارے ”پھوپھا“ بہت

بہت مبارکباد دے رہے تھے۔“

”متھینک یو۔“ ویسے مجھے مبارکباد دے چکے تھے وہ۔ ”وہ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”اچھا!“ وہ ہنسی۔ ”اور کہا کہ رے تھے؟“

”یوچھ رہے تھے تمہاری پیپھو نے کون سے کلر کا ڈریس پہنا ہے۔ میں نے بتایا گولڈن کلر کا۔“

”آں۔“ ایقان کا منہ کھٹکا کھٹکا رہ گیا۔ ”بے ایمان۔“

وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

”انسو جھر جھر کر رہے تھے اس کا چہرہ بھٹکتا جا رہا تھا۔

”میرا ایک دوست ہے۔۔۔ وہ یہ قربانی دینے کے لیے۔“

”آہ! قربانی میری مانگتے ہو۔ اور نام اپنے دوست کا لیتے ہو۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”یہ نہیں

سوچا کہ مجھ پر کیا بیٹے گی۔ جو خوش رنگ بننے دکھا رہے ہو ان تک پہنچنے کے لیے مجھے اپنے تلووں کو لہولہان کرنا

ہو گا اور اسی آہ۔۔۔ سے خیر میری مانگ بھر کر مجھ پر احسان کرو گے۔ ابراہ جیلانی! تم مرد لوگ عورت کو محض ایک حقیر

کھلونا سمجھتے ہو۔۔۔ کہ لوٹا محض اس وقت تک کشش رکھتا ہے جب تک دسترس سے دور ہو۔“

اس کے تپہ بپ رکھا کارڈلیس پھر بجنے لگا تھا۔ شہلا پریشان ہوا تھی۔

”کیا چاہتا ہے یہ شخص۔ یہ مجھے سکون نہ دینے دے گا نہ مرنے دے گا۔“

اس نے فون آن کیا۔

”ہیلو۔“

”ہاشم عرض کر رہا ہوں!“ سلجھے ہوئے شائستہ انداز میں کہا گیا تھا۔

شہلا رعبا سا کت ہوئی۔

”آپ مجھ سے خفا ہو گئی ہیں کیا؟“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں پوچھنے لگا۔

”جی۔ نہیں۔“ اس کا ذہن حاضر نہ تھا۔

”پھر آپ کیوں نہیں؟ پوچھو بھی آپ کی منتظر ہیں۔ اور۔۔۔ میں بھی۔“

”ہاشم!“ وہ تھوڑے وقفے سے بولی۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ورنہ میں ضرور آتی۔ پلیز آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔

اور آئینہ۔۔۔ یہ بھی ضرور معذرت کر لیجئے گا میری طرف سے۔“

”آپ بوجھ کر ایسا کر رہی ہیں؟“ شہلا نے لگا ورنہ آپ ضرور آئیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ

میں سنا نہیں۔“ اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

سب لوگ برسرِ حال میں تھے۔

عریشہ کہ نافع کے برابر لا کر رکھ دیا گیا۔ وہ بے حد سپر چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ معمولی سی مسکان کی جھلک تک لبوں

پر نہ تھی۔ شہلا نے سر اڑا رکھا تھا۔ دوست احباب کے چٹکوں کا جواب دے رہا تھا۔

شفیقہ حیات دو انگلیاں سنہا لیتی دو لہنا دلہن کے پاس آ بیٹھیں۔ دونوں جانب سے انگلیاں انہیں ہی پہنائی

تھیں۔

”بسم اللہ کیجئے اماں جان!“ فاروق سن بولے۔

ہاشم نافع، ایقان اور ماہین دولہا دلہن کے دھوکے پشت پر کھڑے سب کارروائی ملاحظہ کر رہے تھے۔ سب

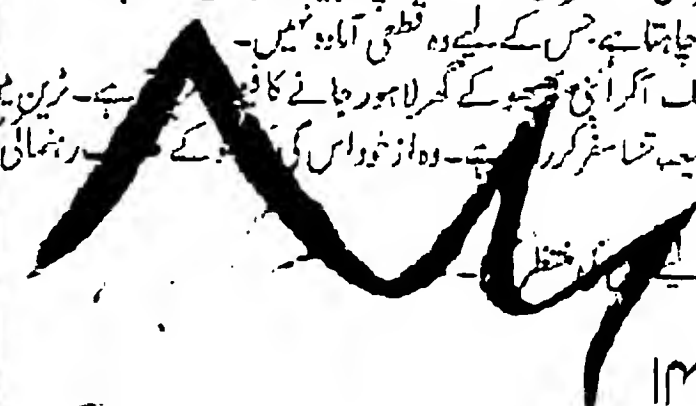
نے سب ہنسنے پر زور دیا تھا۔

”نعنا!“ ہاشم کی زبانی انہی تھیں۔ خوشبو کے ایک مائوس جھونکے نے اسے چونکا دیا تھا۔

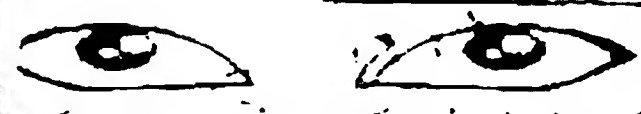
PHOTO

رکتے ہیں۔ دودھ کنیر اور ایک گھمبیر اس کی ملکیت ہے۔ جاکم چچا کو کانوں کا کرایہ لاسنے کی ذمہ داری سونپ کر وہ قدرے فکر  
محاش سے آزاد ہو جاتی ہے۔ ہوا سلیگنہ بھی بڑوں ہونے کا حق بھرپور طریقے سے ادا کر رہی ہیں لیکن ان کی گفتگو میں رنج  
کوئی حقائق سے آگاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اب وہ اسے یہ گھر بیٹے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ خریدار ان کا بہنوئی عزائم  
شوکت ہے جو اس کے گھر کی نہایت کم قیمت لگا آئے۔ نفیسہ خالہ بھی اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔  
ربیعہ متواتر ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی صحرائیں شدید پیاس کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے  
دادی کے رنگ میں دیگر کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شہادت محسوس ہوتی ہے  
سے بوسیدہ خطوط میں جتنے بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے  
بلقیس یا اس کی بیوی پھو ہیں اور ان کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے انتقال کی خبر والا خط پڑھ کر وہ بالکل  
بی ہوش ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں منیبہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ ان کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔  
ڈاکٹر شہلا کو ملاقات ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے سے باتیں کرتا ہے۔  
فردوس بیگم کا بڑا بیٹا ہاشم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔  
ربیعہ اپنی تنہائی اور لوگوں کو بدلتے رویوں سے شک آکر اپنی چھٹی گھبراہٹ اور جانے کا فیصلہ کر رہی ہے۔  
ربیعہ کی ملاقات عبادت سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ربیعہ تھکا سہرا کر رہی ہے۔ وہ از خود اس کی رہنمائی کے  
ذمہ داری لے لیتا ہے۔  
ناشر (ایقان کا شوہر) اپنے دفتر سے نکلا تو لیزا گاڑی لے کر منتظر رہی۔



چوہہ ہو میں قہقہے



آنکھوں میں محبت کی جلتی جوت لیے وہ اس کے مقابل تھا۔ شہلا کے عقب میں پورا چاند اچانک  
سکرا نے لگا تھا۔ ہاشم کو روئے زمین کی ہر شے مسکرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسے وہ پورا منظر ایک طویل ریاست  
اعجاز معلوم ہو رہا تھا۔

PHOTO

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ وہ نرم لہجے میں اپنے دوست کو دیکھ کر کہتا تھا۔  
”شہلا نے نظریں اٹھائیں پھر فوراً اپنی جھکائیں۔  
میں نے سوچا۔ ”آپ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔“ وہ آستنی سے بولی۔ ”حیات والا“ کی ہر خوشی غمی میں ہم  
ہمیشہ شریک رہی ہوں۔ تو پھر اتنی اچھی تقریب بخش ذرا سی ناسازی طبع کے باعث کیوں چھوڑ دی جائے۔ بعد  
مجھے ہمیشہ افسوس رہتا۔ ایقان بھی شکایت کرتی۔  
”تھوڑا“ آپ نفس اتنا ہی سوچ کر آئیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”بہتر!“  
شہلا نے پھر بے چینی سے نگاہ اٹھائی۔ کھدر سلک کے گرے کمرے کرتے اور وہاں شلواریں ہاشم کی وجاہت  
بست نمایاں تھیں۔ مناسب قدم قدامت کی شہلا کو اپنا آپ اس کے مقابل ننھا منسا لگ رہا تھا۔ شناسائی کے  
ساتھ میں وہ سینکڑوں مرتبہ اس سے ملی تھیں لیکن آج سے پیشتر دل نے کبھی یوں چھپ جانے کی خواہش نہ کی  
تھی۔ جائے فرار نہ ڈھونڈی تھی۔  
ہاشم نے ایک مرتبہ پھر اسے دیکھا۔ اس کی ناک میں چمکتی لونگ سے زیادہ روشن نگاہیں اس سے گریز

تھیں۔ ان نگاہوں کے عقب میں چاند جھینپا جھینپا سا مسکراتا تھا اور اپنی روشنی اس کے سیاہ بالوں پر بچھا کر کرتا  
جاتا تھا۔ چاند کی چمک سے مزین زمین اس کے چہرے کے گرد جھولتی تھیں۔ بے حد مکمل اور خوبصورت منظر تھا۔  
ہاشم کا وہاں سے ہٹنے کو جی نہ کرتا تھا لیکن ان نگاہوں میں فرار کی خواہش اس درجہ شدید تھی کہ اسے اپنے دل پر جبر  
کرنا ہی پڑا۔

”آپ کچھ لیجئے نا۔“ اس نے میزوں کی جانب اشارہ کیا۔

”تھکنک یو۔“ شہلا کو جیسے قید سے رہائی ملی۔

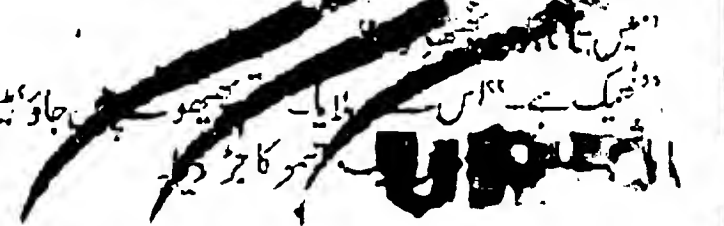
وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ اس کی مسکراہٹ کی چمک نے منظر کو مزید روشن اور خوبصورت بنا دیا تھا۔ ہاشم بھی  
بناشت سے مسکرا دیا۔

اچانک ہی کسی نے از حد بے تکلفی سے اس کے کاندھے پر بازو دھرا تھا۔ ہاشم جو شہلا کی جانب متوجہ تھا  
چونک اٹھا۔ وہ رافع تھا۔

”میاں راجے!“ وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”یہ جنون عشق کے انداز ذرا قابو کر کے دیکھو۔ یہاں سب  
کے پاس دو آنکھیں اور دو کان ہیں۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب کے پر فہوم میں بے خودی کا کلوز فام ہوا ہے جو  
صرف ہماری قوت شامہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔“ ہاشم مسکرا دیا۔

”جیسے اس نے تو اس طرح کا کوئی دھندا ہے نہیں ہمیں تو روزگار سے لگا رہنے دے بھائی۔“  
”جس کی بات ہے وہ بھی چھٹ جائے گی۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”تائی امی! تمہیں ڈاکٹر صاحب سے جو  
گفتگو یا کمرے کے غصے میں داکٹ کوٹ کر چکی ہیں جس کا تمہاری صحت پر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا کیونکہ تمہیں اس  
واقعہ کا علم ہی نہ ہو سکا۔ دادی جان اور امی جان مسلسل ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی ہیں اور  
جیسے جیسے باتیں کرتے ہیں وہ پلٹیں بریانی کی اور دو بروسٹ کی اڑا چکی ہیں اور ہنوز میزوں کے ارد گرد چکرار ہی  
ہے۔ میرا خیال ہے وہ تمہاری بات کا کھانا بھی چشم تصور سے اسی محفل میں اشارت کر چکی ہیں۔“

”میں بتا رہی ہوں۔“ شہلا نے کہا۔ ”اس نے کیا کیا کیا۔“  
”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”جاؤ، میں تائی امی کے پاس جاتا ہوں۔“



”چشم بد دوست۔ کسی کی نظر نہ لگ جائے میری پیاری سی دوست کو۔“ ایقان شرارت بھرے لہجے میں  
کھانکائی بولی۔  
”ایک عرصے بعد اتنا بنا سنو را دیکھا ہے تمہیں بہت اچھی لگ رہی ہو۔“  
شہلا نے کچھ کہنے کے لیے لب و لہجے پھر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔  
وہ دونوں کھانے کی میزوں سے کافی فاصلے پر آگھڑی ہوئی تھیں۔ ایقان نے محسوس کیا شہلا اس سے نظریں نہ  
مار رہی تھی۔ وہ کنفیوژن کا شکار دکھائی دیتی تھی۔ ایقان کچھ سوچ کر شرارت سے مسکرائی۔  
”شہلا! ایک بات پوچھوں؟“  
”ہوں۔“ وہ کسی خیال سے چونکی۔  
”ایک سوال کا جواب دینا اوصار تمہارا میر۔“



شہلا نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ ایقان کو اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف کی جھلک نظر آئی۔  
ایقان تذبذب کا شکار ہوئی۔ نبھانے جو کچھ وہ محسوس کر رہی تھی وہ درست تھا یا صریحاً غلط۔  
شہلا تو یوں بھی اس گھرانے کی ہر تقریب میں شریک ہوتی لیکن یہ بھی غلط نہ تھا کہ وہ عموماً ہر تقریب ہی اس کے  
سان سے انداز میں ہی بھگتا لیا کرتی تھی۔ آج تو اس کا روپ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کا مقابلہ کرنے پر آمادہ نظر  
تھا۔

کادانی سے سجاوٹوں کا خوبصورت سوٹ اس کے مناسب سراپے پر اپنی بہادر دکھلا رہا تھا۔ سفید ٹیگنوں سے  
مرصع کندن کا گوند اور آویزے اس کی آنکھوں سے پھوٹی چمک سے خیرہ تھے۔ خوبصورت کٹاؤ والے لب لہجہ  
میں لب اسٹک سے سجے بے حد وضاحت سے اپنے حسن کا قصیدہ کہلا رہے تھے۔ کمر تک پہنچے ہوئے سیاہ چمک  
ہوئے بال خوبصورتیاں بکھیر رہے تھے۔

اس پر اس کی وہ قابل داد بے نیازی مزید خرابا کر رہی تھی۔  
ایقان نے اور کھڑے ہاشم کی بے بسی پر ایک نگاہ ڈالی اور الجھ کر رہ گئی۔  
”شہلا!“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔  
شہلا نے سم کر اس کی صورت دیکھی۔

”ہاشم کا رشتہ لے کر آؤں باضابطہ طور پر؟“  
”ایقان!“ وہ کمزور سے لہجے میں بولی۔ ”مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔“  
”تمہیں مہلت ضرور دیتی اگر تمہارا یہ قابل روپ نہ دیکھتی تو۔ لیکن یہ سب تیاری چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ  
تمہاری خود ساختہ سزا آج ختم ہوئی۔ اب تمہیں مزید مہلت میں دی جاسکتی۔ قیدی کی رہائی کی تاریخ کا اعلان  
جج صاحب!“ شہلا مسکرا دی۔

”مذاق مت اڑاؤ ایقان! کیا ایک تقریب کے لیے یہ ذرا سی تیاری نہیں میرا حق نہیں؟ اس کے بھی مطلب  
نکالے جائیں گے؟“

ایقان لمحہ بھر کو گڑبڑا گئی۔  
”خدا خواستہ میرا یہ مطلب نہیں تھا شہلا! میں کچھ غلط تو نہیں سوچ رہی۔“

”تم غلط ہی سوچ رہی ہو۔“ وہ پھر مسکرائی۔ ”میں یہاں تمہارا بیٹا نہیں بلکہ ایک دوست ہوں۔“  
ایقان کھلکھلا کر ہنس دی۔

”وہ تم بہت پہلے کر چکی ہو مائی ڈیر فرینڈ! وہاں تو نظر جگر دل پھینک رہا ہے۔ ہاں البتہ  
پر تیل چھڑکنے کا سا اہتمام ضرور کیا ہے تم نے۔ اس کی بھی تو کچھ سزا ہونی چاہیے۔“

”مثلاً کیا؟“ شہلا نے تکیستی نگاہ سے اسے دیکھا۔  
”مثلاً۔“ اس نے دیدے منکائے۔ ”مثلاً یہ کہ سارا اہتمام کم از کم اس کے نام تو کر دیا جائے۔ اتنا تو اقرار  
کرو کہ یہ سب ناز و انداز اس کے لیے ہی ہیں۔“

”ایقان!“  
”شہلا پلینز۔ کیا اس غریب سے پیر پکڑاؤ گی؟“ ایقان بھی سنجیدہ ہوئی۔  
شہلا خاموش ہو گئی تھی۔

”میں کل آرہی ہوں آنٹی سے بات کرنے۔“ ایقان نے دھمکایا۔ ”اور تمہاری جانب سے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“

”اچھا۔“ وہ آہستہ سے بولی۔  
”ہائیں؟“ ایقان دم بخود ہوئی۔  
پھر خوشی اس کے لبوں سے جھرنے کی صورت برآمد ہوئی تھی۔ شہلا بھی جھینپ کر مسکرا دی۔



سیاہ چیلے ڈھالے کرتے اور سیاہ چوڑی دارپا جامے میں ملبوس وہ مہرہ لب آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی سوچے چلی  
جباری تھی۔ لائے سیاہ بالوں سے ٹپ ٹاپ پائی کی بوندیں برس رہی تھیں۔ اس کا کرنا بھی بھیک چلا تھا اور نیلا  
کارپٹ بھی۔ اسے مطلق پر دانہ تھی۔ وہ نبھانے گیا کچھ سوچے چلی جا رہی تھی۔

تقریب ختم ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ سب ہی افراد سخت تھکاوٹ کے عالم میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے  
تھے۔ تقریباً ہر پورشن کی لائٹس آف ہو گئی تھیں۔ اس نے پہلے تو بے حد بے دردی سے اپنے سنورے ہوئے

روپ کو بگاڑا تھا۔ کادار بیماری وہ پہلے اتار کر حقارت سے دور پھینکا۔ چوڑیاں توڑ توڑ کر اتاری تھیں۔ بال ہنسی نوچ  
خوج کر ڈسٹ بنک ٹیبل کے آئینے پر دے ماری تھیں پھر جا کر شاور کے نیچے کھڑی ہو گئی تھی۔ چہرہ بے دردی سے رگڑا

تھا۔ منہ سے سجے ہاتھوں پر ناہر صابن ملا تھا۔ نہا کر نکلی تو آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ پوسٹلے بے تحاشا  
سوچے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے جا کر آرام کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ذہن میں بھونچال سے اٹھ رہے تھے۔ پوری

دنیا اسے ایک غنائت حقیر شے دکھائی دے رہی تھی جسے ٹھکرا دینے کو من کرنا تھا۔ اسے سب ہی سے شکایت تھی  
خود سمیت۔ وہ کون جھک گئی اس نے کیوں اتنی آسانی سے ہار مان لی اس نے کیوں مزاحمت نہ کی۔ کیوں کیوں

کیوں نہ۔  
رنگے میں گھر گھر ہوئی تھی۔ عریضہ کے لبوں سے سسکی نکلی۔ اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھا

پھر ہٹا۔ ”اب آواز کو۔“ چاہتی تھی۔ وہ اسے بھولنا چاہتی تھی۔  
فون لاؤ گھر گھر گھر۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے دل سے خون رستا رہا لب سسکتے

رہے۔ وہ نو جوان مسکراتا تھا۔ پہلا نشہ بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ نرم نرم رگوں میں دوڑتا لو خمار بن جاتا

مشقۂ محمود کی مرتبہ کے حوالے

کھانا پکانے کی مزیدار

ترکیبوں کی

رنگارنگ کتاب

خانوں کا

دسترنخوات

شارہ گوئی

مکھوئے کا پتہ : ۳۷ اندو بازار کراچی

ایقان خود را تکیہ برائی پھر قدرے سنبھل کر گویا ہوئی۔  
 ”بھابھی جان! تو بے خبری کی رستے پر بے حد خاموشی سے، سبر سے محو خرام تھی۔ اسے تو بار بار جو نکایا گیا ہے،  
 رستہ بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اب بھی اس کے انداز میں خوشی کم اور مجبوری زیادہ ہے۔ آپ بھی عورت ہیں  
 سنا بھی بیگم! ایک مجبور اور دکھی عورت کا درد سمجھنے کی کوشش کریں۔ کم از کم لفظوں کے استعمال میں تو کچھ احتیاط  
 کریں۔ اسے دوسری مرتبہ دلس کے روپ میں دیکھنے کے لیے آپ کا صاحبزادہ ہی بے قرار ہے اس نے تو ایسی کسی  
 نیا نیا ش کا کبھی اظہار نہیں کیا۔“

فردوس بیگم بھناؤنٹیں، گھر ماہین کچھ سنبھل سی گئی۔  
 ”میں غلط کہہ رہی ہوں ماہین؟“ ایقان نے تائیدی انداز میں ماہین کو دیکھا۔  
 ماہین جزبزی ہوئی۔  
 ”تو جتنی تو آپ بھی غلط نہیں ہیں پیچھو! اپنا سکہ ہی کھوٹا ہو تو دوسرے سے کیا شکوہ کرنا۔“  
 ”اے بے امنہ میں خاک۔ سوچ سمجھ کر بولو۔ میرا بچہ کیوں کھوٹا ہونے لگا۔ بے چارہ بھولا ہے، کم عمری میں ہی  
 پھنس گیا امی جادو گرئی کی انٹوں میں۔“

”میرا مطلب یہ نہیں تھا امی!“ ماہین بے چاری ماں اور پیچھو کے درمیان شعل کا ک کی طرح پھنس گئی  
 تھیں۔ پیچھے کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ شہلا آئی کی طلب ہمارے بھائی کے دل میں جب اس قدر شدید ہے تو ہم شخص  
 میں تو کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ تو کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ سمجھانا ہے تو اپنے بھائی کو سمجھا لو۔“  
 ”اے ماں! تم کسے سمجھاؤ گے جب ان کا جادو سر چڑھ کر لو لے گا تو۔“ وہ برزرا نہیں۔  
 ”کون سا جادو بھابھی جان؟“ ایقان کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لے کر پوچھی۔ ”اس کو راضی کرنے کے لیے  
 ہاشم نہ بولے۔“

”ہاشم! وہ تو کون سا جادو ہے؟“ ایقان کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لے کر پوچھی۔ ”اس کو راضی کرنے کے لیے  
 ہاشم نہ بولے۔“  
 ”اے ہاشم! وہ تو کون سا جادو ہے؟“ ایقان کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لے کر پوچھی۔ ”اس کو راضی کرنے کے لیے  
 ہاشم نہ بولے۔“

ایقان نے ہاشم کی بات سن کر ہنس دیا۔ ”اے ہاشم! وہ تو کون سا جادو ہے؟“ ایقان کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لے کر پوچھی۔ ”اس کو راضی کرنے کے لیے  
 ہاشم نہ بولے۔“

”اے ہاشم! وہ تو کون سا جادو ہے؟“ ایقان کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لے کر پوچھی۔ ”اس کو راضی کرنے کے لیے  
 ہاشم نہ بولے۔“

ہے۔ اس خمار کو جسم سے نکال پھینکنا روح نکال دینے کے مترادف لگتا ہے۔ جذبوں کے الاؤ میں شدت کی تپش  
 ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم وعدے اس بھٹی میں تپ کر ایسی مضبوط صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ انہیں  
 تو زمین دلدل کی رگوں کو کاٹ دینے جیسا لگتا ہے۔  
 وہ ایسی ہی اذیت میں مبتلا تھی۔ جسم سے روح نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔  
 فون مایوس و نامراد ہو کر خاموش ہو چکا تھا۔ عریضہ کا جی چاہا دھاڑیں مار مار کر روئے۔ وہ اٹھ کر بستر جا گری اور  
 تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

بیگم کر سائیہ گل میں جتنا صبر  
 ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا۔  
 ”جب یہ شعر آتا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟“  
 ”میں کیا جانوں اپنے آنسوؤں سے پوچھو۔“  
 ”آنسو کہتے ہیں دل سے پوچھو۔“  
 عریضہ کے دل سے آنسو گر رہے تھے۔

”السلام علیکم۔“ بکلی بکلی سی ایقان اندر داخل ہوئی تھی۔  
 ”وعلیکم السلام۔“ فردوس بیگم خفگی سے بولیں۔  
 ”کیسی ہیں پیچھو؟“ ماہین نے بھی اس خوش و خروش، مظاہرہ نہ کیا جو عموماً اس کی آمد پر کیا کرتی تھی۔  
 ”فرسٹ کلاس۔ تم کیسی ہو۔۔۔ میں ڈر رہی تھی کہیں تم چلی ہی نہ گئی ہو۔“  
 ”آیا تمہارات کو تسلیم میاں کا فون۔“ فردوس بیگم نے لٹسنے کی بنا پر مصالحت کا گھونٹ ناچار بھر مٹی تھیں اور  
 وہ اتنی جلدی کسی کی خطا میں نہ بخشتی تھیں۔  
 ”کہتے تھے تیار رہنا، لینے آؤں گا۔ دیکھو رات تک پینچیں گے۔“  
 ”کچھ دن اور رہ جائیں۔“ ایقان محبت سے بولی۔

”ارے اس کے سسرالی بڑے گھڑولے ہیں۔“ فردوس بیگم ہر بات کا جواب بذات خود دینا ضروری خیال کرتی  
 تھیں۔ ”وہ چار دن کو چھوڑ دیا وہی ان کی مہربانی ہے۔“  
 ”ہختہ بھر تو ہو گیا ہے امی!“ ماہین بولی۔ ”اب مہینہ تو رہنے سے رہی۔ اس کی مٹی ہی مٹی۔ شادی ہوتی تو باہر  
 دو مہری تھی۔ اب ہاشم بھائی کی کہیں بات ٹھہرے تو دیکھیں۔“

”ان کی تو مہری ہی سمجھو۔“ فردوس بیگم نے جلتے بھنے انداز میں کہہ کر کن اکھیوں سے ایقان کو دیکھا۔  
 ”اس دن تیاریاں نہ دیکھی تھیں تمہارا کی۔ مانو محفل لوٹے آئی تھی۔“  
 ایقان قدرے جزبزی ہوئی۔ بھارج کے تیور پہلے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ اس نے ہولے سے کھنکھار  
 گا صاف کیا۔

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ انہوں نے بغور اس کا سر لایا دیکھا۔  
 ”جی۔۔۔ اب اچھی ہے۔۔۔“ اس کا ذہن ابھرا تھا۔ بات شروع کرنے کا سراپا تیار آ رہا تھا۔  
 ”تمہاری سہیلی تو لگتا ہے جی جان سے تیار بیٹھی ہے۔ دوسری مرتبہ دہن بننے کو۔ کیوں؟“ انہوں نے زہر  
 لےجے میں بات کا آغاز کر کے گویا اس کی مشکل بھی آسان کی تھی۔

”بس تو تیار رہنا شام کو اوھر چلتے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ نیم دلی سے بولی۔

ایقان کا روم روم مسکرا رہا تھا۔ اس کے تصور میں ہاشم کا چمکتا ہوا چہرہ تھا جس کی پر خلوص تمنا کا جھنڈا محبت کے قلعے پر بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔



وہ پانی کا کولر بھر کر کمرے میں لائی۔ فل سائز کا کولر پانی سے بھرا ہوا ہونے کے باعث بے حد وزنی ہو رہا تھا۔ ربیعہ نے اسے بمشکل تمام اٹھا کر میز پر رکھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بار بار یہ بھاری کولر کچن سے کمرے تک لانا دن بھر کا مشکل ترین کام تھا۔

”پانی پلاؤ لڑکی۔“ منور امین بولے تھے۔

ربیعہ زچ ہوئی۔ پانی پانی کی تکرار سے وہ عاجز ہو چلی تھی۔ ان کے اندر نجانے کون سا توردن رات دہکا کر تھا۔ کس احساس کی پیش آن کے جسم و جان کو جلایا کرتی تھی۔ وہ کون سی جھلستی ہوئی سوچ تھی جو ان کے تعاقب میں لگی رہتی تھی ربیعہ سمجھ نہ پاتی۔

وہ بس نگلاں بھر بھر کر انہیں دیتی رہتی کولر لمحہ۔ لمحہ خالی ہوتا چلا جاتا۔ گندی بالٹی لکھنے بہ لکھنے بھرتی جاتی۔ ربیعہ کمرے کے چکر لگا لگا کر تھک جاتی تھی پانی پانی کی تکرار ختم نہ ہوتی تھی ان آنکھوں کی سرخی کم نہ ہوتی لہجے کی گرمی ماحول بڑتی ہے سانسوں کی پیش برقرار رہتی۔

ربیعہ نے گلا غمی بھر کر ان کے رو برو کیا۔

”ہوں۔“ انہوں نے ایک سانس میں اسے خالی کیا۔ ”شباباش۔“

پھر وہ بولے۔

”تم ایک اچھی لڑکی ہو۔“



ربیعہ کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ اس کے تھے ہوئے احساسات میں سے گویا ایک گرہ کھلی۔ اتنی سخت مشقت کے بعد بھی وہ ان کی جانب سے کسی سخت فقرے کی منتظر رہتی تھی۔ وہ بیل میں قلم پل میں ماشہ تھپاں صفت مزاج کے حامل۔ ان کی منظر پر طبیعت ربیعہ کو ہر وقت سبے چین رکھتی تھی۔ گڑھوں میں تیزی سے حرکت کرتی پتلیاں لبوں کے پھڑکتے ہوئے گوشے اور ہمہ وقت تھے ہوئے تھننے ان کے اندر ابلتے لاوے کا پتا دیتے تھے۔ ربیعہ کو کبھی کبھی دھواں اگلنے اس آتش فشاں سے سخت خوف محسوس ہوتا تھا۔ کب وہ کون سا روپ اختیار کریں کوئی گارنٹی نہ تھی۔

”آپ کے لیے چائے بنا لاؤں پیھا جی؟“ ربیعہ کو ایک تعریفی جملہ سرشار کر گیا تھا۔ ترسی ہوئی مٹی بارش کی چند لوندوں سے ہی مہک دے اٹھتی تھی۔

”میرے بہانے تم پینا چاہتی ہو تو بنا لو۔“ وہ بے نیازی سے بولے۔ ”مینا کہتی ہے تم چیزوں کا بے دریغ استعمال کرتی ہو۔“

ربیعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بادل کسی دوسری طرف جانکے تھے۔

”جی مجھے تو طلب نہیں۔“ وہ آتشکی سے بولی۔

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔“ وہ نجانے کیوں خوش ہوئے۔ ”بہت چالاک ہو تم اپنی دلدی کی طرح۔ سازشیں کرنا تمہیں

خوب آتا ہے۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔“

ربیعہ ہکا بکا ہوئی۔ اس نے بھلا کون سی سازش کی تھی۔ وہ تو اس قدر مجبور تھی کہ وہاں سے نکل بھاگنے کے بھی کوئی سازش نہ سوچ سکتی تھی۔ نکل بھاگنے کا نہ تو کوئی ذریعہ تھا نہ دوسرا کوئی ٹھکانہ۔ وہ ایسی پرکٹی چڑیا تھی جس کے لیے پنجرے کی سلاخیں معنی نہ رکھتی تھیں۔

”اے ربیعہ!“ ترانہ کی آواز پر وہ چونکی۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور خوف تھی۔

”ادھر آنا ذرا۔“

ربیعہ سب کچھ بھول بھال کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ ترانہ کے انداز میں کوئی غیر معمولی بات تھی۔

”چلو چھت پر چلیں۔“ ترانہ بولی پھر اسے خیال آیا۔ ”پہچھو کہاں ہیں؟“

”مارکیٹ گئی ہیں تصور بھائی کے ساتھ۔“

”میدان صاف ہے گویا۔ اور صولت؟“

”نہارا ہی ہے۔“

”آجاؤ پھر۔“ وہ جوش بھرے انداز میں بولی۔

ربیعہ بھی ہنس سی اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

”میں تمہارے لیے ایک چیز لائی ہوں۔“ اس نے خاکی لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ربیعہ نے لفافہ

کھول کر دیکھا۔ اس میں یونیورسٹی کا پراسپیکٹس اور فائبروٹیکس تھے۔

”ہاں۔“ بے حد خوشی کے عالم میں اس کے لبوں سے نکلا۔

”شام کی کلاسز کے لیے جو سبیکٹس۔“ اس میں سے سوچ سمجھ کر کوئی سلیکٹ کر لو پھر میں تمہارا فارم

کروا دوں گی۔“

”اور پیچھو۔“

”اوہو۔۔۔ پہلے داخلہ تو ہونے دو، باقی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ پیچھو سے ایک مرتبہ معزکہ تو کرنا پڑے گا۔

اس میں ابھی دیر ہے۔“

ربیعہ خوشی خوشی پراسپیکٹس دیکھنے لگی دفعتاً اس کی آنکھوں میں آنسو اڑ آئے۔ ترانہ دلچسپی سے اس

چہرہ دیکھنے لگی۔

”تھینک یو ترانہ!“ وہ ممنون لہجے میں بولی۔

”تھینکس فار وہاٹ؟ جو کچھ تم ہمارے لیے کرتی ہو ربیعہ! اس کے شکریے کے اظہار کی یہ انتہائی معیار

صورت ہے بلکہ اس کے شکریے کا اظہار بھی ناممکن ہے۔ یہ سب کچھ تو تمہارا اپنا حق ہے اور جو کچھ ہمارے

تم کرتی ہو وہ تمہارا احسان۔“

ربیعہ خوش دلی سے مسکرا دی۔

”احسان کیسا ترانہ! اپنی جائے پناہ کا خیال تو ہر کوئی رکھتا ہے۔ تم یہ ہر وقت احسان احسان کی راگنی مت

کرو۔ اچھا اب چائے پلاؤ آج میں تھک گئی ہوں۔“

”ہوں۔“ ترانہ شوخی سے مسکرائی۔ ”آج تو ہر گز چائے نہ پلاؤں گی۔ آج تو چائے پیوں گی تمہاری اس بے

خوشی کی قیمت تو وصول کروں تم سے۔“

ربیعہ اچانک ہی زور سے چونکی۔ سیڑھیوں پر نیلے بالوں کی جھلک معدوم ہوئی تھی۔

”صولت نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

”وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔“

”وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔“

”وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔“

”وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔“

”وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔“

PIOTO

ترانہ نے مڑ کر دیکھا اور کچھ سوچنے لگی۔

”وہ ابھی ابھی گئی ہے۔“ ربیعہ فکر مند ہو رہی تھی۔ ”میں نے خود دیکھا ہے۔“

”ہوں۔“ ترانہ بولی۔ ”بے چاری سوچتی ہوگی میں ہی چائے بنالوں۔ یہ دونوں تو راضی نہیں ہیں۔“

ربیعہ کو زور سے ہنسی آگئی۔

”تمہیں کسی بات سے ذرا نہیں لگتا ترانہ؟“

”یہ کہ میری شادی باری سے نہ ہو سکے۔“ ترانہ نے شوخی سے اس کے گال پر چٹکی بھری۔ ”اور تو ایسی کوئی

بات نہیں جس سے میں ڈروں۔“

ربیعہ نے رشک سے اسے دیکھا۔

\*\*\*

مینا کے انداز حد درجہ خشک تھے۔ ربیعہ اپنی جگہ پر چور سی بنی ہوئی تھی۔ صبح سے وہ انہیں کئی بار مخاطب کر کے

دیکھ چکی تھی لیکن وہ اپنی خشک مزاجی پر ہنوز مصر تھیں۔

ربیعہ کو اس سے اور ان کی ناراضی سے بے حد خوف محسوس ہوتا تھا۔

”آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری مرتبہ پوچھا۔

”وہ اسے غور سے دیکھنے لگیں پھر بھینکاریں۔“

”دیکھنے میں تو بہت معصوم لگتی ہو لیکن ہو کس قدر گھنی۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟“ وہ بے چاری سے بولی۔



”ڈیزائن؟“

”جی ہاں، تمہیں صولت کے ڈیزائن۔ ترانہ نے اپنا سوٹ سنے کو دیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی، اگر صولت نے دیکھا بھی ویسا ہی ڈیزائن بنوانے کی ضد کرے گی، اسی لیے وہ مجھے چھپ کر دکھا رہی تھی۔“

مینا نے کچھ دیر تک نظروں سے اس کا چہرہ ٹٹولا۔ ربیعہ نے جلدی سے اپنی نظریں جھکا کر دانتوں سے نچال لیا تھا۔ اس کے آثار نہ جان پائیں۔

”اچھا۔ مجھے وہ ڈیزائن کاغذ پر آواز کرو۔“ پھر وہ بولیں۔ ”میں صولت کو اس سے پہلے وہ ڈیزائن سلوا کر گی۔ وہ سمجھتی کیا ہے۔ چار پیسے زیادہ کما لیتی ہے تو ہم سے بہت اونچی ہو گئی ہے۔ ہم اس کے جیسے کپڑے نہیں پہن سکتے کیا؟“

وہ بڑبڑاتے ہوئے ایک کالی اٹھالا میں۔

”اور دیکھو لڑکی! زیادہ ہو سیاری مت دکھانا۔ بالکل ویسا ہی ڈیزائن بناؤ، رتی برابر فرق نہ نکلے، ورنہ مجھ سے کوئی نہ ہوگا اور ترانہ کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ میں کل ہی صولت کو ایسا سوٹ سلوا دوں گی۔“

ربیعہ نے بے حد مشاقی سے ایک خوبصورت گھٹے کا ڈیزائن کالی کے صفحے پر اتار دیا۔ ”خوش ہو گئیں۔“

نے اسے کئی مرتبہ بتایا تھا کہ صولت دو سروں کی ہر شے کی حریف نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ پیریں کی چیل کی کیوں نہ ترانہ اس کی اس عادت سے حد درجہ بیزار تھی اور خاص طور پر اس کے کپڑوں کے ڈیزائن اس وقت چھپائے رکھتی تھی جب تک پہن نہ لیتی۔

ربیعہ کے ذہن کے کسی گوشے میں پڑی ہوئی بات کھولنے کے کی مانند خوش قسمتی سے چل گئی تھی۔

\*\*\*

”ارے کینی۔۔۔ ناشتہ ہی کروادے۔۔۔ میں گھنٹہ بھر سے بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ ایک تھک چکی ہوں۔“

نھیک طرح سے جواب نہیں دیتی ہو پھر چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا۔

ناعمہ، ثانیہ کی بے توجہی محسوس کر کے سلگ اٹھی تھی۔ ”ممنی“ پر دھمکیوں کرنے کے لیے وہ عالم اشتراک میں صبح اٹھ کر بنا کچھ کھائے پیے ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ ثانیہ کچن میں مصروف تھی سو وہ بھی وہیں پڑے اسٹوا پیٹھ کر رواں تہہ شروع کر چکی تھی لیکن اب اسے خیال آیا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں اتنے دنوں سے اس کے لیے تیار کی ہوئی روٹم اس نے اس کی کسی قسم کی خاطر مدارت کرنا بھی ضروری خیال نہ کیا تھا۔

کاؤنٹر پر گیلاد سٹر پھیرتی ثانیہ چونکی۔

”اچھا۔ تم ناشتہ بھی کر کے نہیں آئیں۔“ وہ عام سے انداز میں بولی۔ ”دشمنو میں بناتی ہوں چائے۔“

”تم بھی تو اکثر بغیر ناشتے کے آ جاتی ہو۔“ ناعمہ اس کی بات سے مزید خفا ہو گئی۔ ”ہم بھی تو تمہیں پوچھتے ہیں نہیں۔“

ثانیہ کو ہنسی آ گئی۔

”ارے بھئی! تو کہہ دیا ہوتا، میں پہلے ہی کروادیتی ناشتہ تمہیں۔ اتنی دیر سے خواہش جی میں ہی دیا ہے بیٹھی اور اطلاعا“ عرض ہے محترمہ! کہ میں جب بھی بنا ناشتہ کیے تمہارے ہاں آتی ہوں تو اس بات کا خیال ہمیشہ وارد کرتی ہیں۔ تمہیں کبھی توفیق نہ ہوئی۔“

”اے نہیں تو کرنا ہی ہے خیال۔“ اس نے دیدے مڑکائے۔ ”ویسے تمہاری عدم توجہی مجھے بہت کھل رہی ہے چاہتا ہے تمہاری گدی پر ایک مکا لگاؤں اور گھر چلی جاؤں۔“

وہ پھر ہنستے ہوئے چائے کا پانی رکھنے لگی تھی۔

”میری گدی پر ہی یہ کرم نوازی کیوں بھیجی؟“

”بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے گدی ہی اکڑتی ہے نا، اس لیے۔“

”میں نے کیا بے نیازی دکھائی ہے؟ مسلسل تو باتیں کر رہی ہوں۔“ وہ اپنا کام منہا چکی تھی۔ سو روپے کے پلو کے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”بے رنگ باتیں، وہ بھی غائب دماغی سے۔“ جواب یوں دے رہی ہو جیسے کوئی احسان کر رہی ہو، ”ناکافی خفا ہو چکی“

ثانیہ قدرے سنجیدہ ہوئی۔

”ناعمہ! تم نے کچھ محسوس نہیں کیا، عرشہ کے متعلق؟“

”وہ کیا؟“ وہ چونکی۔ اچانک ہی گفتگو میں دلچسپی در آئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے اس نئے تعلق سے ناخوش ہے۔“ ثانیہ نے کچن کے دروازے کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”ہائیں۔۔۔ اچھا۔۔۔ وہ کیسے؟“ ناعمہ نے اپنا سر اس کے قریب کیا۔ ”ویسے لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔“ ثانیہ نے

”گھورا، ہاتھ پائی کی شاں شاں سن کر اس میں تپتی ڈالنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تجربہ سے پر سوالیہ الفاظ کے بعد یہ تابید کا کیا مقصد؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا جو میں نے لگایا۔“ وہ ٹھیسائی ہو کر بولی۔

”اس لیے کہ میرے پاس بھی وہی آ نکھیں ہیں جیسی تمہارے پاس ہیں۔ تمہاری ذرا گول ہیں، میری لمبی“

”وہ چل کر گویا ہوئی۔

”گول ہوں یا لمبی؟“ آٹھ تو ہیں۔ شکر ہے خدا کا۔“ وہ قدرے برا مان کر بولی۔ ”دیکھتے ہیں ہم۔“

”بے کار رویہ۔“ ثانیہ نے چائے چھان کر کپ اس کے سامنے رکھا اور ٹو سٹر میں سلائس ڈالنے

”میں نے فراموش کر دیا۔“

”میں نے فراموش کر دیا۔“ ثانیہ چو لے پر فراٹنگ بین رکھ کر فریج سے انڈے نکالنے لگی۔

”اس کی آنکھیں روتی ہوئی تھیں۔“ وہ اس کے لیے اس کے لیے مسکراہٹ تک نہ جاگی۔

”انڈا جلد ہی انڈے میری چائے کھڑی ہو رہی ہے۔“

”بے نیازی سے ناکابل۔“ ہاں دیکھ رہی ہوں، میں مسلسل اسے کہہ رہی تھی کہ ممنی کے دن تو

”کیا اس اتنی اداس نہیں ہوئیں۔“

ثانیہ نے انداز میں اس کے سامنے رکھا اور اپنا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

”لیکن وجہ میری سمجھ میں نہ آ سکی۔“ ثانیہ بولی۔ ”کیا اسے نافع بھائی پسند نہیں؟“

”کس کو پسند ہو سکتے ہیں؟“ ناعمہ نے قہقہہ لگایا۔ ”ہاؤ لے سے۔“ ثانیہ اسے کھورنے لگی۔

”کیا مطلب؟ کوئی برائی ہے میرے بھائی میں؟“

”نہیں۔“ وہ منہ چلااتے ہوئے بولی۔ ”برائی تو نہیں ہے کوئی بھی، بس وہ لڑکیوں کی دماغوں میں وہ خناس ہوتا ہے

”کیا کہتے ہیں جسے۔۔۔ نینٹسی۔۔۔ وہ نہیں کری ایٹ ہو پائی۔ اسے اسی کا دکھ ہوگا۔“

ثانیہ کا کپ لبوں تک جاتے جاتے رک گیا۔ وہ تھیر سے اسے دیکھنے لگی۔

”ارے واہ، یہ بات تم نے کہی ہے؟“

”ہاں ہاں۔“ وہ منہ چلائی رہی۔ ”میں نے ہی کہی ہے، میں ہی تو ہوں یہاں۔“

”یقین نہیں آتا۔“ اس نے کتاب بند کر کے ہاشم سے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ اس نے انہی میں سر ہلایا۔

”مجھے خود نہیں آتا۔“ وہ پریشانی سے بولا۔ ”یار ہاشم! عشق تو کر رہا ہے اور خوشبو مجھ سے بھوٹنے لگی ہے۔ یہ

ایسا جڑا ہے؟“  
 ہاشم خالی الذہن سے اسے تکتا رہا۔ رافع اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور سلائیڈنگ ڈور کھسکا دیا۔ کاسی

بچھواؤں سے لدی ہوئی تیل اس کے سامنے جھونکے لگی۔  
 ”میں تیرے عشق کے جذبے سے متاثر ہو گیا یہ سچ ہے ہاشم! مجھے تجھ پر رشک آنے لگا۔ تیری آنکھوں سے

پھونکتی وہ مقناطیسی روشنی مجھے سنسزائز کرنے لگی۔ ٹھیک ہے لیکن یہ سب کیا ہے؟ میں یہ سب کچھ  
 نیسے لکھنے لگا؟ ایک۔ ایک ان جانی خوشبو ہے ہاشم! جو مجھے کشیختی ہے۔ میرا ہاتھ تھام کر اس میں کلمہ دیتی ہے۔

میرے دماغ کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔ مجھ میں جذبے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ میں ان جذبات کو نہیں پہچانتا۔ میں  
 نے اب سے پیشتر انہیں کبھی محسوس نہیں کیا۔ بس لگتا ہے خوشبو ہی خوشبو ہے۔ میرے اندر۔ میرے باہر۔

ان جذبات میں محض خوشبو کا نام دے سکتا ہوں۔ ان سے میری بس اتنی ہی شناسائی ہے جتنی کسی انجانی مگر مسکور  
 کرتی ہوئی خوشبو سے ہو سکتی ہے۔ یہ خوشبو مجھے مغلوب کر ڈالتی ہے۔ میں سوچتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ لکھتا چلا

اس نے مزاحیہ کلمہ کو دیکھا جو حرزہ سا ہو کر اسے تکتا رہا تھا۔  
 ”کیا ہے یہ؟“ اس نے قدرے جھنجھلا کر پوچھا۔ ”میرا جی چاہتا ہے میں ان احساسات کو کھینچ کر خود

علانیہ طور پر اس طرح سے سوچنا نہیں چاہتا۔“  
 ہاشم نے اپنے مسکرا دیے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رافع تک پہنچا اور اسے دونوں شانوں سے تھام لیا۔ کچھ دیر وہ

اس آنکھوں میں کھتا رہا۔  
 ”تو مجھے محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔“ رافع خاموشی سے اس کی آنکھوں

میں دیکھتا رہا۔  
 ”رافع! میں تجھے مزاجاً کھتا تھا۔ تیرے آنکھوں میں پتھر باندھ کر کوہو کے گرد گھومتا ہے۔ میں کہتا تھا تو نرم جذبوں

میں وہی نہیں لکھتا۔  
 ”میں نے اسے دیکھا کرے۔ میں نے ایسا بندر سمجھتا تھا جو محبت کی اور کب کا عالیشان ڈالٹھ

میں رافع نے اسے دیکھا۔  
 ”میں نے اسے دیکھا۔“ رافع نے اسے دیکھا۔

”میں نے اسے دیکھا۔“ رافع نے اسے دیکھا۔  
 ”میں نے اسے دیکھا۔“ رافع نے اسے دیکھا۔

”میں نے اسے دیکھا۔“ رافع نے اسے دیکھا۔  
 ”میں نے اسے دیکھا۔“ رافع نے اسے دیکھا۔

”میں نے اسے دیکھا۔“ رافع نے اسے دیکھا۔  
 ”میں نے اسے دیکھا۔“ رافع نے اسے دیکھا۔

پھر اس کا چلتا ہوا منہ رکا وہ اسے گھورنے لگی۔  
 ”کیا مطلب میں اتنا بھی نہیں سوچ سکتی۔ تم آخر مجھے کتابیہ وقوف کر دانتی ہو؟“

”بہت زبردست بات کسی تم نے۔“ ثانیہ ہنوز سوچ میں تھی۔ ”یہی ہوا ہے۔ لڑکیاں منگیتر کے نام پر کوئی  
 چاہتی ہیں جسے کسی نے پہلے نہ دیکھا ہو جو ایسا ہو کہ بس پھر سب ہی اسی کو دیکھیں۔ واہ واہ ہو۔ لڑکے کی مہینوں

قصیدہ خوانی ہوتی رہے لڑکی کی قسمت پر سالوں رشک کیا جائے۔ میرا معصوم سا بھائی ابھی اپنی عمر کے حساب سے  
 سیدھا سا ادا ہے۔“

”مسنو بے مسخو۔“ ناعمہ نے فوراً ٹکڑا لگایا۔  
 ثانیہ نے پھر اسے بری طرح گھورا۔

”میں کچھ دے ماروں گی۔ تمہارے سر پر۔“ اس کا تخیل جواب دے گیا۔ ”کیوں ہونے لگا میرا بھائی مسخو؟“  
 مذاق تو سب ہی لڑکے کرتے ہیں اس عمر میں۔

”اچھا۔ دیکھو۔“ ناعمہ نے کام پٹنا کر دوپٹے کے پلو سے منہ پونچھا۔ ”فرض کرو تمہاری نیت علی سے  
 کردی جائے۔“

”کیا؟“ وہ بھڑکی۔ ”یہ کیا فضول بات کی تم نے؟“  
 ”اگر ایسا ہو جائے تو کیسا ہے خوش ہوگی تم؟“

”نعم کر لوں اس جو کرے میرا نام کیوں لے رہی ہو۔“ اس نے  
 ناعمہ نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

”دوسروں کے بھائی جو کر رہے ہیں اور تمہارا بہت ذہین دوست اور شائق کون؟ اسے کوئی مسخو نہیں کہہ سکتا۔ ایک  
 ہی تخیلی کے تو ہیں سارے۔“

”لیکن علی؟“ ثانیہ کو تصور سے ہی الجھن ہوئی۔ ”نہیں۔“  
 ”تب ہی تو وہ بے چاری رو رہی تھی۔“ ناعمہ نے آدھ بھری۔

میری چادر گرترے بن میرا ہر خواب بے رنگ بے ثمر  
 میری ہر نگاہ بے سمت ہے میرا ہر شام کا ہر ایک رنگ ہاں چلا لیا ترے سنگ سنگ  
 یہاں رہ گئے ترے منتظر یہ اجاڑ اجاڑ سے باجم و در  
 مرے ہر زخم کا علاج تو مری ہر خوشی میں شریک تو  
 تو ہی رہنا تو ہی راستہ تو ہی رہ گزر تو ہی ہم سفر  
 جو نہیں ہے تو تو تیری قسم یہاں کوئی دل سے نہیں مرا  
 مری ہم قدم میرے ساتھ آ کہ ویران ہے مری رہ گزر

ہاشم پریشانی سے صحنے پر ابھری تحریر دیکھتا رہا پھر اس نے نگاہوں میں تحیر اور الجھن بھر کر اس کی سمت دیکھا  
 ”یار رافع! ایسا یہ تو نے لکھی ہے؟“

انگلیوں میں پکڑے بال پوائنٹ کی نوک منہ میں لیے رافع نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا پھر وہ ہنس پڑا

”تم خود کو کچھ سمجھتی ہو۔“ وہ قدرے خفگی سے بولا۔ ”تم سے جتنا پیار سے بات کرو تم اتنا ہی بھاگتی ہو۔ آخر میں برائی کیا ہے؟“

ربیعہ ایک سنانے کے عالم میں رہ گئی۔ تصور اس سے کیا چاہتا تھا اس کے سامنے بالکل واضح ہو گیا۔ اسے سمجھ نہ آیا وہ کس رد عمل کا اظہار کرے۔ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اسے بد یاد آیا حاکم چچا آئے نفسانی خواہش کی کچھڑے سے لست پت مرد۔ اسے تصور سے کراہیت محسوس ہوئی تھی۔

اسی لمحے صولت اندر آئی۔ اس کی نگاہوں میں غصہ تھا۔ اس نے تصور کو دیکھ کر بڑی کاشدار نظروں سے ربیعہ کو دیکھا۔ غائب و غایب کی کیفیت میں مبتلا۔ ربیعہ اس کی نظروں کے تیور نہ سمجھ پائی۔

”مجھے چاہیے۔“ وہ غصے سے بولی۔ ”میرے سر میں سخت درد ہے اور تم یہاں کھسی بیٹھی ہو۔ بیٹھ بیٹھ کر ہماری کمر نہیں دیکھتی؟“

”تم خود کیوں نہیں چائے بناتیں؟“ تصور بھی جیسے پھٹ پڑا تھا۔ ”ہڈ حرام کہیں کی۔ دو چار گھنٹے باہر گزار کر تم خود بہت قابل سمجھنے لگی ہو۔“

”میں نے آپ سے بات نہیں کی۔“ وہ ترخ کر بولی۔

”میں نے تو اردوں کا تمہارا۔“ وہ غرایا۔

”میں نے تم کو کمر سے باہر نکل گئی اور کچن میں آکر چائے بنانے لگی۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے لیبل لکھنے کے لیے بالکل انوکھی اور ناقابل برداشت تھی۔

چھ دیوہ میں باہر کا گیٹ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ تصور شاید گھر سے چلا گیا تھا۔ چند لمحوں بعد دولت کچن میں آگئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”میں نے اسے غائب کیا۔ صولت کھڑی گھرے گھرے سانس لے رہی تھی۔

”تم ہر وقت میری رہائی کے بارے میں سوچ رہی ہو؟“ وہ بد تمیزی سے بولی۔

”کیونکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟“

دکھ پال کر دیکھ لے جو یقین نہ ہو تو۔“

”ہاں۔ ڈونٹ ٹیل می۔“ وہ استہزائیہ ہنس دیا۔ ”میں بند رہنا چاہتا ہوں۔ میں عافیت چاہتا ہوں۔“

”میرے پیارے!“ ہاشم مزے سے پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔ ”مرزا غالب بڑے کام کی باتیں بتا گئے ہیں۔“

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔

رافع کچھ سوچنے لگا تھا۔ اور ہاشم کے لبوں پر مسکان تھی۔

وہ دروازے کی جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ ایسا اس نے دانستہ کیا تھا کیونکہ وہ ترانہ کے لائے ہوئے پرانی کمر کا مطالعہ کر رہی تھی۔

وہ بے حد دلچسپی اور جستجو سے صفحات پلٹ رہی تھی۔ جب اسے اپنی پشت پر لباس میں مہم آہٹ محسوس ہوئی۔ ربیعہ نے جھٹ پر اس کیٹس تکیے کے نیچے سر کا دیا۔

صفحات پلٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہونے والے شخص کے متعلق اس کے دل میں کچھ دیر گزر گیا۔

”تمہیں پتا چل گیا تھا نا کہ میں آیا ہوں۔ لیکن تم بن ہی نہیں۔“

ربیعہ کو کوفت بھری الجھن نے آگھیرا۔ اس گھر کے سب ہی لیکن ایک خاص طرز فکر کے حامل تھے۔

ترانہ کے ترانہ کو کچھ اس کی تعلیم نے اور کچھ اس کی جادو اثر محبت نے یکسر تبدیل کر دیا تھا۔

”تصور بھائی! میں ذرا مصروف ہوں پلیز۔“ اس نے غصے سے منہ پھیر کر کہا۔

دوسرے لفظوں میں اس نے مہذب انداز میں تمہارے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تصور وہیں صوبے پر گیا۔

”میں تمہیں کوئی کام تو نہیں بتا رہا بیٹھا ہوں۔“

اس گھر میں کل تین کمرے تھے۔ ایک مکمل طور پر منور تھا۔

سے بنا آہٹ کیے گزرنا تھا کہ کہیں وہ اسے پکار نہ لیں۔

وہ سرا کمرہ لڑکوں کے نام تھا۔ تصور اور تمدن دن میں تو اکثر موجود نہ ہوتے تھے۔ البتہ رات کو دونوں ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے۔ تیسرا کمرہ ترانہ صولت اور مینا استعمال کرتی تھیں۔

سوا ب ربیعہ بھی ان کی چوتھی روم میٹ بن گئی۔

ربیعہ کا جی چاہا کہ وہ تصور کو صاف طور پر رد میرے کمرے میں جانے کے لیے کہے لیکن وہ بے حد مصلحت پسند لڑکی تھی۔ ہر معاملے میں وہ وہاں تک جھک سکتی تھی جہاں تک جھک جانا اس کے اختیار میں ہوتا تھا۔

”اچھا۔ آپ بیٹھیں میں چلی جاتی ہوں۔“ وہ آرام سے کہتے ہوئے اٹھنے لگی۔

”میں کیا تمہیں کاٹ رہا ہوں۔“ وہ تنک کر بولا۔

ربیعہ چند ثانیوں کے لیے رکی۔

”میں کچھ دیر سکون سے بڑھنا چاہتی ہوں تصور بھائی! ایسا محض تنہائی میں ہی ممکن ہے ورنہ مجھے آپ کے یہاں بیٹھنے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

PHOTO

بات کی خبر نہیں ہے۔

صورت پتھر کی ہو گئی۔ ترانہ نے اس کے بال چھوڑ دیے تھے لیکن وہ وہیں کھڑی رہی۔ اس کے چہرے غصہ کا فور ہو چکا تھا۔

”اگر پچھو نے مجھ سے یا ربیعہ سے اس واقعہ کے متعلق کوئی استفسار کیا تو یاد رکھنا۔“ ترانہ نے دھمکی لہجے میں کہا تھا۔ ”میں انہیں سب کچھ بتاؤں گی۔“

صورت بے حد تیزی سے کچن سے باہر نکل گئی۔ ترانہ نے جیسے کسی بھرے ہوئے غبارے کو سوئی لگائی تھی۔ ربیعہ کی پلکوں پر اشک چکنے لگے۔ ترانہ نے اسے خود سے لگالیا۔

”یہ پچھو تمہیں مارنا چاہیے تھا ربیعہ۔“ وہ ہولے سے بولی۔ ”اپنے حقوق ہمیشہ اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔ ربیعہ خاموش کھڑی آسوی پتی رہی۔ اسے کسی کے سامنے رونا بہت مشکل لگتا تھا۔

”جیسے دیکھو ربیعہ! ذرا صولت جیسی ہو گئی ہے۔“ ترانہ آہستگی سے بولی۔ مسلسل ابلتی ہوئی کالی چائے دیکھ کر ربیعہ کو ہنسی آئی۔

شہلا ایک دم ہی پریشان ہو گئی تھی۔ ہال کا منظر اس کے لیے عجیب و غریب لگ رہا تھا۔ وہ اپنی ڈھولی اور کر کے ابھی ابھی لڑی تھی۔ اپنی سفید آئینہ سے اتر کر وہ اپنے خیالی کے عالم میں تین سیڑھیاں چڑھ کر۔

سی لائن میں داخل ہوئی تھی اور پھر دروازے میں ہی پھنس گئی تھی۔ اندر بڑے بڑے میزوں صوفوں پر محفل بھی ہوئی تھی۔

سامنے ہی ایقان بیٹھی کھلکھلا رہی تھی۔ اس کے پیچھے اور عمر بیٹھے ایک دوسرے کے کانوں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

ایقان کے دائیں جانب پڑے ہوئے دو صوفوں پر ماہین اور منیزہ بیگم براجمان تھیں۔ وہ دونوں بھی کسی دلچسپ بات پر مسکرا رہی تھیں۔ انبیقہ سینئر نیبل کے پاس فلور کشن رکھے بیٹھی تھی اور کپوں میں چائے اندل رہی تھی۔

اس خوش رنگ ماحول کو دیکھ کر بے ساختہ ہی اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اس طرح کی طرف سے آنے والی تھی کہ اس کے گزرتے ہی اس کے گزرتے ہی اس کے لیے ہاسم کا باضابطہ پروپوزل کے کرانے تھے۔ ماہین کا اس کے ہر کہہ ہونا بات پر صاف تھا۔

شہلا نے اپنی ہتھیلیوں پر نمی اترتے ہوئے محسوس کی۔ اسے اس ماحول کا حصہ بننے کے خیال سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ کیسا عجیب موڑ تھا زندگی کا۔ اس کی شادی بھی ہوئی تھی اولاد بھی اور پھر طلاق بھی ہوئی۔ لیکن اس وقت وہ نو عمر لڑکیوں کی سی گھبراہٹ اور شرم کا شکار تھی کیونکہ زندگی میں کبھی اس طرح کا موقع آیا ہی نہ تھا۔

”لیجئے۔ جن کے انتظار کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔ وہ وہاں چوروں کی طرح کھڑی ہیں۔“ ایقان چونکے متناہ بیٹھی تھی اس لیے شہلا سب سے پہلے اسی کی نظر پڑی۔ ”ادھر آؤنا یا ر!“

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ شہلا من من بھر کے قدم اٹھاتی وہاں تک پہنچی اور وہی آواز میں سلام کیا۔ ”وعلیکم السلام۔“ ایقان نے اسے ساتھ لگالیا۔ ”ہم کب سے آپ کے منتظر ہیں ڈاکٹر صاحبہ! آپ کو اب مریضوں سے فرصت نہیں۔ کچھ مریض محبت کا بھی خیال کیجئے۔“

آخری جملہ اس نے سرگوشی میں اس کے کان میں کہا تھا۔ شہلا نے خفگی سے اسے گھورا۔ اس نے فوراً ”بابا“

نٹوں تلے دہائی۔

”تم نہیں سدھرو گی۔“ شہلا اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”میرا میاں بھی یہی کہتا ہے۔“ وہ مزے سے بولی۔

شہلا کی نگاہ خاموش بیٹھی ماہین پر پڑی۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ ماہین کی جوابی مسکراہٹ میں رسمی انداز تھا۔ کسی بی خوش دلی مشق نہ تھی۔ شہلا کا دل لڑکھایا۔

”اگر اجازت ہو تو میں چینیج کر لوں؟“ وہ ملنے چلنے انداز میں بولی۔

”جی نہیں۔“ ایقان نے اسے ہاتھ کھینچ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ ”کوئی اجازت و اجازت نہیں ملے گی یہاں سے نکلنے کی اور ان کپڑوں میں بھی ٹھیک ہی لگ رہی ہو۔“

پھر اس نے رک کر مومن اور عمر کو دیکھا۔ ایمان کو وہ عذرا بیگم کے پاس چھوڑ آئی تھی۔

”بیٹا۔۔۔ آپ لوگ باہر کیوں نہیں کھینچتے؟“ ان میں بہت مزہ آئے گا۔“

وہ دونوں جیسے تیار ہی نہیں تھے۔ کھانکھلا تے ہوئے باہر کی سمت ہو لیے۔

شہلا بیٹھی ”منیزہ بیگم بے حد حساب خوش نظر آتی تھیں۔“ یہ لوگ تمہارے لیے پروپونل لائی ہیں۔ ماہین کے بیٹے کا نام ایقان کے بیٹے ہاسم صاحب کا۔ آپ تو جانتی ہی ہوں گی انہیں۔ برسوں سے آئی جاتی ہیں۔

”جی ای۔۔۔ ساری خود اعتمادی ہو ہو رہی تھی۔ وہ بے حد خفت کا شکار تھی۔“

”بیٹا۔۔۔ فلاں ہے ایسے فیملی یوں اچانک تو ہو نہیں سکتے۔ تمہیں بھی سوچنے کو کچھ وقت درکار ہو گا لیکن انبیقہ میں۔۔۔ ہم بیویوں تو مستحقہ ہیں کہ ہماری جانب سے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ اٹھے گا۔ سب سے زیادہ رازے

تھیں۔۔۔ عمار بھی پوچھ گئے کیا کہتی ہو؟“

شہلا نے نگاہیں ڈالی۔ ”ان میں بے ساختہ بھرنے والا پانی کوئی نہ دیکھ سکا۔“

ایقان نے شوخی سے ہنسی۔ ”ہاں بولونا۔“

”میں آتی ہوں۔“ وہ ایقان کی جانب سے اندر کی سمت بڑھ گئی۔

”اے شہلا! جواب پہلے ہی مل چکا تھا اس کا اطمینان بے وجہ نہ تھا۔ ماہین پہاؤ بدل کر رہ گئی تھی۔ انبیقہ کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔“

آہی۔۔۔

”آہی! انبیقہ نے کافی کامک سائیڈ نیبل پر رکھ کر محبت سے اس کے سوچے ہوئے پوٹوں کو دیکھا پھر وہ اس کے حریف بنی بیٹھ گئی۔“

”ہوں۔“ شہلا نے کتاب پر سے نگاہ نہ اٹھائی تھی۔

”ادھر دیکھیں میری طرف۔“ وہ شرارتاً ”مسکرائی۔“

شہلا نے گہری سانس بھرتے ہوئے کتاب بند کر دی اور سوائے نظروں سے اس کی سمت دیکھنے لگی۔ خواہصورت سب آٹکھیں متورم تھیں۔

انبیقہ نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔



”یہ گولڈن چانس ہے آئی! اسے من نہ کریں! تقدیر نے آپ کو آپ کی سابقہ خطائیں معاف ہو جائے  
سنگل دیا ہے۔ ریاضت کا صلہ مل رہا ہے۔ فوراً سے پیشتر ہاتھ بڑھا دیں۔“  
شہلا نے نظریں چرائیں۔

”ہر طرح کی الجھنوں سے چھٹکارا مل جائے گا آپ کو۔ مجھے آپ کی راہوں میں دور تک گلاب بیچے دکھائی  
رہے ہیں۔“

”ہنس پٹکی!“ شہلا نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ ”راہ تو بس وہیں تک نظر آتی ہے جہاں پر قدم ہوتے ہیں۔ گز  
آگے کیا ہے گولی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم نے دور دور تک منب دیکھ لیا۔“  
”کیا! کمان تو اچھا رکھنا چاہیے نا۔“ وہ سانسیت سے بولی۔ ”تمنا کے گلزار میں ہمیشہ خوش رنگ پھولوں کا  
ہونا چاہیے یہی جینے کی اساس ہے۔“

”تمنا کا گلزار!“ وہ اداس ہو گئی۔ ”تمنا کا گلزار تو صحرا کا نخلستان ہے پٹکی! اس کی حد سے پرے دُور دور  
جھلکتا ہوا ریگ زار۔ تمنا کا گلزار وہم ہے دھوکہ ہے۔ حقیقت ریگزار تمنا کی طرح اچانک منہ کے سامنے  
ہے۔ پھول پتے پودے پانی سب سراب ٹھہرتا ہے اور انسان عمر بھر اسی سراب کے پیچھے دوڑتا جاتا ہے۔  
یہی سزا سالی ہے سب کو۔“

”او فوہ!“ اس نے شہلا کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔ ”اتنی جتنا باتیں کہیں پر ایک بار نہیں جانیے۔  
انسان جینے کا ارادہ ہی ترک کر دے۔ گلزار تمنا جینے کا نام ہے تو ہے۔“  
”ایسا ہے تو پھر ریگزار تمنا زندگی ہے۔“

”قنوطیت کی انتہا۔“ انہی نے اسے بری طرح گھورا اور ایک ٹون بدل دی۔  
”تو محترمہ شہلا محسن علی صاحبہ! قدرت اس ریگزار سے باحفاظت گزرنے کے لیے آپ کو ایک عدد ٹکڑا اونٹ  
فراہم کر رہی ہے۔ میرا اشارہ جناب ہاشم فاروق حسن کی جانب سے ہے۔ انہیں آپ کو منظور ہے؟“  
شہلا نم پکوں کے ساتھ اچانک ہی ہنس دی۔ اس کی شہس بے ساختہ گور شفاف گئی ہر دم اور اندیشہ  
سپاک۔ انہی نے اسے ہنسا دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

”انہی!“ شہلا ایک سنجیدہ دہنی۔ ”نعمت بہت سمجھ دار بچہ ہے اور اب تو وہ اپنے باپ سے بھی مل چکا ہے۔  
مجھے اندیشہ ہے کہ یہ واقعہ اس کے ذہن کو متاثر کر سکتا ہے۔“

”جناب! عمر سے زیادہ سمجھ دار ہاشم فاروق حسن ہیں جو ان کے قریب ہو چکا ہے اور مجھے اکثر ان کی باتیں بتاتا ہے۔ مجھے یقین ہے عمر اس نے  
رشتے کو ذیل و جان سے قبول کر لے گا بشرطیکہ۔“

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ شہلا نے اس کی جانب دیکھا۔  
”بشرطیکہ۔“ کہیں ”سے گڑ بڑ کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔“  
”اس کی گارنٹی کون دے سکتا ہے۔“ شہلا نے سر جھٹکا لیا۔  
انہی کی آنکھوں میں ایک فیصلہ کن سوچ ابھری تھی۔

وہ مڑ کر دوبارہ کچن میں ٹھس گئی۔ فردوس بیگم نے پلٹ کر اسے دیکھا۔  
”لو کی! میں کہتی ہوں علی کو جگا دو۔ اس نے کہا تھا گیارہ بجے جگانے کے لیے۔“  
”جگا دیتی ہوں۔“ وہ بیزار سی سے بولی اور دروازے کی جانب پشت کھڑی رہی۔  
”ارے۔“ وہ متعجب ہوئیں۔

اسی لمحے دروازے میں نافع نمودار ہوا تھا۔  
”السلام و علیکم تائی امی!“ وہ کچھ جھینپا جھینپا دکھائی دیتا تھا۔  
فردوس بیگم کے تاثرات آن واحد میں تبدیل ہوئے تھے وہ ماتھے کی سلو میں چھپا کر مسکرا نے لگیں۔  
”علیکم السلام بر خیر و اس جیتے رہے خیر ہے ہو۔“

”جی۔“ اس نے بے ہوشی پر بے خبر نگاہ کی۔ ”علی اور حمزہ کہاں ہیں تائی امی! ہمیں یونیورسٹی جانا تھا۔“  
”کب سے تو کہہ رہی ہوں اس لڑکی کو! انہیں جگا دے جگا دے۔ سستی ہی نہیں ہے۔“ وہ بیزار سی سے بولیں پھر  
لخت انہیں کچھ خیال آیا۔ ”اے ہاں بے چاری مصروف بھی تو ہے صبح سے۔ میرے ساتھ لگی ہوئی ہے  
لڑکے ہی بڑے ڈھیٹ ہیں! اٹھ کر نہیں دیتے جاؤ بیٹا! تم خود ہی جگا لو انہیں! اوپر اپنے کمرے میں

جی۔“ غائب ہوا۔  
فردوس بیگم نے اس کا پتھر بلا چہرہ غور دیکھا مگر پھر انجان بن کر کینٹ میں ہاتھ مارنے لگیں۔

\*\*\*

بڑے بڑے شیشے کے بعد نمبر کھو جاتا تھا۔ وہ شہلا سے بھی پوچھ سکتی تھی لیکن وہ یہ کام بہت خفیہ طور پر  
نہایت چاہتی تھی۔  
”دو دو صرف جناب جان! قتل سننے لگی۔“  
”ہیلو۔“ ریچھو دار نے شہلا کو دیکھا۔ ”انداز میں بلا کا اشتیاق تھا۔ غالباً“ اس نے سی ایل آئی پر آنے والی  
ٹائ کا نمبر بغور دیکھا تھا۔

”نعمت!“ شہلا نے کہا۔  
”نعمت!“ شہلا نے کہا۔ ”نعمت بہت کر رہی ہوں۔“  
”نعمت!“ شہلا نے کہا۔ ”نعمت بہت کر رہی ہوں۔“  
”نعمت!“ شہلا نے کہا۔ ”نعمت بہت کر رہی ہوں۔“

”غالباً“ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ دو مری جانب انہی ہو سکتی ہے۔  
”کیسی ہو پٹکی!“ وہ برسوں پہلے اسے اسی انداز سے پکارتا تھا۔  
”نائن۔“ ”نر سا“ بولی۔ ”میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں آپ سے۔ ٹائم ہے آپ کے پاس؟“  
”شیور۔“ وہ بے حد خوش لگتا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔)



گلاس دور کے باہر نافع کھڑا نظر آ رہا تھا۔ کچن سے نکلتی عریضہ لمحہ بھر کے لیے رکی پھر اس کے اندر سخت  
نا پسندیدگی کی ایک لہر اٹھی تھی۔

ریمو کو تو ایک خواب دیکھ رہی ہے کہ دادی کسی عوامی شدید بیماری کے عالم میں اس سے پانی مانگ رہی ہیں۔ اسے دادی نے ٹنک میں درجہ کاغذات کے ساتھ خطوط اور تصاویر بھی ملتی ہیں۔ ایک تصویر میں اسے اپنی شباب مت محسوس ہوتی ہے۔ بوسیدہ خطوط میں قلم بھی نام اس کی نظر سے گزرتے ہیں وہ ان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ بقیس اس کی پچھلی زندگی کا ایڈریس پاکر وہ کسی قدر مطمئن ہو جاتی ہے مگر ان کے استعمال کی خبر والا خط پڑھ کر وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر شہلا اپنی ماں سنیہ بیگم کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس کا بیٹا اکثر اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ڈاکٹر شہلا کو ملاقات ہو چکی ہے اور اس کا سابقہ شوہر اس کے گھر فون کر کے اکثر اپنے بیٹے کی باتیں کرتا ہے۔ فردوس بیگم کا بڑا بیٹا اسٹیم ڈاکٹر شہلا سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ قطعی آمادہ نہیں۔ ریمو اپنی تہائی اور لوگوں کے ہلے رتوں سے تنگ آ کر اپنی پچھلوں کے گھر لاہور جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ رڑ میں ریمو کی ملاقات عباد سے ہوتی ہے۔ یہ جان کر کہ ریمو تنہا سفر کر رہی ہے۔ وہ از خود اس کی پچھلوں کے گھر تک رہنمائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ ماسٹر (ایقان کاشورہر) اپنے دفتر سے نکلا تو لیزا گارڈی لیے اس کی منتظر تھی۔

## پتلا ہونے کا وقت

انیقہ سوچ میں پڑتی تھی۔ ابراہن کی اس قدر خوشی کی وجہ اسے سمجھ میں نہ آ سکی۔ برسوں سے ٹٹے والے رشتے کے بد اثرات سے بادلوں کی طرح ان کے گھر کی خوشیوں کی کوئی روشنی نہ رہ سکتی تھی۔ گمان غالب تھا کہ وہ سری جانب بھی اس حادثے کا اثر محسوس کر رہی ہو گی۔ کیا وجہ تھی وہ چند لمحوں کے لیے سوچتی رہ گئی۔ "ہیلو" وہ اسے خاموش پاکر پکار اٹھا۔ "نکی! کہو! تم کچھ کہہ رہی تھیں۔ کیا بات ہے ایسی جو تمہیں سمجھ نہ آئے۔" انیقہ نے اس کی بات پر اس کی بد تمیزی سے واسطہ پڑ کا تھا ہوسودہ ہوتا تھا۔ "جی ہاں! بات یہی کچھ ایسی ہے جو مجھے خود پر جبر کرنا پڑا۔" اس نے صاف کوئی کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ "ورنہ میں آپ کی آواز سننے کی روادار نہ تھی۔ انسان اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بھول جاتا ہے۔ معاف کر دیتا ہے لیکن اپنے پیاروں کا دکھ دیکھنا اور دکھ پہنچانے والے کو معاف کرنا ناممکن امر لگتا ہے۔ میں اپنی پیاری بہن کی آنکھوں میں پچھلے پانچ سالوں سے مسلسل آنسو دیکھ رہی ہوں۔ یہ سب کچھ میرے دل پر عرصہ تھا جب ہر لڑکی صرف اور صرف مسکراتا جانتی ہے اور ہر موسم مسکراہٹ کے پھول اس کے حائر حق کی طرح اس کی گود میں ڈال کر گزرتا ہے۔ ہر موسم بہار کا موسم لگتا ہے۔ آپ نے اس کی زندگی کو خزاں کا گھن لگا دیا۔ جینا بھول گئی، مسکراتا بھول گئی۔"

"تم بھی کچھ بھول رہی ہو گی!" وہ بے ساختہ اس کی بات کاٹ گیا تھا۔ "ہن باس اگر اس نے کاٹا ہے تو یہ سزا میں نے بھی اتنی ہی بھلتی ہے جتنی اس نے۔ اس کے پاس میرا بیٹا تھا، میرے پاس کیا تھا؟ اس کے پاس "سچ" ہونے کا غرور تھا، میرے حصے میں ندامت اور پشیمانی کے انگارے آئے تھے۔ انسان حق پر ہو تو سولی بھی سکون سے چڑھ جاتا ہے۔ ظلم و زیادتی کا احساس انسان کو نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے دیتا ہے۔ میں نے ایک ایک لمحہ اس کرب ناک سوچ کا شکار نہ کر گزارا ہے نکی! کہ میں نے اس کے ساتھ کیا کیا جو کچھ بد نصیبی سے ہو گزرا وہ میری کوئی سوچی سمجھی سازش نہ تھی، اس کے نازک جذبوں کا خون ہوا تو بخدا یہ قتل عمد نہ تھا۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ میری سیاہ نصیبی تھی۔ ابراہن کی ٹھنڈی نرم پھوار سے رگ جال سیراب نہ ہو پائی تھی اور میری بد قسمتی نے ہاتھ

اسے کئی بار فون پر اس کی بد تمیزی سے واسطہ پڑ کا تھا ہوسودہ ہوتا تھا۔ "جی ہاں! بات یہی کچھ ایسی ہے جو مجھے خود پر جبر کرنا پڑا۔" اس نے صاف کوئی کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ "ورنہ میں آپ کی آواز سننے کی روادار نہ تھی۔ انسان اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بھول جاتا ہے۔ معاف کر دیتا ہے لیکن اپنے پیاروں کا دکھ دیکھنا اور دکھ پہنچانے والے کو معاف کرنا ناممکن امر لگتا ہے۔ میں اپنی پیاری بہن کی آنکھوں میں پچھلے پانچ سالوں سے مسلسل آنسو دیکھ رہی ہوں۔ یہ سب کچھ میرے دل پر عرصہ تھا جب ہر لڑکی صرف اور صرف مسکراتا جانتی ہے اور ہر موسم مسکراہٹ کے پھول اس کے حائر حق کی طرح اس کی گود میں ڈال کر گزرتا ہے۔ ہر موسم بہار کا موسم لگتا ہے۔ آپ نے اس کی زندگی کو خزاں کا گھن لگا دیا۔ جینا بھول گئی، مسکراتا بھول گئی۔"

انیقہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ جیسے جو کچھ اس کے ذہن میں تھا۔ اس پر جی ای جی میں غور ہو پھر اس نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا۔  
 ”ابرا بھائی! ہم لوگ اپنا کی شادی کر رہے ہیں۔“  
 ”کیا؟“ وہ ایسے بولا جیسے ٹھیک طور پر سنا نہ ہو پھر کا ایک ہی نجانے کیا سوچ کر وہ دفعاً خوشی سے بولا۔  
 ”واقعی؟“

انیقہ کو اس کی ذہنی کیفیت پر تعجب ہوا۔  
 ”ہم۔ ہم لوگوں نے اپنا کا رشتہ طے کر دیا ہے۔“ وہ پھر جتانے والے انداز میں بولی۔ مبادا ابرار نے  
 ”کچھ ہی عرصے میں باقاعدہ رخصتی عمل میں آجائے گی۔“  
 ”شہلا مان گئی؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔  
 ”جی۔ جی ہاں، مشکلوں سے سہی، لیکن مان گئی ہیں۔“ انیقہ اب تک اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ

کنفیوژ ہو رہی تھی۔  
 ”اچھا!“ وہ ٹھنڈے اور ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ”یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے۔“

”آپ۔ آپ کے اعتراض سے ہرچند کہ کوئی فرق تو نہیں پڑتا لیکن میں یوں ایک غلط  
 غرض سے پوچھ رہی ہوں۔ آپ کو اپنا کی نئی زندگی شروع کرنے کا کیا اعتراض ہے؟“ ابرار ہونے لگی۔  
 جیسے اسے انیقہ سے اس بے وقوفی کی امید نہ ہو۔

”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔  
 ”آپ عمر کی کسٹڈی کا دعوت تو نہیں کر دیں گے؟“ وہ جیسے ڈرتے ڈرتے بولی۔  
 وہ چند لمحوں کی کیفیت سے مفلوظ ہوا۔

”اگر کروں تو؟“  
 ”پلیز ابرا بھائی!“ وہ لجاجت سے بولی۔ ”میں نے دراصل یہی بات کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ یہی اصل  
 تھا جس کے لیے۔“

”تم نے خود پر جبر کیا تھا۔“ وہ بات کاٹ کر ہلکے سے ہنسا۔  
 ”میں معافی چاہتی ہوں کہ میں نے ایسا کہہ کر آپ کے  
 صفائی میں کہا، اس نے مجھے بھی بے حد متاثر کیا ہے۔ میرے دل میں آپ کے خلاف غم و غصے کے جو کثیف  
 تھے وہ آپ کے اعتراف سے جیسے چھٹ سے گئے ہیں۔ لیکن پلیز ابرا بھائی! میں ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتی  
 کہ اب میری بس کو زندگی کی حقیقی خوشیوں کا لطف اٹھالینے دیجئے۔ اس کے بن باس پر رحم کھائیں۔ اگر  
 آپ اپنے کیے پر پشیمان ہیں تو اب اسے ایک اچھی اور مکمل زندگی کی شروعات کی دعا دیجئے۔ عمر میں اپنا کی جان  
 ہے۔ وہ اس کے ہونے سے ہیں، اس کی سانسوں سے جیتی ہیں، اس کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ اگر آپ  
 کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی کا سوچا بھی تو میری بس اس خیال سے ہی مر جائے گی۔“ بولتے بولتے اس کا سنا  
 پھول گیا۔ الفاظ ساتھ چھوڑنے لگے۔ آنسو زبان بننے پر آماں ہوئے۔

”تم فکر مت کرو کی!“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”میں ایسا کچھ نہیں کروں گا جیسا تم سوچتی ہو۔ شہلا کو نئی زندگی  
 شروعات مبارک ہو۔ میرے دل میں اس کے لیے کوئی غصہ نہیں ہے۔“  
 ”اور۔ اور۔ عمو۔“ وہ اٹکنے لگی۔

”اگر آپ کے اعتراف سے جیسے چھٹ سے گئے ہیں۔ لیکن پلیز ابرا بھائی! میں ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتی  
 کہ اب میری بس کو زندگی کی حقیقی خوشیوں کا لطف اٹھالینے دیجئے۔ اس کے بن باس پر رحم کھائیں۔ اگر  
 آپ اپنے کیے پر پشیمان ہیں تو اب اسے ایک اچھی اور مکمل زندگی کی شروعات کی دعا دیجئے۔ عمر میں اپنا کی جان  
 ہے۔ وہ اس کے ہونے سے ہیں، اس کی سانسوں سے جیتی ہیں، اس کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ اگر آپ  
 کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی کا سوچا بھی تو میری بس اس خیال سے ہی مر جائے گی۔“ بولتے بولتے اس کا سنا  
 پھول گیا۔ الفاظ ساتھ چھوڑنے لگے۔ آنسو زبان بننے پر آماں ہوئے۔

”تم فکر مت کرو کی!“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”میں ایسا کچھ نہیں کروں گا جیسا تم سوچتی ہو۔ شہلا کو نئی زندگی  
 شروعات مبارک ہو۔ میرے دل میں اس کے لیے کوئی غصہ نہیں ہے۔“  
 ”اور۔ اور۔ عمو۔“ وہ اٹکنے لگی۔

”اگر آپ کے اعتراف سے جیسے چھٹ سے گئے ہیں۔ لیکن پلیز ابرا بھائی! میں ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتی  
 کہ اب میری بس کو زندگی کی حقیقی خوشیوں کا لطف اٹھالینے دیجئے۔ اس کے بن باس پر رحم کھائیں۔ اگر  
 آپ اپنے کیے پر پشیمان ہیں تو اب اسے ایک اچھی اور مکمل زندگی کی شروعات کی دعا دیجئے۔ عمر میں اپنا کی جان  
 ہے۔ وہ اس کے ہونے سے ہیں، اس کی سانسوں سے جیتی ہیں، اس کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ اگر آپ  
 کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی کا سوچا بھی تو میری بس اس خیال سے ہی مر جائے گی۔“ بولتے بولتے اس کا سنا  
 پھول گیا۔ الفاظ ساتھ چھوڑنے لگے۔ آنسو زبان بننے پر آماں ہوئے۔

اندھیرا تھا۔ کونے میں رکھے ڈیک سے غزل کی مدہم سی آواز ابھر رہی تھی۔

حالِ دل ہم بھی سناتے لیکن  
جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا  
وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا  
دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

عریشہ نے آگے بڑھ کر لائنس آن کیں اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ناعمدہ جھپکتے ہوئے اس کے مقابل بیٹھی تھی۔ عریشہ نے ریموٹ سے ڈیک آف کر دیا۔ کمرے میں ایک لخت خاموشی چھا گئی۔ چھت پر گھومتا ہوا پتلا سی آواز سدا کر رہا تھا۔

ناعمدہ کو تادیر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے، کیا پوچھے۔ عریشہ اس کے مقابل بیٹھی تھی لیکن اس سے ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ اس کی سرخ آنکھیں کوئی خفتہ کہانی کہہ رہی تھیں۔ ناعمدہ کا ذہن اس بولی کو سے قاصر تھا۔

”عریشہ“ بالآخر وہ بولی۔

”ہوں!“ اس نے لبوں پر زبان پھیری۔ ”کہو“

”تمہاری طبیعت۔“

”ٹھیک نہیں ہے“ اس نے اپنی کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اطمینان سے کہہ دیا۔ ناعمدہ کو سوائے اس کی متروک آنکھوں سے طبیعت کی اور اپنی کا کوئی اور سراغ ہاتھ نہ آیا۔ ”کیا ہوا ہے؟“ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ ہنوز سابقہ انداز میں بولی جس میں منہ غصہ تھا نہ شکایت۔

ناعمدہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی صورت دیکھی۔

”کیسے آنا ہوا؟“ بظاہر اس نے شائستگی سے پوچھا۔

”دھب میں۔“ ثانیہ ثانیہ اور میں۔ اور سرد رہا وہ۔ ”لوگ آج کمرے میں ہیں۔“ وہ ہنسی

تمام بولی۔

”اچھا!“ عریشہ اسی سکون سے بولی۔

”ہم لوگ۔۔۔ بپ۔۔۔ باتیں کر رہے تھے۔“ ناعمدہ کو لگتا تھا وہ کسی انجان ہستی کے مقابل بیٹھی ہے۔

یہ وہ عریشہ تو نہ تھی جسے وہ جانتی تھی۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”کر باتیں۔“

”تم۔۔۔ تم چلو نا میرے ساتھ۔“ اس نے بے حد جھپکتے ہوئے کہا۔

عریشہ نے نفی میں سر ہلایا لیکن بے حد واضح انداز میں۔ ناعمدہ کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ چھوڑا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا۔“ وہ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ ”میں چلوں؟“

”خدا حافظ“ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

ناعمدہ ایسے ڈر کر کمرے سے نکلی جیسے عریشہ اسے مارنے کے لیے پیچھے دوڑے گی۔ تیز تیز قدموں سے اتر

لاؤنچ پار کیا تھا کہ فردوس بیگم کی آواز نے اسے مزید سہا دیا۔

”ارے ٹھہرو تو لڑکی! کہاں بھاگے جاتی ہو۔“ وہ بیگم سے نکل کر اس کی جانب آرہی تھیں۔



”جی ہاں! ممانی جان!“ وہ ٹھہر گئی۔  
 ”ہو گئی بات؟“ انہوں نے کھوجتی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔  
 ”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اثبات میں ہلایا۔  
 ”کیا۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ کیا بات ہوئی؟“  
 ”جی؟“ ناعمہ کو مزید حیرانی کا سامنا ہوا۔

آج سے پیشتر انہوں نے کبھی دونوں سیلیوں کے مابین ہونے والی گفتگو کے متعلق کسی قسم کا استفسار نہ کیا تھا۔

”دوست! اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ پھر وہ نرمی سے بولیں۔ ”وہ ہم سب سے بھی ایسی ہی اکٹھی ہے۔ تم محسوس نہ کرنا کچھ۔“  
 ”جی ممانی! ٹھیک ہے۔ اب میں چلوں!“ وہ مڑی تھی۔  
 ”بات سنو ناعمہ!“ انہوں نے پھر اسے پکارا۔  
 ”جی؟“ وہ بلی۔ اس کی حیران آنکھوں میں استفسار تھا۔  
 ”دوست! بیٹا۔ عریشہ کی طبیعت کا کسی سے ذکر مت کرنا۔“ وہ بڑے سخت سے بولی تھیں۔ ”کیا اب وہ دن یاد نہیں جاتے؟“

ناعمہ کی آنکھوں کی حیرانی میں یک لخت کی واقع ہوئی۔ یہ وہ کچھ سمجھ گئی۔  
 ”جی ممانی جان!“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”ترانہ ایک بات کہوں تم سے، تم برا تو نہیں مانو گی؟“ ربیعہ نے اداسی سے پوچھا۔ اس کی بات میں عجب گہرائی تھی۔ ترانہ اسے دیکھنے لگی۔

”میرا کسی ہاسٹل میں بندوبست کرو۔ میں نوکری کر کے اپنے اخراجات پورے کر لوں گی۔“  
 ”ربیعہ!“ ترانہ نے یک دم اس کے ہاتھ تھام لیے۔

ربیعہ نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تیزی سے آنسو اٹھ اٹھے۔ ربیعہ حیران بھی ہوئی اور شرمسار بھی۔  
 ”ترانہ! میرا مقصد تمہیں دکھ دینا نہ تھا۔ لیکن میں نے بے حد مجبور ہو کر یہ بات کہی ہے۔ تم سے ہاسٹل ہر شہر

میں ہوتے ہیں، میں اپنے شہر میں ہی کسی ہاسٹل میں کسی دکان میں اپنے دو چھوٹے بچے لے کر رہتی ہوں۔ لیکن یہاں کی خوشبو بہت براثر ہوئی ہے۔ یہ انسان کو پوری طاقت سے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ خونی رشتے بہت توانائی رکھتے ہیں انہیں جھٹلانا آسان نہیں ہوتا۔ میں یہاں کچھ چلی آئی۔ اپنی تلاش میں اپنائیت کی خاطر۔“

”اور یہاں تمہیں غیریت ملی دکھ ملا۔“ ترانہ نے سر جھکا کر کہا۔  
 ”تمہاری محبت اور تمہارے خلوص کی روشنی میں ہر سیاہ روپہ و ہند لایا گیا ہے ترانہ۔“ ربیعہ پیار سے بولی۔ ”تم نے مجھے ایک بہن کی سی چاہت دی ہے، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ترانہ!“ وہ اداس ہو کر بولی۔

”مجھے میرا پندار بہت عزیز ہے۔ مجھے میری ہستی کا غرور، میرے کردار کی بلندی ہر شے سے برتر کر بیاری ہیں۔ میں اپنے دامن کو آلودہ نہیں دیکھ سکتی۔“

”تمہارا دامن کوئی معمولی سا داندہار بھی نہیں کر سکتا ربیعہ! کم از کم میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ترانہ جوش سے بولی۔

”ترانہ تم بڑھتے ہوئے قدم روک سکتی ہو، اٹھتا ہوا ہاتھ پکڑ سکتی ہو لیکن چلتی ہوئی زبان کو روکنا تمہارے اختیار

میں نہ ہو گا۔ صولت کی بات نے مجھے سر سے پاؤں تک لرزا کر رکھ دیا ہے۔ میں نے رائی کا پہاڑ بننے سنا ہے لیکن بنا رائی کا پہاڑ۔“

”تم صولت کی باتوں پر دھیان دے رہی ہو یا اگل لڑکی!“ ترانہ پیار سے بولی۔ ”جس کی کھوپڑی بالکل کھوکھلا ڈبہ ہے، دماغ نالی کسی شے کا معمولی سا سایہ بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ آسے تو سوچنا تک نہیں آتا ربیعہ!“

”جو کچھ اس نے کہا، وہ معمولی سوچ کی کرشمہ سازی نہ تھی۔“ ربیعہ نے سر جھٹکا۔ ”معمولی سوچ کی اڑان اتنی اونچی نہیں ہوتی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ طے کیا ہے کہ میرا کردار درست نہیں ہے۔ اپنے حساب سے اس نے مجھے ہر بات کا جواز بھی پیش کیا تھا۔“

”ربیعہ! تم نے ٹھیک کہا کہ بڑھتے ہوئے قدم اور اٹھتے ہوئے ہاتھ کو روکا جاسکتا ہے لیکن چلتی زبان پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔ اسی لیے تاریخ میں بہت عظیم کردار کی حامل خواتین پر بھی بہتان تراشی کے واقعے رقم ہیں، ہم کیا اور ہماری اوقات کیا؟ پھر کیوں ہم ایسی گندی زبانوں کی پروا کریں۔ ان کے خوف سے اپنی زندگی کے فیصلے کریں۔

اپنے دن رات بسر کرنے کا طریقہ؟ کارہم ایسے دنوں کو بد نظر رکھ کر ترہیب دیں۔ کیوں؟ کیا یہی دانش مندی ہے؟“ ربیعہ نے گہری سانس بھر کر سر اٹھایا اور بوڑھے برگد کی لنگتی شاخوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے حد اداس ہو رہی تھیں۔ ترانہ کو اس پر ٹوٹ کر بیاں آیا۔ اس نے ربیعہ کا گورا چٹا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”جی۔۔۔ اتم دنیا میں تنہا ہونا؟ تمہارا کوئی نہیں؟“

ربیعہ نے قہقہوں سے اسے دیکھا۔

”ربیعہ! میں تم سے زیادہ تنہا ہوں۔ میرا باپ ہے، بھائی ہیں، بیٹی ہے، صولت کے نام پر بہن بھی ہے۔ لیکن ربیعہ! جس شخص کو رشتوں کے بیچ رہ کر بھی تنہائی کی اذیت سے دوچار ہونا پڑے، اس کی تکلیف رشتوں سے

عموم شخص کی تکلیف سے زیادہ ہوتی ہے۔ رشتوں سے محروم شخص کو محض محرومی کا احساس ہوتا ہے نا؟ رشتوں میں جو ہے، دنیا میں کوئی تنہائی بھگتا ہوتی ہے۔ ذہنی تنہائی بہت تکلیف دہ احساس ہے ربیعہ! جیسے۔۔۔ جیسے

جیل میں نووارد۔ نیز کا احساس، اجنبیت کا احساس، ذہنی فاصلوں کا احساس۔ میں نے ایک طویل عرصے ان احساسات سے جھٹلتے ہوئے خود کشی کر لیتی شاید اگر مجھے عبدالباری نہ ملتا، باری نے مجھے زندہ رکھا اور تم نے مجھے ذہنی ہم آہنگی دی، محسوس کی کہ میں تنہائی کی شے کی سیانی اور توانائی کا احساس دیا۔ تم میرے لیے بہت کچھ ہو

چاہت ہو۔ بہت کچھ مجھے سیکھنے سے بھی دور رکھنے کی بات مت کرنا۔ تم مجھے عبدالباری کی طرح عزیز ہو۔ میں تمہیں

ہر شے میں تمہیں سیکھ سکتی۔“

ربیعہ نے پہلی مرتبہ ترانہ کو اس قدر جذباتی دیکھا تھا۔ وہ دم بخود تھی۔  
 ”میں کہیں نہیں جاؤں گی ترانہ!“ وہ بولی ”بجب تک تمہاری شادی باری سے نہیں ہو جاتی۔“

ترانہ زور سے ہنس دی۔  
 ”بے وقوف!“ پھر وہ خوش دلی سے بولی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟ میں خوشی خوشی باری سے شادی کروں گی اور تمہیں اس جنگل میں چھوڑ کر چل دوں گی؟ بد عویہلے میں تمہاری شادی کروں گی کسی بہت بہت اچھے انسان سے۔ پھر باری کے ساتھ چل دوں گی۔“

ربیعہ کو ”بہت“ کی تکرار سے ہنسی آئی۔  
 اچانک ہی اس کی ہنسی ختم تھی۔ آنکھوں میں جگنوؤں کی بارات اتری تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کے کنول کھلے تھے۔

سامنے والی بیچ پر عباد بیٹھا تھا۔ آج وہ تنہا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ لائٹ گرین دھاری دار شرٹ اور

مسٹر کلر جینز میں وہ بے خدا سارٹ دکھائی دیتا تھا۔

”واؤ! زبردست!“ ترانہ نے سرگوشی کی۔ ”ابھی بھی سوچ لے ربیعہ! منہ بولا بھائی بھی کوئی ارشہ بھلا؟“ ربیعہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اٹھ کر عباد کی سمت بڑھی۔

اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر عباد کھڑا ہو گیا۔ ربیعہ اس کے مقابل پہنچ گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”کیسے ہیں عباد بھائی؟“

”وعلیکم السلام!“ وہ جواباً مسکرایا۔ ”میں ٹھیک ہوں تم یہ بتاؤ تم ٹھیک تو ہونا۔ خیریت سے ہو؟ کسی پریشانی تو نہیں ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں!“ نجاب نے کیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے جلدی سے نگاہیں جھٹکالیں۔

”ربیعہ!“ عباد کے دل میں جیسے کسی نے پین چھو دی۔ ”ربیعہ! ادھر دیکھو۔“

ربیعہ نے جلدی سے انگلی کی پور سے پلکوں کے کنارے صاف کیے اور مسکراتے لگی۔

”آپ کی اس قدر اپنائیت اچھی لگتی ہے عباد بھائی بس! اور کوئی بات نہیں۔“

عباد نے گہری سانس بھری اور جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ہر ادھر دیکھنے لگا۔

”تم اتنی کم زور کیا ہو؟“ ربیعہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”میرے کپڑے دیکھو۔“

”جی ہاں۔ شاید!“ وہ سوچ کر بولی۔ ”میرے کپڑے دیکھو۔“

”کچھ کرنی رہتی ہوں۔ شاید اس لیے۔“

عباد نے اس کے پس منظر میں ترانہ پر نگاہ ڈالی۔

”فارس بیٹھنا تمہیں پسند نہیں یہ اور بات ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں گھر والوں کو تمہارا فارس بیٹھنا پسند نہ ہو؟“

ربیعہ اس کی بات پر غفلتگی سے ہنس پڑی۔

”اچھا سنو! میں کچھ سامان لایا ہوں تمہارے لیے۔“ عباد نے بیچ پر رکھے شاپرز کی جانب اشارہ کیا۔ ”اگر تمہیں کوئی پراہم نہ ہو تو۔“

”میرے لیے۔“ وہ حیران ہوئی۔ ”کیوں عباد بھائی؟ یہ زحمت کیوں؟“

”یار! بھائی بھی کہتی ہو اور یہ زحمت و زحمت کا ذکر بھی۔“

عذاب میں رکھتی ہیں ہر وقت تم کیسی بہن ہو؟“

ربیعہ ہنس دی۔

”پھر بھی عباد بھائی! اچھا نہیں لگتا میں احساس کتری کا شکار ہو جاؤں گی۔“

”ہاں! اگر مجھے واقعتاً بھائی نہ سمجھو گی تو۔“ وہ بولا۔ ”ورنہ دنیا کی کوئی بہن ایسی نہیں جو بھائی کا لایا ہوا تحفہ ٹھکرا دے۔“

ربیعہ کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہ رہا۔

”اوکے!“ وہ بولی۔ ”تھینک یو بھائی!“

”یو آر ویلکم!“ وہ کھل کر مسکرایا۔

”ترانہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ گھر کے قریب پہنچ کر وہ منمنائی۔

”کس بات سے؟“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”یہ سب یہ بھاری بھر کم شاپرز لگیا کہیں گے سب سے؟“

تم فکر مت کرو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ عمرو عیار کے جیسی ایک زنبیل میرے پاس بھی ہے جس میں بچوں کا اشاک رہتا ہے۔ میں ابھی اپنی زنبیل میں سے ترکیب نمبر چار سو بیس نکالتی ہوں۔“

”جتنے جتنے گلی کے ایک مکان کے سامنے رک گئی تھی۔ پھر اس نے دروازے پر دستک دی۔“

”کون؟“ اندر سے آواز آئی۔

”اماں! میں ہوں ترانہ!“

”روانہ کھل گیا تھا۔ اندر ستر پچتر برس کے سن کی ایک عمر رسیدہ بوڑھی عورت کھڑی تھی۔“

”اماں! یہ سامان رکھ رہی ہوں اپنا۔“ ترانہ نے اندر گھس کر وہ شاپرز ایک طرف کورکھ دیے۔ ”رات کو کسی لے جائیں گی۔“

”اچھا!“ اس عورت نے سر ہلایا تھا۔ ”یہ کون ہے؟“

اس نے ربیعہ کی بابت استفسار کیا۔

”یہ میری ماموں زاد بہن ہے۔ ربیعہ۔ اچھا اماں! دروازہ بند کرلو۔“ ترانہ جلدی میں تھی۔

ربیعہ اس کی اس ترکیب پر حیران تھی۔

”یہ کیا تھا؟“ اس نے ربیعہ سے پوچھا۔ ”یہ اماں کون ہے؟“

”ایک فریب محنت ہے۔“ ترانہ بولی۔ ”بے چاری تن شہا رہتی ہے۔ بیٹا افغانستان کی جنگ میں شہید کیا۔ بیٹی بیوا کر سسرال چلی گئی۔ یہ یہاں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ میں اکثر اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔ شاید اس لیے۔“

”اوہ!“ ربیعہ کو نجات کہیں رادی جان یاد آئیں۔ وہ او اس ہو گئی تھی۔

”مجھے جو چیز چھو۔ اور صوف سے پوشیدہ رکھنا ہو وہ میں یہاں اماں کے پاس رکھوا دیتی ہوں پھر مناسب وقت پر لے جاؤں۔“

”مثلاً؟“ ربیعہ نے ہنس کر پوچھا۔

”مثلاً باری۔“ ترانہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”وہی ایک دلکش راز ہے میری زندگی کا۔“

”اب شاپرز کس وقت آئیں گی؟“ ربیعہ نے پوچھا۔

”آج ہی لاؤں گی محترمہ!“ پھر وہ ہنس کر بولی۔ ”مجھے خود بے حد اشتیاق ہو رہا ہے۔ پیچھو اور صولت کے سونے کا انتظار کرنا ہو گا۔“

ربیعہ نے سر ہلادیا۔

”گھر پہنچ کر ترانہ زمانے کے لیے غسل خانے میں گھس گئی تھی۔ ربیعہ کچن میں چلی آئی۔ مینا بیگم نے ٹوٹی ٹکڑوں سے اسے گھورا۔

”یہ تم لوگ روزانہ باہر کیا کرنے جاتی ہو؟“ وہ کچھ بد مزگی سے بولیں۔ ”لڑکیوں کو زیب دیتا ہے؟“

ربیعہ تو جانے پر رضا مند بھی نہ تھی۔ ترانہ اسے زبردستی ساتھ لے گئی تھی۔

”واؤ! آئی۔ روٹیاں ڈال لوں؟“ اسے کچھ اور نہ سوچھا۔

”ہاں!“ وہ برسیں۔ ”اور کم مت پکانا۔ روز تمہاری پکانی ہوئی روٹی کم پڑتی ہے۔ بے چاری صولت کو اکثر اپنے لیے آٹا گوندھ کر روٹی پکانا پڑ جاتی ہے۔ تمہیں تو احساس نہیں کسی کا جو نوکری کرتے ہیں ان کے دل سے پوچھو۔“

وہ بوڑھانے لگی تھی۔

ربیعہ خاموشی سے آٹا نکال کر گوندھنے لگی۔ مینا بیگم کو آج کچھ زیادہ ہی غصہ تھا۔

”صنولت بھی تو ہے۔ مجال ہے جو بے وجہ کمر سے نکلنے کا نام لے۔ ٹائم سے جاتی ہے، ٹائم پر آتی ہے۔ تمہیں بھی اپنے جیسا کر دے کی۔ لڑکیوں کو یہ آوارہ گردی زیب نہیں دیتی۔ سب کچھ ہوا مصیبت ہو گئی۔“ وہ بڑبڑاتے جا رہی تھیں۔ غسل خانے کی چٹخنی گرنے کی آواز آئی تو ان کی زبان میں لگام پڑی۔ وہ سالن کرنے لگیں۔

”اپنے پیچھا کو کھانا کھلا کر دینی دے دینا ٹائم پر۔“ وہ بولیں۔

”جی۔“ ربیعہ نے محض اتنا ہی کہا۔

عباد سے ملاقات نے اس کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اسے ان کی باتیں بھی بری نہ لگ رہی تھیں۔ بلکہ وہ ان کی اتنے دھیان سے سن بھی نہ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں عباد تھا۔ اس کی پر خلوص نگاہیں تھیں جن میں اپنی محبت تھی۔ اس کے پیشے لہجے میں بار بار اس سے رشتہ جتانے اور اس رشتے کے حوالے سے اپنا حق جتانے کو بہت اچھا لگا تھا۔

”یہ تم مسکرا کیوں رہی ہو؟“ مینا بیگم نے اسے چونکا دیا۔

وہ خفیف سی ہو گئی۔ وہ کھوجتی نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔

”کیا بات ہوئی؟“

”ایک لطیفہ یاد آگیا تھا پیچھو!“ ربیعہ کو بالآخر ان کے حان چہرے نے سکھایا۔

”یہ میں آئی سے پیچھو کیسے ہو جاتی ہوں؟“ وہ بھڑکیں۔ ”تم بہت نیسی لڑکی ہو۔“

”جی پیچھو۔۔۔ شاید!“ اس نے مسکینی سے اعتراف کیا۔

وہ تنگ کر باورچی خانے سے نکل گئیں۔



وہ منور امین کو دو اپناں دے رہی تھی جب تمدن کمرے میں داخل ہوا۔ ربیعہ نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور منور امین کو پانی کا گلاس تھمانے لگی۔

”تم پارک میں کس لڑکے سے باتیں کر رہی تھیں؟“ اس نے اچانک دھماکا کیا۔

ربیعہ اچھل کر رہ گئی۔ تمدن کا حملہ اس قدر اچانک تھا کہ اسے کچھ بے ہوش کر دیا۔

”بولو!“ وہ اسٹک کے سہارے چند قدم آگے بڑھ آیا۔ ”کون تھا وہ؟“

”جی۔۔۔ وہ!“ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

”تم نے یہاں کس سے پیار لانے لگا لیے ہیں؟“ وہ درشت لہجے میں بولا۔

”تمدن بھائی۔“ ترانہ اس کی آواز سن کر وہاں آگئی تھی۔ ”مجھ سے پوچھیں۔ کیا پوچھنا ہے۔“

”تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ اس کی جانب گھوم کر بولا۔ ”بہت داوا گیر بنتی ہو۔ میں ربیعہ سے پوچھ رہا ہوں اور یہی جواب بھی دے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ ربیعہ بولی۔ ”میں جواب دے دیتی ہوں۔ وہ میرا بھائی ہے۔ منہ بولا بھائی۔ ہم لوگ ٹرین میں ملے تھے۔“

”ٹرین میں۔ ہنہ!“ تمدن نے حقارت سے ہنکارا بھرا۔ ”چند گھنٹوں کے سفر میں بھائی بہن پیدا ہو گئے۔ جب اتنی آسانی سے رشتہ جوڑ سکتی ہو تو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”تمدن بھائی۔“ ترانہ چیخنی۔ ”خدا کا خوف کریں کچھ۔“

تمدن نے مڑ کر اسے زور وار اسٹک ماری۔ وہ بلبلاتا تھی۔ ربیعہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ منور امین زور زور سے ماننے لگے۔

”ارے بے غیرت۔ بہن پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ کتے۔ کھوں کھوں۔ ارے تو کیوں ہمارے سینوں پر ناگ بن کر بھاگے۔ کھوں کھوں۔“

”خبردار جو آئندہ پارک کا رخ کیا تم دونوں نے۔“ وہ لال آنکھوں سے انہیں گھورتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

”ارے اس لڑکی کو نکالو!“ میں کہتا ہوں۔“ منور امین کھسک گئے۔ ”ارے یہ اپنی ماں سے دو ہاتھ آگے

کھوں کھوں کھوں۔ میں کہتا ہوں یہ کوئی فساد ڈلو کر رہے گی۔“

ربیعہ منہ چھپا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔



لان میں کھڑی کیاریوں کا جائزہ لیتی انیقہ چونک اٹھی۔ چند لمحے وہ تیر کے عالم میں کھڑی گیٹ سے اندر داخل

ہوئی۔ لے افراد کی آمد کے مقصد کے بارے میں خیال آرائی کرتی رہی پھر جیسے ہی اس کی نظر درہ کے ہاتھ میں

تھا۔ مہمانی کے برعکس وہ بے پروا پڑی ہوا چھل ہی پڑی۔

آنکھوں میں بے غماشا چمک دیتے۔ فتنوں کو روک دینے کی وہ دوڑی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے پور ٹیکو پارک کے لاؤنج کی سیڑھیوں پر قدم دھرتی شفیقہ حیات اور ان کی ہمراہی

فردوس بیگم اور عذرا بیگم کو پھولتی ہوئی سانسوں سے سلام کیا۔

”علیکم السلام۔۔۔ نیسی کو بچی۔“ شفیقہ حیات نے اس کی پیشانی چومی۔

”اس بیگم۔۔۔ ماتھے کی۔“ انیس صاف گئی جاسکتی تھیں۔ عذرا بیگم خوش دلی سے مسکرا رہی تھیں۔ ان سے

چھلکی۔ میں اپنے ہالی سربراہی میں درہ اور رابعہ بیگم تھیں۔

انیقہ۔۔۔ بھئی۔ کا آئینہ بوجھتی، انیس لاؤنج میں لے آئی۔ بھاری بھر کم خواتین صوفوں میں دھنس

کر سانس ٹھیک کرتے۔

”اچانک دھماکا۔۔۔ تو نہیں؟“ ایقان نے مسکرائے ہوئے پوچھا۔

”آئی۔۔۔“ ایقان نے کہا۔ ”کمال کرتی ہیں۔ آپ کا اچھا گھر ہے۔ یہ بھی اور اپنے گھر تو کسی وقت بھی آیا جاسکتا

ہے اور پرمانے کا کیا سوال؟ میں تو بہت خوش محسوس کر رہی ہوں آپ لوگوں کو دیکھ کر۔“

”وہ تو کوئی لی لی۔“ فردوس بیگم منہ ہی منہ میں بد بدائی تھیں۔ ”سر کا بوجھ اتر رہا ہے۔“

”ای کو یا تو بچی!“ شفیقہ حیات بولیں۔ ”اور یہ شہلا کیا کر رہی ہیں؟“

”ای نما رہی ہیں۔ شہلا آپی ڈیوٹی سے آکر سو گئی تھیں۔ میں جگاتی ہوں انہیں۔“ وہ خوشی سے نہال ہوئی

جا رہی تھی۔ مڑ کر کمروں کی جانب تیزی سے بڑھ گئی۔

”ہاشم میاں نے بھی کمال ہی کیا ہے۔“ شفیقہ حیات اس کی پتلی کمر کو دیکھتے ہوئے حسرت سے سانس بھر کر

بولیں۔ ”یہیں کا خیال تھا تو۔۔۔“

ایقان پر نگاہ ڈال کر وہ باقی کے الفاظ ادا نہ کر پائیں۔ وہ برا سا منہ بنائے انہیں دیکھ رہی تھی۔

اندرولی کمرے کا دروازہ کھول کر شہلا باہر آئی۔ سب ہی کی نگاہیں متحسّس انداز میں اٹھیں تھیں۔ سویا ہوا

روپ لیے شہلا نے کسی نگاہ کو مایوس نہ کیا تھا۔

وہ شاید نہا کر سوئی تھی۔ سیاہ بال نہایت محسوس ہوتی چمک لیے اس کے کاندھوں پر پریشان تھے۔ نیند سے لبریز نگاہیں معصوم اور پرکشش لگتی تھیں۔ قدرتی گلابی لب نرم انداز میں ہلکی سی جھینپی جھینپی لیے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ٹھوڑی کا سیاہ نل جگمگا رہا تھا۔ نکھرا نکھرا روپ اپنی بہار پر تھا۔ کسی کو کچھ غلط سوچنے کا موقع دستیاب نہ ہوا۔

”یہاں آؤ بیٹی! ہمارے پاس۔“ شفیقہ حیات نے اپنے اور فردوس بیگم کے درمیان جگہ بنائی۔ وہ دیر دیرے چلتی ہوئی وہاں آکر بیٹھ گئی۔

انہوں نے بے اختیار ہی اس کی پیشانی چومی اور اپنی چند لمحوں پیشروالی سوچ پر شرمندہ ہوئیں۔ اس کی پر شرم و حیا کا نور تھا۔ اس کے وجود سے اب تک الہرود شیراؤں کی مہک اٹھتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ سر سے تنگ بہار ہی بہار تھی۔ کہیں کچھ کمی نہ تھی۔ کوئی داغ نہ تھا، کوئی جھول نہ تھا۔

”معاف کرنا بیٹی!“ وہ بولیں۔ ”ہندو معاشرے کے درمیان ایک طویل عرصے رہے ہیں نا۔ ہماری سوچ اب تک ان کے غلط نظریات کے اثرات میں ہے۔ حالانکہ مذہب اسلام تو خود سونے جیسا ہے۔ یہ تو اپنے ربے والوں کو سنہا کر دیتا ہے۔ ہندوؤں کو ہمارے ساتھ رہ کر احساس ہو گیا کہ ان میں کیا کچھ غلط ہے۔ وہ یہاں کے حقوق کی بات کرنے لگے ہیں۔ انہیں مردوں کے ساتھ جلاؤالنے سے باز آگئے، ان کی دوسری شادی کے خود میں چلک پالے گئے۔ اور ہم مسلمان انہیں اپنی اچھی باتیں دے کر ان کی غلط سوچیں اپنے دامن تبرک کی طرح لیے پھرنے لگے۔“

ہمارا مذہب تو کفارہ دہی کا مذہب ہے۔ وسیع الگ نظری کی بات کرتا ہے۔ وہ ہم، نحوست، سب کچھ شدت سے کرتا ہے۔ بیواؤں کو، مطلقہ عورتوں کو دوسری شادی کی پرزور تائین کرتا ہے۔ پورے معاشرے کو پابند کرتا ہے۔ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ کہیں کوئی عورت تنہائی کی، تنہائی کی زندگی بسر نہ کرے۔ مرد کی حفاظت اور ذمہ داری ہے۔ ہم لوگ یہ سب کہہ تو سکتے ہیں۔ عمل کرنے کا وقت آئے تو اٹھ پھرتے ہیں۔“

یاسف سے بولتے ہوئے ان کی نگاہ منبذہ بیگم پر پڑی تھی جو بچاؤ کے سامنے کھڑی ان کی گفتگو رہی تھیں۔ سلیقے سے دوش اورھے، مہربان سی منبذہ بیگم انہیں بہت بھانپیں۔

”ارے، تمیں خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ جلدی سے اٹھیں۔“

”السلام علیکم۔“ منبذہ بیگم نے مسکرا کر حاضرین کو سلام کیا اور شفیقہ حیات سے معاف کرنے لگیں۔ فردوس بیگم بھی ساس کی تقریر کے زیر اثر دیا دیا مسکراتی تھیں۔ وہ بھی اٹھ کر منبذہ بیگم کے گلے لگیں۔ ملائے کے مراحل طے ہوئے ہی تھے کہ انہما نازک گلاسوں میں ٹھنڈا مشروب لیے چلی آئی۔ اور سب کو کرنے لگی۔

”ہم بتا کر نہیں آئے۔ معافی چاہتے ہیں۔“ شفیقہ حیات نے مفرح شربت کا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”دراصل یہ لوگ اکٹھے ہو کر رشتے کے متعلق بات کر رہے تھے تو لڑکوں نے شور مچا دیا کہ جب سب ہی کچھ طے ہو چکا ہے تو کیسی۔ آج ہی انگوٹھی ڈال کر آئیں اور برات کا دن طے کر لیں۔ پھر یہ ہماری صاحبزادی۔“

انہوں نے ایقان کی جانب اشارہ کیا۔ وہ مسکرائے لگی۔

”ان کے مغز میں کچھ سما جائے تو نکلنا مشکل۔ بچوں کی طرح دیوانی ہو کر ضد کرتی ہے۔ بھاگم بھاگ ہاشم میاں کے ساتھ جا کر انگوٹھی اور مٹھائی لے آئیں۔ آدھے گھنٹے میں کبھی کچھ ہو گیا۔ ہم نے بھی سوچا کیا روم و روان اس قدر پابندی کرنا۔ عمر بیت گئی یہی سب کرتے کرتے حاصل نہ وصول۔ ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو آؤ۔“



ہم بھی بچوں کی مان کر دیکھیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ وہ دیں۔ پرائز۔  
 ”سربراہ! اور وہ نچلا لب دبا کر بولی۔“  
 ”آں ہاں وی۔“

سب ہی ہنس لیے شہلا سمیت وہ از حد مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ پیچھے دنوں کا وہ سارا اضطراب سب چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا اور مسرور محسوس کر رہی تھی۔ ایک نتیجے پر پہنچنا، بھنور سے کنارے پر لگتا تھا۔

”اجازت ہے بہن؟“ انہوں نے پرس میں سے مٹلیں ڈبہ نکال کر منیزہ بیگم کو دکھا۔  
 ان کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ انہوں نے بمشکل خود پر قابو پا کر اثبات میں سر ہلایا۔

شفیقہ حیات نے بسم اللہ بڑھ کر انگوٹھی شہلا کی انگلی میں ڈال دی۔ شہلا کا سر جھکا ہوا تھا۔ پلکیں بھاری بھاری لگنے لگی تھیں۔ لبوں پر شرمیلی مسکان کا راج تھا گالوں پر گلال پھیل رہا تھا۔

”ہائے اللہ! ایقان نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔“ کیمرو تو بھول ہی آئی میز پر۔ اب ہاشم لڑے کا مجھ سے۔  
 ”ہاں جی! حولا خفتا تو ہو تم۔ تم سے یہی امید۔“ شفیقہ حیات شہلا کی ہتھیلی پر لفافہ دھر رہی تھی۔  
 ”یہ تمہارے جوڑے کے پیسے ہیں۔ برانہ ماننا۔ ہم نے ابھی بازار ستان سنائی تاکہ کیسے آتے ہیں ششم بھتیجی۔“

”یہ لیجئے ایقان آپ! آپ کے مسئلے کا حل۔“ انہوں نے کیمرو لایا تھا۔ ہمارے دولہا بھائی۔  
 کچھ زیادتی ہوگی۔“

سب ہی ہنس دیے۔

ایقان جلدی جلدی تصویریں کھینچنے لگی۔

اچانک ہی سب کی توجہ عمر نے اپنی جانب کھینچ لی۔ وہ غالباً ماں کے ساتھ سویا ہوا تھا اور اب اسے ساتھ نہ پا کر پریشان ہو کر باہر چلا آیا تھا۔ اتنے لوگ دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گیا اور جلدی سے شہلا سے لپٹ گیا۔  
 ”مما!“

شہلا اپنی کیفیات سے پلک جھپکتے میں باہر آئی۔ عمر کے گرد بازوؤں کا مضبوط حصار بنا کر اس نے اس کی پیشانی پر بے ساختہ پیار کیا۔

حاضرین خاموش سے ہو گئے۔ فردوس بیگم گویا بغلیں جھانکنے لگی۔  
 ”جاری تھی۔ منیزہ بیگم نے آگے بڑھ کر عمر کو شہلا سے علیحدہ کرنا چاہا۔“  
 ”اؤں بچے۔ نانوپاس آؤں۔ میں آپ کو اوولٹین بنا کر دوں۔“  
 ”نہیں۔“ وہ ہچکا۔

”رہنے دیں ای! سو کر اٹھا ہے نا۔“ شہلا نے محبت سے اس کے بال سنوارے۔

”اب ممما کو تھوڑا فری ٹائم دو۔“ عذرا بیگم نے ہنس کر ماحول خوشگوار کرنا چاہا۔ ”اب آپ اپنی نانو کو تنگ کر دو۔ تمہاری ممما کو تو ہم لے جا میں گے اپنے ساتھ۔“

عمر نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ شہلا سے لپٹا کر ٹکرا نہیں دیکھے گیا۔ اس کی نگاہوں میں خوف ور آیا تھا۔ شہلا کے چہرے پر سے سایہ گزرا تھا۔ فردوس بیگم ماتمی انداز میں بیٹھی تھیں۔

”باشاء اللہ! چشم بد دوست۔ نظر نہ لگے دوستے میاں کے بتیں دانتوں سے بھی مسکراہٹ کو۔“  
 ہاشم مسکراتے مسکراتے چونک اٹھا۔ ہنستا ہوا رافع مقابل تھا۔ ہاشم جھینپ گیا۔

”ارے تم کب آئے؟“

”جب آپ چاند میں محبوب کا مکھڑا دیکھ کر فل ٹائم مسکرا رہے تھے۔“ وہ بمشکل خود پر قابو پا کر بولی۔ ”بائی دا“  
 ”یہ نسبت طے ہوتے ہی شرمیلی لڑکیوں کی طرح آپ نے چھت کا رخ کیوں کر لیا؟ خیالی پلاؤ کی ویگ کیا چھت سے لپکتی ہے؟“

”چل نا بندر۔“ ہاشم نے خفت مٹانے کو اسے مٹا کر سید کیا۔ ”تو کیا سمجھے ہم سے دیوانوں کی دماغی کیفیت کو۔“  
 ”یاں! احساسات کو سمجھنے کے لیے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اور اگر تجربے سے نہیں گزرے تو احساسات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ لہذا یہ دانت اندر کر لو۔“

”تجربے سے کیسے نہیں گزرے؟“ رافع معنی خیزی سے بولا۔ ”تجربے سے تو الحمد للہ ٹھیک ٹھاک گزرے ہیں۔“

”ہاں تو“ ٹھیک ٹھاک گزر گئے نا۔ مسئلہ یہ ہے۔ ”ٹھک“ سے لگی نہیں تمہیں۔ ورنہ تم بھی یونہی دانت نکالتے چاند کو دیکھ کر۔“ ہاشم اپنی شرمندگی پر قابو پا چکا تھا اور اب مائل بہ ڈھٹائی تھا۔

رافع مسکراہٹ بٹکی ہوئی اور منسوب بدلتے لگی۔ اب وہ کچھ سوچتا ہوا نظر آتا تھا۔

”یا۔ ع۔“ ہاشم نے بلکورے لیتی ہوا کے سامنے سینہ سپر ہو کر کہا۔ ”یار! ایک نظم لکھ میرے لیے۔“ رافع

”کیا مطلب؟“

”یار! عجیب سی کیفیت ہے میری۔ اتنی بڑی خوشی سے گزر رہا ہوں اور۔۔۔ اور۔۔۔ مجھے خود سے ڈھیر ساری باتیں

سننے کا جی جا رہا ہے۔ ہوا کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی مجھے

خود۔۔۔ ٹھیک طرح سے باتیں نہیں کر پا رہا۔ یار! ایسے عالم میں ایک چیز سہارا دیتی ہے۔ جانتا ہے کیا؟“

”شاعری۔“ وہ کہہ کر ہنس پڑا۔ ”میں ڈھلے الفاظ۔۔۔ کیفیات کی تکمیل کرتے ہیں۔ یار! رافع! قدرت نے

مجھے ہم سے دیوانوں کے احساسات کی تکمیل کرنے کا ذہنک دیا ہے۔ ہمارے جذبات کی تشکیل کا ہنر ہے تیرے

پاؤں پر۔“ وہ کہہ کر ہنس پڑا۔ ”کچھ سانس لے لیں۔ ایسی باتیں جو دل سے نکلے اور دل میں اتر جائے۔ مجھے سن کر یوں

”دوست۔“ میرے جہ بات کو زبان دے دینی ہو۔ جو بات میں خود سے نہ کہہ پایا، وہ بات کہہ دے میرے

”کیا کہوں؟“ رافع ہنس دیا۔ ”کیا کہنا چاہتا ہے تو خود سے؟“

”اپنی خوشی کا مکمل احساس دلانا چاہتا ہوں خود کو۔ اس کے تصور کو حقیقت کی سطح پر لا کر اپنی خوشی شہر کرنا چاہتا

ہوں۔“ فرخ کر رافع! اتنے سالوں تو کسی کو دیوانہ وار چاہتا ہو اور اچانک تجھے اس کی ہر اہی کا اعزاز حاصل ہونے

لگتا۔ کیا کہتا؟“

رافع سوچ میں پڑ گیا۔ ٹھنڈی متوالی ہوا اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے گزری۔ بادل کے مہین غلاف کو بٹا کر چاند نے تہا نکا اور مسکرایا۔ جنگلی گلابوں کی بھنگی ہوئی خوشبو کسی جھوٹے کا ہاتھ تھام کر اس کے بے حد قریب سے گزری۔ اس کی براؤن آنکھیں دور دیکھنے لگی تھیں۔ اس کا تخیل چاندنی کے ساتھ ساتھ بھٹکتے لگا۔

”اس کی ہر اہی! شبہ تمہاری بے لوث چاہت کا اعجاز ہے ہاشم۔“ پھر وہ بولا۔ ”جب اس سے ملو تو بتانا کہ۔۔۔“

تری آنکھ کی یہ روشنی میرے خون دل کی لکیر ہے  
ترکش زلف کی یہ چاندنی مرے خوابوں کی تعبیر ہے  
یہ کشش تھی میرے خیال کی جو یوں کھم گئے ہیں تیرے قدم  
یہ تیری ادائے دلبری میری چاہتوں کی اسیر ہے  
میری بے بسی میں سوال ہیں ترا نقش نقش جو ابدہ  
مری مدد کوئی بات کرا تو نہ بت ہے نہ تصویر ہے  
”اے رافع! ہاشم نے بھیج لیا۔“ گریٹ!“  
رافع حیران پریشان کھڑا تھا۔  
”یہ باگل ہو جاؤں گا۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“  
خوشی میں مگن ہاشم نے کچھ نہ سنا تھا۔

”اچھا۔۔۔ معافی چاہتی ہوں۔“  
”ایک اور اجنبی جملہ۔“ وہ فوراً بولا۔  
وہ تذبذب کا شکار ہو کر خاموش ہی ہو گئی۔ ہاشم نے چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کیا، پھر تھک کر بولا۔  
”جلنے کہیے۔ کیا کہنا چاہتی تھیں آپ۔ آپ کو شناسائی کی زبان نہیں آتی تو اجنبیت کی بولی میں ہی بات  
کریں۔ لیکن بات تو کریں۔“  
”ہاشم صاحب۔“

”صاحب ہٹادیں۔“ آج وہ بے حد حق کے ساتھ بات کر رہا تھا۔  
”اچھا ہاشم۔“ وہ کھنکھارے گویا کسی کمی کا احساس ہوا تھا۔ ”میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں  
کہ۔۔۔ عمر کے متعلق آپ نے کیا سوچا ہے؟“  
”وہ سب کچھ جو عمر کے متعلق آپ سوچتی ہیں!“ وہ ہنسا۔ ”عمر کے معاملے میں کبھی بھی خود کو مجھ سے علیحدہ  
کر کے نہ سوچئے گا۔“

شہلا نے جیسے پرسکون سانس بھری تھی۔  
”سے اپنے ساتھ رکھوں گی ہر جگہ۔ خواہ وہ میری ماں کا گھر ہو یا آپ کا۔“  
اچانک ہی ہاشم ہوش ہوا تھا۔ فاروق حسن کے چند الفاظ دماغ کے کسی خفیہ گوشے سے نکل کر حافضے کی سطح  
پر ابھر آئے۔

”اس گھر میں ہماری نسل پروان چڑھے گی۔“ وہ سخت لہجہ، وہ ٹھوس اور حتمی بات۔  
وہ کیسے بھول گیا تھا اتنی اہم بات! یہاں تو خیالات کا سخت ٹکراؤ ہونے جا رہا تھا۔  
”آپ خائف کیوں ہیں؟“ وہ جیسے ڈر کر بولی۔ ”دیکھیے آپ کے ذہن میں اگر کوئی اور خیال ہے تو ابھی کلیئر  
کر لیں۔ اتنا طے نہ ہو کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”شہلا!۔۔۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”میں ان آنکھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں شہلا! جو  
میرے کئی قیمتی برس قید ہیں۔ مجھے ان لمحوں کا سراغ چاہیے۔“  
اس کے موبائل کی بپ بپ بجنے لگی تھی۔ وہ چونک اٹھا۔ اتنی جگہ سے اٹھ کر وہ اپنے بیڈ کی جانب دوڑا۔  
”ہاشم میاں!۔۔۔ قبولیت کا وقت ہے مانگ لو اور کچھ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے موبائل کان سے لگا  
”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام۔“ اس کی مدھم آواز آئی۔ ”تعارف کی ضرورت تو شاید نہیں ہے۔“  
”جی نہیں۔ میرے موبائل نے آپ کا تعارف کر دیا ہے۔“ وہ شرارت سے لہجہ بڑھاتا ہوا کہتا تھا۔  
”جی۔۔۔ شکریہ!“  
”خوش ہیں آپ؟“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔  
”مطمئن ہوں!“ پھر وہ بولی۔  
”جلے!“ اس نے سانس بھری۔ ”اتنا بھی بہت ہے۔“

”مجھے ایک ضروری بات کرنا تھی ہاشم صاحب!۔۔۔ بے وقت آپ کو زحمت اسی لیے دی ہے۔“ وہ محتاط انداز  
اختیار کرنے لگی تھی۔  
”مائی گاؤ!“ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”شہلا پلیز! اجنبیت کی اس دیوار میں اب تو کوئی در پچھو دا کر لیجئے جہاں  
سے شناسائی جھانکے دوستی مسکرائے۔ معنویت باتیں کرے۔ آپ تو بے مہر کی حد کرتی ہیں۔“ اس کے  
میں بے پناہ شکایت تھی۔ شہلا دھیرے سے ہنس دی۔

”اس گھر میں ہماری نسل پروان چڑھے گی۔“ وہ سخت لہجہ، وہ ٹھوس اور حتمی بات۔  
وہ کیسے بھول گیا تھا اتنی اہم بات! یہاں تو خیالات کا سخت ٹکراؤ ہونے جا رہا تھا۔  
”آپ خائف کیوں ہیں؟“ وہ جیسے ڈر کر بولی۔ ”دیکھیے آپ کے ذہن میں اگر کوئی اور خیال ہے تو ابھی کلیئر  
کر لیں۔ اتنا طے نہ ہو کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”شہلا!۔۔۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”میں ان آنکھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں شہلا! جو  
میرے کئی قیمتی برس قید ہیں۔ مجھے ان لمحوں کا سراغ چاہیے۔“

اس کے موبائل کی بپ بپ بجنے لگی تھی۔ وہ چونک اٹھا۔ اتنی جگہ سے اٹھ کر وہ اپنے بیڈ کی جانب دوڑا۔  
”ہاشم میاں!۔۔۔ قبولیت کا وقت ہے مانگ لو اور کچھ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے موبائل کان سے لگا  
”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام۔“ اس کی مدھم آواز آئی۔ ”تعارف کی ضرورت تو شاید نہیں ہے۔“  
”جی نہیں۔ میرے موبائل نے آپ کا تعارف کر دیا ہے۔“ وہ شرارت سے لہجہ بڑھاتا ہوا کہتا تھا۔  
”جی۔۔۔ شکریہ!“  
”خوش ہیں آپ؟“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔  
”مطمئن ہوں!“ پھر وہ بولی۔  
”جلے!“ اس نے سانس بھری۔ ”اتنا بھی بہت ہے۔“

”پھپھو کہاں ہیں؟“ بالآخر وہ بولا۔

”جی!“ اس نے سر اٹھایا۔ ”پھپھو سبزی خریدنے گئی ہیں۔“

”ہوں!“ اس نے ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

پھر اس کی نظر تکیے کے نیچے سے جھانکتے کاغذ پر پڑی۔

”ایک کپ چائے بنا دو۔“ وہ بولا۔

ربیعہ نے آنکھیں میچیں۔ وہ دل ہی دل میں یہی دعا مانگ رہی تھی کہ کہیں وہ اسے کسی کام سے اٹھا نہ دے۔

”جی اچھا!“ وہ چند لمحے رک کر بولی۔ ”ابھی بنا دیتی ہوں تمدن بھائی!“ تمدن وہیں کھڑا رہا۔ ربیعہ کسمسا کر رہ

گئی۔

”اٹھ بھی جاؤ۔“

ربیعہ نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر چل پھرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی اس سے پہلے  
تمدن کمرے سے نکل جائے۔ اسے وہ کاغذات وہاں سے اٹھا لینے کا موقع مل جائے لیکن ایسا ناممکن لگنے لگا۔ وہ ہنوز  
وہیں کھڑا اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ربیعہ کو وہاں سے ہٹے ہی بنی۔

اس کی جانب دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ کمرے سے نکل کر پچن میں چلی آئی۔ بے کلی اور اضطراب کے عالم  
میں اس نے جلدی جلدی ساس پیر کاٹنے کا لہجہ چائے کا پانی چھلکے پر رکھ دیا۔ باہر صحن میں گیٹ کھلنے کی آواز آئی  
تھی۔ شاید سبزی سبزی لے گئی تھیں۔ کوشش کو مزید کوفت نہ آگھیرا۔ وہ باہر سے آکر چند لمحوں کے لیے  
ضرور کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹتی تھیں۔ ان کے تکیے کے نیچے اس نے گویا پٹانے رکھے ہوئے تھے۔ اس  
کے دل میں ان پٹانوں کے چلنے کی آوازیں ابھی سے گونج رہی تھیں۔

مینا پچن میں چلی آئی۔ ان کے ہاتھ میں ٹوکری تھی۔ ربیعہ نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے ٹوکری لے لی۔

”سب سبزی دھو کر رکھنا ہے۔ قیمہ بھی لاتی ہوں۔ دھوا فریزر میں رکھو۔“

”جی!“ وہ مرل انداز میں بولی۔ ”چائے دوں آپ کو؟“

”نہیں۔ مجھے سہ ہر وقت کی چائے پسند نہیں۔“ وہ خفگی سے بولیں۔

”مم۔ میں تمدن بھائی کے لیے بناتی ہوں۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔ مینا بیگم نے گھور کر اسے

دیکھا۔

”لیموں لائی ہوں۔“ پھر وہ بولیں۔ ”مجھے سکنجبین بنا کر دو۔“

”جی اچھا!“ وہ فرماں برداری سے بولی۔

تمدن نے چائے اور مینا بیگم کے لیے سکنجبین کا گلاس لیے وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ اس کی گویا

روح قبض ہونے لگی۔

تمدن اس کا فارم ہاتھ میں لیے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سب کاغذات اس کے سامنے پڑے تھے۔

”تمدن بھائی!“ ربیعہ جلدی سے بولی۔ ”یہ میرے ہیں۔“

تمدن نے خشمگیں نگاہیں اٹھائیں۔

”کس نے لا کر دیا ہے یہ؟“

”ترانہ نے۔“ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

”کیوں منگوا دیا ہے تم نے؟“ وہ غرایا۔

”میں پڑھنا چاہتی ہوں۔“

تمدن چند لمحے اس کی جانب دیکھا رہا، پھر اس نے فارم پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ربیعہ کے لبوں سے اس کا

تمدن نے فارم کے ٹکڑے وہیں فرش پر پھینک دیے اور حقارت سے اسے دیکھنے لگا۔

”پڑھنا چاہتی ہو۔ کیا تیرا لوگ چند کتابیں اور بڑھ کر۔ ترانہ اور صولت کی طرح کمانے نکل کھڑی ہوگی؟ تمہیں پڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ تمہارے لیے ہم لوگوں نے کچھ اور سوچا ہے۔“

ربیعہ کے خاموش آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔ وہ کسی بہت کی مانند ساکت کھڑی رہی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ قرعہ نال میں اب کون سی سزا اس کے نام کی پرچی کے ساتھ نکلی ہے۔ لیکن اس کی قوت گویائی غم غصے اور بھڑپور احتجاج کو دبانے میں مصروف تھی۔ سو وہ اس کا ساتھ نہ دے سکی۔

”مبصری دھوکہ دہا کر رہی ہے پکاؤ آج۔“ مینا بیگم بے حد مسرور نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے بڑھ کر رے اس کے ہاتھوں سے لے لی تھی۔ ربیعہ بے جان قدموں کو کھینچتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ترانہ اسے دھونڈتی، آوازیں دیتی، چھت پر چلی آئی۔ پھر وہ بیڑھیوں کے پاس ہی کھڑی رہ گئی۔

ربیعہ چھت کے آخری کونے پر چھوٹی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی رہ گئی۔ اس نے انداز غیر معمولی تھا۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ ترانہ کی آمد پر وہ یوں کونے میں بیٹھی رہتی۔ اس کی پکار کا کوئی جواب نہ دیتی۔ اب وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر ترانہ کی طرف دیکھا تھا۔

ترانہ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ وہ اس تک پہنچی۔ ربیعہ کی گود میں اس کی ڈائری کھلی پڑی تھی۔ انگلیوں میں قلم ڈھیلے انداز میں جھول رہا تھا۔ ربیعہ کی نگاہیں ڈائری کے صفحے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ربیعہ!“ ترانہ اس کے قریب بیٹھ کر محبت سے بولی۔

”ہوں!“ جواب آنے میں چند لمحے لگے تھے۔

”کیا بات ہے؟ تم یہاں کیوں بیٹھی ہو۔؟“

ربیعہ نے ایک گہری سانس بھری۔

”بچے بہت مٹھن ہے ترانہ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں مر جاؤں گی۔ اتنی مٹھن تھی اتنی۔ اتنی۔“

ترانہ گھبرا گئی۔ اس نے ربیعہ کا ہاتھ تھام لیا۔

”ربیعہ! کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا تم سے؟“

اس نے نفی میں سر ہلا کر حلق میں گرتے آنسو نکلے۔

”پھر میں نے پہلے کبھی تمہیں اس قدر پریشان نہیں دیکھا۔“

”پریشان تھی۔ اب نہیں ہوں۔“ وہ بولی۔

”یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟“ ترانہ کی الجھن اس کے ادھورے جوابوں سے بڑھ رہی تھی۔

”میں خود کو سمجھا رہی تھی۔“ دیکھا۔

ربیعہ نے پہلی مرتبہ چہرہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے۔ ترانہ نے بے ساختہ ہی اس کی گود میں رکھی ڈائری کی جانب دیکھا۔

ربیعہ نے ڈائری اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں دے دی۔ ترانہ اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر ڈائری میں لکھی ہوئی تحریر پڑھنے لگی۔

اپنے کاندھوں پر لیے اپنے گناہوں کی شہرہ پر ہم کیوں گامزن کیا جانے دقت کی شاہراہ پر ہم کیوں گامزن کیا جانے کیوں نگاہیں بے ہوشی کے شہر کے شہر کیوں گامزن کیا جانے کیا ہوئے اس شہر کے شہر کیوں گامزن کیا جانے دل کہ سنا تھا غلط انداز لہجے بھی پر اب کیوں تھیں نظروں سے ہوتی ہے تھکن کیا جانے کیا کہیں عزت نشینی کیوں ہمیں راس آگئی کس سے تنہائی میں ہیں محو خن کیا جانے

ترانہ نے اسے ابھی ابھی نظروں سے دیکھا۔

”یہ سب کیا ہے ربیعہ؟ کس نے لکھا ہے یہ؟“ ”میں نے!“ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

”تم نے؟ کیوں؟“

”دکھتا رہا اس کے لیے۔ شاید۔“ وہ بے یقینی سے بولی۔

”نا سر جھک گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ اسے شاید کوئی سراہا تھا آیا تھا۔“ ”تم نے نام کیا؟“

ربیعہ نے غالی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”ترانہ۔ تمدن بھائی نے میرا فارم پھاڑ دیا۔“ اس کے گلے میں آنسوؤں کی نمی سی گھلتی لگی۔ ”وہ کہتے ہیں مجھے برا بھائی کی ضرورت نہیں وہ کہتے ہیں سب گھر والوں نے میرے لیے کچھ اور سوچا ہے۔“

”کیا؟“ ”ترانہ بولی۔“

”میں نے تمہیں سر ہلا کر مجھے نہیں بتا۔“

”بلکہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے سر اٹھایا۔“

”تم غیب کی بات کہتی ہو جیسی لڑکی اس گھر میں رہے گی تو ضرور مر جائے گی۔ میں۔ میں تمہارا ایڈیشن کروا دوں گی اور تمہیں ہاں میں کمرہ دیں گا۔ تمہاں کل فکر مت کرو۔“

”اس نے کوئی بات نہیں کہی۔“

”میرا۔“ ”انہوں نے اس کی طرح سے چونکی تھیں۔ وہ نجانے کب آکر ان کے سروں پر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ترانہ اور ربیعہ سر اٹھائے انہیں دیکھنے لگیں۔ ان کے لبوں پر دل جلانے والی مسکراہٹ تھی۔“

”کیا کہنا چاہتی ہیں پچھو آپ؟“ ترانہ نے دلیری سے پوچھا۔

”ربیعہ کونہ کہیں جانے کی ضرورت ہے نہ پڑھائی کی۔ ہم اس کے بڑے ہیں۔ اس کے متعلق زیادہ بہتر سوچ سکتے ہیں۔“ ”پھر کیا سوچا“ ”بہن“ نے؟ ”ترانہ نے ملتی سے پوچھا۔“

”تمدن ربیعہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی تھیں۔ ”اور میرے خیال میں اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ بن ماں باپ کی بچی کا ٹھکانا بھی پکا ہو جائے گا۔“

ترانہ نے ہر اسماں ہو کر ربیعہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”شو“ کر کے کوئی پھلجھڑی چھوٹی تھی۔ ربیعہ کے چاروں جانب دھماکے ہونے لگے۔

اس کی آنکھوں نے دیکھنا چھوڑ دیا۔ کانوں نے سنا موقوف کیا۔ ذہن نے سوچنا بند کیا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ روئے زمین پر تنہا کھڑی تھی۔ بالکل تنہا۔

(باقی آئندہ)



عربہ نافع کے رشتے کا سنتے ہی منگنی سے انکار کر دیتی ہے۔ لیکن فاروق حسن سمجھا بھجا کر اسے راضی کر لیتے ہیں۔  
 رافع شاعری شروع کر دیتا ہے۔ اس کی نظم ہاشم کو بہت پسند آتی ہے۔  
 ابرار شہلا کو فون کرتا ہے اور دوبارہ تعلقات کی استواری کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ شہلا سنتے ہی دنگ رہ جاتی

ایقان کے دوبارہ دستفشار پر شہلا ہاشم کے لیے نیم رضا مندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ترانہ 'ربیعہ' کو یونیورسٹی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر گناؤں کے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ 'صولت' کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے سنگین نشانج کی دھمکی دیتی ہے۔

انیفہ 'ابرار جیلانی' کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔

یارک میں رہیجہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن۔ پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے پارک جانے پر یابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ساس اور نند کے ساتھ جا کر شہلا کو مستثنیٰ کی انگوٹھی پہناتی ہیں، شہلا، ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس بات مان لیتا ہے۔

تمدن ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے، اس کا فارم پیمانہ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اس پر غم کا بھہاڑ اس وقت ختم ہوتا ہے جب مینا بیگم تمدن کے اس کی ستاوی کا اعانہ کرتی ہیں۔

## 14

سوارپوش قریب

ترانہ کو اپنے حواس بحال کرنے میں کچھ وقت لگا۔ وہ قسم قسم کی چیزیں ایک دوسرے دیکھتے ہوئے بیٹا کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی؟“ وہ تھک چکے تھے۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کو ایک شخص کی مرضی کا نام تو نہیں ہے۔ شادی تو بندھن ہے دو افراد کو آپس میں جوڑتا ہے۔ کسی ایک شخص کی مرضی کے تحت بندھن نہیں بندھ جاتے۔ ربیعہ کی مرضی جانے بغیر آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔“

پناہیگم نے رنجہ کی جانب دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں بے پناہ تحقیر تھی۔

”اس کی کیا مرضی ہوگی؟ اکیلی لاوارث لڑکی، جس کا نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ ہم ہی ہیں اب اس کے سرپرست۔ اور مشرقی لڑکیاں اپنے سرپرستوں کے سامنے زبان نہیں کھولتیں۔ اسے تو سہارا ہی چاہیے، سرچھپانے کو چھمت پناہیے، کھانے کو دودھت کی رونی چاہیے۔ مل رہا ہے نایہاں اسے یہ سب کچھ۔ پھر رشتہ جوڑنے میں اعتراض کیسا؟ یوں تو یہ کوئی ہاسٹل ہے نہ دارالامان، تمدن سے اس کا نکاح ہو جائے تو لوگوں کے منہ بھی بند ہو جائیں گے۔ اسے عزت مل جائے گی۔ بندے کا نام مل جائے گا۔ ابھی یہ ہے کیا؟“

”بچھو!“ ترانہ از حد تاسف سے بولی تھی۔ ”یہ ایک تکمّل ذات ہے، اگر اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں یا ماں کی نرم گود اسے میسر نہیں تو اس سے اس کی ذات ادھوری نہیں ہو جاتی۔ یہ ایک وجود ہے، کھوس حقیقت۔ اس کو جو کچھ مل رہا ہے یہ اس کی یابی پائی کا حساب چکا رہی ہے۔ جسمانی، روحانی، ذہنی، تنہا۔ ہر طرح سے قیمت ادا کر رہی ہے یہ اس عظیم احسان کی جو ہم اس کو یہاں رکھ کر کر رہے ہیں۔ اور کن لوگوں کی زبانوں کی فکر ہے آپ



”بے چارہ نافع!“ ناعمہ نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”بچنس گیا بری طرح سے۔“  
 ”بس“ فضول ہی بولنا تمہیں مجھے تو تمہارا ہی خوف رہتا ہے ہر وقت کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ بک دیتی ہو اور پھر اڑ  
 کو باتیں سننا پڑتی ہیں۔“ وردہ نے اسے فوراً ڈانٹا۔

”رائمہ آپ کی شادی پتا نہیں کیوں پہلے کر دی امی نے۔“ اس نے منہ بنایا۔ ”آپ کی کر دیتیں تو میری از  
 پیشیوں سے جان چھوٹی۔ بہن سمجھ کر میں اپنے دل کی باتیں کرتی ہوں، آپ فوراً ڈانٹنا شروع کر دیتی ہیں۔  
 رائمہ آپ اپنی اتنی دلچسپی سے میری باتیں سنتی ہیں۔ خوب ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔ اور اگر میں کوئی نئی تازی نہ سناؤں،  
 ان کا تو دن ہی بے کار جاتا ہے۔“  
 وردہ کو بے ساختہ ہی ہنسی آگئی۔

”میں تمہارا اینٹی بدھوپن اسکو اڑھوں، اس لیے۔“ اس نے خفا بیٹھی ناعمہ کے سر پر ایک چپت لگائی۔  
 ”سمجھتی تو کچھ ہو نہیں سوچتا تمہیں ویسے ہی نہیں آتا۔ بی جملہ دینی پھرتی ہو اور اپنی اس ڈیوٹی پر بہت خوش بگم  
 رہتی ہو۔“

”اچھا۔ تو محترمہ عقل کل صاحبہ! ذرا اسی روشنی بھینکیے اپنی عقل کے مینار سے اور بتائیے کہ میں نے کون سے  
 بدھوپن کا مظاہرہ کیا ہے۔ عریشہ نافع جیسے منگنی کر کے خوش نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مجھے کیوں ٹکر  
 زباں بندی اس قدر شدت سے رہا ہے؟“  
 وردہ خاموش رہ کر غور کرنے لگی۔

”جانتی ہوں اس گھر کے بزرگوں کو گھر کے رشتے گھر ہی میں توڑنے کا کتنا کریز ہے۔ لڑکوں کے خاندان سے باہر  
 جانے کا تصور ہی ان کے لیے کتنا روح فرسا ہے۔ ہاشم بھائی بے چارے ابھی تک سخت تنقید کی زد میں ہیں۔ اسی  
 حساب سے لڑکیوں کی باتیں بھی یہی کچھ یہ جیتی ہیں۔ نافع کے عریشہ اور تمہارا دونوں نام زیر غور رہے ہیں پھر  
 بزرگوں نے فیصلہ عریشہ کے لیے ستایا۔ کیونکہ۔“ وہ کہتے کہتے ہنسی بھجی۔ ”جوچہ تم جانتی ہو۔ اب اگر تمہارے  
 منہ سے یہ پروپیگنڈہ کسی نے سن لیا کہ عریشہ اس رشتے سے ناخوش ہے تو جانتی ہو اس کا منطقی نتیجہ کیا نکلے گا؟ سب  
 یہ کہیں گے کہ تم جلد میں سے نکال دو۔“

”ہائے اللہ۔ وہ عقل سے اسے دیکھنے لگی۔ ”مجھے کیا خبر سہی میں لو اب شکرانے کے نفل پڑھوں گی۔“  
 وردہ کو ہنسی آگئی۔ ”کیوں“ یہ نافع اتنا برا تو نہیں ہے بے چارہ۔ تم لڑکیاں اتنا بدک کیوں رہی ہو۔ خوب  
 صورت، خوب سیرت، سلجھا ہوا لڑکا ہے۔“

”بھئی مجھے خاندان میں شادی کرنے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔“ اس نے ناک سکوڑی۔ ”بچپن سے جنہیں  
 دیکھتے آرہے ہیں، انہیں بربھاپے تک برداشت کیے جاؤ، کوئی سزا ہے یہ ہماری؟“

”یہ آئیڈیلزم ہی تو مار رہا ہے اس دور کی لڑکیوں کو۔“ وردہ کو غصہ آیا۔ ”میڈیا نے اور غضب ڈھایا ہے  
 لڑکیاں خود کو جانے کون سی مخلوق تصور کرنے لگی ہیں۔ ناک کے نیچے کوئی سہارا ہی نہیں۔ لی وی اسکرین توڑتا ہو  
 کوئی ہیروز زندگی میں آگھے اور ہاتھ پکڑ کر واپس فلمی دنیا میں لے جائے جہاں ڈوسٹ ساگز ہوں اور عشقیہ ڈانٹا لگا  
 یہی چاہتی ہوں نام لوگ؟“

ناعمہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔  
 ”اب سب آپ کی طرح تو نہیں ہوتیں اللہ میاں کی بکری۔“ وردہ کو غصے کے باوجود ہنسی آئی۔

”یہ مثال کو کیا ہوا؟“  
 ”اب آپ کو گائے تو کہنے سے رہی سبائیں انچ کی کر ہے۔ آپ کے لیے یہی مثال مناسب ہے۔“

”اور جو کچھ میں نے عرض کیا اتنی دیر میں وہ پلے پڑا آپ کے؟“ اس نے تبیں ہی انداز میں پوچھا۔ اس نے معصومیت سے سر ہلادیا۔

\*\*\*

”میں پوچھتی ہوں اب کتنے دن سوگ مناؤ گی اپنی مری ہوئی ماں کا؟“ فردوس بیگم کا جو صلہ جواب دے گیا تھا۔ وہ تن فتن کرتی اس کے سر پر آکھڑی ہوئیں۔ ”ایسی فتنہ لڑکیاں۔ توبہ توبہ۔ لوگ یونہی تو نہیں زندہ گاڑ دیتے تھے۔ خبر ہوتی ہوگی انہیں کہ جوان ہو کر منہ کو آئیں گی یہ بالشت بالشت بھر کی چھو کر یاں۔ سروں میں خاک ڈالیں گی۔“

عریشہ ماں کے توروں پر اندر سے سہم گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ایک ہفتہ سے وہ نہ ڈھنگ سے کھاتی پیتی تھی نہ کسی سے بات کرتی تھی۔ منہ دھوٹا بال بنانا کپڑے بدلنا سب ہی چھوڑ رکھا تھا۔ گلابی رنگت پہلی ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے۔

فردوس بیگم چند لمحے بیچ بویا بویا رہیں پھر اس کی صورت دیکھ کر نظریں چراتے ہوئے پردہ اٹھانے لگیں۔ ”صبر اور حوصلہ تو رہا ہی نہیں لڑکیوں میں۔ ناشکری سی ناشکری۔ ارے ایسا کون بنا پڑا تو دیا ہم نے تمہارے سر پر۔ منگنی ہی کدی ایک دیکھ بھالے بچے۔ وہ بھی سارا محبت میں۔ کہ بٹی کولا ڈول سے پالا ہے کہیں اور دینے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ ہماری بچی ہماری بچوں کے ہاتھ سے رہے گی۔ ہماری آنکھیں اور کلیجہ ٹھنڈا رہے گا لیکن بچی نے تو مانو اندھیر چا ڈالا۔ انوائی کھوائی ہے بڑی ہے سو بڑی ہے۔ اب ہمیں جتاؤ ہم کیا کریں؟ ناک رگڑیں؟ پیر پیریں تمہارے؟ اپنے سر پر جوتے ماریں؟ کیا کریں جو تم خوش ہو جتاؤ؟“

”بہت خیال رکھا آپ نے میری خوشی کا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اب مزید میں کیا چاہوں گی؟ اپنی آنکھیں اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کا سوچا تھا میرے سر کیا؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اب مزید میں کیا چاہوں گی؟ اپنی آنکھیں اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کا سوچا تھا میرے سر کیا؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اب مزید میں کیا چاہوں گی؟ اپنی آنکھیں اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کا سوچا تھا میرے سر کیا؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

آپ کو مبارک ہو اب میرا خیال نہ کریں۔

”کیسے نہ کریں خیال؟ تمہارا خیال نہ کریں اپنی عزت کا تو کریں گے۔ بات پہلے ہی تو ہماری رسوائی ہوگی۔ تمہارا کیا جائے گا۔ تم تو ہیروئن بنی کوئے میں پڑی رہو گی۔ لوگوں کو تو جوہر ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اب مزید میں کیا چاہوں گی؟ اپنی آنکھیں اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کا سوچا تھا میرے سر کیا؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

ایسا جلدی کیسے بھول جاتی۔ دل کی دنیا بننے سے پہلے ہی اجاڑی گئی تھی۔ ابھی تو آنکھوں نے خوش رنگ سنے بننے کا آغاز ہی کیا تھا۔ ابھی تو دھڑکنوں نے نئی تال پر دھڑکنا شروع کیا تھا۔ ابھی تو آنکھوں سے روشنی پھوٹنے لگی تھی۔ وقت ہی گزرا تھا۔ سپنا مکمل ہونے سے پہلے ہی اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا تھا اور اب حواس بحال نہ ہونے کی شکایت بھی کی جا رہی تھی اس میں کچھ وقت تو لگنا تھا۔ نکلنے کے رنگ اس کی انگلیوں پر رہ گئے تھے۔ ان رنگوں کو مننے کے لیے کچھ عرصہ درکار تھا۔

ماں باپ بھی کبھی کبھی کتنے بے مروت ہو جاتے ہیں۔ جس اولاد کی خوشی کا لمحہ لمحہ خیال کر کے اسے پروان چڑھاتے ہیں جسے شروع سے احساس دلاتے ہیں کہ تمہاری خوشی ہی ہمارا سب کچھ ہے۔ اسی اولاد کی رگ جاں سے سب سے خوش کن احساس کو نوح کر علیحدہ کر ڈالتے ہیں۔ زندگی بھر چھوٹی چھوٹی خوشیاں ڈھیر کرتے رہتے ہیں

اور جہاں زندگی کی سب سے بڑی خوشی کا محالہ آتا ہے وہاں دُندلی مار جاتے ہیں۔ زبان کے مسئلے کھڑے ہوتے ہیں، عزتوں کی بات ہوتی ہے۔ خاندان سے تعلق یاد آتا ہے اور جو بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اسے بھول جاتے ہیں۔

زبان۔ ہر شے سے برہہ کر اور دل؟

عزت۔ ہر شے سے زیادہ اہم اور جذبہ؟

خاندان۔ وجود کی بنیاد اور روح؟

دل جذبات روح پیا سے رہ جائیں۔ زبان عزت خاندان خون جگر سے اپنے ہونے کا خراج مانگیں۔ دل کی ناقابل برداشت اذیت سے آنکھوں میں آنسو بھر آئیں تو یہ ایکٹنگ قرار پائے۔ ڈراموں میں فلموں میں انھوں میں کہانیوں میں انسانوں میں کیا کچھ بھی سچ نہیں ہوتا؟ آنسو کب جھوٹ بولتے ہیں؟ زبان جھوٹ بول سکتی ہے لیکن آنسو ہمیشہ سچ کہتے ہیں۔

عریشہ جتنا سوچتی اتنا الجھتی تھی۔ اسے بھولنا چاہتی تھی لیکن وہ آواز خوابوں میں بھی اسے ستاتی تھی۔ وہ جتنے سوچتے تھک جاتی۔ مگر ابھن کا سراپا تھا نہ آتا۔ اسے کیسے فراموش کرے، نئی زندگی کی ابتدا کیسے کرے، نیا کو کیا کہہ کر سمجھائے؟ اس وقت جذباتیت شوریدہ سری اور غم و غصے کا شدید غلبہ تھا۔ وہ کچھ فیصلہ کرنے کے قابل نہ تھی۔

\*\*\*

”شہرستانوں؟“ منیزہ بیگم نے انیقہ کو محبت سے دیکھا۔

”کون سے؟“ انیقہ نے اور بے حد تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ شوز اتار کر لاؤنج میں ہی صوفے کے گداز پن کا لطف اٹھا رہی تھی۔ پتھر کی رفتار سے چل رہا تھا۔

”آپ شہرستانوں؟“ اس نے سر اٹھایا۔ ”میں خود کچن میں آتی ہوں بھوک لگی ہے۔“

”آج بہت سہولت رہی۔“ انیقہ نے سر اٹھایا۔ ”پتھر کی رفتار سے چل رہا تھا۔“

”آج بہت سہولت رہی۔“ انیقہ نے سر اٹھایا۔ ”پتھر کی رفتار سے چل رہا تھا۔“

”آج بہت سہولت رہی۔“ انیقہ نے سر اٹھایا۔ ”پتھر کی رفتار سے چل رہا تھا۔“

”آج بہت سہولت رہی۔“ انیقہ نے سر اٹھایا۔ ”پتھر کی رفتار سے چل رہا تھا۔“

”آج بہت سہولت رہی۔“ انیقہ نے سر اٹھایا۔ ”پتھر کی رفتار سے چل رہا تھا۔“

”آج بہت سہولت رہی۔“ انیقہ نے سر اٹھایا۔ ”پتھر کی رفتار سے چل رہا تھا۔“

”آج بہت سہولت رہی۔“ انیقہ نے سر اٹھایا۔ ”پتھر کی رفتار سے چل رہا تھا۔“

”آج بہت سہولت رہی۔“ انیقہ نے سر اٹھایا۔ ”پتھر کی رفتار سے چل رہا تھا۔“

”آج بہت سہولت رہی۔“ انیقہ نے سر اٹھایا۔ ”پتھر کی رفتار سے چل رہا تھا۔“



”بڑے لاڈ ہو رہے ہیں بھی“ شہلا کی آواز پر وہ دونوں مڑی تھیں۔  
وہ لبوں پہ مسکراہٹ لیے بچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔ آج کل وہ ہر وقت مسکراتی نظر آتی تھی۔  
”جی ہاں!“ انیقہ مزے سے بولی۔ ”امی اب پوری طرح سے میرے تصرف میں آنے والی ہیں۔ عباد بھائی لاہور میں اور آپ سرال میں۔ میں اور امی خوب جی بھر کر باتیں کیا کریں گے۔“  
”باتیں تو میں اب اپنی بہو سے کروں گی“ سمیس تو میں پڑھائی مکمل ہوتے ہی بیاہ دوں گی۔“ انہوں نے ہات پات میز پر رکھ کر ہنستے ہوئے کہا  
”امی!“ انیقہ نے احتجاج کیا۔ ”ناٹ خیر! مجھے کچھ تو لطف اٹھانے دیں“ آپ کے پورے پورے پیار کا۔“  
شہلا بھی گنگو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میز پر آ بیٹھی تھی۔  
”بھئی تم کیسے لطف اٹھا سکتی ہو۔“ وہ بولیں۔ ”میرا نواسا جو ہے۔ خدا سے سلامت رکھے، وہ کہاں تمہیں لاڈ کرنے دیتا ہے۔“

شہلا ان کا مطلب سمجھ گئی تھی یکدم سنجیدہ ہو گئی۔  
”شہلا!“ منیزہ بیگم نے اب اسے مخاطب کیا۔ ”بیٹا! وہ لوگ کئی شام آرہے ہیں نکاح کی تاریخ طے ہوئی۔ کل تمہارا آف ڈے ہے نا“ اسی لیے میں نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ یوں ہی نیک کام غیر مناسب نہیں ہے۔  
اب دن ٹوکیا مل پل گرن رہی ہوں۔ کب وہ مبارک گھڑی آئے اور میں سمیس لہجے میں روپ میں دیکھوں۔“  
”امی!“ وہ کچھ دیر بعد بولی تھی۔ ”میں عمر کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔“  
منیزہ بیگم نے کچھ دیر سوچا پھر مسکرا دیں۔  
”شروع شروع میں تو مناسب معلوم نہیں ہوتا بیٹی! ہاشم میاں ماشاء اللہ سلجھے ہوئے نیک طبیعت آدمی ہیں پھر بھی ان کے بھی جذبات و احساسات کا خیال نہیں کرنا ہو گا نا۔ ہاں چند ماہ بعد جب زندگی کی گاڑی ایک طے شدہ راستے پر چل نکلے تو آہستہ آہستہ اس گھر میں عمر کی جگہ بیدار ہو لیتا۔ تب تک میں عمر کا ویسے ہی خیال نہ رکھوں گی جیسا تم خیال کرتی ہو۔ میں اس کی ماں جیسی ہوں سمجھے اس کی نانی نہ سمجھوں۔ ہمیشہ سے وہ تم سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتا ہے۔“

شہلا کی پلکوں پر نمی تپکنے لگی تھی۔  
”میں اس کے بغیر کیسے جی پاؤں گی؟ ساری رات مجھے اس کا خیال تھا نا۔ وہ رات کو تو میرے بغیر ہی صورت نہیں رہتا۔“

”بہل جائے گا“ پتہ ہے۔ تم کون سا میلوں دور جا رہی ہو، دن میں دوبار آ سکتی ہو اسے دیکھنے۔“  
”میں زیادہ دن اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گی۔“ وہ آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”میں بس ہفتہ بھر میں لے جاؤں گی اسے۔“

”بھئی ہو۔“ منیزہ بیگم مسکرائیں۔ ”میرا بھی اعتبار نہیں ہے؟“  
”آپ کا اعتبار نہ ہوتا تو کبھی امی نہ بھرتی۔“ وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔  
”اچھا یہ بتاؤ اگلے چاند کی تاریخ تمہارا دیں؟“ اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔  
”جیسی آپ کی مرضی۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”اس راہ پر چلنا ہی ہے تو سوچنا کیا؟“  
انیقہ بغور اس کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی تھی۔

”تو پھر ملے ہے بہن“ اگلے چاند کی دس تاریخ؟“ شفیقہ جیات نے مسکرا کر پوچھا تھا۔  
”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ منیزہ بیگم کے روم روم سے مسرت کی لہریں نکل رہی تھیں۔  
”جلے پھر منہ بیٹھا کرتے ہیں۔“ انیقہ نے ڈانٹنگ ٹینل کی جانب اشارہ کیا، جمال ہاس نے بے حد پر تکلف قسم کا اہتمام کیا ہوا تھا۔

سی گرین کمر کے کڑھائی والے لباس میں شہلا صوفے پر بیٹھی تھی۔ سر پر آنچل لیے، نگاہیں جھکائے وہ خالصتاً ”شرقی لڑکیوں کے انداز میں بیٹھی کارروائی ملاحظہ کر رہی تھی۔ وہ وہاں آنے سے بھی گریزاں تھی اور اپنے کمرے میں ہی بیٹھنے پر مصر تھی لیکن ایقان اور انیقہ اسے پکڑ لاتی تھیں۔

ایقان چند لمحوں میں ہی اپنی پلیٹ بھر کر اس کے قریب آ بیٹھی تھی اور اب بے حد شوق سے ایک روٹ لکھا رہی تھی۔ شہلا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گہرے سبز رنگ کے لباس میں بے حد بھرے بھرے گداز جسم کی مالک، روشن و شاداب چہرہ لیے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ شہلا چند لمحے اس پر سے نظر نہ ہٹا سکی۔

”تم بھی کھاؤ نا۔“ ایقان اس کی توجہ محسوس کر کے بولی۔ ”ہم سے کیسی جھجک۔ ہم تو سب تمہارے جانے پہچانے دیکھے بھالے ہیں۔ یہ لوگ اب جاسن میرے ہاتھ سے کھاؤ۔“

اس نے اپنی پلیٹ میں رکھا گلاب جاسن اٹھا کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ بیشتر حاضرین محفل مسکرانے لگے تھے۔ شہلا نے خفت سے آگے دیکھتے ہوئے نشو سے منہ صاف کیا۔

”تم ایقان کی بچی۔“ وہ بولی تھی۔ ”سدا بھڑکی نہیں۔“  
”یہ تمہارے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔“ ایقان ہنسی۔

اس کی ہنسی میں مسرت تھی۔ شہلا اسے پھر سے بغور دیکھنے پر مجبور ہوئی۔ وہ واقعی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ وہ غالباً ہمیشہ سے انصاف کرنے کا تہہ کیے ہوئے تھی۔

”کچھ روٹ لکھاؤ۔“ ایقان نے شرارتاً پوچھا۔  
شہلا نے ہنسی سے انکار کر دیا۔

ایقان اپنی پلیٹ مزید کرنے کے لیے اٹھی تو فردوس بیگم وہاں آ بیٹھیں پھر انہوں نے غور سے شہلا کی نگاہیں پھرائیں۔  
”جان بھناؤ! بیٹیاں کر کر کے کسی دہلی ہو رہی ہو۔“

شہلا ہنس کر خاموش ہو گئی۔  
”اب اپنی بھلی نوکری تو تم چھوڑ دو گی نہیں۔ نہ ہی ہم کوئی زور زبردستی کریں گے، تمہاری اپنی مرضی ہے۔ کمانا چاہتی ہو تو شوق سے کماؤ لیکن چھٹیاں لے لینا، مادہ ماہ کی۔ آخر ہمارے بھی تو کچھ ارمان ہیں۔ پہلا پہلا لڑکا ہے ہمارا۔ کچھ تو شوق پورے کر لیں۔“

انہوں نے حسرت سے سانس بھری تھی۔ شہلا خفیف سی ہو گئی۔  
”نہ۔“ وہ بے وجہ ہی کھنکھساری۔ ”عریضہ نہیں آئی؟“

”اے ہاں۔“ آج کل کی لڑکیاں اپنی مرضی کی مالک۔ ہم نے تو بہتیرا کہا، بہن نے سمجھایا۔ وہ منہ لپیٹے پڑی رہیں۔ بے چاری کی طبیعت خراب ہے کافی دن سے۔“

”خیر تو ہے۔“ شہلا بولی۔ ”کیا ہوا ہے؟ آپ لے آئیں تو میں چیک اپ کر لیتی۔“  
”ارے نہیں۔“ وہ مزید گھبرائیں۔ ”ایسی کوئی خاص بات نہیں، سرور کی شکایت کرتی ہے۔ میں نے کما نظر



ربیعہ سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

”تم۔۔۔ عباد کو چاہتی ہو؟“ ترانہ نے آہستگی سے پوچھا۔

ربیعہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی نگاہوں میں کھیر تھا۔

”ترانہ! میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ اس نے بالآخر لب کھولے اور گلے میں گھلتی نمی کو محسوس کیا۔ ”میں

بس اتنا جانتی ہوں کہ میں مردوں سے الگ ہوں۔ کیوں کب کیسے۔۔۔ ان سوالوں کے جواب نہیں ہیں میرے

پاس۔ بس میں شادی نہیں کر سکتی۔ میں یہاں اس گھر میں ساری عمر بتانے کو تیار ہوں ترانہ! میں۔۔۔ میں پیچھا

جان کی خدمت کروں گی۔۔۔ جب تک ان کی یا میری زندگی ہے میں تمدن بھائی اور تصور بھائی کی شادیوں کے گیت

گاؤں گی ان کی دہنوں کے چاؤ اٹھاؤں گی۔۔۔ پیچھو کے لیے صولت بن جاؤں گی لیکن پلیز ترانہ! مجھ سے شادی

کے لیے اصرار نہ کرو مجھے اس سے بچالو ورنہ۔۔۔ ورنہ شاید میں مرجاؤں گی۔“

وہ سسکا اٹھی۔ ترانہ اس کی پشت سہلانے لگی۔

”پہلی۔۔۔ میں تو نجانے کیا سمجھ بیٹھی۔ مجھے لگتا ہے ربیعہ! تمہاری زندگی میں کچھ ایسے حادثات گزرے ہیں

جنہوں نے تمہیں مردوں سے متنفر کر دیا ہے ورنہ تمہاری عمر ایسی نہیں کہ تم اس قدر گہرائی سے ان معاملات کا

تجزیہ کر سکو۔“

”کچھ بھی سمجھ لو“ ربیعہ گلو گیس میں ملی۔ ”تم تمدن بھائی کو سمجھاؤ ترانہ! انہیں بہت اچھی لڑکی مل سکتی

ہے۔“

”تم بھی تو بہت اچھی ہو ربیعہ!“ ترانہ نے محبت سے کہا۔

ربیعہ چونک کر ترانہ کی جانب دیکھنے لگی۔ گویا اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”دیکھو ربیعہ! اگر بات یہ ہوتی کہ تم تمدن بھائی کو ناپسند کرتیں مجھ میں کسی کو بھی تم سے زبردستی نہ کرنے دیتی یا

اگر تم کہیں اور شادی کر دینے کی خواہش مند ہوتیں جیسا کہ عباد سے۔۔۔ تب بھی ایک ٹھوس وجہ بنتی

لیکن محض اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ تم شادی نہیں کرو گی۔ یہ بات اپنے ذہن میں نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل تمہیں یہ

قدم اٹھانا ہی ہو گا تو پھر آج ہی کیوں نہیں اوسسہ اور اگر تمہارے ذہن میں واقعی کوئی نتیجہ کوئی پائیڈیل نہیں ہے تو

پھیر۔“

وہ جھجک کر خاموش ہو گئی۔ ربیعہ نے اب کی بار سر اٹھا کر اسے نہ دیکھا۔ وہ جان چکی تھی کہ ترانہ کا مطلب کیا

ہے۔

”ربیعہ!“ ترانہ اس کے ہاتھ تھام کر خوشامد سے بولی۔ ”ربیعہ! تم اس گھر کو سنبھال سکتی ہو، سنوار سکتی ہو۔

تمہاری ”ہاں“ اس گھر کا مقدر بدل ڈالے گی مجھے یقین ہے۔“

ربیعہ کے اندر آنسو گرنے لگے۔ طوفانی ہوائیں زور پکڑنے لگیں۔ اس کا دل شدت سے نفی میں سر ہلانے لگا

لیکن وہ ساکت بیٹھی رہی۔

”پیچھو نے حقیقتاً میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے نظر آنے لگا کہ اس گھر کی خوشیاں صرف تمہارے وجود

سے وابستہ ہیں۔ یہاں جاہتوں کے گل و گلزار محض تم کھلا سکتی ہو۔ اتنی محبت اتنی طاقت میں نے تم میں پائی ہے

ربیعہ! تم ایک غیر معمولی لڑکی ہو۔ اس گھر کے معمولی افراد کو اپنا کر غیر معمولی کر سکتی ہو۔ میں جانتی ہوں ربیعہ! میں

بہت زیادہ طلب کر رہی ہوں لیکن محض تمہارے اندر موجزن بھلائی کے سمندر کے سہارے میری اتنی ہمت

ہو پائی ہے۔“

ربیعہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ترانہ دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ رہی ہو۔ اس سے

سانس لیتا محال ہونے لگا تھا۔

”بولونا ربیعہ!“ ترانہ جیسے خود بھی کسی سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔

ربیعہ خاموشی سے اپنے بسترے آنسو صاف کرنے لگی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور اس کا انداز ہار مان لینے والا تھا۔

\*\*\*

موبائل کی ہب بہت دیر سے بج رہی تھی۔ عاشر بہت تھک کر سویا تھا اس لیے اسے شعور کی کیفیت میں آ میں کچھ وقت لگا۔

”ہیلو؟“ بدقت تمام اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہیلو۔“ لڑاکی شوخ آواز گونجی۔ ”کیسے ہو ڈار لنگ؟“

”فائن۔“ وہ مکمل طور پر حواسوں میں آنے کی کوشش کرنے لگا۔

”لگتے تو نہیں ہو۔“ خیر کیا کر رہے ہو؟“

”اس وقت تو تم سے باتیں کر رہا ہوں۔“ وہ بیٹھ کر جمائی لینے لگا۔ ”چند لمحوں قبل سو رہا تھا۔“

”اوسے میں نے تمہاری نیند خراب کی۔ سوری۔“ وہ شوخ بولے۔

اس کا اجد اس کے الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔

”کیسے میم! کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟“

”خدمت میں آپ کی کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ ہنسی۔ ”آپ ہمارے پسند کریں گے؟“

”کیا؟“ اس نے ایک اور جمائی لی۔

”میری خدمات۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً“ یہ کہ چھٹی کا دن ساتھ گزارتے ہیں، میں تمہارے لیے کوئی اچھی سی ڈش بناؤں گی۔ ہم لچ ساتھ کریں گے اور آؤنگ پر چلیں گے۔“

”ہوں۔ اس پورے پروگرام میں آپ کی خدمت محض لچ بنانے تک محدود ہے مادام؟“

”جو آپ چاہیں پروگرام میں شامل کیا جاسکتا ہے۔“ وہ سبے باکی سے بولا۔

عاشر کورگوں میں لہو گرم ہوتا محسوس ہوا۔

”کافی اوین مائنڈ ڈیں آپ۔“ وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔

”صرف تمہارے لیے۔“ اس نے جتایا۔

”مائی گاؤ۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”تم کچھ کر کے رہو گی۔“

”شیوور۔“ وہ ہنسی۔

”یا پھر میں کچھ کر بیٹھوں گا۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

”مائی پلینز۔“ وہ گنگنائی۔

”یا سہ! تم چاہتی کیا ہو؟“ وہ نہج ہوا۔

”آجاؤں؟“

”اوکے۔“ اس نے ہار ماننے والے انداز میں کہا۔

”سوٹائس آف یو ڈار لنگ۔۔۔“ وہ خوش ہو گئی تھی۔

عاشر نے موبائل آف کر دیا۔ دونوں بازوؤں کا تکیہ بنا کر وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ آج کا پورا دن وہ سو کر گزارنے کا

راہ رکھتا تھا اور اس نے کیا رنجے ہی اٹھا دیا تھا۔ ساری نیند آبی بخارات کی مانند اڑ گئی تھی۔

وہ گہری سوچ میں گم تھا پھر سر جھٹک کر وہ نہانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

\*\*\*

باشم آفس جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ ٹائی صحیح انداز میں سیٹ کرنے کے بعد اب پلیس وہاٹ شرٹ کے

کف لٹکے لگا رہا تھا۔ ایک نظر اس نے آئینے پر ڈال کر بالوں میں جلدی جلدی انگلیاں چلائی۔

”کافی ہینڈ سم ہو یا ر!“ اس نے اپنے عکس سے کہا اور مسکرایا۔

فون کی بیل بج رہی تھی۔ وہ برش کرتا ہوا وہاں تک آیا۔

”ہیلو! باشم از میسر۔“

”ہیلو۔“ باشم انکل۔ میں عمرات کر رہا ہوں۔“ معصوم آواز کی چکار گونجی تھی۔

باشم نے ایدوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ہیلو میسر!۔۔۔ کیسے ہو؟“

”فائن۔“ آپ آفس جارہے ہیں؟“

”جی ہاں! آپ نے چلنا ہے؟“ وہ مسکرایا۔

”نہیں! میں آؤں گا! ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”تھو!۔۔۔ آپ؟“

”انکل!۔۔۔ میں آؤں گا! ابھی دین والا نہیں آیا۔“

”اچھا۔۔۔“

”میرے ساتھ کرنا۔۔۔“

باشم کو اچانک سے احساس ہوا۔ یہ کونسی شخصیت کا فرما تھی۔

”اچھا۔۔۔“

”جی ہاں! شام چھ بجے۔“

”اوکے۔“ وہ بولا اور سلسلہ فوراً منقطع ہو گیا۔ باشم ریسیور ہاتھ میں لیے کچھ دیر غور کرتا رہا پھر مسکرا کر

ریسیور کرینڈل پر ڈال دیا۔

”ہمارا تو جیلا ہی ہونا ہے۔“ وہ گنگنائے ہوئے بڑبڑایا۔

\*\*\*

شام اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ گلابی لباس پہن کر اتری تھی۔ باشم نے پارک کی پختہ روش پر چلتے ہوئے

موسم کی دلکش گو محسوس کیا۔ روش کے دونوں جانب ننھے، مختلف رنگوں کے پھولوں والے ان گنت پودوں کی قطار

تھی جن سے نمی کا خوشنما احساس قریب جاں کو معطر کرتا تھا۔ گہری سبز گھاس پر معصوم پرندے دن بھر کی تھکن اتار

رہے تھے۔ درختوں کے ٹھنڈے، گنگنائے ہوئے باغیچے اپنی مہربان آغوش میں بلا تے محسوس ہو رہے تھے۔

وہ بہت خوبصورت شام تھی یا شاید اسے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں بے فکری

”سوری۔ سوری ہاشم صاحب!“ پھر وہ بولی۔ ”میں شاید کچھ نا انصافی کر گئی آپ کے ساتھ۔“

”کوئی نئی بات ہے؟“

شہلا لب کاٹ کر رہ گئی۔ ہاشم نے چند لمحے اس کی شرمندگی ملاحظہ کی پھر مسکرا دیا۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں شہلا! میں آپ کے ایسے وجود کو حاصل کرنا چاہتا ہوں جس میں ”دل“ نہ ہو؟ بنا روح کے جسم کی کیا انٹرکشن ہو سکتی ہے؟ میرے لیے ”وجود“ اور ”جسم“ اہمیت نہیں رکھتے۔ میں دل اور روح کے رشتے کا قائل ہوں اور میں اتنا جانتا ہوں کہ ایک ماں کے لیے اس کی اولاد اس کا ”دل“ بھی ہوتی ہے اور ”روح“ بھی۔ آپ عمر کے ساتھ آپس کی تو آپ میں زندگی ہوگی۔ روح ہوگی۔ دل ہوگا۔ عمر کے بغیر تو میں نہ آپ کو پاسکوں گا نہ خود کو۔“

اس کے الفاظ ٹوٹے ہوئے تھے۔

”ویری سوری ہاشم!“ شہلا کا سر شرمندگی سے جھکا ہوا تھا۔ ”میں نے آپ کے جذبات کو نہیں پہنچایا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔“

”اتنا ضرور ہے شہلا! کہ ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔ میں نے گھر میں اس موضوع پر کسی سے اس لیے بات نہ کی۔ میں اتنے اہم موثر پر نیا اختلاف پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں ایک مرتبہ ہم سب کو اپنی خوشیوں میں شریک کر کے اپنے بندھن کا گواہ بناؤں پھر زندگی ہماری ہوگی۔ فیصلے بھی ہمارے ہوں گے۔ جذباتیت کے جو مظاہر ہمیں وقت ہو سکتے ہیں تب ان کا اظہار فضول اور بے مصرف ہوگا۔ لہذا ہمارے ارد گرد کے لوگ ان پر اپنا وقت ضائع نہ کریں گے کیا خیال ہے؟“

شہلا مسکرائی۔ ہاشم کی نگاہ نے جو رنگ جاتی ہوئی شام کے آنچل سے چرائے تھے وہ شہلا کی مسکراہٹ کو دان کر دیے۔



”نہیں بیٹا! تو روز کی یاد کرتا ہوں۔ میں آپ کو کسے بھول سکتا ہوں؟ میں تو روزانہ اپنے فریڈز کو آپ کی باتیں بتاتا ہوں۔“

”ضرور لے کر جاؤ گے یا کرنا؟“

”نہیں! میں شہلا کو جانوں گا اور میوزیم بھی اور سمندر دیکھنے بھی جائیں گے۔ آپ مجھے بہت سارے ٹوائز لے کر دیجئے گا اور۔۔۔ اور۔۔۔ چاکلیٹس۔۔۔“

”آئی پراس مالٹی سن! جو آپ کو کس (Kiss) کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔“ اس نے ترقیہ لگایا۔ ”سونا کس آف یو ڈارلنگ۔“

”پھر ہم کب چلیں گے؟“

”سندے کو۔“

”آپ کی ماما کہاں ہیں؟“ اس نے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

”ہا ہا ہا! وہ مختصراً“

”اچھا۔“ وہ محتاط انداز میں بولا۔ ”ماما سے میری باتیں کرتے ہو؟“

سے پھرتے ہوئے یا دل اپنا رنگ تبدیل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے پھر اس کی نگاہ سامنے سے آتی شہلا پڑی۔ اس کے ساتھ اچھلتا کودتا عمر چلا آ رہا تھا۔

”السلام علیکم! نقل!“ وہ اس کے قریب آکر بمشکل رکا۔

سفیدی شرٹ اور گلابی نیکی میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہاشم نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے جھک کر اسے پیار کیا پھر سیدھا ہو کر شہلا پر ایک نظر ڈالی۔

لائٹ پریل سوٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ ہاشم کی آنکھوں نے شام کے سب ہی رنگ چرائے۔

شہلا کو ان نظروں سے نظریں چراتے ہی مانی۔

”جی میں ٹھیک ہوں، شکر ہے اللہ کا۔“

”آئیے اور بیٹھتے ہیں۔“ ہاشم نے سگلی بیچ کی جانب اشارہ کیا۔

عمر قد رے فاصلے پر کھیلنے ہوئے بچوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔ وہ دونوں بیچ پر آ بیٹھے۔ شہلا کھڑے پر سنجیدگی کا چھاپ تھی۔

”وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا۔“ ہاشم نے گہری سانس بھر لیا۔

”مجھے کچھ کہنا تھا۔“ شہلا دور کھیلنے عمر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں ہمت تن گوش ہوں۔“ اس نے بازو سینے پر باندھ لیے۔

”آپ کی والدہ شاید یہ سمجھتی ہیں کہ میں عمر کو امی سے پیار سے چھوڑ دینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔“ اس نے سر جھکائے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ ”حالانکہ میں نے ایلوور خاں آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ اس سلسلے میں سب کی غلط فہمیاں دور کر دیجئے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے کسی سے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا۔“ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی ہاشم اس کی بات ختم ہو جانے کا منتظر تھا۔

”ہاشم صاحب! اتنا طے ہے کہ میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔“

”صرف ایک خوشی باقی ہے اور میں آخری سانس تک اسے خود سے جدا نہیں ہونے دوں گی۔ میں عمر کے بغیر آپ کے گھر نہیں آؤں گی۔“

ہاشم نے اس کے بے سرحالے پر نگاہ کی۔

”آپ۔۔۔ صرف اپنے جذبات کی پروا کرتی ہیں شہلا!“ وہ مایوس ہو کر بولا۔

”بہت مارجن تو دے دیا کریں۔ جذبہ ہمدردی کے تحت ہی سہی۔“

شہلا نے سر اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ کم از کم مجھ سے پوچھ لیں کہ میں کیا چاہتا ہوں کیا سوچتا ہوں میری تمنا کے دائرے میں کیا کچھ آتا ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ عمر کے لیے میں وہی سوچتا ہوں جیسا آپ اس کے لیے سوچتی ہیں۔ کیا یہ الفاظ آپ کی تسلی کے لیے کافی نہیں ہیں۔“

”نہیں۔“ وہ بے مروتی سے بولی۔

ہاشم اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

”شہلا پلیز! مجھے اتنا تو سمجھیں جتنا میں نظر آتا ہوں۔ اندر اترنے کی بات تو علیحدہ ہے۔ اس کا تو میں آپ سے تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ وہ شاید خفا ہو گیا تھا۔

شہلا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے اپنے رویے کے غلط ہونے کا احساس ہوا۔



”نہیں۔“

”کیا کرونا یا ر! کام کے بندے نہیں ہو تم۔“

”ممانع کرتی ہیں نا۔“ وہ منمنایا۔

”کیا کہتی ہیں؟“

”وہ کہتی ہیں مجھ سے پایا کی باتیں مت کیا کرو۔ وہ تمہارے پایا ہیں مگر میرے کچھ نہیں ہیں۔“ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

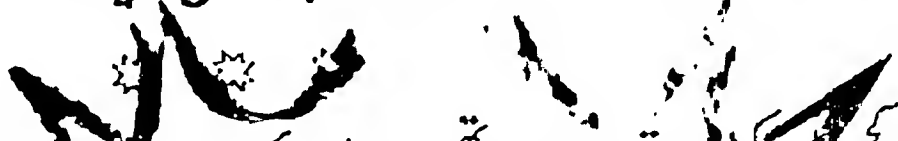
”اچھا!“ لگتا ہے تمہیں وکالت سکھانا پڑے گی۔ خیر ہم بھی تمہارے باپ ہیں یا ر! کیا یاد کرو گے تم اور۔ تمہاری ماما۔“

”پاپا میں لیپ ٹاپ (پکیسٹریٹ) لوں گا۔“ موضوع تبدیل ہونے سے وہ بیزار ہوا تھا۔ ”میرے سب فرینڈز کے پاس ہے اور چھروں والی گن بھی۔ ماما مجھے نہیں دلاتیں۔ وہ کہتی ہیں تم کسی کوز خمی کرو گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں دلاؤں گا۔ ویسے تو بہت سافٹ ہارڈ ہیں تمہاری ماما! مگر ہمارے کیس میں تو۔“ اس نے جملہ اوتھورا اچھوڑ دیا۔

”خالہ جانی آگئیں۔“ عمر نے سیڑھیاں اترتی انیقہ کو دیکھ کر کہا تھا۔

”اوسکے جانوس خدا حافظ۔“ اس نے فی الفور رابطہ منقطع کر دیا تھا۔



ربیعہ کیچن میں کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ صولت بھی خلاف معمول آن کیچن میں نظر آرہی تھی۔ وہ آلو چھیل رہی تھی۔ غالباً اسے سالن بنانے کا آرڈر ملا تھا۔ تمدن اور مینا بیگم آج بڑے خفیہ انداز میں خوش خوش کہیں روانہ ہوئے تھے اور تاحال نہ لوٹے تھے۔ تصویر چھیت پر چھٹکیں اڑ رہی تھیں۔ ترانہ اپنی ڈیوٹی بھگتا کر آئی تھی اور کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹی ہوئی تھی۔

کیچن کی کھڑکی سے لال فرش والے صحن کا منظر نظر آرہا تھا۔ فرش خشک پتوں سے اٹا ہوا تھا۔

”برتن دھو کر میں صحن میں جھانڈ لگا دیتی ہوں۔“ ربیعہ نے دل میں سوچا۔

”اچانک ہی اسے اپنا کچن یاد آیا۔ جہاں ہار سنگھار کے ختم ہونے پر پتے پھول بکھرا کرتے تھے، جنہیں وہ روز سیٹھی تھی جن کی خوشبو اسے دیوانگی کی حد تک پسند تھی۔ بچپن میں بھی وہ ان پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر پھرا کرتی تھی۔“

ربیعہ کو دادی جان یاد آئیں۔ ان کا چمکتا چہرہ، شفیق مسکراہٹ، مہربان لمس، شناسا خوشبو۔

ربیعہ کسی اور منظر میں جا پہنچی تھی۔ جب گیٹ کھلنے کی آواز سے وہ حال میں لوٹ آئی۔ تمدن اپنی موٹر سائیکل اندر لا رہا تھا۔ مینا بیگم ہاتھوں میں کئی شاہرز تھا۔ اس کے ہمراہ تھیں۔

”امی آگئیں۔“ صولت مسرت سے چلائی۔

ربیعہ کو اندازہ ہوا کہ وہ ان دونوں کے ایک ساتھ کہیں جانے کے مقصد سے واقف تھی اور بات کچھ ایسی تھی کہ وہ بہت پر جوش ہو رہی تھی۔ وہ جلدی آلو پرے کھسکا کر کیچن سے نکل گئی۔ ربیعہ گوگو کی کیفیت میں کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا پھر مینا بیگم نے کیچن میں جھانکا۔ ان کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جو ربیعہ نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

”ربیعہ ذرا یہاں تو آؤ۔“ وہ کمال مہربانی سے گویا ہوئیں۔

ربیعہ کے ہاتھوں پر صابن کا جھاگ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی پھر میکا کی انداز میں وہ انہیں دھونے لگی۔ ہاتھ دھو کر وہ کچن سے نکل کر کمرے میں آئی۔

تمدن مینا بیگم صولت اور ترانہ سے چاروں ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ ربیعہ کی نگاہ ان کے چہروں سے پھسل کر ان کے درمیان رکھی چیزوں پر گئی۔

”دیکھو ربیعہ! یہ جوڑا کیسا ہے؟“ مینا بیگم نے گہرا سرخ، مقشیش کے کام سے سجھا ہوا سوٹ لہرایا۔

”اُمی!“ صولت جلدی سے بولی۔ ”یہ میرا ہوگا۔ ربیعہ کو دو سرا والا دے دیں۔ مجھے لال رنگ پسند ہے۔“ ترانہ نے خفگی سے صولت کو گھورا تھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ مینا بیگم جلدی سے بولیں۔ ”تمہیں یہ پسند ہے تو تم یہ لے لو۔ ربیعہ تو بے چاری بہت صابر و شاکر بنی ہے۔ ایسی باتوں کو محسوس نہیں کرتی۔“

انہوں نے جلدی جلدی شاپر سے دو سرا سوٹ برآمد کیا۔ وہ گہرے جامنی رنگ کا تھا۔ اس پر بھی مقشیش کا ہی کام تھا۔

صولت نے دو سرا سوٹ دیکھتے ہی جلدی سے جھپٹ لیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں یہ لے لیتی ہوں۔ یہ زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔“ مینا بیگم نے لہجہ میں دلالت کرتے ہوئے کہا۔

”لے لائی تمہیں اُمی کو دے دیں۔“ ترانہ نے بد مزگی سے اسے دیکھا۔

”مسکون سے دیکھنے دو چیزیں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی ہیں۔“ ربیعہ نے جو بوجھیں پسند آتی جا میں وہ تم رکھتی جاننا۔ ربیعہ کے لیے بے شک کچھ نہ بچے۔“ ترانہ جل کر بولی تھی۔

صولت کے چہرے کے زاویے کئی بار بگڑے مگر وہ اس قدر جوش تھی کہ اس نے ترانہ کی خفگی کو زیادہ اہمیت نہ دی۔

”یہ سینڈل ہیں۔“ مینا بیگم نے سلور کلر کی دو سینڈل ایک شاپر سے برآمد کیں۔ ”ان پر لڑائی نہیں ہو سکتی۔“

صولت نے سینڈل غلٹ کے عالم میں ان کے ہاتھ سے چھین لی اور پہننے لگی۔ مینا بیگم اس کے انداز پر دل کھول کر ہنس جبکہ ترانہ کے چہرے پر شدید بیزاری کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ تمدن صوفے پر بیٹھا خواتین کی کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے خواہش کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر بات کرے۔

ربیعہ کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ سب کچھ کیا تھا، کس لیے تھا، کیونکر تھا؟ وہ سمجھ کر بھی سمجھ نہ پا رہی تھی۔

”آہا۔۔۔ ایک اسپت۔۔۔“ بولی بکس دیکھ کر صولت چلائی۔ ”مزہ آگیا۔ میں تو روز تیار ہوں گی۔“ اچانک ہی کمرے میں تصور داخل ہوا پھر اندر ہونے والی کارروائی دیکھ کر وہ کچھ الجھ سا گیا تھا۔ غالباً ”ربیعہ کی طرح وہ بھی لا علم تھا۔“

”یہ کیا ہے؟“ وہ آگے بڑھ آیا اور اشیاء کے متعلق استفسار کرنے لگا۔ ”یہ کس کے کپڑے ہیں؟“ اشکارے مارتے۔

”جو جو تو جانیں۔“ مینا بیگم ہنسیں۔

صولت شرمائے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ تصور نے اچھے اچھے انداز میں سب کے چہروں پر نگاہ کی۔

”کیا بات ہے آخر؟ کچھ بتا تو چلے۔“ وہ قدرے محتاط انداز میں بولا۔

”تمہیں دو لباس لانے کی تیاریاں ہیں۔“ مینا بیگم مسکرائیں۔

تصور کے ماتھے پر یک نخت کئی بل نمودار ہوئے وہ سب کو گھورنے لگا۔

دیکھا مطلب؟ یہ کون سی ساتیں ہو رہی ہیں؟“

”پکارا شیں؟“ ترانہ اچھنبے سے بولی۔ ”اس میں سازش کی کیا بات ہے۔ کیا آپ بھول گئے کہ دو سال قبل صولت سے آپ کی منگنی ہوئی تھی۔“

”اس منگنی کا یہاں کیا ذکر؟“ وہ مسلسل بگڑا ہوا تھا۔

”ذکر یہ کہ منگنی کے بعد شادی بھی ہوئی ہے۔“ تمدن نے بالآخر قطع کلامی کی۔ اس کے لہجے میں کڑھکی تھی۔

”اور اب تمہاری شادی ہو رہی ہے صولت کے ساتھ۔“

”ساتھ ہی تمدن اور ربیعہ کی بھی شادی ہے۔“ مینا بیگم نے آرام سے بتایا۔

ربیعہ کے سامنے رکھی ہر شے دھندلانے لگی۔ اس کے کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ دل کو جیسے کسی نے پھینچنے لگا۔

”اگلے ہفتے نکاح ہے۔“ مینا بیگم اطمینان سے چیزیں سمیٹنے لگیں۔

”کمال ہے۔“ تصور اچانک ہی بھڑک اٹھا تھا۔ ”مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں اور لگے اپنی اپنی کہنے۔ مجھے تو کمال ہے۔“

”دل دادی کرنی اور اس صولت سے تو ہرگز نہیں۔ ربیعہ سے تو میں شادی کروں گا۔ بھلا یہ۔۔۔ یہ آدمی اس کا بھائی ہے؟“

اس نے تمدن کی جانب اشارہ کیا۔ تمدن پر گویا کسی نے تیل ڈال کر تیلی دکھادی۔ وہ لپک کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے تصور کو زور سے دھکا دیا۔

”کتنے تیری یہ مجال۔ تو اس پر نگاہ رکھتا ہے۔ اور تو خود کس قابل ہے۔“

تصور نے کمر اس کا پکڑ لیا۔ دونوں بھائی آپس میں کھم کھم ہو گئے۔ عورتیں چیخنے لگی تھیں۔ ربیعہ تو کچھ نہ پائی۔ کچھ کچھ نظروں سے وہ دونوں بھائیوں کو آپس میں لڑتا دیکھتی رہی۔ ترانہ اور مینا بیگم آگے بڑھ کر غلجہ کی کوشش کرنے لگیں جبکہ صولت زور زور سے رونے لگی تھی۔

”ذیل۔۔۔“ صولت نے کچھ کہہ چلائی۔ ”بس پر مٹی ٹھنڈ کھجے میں؟ لگاری آگ میری زندگی میں؟ مجھے پتا تھا۔ اچھی طرح پتہ تھا۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ کچھ کہہ کر چلائی۔ ”ایسے ہی لکھن تھے تیرے۔“ ترانہ لپک کر آئی۔ اس نے

”وہ تو کھانا ہے۔“ وہ چیخیں۔ ”اپنے گریبان میں جھانکو۔ تم نے کیا کیا حرکتیں نہیں کیں یہاں سب کی نظروں کے سامنے؟ اس پر الزام لگائی ہو۔ اپنا آلودہ دامن دیکھو اُمی! یہ تصور بھائی نے تم سے شادی سے انکار کیا ہے۔ تم جیسی لڑکیوں کو کون پوچھتا ہے۔“

”دفعنا“ مینا بیگم نے مڑ کر ترانہ کے بال دیوے۔

”وہم بخت! میری فرشتہ صفت بیٹی پر الزام دھرتی ہے۔ خود نجانے کیا کچھ گل کھلا کر آئی ہے باہر۔ پرائے لڑکوں سے ختم تھا۔“ صولت پھرتی ہے۔ ایسے کون کسی کو کچھ دیتا ہے۔ بدلے میں تو کیا دیتی ہے اسے؟“

تمدن تصور سے علیحدہ ہو کر ترانہ کے بال مینا بیگم کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

کمرے میں کان بڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، چیخنے چلانے کی آوازیں سے پورا کمرہ گونج رہا تھا۔

ربیعہ کی نظروں کے سامنے سب کچھ او جھل ہونے لگا۔ بالآخر وہ تیرا کر نیچے گری۔ اس کا سر چارپائی کے پاس سے ٹکرایا تھا۔ اچانک ہی خون کا فوارہ سا پھوٹا تھا۔

عرشہ نالغ کے رشتے کا سنتے ہی منگنی سے انکار کر دیتی ہے۔ لیکن فاروق حسن سمجھا بھجا کر اسے راضی کر لیتے ہیں۔  
 رافع شاعری شروع کر دیتا ہے۔ اس کی نظم ہاشم کو بہت پسند آتی ہے۔  
 ابرار شہلا کو فون کرتا ہے اور دوبارہ تعلقات کی استواری کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ شہلا سنتے ہی رنگ رہ جاتی ہے۔  
 ایقان کے دوبارہ استفسار پر شہلا ہاشم کے لیے نیم رضا مندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ترانہ ربیعہ کو یونیورسٹی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر گستاخوں کے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ صولت کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے سنگین نتائج کی دھمکی دیتی ہے۔  
 انیقہ ابرار دیوانی کو چمپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔  
 یارک میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عبادتے ہوتی ہے۔ تمدن۔ یارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے یارک جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔  
 فردوس بیگم اپنی ماس اور نند کے ساتھ جا کر شہلا کو منگنی کی انگوٹھی پہناتی ہیں شہلا ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔  
 تمدن ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔  
 لیکن اس پر غم کا پہاڑ اس وقت ٹوٹتا ہے جب بیگم اس سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔

## ساتویں قسط

ایک کراہ کے ساتھ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھلیں تھیں۔ اس کے لبوں سے چند بے معنی آوازیں نکل کر رہ گئیں۔ اس کے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ بھری ہوئی موجوں کی مانند اس کے احساسات سے پوری شدت سے آکر ٹکرا رہی تھیں۔  
 ربیعہ کی ادھ کھلی آنکھوں نے اپنے ہاتھوں کے درمیان سے نظر نہائی۔ ترانہ کے چہرے پر تاسف اور فکر مندی واضح تھی۔ ربیعہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے بولنا چاہا تو کراہ کر رہ گئی۔  
 ”ترانہ“ کی بمشکل بولی تھی۔

”ہاں ربیعہ!“ اس نے اپنے ہاتھ کو ترانہ کے گرم پر خلوص ہاتھوں میں پایا۔ ”میں ہوں تمہارے پاس۔ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری تم تھیک تو ہونا۔ دو روز زیادہ تو نہیں ہو رہا؟“  
 ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر ترانہ کا چہرہ دیکھتی رہی جس پر اب ایک مہربان پر خلوص مسکراہٹ تھی۔

”تم گر گئی تھیں ربیعہ۔ تمہارا سر پھٹ گیا تھا۔ پھر خون بہنے کی وجہ سے تم نقاہت سے بے ہوش ہو گئیں۔ ابھی ڈاکٹر آیا تھا۔ اس نے تمہاری بینڈیج کی اور انجکشن بھی لگایا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ تمہارا بلڈ پریشر بہت زیادہ لو ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔“

ترانہ اسے دیکھے دیکھے انداز میں بتا رہی تھی۔ ربیعہ آنکھیں موندے سنتی رہی۔  
 ”کیا بات ہے ربیعہ۔ تمہارا بلڈ پریشر آخر اتنا کیسے ہو گیا؟ کیا تم نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے؟ یا۔۔۔ یا۔۔۔ تم نے

بست زیادہ ٹینشن لی ہے؟ کیا بات ہے مجھے تو تاؤ۔

ربیعہ کی بند پلوں سے ایک قطرہ نکل کر اس کی کپٹی سے ہوتا ہوا اس کے بالوں میں کہیں گم ہو گیا۔ اس ہونٹ دھیرے دھیرے کانپنے لگے۔ وہ شاید خود بہت ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ترانہ اس کا ہاتھ ہولے تھپکتے ہوئے پرسوج انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

\*\*\*

”مجھے پتا تھا۔۔۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا ای! جس دن میں نے اس جڑیل کا یہ سفید چہرہ دیکھا تھا“ اسی دن میرے میں ایک سوئی سی کھب گئی تھی۔ آخر وہی ہوانا جس کا مجھے ڈر تھا۔۔۔ ہوانا وہی؟“ صولت فریاد کناب تھی۔

”چل اب بند کر اپنی بکواس۔ کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑا تیرے سر پر۔“ مینا بیگم کی تند آواز آئی۔ دودھ کا پیالہ ربیعہ کی انگلیوں میں کنب کر رہ گیا۔ اس نے سامنے بیٹھی ہوئی ترانہ پر ایک تھکی تھکی سی نگاہ ڈالی۔ ترانہ نے اس کی نظریں محسوس کیں لیکن اس نے نگاہ اٹھا کر ربیعہ کو نہیں دیکھا۔ دودھ کی پوٹل کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی لگی تھی۔

”اور کیسے ٹوٹا ہے آسمان؟ وہ ڈائن میرا کلیجہ نوچ کر لے گئی اور۔۔۔ کتنی ہیں کس۔۔۔“ شہناز کی وجہ سے صولت کی آواز بیٹھ گئی۔ اس سے بولا نہ گیا۔

”نہ مہم نہ مہم ہو جائے گا سب کچھ ٹھیک۔۔۔“ مینا بیگم قد کے آگے آگے سے بولیں۔ ”ادھا کام تو نیٹ ہے اپنی ادھا بھی نیٹ جائے گا۔“

”کیسے۔۔۔ کیسے ہو گا سب کچھ؟ وہ تو کہتا ہے صرف اسی جہنم جلی سے شادی کرے گا۔“

”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے صولت! ہم بیٹھے ہیں تم لوگوں کے سروں پر۔ اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مینا بیگم اب کی بار قدرے سہولت سے بولیں۔

”شادی کر کے بھی تو اسی کا دم بھرے گا نا۔۔۔ مجھے کب پوچھے گا۔۔۔ مجھ سے تو دل بھر گیا اس کا۔۔۔ اب توئی ہواؤں میں اڑنا چاہتا ہے۔ یہ دن رات سامنے رہے گی تو۔“

”مر جا کیٹی!“ مینا بیگم اب یکایک درشت ہو گئیں۔ ”پھر کھالے زہر۔۔۔ یہاں ہم پہلے ہی پریشان بیٹھے ہیں تجھے ماتم سوچ رہے ہیں۔ کہہ جو دیا سب ٹھیک ہو جائے گا پھر۔۔۔“

صولت غالباً ”ماں کے جارحانہ تیور دیکھ کر سہم گئی پھر اس کی سسکیاں بھی اچانک ہی کھم گئیں۔ ترانہ ہونٹ چبانے لگی تھی۔ ربیعہ کو نبھانے کیوں ترانہ سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ اس نے جلدی سے ہلڈی ملا دودھ کا پیالہ لبوں سے لگالیا۔

\*\*\*

”سوٹ کا کلر ہاشم سے پوچھ لیتا جا۔۔۔“ رُجوش ہوتی ایقان فردوس بیگم سے کہہ بیٹھی پھر فوراً ”ہی ٹھنڈی پڑ گئی۔ انہوں نے از حد بد مزگی سے تھوک نگلا تھا۔

”جی پیچھو۔۔۔ زبردست آئیڈیا پیش کیا ہے آپ نے۔“ رافع اندر چلا آیا تھا۔ ”دو لہامیاں کا سوا سیر خون برہہ جائے گا اس استفسار پر۔ گاؤں پر گلال بھر جائے گا۔ آنکھوں میں ایسی قندیلیں روشن ہوں گی کہ شادی میں لائننگ وغیرہ کی قطعاً کوئی ضرورت نہ پڑے گی اور چشم تصور سے وہ شہلا بھا بھی کووہ رنگ پہنا دیکھیں گے تو۔“

وامس۔۔۔ وامس۔۔۔ ان کا اپنا چہرہ دیکھنے۔۔۔ دیکھنے۔۔۔ والا۔۔۔ میرا مطلب ہے ”آہم!“

تب ہی اس کی نظر بھی اپنا جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی فردوس بیگم کے خون آشام تاثرات اور ایقان کی جنبشی نظروں پر پڑ گئی تھی۔

”کب آئیں پیچھو آپ!“ وہ یکایک ہی موضوع بدل کر خوش گواری سے یوں بولا جیسے چند لمحوں قبل وہ کچھ کہہ ہی نہ رہا تھا۔

”میں۔۔۔“ ایقان سے مسکراہٹ ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ ”میں۔۔۔ بس۔۔۔ ابھی۔۔۔ بھابھی بیگم کا فون آیا تھا کہ ہاشم کی بری کی تیاری کرنا ہے۔۔۔ چند ایک روز کے لیے آگئی ہوں۔ میں رائنہ اور وردہ مل کر شاپنگ کر لیں گے۔“

”اور ہم۔۔۔ ہم کیا کریں؟“ فاطمہ جوش سے کہتے ہوئے آہٹکی تھی۔

”تم ڈھولک بجاؤ۔۔۔ گانے گاؤ۔۔۔ اب دن ہی کتنے ہیں شادی میں۔۔۔ کتنی کے بیچتیس دن ہیں۔۔۔ کتنے سال بعد اس گھر میں خوشی کا ایسا موقع آیا ہے۔ جم کر منائیں گے۔“

رافع بے حد خوش نظر آتا تھا۔ چوری چوری اس نے اپنی بات کا رد عمل فردوس بیگم کے چہرے پر دھونڈنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بہ مشابہ آہ کے بھری اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ہاں رافع میاں! کتنے توچ ہی ہو۔“ وہ جاتے جاتے بولی تھیں۔ ”اچھا ایقان! پھریوں کرو بازار جانے سے پہلے شہر میاں سے بچھو علاج کر ہی لینا۔“

”مجھے کتنے درد موں سے چلتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ رافع اور ایقان نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ جب کہ فاطمہ چہرے سے ہی رُجوش لگنے لگی تھی۔

\*\*\*

”ہاشم کرے۔۔۔ داخل۔۔۔ تو وہ انگلیوں پر کچھ گھٹنے میں مصروف تھی۔ ہاشم دروازے پر ہی رک گیا اور مسکراتی نظر ڈال کر ارادہ لطف اٹھانے لگا۔ اس کی گنتی میں بار بار گڑبڑ ہو رہی تھی۔ یکایک جھنجھلا کر اس نے نگاہ اٹھائی تو سامنے کھڑے کھڑے۔۔۔“

”ہاں کب کھڑے ہوئے اندر آؤ۔“ ہاشم کے چہرے پر ہنوز دلچسپ و شریری مسکراہٹ تھی۔

”نہیں۔۔۔ نہ تو۔۔۔“ رافع بالکل تھک چکا تھا۔ ”ایقان نے اسے چھیڑا۔ ہاشم کو اُسی آگئی۔

”رافع بالکل تھک چکا ہے رپورٹنگ کر رہا تھا تمہاری۔ اب مجھے اس کی رپورٹ درست ہونے میں کوئی شک نہیں رہا۔“ ایقان نے اس کا کان پکڑ لیا۔ ”شادی میں ہمیں گھر پر قہقہے لگوانے کی ضرورت بالکل نہ ہوگی، تمہیں چیمت پر کھڑا کر دیا جائے گا۔ دو تمہاری آنکھیں اور ہمیں تمہارے دانت پورے چوٹیں بلب روشن ہوں گے۔“

”میرا کان چھوڑیں اور اپنی گنتی پوری کر لیں۔“ وہ ہنسا۔ ”ایک آدھ دن کہیں بس نہ ہو جائے۔ بائے راوے“

”کس دن شریف لارے ہیں پھوپھا موصوف؟“

”تمہارے منہ میں کھی شکر۔“ ایقان نے اس کا کان چھوڑ کر گہری سانس بھری۔ ”ابھی تک تو وہاں سے ایسی کوئی خبر نہیں آئی۔“

”پھر یہ کون سے واسطے پڑ رہی تھیں آپ؟ میرا مطلب ہے کیا گن رہی تھیں۔ عاشر۔۔۔ عاشر کا وظیفہ تو نہیں بتا دیا کسی ”بابے“ نے؟“

”چار سو بیس؟ یعنی یا بے وغیرہ؟“

”جی نہیں تمہارے بھوپیا موصوف“ وہ جلی بیٹھی تھی۔

”تجھے تجھے تجھے۔ بہت افسوس کی بات ہے دیر پھوپھو! آپ کی محبت سے مجھے اس ”جلی کئی“ کی امید تھی۔“

”محبت نام ہی ”جتنے“ اور ”دکھنے“ کا ہے ڈیر بیٹیجے! تمہیں تو خوب خوب تجربہ ہے۔“

”بجای فرمایا لیکن ہم نے کبھی ڈاکٹر صاحبہ یعنی آپ کی دوست موصوفہ کو اس طرح نمبر سے یاد نہیں کیا۔“ ایقان ہنسنے لگی۔

”تمہیں زیب بھی نہیں رہتا کہ تم میری پیاری سی دوست کو اس نمبر سے یاد کرو۔ یہ تو تمہارے پھوپھا جیسے مرزوت لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔ آج پورا آنکھواں دن ہے پلٹ کر خبر نہیں لی کہ بیوی! جیتی ہو یا مری ہو۔ خیر میری بلا سے۔ یعنی میری جوتی سے۔ میں بھی کون سی پروا کر رہی ہوں۔ خوشی خوشی تمہاری کھانسی کے تیار یوں میں مصروف ہوں۔“

”سچ کہا۔“ اس نے شرارت سے سر ہلایا۔ ”۲۰ گلیوں پر نجانے کتنے سا اسم پڑھ رہی ہیں ابھی آپ کو یوں آپ کو کیا پروا۔“

”چنانچہ شیش کیا بات ہے عاشق!“ وہ اچانک ہی سنجیدہ ہوئی۔ ”میرا دل اچانک ہی گھبرانے لگتا ہے جب عاشق مجھ سے یوں غفلت برتنے لگے تو میرا کسی چیز میں نہ دل لگتا ہے نہ دعیان لگتا ہے۔ نجانے کب پوری ہوگی یہ سزا کی مدت۔“

ہاشم نے چند لمحے بغور اس کا چہرہ دیکھا، کچھ سوچا پھر کہا: ایک سو دو لہجہ بدیل کر بولا۔

”یارِ سہمیو! سنا ہے آپ ڈاکٹر صاحبہ کا ویڈیونگ ڈریس لے کر جا رہی ہیں۔“ ابقان جو کسی خیالی میں نہ تھی۔

”آل۔ ہاں۔ بھابھ بھی جیم نے اسی لیے تو بلوایا ہے مجھے۔“

”تو پھر ایسا لباس لے آئیں جس میں دھنک کے سب ہی رنگ ہوں۔“

”ہائیں۔“ اقبال نے برا سامنہ بنایا۔ ”یہ تمہیں نیکنی کلر دے لیں۔“ اقبال نے کہا۔ ”یہ تمہیں نیکنی کلر دے لیں۔“ اقبال نے کہا۔ ”یہ تمہیں نیکنی کلر دے لیں۔“ اقبال نے کہا۔

”بائے چھینوس۔ اب میں آپ سے کیا چھپاؤں۔ جو رنگ بھی سوچتا ہوں، اس میں ڈاکٹر صاحب کا تصور ایسا عملاتا ہے کہ باقی سب ہی رنگ اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں پھر اچانک ہی ڈاکٹر صاحب کسی اور رنگ میں نمودار ہوتی ہیں تو بس پھر ہر سو وہی رنگ چھا جاتا ہے۔ ایسے میں کسی ایک رنگ کا انتخاب تو بہت مشکل ہے نا اسی لیے یہ مکنی فکر والی ترکیب اچھی ہے۔ ذرا ذرا سا کپڑا، ہر رنگ کا لے لیں، پورا لباس تیار ہو جائے گا۔ کیا خیالی ہے؟“

اب اگر تم مذاق بھی کر رہے ہو تو میں ضرور تمہارے ساتھ ہی کرنے والا ہوں۔“

مذاق ہے؟ میں حد درجہ سنجیدہ ہوں پچھو!

بس تو مجھے لو کہ مہاری دلہن کے عروسی لباس میں ایک سو ایک رنگ ہوں گے۔“

اوریں ایک دیر یا آباد کردی اپنے لیے تو یہ لیا خود بصورت جملہ بولا ہے۔

ایقان ہنس ہنس کر دھری ہو گئی پھر اس نے ہاتھ کو ایک دھپ لگائی۔  
 ”اور بے چاری ڈاکٹر صاحبہ کا کیا قصور ہے جو اس کو ایسی عالی شان  
 میری اکلوتی اویس اور سہ“ ایقان کی ہنسی کسی طور نہ ختم رہی تھی۔  
 ”شہا پاش ہاتھ میاں۔“ ہاتھ نے چشم تصویر سے خود کو ہٹکی وی۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“

ربیعہ نے نظر اٹھا کر فرمایا: تم دن سامنے کھڑا تھا۔ ربیعہ نے سر جھکا لیا۔

ربیعہ نے محسوس کیا کہ نرم لہجے اور نرم بات کے پس پردہ ایک نامحسوس سی تپش تھی جیسے وہ کوئی خاص بات محسوس کر کے یہ سب کچھ کہہ رہا ہو۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر تہن کو دیکھا۔ وہی نامحسوس سی تپش اس کی نگاہوں میں بھی تھی۔

”یاد تو کچھ سمجھی نہیں ہے تمدن بھائی!“ وہ رسائی سے بولی۔ ”ترانہ چار ہی تھی کہ میرا بلڈ پریشر بہت زیادہ ہو گیا۔“

۱۔ دیکھیں صاحب! کوئی اور چکر و کرچلا رکھا ہو تو اب بھول جاؤ اسے۔ ”وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا تھا۔ ربیعہ

”جیسا کہ اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔“

تھمارے حقیقت یہی گھر ہے۔ اس حقیقت کو دل سے قبول کر لو گی تو تمہارا بلڈ پریشر پھر لو نہیں

کے لیے ایک بار جانے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ایسی مسکراہٹ ربیعہ اکثر منور امین کے

ابوں پر تو خدا کا عذاب ہے اس کی ماں کے متعلق کوئی بات کیا کرتے تھے۔ ربیعہ کھلی آنکھوں سے

سندھ کو منظورائیں میں کو منظورائیں کے پھر منظورائیں سببیں ہو مادی کی رائی پھر منظورائیں اپنی اسسٹ ماسٹر کے سر کے

مشکلات معمولی کی ترتیب کے حوالے

کھانا پکانے کی مزیدار

## ترکیبوں کے

رنگارنگ کتاب

مکھوئے کا پتہ : ۳۷، آندو بازار کراچی

# خاتون کا دسترنخواست

## شامیر ہو گئی



ربیعہ کے کانوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے اس کا وجود کسی بہت پرانی عمارت کا کھنڈر ہو۔

\*\*\*

”میرا خیال ہے۔ سنہری۔ راسلک کا کرتا۔ شیروانی کالر کے ساتھ۔ اس پر ڈل گولڈن امیر انڈری۔ کیوں علی؟“ حمزہ نے گھٹلاگ پر سے نظر اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔

”صدقے جاؤں۔“ اس نے دانت نکالے۔ ”دستار بندی میرا مطلب ہے سہرا بندی کی رسم آپ کی سرانجام نہیں پار رہی۔“

”نہ ہی آپ کا سہرا لکھا جا رہا ہے۔“ نافع اسے مزید بلبوسات دیں۔

”رسم نکاح میں آپ کا نام ہرگز نہیں پکارا جائے گا۔“ علی نے ٹکڑا جوڑا۔

”کوئی کمٹنگ مشین کچر بلی فی الحال نہیں ہے۔“ نافع مزید بولا۔

”تو پھر یہ گولڈن کرتا؟“ علی ہنسنا۔

”ڈل گولڈن امیر انڈری؟“

”قسم خدا کی۔“ حمزہ نے دانت چکچکائے۔ ”تم میرے بھائی۔ اور میرے ہونے والے دو لہا بھائی نکلتے تو اس وقت دونوں اپنا اپنا سر پکڑے بیٹھ جاتے۔“ نافع نے دھونڈ کر دیکھا۔ ”اپنے آئیڈیاز پیش کر رہے ہوں اور تم دونوں مل کر میرے آئیڈیاز کی دجیاں نکھیر رہے ہو۔ تم دونوں کیا چاہتے ہو؟ کیا میں اپنے بھائی کی شادی کوئی دھوئی وغیرہ پیسٹ کرائینڈ کر لوں؟ کسی چیز پر ہاں ہی نہیں بھرتے رہتے وہ پھر ایک جیسے کپڑے بنوانے کا خیال میں اپنی ڈربنگ علیحدہ ہی کر لوں گا۔“

”اپنے دھنسنے میں پیش کیے جانے والے سارے آئیڈیاز پر نظر ثانی کرو۔“ نافع نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”کیسے کیسے فضول خیالات پیش کر کے تم نے ہم دونوں کا وقت ضائع کیا ہے۔ غور کرو کیوں علی؟“

”صدقے جاؤں۔ میرے دل کی بات کہہ دی دو لہا بھائی آپ نے اس کے بتائے ہوئے تمام بلبوسات میں صرف یہ لاسٹ والا آئیڈیاز قابل عمل ہو سکتا ہے۔“

”راسلک کا کرتا؟“ حمزہ جلدی سے بولا۔

”نہیں یا رہیہ دھوتی والا۔ وہ بھی صرف تمہارے لیے۔“

”حمزہ اپنے آس پاس کوئی ایسی چیز ڈھونڈنے لگا جسے وہ علی کے سر پر مار سکے۔ علی اس کا ارادہ بھانپ کر اچھل کر بیٹھ گیا۔

”بھئی اب میری بات سنو۔“ نافع اس کا جارحانہ انداز بھانپ کر جلدی سے بولا۔ ”اب میں ایک آئیڈیاز پیش کر رہا ہوں۔ یہ کرتے یہ کڑھائیاں وغیرہ بعد میں کام نہیں آتیں۔ کچھ ایسا بنواؤ جو بعد میں بھی کام آئے۔“

”مثلاً“ ”بعد“ کی وضاحت بھی کر دو۔“ حمزہ نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

”میرا مطلب ہے سوٹ۔ ٹوپیں۔“ اس نے وضاحت کی۔

”اور بعد میں وہی سوٹ تمہاری رسم ہندی میں بھی چل جائے گا۔ ہے نا؟“ حمزہ جل کر بولا۔

”بھئی۔ تم دونوں کی مرضی ہے۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”میں تو اس دن سفید کرتا شلواری پہنوں گا۔“ وہ مزے سے بولا تھا۔

”دیکھ لیں گے تیرے کرتے کو سچے رنگین نہ کر دیا تو سالانہ کہنا۔“ حمزہ نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

”پھر اس دو سو روپے کی کیٹلاگ کا کیا ہو گا؟“ اچانک علی نے وہائی دی۔ ”یہ کیوں خریدی گئی؟“ یہ رقم چونک۔

اس کی جیب سے ادا کی گئی تھی اس لیے ورداسی کے دل میں اٹھا تھا۔

”بھئی یہ فضول خرچی کیوں کروائی گئی؟ اس سے تو اچھا تھا میں اپنی موٹر بائیک میں اتنے روپوں کا پیٹرول ہی ڈلوالیتا۔ وہ غریب بھی کیا سوچتی ہوگی۔ کیا قسمت پائی ہے اس نے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ نافع نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”وہ بڑی منکسر المزاج قسم کی موٹر بائیک ہے اور پھر ایسی نیک اور منقح ہر وقت حالت صوم میں ہوتی ہے۔ وہ غریب کیا سوچتی ہے؟“

”بیوی ڈھونڈنے لگا تو اپنی بائیک کی تمام خصوصیات ذہن میں رکھنا۔“ حمزہ نے بھی اگلے پچھلے ادھار اتارنے کی ٹھانی۔ ”صاحب جو شکر گزار۔ تھوڑے کو ہی بہت سمجھنے والی۔“ علی ویدے گھما گھما کر باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”ایک لباس میں زندگی بتادی غریب نے۔“ نافع مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔ ”آج تک سیٹ کو تبدیل ہونے کی نوبت نہ آئی۔“

”لیکن یا۔۔۔ بیوی کچھ صفائی پسند ہو، کبھی کبھی نہاد ہو بھی لیتی ہو۔ اس بائیک کے مکھڑے پر تو ہر وقت کچھ بڑے نشانی ملتے ہیں۔“

”ہند کرواؤ۔“ ”بالآخر علی کا صبر جواب دے گیا۔ ”اس کیٹلاگ کا سو روپیہ تم بھرو اور سو تم۔“ اس نے باری باری کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم دونوں کے پر زور اصرار پر ہی میں نے یہ خریدی تھی۔ کیا کہہ رہے تھے نافع تم؟“ گہری پہلی پہلی تقریب ہے، بہت اعلیٰ ڈیزائن کے لباس تیار کروائیں گے اور اب۔؟“

”اب۔۔۔ یہ عیش اور مکیش کی ڈیزائننگ اپنی سمجھ سے تو باہر ہے۔ اچھے بھلے کرتے کا گریبان تک آتا ہے۔“ شیروانی ہے اور آستین عاتب دو لہا میاں کھڑے مسکرا رہے ہیں گہری اور نچر سانی

”اب۔۔۔“ ”میرا آئیڈیاز۔“ ”نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا آئیڈیاز۔“ ”نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا آئیڈیاز۔“ ”نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا آئیڈیاز۔“ ”نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا آئیڈیاز۔“ ”نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا آئیڈیاز۔“ ”نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا آئیڈیاز۔“ ”نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا آئیڈیاز۔“ ”نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا آئیڈیاز۔“ ”نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”نتیجہ ناراض ہو مجھ سے؟ کوئی۔۔۔ کوئی۔۔۔ غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟“ عریشہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر اجنبیت اور آنکھوں میں ایسا گہرا دکھ تھا کہ نافع اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر پلٹ کر اوپر چڑھتی چلی گئی تھی۔ نافع گہری سوچ میں گم تھا۔



”مما! یہ سب کس کے کپڑے ہیں؟“ وہ آنکھوں میں حیرانی کے سبب ہی رنگ بھرے رنگے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔ انیقہ مسکرا دی۔

”یہ سب کپڑے آپ کی ممما کے ہیں۔“ اس نے عمر کو بانموں میں بھرا۔

”اتنے پیارے کپڑے۔۔۔ چمکیلے۔۔۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”میں نے کبھی ممما کو اتنے اچھے اچھے کپڑے پہنے نہیں دیکھا۔ میری ممما کیا دلہن بنیں گی؟“

شہلا کے چہرے پر سنجیدگی بھی لیکن منیوہ بیگم اور انیقہ مسکرا دیں۔

”ہاں عمر! آپ کی ممما دلہن بنیں گی بہت خوبصورت لگیں گی۔“ انیقہ نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا تھا۔

”اور دولہا؟“ اگلا سوال برق رفتاری سے آیا تھا۔

”دولہا۔۔۔“ ابھی انیقہ کی بات اس کے لبوں میں ہی تھی کہ عمر نے اچکلی۔

”دولہا تو میرے پڑا ہوں گے۔ ممما! دلہن تو کیا دولہا۔۔۔ سے نا ممما!“ اس نے تالیاں بجائیں۔ شہلا کے چہرے نے لمحہ بھر میں ہزار رنگ بدلے تھے۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر گئی۔ منیوہ بیگم نے تأسف سے اسے جاتا ہوا دیکھا۔ انیقہ نے زچہ ہو کر عمر کو دیکھا تھا۔

”تمہاری یہ دو آنکھ کی زبان قابو میں نہیں رہتی تمہارے؟“ وہ چڑخوولی۔

”میں نے کیا کہا ہے ناؤ؟“ وہ حیران ہوا۔ ”خالہ جانی تو مجھ سے لڑتی ہی رہتی ہیں۔ ان کو تو میں بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔“

اس کی معصوم آنکھوں میں پانی اترتا دیکھ کر انیقہ سب کچھ بھول بیٹھا۔ اس نے چٹا پٹ اس کے گالوں کے کتنے ہی بوسے لے لیے۔

”آپ تو خالہ جانی کی جان ہیں۔“ وہ بھال کر بیٹھا۔

”کوئی نہیں لگتا۔“ وہ منہ پھلا کر بیٹھا تھا۔ ”ابھی آپ نے مجھے ڈانٹا ہے۔“

”نہیں جاندا! میں نے آپ کو نہیں ڈانٹا۔“

”مما بھی یہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ انہیں بھی میری باتیں بری لگیں“ اسی لیے اب میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔“ وہ مزید روٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آپ کی ممما نے کتنی بار آپ سے کہا ہے عمر کہ ان کے سامنے اپنے پیاز کا زکرم مت کیا کرو۔“ انیقہ نے اسے ہلکے ہلکے انداز میں سمجھانا چاہا۔ ”پھر بھی آپ۔۔۔!“

”کیوں نہ میں پیاز کا ذکر کروں؟“ وہ اکڑا۔ ”وہ ممما کے کچھ بھی نہیں ہیں مگر میرے تو پیاز ہیں، مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں ضرور ان کا نام لوں گا۔ پیاز۔ پیاز۔ پیاز۔ اور بھی لوں گا۔ پیاز۔ پیاز۔ پیاز۔ آپ کو بھی میرے پیاز برے لگتے ہیں ناؤ؟“

اسے لڑائی کے دوران اچانک ہی منیوہ بیگم کا خیال آگیا۔ اس نے از حد معصومیت سے سب کچھ بھول بھال کر پوچھا تھا۔

منیزہ بیگم اور انبیقہ بے اختیار ہی اس کے بھول پین پر مسکرا دی تھیں۔

”نہیں بیٹا! وہ کسی کو برے نہیں لگتے۔“ منیزہ بیگم نے اسے گود میں بٹھالیا۔ ”وہ آپ کے ابو ہیں۔ وہ آپ اچھے لگتے ہیں تو ہم سب کو اچھے لگتے ہیں۔“

”پھر آپ لوگ انہیں دولہا کیوں نہیں بناتے۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ میری ماما کے دولہا بس میرے چاہنے والے ہیں۔“

منیزہ بیگم ہونٹ سی ہو کر انبیقہ کو دیکھنے لگیں۔ نواسے کا یہ انداز ان کے لیے نیا اور بے حد حیران کن تھا۔ انبیقہ نے ہاں کی گھبراہٹ ہوئی صورت دیکھی تو جھٹ کھڑی ہوئی اور عمر کو گود میں اٹھالیا۔

”بچہ لان میں چل کر کھیلیں۔ وہاں میں آپ کو ساری بات بتاؤں گی۔“ وہ اسے چومتے ہوئے وہاں سے چل دی۔

منیزہ بیگم اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے جوڑوں کو ترتیب سے رکھنے لگیں۔ وہ اور انبیقہ ابھی ابھی شہلا کی شادی کے لیے خریداری کر کے لوٹی تھیں اور شہلا کو کپڑے دکھا رہی تھیں۔ عمر کے غیر متوقع۔ تانے ماحول رنگ ہی بدل ڈالا تھا۔

”ہاں بھئی! اب بتاؤ۔“ اس نے عمر کو میڑھیوں پر بٹھایا اور خود اس کے برہنہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”یہ کیا چکر ہے؟“

”کون سا چکر؟“ اس نے ابھ کر خالہ کی صورت دیکھی۔ ”آپ تو مجھے اپنے ساتھ کھینے کے لیے لائی تھیں۔“

”پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاپا تمہیں دن میں کتنی ہر تیرہ فون کرتے ہیں۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں پوچھنے لگی۔

”کیوں بتاؤں؟“ وہ بگڑا۔ ”پاپا نے منع کیا ہے۔“

”اوہ۔“ انبیقہ کو گڑبڑ کا احساس ستانے لگا۔ ”لیکن ہم تو اب آپ کو منع نہیں کرتے بات کرنے سے پھر پاپا نے منع کیوں کیا؟“

”وہ کہتے ہیں کہ خالہ جانی اور نانا کو بالکل نہیں بتانا کہ ہم باپ بیٹا کیا باتیں کرتے ہیں۔“ وہ مزے سے ٹانگیں ہلانے لگا۔ ”اسی لیے آپ کو تو بالکل نہیں بتاؤں گا۔“

”اچھا۔“ انبیقہ نے بے اختیار ہی اس کی صورت دیکھی۔ ”اور تو بتاؤ۔“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے پر زور انداز میں سر ہلایا۔ ”وہ تو کہتے ہیں اپنی ماما سے میری باتیں کیا کرو، انہیں ماما بہت پسند ہیں۔ ماما ان کی دلہن جو ہیں۔“

انبیقہ کو دم گھٹنے کا احساس ہوا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور میڑھیاں اتر کر لان میں چلی گئی۔ عمر بھاگتا ہوا اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ پھر وہ پیچھے سے آکر اس سے لپٹ گیا۔

”آپ ناراض نہ ہوں خالہ جانی! میں پیپا سے پریشانی لے لوں پھر آپ کو بھی سب بتایا کروں گا۔“

”یہ۔۔۔ دولہا اور دلہن۔۔۔ کی باتیں تمہارے پاپا کرتے ہیں عمر؟“ اس کی آواز جیسے کسی کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔

”ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ آپ کو کیوں بتاؤں؟“

انبیقہ بری طرح سے اچھی۔ اس نے پلٹ کر اسے برہمی سے دیکھا پھر فوراً ہی اپنا انداز بدل لیا۔ اس بچے کا اس سارے معاملے میں رتی بھر قصور نہ تھا۔ وہ جھک کر اسے چومنے لگی۔

\*\*\*

”سچ رائے آتی اور وہ آپ نے تو مجھے سخت بور کر دیا ہے۔ کیا تھا اگر یہ آپ سے بڑی ہو تیں یا پھر ان کی شادی پہلے ہو جاتی تو۔۔۔ حالات حاضریہ پر گفتگو تو انہیں بالکل پسند نہیں۔ کرنٹ افینڈز کی بات کرو تو یہ کرنٹ مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ کہیں سے اڑتی اڑتی کوئی سن کر نکلے آو تو یہ اس ”اڑتی“ کے سارے پر کاٹ کر بندے کے ہاتھ میں تھما دیتی ہیں کہ لو! اب جی بھر کر شرمندہ ہو لو۔ قسم خدا کی گفتگو کا مزہ عارت کر دیتی ہیں۔ اچھا ہوا جو آپ آگئیں۔ میں تو سخت بور ہو گئی تھی ان کے ساتھ رہ رہ کر۔“

ناعمہ پیاز بھی کاٹ رہی تھی اور فل والیوم میں کنٹری بھی نشر کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپا رہے تھے لیکن اسے مطلق پروا نہ تھی۔ کبھی کبھار وہ چھری والے ہاتھ کی پشت دونوں گالوں پر پھیر لیتی۔ رائے اپنی اہمیت پر نازاں اور فرحان نظر آتی تھی۔ وہ بہت دل چسپی سے ناعمہ کی فضول گویاں سن رہی تھی۔

”اچھا پھر تم نے بتایا نہیں۔ وہ منگنی والے دن کے بعد عریشہ سے جو ملاقات ہوئی تھی تمہاری؟ ایک تو ہر بات ادھوری۔ گورڈ کر تم کوئی دوسری بات شروع کر دیتی ہو۔ تمہاری یہ عادت مجھے سخت ناپسند ہے۔“

”پھر پورے تھی آپ کو۔ کہ وہ آپ سے سخت ڈانٹ پڑی تھی پھر وہ آپ کی بات چل نکلی۔ ہاں تو پیپا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ زیادہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟“ رائے کا تجسس اپنے عروج پر تھا۔

”نہیں خیر۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ایسی بات ہوتی تو کیا مجھے علم نہ ہوتا؟ میں تو اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ بس چھ سال ازم کا چکر ہے۔ عریشہ اپنے آپ کو ”کچھ“ سمجھتی ہے۔ ناس۔ تو اس کے معیار پر نافع شہلا پورا نہیں۔“

”پاپا نے۔“ رائے نے سر کا سر سمجھ داری سے ہلایا۔ ”مجھے بھی شک تو ہوا تھا اس کا بچھا بچھا سا چروہ دیکھ کر۔ اچھا پھر۔۔۔ تم یہ بات کہہ رہے ہو کہ وہ بے وجہ باتیں نہیں کی۔“

”لیس جی! مجھے پتہ نہیں ہے۔“ رائے نے پوچھا۔ ”میں کوئی بی جھالو ہوں۔ میں نے تو ممانی والی بات بھی کسی سے نہیں کہی۔“

”پاپا نے۔“ رائے نے کمال پھری سے رو کر اور چھری ایک طرف رکھ کر آئینل پورے منہ پر مسلا۔

”ہاں۔۔۔ بالکل جی نہیں کہی تم نے کسی سے اور مجھے تو بالکل پتا نہیں ہے کہ کیا بات ہوئی۔“ دروازے پر درون کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

ناعمہ کی آدمی جان خشک ہو گئی۔ اس نے تھوک نکل کر رائے سے مکمل چاہی۔

”ارے لو۔ بڑی بہن ہوں اس کی اور تمہاری بھی۔ کوئی بڑوسن تو نہیں ہوں جس سے تم لوگ پروہ داری برتو۔“ رائے جی بھر کر خفا ہوئی۔ ”مجھ سے اپنے دل کی باتیں نہیں کہے سنے گی تو پھر کس سے کرے گی۔“

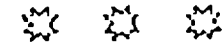
”یہ بات نہیں ہے ایپا!“ درون اندر چلی آئی۔ ”یہ بات میں اس کو پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ عریشہ والے معاملے میں اس کا یوں اچھٹا مناسب نہیں ہے۔ خدا نخواستہ کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ساری برائی اس کے گلے میں آئے گی۔ یہ سمجھتی ہی نہیں ہے۔“

”تم تو درون سے ذرا اسی باتوں کو بہت گہرائی میں جا کر سوچتی ہو بھلا اونچ نیچ کیا ہوتی ہے؟“ رائے بے پروائی سے بولی۔ ”اور ہم کون سا اصول تاشے پیٹ رہے ہیں۔ آپس میں ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے ہیں نا۔!“

درد نے افسوس سے سر ہلایا۔ اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔  
 ”تم نے سبویہ کو کسٹرو کھلا دیا؟“ رائے نے بات بدلی۔  
 ”جی ہاں اسے ای کے پاس سلا دیا ہے میں نے۔“

”اچھا یہ لیں۔“ رائے نے پیاز کی ٹوکری اس کی جانب بڑھائی۔ ”برائی کی پیاز بھی میں نے کاٹ دی ہے گوشت بھی دھو کر فریج میں رکھ دیا ہے۔ برائی بنانا آپ کا خاص الخاص ڈیپارٹمنٹ ہے۔“  
 ”یوں کہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں تاکہ تم گفتگو کا ٹوٹا سیراجوڑ سکو۔“ وہ مسکرائی۔ ”چلو ٹھیک ہے میں جارہی ہوں۔“ پھر وہ ٹوکری تھام کر کمرے سے نکل گئی۔

”ہاں۔ اب بتاؤ!“ رائے نے پیر پھیلائے۔ ”یہ ممانی جان کا قصہ کیا ہے؟“  
 ”ہو ایوں کہ ایک دن عریشہ سے ملنے گئی۔“ رائے مزے سے شروع ہوئی تھی۔



صورت نے رو رو کر آنکھیں سجائی تھیں۔ مینا بیگم سخت برہم تھیں، لیکن یہ انداز نہ ہو۔ دراصل ان کی برہمی کی وجہ کیا ہے؟ شاید وہ خود بھی اس حقیقت سے ناواقف تھیں۔ ربیعہ سے پرہیز ہونے اور اس پر غصہ اتارنے سے وہی الحال احتراز برت رہی تھیں کیونکہ ربیعہ کی اپنی خاص زبان خود بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ صورت کے انداز انہیں غصہ دلا رہے تھے لیکن ان کی اکابر کی کوئی اور چیز ان کی محبت و چاہے کا واحد مرکز تھی۔ سو اس پر اٹھتا غصہ بھی وہ اپنے اندر دبا لے کر مجبور تھیں۔ ترانہ تو کئی دن سے مہرہ بلب لگی ہوئی الحال تو ہر طرح کی پریشانی کا عنوان تصور تھا جو تین دن سے گھبراہٹ لٹا تھا۔  
 صورت سے شادی سے علی الاعلان انکار کر کے وہ گھر سے چلا گیا تھا۔ اور اب تین دن سے اس کا کچھ اتنا پتا نہ تھا۔ صورت نے محبوب کی جدائی کو اذہل دل پر لیا تھا۔ اور وہ نہ صرف مدہم ہو رہی تھی بلکہ کھانے پینے سے بھی گریزاں تھی۔

اسے وہ کہہ کر ربیعہ پر غصہ اتارنے کا جوش چڑھتا تھا اور وہ جو منہ میں آتا سو کہنے لگتی تھی۔ شروع شروع میں مینا بیگم نے اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کی پھر وہ بھی بارمان کر چپ ہو گئی تھیں۔  
 ربیعہ کو اس وقت آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔ لیکن اس کے آواز باہر اس کے اعصاب جھنجھوڑ دیتی۔ صورت اسے کوستی، منحوس قرار دیتی تھی اس لیے اس نے اندر سے اندر اپنی پھر تھک بار کر چپ ہو جاتی۔ کچھ دیر کے بعد اسے پھر نئے سرے سے جوش چڑھ جاتا۔  
 ”میں کتنی ہوں امی۔ نکال باہر کریں اس جیل کو یہاں سے۔ اس کے یہاں ہونے سے میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ آگے چل رہے ہیں آگے۔ بار بار مجھے خیال آتا ہے کہ جانے کس وقت میں اس نے کیا منتر پڑھ کر بہو کا تصور پرستہ تو ایسا نہ تھا۔ ہائے میری قسمت۔“

”کیا بات ہے۔ کیا کہو اس ہے یہ؟“ گھر میں یکایک تمدن کی ترش آواز گونجی تھی۔  
 ”جس وقت گھر میں داخل ہو تمہارے کی بی بی سننے کو ملتے ہیں۔ کیا تکلیف ہے تمہیں؟ مرنے نہیں گیا دھس۔ پڑا ہو گا اپنے کسی یار کے گھر منہ چھپائے۔ چار دن اور گزریں گے۔ بے غیرتی سے چلا آئے گا۔“  
 صورت پھر خاموش ہو گئی تھی۔ اسے خاموش ہونے کے لیے ایسے ہی کسی ہیوی ڈوز کی ضرورت پڑتی تھی۔  
 ”پتا تو کیا ہو تا تمدن!“ مینا بیگم قدرے سہولت سے بولیں۔ ”غصے میں گھر سے گیا ہے۔ جوان خون ہے کچھ ایسا ایسا نہ کر بیٹھے۔“

”بابا بابا۔۔۔“ تمدن کو یہ بات کافی پر مزاح لگی۔ ”جوان خون! پچھو جوان خون ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ خون میں غیرت بھی ہونا چاہیے۔ جو اس بے چارے کے پاس بالکل نہیں ہے۔ سالابد معاش ہوئے والی بھابھی پر نظر رکھتے بیٹھا ہے۔ خبیث۔“

صورت پھر بھون بھون کر کے رونے لگی تھی۔ مینا بیگم اور تمدن نے اس مرتبہ اسے بالکل لفٹ نہ کرائی۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں کمرے میں چلے آئے تھے۔ ربیعہ نے اٹھنے کی کوشش کی تو مینا بیگم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔  
 ”آرام کرو۔“ تمدن بھی نرمی سے بولا۔ ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

پھر وہ مینا بیگم کی سمت مڑا۔  
 ”پچھو اپنی اکیال اس سے گھر ویر کا کوئی کام نہ کرو اسے لگتا۔ ابھی اس کی حالت ایسی نہیں ہے۔ شکل سے ہی تڑھال لگتی ہے۔“

”اب خیر میں اتنی ظالم بھی نہیں ہوں۔“ مینا بیگم کو برا محسوس ہوا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے قدرے ظالم ہونے کا اعتراف بھی کیا۔

”تمہارے چھپ جانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ تمدن اسی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جس پر ربیعہ لیٹی ہوئی تھی۔

ربیعہ نے جھٹ کر خود کو سمیٹا۔ وہ بالکل پرے ہو گئی۔ تمدن نے ایک سرسری نگاہ اس کی حرکت پر ڈالی تھی۔  
 ”میں نے اپنے سب دوستوں کو مدعو کر لیا ہے۔ اور اپنا پروگرام بدلنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس جمعے کو میں میاؤں کے لیے نکلیں گا۔ گھر میں ہی نکاح پڑھوا لیں گے۔ چند دوستوں اور رشتے داروں کو بلا کر ہلکا پھلکا ارتج پھٹ کر لیں گے۔“

”تیرے لیے اٹھنے لگے۔ وہ کسی صحرائی طوفان میں جا پھنسی۔ تمدن اس کی کیفیت سے بے خبر ہوئے۔“

”پھر وہ اپنی ساری باتیں سن کر کہنے لگا۔“  
 ”لیکن تمدن!“ مینا بیگم نے تذبذب سے کہا۔ ”تصور کے نہ ہونے پر بہت باتیں نہیں کی۔ یوں بھی جن لوگوں

کی انہیں دوستوں شادیوں کے متعلق بتایا تھا۔ اب اگر صرف تمہاری رسم نکاح مستند نہ ہو تو اسے دوستدار اندیشوں کا شکار ہوں گے اور منحوس کا اس موقع پر نہ ہونا ان اندیشوں کو اور بھی ہوا دے گا۔“

”پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ خود غرضی سے بولا۔ ”وہ ساری عمر نہ لوئے تو کیا میں اور ربیعہ ساری عمر اس کا انتظار ہی کرتے رہیں گے؟“

”ایسے نہ کہو تمدن۔ اتنے خود غرض نہ بنو۔“ مینا بیگم خود پر مزید جبر نہ کر سکیں۔ یوں بھی تصور ان کا ہونے والا ماد تھا۔ سو تمدن کی نسبت وہ اس سے زیادہ انیسیت رکھتی تھیں۔

”اس میں خود غرضی کی کیا بات؟ حقیقت پسندی ہے یہ۔ ادویوں بھی اگر آپ غور کریں تو ہمارا نکاح ہونے سے اس معاملے پر اچھا اثر پڑے گا۔ تصور کی امیدوں پر پالی پھرے گا تو وہ خود ہی چلا آئے گا۔ یہ سوچ کر کہ اب تو کچھ ہو نہیں سکتا۔“

تمدن کی بات پر مینا بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔  
 ”یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ آہستہ سے بولیں۔







وردہ بری طرح سے جھنجھلا گئی تھی۔

”مجھے نہیں لگتا تمہیں کچھ لینا ہے۔ تمہاری سوئی اسی لہنگے پر الٹ چکی ہے۔ سب نشريات اپنی اپنی جگہ رک گئی ہیں۔ اب تم سکون سے بیٹھو اور مجھے اپنی شاپنگ کر لینے دو۔“

”تو آپ کریں ناشاپنگ۔ میں نے آپ کو منع کیا ہے۔“ ناعہہ کچھ خفاسی ہو گئی۔

”میں نے سوچا تھا پہلے تم سے نمٹ لوں۔ پھر وہ لکھوں کیا بچتا ہے میرے لیے۔“

”اتنا سیکرینا زنبہ کیا کریں وردہ آپ کی صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔“ وہ طنز سے بولی۔ وردہ اور ثانیہ کو اس پھولا ہوا منہ دیکھ کر ہنسی آگئی۔ اسے مزید تاؤ آگیا۔

”میں اپنے فیورٹ سائنگز کی سی ڈیزلے رہی ہوں۔ اس شاپ پر ہوں۔“ ناعہہ نے اشارے سے بتایا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ وردہ نے اس کے پھولے ہوئے منہ کے پیش نظر سہولت سے اس کی بات مان لی۔ وردہ

عموماً وہ مارکیٹ میں بھی کسی لڑکی کو تنہا کسی شاپ پر نہیں جانے دیتی تھی۔ وردہ اور ثانیہ کپڑا دیکھنے لگیں۔ ناعہہ سی ڈیزلے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

سیلز مین سے کافی ساری سی ڈیزلے نکوا کر وہ بہت دھیان سے ان کے گانوں کے بول پڑھ رہی تھی۔ جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

ناعہہ نے نگاہیں اٹھائیں۔ وہ اس کے قریب اس طرح سے کھڑا تھا جیسے وہ اسی کے ساتھ ہو اس کے چہرے پر اپنی پُریش نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ وہ اسے عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ان کی برسوں کی شناسائی ہو۔ جیسے ان کا بہت قریبی رشتہ ہو۔

جیسے وہ کسی بات پر اس سے بے حد خفا ہو۔

جیسے اس کو انھیں لگی ہو۔ جیسے وہ آزرده ہو۔

ناعہہ سے نگاہیں نہ جھکا لی گئیں۔ وہ اسے کھلی آنکھوں سے دیکھتی رہا۔

”کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟“ اس کا لہجہ بھی آج عجیب تھا۔

وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”جی۔ اچھا۔“ اس نے تجھے دیکھ کر ہنسی کی۔

”کوئی کھیل تھا تمہارے لیے؟ دوست لڑائی تھی؟“ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

ناعہہ نے پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی بھی ان کی جانب متوجہ نہ تھا۔ چند لڑکے اپنی پسند کی سی ڈیزلے رہے تھے۔ سیلز مین انہیں اڈیل کر رہا تھا۔

”آپ۔ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ اس نے حسب معمول ہتھیلی کی پشت سے پیشانی صاف کی۔

”جاننا چاہتا ہوں۔ تمہارے اس طرز عمل کی وجہ۔“ وہ درجہ سنجیدہ تھا۔

ناعہہ سخت پریشان ہو گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟ کیا لگاڑا ہے آپ کا؟“

”اپنے دل سے بوجھو۔“ وہ طنز سے مسکرایا۔

ناعہہ کو اس کی شکل دیکھی دیکھی سی لگی۔ وہ ذہن پر زور ڈالنے لگی کہ اس دیوانے کو اس نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔

وہ بھی بے حد غور سے اس کا نقش نقش دیکھ رہا تھا۔

”اسی بھول پن پر مرنا تھا میں۔“ پھر وہ بولا۔ ”کیا خبر تھی کہ بھول پن کے پردے میں کتنا قریب پوشیدہ

ناعمہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا وہ کیا کرے۔ درد کے لیے کسے پکارے۔  
 ”فرانسہ!“ کسی لڑکے نے آواز دی تھی۔  
 ”کم آن یار!“

فرانز نے ایک بے بس نگاہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتے وجود پر ڈالی اور بادل نخواستہ اپنی جگہ چھوڑی۔ شاب سے نکلنے سے پہلے بھی اس نے بت بنی ناعمہ پر نظر ڈالی تھی۔

\*\*\*

”مما!“ عمر بے حد غصے میں معلوم ہوتا تھا۔

شہلا چونک اٹھی۔ وہ پندرہ دن کی چھٹی کے لیے تحریری طور پر درخواست تیار کر رہی تھی۔ بین ایک طرف رکھ کر وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”جی جناب کیسے!“ وہ مسکرائی۔ ”خالہ جانی سے لڑائی ہو گئی ہے شاید۔“

”آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں؟“ اس نے دونوں ہاتھ کھینچ کر رکھے۔

شہلا دم خم سا مسکرائی پھر اس نے عمر کو اٹھا کر اپنے زانو پر بٹھا دیا۔

”میں آپ کی ماما ہوں جانو۔ ماما اپنے جانو کو چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں؟“

”نہیں۔ آپ جا رہی ہیں۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ آپ ہاشم انکل کے گھر جا رہی ہیں ان کی دلہن بن کر۔“

مجھے نانو نے بتا دیا ہے۔ میں یہاں نانو کے پاس رہوں گا اور آپ اور ہاشم انکل کے پاس رہیں گی۔ ہے ٹھیک۔“

و منہ بسورنے لگا تھا۔ شہلا کو اس پر ٹوٹ کر بیا آ یا۔ اس نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ اس کا ماتھا چوما پھر اس نے بال سنوارنے لگی۔

”عمیرہ میں آپ کو یہاں نانو کے پاس صرف ایک ہفتے کے لیے چھوڑوں گی۔ میری جان بلی پر امیں میں ہمیشہ آپ کو اپنے پاس رکھوں گی۔“

”کہاں؟ کہاں رکھیں گی؟ ہاشم انکل کے گھر؟ میں وہاں نہیں رہوں گا۔“

شہلا کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل اپنی منہی میں مسل دیا ہو۔

”کیوں؟“ اس نے کمزوری آواز میں پوچھا۔ ”کیوں نہیں رہیں گے وہاں؟“

”وہ میرا گھر نہیں ہے۔ وہ مومن کا گھر ہے۔ میں اس کے گھر میں کیوں رہوں؟“

”بیٹا!“ وہ جزبہ ہوئی۔ ”وہ تو مومن کی نانو کا گھر ہے۔“

”تو اسی کا گھر ہونا؟ یہ میری نانو کا گھر ہے تو میرا گھر ہے نا۔“

شہلا کی سمجھ میں نہ آیا وہ اسے کیسے سمجھائے۔

شہلا نے جواب نہ دیا۔ صرف استفہامی نگاہیں اس کے چہرے پر نکادیں۔

”بچوں کا گھر وہ ہوتا ہے جو ان کے پاپا کا گھر ہوتا ہے۔“

شہلا کو یوں لگا جیسے چھت اس کے سر پر آگری ہو۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”جو میرے بہا ہیں نا۔ ان کا نام ابراہیم جیلانی ہے۔ انہوں نے میرے لیے بہت اچھا گھر بنوایا ہے۔ اسلام آباد میں۔ اگر آپ میرے بہا کی دلہن بن جائیں تو ہم تینوں وہاں رہیں گے۔ میں آپ اور بہا کو اکتانہ آئے گا نا۔“

شہلا کا سانس اس کے گلے میں پھنس گیا۔ اس سے آواز نکالنا مشکل ہو گیا۔ اپنی ہتھیلیوں کو اس نے غم دنا

محسوس کیا۔

”مما!“ اس نے شہلا کو ہلایا۔ ”بتائیں نا! آپ چلیں گی نا اسلام آباد!“ شہلا کا حوصلہ جواب دے گیا۔ بنا سوچے سمجھے اس نے ایک طمانچہ اس کے گلے پر دے مارا تھا۔

”بند کرو بکواس۔ کس نے سکھایا ہے تمہیں یہ سب کچھ۔“ وہ پھنکاری۔

عمر گل پر ہاتھ رکھے سخت خوف زدہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

\*\*\*

کاغذ پر اس کا قلم نہایت برق رفتاری سے رواں تھا۔ چند اسائنمنٹ تھے۔ جنہیں چند ایک روز میں پورا کرنا بے حد ضروری تھا۔ اس کا پورا پورا اوصیان اپنے کام کی جانب تھا۔

اس کے موبائل کی بپ بجی تو اسے سخت کوفت ہوئی۔

اس نے آنے والی کال کا نمبر دیکھا۔ اسے اندازہ نہ ہوسکا کہ کالر کون ہے۔ اس نے منہ بنا کر کال ریسیو کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے نوٹس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”ہوا؟“ عبد الباری نے اس کا فکر منہ چروہ دیکھا۔

”کال نہیں۔ مکالم کیوں ریسیو نہیں کر رہا ہے؟“ موبائل تو اس کے پاس ہی ہو گا نا۔“ ترانہ نے فکر مندی سے کہا۔

”پریشان مت ہو، ہو سکتا ہے وہ واش روم وغیرہ میں ہو۔“ عبد الباری نے اسے تسلی دی۔

”تھیں کہیں جانتی؟“ کس انٹینیٹیوٹ میں پڑھتا ہے۔ ورنہ ہم اس سے ملنے چلے جاتے۔ میرے پاس صرف اس کا موبائل ہے۔“

”ڈونٹ ڈو ٹرانز۔“ ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹرائی آگین۔“

”جی نہیں۔“ اس نے ایک مرتبہ ریسیو کرنے کی کوشش کی۔

”اس نے اپنی سرکس میں سرکس اور ایک مرتبہ پھر نمبر مانے لگی۔“

اس نے کال کر لی۔ لیکن اب اس کی روشن اسکرین اطلاع دے رہی تھی۔ کہ کال کرنے والا بات کرنے پر مصر ہے۔

”کیا؟“ اس نے کال کر لی۔ ”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”میں ریسیو کی کزن ہوں۔ اکثر آپ نے مجھے اس کے ساتھ دیکھا ہے۔“

”اوہ گاڈ! ہاؤ کین آئی فار گیٹ! سو سو سوری ترانہ۔ میں اس وقت کسی اور دھیان میں تھا۔ جی کہہیے، کیسے مزاج ہیں۔“

”جی نہیں!“ ترانہ دھیسے سے بولی۔ ”یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ عباؤ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کہنا ہے۔“

”کہہیے۔“ وہ بری طرح سے چونکا تھا۔

”عبداللہ! آپ۔۔۔ ریسیو سے شادی کر لیں۔ فوری طور پر۔ آج ہی آپ کو منظور ہے؟“

”وباٹ۔۔۔؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

ایقان کے دوبارہ استفسار پر شہلا ہاشم کے لیے نیم رضا مندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ترانہ ربیعہ کو یونیورسٹی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصویر کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر ٹھانڈے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ صولت کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے سنگین منہ مارنے کی دھمکی دیتی ہے۔ انیسوا ابراہیم جیانی کو چھٹیپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔

پارک میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن۔ پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے پارک جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ساس اور نند کے ساتھ جا کر شہلا کو سنگنی کی انگلیوں پر سناتی ہیں، شہلا ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

تمدن ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اس پر غم کا پھاڑ اس وقت ٹوٹتا ہے جب مینا بیگم تمدن سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔

۱۸

رکھتا ہوں تو قیصر

اس نے ایک خطرناک نگاہ گرد پیش پر اور دو سری اپنی رسٹ واپس چڑھائی تھی۔

باری مسکرا دیا۔ پھر اس نے میز پر رکھے ہوئے ترانہ کے ہاتھ پر ڈھیر سے سونگنا ہاتھ رکھا۔ ترانہ چونکا اٹھی۔

”ریلیکس۔“ باری نے اسے تسلی دی۔ ”تم بہت شینس نظر آ رہی ہو۔“

”شینس ہوں تو۔“ نظر بھی آؤں گی۔ ”وہ ہوئے سے مسکرائی اور واحد انسان بن گئی۔ کہ تم میرے ساتھ ہو۔“

اتنا وقت میں اسی لیے کاٹ پائی ہوں۔ پتا نہیں وہ آئے گا بھی یا نہیں۔ ”عید العید کی سبھی اپنی رسٹ واپس دیکھتی ہے۔“

”وہ آئے گا ترانہ۔“ میں ”شینس“ سے کہتا ہوں۔ یوں بھی ہم اس کے لیے ہوئے وقت سے بہت پہلے ہی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اس نے پانچ بجے آئے کو کہا تھا اور ابھی صرف سو پانچ ہوئے ہیں۔“

”پتا ہے باری۔ جو کچھ میں کرنے جا رہی ہوں اس کے لیے بہت ہمت و رکار ہے۔ مجھے یہ ہمت نبھانے کس چیز نے دی ہے۔ شاید۔ شاید میرے احساس جرم نے۔ یا پھر اس محبت نے جو میں ربیعہ کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں۔ جب سے میں نے اسے تمدن بھائی سے شادی کرنے پر فورس کیا ہے میں ایک عجیب سی خلش ایک ناقابل بیان احساس جرم میں مبتلا ہوں۔ یہ جانتے بوجھتے کہ کسی بھی طرح تمدن بھائی اس کے لائق نہیں ہیں۔ میں پیچھو کی باتوں میں آکر اسے ایک آگ کے دریا میں دھکیلنے لگی تھی۔ وہ گھر ہی آگ کا دریا ہے باری! میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ پھر بھی پھر بھی میں ربیعہ کو وہاں عمر قید کی سزا سنانے والوں میں شامل ہو گئی۔ ربیعہ تو موسم کی گڑیا ہے۔ وہ کیسے جی پائے گی وہاں؟ کھل کھل کر مرجائے گی وہ۔“

باری گال کے نیچے ہاتھ رکھے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ترانہ بات مکمل کرتے کرتے جھینپ گئی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو پاری؟“

”سوچ رہا ہوں!“ وہ واقعی سوچ میں گم تھا۔

”کیا؟“ ترانہ نے اچھپنے سے اسے دیکھا۔

”ایسا ہی ایک آگ کا دریا میرے گھر میں بھی بہتا ہے ترانہ۔ یہ کیسی حقیقت ہے؟ ہم انسان اپنے ان رویوں سے آگ کے دریا کیوں بناتے ہیں؟ ہم پر سکون ٹھنڈی میٹھی پھیلیں کیوں نہیں بناتے ترانہ؟ ابھی تو جب یہ سب کچھ کہا تو میں۔۔۔ میں بھی ایک احساسِ جرم میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ کہیں میں بھی تمہارے ساتھ نہ تو نہیں کر رہا۔“

ترانہ مسکرا دی۔

”نہیں باری! دونوں سچویشنز میں بہت فرق ہے۔ ربیعہ اس سیٹ اپ کا دائمی حصہ بننے پر آمادہ نہیں ہے۔ نے کبھی ایسے ماحول کو نہیں برتا۔ وہ بالکل الگ نیچر کی لڑکی ہے۔ جب کہ میں تو ہمیشہ سے ہی آگ کے دریا کی ہوں۔ مجھ پر جگمگاتے بد لے سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ پھر میں خود اس بات پر ذہنی طور پر رضامند ہوں۔ کہ میں ترانہ ہوں، موم کی گڑیا نہیں۔“

باری اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ تب ہی ان کی نگاہ گلاس ڈور کھول کر اندر آتے عباد پر پڑی تھی۔ وہ اندر اب متلاشی نگاہوں سے مختلف میزوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ترانہ کو باری کے ساتھ بیٹھا دیکھ لیا۔ تو ان طرف بڑھا۔

ترانہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ باری عباد کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر چند قدم آگے بڑھ کر ترانہ بھی کھڑی ہوئی۔ بھلام دعا کے مرحلے کے لیے وہ تینوں اپنی اپنی نشستوں پر آ بیٹھے تھے۔ ترانہ جا بختی ہوئی نگاہوں سے عباد کو دیکھا۔ گرے شرٹ اور گرے جینز میں وہ ہمیشہ کی طرح فریش اور خوب لوگ رہا۔

شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک موڑے وہ قدرے بے پروا انداز میں تھا۔ شرٹ کا اوپری بٹن کھلا تھا اور اس گلے میں پڑا ہوا سیاہ تھوڑا کھائی دیتا تھا۔

ترانہ نے چشمِ اقصور سے اسے ربیعہ کے ہمراہ دیکھا اور خوشی سے مسکرا دی۔ ربیعہ جیسی خوبصورت، نازک، حساس لڑکی کے لیے ایسا ہی شاندار سا بندہ ہونا چاہیے تھا۔

”جی مس ترانہ۔“ اس نے کہا۔ ”جیپ بھر کر مجھے لے آئے ہوئے بالآخر عباد نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔“ ”تو اب ہم بات کر سکتے ہیں۔“

ترانہ نے ایک نگاہ باری پر ڈالی اور ہولے سے کھنکھارتے ہوئے بات شروع کی۔

”عباد! میں نے آپ سے فون پر ایک درخواست کی تھی۔“

”اور ایسی باتیں فون پر تو ہر گز نہیں ہوتیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”اسی لیے میں نے آپ لوگوں کو یہاں آنے

زحمت دی ہے۔ اچھا ہوتا کہ آپ ربیعہ کو بھی ساتھ لے آئیں۔“

”وہ فی الوقت ایسی پوزیشن میں نہیں ہے۔“ ترانہ افسردگی سے بولی۔ ”اور پھر اسے تو بالکل علم نہیں ہے کہ میں نے آپ سے ایسی کسی بات کے لیے رابطہ کیا ہے۔“

اس نے عباد پر نگاہ ڈالی وہ سوچتی نگاہوں سے اس کی گفتگو میں تسلسل آنے کا منتظر تھا۔

”در اصل عباد! بات یہ ہے کہ میری پیپھو اور میرے بڑے بھائی تمدن نے ربیعہ سے زبردستی کی رضامندی

کر اس کی شادی تمدن بھائی سے طے کر دی ہے۔ اس جمعہ کو ان کا نکاح ہے۔ شروع میں تو میں بھی سوچ

تھی کہ اگر ایسا ہو جائے تو شاید ہمارے بد قسمت خاندان کو ایک بہت اچھی سبھی ہوئی یا رسالہ کی غیبی مدد کی

ناعمہ کو بار بار جیسے کچھ یاد آتا تھا پھر ذہن پر بننے والے یاد کے نقش کسی دوسری سوچ کی لہر میں بہہ جاتے تھے۔ کون تھا وہ؟ پہلے کہاں دیکھا تھا اسے؟ وہ اسے کیا سمجھ رہا تھا؟ وہ اس سے خفا کیوں تھا؟ پھر اس کا نام سنا سنا۔ جانا پہچانا سنا۔

”فرانسہ!“ اس کے کانوں میں باز بار آواز گونجتی۔

اس کا مڑ کر ناعمہ کو بے بسی سے دیکھنا اور بادل نخواستہ وہاں سے ہٹنا۔ ناعمہ کے دل و دماغ پر وہ منظر نقش ہو گیا تھا۔ پھر اس کی وہ دیوانوں کی سی باتیں سننے سمجھ میں آنے والی نہ رہی جانے والی۔ کچھ مطلب تھا ان بے سرو پا باتوں میں۔ کوئی دُور تھی جو ہاتھ میں آجاتی تو سب ہی معے حل ہو جاتے۔ لیکن دُور۔ اس کا سیرا۔ کہاں تھا؟

”کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟ کیوں؟“

”کوئی کھیل تھا تمہارے لیے؟ وقت گزاری تھی؟“

”اسی بھولپن پر مر رہا تھا میں کیا خبر تھی کہ اس بھولپن کے پروے میں کتنا فریب پوشیدہ ہے۔ کیا خبر تھی؟“

”کیا خبر تھی؟“

ناعمہ نے ارد گرد اس کے الفاظ میں چھپی بے بسی چکرانے لگی۔ اس کی سوچ کی پرواز نہ حال ہو کر گر پڑی۔

”اب کتنے بستر کی پشت سے نکا کر آنکھیں موند لیں۔“

”کیا بات ہے؟“

”وردہ کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکراتے کی کوشش کی۔“

”میں ٹھیک ہوں اپنا۔ مجھے بھلا کیا ہونا ہے؟ آپ نے مجھ کو نظر انداز کر کے مجھے میری پسند کا لباس دیا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔“

”ہائیں سس! وردہ دنگ ہو گئی۔“

”یہ تم ہی ہو ناعمہ؟ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہو۔؟ یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟“

”میری طرف سے کوئی بات نہیں۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

”یہ بات تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔“

حاصل ہو جائے گی۔ شاید۔ شاید اس کے ہمارے خاندان کا حصہ بن جانے سے خوش قسمتی کا کوئی دریچہ ہمارے لیے بھی کھل جائے۔ لیکن گزشتہ چند روز میں مجھے احساس ہوا کہ میں بالکل غلط سمجھتی اور سوچتی تھی۔ خاندان واقعی اس قابل نہیں ہے کہ وہاں ربیعہ جیسی معصوم فرشتہ صفت لڑکی اپنی تمام زندگی کسی ناکرد و گناہ قابل معافی سزا کے طور پر گزار دے۔ وہ گھر تو کالے لپائی کی سزا ہے۔ میں بچپن سے وہیں رہی ہوں۔ لیکن درود یو ار میں میرا دم گھٹتا ہے تو ربیعہ ربیعہ تو بہت نازوں سے پلی ہوئی، نرم و نازک تیل جیسی لڑکی ہے۔ وہ تو دنوں میں مرجھا جائے گی۔“

عباد سیٹ چہرہ لیے اپنی نگاہیں بولتی ہوئی ترانہ پر جمائے ہوئے تھا۔

”وہ سزا کوئی آپشن میرے یا ربیعہ کے پاس نہیں تھا۔“ ترانہ نے نظریں جھکا کر جیسے اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔

”اور ربیعہ بے چاری کے ذہن میں تو ایسا بھی کوئی آپشن نہیں ہے۔ وہ تو آپ کو ایک بھائی کی طرح مخلص مددگار سمجھتی ہے۔ لیکن عباد ایہ پوزیشن کچھ ایسی ہے کہ ربیعہ کو اس صورت حال سے نکلنے کے لیے ایک غیر رشتے کی ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ اس دنیا کی نظریں منہ بولے رشتوں کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر میں کسی طرح ربیعہ کو اس گھر سے نکال بھی لاتی ہوں تو اسے ایک سائبان چاہیے۔ ایک مضبوط چاہیے۔ اس لیے میں نے آپ سے یہ بات کی تھی۔“

ترانہ نے نظروں میں آس بھر کر اسے دیکھا۔

”میں جانتی ہوں عباد! اس نے لبوں پر خاموشی کی مہر لٹائی ہوئی ہے لیکن اس کا دل دہائیاں دے رہا ہے۔ اس کے آنکھیں خشک ہیں مگر اس کے احساسات آشک بار ہیں۔ وہ اس حالت میں زیادہ عرصہ نہ جی سکے گی۔ اس کے جینے کی آس اگر کہیں موجود بھی ہوئی تو میرا ظالم بھائی اسے کسی شمع کی لوکی مانند ایک ہی پھونک میں بجھا دے گا۔ پلیر عباد! آپ۔ آپ اس کا ہاتھ تھام لیں۔ اگر آپ کے دل میں اس کے لیے ذرا سی بھی مہربانی ہے۔“

”آپ اس سے شادی کر لیں۔“

عباد نے پہاؤ بدلا۔ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے جیسے صورتحال پر غور کیا تھا۔

”لیکن ترانہ! آپ کے گھر والے؟ انہیں کون ذیل کرے گا؟“

”کوئی نہیں!“ وہ سیٹ انداز میں بولی۔

”کیا مطلب؟“ عباد کو الجھن ہوئی۔ ”ربیعہ آپ کے گھر میں ہے۔ اس کا جہہ تو نکاح ہے۔ ایسی صورت میں اس سے شادی پر ہائی بھرنا کس درجہ حماقت کے مترے میں آتا ہے۔ کیا آپ کو احساس ہے؟“

”عباد!“ ترانہ کو اس کی بات سمجھ گئی۔ ”میں آپ سے کوئی باراست وغیرہ لانے کے لیے نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں تو آپ سے ربیعہ کو بھگا کر لے جانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔“

”کیا بات!“ عباد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

عبدالباری نے بڑی مشکلوں سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔

مشق محمد و محمد فرشتہ کے حوت

کھانا پکانے کی مزیدار

ترکیبوں کے

رنگارنگ کتاب

نگوٹے کا پتہ: ۷۳، انڈیا بازار کراچی

خانہ کا  
دستخطات

شائع ہوئی



وردہ کے لب مسکرانے لگے۔ اس نے ناعمہ کے سامنے پڑے لباس پر ایک نگاہ ڈالی۔  
 ”ویسے ڈریس تو واقعی اچھا پسند کیا ہے تم نے۔ بہن کر دیکھا ہے؟“  
 ”نہیں۔۔۔ ابھی تک تو نہیں!“ وہ کسلمندی سے بولی۔

وردہ نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں پوری طرح سے کھول کر اسے دیکھا۔  
 ”ناعمہ۔۔۔ تم مجھے واقعی بہت بدلی ہوئی لگ رہی ہو۔ یعنی کل سے تم نے اسے بہن کر ہی نہیں دیکھا۔ کہاں تو تمہارا بس نہیں چل رہا تھا کہ تم اسے وہاں ایمپوریم میں ہی بہن کر کھڑی ہو جاتیں۔“  
 ناعمہ کو بہن کی باریک بینی کا احساس ہوا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے مسکرا دی۔  
 ”میں ابھی آپ کو بہن کر دکھاتی ہوں۔“ وہ چٹکی بجا کر بولی۔  
 وردہ بے ساختگی سے مسکرا دی۔



”کیا بات ہے عریشہ! سچ بچ بتاؤ مجھے!“ ماہین سب کام سمیٹ کر اب بے حد فراغت سے اس کے سامنے یوں  
 آکر بیٹھی تھی کہ فرار کے سبب ہی راستے میں وہ عریشہ نے کتاب پر سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر نظریں چرا  
 کر لب کاٹنے لگی۔ ماہین بغور اس کے تاؤ اور اسے ملاحظہ کر رہی تھی۔

”آپ کیا چاہنا چاہتی ہیں؟“ وہ دھڑکے سے بولی۔  
 ”تمہارے آپ بالکل بدلے ہوئے رویے کی وجہ! اور آج میں جان کر رہوں گی۔ دیکھو عریشہ! لڑیا گڈنے سے  
 کھیلنے کی عمر گزر گئی ہے تمہاری۔ زندگی کو کچھ سنجیدگی سے لو۔ اگر تمہارے ساتھ کہیں کچھ غلط ہوا ہے کوئی  
 زیادتی ہو گئی ہے ہم سے تو بتاؤ ہمیں۔۔۔ تمہارے لب آزاد ہیں۔ لیکن اپنی گویائی کو قید کیا ہوا ہے تم نے۔“  
 ”کیا بات ہے کیا!“ وہ پھٹکی سی ہنسی نہیں دیتی۔ ”آج تو بہت فلسفیانہ گفتگو کر رہی ہیں آپ اتنے دنوں بعد آج  
 آپ کو یہ خیال آگیا کہ میرے لب آزاد ہیں۔ اور لبوں کے آزاد ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ گویائی کی طاقت ہونے  
 سے کیا ہوتا ہے؟ بات تو سماعتوں کی ہے ایسا۔ سننے والوں نے سماعتوں سے کہیں زیادہ کچھ سیکھ لیا ہے۔  
 دستک ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ لیکن جب اسے سماعتیں پھرنا پڑیں تو یہاں یہاں سے  
 ماہین نے ہمدردی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”عریشہ! بہت ڈسٹرب لگتی ہو تم مجھے۔ تم یہ بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟ تمہیں نافع پسند نہیں ہے یا پھر تمہیں کوئی اور  
 پسند ہے؟“

عریشہ کا دل یکبارگی کسی اور تال پر دھڑکا تھا۔ ”کوئی اور“ نے عجب طرح سے احساسات کو چھوا تھا۔ اس کی  
 پلکیں لرزنے لگیں۔

”بولو۔۔۔ جواب دو۔۔۔ میں تمہارا جواب سننے بغیر یہاں سے اٹھنے والی نہیں ہوں۔“

”اپنا۔۔۔ کیوں راکھ کرید رہی ہیں۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”سب چنگاریاں بجھ چکی ہیں۔“  
 ”جھوٹ۔۔۔ غلط۔۔۔ پورا الاؤ روشن ہے یہاں تو۔۔۔ اس کی تیش باہر والوں تک نہ پہنچے“ اس بات کا خوف ہے  
 ہمیں۔ عریشہ! یہ خاندان کا معاملہ ہے۔ اور وہ خاندان جو برسوں سے ایک ہے۔ تمہاری کسی بچکانہ حرکت سے  
 اس کی بنیادوں کو نقصان پہنچا تو ساری عمر پچھتاؤ گی تم بھی۔ اور ہم بھی۔ ابھی وقت ہے فیصلہ ہمارے ہاتھ میں  
 ہے۔ اس لیے جو کہنا ہے وضاحت سے کہہ دو۔۔۔ تمہارا یہ رویہ گھر والوں کو تکلیف دے رہا ہے اور باہر والوں کو

شک میں مبتلا کر رہا ہے۔ سب لوگ تمہارے اس برتاؤ کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔ جب سے نافع سے تمہاری متکبر ہوئی ہے تم نے کسی سے بھی کلام کرنا چھوڑا ہوا ہے۔ تم کہیں آنا جانا ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اور اب ہاشم بھائی کی شادی کی تاریخ بھر گئی ہے اور تم نے اس معاملے میں بھی رتی برابر دل چسپی نہیں لی بھی۔ خاندان کی سب ہی لڑکیاں بہت شوق سے اپنی تیاریاں کر رہی ہیں اور تم دو لہا کی بہن ہوتے ہوئے بھی لا تعلقی سے کونے میں پڑی ہوئی ہو۔ آخر کیوں؟

عریشہ نے سر جھکاتے ہوئے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔ کیا بتاتی وہ کسی کو؟ اس سارے قصے میں بتانے والی آخر کی بات کبھی؟ بس صرف اتنی سی بات تھی کہ اس کا دل اسے کسی گھڑی کسی بل چین نہ لینے دیتا تھا۔ اسے آنکھیں یا آتی تھیں۔ اسے باتیں یاد آتی تھیں۔ اور وہ یوں پہلو بدلتی تھی جیسے کسی والاؤ پر بیٹھی ہو۔ ماہین اسے دیکھتی رہی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

”نافع سے کوئی شکایت ہے؟“ اس نے پھر زچ ہو کر پوچھا تھا۔

”نہیں۔!“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”اس میں یہ ہے کیا اچھا یا برا لگنے کو۔“

”اوہ!“ ماہین اچانک ہی جیسے کسی نتیجے پر پہنچی تھی۔ ”عریشہ! حد تو رکھو گئی بچپنے کی۔“

وہ تاسف سے بولی تو عریشہ نے آنسو بھری نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”بس۔۔۔ نہیں پسند مجھے۔“ وہ ضد سے بولی۔

”پھر توڑ دیں متکنتی؟“ ماہین نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔ ”کچھ ایسا ناممکن تو نہیں۔ گھڑی کی بات ہے۔ بعد میں تم اس کے ساتھ کبھی روئیہ اپنا لے رکھو گی تو کچھ نہ ہو پائے۔“

عریشہ لب چبانے لگی۔

”بولو۔۔۔ جواب دے۔۔۔ کہتی ہو تو میں بڑوں سے بات کروں۔۔۔ اتنا بچھو کو بیچ میں ڈال کر میں دلوں پہاڑ تک بات پہنچا دیتی ہوں۔“

عریشہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے الفاظ ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئے۔ چشم تصور سے اس نے ایک مضبوط ہاتھ کو اپنے سر پر آتے اور ٹھہرتے دیکھا تھا۔ اس ہاتھ کے دیاؤ میں جو مان تھا جو بھروسہ اور جو اعتبار تھا۔ عریشہ کا رواں رواں اسے محسوس کر سکتا تھا۔

”بولو عریشہ۔۔۔ جواب دے۔!“ ماہین جھنجھلا گئی۔ ”ہاشم بھائی! شادی کے بعد جب سے تمہاری بات توڑا لے لیتے ہیں یہ متکنتی۔۔۔ جب تم ہی خوش نہیں ہو۔“

”نہیں! کیا۔!“ وہ کانپتے لبوں سے بولی۔ ”اب کچھ نہیں ہوگا! میں۔۔۔ میں خوش ہوں۔“

ماہین نے گہری سانس بھری اور کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھا۔

”پھر اپنا روئیہ درست کرو۔ انسان بن کر رہو۔ اب کسی کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اور ہاں، کل ہم تمہارے کپڑے لینے جا رہے ہیں۔ سب تیاریاں مکمل ہیں۔ ایک تمہارے ہی کپڑوں کا کام رہتا ہے۔“

عریشہ چپ رہی، اس کی پلکوں پر کی تھی۔

نما دعو کروہ بستر بہت آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن ذہن، جسمانی آرام کا اثر قبول کرنے پر قطعاً آمادہ نہیں تھا۔ وہ بے حد منتشر! اچھیال کا شکار ہو رہی تھی۔ بالوں سے نچکتے پانی سے خنک ہوئے بستر پر اس نے گروٹ بدلی اور

جالی کے سفید پردوں کو وہ خالی الذہنی کے عالم میں گھور رہی تھی۔ بیڈ پر دونوں ٹانگوں کو سمیٹ کر بیٹھی ہوئی وہ نجانے کیا کچھ سوچے جا رہی تھی۔ کچھ دن بعد اس کی سونی اجڑی مانگ پھر سے جننے والی تھی۔ ہتھیلیوں سے روٹھی ہوئی مندی کے رنگ پھر سے دوستی کرنا چاہتے تھے۔ سرخ زرتار آچل پھر سے لہرانے کو تھا۔ لیکن روٹھا ہوا دل سے مان کرنے دیتا تھا۔ نجانے کیا چاہتا تھا یہ دل، شہلا اپنے آپ سے ڈر رہی تھی۔ اسے خود سے باتیں کرنے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر ایسا کرنے سے قاصر تھی۔

عمر کی باتوں نے اس کے دل کو آج سی لگا دی تھی۔ نجانے وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا۔ شہلا جانتے بوجھتے بھی بے نیاز رہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی کوشش کچھ ایسی کامیاب نہ ہو پاتی تھی۔

”بچوں کا گھر وہ ہوتا ہے جو ان کے بابا کا گھر ہوتا ہے۔“

”انہوں نے میرے لیے بہت اچھا گھر بنوایا ہے، اسلام آباد میں۔ اگر آپ میرے بھائی کی دہن بن جائیں تو ہم

تنبہاں وہاں رہیں گے۔ میں آپ اور پہا۔ کتنا مزہ آئے گا۔!

شہلا نے بے ساختہ ہی دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا رہا ہو۔

”محبت کے اس تناور درخت کو مل کر سیدھا کرتے ہیں شہلا!“ اس کے کانوں میں ابرار جیلانی کی آواز گونجنے لگی تھی۔

”میرا ایک دوست یہ قربانی دینے کو تیار ہے۔ ہاں کہہ دو شہلا! ہاں کہہ دو۔“

شہلا کے لبوں سے بے اختیار ہی سسکی نکلی تھی۔ وہ تکیہ میں منہ چھپا کر اوندھی لیٹ گئی۔ قسمت نجانے کیا ہر موڑ پر آزمانے کھڑی ہو جاتی تھی۔ اس نے مطمئن اور پرسکون رہنے کے لیے ایک راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب لگتا تھا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ اس نے راہ نہیں دورا ہا منتخب کر لیا تھا۔ سامنے تو دورستے کھلے ہوئے تھے پوری وضاحت کے ساتھ۔



دوڑتے دوڑتے وہ حسب معمول بھاگ گیا تھا۔ رافع کافی آگے نکل گیا پھر وہ بھی رکا اور پلٹ کر واپس آنے لگا۔ ہاشم دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اس کی سفید ماریش سے بنے بنے کودیکھ رہا تھا۔ پام کے خوبصورت پودوں سے سجا ہوا ٹیرس فی الوقت سنسان تھا۔ کھسی پھولوں سے لکڑی ہوئی ٹیل جیڑے کھڑکی تک جاری تھی وہ کھڑکی بھی بند تھی۔ اس کے شیشوں کے پیچھے پڑے دبیز پردے نظر آتے تھے رافع اس کے قریب آکر رکا اور اس کی حد درجہ محویت دیکھ کر مسکرا دیا۔

”میاں رانجھے! کیا سوچنے لگتے ہو یہاں تک پہنچ کر تم۔“

ہاشم نے رافع کو دیکھا۔ اس کے لب مسکراتے لگے۔

”اب تو خیر سے شاعر ہیں جناب!“ وہ بولا تھا۔ ”اب تو میرے جذباتی مسلمات تمہیں بغیر میرے کچھ کے بھی سمجھ لینے چاہئیں۔ شاعر تو انسانی احساسات کے سمجھنے والے ہیں۔ پھر کیا کیوں کہیں؟“ رافع نے اس کے کھلتے چہرے کو دیکھا اور چپکلی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور دل ہی دل میں ان تمام چیزوں کے رانگی ہونے کی دعا مانگی۔ دونوں اب ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

”یار رافع!“ ہاشم نے اس کے کاندھے پر اپنا بازو رکھ لیا۔ ”وہ جو لڑکی ہے تیرے خیال میں حقیقت میں وہ کہاں ہے؟“

”کیا مطلب؟“ رافع نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”جو خیال میں ہے وہ خیال میں ہے۔ حقیقت سے خیال کا واسطہ ہی کیا؟“

”نہیں یار! اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تو نے اسے ہی اپنے خیالوں کا پیکر بنایا ہے۔ لاشعوری طور پر اتنی بڑی حقیقت تیرے سامنے ہے اور پھر بھی تو اس سے انکاری ہے۔ میرا دل نہیں مانتا۔“

”نہ مانے دل!“ رافع مسکرایا۔ ”اسے منانا میری ذمہ داری تو ہے نہیں۔ اور میاں رانجھے! تمہیں یہ گمان کب سے ہوا کہ میں تم سے کچھ چھپاتا ہوں۔“ اس کا وجود میرے خیالوں کی اس ماورائی دنیا میں نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔“

ہاشم کو الجھن نے آگھیرا۔ دونوں اب پارک میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک بیچ پر بیٹھ کر رافع گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے صبح کی خوبصورتی کو اپنے اندر سمونے لگا۔

”رافع!“ کچھ دیر کے بعد ہاشم بولا۔ ”کیا یہ خطرناک نہیں ہے؟“

”کیا...؟“

”یہی۔ اتنا بڑا ٹکراؤ۔“

”کہیں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ یوڈونٹوری۔“ رافع اٹھ کر بچوں کے بل اچھلتے لگا۔

”ٹکراؤ ہے رافع! تم ابھی اس کی سنگینی سے آگاہ نہیں ہو۔ لیکن میں سمجھ سکتا ہوں انسان کے خیالوں اور اس کی حقیقت میں اتنا بڑا تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ٹکراؤ ہو کر رہتا ہے۔ رافع! ایک مشورہ دوں۔؟“

رافع نے اچھلتے اچھلتے ہی ایک نظر اس پر ڈالی۔

”شاعری کرنا چھوڑ دو۔ پھاڑ دو اپنی نظمیں، غزلیں۔ سبھی کچھ! بھول جاؤ کہ تم نے لفظوں سے خیال میں ایک بری پیکر تراشا تھا۔ بھول جاؤ۔“

رافع رُک کر حیران و پریشانی سے اسے گھورنے لگا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا وہ کچھ دیر کے لیے کچھ بول نہ پایا۔

پھر وہ آکر ہاشم کے برابر بیٹھ گیا۔

”یار ہاشم!“ کچھ دیر کے بعد وہ خود پر قابو پا کر بولا تھا۔ ”میں تیرے گردن دبا دوں گا کسی دن۔“

ہاشم بے ساختہ ہی مسکرایا۔

”بندہ“ ”چوں“ نہیں کرے گا۔ ہم یاروں کے یار ہیں۔“

”میں سکون سے جی رہا تھا، اطمینان ہی اطمینان تھا میری لائف میں۔ اتنا حیدر ہاں تھا اس شاہراہ میں کہ آنکھیں بند کر کے بلا خوف و خطر دوڑ لگا سکتے تھے۔ تو نے مجھے ابھارا۔ بار بار ابھارا۔ اتنا کہ میں مجبور ہو گیا خود سے باتیں کرنے پر۔ میں نے اپنے اندر ایک خیالی دنیا بسائی۔ میں نے ایک خیالی محبوبہ اس دنیا کی کمین بنائی۔ اسے سب سے چھپا کر صرف اور صرف خود تک محدود رکھا۔ اور اب جب کہ میں اس دنیا کی سیر کرنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ تو فرماتا ہے۔ بلکہ بکواس کرتا ہے کہ میں آگ لگا دوں اس دنیا میں۔“

”تو نے کبھی کچھ سوچا تھا؟ یار ہاشم! میں انسان ہوں۔ یارو بوٹ ہوں؟ اپنے احساسات کو سنگ دی سے پھاڑ کر پھینک دینے کا ظالمانہ مشورہ کیوں دیتا تو نے؟ وضاحت کر؟“

ہاشم نے گہری سانس بھری اس کی سانس میں رافع کے ہر لفظ کی تائید تھی۔

”رافع! میں تجھے مشینی خیالات کے حوالے سے جھپٹتا تھا تو مجھے پتہ نہ تھا کہ میں ہی بادلوں کو پرے کر دیا کی طرح ہیں جو بے خبری کے سیاہ بادلوں کے پیچھے سفر کر رہا ہے۔ میں نے اسے انجاسے میں ہی بادلوں کو پرے کر دیا۔“

”رافع! اور اس چاند کی روشنی سے خوفزدہ ہو گیا ہوں یا تو اس روشنی کو ”اس“ کے نام کر لیا۔ یا پھر یہ بھادوا ہے۔ گل کر لیا۔ تم سے بہت محبت کرتا ہوں رافع! اسی لیے ایسا کہہ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم بری طرح سے پھنس جاؤ گے۔ کسی بھی وقت۔ کسی بھی وقت رافع!“

”میں نا الوقت۔“ اس کے نام کچھ بھی نہیں کر سکتا ہاشم! مجھ میں یہ خیال ڈیولپ ہی نہیں ہو پاتا۔ مجبور ہوں۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی اور خیال تو خیال ہے۔ اس سے کیا ڈرنا؟ حقیقت کی سب ہی ڈوریاں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔“

”ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ جذبے اور خیال حقیقت کو کس طرح بے بس کر دیتے ہیں۔“

”اے۔۔۔ دیکھی جائے گی!“ وہ شیر جوان کی مانند اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چل دیکھتے ہیں کون اس پمیل کے درخت کو پہلے ہاتھ لگاتا ہے۔“

”تو جیت جائے گا یا نہ!“ ہاشم نے جمائی لی۔ ”میری دراصل نیند پوری نہیں ہوئی رات کو۔ میں کچھ ست

ہو رہا ہوں۔“

”ابھی سے یہ حال ہے۔“ رافع نے شوخی سے دانت نکالے۔

”آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!“ ہاشم نے بھی خوش دلی سے ٹکڑا لگایا۔

دونوں کے زبردست قہقہے نے پاس بیٹھی چیزوں کو اڑا دیا تھا۔

”ربیعہ!“ ترانہ نے سرگوشی کی تھی۔

اور وہ تو نجانے کتنی راتوں سے جاگی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی پھلتے ہی اس کا دل جیسے کسی آہنی شکنجے کی گرفت میں آکر پھر پھرنے لگتا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے چھت پر گھورتے پنکھے کو دیکھا کرتی، بے سوچ، خیالی ذہن کے ساتھ وہ دیواروں کے اکھڑے ہوئے پینٹ سے بنے ہوئے نقش و نگار بھول بھلیوں میں پھرا کرتی۔ کمرے میں سوتے ہوئے نفوس کی سانسوں کے زبردست سستی اور اپنی کھوئی ہوئی نیند کے بارے میں سوچتی کہ کبھی وہ اس کی کتنی اچھی سہیلی تھی۔

”ربیعہ!“ ترانہ نے فوراً ہی چونکنا لازم تھا۔ ربیعہ نے آنکھیں کھول کر اپنے اوپر جھٹکے ہوئے

”اے ربیعہ! اگر ترانہ نے اسے پکارا نہ ہوتا تو وہ یقیناً ڈر جاتی۔“

”ربیعہ!“ ترانہ پھر بولی تھی۔ ”میں اوپر چھت پر ہوں۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر آجاؤ۔ کسی کو پتہ نہ چلے۔“

ترانہ بات مکمل کر کے آہستہ سے پیچھے ہٹی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی باہر کے اندھیرے میں مدغم ہو گئی۔

ربیعہ کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ چارپائی اس کی غیر متوقع حرکت پہ جھنجھلا کر کراہی

”ربیعہ! کل سہا پہن آہستہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔“

کچھ دیر کھڑی رہی مینا نے صولت کی سانسوں سے ان کی گہری نیند کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے سہا پہن کی طرف بڑھاؤ دیا تھا۔

پنکٹ چھٹا چھٹا ہوا تھا۔ قہقہے خنکی کا احساس ربیعہ کو نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے ٹھنڈ محسوس ہونے لگی۔ اس نے قہقہے بازو پھینک کر پیچھے کی کوشش کی۔ ترانہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے ہمدردی سے۔۔۔

”کیا بات ہے ترانہ!“ ربیعہ نقاہت سے بولی تھی۔ ”رات کے اس پہرے کوئی خاص بات ہے۔؟“

”ہاں۔۔۔“ ترانہ نے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”بہت خاص، یہاں اس لیے لائی ہوں تمہیں کہ یہ بات ابھی ہمارے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلے تو اچھا ہے۔“

ترانہ بہت مدھم آواز میں گفتگو کر رہی تھی۔ ربیعہ نے ڈر کر اندھیرے میں اسے غور سے دیکھا۔

”جلدی کہو ترانہ! مجھے۔۔۔ مجھے۔۔۔ ڈر لگ رہا ہے۔“

”بس رہو۔ اب تمہارے سارے ڈر اور خوف ختم ہونے والے ہیں۔ ایک نئی خوبصورت، مسکراتی ہوئی زندگی تمہارے احاطہ میں دبے پاؤں چلی آرہی ہے۔“

”ترانہ!“ ربیعہ کے لب کاٹنے، مجھ سے ایسے مذاق مت کرو۔ پلیز۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے اور ترانہ کے ہاتھوں پر گرے۔ سو تڑپ اٹھی تھی۔

”ربیعہ۔! ربیعہ! مجھے معاف کرو، میں اپنے خاندان کے لیے بہت خود غرض ہو گئی تھی۔ میں کسی شاک

پجاری کی طرح تمہارا خون بہا کر اس گھر کے لیے عاقبت مانگ رہی تھی۔ ربیعہ! بہت بڑی زیادتی کرنے جا رہی  
میں تمہارے ساتھ۔“

”ایسا نہ کہو ترانہ!“ ربیعہ آہستگی سے بولی۔ ”میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا، کوئی شکایت نہیں کی۔ پھر تم کیوں  
ایسا سوچ رہی ہو؟“

”میں جانتی ہوں ربیعہ! تم کتنی صابر، شاکر، معصوم اور نیک فطرت لڑکی ہو۔ اسی لیے تو میری نیت میں بھی  
در آیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ گھر اور اس گھر کے مکین اس لائق ہی نہیں ہیں کہ تمہاری جیسی بے غرض  
اور بے لوث لڑکی اپنی خوشیوں کی قربانی دے۔“

ربیعہ خاموش رہی۔

”مجھے معاف کرو ربیعہ! لیکن تم سے پوچھے بغیر ہی میں تمہارے مستقبل کے بارے میں ایک فیصلہ کر بیٹھ  
ہوں۔!“ ترانہ قدرے شرمندگی سے بولی۔

”میں تو یہ فیصلہ کب کا قبول کر چکی ہوں ترانہ!“ ربیعہ نے گہری سانس بھری۔ ”تم اب اس بات کا ذکر کیوں  
کر رہی ہو؟“

ترانہ نے سر اٹھا کر محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں ربیعہ! میں کسی اور فیصلے کی بات کر رہی ہوں۔“

”اور فیصلہ کیا ہے؟“

”ربیعہ! کل رات کو اسی وقت ہم لوگ خاموشی سے اس گھر سے نکلیں گے۔“ ترانہ مدہم آواز  
میں بولنے لگی۔ ”ہم لوگ یہاں جایں گے۔ یہاں عباد ہمارا منتظر ہو گا۔“

ربیعہ حیرت سے بت بنی اس کی بات سن رہی تھی۔

”ربیعہ! ہوٹل میں باری اور باری کے ایک دوست کے ساتھ عباد کے تمہارا نکاح پڑھوایا جائے گا۔ پھر  
ایک گھنٹے بعد تم دونوں رات میں بیٹھ کر کراچی چلے جاؤ گے۔ پوچھنے کے لیے۔“

”ترانہ! ربیعہ! بمشکل بول پائی تھی۔“ تمہا گل ہو گئی ہو لیا ہے۔

”نہیں ربیعہ! میں اب مکمل ہوش ہوں۔“ اس نے آچکی ہوں یہاں شاید کچھ دنوں میں پر گل ہو گئی تھی۔“ ترانہ  
سکون سے بولی۔

”جانتی ہو۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا کرنے جا رہی ہو؟ تم اس گھر کا ایک فرد ہو ترانہ! تمہارا ہر قدم اس کی بہتری  
اور بھلائی کے لیے اٹھنا چاہیے۔ اور تم یہاں آگ لگا دینے والا کام کرنا چاہتی ہو؟“ ربیعہ جذباتی ہو گئی۔

ترانہ نے ایک گہری سانس بھری تھی۔

”ہاں ربیعہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔ کچھ دن پہلے تک میں یہی سوچ رہی تھی کہ میرا ہر قدم ہر عمل صرف اپنے گھر کی  
بہتری اور بھلائی کے لیے ہی ہونا چاہیے۔ لیکن اب میں جان چکی ہوں کہ صرف اپنے گھر کے متعلق سوچنے والے  
خود غرض ہوتے ہیں۔ اپنے گھر کی خوشی کے لیے کسی معصوم کی زندگی بھونک دینا سخت ترین خود غرضی کے سوا کچھ  
نہیں ہے۔ میں خود غرض بن کر جینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”اور میں ایسا کچھ بھی کرنے پر تیار نہیں ہوں ترانہ!“ ربیعہ آہستگی سے بولی۔ ”مجھے تمہارا یہ فیصلہ منظور نہیں  
ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

”ربیعہ! ربیعہ!“ ترانہ نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ”تم پانگل مت بنو“ اس گھر میں کوئی تمہارا ایسا خیر خواہ نہیں  
ہے جو تمہارے اس ایثار اور خلوص کے بدلے تمہیں کبھی چاہت اور محبت کا ایک لفظ بھی خیرات میں دے



دے۔ مجھ سے پوچھو۔ مجھ سے۔ میں نے اس گھر کی بنیادوں کو اپنا خون جگر دیا ہے۔ اور اگر آج میری طرف سے رتی برابر بھی کوتاہی ہو جائے تو یہ لوگ میرا خون پیئیں پر آمادہ ہو جائیں گے۔ میں اپنے خونی رشتوں کو بخوبی جانتا ہوں۔“

”جو بھی ہے ترانہ! اب یہی میرا مقدر ہے۔“ ربیعہ آنسو پی کر بولی۔ ”ان باتوں پر سوچنے اور بولنے کا وزن گزر چکا ہے۔ اب تو فیصلے پر عمل درآمد ہونا پائی ہے۔ سو ہو جائے وہ۔ اور پھر میں تہن بھائی سے شادی کر لوں، لیکن عباد بھائی سے۔ کبھی نہیں۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ اور وہ کیسے مان گئے؟“ ربیعہ کی آواز بھرا گئی۔

”انہوں نے اپنی رضامندی تمہاری رضامندی اور خوشی سے مشروط کی ہے ربیعہ!“ ترانہ نے جیسے کسی گناہ اعتراف کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”اور میں قطعاً رضامند نہیں ہوں۔“

”ربیعہ! بے وقوف مت بنو۔ تم کھائی میں گرنے جا رہی ہو۔“ ترانہ جیسے گڑگڑائی تھی۔

”یہ رستہ تم نے ہی تو چنا تھا ترانہ!“ وہ یاسیت سے بولی۔ ”اب یہ کنویں کو جائے یا کھائی کو۔ میری قسمت!“

ترانہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ اپنی آنکھوں پر گر رہے تھے۔

وہ یوں روئے روئے انداز میں چلتی ہوئی فون تک آئی تھی جیسے دو سری جانب وہ دیکھ ہی رہا ہو گا۔ چند لمحے اس نے ریسور کو غصے سے گھورا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بددلتائی، پھر ریسور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہوں۔!“ وہ بولی تھی۔

”ہیو۔“ دو سری جانب صورت حال سمجھنے پایا۔

”ہوں۔!“ اس نے اصرار کیا۔

”بھئی یہ“ ہوں کیا ہے؟ نہ دعا نہ سلام نہ منہ میں کچھ رکھا ہے کیا؟

”ہاں! غصہ رکھ رہے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ پتلا کر لیا ہوا ہوا۔

”ہا ہا ہا۔“ عاشر نے خوب لطف اٹھایا تھا۔ ”بے وجہ غصہ تو نر دماغی کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ ہماری

پیاری سی بیگم صاحبہ خرم غ ہو گئی ہیں شاید۔“

”ایقان نے ایک ہاتھ سے ریسور سنبھالا ہوا تھا اور سر ہاتھ اس نے لڑنے والے انداز میں کمر پر رکھا تھا۔

”اس وقت اگر تم میرے سامنے ہوتے تا۔!“ اس نے دانت پیسے۔

”اچھا! پھر کیا کرتیں؟“ اس نے بہت سارو مانیں لہجے میں سمو کر پوچھا۔

غصہ سے بھری ہوئی ایقان دفعتاً ہی مسکرا دی تھی۔

”عاشر تم!“

”ہاں بھئی۔“ ایسے خوبصورت جملے ادھر سے نہیں چھوڑا کرتے۔“ وہ مسلسل اسے چھیڑنے کے موڈ میں

تھا۔ ایقان کو اپنی بے بسی پر رونا ہی آگیا۔ اس کے آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگے۔

”ہیلو۔“ دیکھو تمہاری خاموشی بھی خوبصورت ہے بیگم! لیکن میرا بل اگر تمہاری کھکتی آواز سے سینے توڑ دیا

اچھی بات ہے۔“

ایقان نے زور سے ”سوں“ لیا تھا۔ بصورت دیگر اسے علم ہی نہ ہوا یا کہ وہ رو رہی تھی۔

”ہائیں۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ اوہ۔۔۔ دیکھو ایقان اب بہت بری بات ہے۔ تم مجھے اتنی دور ہونے کی سزا تو مت دو۔۔۔“  
”سزا تو تم مجھے دے رہے ہو عاشر! شاید اس محبت کی جو میں تم سے کرتی ہوں۔ آخر تم مردوں کو بیوی کو اپنے  
تائے میں کیا لطف آتا ہے۔“ وہ سسک کر بولی۔

”ہاں یار! حمزہ تو خیر آتا ہے۔ لیکن آنسوؤں کا سارا لطف تو قرب میں ہے انہیں اپنے ہاتھ سے نہ صاف کر  
تسکتی نہیں جاتی۔ اس لیے تم ان آنسوؤں کو میرے آنے تک سنبھال کر رکھو۔ فون پر تو بس تم ہنستی ہوئی اچھ  
لگتی ہو۔“

”اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا تم نے؟“ وہ پھٹ پڑی۔

”میں یہاں نہیں تھا یا۔۔۔! کمپنی کے کام سے تائیوان گیا ہوا تھا۔“

”وہاں فون لا سز نہیں ہیں؟ کوئی گاؤں ہے؟“ وہ پھری ”یا میرا نمبر بھول گئے تھے تم!“ عاشر کو ہنسی آئی۔

”ایسا کچھ نہیں تھا جانو! میں بڑی بہت زیادہ تھا۔ اب معاف بھی کر دو۔ ساری کال تو تم نے لڑنے میں  
ضائع کر دی ہے۔“

”عاشر! تمہیں میرے جذبات کا بالکل خیال نہیں ہے۔“ اس نے خود پر قابو پایا۔ ”جس طرح کی صور  
حال سے میں گزر رہی ہوں۔ اس میں یوں بولا اور پریشان رہنا کتنا مشکل اور کتنا خطرناک ہے۔ تمہیں اس بات

بھی احساس نہیں ہے ایک کمانے کے چکر میں پڑ کر تم ہر طرح کی فکروں سے بے نیاز ہو گئے ہو۔ مرد کا کام صرف  
اور صرف کمانا ہی تو نہیں ہے عاشر!“

عاشر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ ایقان کا لفظ لفظ سچا تھا۔ وہ اپنی سچائی کہاں سے پیش کرتا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو ایقان!“ پھر وہ قدر سے شرمندگی سے بولا۔ ”میں واقعی اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو گیا  
ہوں۔ شاید تم پر بے پناہ یقین کا منظر ہے یہ کہ میری ایقان نے سب کچھ بہت احسن طریقے سے سنبھالا ہوا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ بس ایک اپنا دل ہی نہیں سنبھالتا ہے اس نے۔۔۔“

”اچھا یہ بتاؤ۔ حالات کی کیا پوزیشن ہے؟ ہاشم میاں کے آرمی کے لیے ہو رہے ہیں؟“

”اگلے ہفتے بارہ بجے تک کسی ایسی کاپیاتیوں میں لگے ہوئے ہیں۔“

”میرے بچوں کے کپڑے بہت اچھے ہوئے جا نہیں آتے اور یوں لگتے ہیں۔“

ایقان نے گہری سانس بھرنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

”اپنا خیال رکھنا۔ اور بچوں کا بھی سب کو سلام کہنا۔ خدا حافظ۔“

لائن ڈس کنکٹ ہو گئی تھی۔ ایقان نے بے دلی سے ریسور رکھا۔ الفاظ جیسے اپنے معنی اور اپنا اثر کھوئے  
جارہے تھے۔

\*\*\*

نافع اور علی ڈھول کا ایک ایک سائیڈ بری طرح سے پیٹ رہے تھے اور حمزہ کھڑا لڈی ڈال رہا تھا۔ لڑکیوں کی لڑائی  
رستے میں ہی رک گئی تھی اور اب حیرت اور غصے سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

”یہ یہ پھاڑ دیں گے اس ڈھول کو۔“ ثانیہ قدرے خفگی سے بولی۔ ”جنگلیوں کی طرح سے پیٹ رہے  
ہیں۔“

”اوسا اوسا اوسا۔“ حمزہ نے اس کی بات سن کر افریقی قبائلیوں کی سی تان لگائی۔ علی اور نافع نے

# قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے، لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے محفوظ رکھیں۔

بھی کانگوا سائل اپنا لیا۔ اب حمزہ قبائلیوں کا مخصوص رقص پیش کرنے لگا۔

”بھئی کیا بد تمیزی ہے یہ۔۔۔“ ”وہ بھنا کر آگے بڑھی۔“ ”ہم نے یہاں یہ سارا رقص منٹ تمہارا یہ جنگلی رقص دیکھنے کے لیے نہیں کیا ہے۔ واپس دو ہمارا ڈھول۔۔۔ ہمارا بہت اچھا موڈ ہے اس وقت۔ اسے خراب مت پلیر۔“

”ان سب کو درختوں سے باندھ دو۔ اور لاؤ روشن کیا جائے!“ علی نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے پر پڑا۔ انداز میں باندھ لیا۔

”یہ ایسے نہیں ماننے والے۔۔۔“ ماہین نے حسام کو گود سے اتارا اور آگے بڑھی۔

علی اور حمزہ بڑی بہن کو خطرناک تھوڑوں سے اپنی جانب آتا دیکھ کر بدک کر بھاگے۔ نافع بیٹھا مسکراتا رہا۔ وہ اپنا رشتہ بخوبی پہچانتا تھا۔ ماہین کے بھائی مسکرا دیے۔

”تم کیا سمجھتے ہو؟ بہت لمبا کڑوں کی میں مارا ہے؟“

”کرنا تو چاہیے!“ وہ شرارت سے ہنسا۔

ماحول کی خوش گواریت محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک شریر سی نظر لڑکیوں کے درمیان کھڑی عریشہ پر ڈاٹھی۔ عریشہ کے گال سرخ ہو گئے۔ اس کے اندر ناگواری کی بہت منہ زور لہر اٹھی تھی۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

”اے جنتی!“ اب ماہین قدرے رسوائیت سے بولی۔ ”نہیں تو ہم آپ کے جوتے چھپا دیں گے۔“ ایک قہقہہ لگا۔ نافع سچ بچ بہت فحش ہوا تھا۔ کان کھجا تا وہ لڑکیوں کے درمیان سے نکل بھاگا۔

”پیلو تان سین کی شاگردوں تان لگاؤ!“ ماہین نے ڈھول بجا لیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی اس ساز کو بجانے میں مہارت رکھتی تھی۔

اس نے ایک ہاتھ ڈھول پر مارا اور اگلے ہی پل دکھ سے چلائی۔

”کیا ہوا ہے؟“

لڑکیاں چونک اٹھیں۔ ڈھول کا پرہ چاک ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے سر پیٹ لیے۔



بہت دیر تک وہ فون کے پاس ہی کھڑی رہی تھی پھر اسے دھیان آیا۔ لڑکیوں کا ارادہ تو پچھلے لان میں جمع ہو کر گانے بجانے کا تھا۔ وہ بھی رائے کے ساتھ وہیں جا رہی تھی جب عذرا بیگم نے اسے عاشر کے فون کا بتایا۔

فون کے پاس سے ہٹ کر وہ رافع کے کمرے سے نکل آئی۔ بے دلی اور بے دھیانی کے عالم میں اس نے پہلا میٹر ہی پر نجانے کس طرح سے قدم رکھا تھا کہ پیراس کا بوجھ نہ سہا رہا۔ ایقان ایک دردناک چیخ کے ساتھ لڑھکتے ہوئے آخری میٹر ہی پر آگری تھی۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ)

ایقان کے دوبارہ استفسار پر شہلا، ہاشم کے لیے نیم رضامندی کا اظہار کرتی ہے۔ فردوس بیگم بھی بیٹے کی خواہش پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

ترانہ ربیعہ کو یونیورسٹی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر گناؤں کے الزام لگاتی ہے۔ جس پر ترانہ صولت کو تھپڑ مارتی ہے اور اسے سنگین ناکج کی دھمکی دیتی ہے۔

انیقہ ابرار جیلانی کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے کہ وہ عمر کو شہلا سے نہیں چھینے گا۔

پارک میں ربیعہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن۔ پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس کے پارک جانے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

فردوس بیگم اپنی ساس اور سند کے ساتھ جا کر شہلا کو منتہی کی انگوٹھی پسنا تی ہیں، شہلا ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ شادی کے بعد عمر کو اپنے ساتھ رکھنے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

تمدن ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اس پر غم کا پاپاڑ اس وقت ٹوٹتا ہے جب مینا بیگم تمدن سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔



”اٹھو بیٹی۔ یہ ذرا سی بخنی پی لو۔“ شفیقہ حیات نے بہت محبت سے اسے دیکھا۔

ایقان نے بے دلی اور جب زاری سے بخنی کا پیالہ دیکھا پھر اس نے نفی کی سر ہلا دی۔

”نہیں اماں! بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا ہے۔“ بخنی بھا بھی جان اپنے زیر ستی ایکسچینج لایا تھا۔ اب تو ذرا بھی من نہیں ہے۔“

”نہ بیٹی!“ انہوں نے اسے دیکھا۔ کارا نے اسے دیکھا۔ من نے دیکھا۔ بخنی نے دیکھا۔

اتنی ہی جلدی اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ گی اپنے پیروں پر۔ شاہناش۔

ایقان چند لمحے چھت کو گھورتی رہی۔ دنیا بھر کی بے زاری اور کوفت اسے اپنے اندر بھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی سے کلام کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ آنکھیں موند کر لیٹے رہنا ہی ہر غم کا علاج محسوس ہوتا تھا۔

شفیقہ حیات اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ ان کے انداز میں محبت بھرا اصرار تھا۔ ایقان کو محبت سے منہ موڑنا دنیا کا مشکل ترین کام لگتا تھا۔ وہ ناچار اٹھ کر بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے پیالہ لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

”ایسے جموٹے موٹے حادثات تو عورت کے مقدر کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں بیٹی! ان کو اس طرح دل پر لے لینا اچھا نہیں ہے۔“

انہوں نے موقع غنیمت جان کر اسے سمجھانا چاہا، ورنہ وہ تو پچھلے چار دن سے کسی سے دو لفظ بولنے پر آمادہ نہ تھی۔ کسی بے جان لاش کی طرح دن رات آنکھیں بند کیے لیٹی رہتی۔

ایقان نے پیالہ لبوں سے ہٹا کر ماں کو ایک نظروں دیکھا۔ اس کی نظروں میں افسردگی اور عجیب سا گلہ تھا۔ شاید ان کی بات اس کے دل پر لگی تھی۔ شفیقہ حیات اس کی نگاہوں کی زبان سمجھ گئیں۔

”اٹھ اولادیں ہوئی تھیں میری چار بیٹیاں اور چار بیٹیاں۔ ان میں سے صرف چار نے زندگی پائی۔ اللہ تم چاروں

”شہلا کی زندگی میں پھر سے بہار لوٹ آئے اس کے لیے اس کی خلعمانہ کوششوں کا بہت ہاتھ ہے۔ ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر خوشی منانے کو تو میرا دل بھی ہامی نہ بھرتا اور شہلا۔۔۔ وہ کہاں مانتی تین دن بعد نہ سہی دس دن بعد تھی۔“

انیقہ نے نظروں کا زادیہ بند کرنا نہیں دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دی۔  
 ”کہنتی تو آپ کھیک ہی ہیں۔ ایتقان آپ کی کا بہت ہاتھ ہے یہ رشتہ یوں آسانی سے طے ہو جانے میں اور ان کے بغیر تو شادی میں بالکل بھی مزہ نہ آتا۔“  
 ”شہلا کہاں ہے؟“ منیڑہ بیگم نے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”صبح سے کمرے سے ہی نہیں نکلی۔“

”بیگم! ہوں گی اداس شاعری کی کوئی کتاب کھولے۔ عجیب ہی مخلوق ہیں قسم۔ میری شادی اتنی قریب ہو تو میں صرف شادی کے گانوں کی کتاب برصوں اور اچھے اچھے گانے سلکٹ کروں؟ نہیں تو کوئی دل چسپی ہی نہیں ہے۔ میں نے اتنا اچھا ایشن لا کر دیا تو بولیں۔ مجھے اس کی خوشبو سے سخت المرجی ہے۔ مہندی کے ڈیزائن دکھائے تو بولیں۔ کوئی نئی ہلکا سا ڈیزائن ہو زیادہ تیل بوٹے نہ ہوں۔ ان کا بس چلے تو سفید رنگ کا ویڈنگ ڈریس پہن کر بیٹھ جائیں۔ شادی والے دن۔ کہہ دیں گی کیا فرق پڑتا ہے۔ سچ کل تو اس جملے کی رٹ لگائی ہوئی ہے انہوں نے۔“

انیقہ جھلک رہی تھی۔ منیڑہ بیگم مسکراہٹ لبوں پر سجائے اسے دیکھتی رہیں۔  
 ”ہاں تو دلینا۔۔۔ کتنی ہی ہیں سفید لباس بھی۔“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”مجھے تو خود بہت پسند ہے سفید لباس۔“  
 ”ہائیں۔۔۔“ انیقہ نے سب سے ان کی صورت دیکھی۔ ”کمال ہے امی۔ اچھا! آپ نے کون سے رنگ کا لباس پہنا تھا اپنی شادی میں؟“  
 ”سفید۔۔۔“  
 ”انیقہ حیران ہو کر ان کی صورت دیکھتی رہی۔“

اس سے ساتھ ساتھ ہی ہوئے عمر اور مومن کو دیکھا پھر مسکرا دی۔ وہ نما کر و اش روم سے نکلی تھی۔ نیلے بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے وہ کھڑکی تک چلی آئی اور یہ ہٹا کر سلائیڈنگ ڈور کھسکا دیا۔ باہر منظر خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادلوں کے سرمنی ٹکڑے چل قدمی کر رہے تھے۔ کہیں چھپے ہوئے سورج کی کرنیں ان کے کناروں کو روپوشی بخیل لگا رہی تھیں۔ ہوا میں نامعلوم سی خوشبو تھی۔ شہلا کی خوبصورت سیاہ آنکھیں بادلوں سے پرے دیکھنے کی جستجو کر رہی تھیں۔ سپاس رکھے موبائل کی لیمپ بجھنے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

”سیا۔۔۔ شہلا۔۔۔“ دوسری جانب موڈ خوشگوار تھا۔  
 شہلا کا سانس لمحہ بھر کے لیے اس کے سینے میں مقید ہوا پھر پھر پھڑپھڑا کر نکلا۔ اس سے کچھ بھی نہ بولا جاسکا۔  
 ”شہلا! ابرار بات کر رہا ہوں۔“  
 ”یہ۔۔۔ یہ نمبر۔۔۔“ وہ ہٹائی۔

کو سلامت رکھے۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو تم لوگ لیکن جو چار نہ رہے ان کا دکھ آج تک سینے میں محسوس ہوتا ہے۔“ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اس زمانے میں نہ تو پیدائشی ٹیکوں کا طریقہ بچاؤ تھا نہ ہی دوسرے جدید علاج نکلے تھے بیماریوں کے۔ بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے دیکھا ہے میں نے۔ اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجا ہے۔ بناؤ بیٹی! ہم بھی جیتے ہیں ہنستے ہیں کلام کرتے ہیں تم لوگوں کی خوشیوں اور تندرستی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ تم اس حادثے کو جو روگ بنائے بیٹھی ہو۔ بچے تمہارے ارد گرد پھر پھرا کر مایوس ہو کر کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ کچھ ان کا خیال کر انہیں بیمار دوسلی دو۔ عجیب ہونق سے پھرتے ہیں دونوں۔“

ایتقان کو ماں کی باتوں سے یک گونہ تسلی ملی۔ اس کے دل کو قرار سا آیا۔  
 ”کہاں ہے ایمان؟ کس کے ساتھ ہے؟ اور مومن کیا کر رہا ہے؟“ اس نے بے چین سے ہو کر پوچھا تھا۔  
 شفیقہ حیات مسکرا دیں۔

”ایمان کو دورہ اپنے ساتھ لے گئی ہے اور مومن کو شہلا ساتھ لے گئی تھی صبح جب۔۔۔“ اس فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی کھانا کھا کر عمر کے ساتھ ہی سو گیا ہے۔  
 ایتقان کے لبوں پر بھیجی بھیجی سی مسکراہٹ پور آئی۔ اس نے بخٹی کمالہ سائیڈ ٹیبل دھو دیا۔  
 ”کیا سوچتی ہوگی شہلا بھی اور بے چارہ ہاشم! کس قدر خوش تھا اپنی بزرگت کے تصور سے۔ میں نے اس۔۔۔“  
 اراٹوں کو مزید انتظار کی سزا سنائی۔

”اے لوسہ! اچھی کی۔“ انہوں نے برا مان کر اسے دیکھا۔ ”بیٹی! لکھے پر کس کا زور؟ جس وقت ملنا لکھ دیا ہے اسی وقت ملیں گے۔ نہ گھڑی بھر آگے نہ گھڑی بھر پیچھے۔ تم سے بھلا کسی کو کیا شکایت ہوگی۔ تم تو خود اہم وقت سب کی توجہ اور ہمدردی کے لائق ہو۔ لا حول ولا قوۃ۔ یہ کیا کچھ خرافات سوچتی رہتی ہو تم۔“  
 برات چلی جائے گی۔ ہمارے ہاں صد شکر کہ شبہ گھڑیوں کا فضول ہے۔ ہوتا ہے۔  
 وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسی لمحے عذرا بیگم جوس کا کلاس لے کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ ایتقان کے لبوں پر چاہتے ہوئے بھی اداس سی مسکراہٹ عود گئی۔  
 ”لیجئے! آگلی شفٹ تیار ہے۔“ وہ بولی۔  
 شفیقہ حیات بھی مسکرا دی تھیں۔

## URDU PHOTO

”بے چاری ایتقان!“ منیڑہ بیگم تاسف سے شہلا کے کپڑے اٹیچی کیس میں رکھتے ہوئے بولی تھیں۔ ”دوسرے قدر خوشی خوشی شادی کی تیاریوں میں حصہ لے رہی تھی اور ناگہانی حادثہ پیش آگیا۔“  
 ”بس امی جی!“ انیقہ نے گہری سوچ کے اثر سے نکل کر سانس بھری۔ ”میرا دل تو لمحہ بھر کے لیے جیسے کسی مٹھی میں دیوچ لیا تھا۔ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اچانک ہوا کیا ہے۔ جس تاریخ کا اتنے دن سے شدت سے انتظار تھا وہ تین روز بعد ہے لیکن اب۔۔۔“  
 ”دل برا نہ کرو۔“ منیڑہ بیگم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”انہوں نے زیادہ دن آگے نہیں بڑھائے صرف ہفتہ بھر کی مہلت مانگی ہے۔ ایتقان صحت یاب ہو جائے، ہنسی خوشی شادی میں شریک ہو تو ہمیں بھی خوشی ہوگی۔“ پھر وہ کچھ سوچنے لگی تھیں۔



”عمر نے بڑا ہنسا۔“ وہ ہلکے ہلکے انداز میں بولا۔

”لیکن۔۔۔ لیکن آپ کو اس طرح سے مجھے فون نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے خفگی سے بولی۔  
وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ ”تمہیں برا لگا؟“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔  
شہلا اس غیر متوقع سوال پر جھنجھلا سی گئی۔

”بات اچھا یا برا لگنے کی نہیں ہے ابرا۔ ہمارے بچ کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔

”شہلا! بہت سے لوگوں سے ہمارا کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں ہوتا پھر بھی ہم ان سے ملتے ہیں بات کرتے ہیں۔“

”ابرا! جو تعلق بن کر ٹوٹ جائیں ان میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔“

”گنجائش نکالی جاسکتی ہے شہلا!“ وہ قدرے لجاجت سے بولا۔ ”تو تنگ دل کیوں بن رہی ہو؟“

”ابرا! پلیز۔۔۔“ اندر قدم رکھتی انہیہ ٹھنک کر رکی تھی۔ دروازے کی جانب شہلا کی پشت تھی۔ انہیہ کی طرف سے ایک طرف ہو گئی۔

”شہلا! کچھ مانگ تو نہیں رہا ہوں تم سے میں صبر کرو۔ چند خوشگوار لمحوں میں جو یہ سوچو۔۔۔“ شہلا نے جھنجھلا کر کہا کہ کون سا تعلق تھا کون سا ہے کون سا ہو سکتا ہے۔ تم اس قدر غمناک کیوں ہو رہی ہو اور پھر ہمارے درمیان ایک تعلق ایسا ہے جو ٹوٹنا ناممکن ہے۔ میں اور تم ایک دوسرے میں بندھے ہیں اور اس دور کا نام عمر ہے۔ کیا تم اس حقیقت سے انکار کر سکتی ہو؟ کیا یہ سچ نہیں کہ تم جس بچے کو دیکھ کر جیتی ہو، میں اس بچے کا باپ ہوں۔“

شہلا کا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن لپکتی ہوئی تھی۔

”ابرا! تم۔۔۔ تم آخر کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا۔۔۔ کیا چاہتے ہو تم؟“

”شہلا! میں تو صرف تمہیں۔۔۔ نئی زندگی کی ابتدا کی مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔“ وہ فوراً ہی بولا۔ ”تین دن بعد تم کسی خوش قسمت کے درو دیوار سجانے جا رہی ہو۔ میں نے سوچا تمہیں دس کروڑ۔“

”تین دن بعد نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”ایک مسئلے کی وجہ سے یہ سب ممکن نہیں ہے۔“

”اچھا۔“ وہ گویا مسکرایا تھا۔ ”مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری سانس میرے حلق میں پھنسی ہوئی ہو۔ تم نے کچھ ریلیف سادیا ہے یہ خبر سنا کر۔“

”ابرا! پلیز مجھے اس طرح ڈسٹرب مت کرو۔“ شہلا کو روکنا آئے لگا۔

”اوکے۔“ وہ فوراً بولا۔ ”تم ڈسٹرب مت ہو۔ میں تمہیں بالکل بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا۔“

”خدا حافظ۔“ شہلا حتمی انداز میں بولی تھی۔

”عمر کا خیال رکھنا شہلا!“

”تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔ ”میں اس کی ماں ہوں۔“

”جانتا ہوں۔“ اس کا لہجہ مٹھاس لیے ہوئے تھا۔

شہلا پھر خشکی تھی۔

”پھر بھی۔۔۔ میں یہی کہوں گا۔۔۔ عمر کا خیال رکھنا۔ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔ ٹیک کیئر۔“  
رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ شہلا نے گہری سوچ میں ڈوب کر موبائل سائیڈ پر رکھ دیا۔  
ابرا کے انداز غیر متوقع تھے۔ شہلا کو کسی گزیر کا احساس ستانے لگا تھا۔ وہ چند لمحے پہلے جن بادلوں کو پر شوق انداز میں دیکھ رہی تھی اب ان ہی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ موسم یک لخت ہی بدل رہا تھا۔  
باہر کھڑی انہیہ ایک عجب کش کش میں گرفتار آئی ہی سوچوں سے جنگ کرتی اپنے ہی واہموں کی نفی کرتی مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب برہہ گئی تھی۔

\*\*\*

موسم ابر آلود تھا۔ ربیعہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ اسے انداز نہ تھا کہ اچانک ہی ماحول میں اس قدر تبدیلی آجائے گی۔ وہی بادل جو کچھ دیر قبل خوشگوار سرمئی رنگت لیے ہوئے تھے، یکایک کالے سیاہ ہو گئے۔ کوئل، متوالی ہوانے اچانک ہی چولا بدلا اور بھیڑیوں کی شکل اختیار کرنے لگی۔ پانی کے موٹے موٹے قطرے ان کے اوپر اور پھر چاروں طرف گرنے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے اوپر چھت سی بنانے کی ناکام کوشش کی پھر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ادھر ادھر دھڑکھا۔

انہیہ احساس ہو گیا کہ اپنی دھن میں چلتے چلتے وہ آبادی سے بہت دور نکل آئی تھی۔ وہ تو جیسے کسی سنسان سی چراگاہ میں پہنچی ہو۔ اس کے آس پاس آگے پیچھے بھوسے کے ڈھیر بنے ہوئے تھے۔ دور کسی جنگل کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس مشکل گھڑی میں کہاں جائے، کس سے مدد مانگے؟ بارش آہستہ آہستہ شدت سے پکڑنے لگی۔ ہواؤں کے جھکڑ اسے دھکیلنے لگے۔ ماحول کالا سیاہ ہوتا چلا گیا۔ سارے منظر جیسے نگاہوں سے چھل ہو گئے تھے۔

”کہاں جاؤ گی؟“ آخر میں جاؤں؟“ ربیعہ کے دل نے دہائی دی۔

”میں کبھی نہیں جانتی تھی کہ یہاں آؤں۔“ ہوا مانی کی طرح ہر اسان کرنے لگا۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین غائب ہونے لگی۔ اس کے لیے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔

”میں کہاں جاؤں؟“

”میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔“ اس نے ادھر ادھر دھڑکھا۔ آواز کہاں سے آرہی تھی اسے انداز نہ ہو سکا۔

”ربیعہ۔۔۔ ربیعہ! یہاں آؤ۔ یہاں۔۔۔ میرے پاس۔۔۔“ دعوت میں اصرار تھا۔

ربیعہ مزید پریشان ہو گئی۔ اس کا ذہن آواز سے شناسائی محسوس کر رہا تھا لیکن وہ کس کی آواز تھی اسے پوری طرح سے انداز نہ ہو پایا تھا۔

”دادی۔۔۔ دادی۔۔۔“ ربیعہ نے زور سے پکارا۔ ”دادی۔۔۔ یہ آپ ہیں؟“

اس کی اپنی ہی آواز کی گونج ناکام ہو کر پلٹ آئی۔ دعوت دینے والی آواز اب غائب تھی۔

”دادی۔۔۔ دادی۔۔۔ آپ کہاں ہیں؟“ آپ کہاں ہیں؟“ وہ چلائی۔

چاروں طرف اب گہرا سناٹا تھا۔ ربیعہ نے محسوس کیا بارش اب ختم ہو گئی تھی۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں کبھی کبھار کوئی بوند ٹپک کر سناٹا توڑتی تھی۔ اس ٹپ ٹپ کی آواز میں عجیب سی تنہائی کا احساس اور خوف تھا۔ ربیعہ کو شدت سے خوف محسوس ہوا۔

”ربیعہ!“ کوئی اس کے بالکل قریب سے بولا۔

اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم کا رواں رواں  
کھڑا تھا۔ اس کا حلق دھوپ میں پڑے ہوئے گھڑے کی مانند خشک ہو رہا تھا۔ بدن میں ارتعاش تھا اور اسے سردی  
لگ رہی تھی۔

وہ کچھ دیر تک اسی طرح لیٹی کانپتی رہی پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھی۔ اپنے سن ہوتے ہاتھوں کو آپس میں مل کر اس نے بدن کے ارتعاش اور سردی کے احساس کو ختم کرنے کی کوشش کی پھر پیروں میں پڑی ہوئی چادر اٹھا کر اوڑھ لی۔ وہ پانی پینا چاہتی تھی۔ آہستہ سے چارپائی سے اتر کر اس نے چادر کو اچھی طرح سے اپنے ارد گرد لیٹا اور باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ کمرے سے باہر نکل کر وہ کچن میں جانا چاہتی تھی؛ جب اس نے منور امین کے کمرے سے آئی ہوئی آوازیں سنیں۔

ربیعہ کو چند لمحوں تک ان ٹھٹھی ٹھٹھی آوازوں کا مفہوم سمجھنے میں نہ آسکا پھر وہ قدرے تیزی سے ان کے کمرے کی جانب بڑھی۔ اس کے ہی پل وہ دروازے کے ایک طرف: گئی تھی۔ کمرے کا منظر ناقابل برداشت اور ناقابل یقین تھا۔

تہاں نے منور امین کو گردن سے پکڑا ہوا تھا اور وہ انہیں جھٹکے دے رہا تھا۔ ربیعہ نے اپنی بیٹی کو اندر لے گئے  
کے لیے لبوں پر سختی سے ہاتھ رکھ لیا۔

”تمہیں وہ رقم مجھے دینی پڑے گی۔۔۔ سمجھے تم۔۔۔ وہ یہ ہیں تمہیں بیان ہے کہ وہ لوگ جان لے لوں گا میں تمہاری۔“

تہاں بہت دلی دلی لیکن نہایت درشت آواز میں بول رہا تھا پھر اس نے انہیں چھوڑ دیا۔ وہ کھانسنے اور ہانپنے لگے تھے۔ ربیعہ نے خوف زدہ نظروں سے ذرا کی ذرا ابد رجھا نکا۔ وہ سہم کر رہ گئی تھی۔ ساٹھ واٹ کے بلب کی زرد سی روشنی میں تہاں کسی دیوانے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں چڑخی، منہ اور سرخ تھیں۔ لبوں سے گویا جھاگ سا نکل رہا تھا۔

"بد بخت۔ کیسے۔ نافرمان۔ منور امین نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ "تو کیا سمجھتا ہے میری جان لے کر تو وہ رقم پالے گا؟ کبھی نہیں مردانہ، کبھی نہیں۔ لمبے لئے تو میری جان بار دے مجھے میں دیکھتا ہوں کیا ملے گا تجھے چڑیا کی بیٹ بھی مل جائے تو کہنا ناخلف نہ ہو کا تھکے کٹر کٹر اور برا جسم۔ کھول کھول کھول۔ کھول کھول کھول۔"

**P.T.O.**

”ہو نہ! تمدن نے سر جھکا۔“ تم اپنی فکر کرو بڑھے! جیسے میں جانتا نہیں تمہاری پیار سالی کو۔ تمہاری قبر میں کیا کچھ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“  
و اپنی چھتری دھونڈنے لگا تھا۔

ربیعہ نے خود بر قابو پانے کی کوشش کی اور واپس جانے کے لیے مڑی۔ اس کی چیخ بس نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ اس کے پیچھے ترانہ گھڑی تھی۔

”ترانہ۔۔۔ ترانہ۔۔۔! میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“ وہ کانپتے ہوئے بول رہی تھی۔ اسے جیسے بخار چڑھنے کو تھا۔  
ترانہ نے متاسف نظروں سے اسے دیکھا پھر اس نے اپنی مثال اتار کر اسے پہنا دی۔

و دونوں جہمت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ چار بجے کا عمل تھا۔ اتق پر اب پو پھٹنے کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ باد نسیم

رک رک کر چلی رہی تھی۔

”میں نے تم سے کہا تھا نار بیہ! لیکن تم نہیں مانتی۔“ ترانہ بولی۔ ”جانتی تھی میں۔ بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ تمہارا نازک دل ان حالات کو برداشت کرنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ مر جاؤ گی تم یہاں۔ کتنا سمجھایا میں نے تمہیں۔ لیکن تم نہیں مانتی۔“

”پلیز۔ پلیز ترانہ!“ وہ ہلکی انداز میں بولی۔ ”میں نے اس وقت جو کچھ دیکھا ہے، اس کے بعد میں اگر یہاں رہی تو یا تو مر جاؤں گی یا پھر پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے یہاں سے بھیج دو، کہیں دور بھیج دو۔“

ترانہ اپنے لب کاٹتے ہوئے کچھ سوچنے لگی تھی۔  
 ”اس کی بہن کی شادی تھی۔“ پھر وہ بولی۔ ”ہو سکتا ہے وہ کراچی چلا گیا ہو پھر تو کیا کیا ہوں گی میں تمہارے

لیجئے۔ یہ لوگ زبردستی تمہارا نکاح پر رضوا دیں گے۔“  
ربیعہ کی نظموں میں تمدن کا وحشت ناک چہرہ گھوم گیا۔ وہ تھر تھڑکا پنے مکی۔ ترانہ نے اسے خود سے لپٹا لیا۔  
ربیعہ سنسنے لگی تھی۔

”میں اب رووڑ بیچے! جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ مت روؤ۔۔۔“ ترانہ نے اسے تھپکا۔

بچوں کی طرح سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”نہیں ہوں گے۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ عباد بھائی مجھے مشکل میں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“

”تم ٹھیک رہ رہی ہو۔“ ترانہ بولی۔ ”وہ تمہارے لئے بے حد فکر مند تھا، کچھ کرنا چاہتا ہے و تمہارے لیے۔“

”ترانہ لکھ میرے لیے جو بھی بہتر سمجھتی ہو، وہ کرو۔“ ربیعہ نے گویا ہار مان کر کہا تھا۔ ”مناطے سے کہ میں تمدن

بھائی سکرے۔ اتنے زندگی گزارنے کا اب سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں سے کیا جانتی تھی ترانہ۔ اگے وہ اس

“

۱۰۔ اپنی بات مکمل نہ کرنا۔ آنسوؤں سے اس کا گلا بندھ گیا تھا۔ ترانہ کسی سوچ میں گم تھی پھر اس نے سر

[illegible]

”اگر وہ کسی اور سے ملے تو اس سے کہیں کہ میں نے تم سے ملنے کی کوشش کی تھی۔“

رہا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ چلی جاؤں۔ چاہتا تھا اس سے کہیں نہ ملے۔

اس پر بریں ملکہ ہوئے اور ان کے پاس جو کچھ تھا اسے سارے دیوے دیا۔

(مستطاب)

7-2019

1999

”السلام علیکم۔“ دونوں نے ایک ساتھ کہتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔

ایقان نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا اور کسل مندی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ابھی ابھی اس کی آنکھ لگی تھی۔ اس کا

مخنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی اخلاقی تقاضے نبھانے کی خاطر وہ اٹھ بیٹھی۔

وہ دونوں اس کے سامنے پڑی کر سبیل پر آ بیٹھے تھے۔

”لیسی ہیں پچھو اب آپ؟“ رافع اس کے پاس پر بے ہوئے انگوٹھ رکھنے لگا۔

”بھیک ہوں۔“ ایقان نے ایک شرمندہ شرمندہ سی نظر ہاتھ پر ڈالی۔

جھکنا۔ بہت ہمدردی اور اپنائیت سے مسکرا رہا تھا۔ ایقان نے آنکھوں میں بھرا آنے والے پانی پر قابو پایا اور پلکیں

دوہرہ نہ ہو

”بھئی پچھو! یہ بہانے نہیں چلنے والے۔“ ہاشم دفترا بولا۔ ”آپ نے تو گھر میں دیرانی پھیلا دی۔ انٹوائ

کھٹوا لی۔ وہ کیا ہوتا ہے یار! وہ لے کر پڑ گئی ہیں۔ انھیں بھی۔ وہ لہا کی پیچھو ہیں خیر۔ کوئی ڈھول تاشے کوئی گانے شانے یا۔۔۔

ایقان چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول بھال کر مسکرانے لگی۔  
 ”ہاں پیچھو! وہ کون سا گانا تھا جو آپ سلامی مشین کا ڈبہ بجا کر گایا کرتی تھیں اپنی گڑیا کی شادی میں؟“ رافع ذہن پر زور دینے لگا۔

”میں لکھ لکھ بھیجوں بتا شے میں۔“ ہاشم کو نکلایا دیا گیا۔  
 ”اللہ ہٹو بھی۔“ ایقان کو بے حد شرم آئی۔ ”کون کون سی باتیں یاد کر رہے ہو۔ بے وقوف۔“  
 ”ہاں ہاں۔ کیا تھا وہ۔ میں لکھ لکھ بھیجوں بوتل میں سیال آؤ گے کون سے بوتل میں۔“ رافع کو پورا مصرعہ یاد آ گیا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔  
 ”پیچھو! یہ گانا تو ضرور سننا ہے آپ سے۔ آخر آپ کی عزیز از جان سہیلی کی شادی ہے۔“ ہاشم خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

”ابے راجھے!“ رافع نے اسے چھیڑا۔ ”تو عزیز از جان بھتیجا بھی کہہ سکتا تھا لیکن وہ کیا کہا ہے شاعر نے بات کوئی ہو تیرا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔“  
 ہاشم کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے ہنسی رنگ بکھرے۔ ایقان اب دل چسپی اور شوق سے ان کی باتیں سنتے ہوئے مسکراتی ہوئی تھی۔

”ہر بات میں پیچھو کی سہیلی کا ذکر نکال لیتا ہے یہ۔“  
 ”ارے یار! حکم زباں بندی کی اس قدر طویل سترا بھگتائی ہے اسی کا ردِ عمل ہے یہ۔“ ہاشم نے بات کا اثر کم کرنے کی کوشش کی۔ ”بندر اتنا اشاک جمع کیجئے وقتاً فوقتاً بھگتا رہتا ہے۔“  
 ایقان چند لمحے محبت سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس سے بڑی سادگی بھری تھی۔

”تم بھی سوچتے ہو گے ہاشم! اچھی بھلی طے شدہ تقریب میری وجہ سے۔“  
 ”افسوسہ یار! پیچھو! ہمیں کیا بات کا لگا ہے آپ کو؟ ہم میں غم ہی ایسا سوچ سکتا ہے؟ آپ ہماری ہیں۔ ہم میں سے ہیں۔ غیروں کی سی بات کیوں کی آپ نے۔ ہمارے دکھ، ٹھیکہ، خوشی، غم، تکلیف، راحت سب مشترکہ ہے یار! اور پھر خوشی کو تو ہم اپنی منہی میں قید کر چکے ہیں۔ اب یہ بھاگنے والی نہیں ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔“

”اور جھٹ پٹ بھلتی چنگی ہو کر ڈھول سنبھالیں۔ وہ گانا ہم نے ضرور ہی سننا ہے۔“ رافع نے مزے سے فرمائش داغی۔

”کوئی نہیں سننا گانا وانا۔“ ایقان نے صاف انکار کیا۔ ”میں ہر گز اتنے پرانے گانے نہیں گاؤں گی۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ یہ اتنی پرانی خاتون ہیں۔“  
 ہاشم اور رافع نے ایک مرتبہ پھر قہقہہ لگایا۔ اس مرتبہ ایقان بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئی تھی۔



”تائی امی! اندر آ سکتا ہوں؟“ وہ پر شوق انداز میں اندر جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔  
 ”زیور است کی جانچ پڑتال کرتی ہوئی فروس پیگم لکھتے ہی بوکھلا اٹھیں۔“

”ہائیں۔ کون۔ نافع۔ ارے اونچے۔ آؤ۔ یوں غیروں کی طرح یا ہر کھڑے ہو کر پوچھتے ہو کہ ہمیں ہی شرم آجاتی ہے۔“

انہوں نے بڑی بڑی ہنسی کی۔ ہیکو کو ڈبے میں واپس ٹھونسنے کی کوشش کی۔ نافع خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اندر چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیک کیا ہوا ڈبہ تھا۔

”یہ کیا اٹھا لائے؟“ انہوں نے جیسے کی گمانی سنبھالتے ہوئے اس کا ہاتھ میں تھاما ہوا ڈبہ بغور دیکھا۔

نافع نے قدرے جھینٹے ہوئے ڈبہ دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

”آپ کیا کر رہی ہیں مائی امی!“ اس نے بات بدلنے کی کوشش کی جو کامیاب ہوئی۔

”ارے نیچے! کیا انہوں تم سے دس ہزار جھنجھٹ چھٹے ہوئے ہیں جان کو۔ میری لڑکیاں تو کسی کام کی نہیں ہیں۔ اب یہ دیکھو۔ کچھ پرانا زیور بھی بری میں رکھنے کا سوچ رہے تھے۔ اسی کا مینا اور ٹکینے دیکھ رہی تھی۔ مہینہ بجا رہی تو جوڑے ٹانگ رہی ہے۔ عریشہ کو اپنی ازلی ڈھنکائی سے فرصت نہیں۔ ہتیرا کمالڑکی سے کہ میری نظراب کام نہیں کرتی سزا ان جھکیوں اور گلوبند کے ٹکینے چیک کر لے۔ مجال ہے جو یہ سنے کسی کپہات۔“

وہ قدرے غصے اور جھنجھلاہٹ کا شکار تھیں۔ سو انہوں نے نافع کے سامنے بھی عریشہ کی داری کی ضرورت محسوس نہ کی۔

”لایئے مجھے دیں۔ میں چیک کرتا ہوں۔“ اس نے مخلصانہ پیش کی۔

”اچھا۔ تم کر لو گے۔ ہاں کر تو سکتے ہو؟“ انہوں نے پھر مڑتے ہوئے دیکھ کر تین رنگوں کے ٹکینے ہیں ان جھکیوں میں سزا دیکھو تو پورے ہیں۔“

نافع جھکیوں کو بغور دیکھنے لگا۔

نہیں تائی امی۔ پھر وہ بولا۔ ”کئی خانے خالی پڑے ہیں۔ نئے ٹکینے لگوانے ہوں گے۔“

”اچھا۔“ انہوں نے سوچا پھر تم ہی یہ سیٹ سنار کے چولہے کر آؤ۔ اس سے کونا کل پر سب تک تیار کر دے۔ پالش وغیرہ بھی کر دے۔“ وہ جھکیاں اور گلوبند ڈبے میں رکھنے لگیں۔

”تائی امی! میں ذرا عریشہ سے مل لوں۔“

”ہیں۔؟“ وہ بری طرح جو نکلیں۔ ”عریشہ!“

”تائی امی! آج اس کی سالگرہ ہے نا۔ میں صرف ش کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ گفٹ بھی بڑا تھا۔“ نافع نے صاف گوئی اختیار کی اور مختصر نظروں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

فردوس بیگم کافی جزمز ہوئیں۔ لیکن اسے منع کرنے کا حوصلہ نہ کر سکیں۔

”اچھا۔“ پھر وہ نیم دلی سے گویا ہوئیں۔ ”دے آؤ اسے۔ اپنے کمرے میں ہوگی۔“ نافع جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”جلدی آجافسہ میں بیٹھی ہوں۔“ پیچھے سے انہوں نے جتایا تھا۔

”جی جی۔ میں بس ابھی آیا۔“ وہ مڑے بغیر بولا تھا۔

اس کے کمرے کا دروازہ بجا کر اس نے کچھ دیر انتظار کیا تھا۔ پھر اس نے ہلکا سا دباؤ والا تودروانہ کھٹکا چلا گیا۔ نیم اندھیرے کمرے میں عریشہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں پر سی ڈی پلیئر کا ہیڈ فون تھا۔ شاید اسی لیے وہ دستک کی آواز نہ سن سکی تھی۔

نافع چند قدم آگے بڑھا تو عریشہ نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے کھڑے ہوئے نافع کو دیکھ کر وہ چند لمحے کچھ نہ سمجھ پائی تھی۔ پھر اچانک ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے قدرے غصے سے ہیڈ فون کانوں پر سے کھینچا تھا۔

”ہائیں۔ یہاں!“ اس کے انداز جارحانہ تھے۔

نافع بے چارہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

”دوسرے عریشہ۔ میں۔ میں تمہیں یہ دینے آیا تھا۔“ اس نے جلدی سے وہ گفٹ باکس اس کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس کے ابرو ہنوز چڑھے ہوئے تھے۔

”یہ۔ یہ تمہارے لیے گفٹ ہے۔“ وہ جیسے شرمندگی سے بولا تھا۔

”گفٹ۔؟“

”ہاں۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ اس لیے۔“ نافع کے انداز ایسے تھے جیسے اس سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

عریشہ نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ گویا اسے جانے کا اذن دیا ہو۔

”اچھا۔ پھر۔ میں چلوں۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

جواباً خاموشی چھائی رہی۔ نافع بے چارگی سے دروازے کی سمت ہولیا۔ پھر وہ جیسے ہی باہر نکلا ”اچھل ہی پڑا تھا۔“ فریڈ بیگم بالکل دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ وہ نافع کو دیکھ کر سٹپٹا کر پڑے ہوئے گویا انہیں اس کے اندر جلد برآمد ہونے کی قطعاً توقع نہ تھی۔

”اچھا۔“ وہ خجالت سے فہیں۔ ”میں بس۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے جھڑن نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جا رہے ہو سنار کے پاس۔“ وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اچھا۔“ وہ خجالت سے فہیں۔ ”میں بس۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے جھڑن نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جا رہے ہو سنار کے پاس۔“ وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اچھا۔“ وہ خجالت سے فہیں۔ ”میں بس۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے جھڑن نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جا رہے ہو سنار کے پاس۔“ وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اچھا۔“ وہ خجالت سے فہیں۔ ”میں بس۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے جھڑن نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جا رہے ہو سنار کے پاس۔“ وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اچھا۔“ وہ خجالت سے فہیں۔ ”میں بس۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے جھڑن نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جا رہے ہو سنار کے پاس۔“ وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

ہوئے جھنجھلا کر مڑی تھی۔ پھر اگلے ہی پل وہ جیسے پتھر کی ہوئی۔

سامنے مسکراتا ہوا عاشر کھڑا تھا۔

”عاش! ایتقان کے لب کا ہے۔“

عاشر ایک قدم آگے بڑھا تھا۔ ایتقان کئی قدم دوڑ کر اس کے سینے سے جا لگی۔

”عاش! سارے بند ایک ساتھ ہی ٹوٹے تھے۔ ایتقان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔“

”بس جانو! وہ اسے تھمے لگا۔“

ایتقان کا بس نہ چلتا تھا وہ ساری کی ساری آنسوؤں میں بہہ جاتی۔ جانے کہاں کہاں سے کون کون سے گلے، شکوے، شکایتیں، دکھ، تکلیفیں۔۔۔ آنسوؤں کی زبان میں نکلتے چلے آ رہے تھے۔

”بس ایتقان! بس کرو یا۔۔۔ میں بہہ جاؤں گا۔“

ایتقان نے سر اٹھایا۔

”شرقی آنکھوں کو شبنمی کر کے مزید ظلم نہ دھاؤ۔“ وہ مسکرایا۔

”بہت برے ہو تم! اس نے ایک مکا اس کے سینے پر مارا تھا۔“ تمہیں بس باتیں بنانا ہی آتا ہے۔“

”غلط فہمی ہے تمہاری۔“ وہ شوقی سے بولا۔

”ہٹو پرے۔“ ایتقان نے اسے دھکیلا اور اس کے پیچھے رافع کو بٹھانے لگی۔ پھر اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”تم نے اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“

”اطلاع ہم سے اچھی ہے کیا؟ اس نے اطمینان سے بیڈ پوئیم دراز ہوتے ہوئے ایک پرسکون سانس کھینچا۔“

”میرا ہارٹ فیل ہو جاتا پھرے؟“ وہ بگڑی۔

”ہارٹ تمہارے پاس ہوتا تو یقیناً اتنا ہی نکما ہوتا۔ وہ تو خیر سے میرے پاس ہے۔“ وہ آنکھوں کو دبا کر روئے بولا۔ یقیناً وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔

ایتقان اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”بچے کہاں ہیں؟“ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”حمزہ! نہیں قریب پارک لے گیا ہے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔“ وہ مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔

”تم کیسی ہو؟“ اس نے دشتا اس کا ہاتھ تھاما، طبیعت ٹھیک ہے؟“ ایتقان نے سر ہلاتے ہوئے اور ہوش کاٹنے لگی۔

”بولو! بولو! ایتقان!“

”بس عاش! کچھ مت پوچھو! وہ لرزتی آواز میں بولی تھی۔“ ورنہ مجھے پھر سے رونا آجائے گا۔“

”ہم شام کو اپنے گھر چلیں گے۔“ وہ قدرے اداسی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے نا؟“

ایتقان نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک دے کر شفیقہ حیات اور عذرا بیگم اندر چلی آئی تھیں۔ دونوں کے چہروں پر خوشگوار مسکراہٹ تھی۔ عاشر اچھ کر ان دونوں سے ملنے لگا۔

ایتقان یکدم ہی بہت ہلکی پھلکی اور خوش باش ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی چمک آ گئی تھی جو پہلی نظر میں ہی محسوس ہوتی ہے۔

وہ خالی خالی نظروں سے پورے گھر کو دیکھتی پھر رہی تھی۔ ایک مرتبہ پھر دیس نکالا ل رہا تھا۔ ظلم و ستم نے ایک بار پھر ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔

ربیعہ نے درحقیقت اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بچپن سے جوانی تک خونی رشتوں کی ملک سے اپنے پاروں کے لمس سے محروم رہی تھی۔ سو اس نے ان کو بھی اپنا سمجھنے کی غلطی کی تھی جو اس کے اپنے نہ تھے۔

نیمت اس کے حصے میں صرف خلص اور دکھ ہی آئے تھے۔

ترانہ اسے آفس جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر تلقین کر گئی تھی کہ وہ اپنا سامان وغیرہ خاموشی سے اپنے سوٹ کیس میں رکھتی رہے۔ اس طرح کہ مینا بیگم یا صولت کو رتی برابر شک نہ ہونے پائے۔ ترانہ آج بینک سے اس کی رقم اور زیور وغیرہ بھی نکلوا کر لانے کا کہہ گئی تھی۔ اس نے ربیعہ کو آج عباد سے منسلک کرنے کا پورا پروگرام بنا رکھا تھا۔

ربیعہ کی اپنی ذہنی کیفیت یہ تھی کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا ارادہ تو کر چکی تھی، لیکن اب اس کا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے، کیوں جانا ہے، کیس اور جا کر آخر کیا کرے گی۔

یہ کیفیت میں قطعاً غائب دماغی سے چلتے ہوئے وہ منور امین کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بستر پر پڑے اور نگہ ڈال کر اس کی آہٹیا کر جو کئے سے ہونگے۔

یہاں چوٹ اور اس کے بعد ہونے والی کمزوری کی بناء پر کچھ دن سے ان کے کمرے کی صفائی وغیرہ نہ کر رہی تھی۔ اس وقت ان کا بستر ان کا لباس اور کمرے کی ہر شے بہ زبان خود ربیعہ کی غیر حاضری کی کہانی سن رہی تھی۔

ربیعہ اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ منور امین نے قدرے نفرت سے اس کی جانب دیکھا۔

”تمہارے کمرے پر خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ بھنکارے۔

”نہیں دیکھنے لگی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“

”نہیں دیکھتی رہی۔“



قدر گری ہوئی ہے۔ اس سے مجھے یہی امید ہونا چاہیے تھی۔ تمہارا انتخاب کر کے اس نے مجھے حیران نہیں کیا۔

اب کی بار ربیعہ نے سر اٹھایا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں اس ظالم شخص کے لیے لمحہ بھر کے لیے شکایت چمکی پھر اس نے دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔

”تم بھی۔ تم بھی اپنی ماں والی روایت دہراؤ گی سو کچھ لیتا۔ بھاگ جاؤ گی ایک دن کسی کے ساتھ۔“

ربیعہ کے سر پر انہوں نے آسمان لا کر آیا تھا۔ وہ بچٹی بچٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”میری ماں! اس کے لب کا نیچہ۔“

”ہاں ہاں تمہاری ماں!“ وہ نفرت سے پھنکارے۔ ”دو کوڑی کی عورت۔ جسے تمہارا باپ کہیں سے اٹھالایا تھا۔“

ربیعہ کو چکر آنے لگے۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔

”مسلمان نہیں تھی وہ۔ اور اسے مسلمان کیے بغیر ہی تمہارے باپ نے اس سے شادی کر لی تھی۔“

اسی گناہ کی پیدوار ہو تم۔!“

ربیعہ کو یوں لگا جیسے ابھی اسے الٹی ہو جائے گی اور اس کی آنتیں منہ کے رستے باہر آ جائیں گی۔

”پچھھا جان۔!“ وہ بمشکل بولی تھی۔ اس کے لیے خاموش ہو جائیں۔“

”ارے سنتی کیوں نہیں ہو اب۔“ وہ سننے کی ہمت پیدا کر خود میں سے بھاگ کر آئی تھی کہیں سے اور

تمہیں پیدا کر کے پھر بھاگ گئی کسی کے ساتھ۔“

ربیعہ کے لیے آتی وقت ہلنا بھی محال تھا۔ پھر بھی وہ بہت ہمت کر کے اٹھی اور مردہ قدموں کو گھسیٹتی ہوئی

کمرے سے نکل گئی تھی۔

دوسرے کمرے میں آکر وہ منہ کے بل چار پائی پر اوندھنی گری اور سکیاں بھرنے لگی۔ آج اس کے کانوں نے

اس کی پوری زندگی کی بدترین بات سنی تھی؟ ہمیشہ ہی سے وہ کہنے میں باپ کے متعلق جاننے کے لیے بہت پر شوق

رہا کرتی تھی۔ دادی سے کرید کرید کر باتیں پوچھا کرتی تھی۔ جہاں کہیں اس کے کچھ نقلات۔ ربیعہ کے کان

کھڑے ہو جایا کرتے۔ لیکن آج جیسے کسی نے وہ بھاری تلواریں اس کا کلاں پیر ڈالا تھا۔ ربیعہ سنّت ترین اذیت

کا شکار تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔

آج اس نے جانا تھا کہ کیوں دادی جان ہمیشہ ہی اسے کچھ بھی بتانے سے گریزاں رہا کرتی تھیں۔ ربیعہ کے ماں

باپ کا ذکر ان کے لیے تکلیف دہ کیوں تھا؟ وہ اسے اس روحانی تکلیف سے بچانے کی سعی کرتی تھیں جس سے

اسے منور امین نے دو چار کیا تھا۔

آج ربیعہ کو علم ہوا تھا کہ کیوں بیٹا بیگم اور صولت اسے اتنی حقارت بھری نظروں سے دیکھا کرتی ہیں۔ کیوں

ان کے انداز میں ربیعہ کے لیے اس قدر شہر ہوتا ہے۔

آج جیسے اسے اپنی ہستی کے بے وقعت ہونے کا احساس ہوا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ اسی دوران اس

نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔

اس کے وجود کے ساتھ جو کہانی جڑی ہوئی تھی اس نے ربیعہ کو اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا کہ وہ اس دنیا میں سر

اٹھا کر ایک باعزت زندگی گزار پاتی۔ اور جب اپنی ذات مٹا کر بھلا کر، سر جھکا کر زندگی گزارنا تھی تو اس کے لیے یہ

گھر دنیا میں سب سے موزوں تھا۔



آنکھیں موندے وہ گویا جنت کے کسی باغ میں لیٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے بالوں میں دھیرے دھیرے چلنے والیوں کا دھڑکاہٹ محسوس کرنا پوری شدت سے ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کبھی آنکھیں نہ کھولے۔

ایقان! "عاشق نے محبت سے اسے پکارا۔

ایقان نے آنکھیں کھول کر عاشق کو دیکھا اور مسکرا دی۔

"کیا سوچ رہی ہو۔ میں تو سمجھا تم سو گئیں۔"

"نجانے کون سی حالت میں ہوں عاشق! یہ نیند ہے نہ بیداری ہے نہ خواب ہے نہ حقیقت نہ کوئی سوچ جی چاہتا ہے۔ بس سکون ہے اتنا گہرا اتنا گہنا اتنا خاموش سکون کہ ان چند لمحوں میں پوری زندگی بتا دینے کی جگہ ملے۔"

عاشق نے گہری سانس بھری اور کچھ سوچنے لگا تھا۔ ایقان نے منظور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ متوجہ نہ تھا۔

"کیا سوچنے لگے اب۔ کہیں وہ سوئی ہو کر تو نہیں یاد آنے لگی؟" اس نے جل کر پوچھا تھا۔

عاشق نے ساختہ ہی ہنس دیا۔

"کمال کرتی ہو یا۔ اس قدر خاتون پن۔ میری وہ چلی شرارتیں سی ایقان کہاں ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"تمہاری جدائی کے غم میں گھل گھل کر ختم ہو گئی ہو عاری! ایقان نے آہستہ سے کہا۔

"خاتون نما" یہی ہے۔ اسی سے کام چلاؤ۔"

"کام تو خیر ہم اپنی آخر عمر تک چلا میں گے۔" وہ مزے سے بولا۔ "لیکن کام میں دل تو لگے۔"

"کیا مطلب؟" وہ بڑی۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں جانو۔ کہ "موتی نوکری" اور "موتی چیمبر" سے اپنے بندے کا دھیان جھٹکنا ہوتا ہے۔"

خاتون کو کافی جتن کرنے پڑتے ہیں۔ تم جانتی ہو تمہارا بندہ جس پرستِ باغ ہو ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔" وہ اسے چڑانے کے موڈ میں لگتا تھا۔ ایقان اٹھ کر بیٹھ گئی اور کڑے توروں سے اسے گھورنے لگی۔

"اب یہی دیکھ لو۔" وہ فوراً بولا۔ "شرابی سے پہلے تم نے کبھی مجھے اتنی بری شکل بنا کر نہیں گھورا۔ اور اب تمہیں پرواہی نہیں ہے کہ اسے گھورتے ہوئے تم کتنی بری لگتی ہو۔"

"میں اب تمہیں بری بھی لگنے لگی ہوں۔" وہ روٹی صورت پر لگتی تھی۔

"میں تو صرف گھورتے وقت کی بات کر رہا ہوں۔" وہ چکارنے والے انداز میں بولا۔

"تم کچھ بدل گئے ہو عاشق! وہ مشکوک ہوئی۔ "پہلے تو میں تمہیں کسی صورت بری نہیں لگتی تھی۔"

"ارے جانم! وہ ہنس پڑا۔ "مذاق بھی نہیں سمجھتیں تم۔ مجھے تم بری لگتیں تو یوں کھنچا چلا آتا۔ میرے لیے تو تم متناطیس ہو۔ اور میں آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر یقین سے مسکرا دی۔"

ایقان چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر یقین سے مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

"آداب عرض! وہ اپنے مخصوص، مطمئن و شاداب انداز میں بولا تھا۔ "مزاج بخیر ہیں!" شہلا دھیمے سے مسکرا دی۔ فون اتفاق سے اسی نے اٹھایا تھا۔

"جی!" وہ آہستہ سے بولی "اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنائیے۔ خیریت سے ہیں!"

"بس جناب۔ گھنٹے پر لگے ہوئے ہیں۔ دن ہوں کہ پل ہو۔ کزرتا مشکل!" شہلا چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔

"ایقان کیسی ہے اب!" اسے خیال آیا۔

"فرسٹ کلاس۔ اپنے میاں جی کے ساتھ ہنستی مسکراتی پھر رہی تھیں یہاں سے وہاں سے۔" وہ بشاش انداز میں بولا۔

"عاشق صاحب آگئے ہیں!" شہلا نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ پیچھو کے بارے میں سنا تو فوری چھٹی کی درخواست منظور کروا کر دو ماہ کے لیے آئے ہیں۔" ہاشم نے اسے اطلاع دی۔

"دچلیں یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ایقان تو بہت خوش ہوگی۔"

"کیا خبر!" اس نے گہری سانس بھری۔ "آپ زیادہ بہتر بتا سکتی ہیں۔ سیاں جی کی آمد پر کیا تاثرات ہو سکتے ہیں؟"

شہلا کے لبوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اب آپ بنا میں مت۔!" وہ دھیمے سے بولی۔ "ان باتوں کا تو اچھا بھلا تجربہ ہے آپ کو۔"

"آپ کو اگر اندازہ ہے تو میرے لیے تو یہ احساس بھی بہت ہے۔ کم از کم ہمارے متعلق کچھ سوچتی تو ہیں آپ۔"

"ہاشم خنہ شوخ ہونے کی جسارت کی۔" وہ نہ یہ بے چارہ دل تو عجیب خدشات کا شکار رہتا ہے۔"

"آپ کا بچہ بچا ہوا انداز میں دھڑکا۔

"خدشات۔!" وہ کچھ سوچ کر بولی تھی۔ "کیسے خدشات۔!"

"سنو جانے دیجئے! وہ مسکرایا۔ "آپ برا نہ مان جائیں۔"

"میں نہیں۔" وہ بولی۔ "آپ کہہ دیجئے جو بھی آپ کے دل میں ہے۔ ہاشم صاحب! میں بعد کی بدگمانیوں سے بچنے کی خاطر زیادہ سوچتی ہوں۔"

"آپ تو اس قدر گھبرا گئیں۔ چلیے یہ بھی اچھا لگا مجھے۔ یعنی ناچیز کی آپ کے نزدیک کیا قیمت ہے؟" وہ بولی۔ "تو صرف اس خدشے کا اظہار کر رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری پیہم خواہش وصال ہے۔"

"دکھتی مشعل! میں گرتی ہوں ہاشم آپ؟"

"بعد میں بتائیں گے آپ کو ایسی باتوں کا مطلب۔ ایک شاعر خیر سے یار غار ہے۔"

شہلا کے لیے تو "بعد میں" ہی کافی تھا۔ وہ جھنجھپ گئی۔

سانحہ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ میمونہ خورشید علی کی بڑی بہن قضائے الہی سے وفات پا گئیں۔

ان اللہ وانا الیہ راجعون ○

ادارہ خواتین ڈائجسٹ، میمونہ خورشید علی کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔

میمونہ خورشید اور دیگر ہمدرد گان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

”اچھا! تو مجھ سے خدا حافظ ہے؟“ اس نے اجازت چاہی۔  
 ”ہمارا“ آپ کا سب کا!“ اس نے گویا اس کی بات سمجھ لی۔  
 سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ شہلا ریسور آہستگی سے کریڈل پر ڈالتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

\*\*\*

بے حد کوفت اور بددلی سے وہ سامنے بڑے ہوئے لاکٹ سیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ عام سا، نقلی ٹگینوں کا لاکٹ اور ساتھ چھوٹے چھوٹے سے بندے۔ اس گھٹ باکس میں سے بس یہی کچھ برآمد ہوا تھا۔ عریضہ کا کوفت سے برا حال تھا۔ اسے نافع پر رہ کر غصہ آ رہا تھا۔  
 ”حد درجہ احمق اور بد ذوق شخص کو میرے سر تھوپ دیا ہے سب نے مل کر۔“ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”یہ ذوق جس بندے کا ہو کیا دے پائے گا ساری زندگی وہ مجھے۔ اسے تو ڈھنگ سے دو لفظ بولنا نہیں آتے۔ نہ کوئی شخصیت نہ کوئی ہنر نہ فن۔ ہونہ۔ کسی کو تحفہ دینے کا سلیقہ نہیں ہے۔ یہ نقلی ٹگینوں کا لاکٹ۔ میری حویلی پہنے گی اسے۔“

اس نے جھنجھلا کر وہ لاکٹ اور بندے واپس باکس میں ٹھونے اور اسے ایک طرف ڈال دیا۔

\*\*\*

”ربیعہ!“ ترانہ نے پریشانی سے اسے پکارا۔  
 ربیعہ چمت پر کھڑی اور سے آتے ہوئے باڈول کو دیکھ رہی تھی۔ مڑ کر ترانہ کو دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں کوئی ایسی بات تھی کہ ترانہ بے حد پریشان ہو گئی۔  
 ”ربیعہ!“ میں تم سے کیا کہ کر گئی تھی۔ تم نے تو۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ اب تک۔ تمہارا سامان پونہ کی رکھا ہے اور تم خود؟“ اس نے ربیعہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔  
 ”تم نے کپڑے تک تبدیل نہیں کیے۔ ربیعہ!“ میں۔ وہ بڑا عجیب و غریب دیکھنے والی ہے۔ آہستہ آواز میں بولی۔  
 دیکھ کر آواز کم کی۔ ”میں عباد سے بات کر کے آ رہی ہوں۔ وہ ہمیں سے لاہور میں۔ ہماری خوش قسمتی سے اس کی بہن کی شادی چند دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی تھی۔ عباد آج رات کی گاڑی سے کراچی جا رہا ہے۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ میں ربیعہ کو ساتھ لے کر آؤں گی۔“

”میں کہیں نہیں جا رہی ہوں ترانہ!“ وہ گہرے دکھ کی کیفیت میں بود۔ ”میں نے تو یہ سب سنا ہے۔ جب تک خدا نے میری زندگی لکھ دی ہے۔ میں۔ میں اپنے گناہوں کی سزا سمجھ کر اسے یہیں گزاروں گی۔“  
 ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ ترانہ نے پریشان ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ”ربیعہ!“ تمہیں بار بار کیا ہو جاتا ہے۔ تمہارے رویے میں یہ تبدیلی کیوں آ جاتی ہے؟“

ربیعہ نے آنسوؤں سے بھری نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔  
 ”ترانہ!“ میں اپنے ماں باپ کے گناہوں کا جیتا جاگتا ثبوت بن کر کہاں جا سکتی ہوں بھلا؟ کسی نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم کون ہو؟ کس سے ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ کیا جواب دوں گی؟“ ترانہ نے اسے دیکھا۔  
 ترانہ چند لمحے دکھ سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تم ہر سوال کا جواب خود ہو ربیعہ!“ تم ایسی لڑکی ہو جو خود کسی کا قابل فخر حوالہ بن سکتی ہے۔“  
 حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ ربیعہ خود کو بچاؤ سے خود کو عزت دے۔ تم اپنی پہچان آپ ہوتے۔“

”ترانہ!“ مجھے بھلانے کی کوشش مت کرو۔“ ربیعہ نے منہ پھیر لیا۔ ”میں اگر یہاں سے گئی تو سب یہی کہیں گے کہ اپنی ماں کی طرح۔ میں بھی۔ کسی کے ساتھ۔“  
 اس کا کادہ رندھ گیا۔ اس سے آگے بولنا نہ جاسکا۔  
 ”ربیعہ!“ ترانہ نے اس کا بازو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے کر زور سے دبا دیا۔ ”لوگوں کے کہے کی بردا کر کے اپنی زندگی خراب کرنے کے تصور سے نفرت ہے مجھے۔ میں تمہیں کبھی ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ میں تمہیں زندگی خراب کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“

”ترانہ!“ اس نے بوسے کی کوشش کی۔  
 ”بس ربیعہ!“ ایک نہیں سنوں گی تمہاری۔ کل تک تم مجھے سمجھاتی تھیں۔ آج میں تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ کل تم اپنی مرضی سے یہاں سے جانا چاہتی تھیں تو میں نے تمہیں بہن کہہ کر روکا تھا۔ آج تم رکنا چاہ رہی ہو تو میں تمہیں ہر صورت یہاں سے بھیجوں گی۔ کیونکہ تم مجھے ایک بہن کی طرح عزیز ہو اور میں اپنی بہن کو اپنی زندگی تباہ کرنے سے ضرور روکوں گی۔“

ترانہ کے انداز میں حد درجہ حتمی پن تھا۔ ربیعہ اس کی صورت دیکھتی رہ گئی۔  
 ”میں تمہارا سوٹ کیس اماں کے گھر رکھ کر آ رہی ہوں ربیعہ!“ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”تم اس میں سے ابھی لے کے لیے کپڑے نکال لو اور ہاتھ روم میں چلی جاؤ۔ میں موقع پاتے ہی تمہارا سوٹ کیس وہاں چھوڑ آؤں گی۔“  
 ”ترانہ!“ ربیعہ نے اس سے لپٹ گئی۔ ”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“  
 ”مجھے کچھ سمجھ میں آ رہا ہے ربیعہ!“ ترانہ نے محبت سے اس کا سر سلایا۔ ”اور دیکھو۔ اب ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ عباد سے تمہارا نکاح کیا جاسکے۔ تمہیں کراچی جا کر۔“  
 ”نہیں!“ ترانہ نے الٹ ہو کر اسے دیکھا اور حتمی انداز میں بولی۔  
 ”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ ترانہ نے سر ہکا بکا کر بھی ایسا نہیں سوچ سکتی۔ میں تمہارے کہنے پر جا تو رہی ہوں لیکن وہاں جا کر میں کسی ہو سکتی ہوں۔“ اس نے آواز بھائی سے کہہ کر کوئی نوکری وغیرہ ڈھونڈ لیں گی۔“

”ربیعہ!“ وہ بوسے سے اس کا چہرہ دیکھا۔  
 ”ترانہ!“ میں نے سنا ہے۔ میں شاید کبھی بھی۔ کسی سے شادی نہیں کیاؤں گی۔  
 ”ترانہ!“ اس نے رتی برابر تجناش نہیں کی۔ اسے شاید تقدیر کی بساط پر یہ خانہ بٹائی نہیں ہے۔“  
 ترانہ نے گہری مانس بھرتے ہوئے اس کا شانہ تھپکا تھا۔

\*\*\*

ربیعہ خاں اللہ بنی کے عالم میں بالکل مشینی انداز میں بیٹھی اپنے بال سلجھا رہی تھی۔ ترانہ نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا۔ ربیعہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ آٹھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ ربیعہ نے سر جھکا لیا۔  
 اسی وقت دروازہ کھول کر تمدن اندر داخل ہوا۔

(باقی انشاء اللہ آئندہ)

۱۰۰۔ نی کا فارم لا کر دیتی ہے۔ تصور کی حرکتیں صولت کی نظر میں جاتی ہیں۔ جس پر وہ ربیعہ پر گھٹاؤ نے

س پر راندہ صولت کو پھینک دیتی ہے اور اسے ستین نکاح کی دھمکی دیتی ہے۔

۱۰۱۔ راندہ کو چھپ کر فون کرتی ہے۔ اور اسے شہلا کے رشتے کے متعلق بتاتی ہے۔ وہ یہ یقین دہانی چاہتی ہے

۱۰۲۔ شہلا نہیں سمجھتی۔

۱۰۳۔ راندہ کی ملاقات دوبارہ عباد سے ہوتی ہے۔ تمدن پارک میں ربیعہ کو عباد کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اس

۱۰۴۔ سائے پر پابندی لگا دیتا ہے۔

۱۰۵۔ گھر اپنی ساس اور نند کے ساتھ جا کر شہلا کو سنگنی کی انگوٹھی پسنا تی ہیں 'شہلا' ہاشم پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ

۱۰۶۔ بد مکر کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ ہاشم اس کی بات مان لیتا ہے۔

۱۰۷۔ ربیعہ کو یونیورسٹی فارم بھرتے دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کا فارم پھاڑ دیتا ہے۔ جس کا ربیعہ کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

۱۰۸۔ اس پر تم کا پناہ اس وقت ٹوٹتا ہے جب مینا بیگم تمدن سے اس کی شادی کا اعلان کرتی ہیں۔

۱۰۹۔ راندہ سے التجا کرتی ہے کہ وہ کسی طرح اسے عباد بھائی تک پہنچا دے۔ ترانہ تمام پروگرام ترتیب دے لیتی ہے۔

۱۱۰۔ ریشہ کو اس کی سالگرہ پر تحفہ دیتا ہے۔ عرشہ بے حد بے اعتنائی سے پیش آتی ہے۔ ناز کو اس کے رقصے پر افسوس

۱۱۱۔

۱۱۲۔ مائٹری کا چاک پاکستان آمد پورے غلامان کو مسرور کر دیتی ہے۔ مائٹری ان اٹل کے رقصے میں کچھ تبدیلی محسوس کرتی

۱۱۳۔ زور امین کی تنہا جانیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔ لیکن ترانہ اس کی اچھل نہیں سکتی۔ جس پر

۱۱۴۔ یہ کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل مینا موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

۱۱۵۔

۱۱۶۔

۱۱۷۔

۱۱۸۔

۱۱۹۔

۱۲۰۔

۱۲۱۔

۱۲۲۔

۱۲۳۔

۱۲۴۔

۱۲۵۔

۱۲۶۔

۱۲۷۔

۱۲۸۔

۱۲۹۔

۱۳۰۔

۱۳۱۔

۱۳۲۔

۱۳۳۔

۱۳۴۔

۱۳۵۔

۱۳۶۔

۱۳۷۔

"تم دونوں کو سانپ کیوں سوگنوا گیا؟" تمدن قدر سے غریبا۔ "میں نے وہی کچھ کہا ہے جو طے شدہ ہے کہ ان بات تو نہیں کی۔"

دوسرے کمرے سے نکل کر یہاں تکم اور صولت بھی چلی آئیں۔  
 "کیا بات ہے تمدن؟" مینا بیگم نے فدا حلال میں تازہ سادہ کیمہ کرپاری باری سب کو دیکھا۔  
 "کچھ نہیں پوچھو، تمپ نے شاید ان لوگوں کو بتایا نہیں کہ سچ میں تمپ سے کیا کہہ کر گیا تھا۔" تمدن وہیں پڑی کر سی پٹیتے ہوئے بولا۔

"میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ میں چاہتی تھی انہیں یہ خوش خبری اچانک ہی دی جائے۔"  
 "کیا۔ کون سی خوش خبری؟ کیا ہو رہا ہے؟" صولت نے نونوالے انداز میں پوچھنے لگی۔  
 "شاید مینا بیگم نے سچ سے یہ خبر اس لیے پوشیدہ رکھی تھی۔ انہیں اپنی ہی بیٹی کے رد عمل کا خوف تھا۔ کچھ نہیں صولت! تم خاموش رہو۔" مینا بیگم نے اسے بھڑکا۔ "بچیاں ایسے معاملات میں بالکل ہنس مکھ ہوتی ہیں۔"

خدا کے لیے امی۔ "وہ بھڑکی۔" اپنے یہ سوسلے پرانے اصول اپنے باپ کی سنبھال کر رکھیں۔ مجھے بتائیں یہاں کیا ہو رہا ہے؟ مجھے لگتا ہے تمدن بھائی اکیلے ہی اپنی بات کا لکھنا تمام کر رہے ہیں۔ میرے اور تصور کے معاملے کی یہی نہ کسی کو فکر ہے نہ پردہ اور کیوں کسی کو پروا ہو؟ مجھے۔ جب اپنا رنگ تم رہا ہو تو دوسروں کی زندگی کے جھکے پن کی فکر کیوں ہو کسی کو؟ ہم بے موت مر رہے ہیں۔ انہیں ہر کی ہری سوچتے۔  
 "صولت! تمدن بچہ آغا۔" بے ہوش لڑکے دفع ہو جا رہا تھا۔ سب عتاب کرانی شکل۔ چل نکلی۔  
 وہ جارحانہ طور پر لپٹے آغا۔ صولت اس کی مینا بیگم کے چہرے پر ان کی نفرت کے آثار دیکھ رہی تھی۔  
 "میں تمدن کا انداز سخت نامناسب لگتا۔"

"پچھو۔" تمدن اچانک ہی ان کو جانب مڑا۔ "تمپ نے اسے بالکل لگام میں ڈال دیا۔"  
 "نہیگ ہے تمدن۔ وہ تو ہے ہی۔ سرخروی۔ لیکن تم اسے بالکل ڈال دے ہو۔ تم ہی اپنی زبان کو لگام دو۔ تمہارا اس موقع پر یوں چڑخا جلا گیا اچھا لگ رہا ہے؟" وہ جل کر بول رہی تھی۔ تمدن کی گھر گیا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا پھر سر کو زور سے جھٹک کر اوڑھ کر دیکھنے لگا۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟" مینا بیگم نے ریجہ کو بری طرح سے گھورا تھا۔ "میں یہاں ہی نہیں آ رہی تھی۔" تمدن کے سامنے تصویر بنی کھڑی ہو۔ جاؤ جا کر کپڑے بدل دو۔ میری بیٹی کی قسمت کے آگے تمہارے کان کی پٹی کی بجائے۔"

ریجہ کا کمزور جسم زور سے کانپا۔ اس نے تھوک ڈھکا اور آگے جانے کے لیے قدم پر بھاگے۔ ترانہ نے جلدی سے اسے سنبھالا۔

"سے تیار کرو۔ مولوی آگیا ہو گا۔" مینا بیگم نے بے حد سختی سے کہا۔  
 ترانہ ریجہ کو ساتھ لگائے کمرے میں چلی آئی۔ ریجہ سوکے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت اس بکھرے کی سی تھی جس کی نگاہوں کے سامنے تعاقب چھری کو دھار دے رہا ہو۔ ترانہ نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا شانہ تھکا پھر کمرے میں موجود صولت کو دیکھا جو کچھ کے میں سر۔ دیے دو حواں و حار دور رہی تھی۔  
 "صولت! ترانہ رومانیت سے بولی۔" پلینہ۔ تم ذرا باہر چل جاؤ، میں ریجہ کو تیار کر دوں۔"  
 صولت پر اس کی گزارش کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی رفتار سے پچکیاں لیتی رہی۔  
 "صولت۔" ترانہ پھر بولی۔ "صولت۔"

الہا کر دھاڑی۔ "میں اس چیل کو کیا کہہ رہی ہوں؟ تم شوق سے اسے جتنا مرضی سجاؤ۔"

لی پر اس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رہی۔ کوہ کھا

جے کے کپڑے تبدیل کر دئے ہیں۔ "ترانہ پھر عاجزی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح اٹھان تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ بنانے والے عوارے پر عمل کر رہی تھی۔

حلال۔ لڑاؤ۔ "صولت ہنس دھری کا بھرپور مظاہرہ کر رہی تھی۔  
 "مینا بیگم کی خوشی سے لہریز آواز پر وہ تینوں ہی چرکی تھیں۔ "تصور آگیا ہے۔"  
 صولت کی حالت میں ایسا کی واضح تبدیلی نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر چھائی تختی اور غم و غصے کی جگہ ہنس مچ گئی اور مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کسی بچی کی طرح اچھلتی کودتی لگے سے باہر نکل گئی۔ ترانہ اور جے کا تباہہ نہیں۔

تصور کی کاٹ دار توازن تک پہنچا تھی۔ "تو کاشما نہیں ہوں جیسا تم لوگوں نے کہا ہے۔"

"تم لوگ اچھا ہی ہے۔" تمدن نے بولا۔ "کیونکہ جے۔"  
 "ابھی سمجھ لو لیکن میں یہ شادی نہیں کرنے دے گا۔"

"تیرا تو باپ بھی۔" تمدن نے شاید تصور کے چہرے پر پکڑ لیا تھا۔

ریجہ کی لڑش میں شدت آئی۔ ترانہ کی سچی بڑی تیزی سے رنگ بدلنے لگی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کرپے سے باہر تھانک کر کمرے کا دروازہ بند کر کے کچن چلی گئی۔

مدن نے اس کے روبرو کھڑے ہوئے۔ "جے ریجہ کو اطمینان دے۔"

ریجہ چوتھ پوٹ کر رہی تھی۔ ہر سے تمدن اور تصور کی کالم گلوں اور مینا بیگم اور صولت کی چیخ و پکار کی توازیں آ رہی تھیں۔

"ترانہ۔ ترانہ کچھ کرو۔" ریجہ نے بے بسی بولی۔  
 "یہی تو وقت ہے سب کچھ کر گزرتا ہے۔" ترانہ حسی انداز میں بولی۔

پھر اس نے آگے بڑھ کر الہا کی طرف سے چادر میں نکالیں۔ ایک چادر اس نے ریجہ کی طرف اٹھالی۔

"جلدی کرو۔" ترانہ نے جلدی جلدی دسری چادر میں خود کو لپیٹا پھر ریجہ کو حیران کر دیا کچھ کر رہی تھی۔

"وہ بہت وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ جلدی۔ ہری۔"

ریجہ نے کھپکھپاتے چادر اوڑھنے لگی۔ ترانہ کلی میں تسلی کھڑکی کی جانب بڑھی اور اس کے پیٹ کھول کر باہر بھاگنے لگی۔ کلی میں سنا تھا جبکہ گھر کے اندر دلی جیسے سے آتی تو اندل میں بے حد شدت آجھکی تھی۔ ترانہ کوئی سے باہر اترنے میں رنج۔ کچھ نہ کر سکتی تھی۔

ہسٹری کی گزرتا ہٹ اور انجن کی کھٹکھٹانے ایک مرتبہ پھر یہ جے کے دل کو انجن و سوسلی اور خدشات کی بھیجی تھی۔ جو تک رہا تھا۔ بے اختیار ترانہ سے لپٹ گئی۔

"ترانہ۔ ترانہ۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" ریجہ مدد سے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

"ترانہ تم بہادر ہو رہی۔ یاد ہے ایک مرتبہ تم اکیلی ہی ہم لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تھیں۔"

"نہانے کیوں ترانہ۔ میں اس وقت۔ اس وقت سے زیادہ خوف محسوس کر رہی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے



ایک اندھی سیاح سرنگ میں داخل ہوئے جارہی ہوں جس کے دوسری جانب کیا ہے۔ کچھ بتائیں۔"

"حوصلہ رکھو رہید۔ اور سری جانب زندگی ہے یہ میرا یقین ہے۔"

"تمہارے یقین کے سارے ہی اتنا بڑا قدم اٹھاپائی ہوں میں۔" وہ لایوسی سے بولی۔ "ورنہ میرے اندر تو اس نے تپ ہے نہ امید نہ یقین نہ حوصلہ۔ میں۔ میں خود کو مست ٹوٹا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ ترانہ۔ زرا سی نہیں سے بکھر جائیگی۔"

"خدا انہ کرے کہ تمہیں کوئی نہیں لگے۔ میری ساری دعائیں صرف تمہارے لیے ہیں۔ تم مجھ سے باری کے موبائل پر رابطہ رکھنا۔"

"تم۔ تم اب کھر جا کر سب سے کیا کوئی ترانہ؟" وہ یہ کہ پھر اندیشوں نے آکھیرا۔

"کچھ بھی۔ تم میری فکر مت کرو۔" وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں اضطراب پوشیدہ تھا۔ وہ یہ کہ کچھ کہہ ہونے لگا۔

"یہ عباد کیوں نہیں آیا اب تک؟" ترانہ نے پریشانی سے اور حراہروں کہا۔ "عباد باری کا بھی کچھ بتائیں۔ کئی دہ گئے ہیں یہ دونوں؟"

منیزوہ ٹیکم انقہ کے قریب چلی آئیں۔ دور ریور تھا۔ کم سمجھتی تھی۔

"کیا بات ہے انقہ؟ کس کا لون تھا؟"

انقہ نے چونک کر ان کی سمت دیکھا پھر گری سانس دیا۔

"عباد کا۔" منیزوہ ٹیکم مسکرا دیں۔ "گیا کہ رہا تھا؟"

"کہہ رہے تھے کہ۔" انقہ نے ایک مرتبہ پھر الجھ کر ان کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں سے کھر آ رہی ہے۔"

منیزوہ ٹیکم بے اختیار ہی ایک دم پیچھے ہٹی تھیں۔

"لڑکی آ رہی ہے۔ عباد کے ساتھ۔؟ کون ہے وہ لڑکی؟"

"یہ وہ انہوں نے نہیں بتایا۔ وہ بہت جلدی میں تھے۔" انقہ ہونٹ کاٹتے ہوئی تھی۔

"یا اللہ خیر۔" منیزوہ ٹیکم نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ "یہ کیا ماجرا ہے۔ کیوں آ رہی ہے وہ لڑکی۔ تم نے پوچھا تو ہوتا۔"

"میں کیا پوچھتی ای میں نے بتایا تھا وہ بہت غلط میں تھے۔ انہوں نے بس اتنا کہا کہ ای کو تارہ میں لایا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ایک لڑکی بھی آ رہی ہے۔ اس کے لیے بڑو ہو خیر و تارہ کو ادیں۔"

"انقہ مجھے تو بہت فکر ہو رہی ہے۔" منیزوہ ٹیکم پریشانی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"مجھے تو صریح یہ خیال سنا رہا ہے کہ برسوں آئی کی مسندی اور اس سے اگلے دن رات ہے۔ پتا نہیں یہ عباد بھائی کو ایسے موقع پر کیا سوچا بھی ہے۔" وہ پیشانی مسلتے لگی۔

منیزوہ ٹیکم اب بے حد تشویش کا شکار تھیں۔

کراچی جانے والی ٹرین کی آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔ تب ہی دور سے عباد اور باری تیزی سے آتے ہوئے نظر آئے۔ ترانہ کی جگہ میں جان آئی۔

"کہاں رہ گئے تھے یہ لوگ۔ میں تو زوری مٹی تھی۔"

وادی میں؟" عباد مسکرا کر رہید سے پوچھنے لگا۔

طرس برنائیں اور آنسوؤں کا ریا دار کسے گئے لیے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"ہاں ایسا وقت نہیں ہے رہید۔" عباد اس کی کیفیت بھانپ کر نکلیں دیکھنے لگا۔ "ٹرین دوسرے آ رہی ہے۔ جلدی چلیں۔"

"ان سے لپٹ کر روئی۔ ترانہ بھی رہا سا حوصلہ بار بیٹھی۔ دونوں زار و قطار روئے لگی تھیں۔

"اور باری اس۔ رقت آمیز منکرتے متاثر ہو کر ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔



۴۴ رات میں سفید چھاگ بنائی منہ اور بلند بالا لہلوں کا نکلا اور مسکور کن تھا۔ ایجن خاموشی سے سامنے آئے۔ مسند روک دیکھی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ برابر میں کھڑا ناشر بھی ضرورت سے زیادہ خاموش تھا۔

انہوں نے اس نے ایجن کو مخاطب نہ کیا تھا۔ ایجن نے گردن موڑ کر ناشر کو نہ کھانا نہ بھی اسی کی طرح کسی کی بات نہ کی۔

"ناشر! وہ نرم آواز گونجنے لگی۔

ناشر چونک اٹھا۔ اس نے اپنے منہ کا دیکھا اور مسکرا رہا ہوا دیکھتے ہیں سے مسکرت نکال کر ساگانے لگا۔

"کہو۔" انہی دو بعد وہ بولا تھا۔ "کیا کچھ بتائیں؟"

"یہ تم کئی سوچوں میں گم رہے ہو۔" وہ لگتا تھا مہمل۔ "جیسے تم نے ہو میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم بدل رہے ہو۔"

"اتر رہا۔" اس نے ایجن کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ جو حائل کر کے اسے خود سے قریب کر لیا تھا پھر ایک کش لگا کر اسے ہوا میں اٹھا کر لے گیا۔"

"اؤ۔" وہ یہ مسکرت کیوں اس قدر پیچھے لگے ہو تھے۔ "ایجن بھائی۔" جب دیکھو۔ پھر شر کر کے طرح ہوں۔ بھوں کرتے رہتے ہو۔ کس بات کا پریشانی ہے؟

ناشر نے بے اختیار ہی انقہ کا منہ دیکھا۔ اس نے جلتا ہوا مسکرت ایک طرف پھمال دیا اور ایجن کو شرارتی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"جس۔ اب خوش ہو۔" ناشر نے باری داوے۔ یہ تم مٹی کی بانڈی کی طرح چپکے چپکے کیوں بکے جاتی ہو؟

"میں انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ بار بار مجھے بدلے کا ملنے دے رہی ہو۔ اڑے بابا۔ میں وہی ہوں۔ تمہارا ناشر۔" انہوں نے آخر تمہارا۔" دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

"میں بچوں کو ان کے پاس بھول کر آئی تھی کہ جی بھر کر اپنے دل کی باتیں کریں گے۔ ہر گز اور اندیشے سے بے پروا بنے نیاز ہو کر لیکن جناب کو مرا ہے سے فرصت نہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تبت کے پانڈوں سے اتر کر آئے ہو۔"

ناشر پھر بے پروا رہا تھا۔

"میں اب پیچھے جاؤ۔" ایجن مزید چل گئی۔ "کنے سننے کو تو کچھ باتیں مانیں۔" پہلے آتے تھے تو تمہاری باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں اور اب۔ اب صرف میری باتوں پر ہنستے رہتے ہو جیسے کسی بچی کو ہلا رہے ہو۔"

"ایجن۔ ایجن۔" یاد کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تم بہت چڑھ چکی ہو مٹی ہو۔ انھنے کی عادت تو خیر تمہیں پہلے بھی تھی لیکن سننے کی بات پر ابھارتی تھیں اب تو یہ بات ہی انھنے کی ہو۔"

اس کے انداز میں قدرے برہمی آئی تھی۔ ایجن انقہ خاموش ہو گئی۔ ناشر کو بھی ماحول میں ٹھکنے والی تھی

کا احساس ہو گیا۔  
 ”چلو دوپٹہ چلیں۔ بونے فوئر کرتے ہیں۔“ وہ لمانت سے بولا۔  
 ایقان نے پلوں پر چسکتی نمی کو چھپانے کے لیے منہ موڑ لیا تھا۔



شور مچاتی ٹرین تیزی سے منزل کی جانب محو سفر تھی۔ عباد نے ایک نگاہ ریجہ کے سستے ہوئے چہرے پر ڈالی پھر مسکرایا۔ وہ حد درجہ پریشان نظر آرہی تھی۔  
 ”ریجہ۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

ریجہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔  
 ”ٹیک ایزی۔ تم بہت زیادہ گھبرا رہی ہو۔ ریلیکس۔“  
 ”عباد بھائی۔ ہم۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ کچھ سوچ کر گویا ہوئی تھی۔  
 ”کہاں جا رہے ہیں؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ”ارے بھی ہم اپنے گھر جا رہے ہیں؟“  
 وہاں میری امی ہیں۔ میری دو بہنیں ہیں۔ ایک پیارا سا کیوٹ سا بھانجا ہے۔

ریجہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔  
 ”کیا سوچ رہی ہو ریجہ؟“ عباد کو اس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ تھا۔  
 ”عباد بھائی۔ میں۔ میں۔ میں کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”کسی کا بھی نہیں۔ آپ اپنے گھر جانے سے پہلے مجھے کسی ہاسٹل میں۔“

آواز زندہ جاوے پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ پھر کچھ دیر اسے غور پر دیکھوانے میں لگی تھی۔  
 ”میرے ہیں میرے۔“ وہ بولی۔ ”میرے گھر میں۔“

”ریجہ۔“ عباد تأسف سے بولا۔ ”نہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اپنا گھر ہوتے ہوئے میں تمہیں ہاسٹل میں چھوڑوں گا؟ شاید تم ایک سنگ جگہ پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔“  
 ”عباد بھائی!“ ریجہ رنجیدہ ہوئی۔ ”خدا کے لیے ایسا تو مت کہیں۔ میں نے اس کی دنیا میں محبت صرف چند ایک لوگوں سے پائی ہے اور آپ ان لوگوں میں شامل ہیں۔“  
 ”پھر تم نے ایسا کیوں کہا؟“

”اس لیے عباد بھائی کہ میں۔ میں لوگوں کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں، میرے ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ دار، سب کون ہیں، کہاں ہیں۔ میں۔ میں کسی بھی سوال کا جواب نہیں دے سکتی، نہیں دے سکتی۔“ اس نے سر جھکا کر ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔  
 عباد چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

”کوئی تم سے کچھ نہیں پوچھے گا ریجہ۔! یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ تمہارا حوالہ صرف اتنا ہو گا کہ تم میرے ایک بہت اچھے دوست کی بہن ہو۔“

”یہ کافی نہیں ہے عباد بھائی۔ انسان کے لیے رشتوں کا حوالہ ضروری ہے۔ خصوصاً لڑکی کے لیے۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”انسانیت کا رشتہ ہر رشتے سے بڑا ہے ریجہ۔! محبت، خلوص، رواداری۔ یہ سب انسانیت کے رشتے سے آتی خوشبو کے نام ہیں۔۔ اور میرے گھر کے افراد میں تمہیں یہ خوشبو ملے گی۔ میری بات کا یقین کرو۔“  
 ”عباد بھائی! میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کسی مشکل کا شکار ہوں۔ میرا آپ کے ساتھ آپ کے گھر

جانا، ستے دوسریں کو جنہوں نے سنا ہے آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔"

”میں سمجھ رہا ہوں یہ کیا۔ لیکن پھر بھی میں حسرتیں اس بے مروت دنیا کے رحم و کرم پر غصے چھوڑ سکتا۔ انسان کے لیے اگر رشتوں کا حوالہ ضروری ہے تو پھر یہ حوالہ تمہے ہر جگہ طلب کیا جائے گا۔ اور اگر تم اپنے بچنے رشتوں کو اپنا حوالہ بنانا نہیں چاہتیں تو نئے رشتے بناؤ یہ کیا۔ محبت اور خلوص کم باب سہی، لیکن نایاب نہیں

”عباد بھائی! کیا تم لوگ آپ کے گھر والوں سے؟ کیا تم اسکوں کی؟ نہیں اپنے بارے میں۔“

”میں نے کہا تا تم میرے ایک انصاف دوست کی بہن ہو۔ جو چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر تمہاری ذمہ داری میرے سپرد کر کے باہر چلا گیا ہے۔ اور جس سے اس کے آگے تم سے کوئی کچھ بھی نہیں پوچھے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اپنے گھر والوں کو میں خود سمجھاؤں گا۔ دیے بھی میری ماں میری بہنیں بہت اچھی ہیں۔ تم ان سے مل کر تو دیکھو۔“

”یقیناً“ ہوں گی۔ ان سے ملے بغیر بھی میں جانتی ہوں۔ ”زوجہ پہلی مرتبہ مسکرائی۔

اس سہل کو جیسے قرار سا اگیا تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر اپنا سر بیٹھ سے ٹکا لیا اور پتہ چلنے موزوں لیں۔

ہاشم نے اپنے سامنے سجے ہوئے زیورات پر ایک ہوس سی نگاہ ڈالی تھی۔ سلازمین نے کاؤنٹر پر مختلف زیورات کے زیورات کا انبار لگادیا تھا۔ لیکن ہاشم کی بے چین متلاشیں کچھ کو کوئی بھی چیز مطمئن نہ کر پاتی تھی۔ واقعے نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے پیپسی کا گھونٹ بھرا۔

”یہ میں نے کوئلہ ڈر رک کا نہیں ممبر کا ٹھونٹ بھرا ہے میں نے۔“

جب احمد افسوس کے لیے زندگی کا پہلا مختصر دور نے اٹھ کر تو میری کفایت کو یاد کرنا۔ پھر تجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہوگی کہ تو نے میرے جذبات کو سمجھنے میں لطف کی کمی کی۔

”اے بیچارہ! کئی بھی چیز افعالے اس جیرے سے یہ انکو بھی پان ہوسکتا ہے۔ گلوں کی بجائے جیس۔“  
 ”یہ اتنا بھاری گلوں سے نہ دکھائی میں دے دوں؟“ ہاشم چرکیک ”یار شاعر! آج تیرے بزرگ استاد صاحب  
 ہوتے ہیں؟“

”میں خود بخود دلت سے نہیں سویا۔“ اس نے جانی لیا۔ ”شادی تو یہی ہے،“ خوار میسری۔“  
 ”دستوں کے لیے خوار میسری عین معلوت ہے۔“ اس نام اس کی حالت سے بے نیاز شوکیس میں آکا بھانجی کرنے  
 پر ہکا بیک اس کی نگاہوں میں تکب سی آئی۔

”باردراغے۔ ایسے لاکٹ پر چلے گا، نہیں بڑی۔ ذرا دکھنا۔“  
 میلز نے پہل کی شکل کا انعام لاکٹ پہیل کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بائٹھنے شوقی سے لاکٹ اٹھا کر دیکھا۔  
 ”یونی ٹل۔“ ”محمود بولا۔“ ”بس ٹھیک ہے۔ بیچھہ کی جا ہے۔“

”سو نے کامل ہیرے کے سراپا،“ رابع نے جھوکر کے پھر ایک قتل کیا۔ — ”ویری گلو۔“  
 ”دل تو ہمارا سو نے کا ہی ہے۔“ بائسم نے دانت نکالے۔ ”اور ان کی محبت اس میں ہیرے کی مانند دک رہی

”اما، حارہ! تم نیک کیا جذبہ کے اظہار کا۔“

... رات کو سو گیا۔ "بھئی بھئی میری چاہتا ہے کاش میں ڈاکٹر شمس ہوتا۔"  
... رات کو سو گیا۔ پھر جبکہ کا احساس کر کے یکدم جھینپ گیا۔



۱۔ ماما کر اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے گھڑی کی جانب دیکھا۔ دوش روہ سے ہائی گرنے کی تواز آوری  
 ۲۔ شاہد لے رہی تھی۔ دوسنے سے کل شاہد لے کر ہائی گرنے کی تواز آوری تھی۔  
 ۳۔ ماما نے بے چینی سے پلو پلو لے لے ایقان کی باتیں یاد کرنے لگیں۔ بجائے کیا تہذیبی آگہی تھی اس کے  
 ۴۔ یہ تھی۔ وہ خود سمجھ نہیں پایا تھا لیکن ایقان کی چھٹی جس سے آخر کو نئی ہیلت عسوسی کی تھی۔ یہ وہ تھنے  
 ۵۔ تھمر تھا۔ اس کے مویا کئی کی تھ۔ تھی تو وہ ہر طرح سے چونکا۔ موبائل پر، ٹوننگ روہی تھی جو اس نے  
 ۶۔ ایک مخصوص نمبر کے لیے میٹ کی ہوئی تھی۔

نہ مل رہی ہوگی۔

”اے ڈارلنگ! لا سڑی جانب پیٹھ تھام لے گی تھی۔“

”میں نے تم سے کہا تھا اراکس۔“

”کہ خون نہ کھوں۔“ اطمینان سے اس کا ہاتھ کٹ کر تولیہ ”لیکن کیا کدوں بنا شرا میرا دلخ تھما دیا تب بعد ار

”الجبلی نے اس وجہ سے استعفاء دیا۔ میرے بارے میں مشکلات میت کھڑی کرو۔“

”ڈونٹ ڈری، ڈائرینگ۔ میں تو صرف ایک میگزین چاہا اور یہی تمہیں پاکستان کے نام کے مطابق رشتے کا بارہنچ رہے ہیں۔ نام مل تو چیک کر رہی تھی کہ تمہیں کیا کر رہے ہو؟“ وہ شرارت سے ہنسی۔

شعبہ عربیہ اسلامیہ

”اؤ کے ڈارنگس! تم ایک لڑکی ہو۔ میں اب آرام سے سو جاؤں گی۔ بانی داد سے کہہ دو: ”واش روزم سے پانی کرنے کی آواز آتا ہے۔“ یہ سچی بات سننا محسوس کیا۔“

”جی ہاں“ جلدی سے بولا۔ ”اور اب فن مت کرنا۔“

اس نے جواباً کہل کر دیا حواش دوم سے نقلی ایقان نے مسکرا کر اسے دکھا۔

”کے زانت ہے؟“

کیا ہے؟ لڑے لڑا کیا۔  
مگر کس کے ساتھ؟

”کس سے کہہ رہے ہو کہ اب لندن مت کرنا؟“ قیصر نے جلی بولیہ سے رگڑ کر اس کے منہ میں ڈال دی۔

۱۰ اے ایسا مستعد  
۱۱ کیا کئے گئے چارے نے؟

نمایا گیا ہے بے چارے کے! ایسا کہ میراں گناہوں سے اسے نہ سما۔  
خاشا اے نور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ پر دھا کر لٹکان

”میں نے اپنے قریبی دوستوں کو اطلاع دیا کہ میں نے کون سا نمونہ دیا ہے۔“

”میرے اس یہی دلت میں داخلت لی اس۔۔۔ جو میں ہرگز نہیں چاہتا۔“

”تمہاری زلفوں کی خوشبو میں ابھی تب کچھ کم ہو جائے گا۔“ عاشق نے تکیہ لے کر زور اچھل دیا۔

”جی عباد مافی“ اور دجبر سے بولند  
 ”میں فقی وغیرہ کہتا ہوں، تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ کچھ لے لوں؟ یا بھر گھر چلی کر کھائیں؟ امی نے مزے  
 مزے کیا، جس سے بتائی ہوں۔“

۴۱؎ ایک دوست کو ہمیں نے اسے لاہور سے فون کروا دیا تھا کہ ہمیں لینے آئے گا۔ لوسن بھی گیا۔ "عبدال

"ملا دوں یہ۔۔۔ یہ فراز ہے۔ میرا بہت اچھا دوست افغان لڑکائی ہے۔ وہ موموں کو چھو کر پھانسیا دیتا ہے۔"  
 "ہمارے دوستی ملا دوں میں ہوگی یہ۔ پچھلے سال ہی ملا ہو رہے ہیں کراچی کی ہے۔"  
 فراز مسکراتی نگلیں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ نہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کون سا لڑکا۔  
 "جلیں۔۔۔" فراز نے کلی کو سامنے اٹھائے کھڑا دیکھ کر پوچھا۔

عہد اور فراز کاڑی سے ان کی رازی سے مسلمان نکال دے جسے جہنم کے اس کی جانب دہراؤ دے گا۔  
 یہ کیا بات ہے راجہ! انہیں کہیں اور جانا ہے کیا؟ وہ قہقہے سے پوچھ رہا تھا۔  
 راجہ کاڑی سے اتر آئی۔ اپنے کمر تک پہنچ کر عہد کے انداز میں بے حد ناؤی اور مسرت ورتی تھی جو اس کی  
 ایک حرکت سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کا سکون اور اطمینان محسوس کر کے راجہ کے اندر ایک ہلک سی

48

[illegible]

وَعَلَيْكُمْ السَّلَام۔ اے ان کی ساری تشویش محبت اور امانت کی لہروں میں بہہ گئی تھی۔ انہوں نے اسے

۱۱ "اسلام علیکم آئی! " فرما کر مسلمان سے لدا گیا اور آگیا تھا۔  
 ۱۲ "و علیکم السلام" جتنے رہے۔ عباد میں سے خیال کرو۔ سب کچھ اس غریب کو چھوڑا ہے۔"

”آئیے!“ پھر اس نے پکارا۔ شملہ بھی پکڑنے سے نکل گئی۔  
”آؤ!“ منیبہ نے حکم دے دیا۔ ”اچھی بیٹیوں سے ملو۔“

”بھئی، میں رسیہ اسے مل کر واقعی بہت خوش ہوئی ہوں۔ نجانے کیا بات ہے اس میں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ماری افغانی ہو۔“

"بالکل ٹھیک کہا ای تب نے! شہلا مسکرائی۔" میں بھی مسکرائی تھی۔  
 "تپ جلدی ہیں تپ! اس لیے میں ایک، بس اور لے لیا۔" عبادان لوگوں کے قریب آتے ہوئے خوش دلی سے بولا۔

"بہت اچھا کیا۔" شہلا کھل کر مسکرائی۔ "اور یہ تو اتنی چھوٹی سی گتھی ہے کہ شمار سے بچانے میں فوراً دو تکی کر گئی تھی اس سے۔"

عباد نے اعتبار نہ دیا۔

"لیکن وہ ہے کہاں؟"

"سورج ہے۔" منیزہ دیکھ بولیں۔ "مشتا کر لو تو اسے دیکھ لیتا۔"

سب لوگ ڈانٹک نیکل کی جانب بڑھ گئے تھے۔ ریہہ کو بے حد سکون کا احساس ہوا تھا اسے اچانک سی بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔

\*\*\*

"کل شام ایرا کو ہاؤس بھانئیں گے ساتھ ہی رسم مندی بھی ہے۔ پر سولہ بج گئے ہیں۔" انقضاء ریہہ کو پروگرام سے آگاہ کر رہی تھی۔ شہلا خاموشی سے شیشی مسکرائی تھی۔  
 "کل باہر،" کل ہی مندی پر سولہ نکاح۔ "ریہہ نے حیرانہ سے شہلا کو دیکھا تھا۔ "ولن کو تو کم از کم ایک بشت پہلے ہاؤس بھانئے ہیں۔"

"ہاں بھانئے تو ہیں۔ پر یہ ہماری اپنا۔" انقضاء نے ناک بھونچ کر حیرانہ سے دیکھا۔  
 "کون کون سے آکر رہا ہے؟" ان کی باتوں کا تو سر نہ رہا تھا۔  
 "انہیں تو اگر ہی ہو جاتی ہے! بس ہے۔"

ریہہ مسکرا کر شہلا کو دیکھنے لگی۔  
 "انہیں کسی چیز کی ضرورت بھی تو نہیں ہے۔" وہ بولی۔  
 "بس۔ اب تم انہیں زیادہ مت سراہو۔ درنہ یہ برسوں تیار ہوئے ہیں۔" انقضاء نے کہا۔  
 "چیز کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" انقضاء مندی کے لیے پیش کی کوریوں اور تھالیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔  
 "خیر کر لائی تھی۔"

"کم آن انقضاء! کتاب لاتی ہو تپ۔" شہلا نے اسے گھور دیا۔

"پیش کرتا ہے نامحاط۔ آپ جو گوشتے کا کر شوق سے کھاتی ہیں۔"

ریہہ ہنس رہی۔ اسے ہنسن کی نوک بھونک اور اس میں چھپی محبت کا احساس لطف دے رہا تھا۔ اسی وقت عباد اور عمرو ڈھٹے بھاگتے کرے میں داخل ہوئے تھے۔ دونوں ہنس رہے تھے۔  
 "مما۔" عمر شہلا کے گلے میں بازو ڈالے ہوئے زور سے بولا۔

"میرا بھائی! شہلا نے اسے محبت سے چوما۔

ریہہ لمحہ بھر کے لیے ششدر رہ گئی۔ اسے یہ تو علم تھا کہ عباد کا ایک بھانجا ہے لیکن اپنی سوجھ میں ابھی اس نے کبھی اس بات پر غور نہ کیا تھا کہ عمر کی ماں کون ہو سکتی ہے۔ اب اس وقت اسے اچانک ہی علم ہوا تھا کہ شہلا ایک نیکی کی ماں بھی ہے۔

"ایسا!۔" نالہ جانی اور چچی ہیں۔ ان سے طوطہ ریہہ خالہ ہیں آپ کی۔" شہلا عمر کو اس سے

قرب ملا کیا اور کچھ حیرت اور شوق سے اسے دیکھنے لگا۔ ریہہ نے مسکرا کر ہاتھ پیرھایا۔ عمر نے

نہایت سے آئی ہیں؟  
 "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"

مر۔ "تپ میری خالہ جانی ہیں؟" ریہہ نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "کل سے آئی ہیں؟"



ہو اس وقت۔ کہاں جا رہے تھے؟  
 اختر میاں نے سرخ سرخی نگاہیں اٹھائیں اور سوکھے لپوں پر زبان پھیری۔  
 ”سپا! السلام علیکم۔“

”ارے و علیکم۔ میں پوچھتی ہوں کہاں سے چلے آ رہے ہو؟ حلیہ دیکھا ہے اپنا۔ جیسے کڑے سے نکل کر آئے ہو۔ چلو اٹھو۔ سارے نما کر آؤ۔ بوسے داغ پھنا جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں فاروق حسن نے اگر تمہیں اس طیلے میں دیکھ لیا تو بھٹیوں سے اٹھوا کر گلی میں پھکوا دیں گے، سمجھ لے ہاں۔ جسے دیکھو وہی گلے کا طوق ہے۔ چلو اٹھو اب۔“ وہ حد درجہ جھنجھلا گئی تھیں انہیں دیکھ کر۔

”باجی۔!“ وہ پھر نقاہت سے بولے تھے ”چائے تو ملا دے۔“  
 ”ارے سب کھلا پا دیں گے تمہیں۔ مر نہیں جاؤ گے ذرا سی دیر میں۔ اب اٹھو بھی۔ جا کر ہمارا غسل خانہ پلید کرو۔ چلو جاؤ۔“

اختر میاں بہن کی جھاڑ پھینکار سن کر لڑکھڑاتے ہوئے غسل خانے کی سمت کو برہ گئے فردوس بیگم ہاتھ پر سو بل ڈالے کھڑی سوچتی رہ گئی تھیں۔

ہاشم میاں کو جی بھر کر یہ لکھا گیا تھا، لیکن انہوں نے قطعاً برا نہ مانا۔ بقول راج علی کہ ان کے دانت تک پہلے ہو گئے تھے۔ پھر بھی مسلسل مسکرائے جا رہے تھے۔

”یاب۔ ذرا اندر بند کرانا۔“ رافع کھڑا تصور کھینچ رہا تھا۔ ”اسی نہیں چل رہا ہے کہہ۔ کہاں ختم ہیں اور دانت کہاں سے۔“

”چلو۔ ہم نکلتے ہی سسی، سمری چڑھیں گے نالسی کے۔“ وہ گجل ملتے ہوئے ایٹن اتار رہا تھا۔  
 ”پلیٹ بھی کتنے ہیں کسی کو۔“ حمزہ بے سوچے سمجھے بولا۔  
 ”یہ بھی برا نہیں۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

بات سمجھ لینے والوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”کیا یہ جا رہا ہے؟“  
 ”چلو کھسکو یہاں سے۔“ وردہ نے سرگوشی کی۔ ”تب یہ لوگ نجانے کیا کیا اول فلول بولیں گے۔“  
 ”بکتے رہیں۔“ ماہین جھجھلائی۔ ”ہم کیوں جا میں۔ ہم نے تو ابھی گائے گائے ہیں۔“  
 ”تمہارا اٹکا ابھی دکھا نہیں۔؟“ رانمہ نے اسے کھوڑا تھا۔

”ارے۔ میرے بھائی کی شادی ہے۔ کوئی مذاق ہے۔“  
 ”یہ مذاق نہیں آئی۔ یہ۔ حقیقت ہے۔“ ریکا یک پیچھے سے حمزہ نے جملہ کہا اور جلدی سے ڈھیر سارا ایٹن ماہین کے چہرے پر مل دیا۔ وہ بھوت بنی بیٹھتی رہ گئی۔ لڑکیاں قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں تو وہ جھٹلا کر حمزہ کو مارنے لگی۔ پھر زور سے ہنسی۔ اس کے ساتھ وردہ بھی ہنسنی لگی۔

کسی نے ان دونوں کی چٹیا آپس میں باندھ دی تھیں۔ اور اب سارے کے سارے انہیں دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

پھر تو گویا ایک طوفان بد تمیزی اٹھ کھڑا ہوا۔ سب ایک دوسرے پر ایٹن کے گولے بنا بنا کر پھینکنے لگے تھے۔ کپڑوں، میک اپ کا حشر ہو گیا تھا۔ قہقہوں سے پورا لان گونج رہا تھا۔ بزرگ حضرات تو یہ صورتحال شروع ہوتے ہی اندر ہی جانب ہرہ گئے تھے۔ اور اب کوئی کسی کا رخ سامان حال نہ تھا۔ لڑکوں کی تو باقاعدہ دھینگا مشتی شروع ہو چکی



”عباد بھائی! میں ذرا پارک تک چلی گئی تھی۔“ ربیعہ بھی اپنی غلطی پر شرمندہ سی ہو گئی۔

”میں پریشان ہو گیا تھا۔ کافی دیر تک تمہارا دروازہ بجایا پھر دوسری جانب سے دیکھا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں گھبرا گیا کہ تم نجانے کہاں چلی گئیں۔“

ربیعہ نے اس کا چہرہ دیکھا پھر مسکرا دی۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی عباد بھائی!“ وہ ہنس دی تھی۔ ”بے فکر رہیے۔“

عباد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

”نچلو۔ ناشتہ کرلو۔ امی بہت مزے کے پراٹھے بناتی ہیں۔ اور ہاں رات کو شہلا آپلی کی مندی کی تیاری بھی کرنا ہے۔ تم نے اور انیقہ نے سنبھالنا ہے سب کچھ۔“

”ضرور۔“ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

پھر اپنے کمرے میں آکر اس نے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ دیکھا اور مسکرا دی۔ نجانے کیا تھا جسے وہ اتنی دیر تک مٹھی میں دبائے پھر رہی تھی۔

ربیعہ نے کانڈ پھیلا کر دیکھا پھر حیرانی سے مسکرائی۔ اس پر تو پوری لطم تحریر تھی۔ ربیعہ لطم پڑھنے لگی۔

”کمال ہے۔“ پھر وہ بولی تھی۔ ”یہ میرے ہاتھ میں رکھ کر لکھا ہے۔“

پھر وہ بتا: ”اس کے ذہن میں یہ پورا منظر آ رہا ہے۔ وہ ان حیران نظروں کو دیکھ کر کے مسکرا دی۔“

”ربیعہ! منہ بند رکھو! آواز سے وہ چونک اٹھی۔“ ناشتہ کرلو۔“

وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

UrduPhoto.com

رات روشنیوں سے معمور تھی۔ عباد نے کمری پیمت پر تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ ڈیکورنگ والوں نے پیمت کو خوبصورتی سے سجانے میں کوئی رقتہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ ہرے اور پیلے رنگ کے جھلما پٹے دیوٹیوں سے پورا ماحول سج گیا تھا۔ جگہ جگہ گلاب کے پیلے اور نارنجی پھولوں کے گلہ سے سجائے گئے تھے۔ اسٹیج پر گیندے کے پھولوں کی فراوانی تھی۔ رنگین منیٹروں نے جا بجا مختلف رنگ کی روشنیوں کو ہم آہنگ کیا ہوا تھا۔

انیقہ اور شہلا کی سیلیوں نے اسٹیج پر پورے دروازے پر طبع آزمائی کر رہی تھیں۔ انیقہ اور ربیعہ کھانے کے انتظامات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ عباد موسیقی اور تصویریں بنانے والوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

تب ہی ہاشم کی طرف سے مندی لے کر پوری پلٹن آچکی۔ آنے والے بھی ڈھول اور دف بجا رہے تھے۔ ادھر والوں نے بھی فل دیویم میں ڈیک آؤں کر دیا۔ موم بتیاں روشن ہو گئیں کلاسیں بجھا دی گئیں۔

دولہا میاں کی بہنوں اور کزنز کے چہرے موم بتیوں کی سحر انگیز روشنی میں چمک رہے تھے۔ تب ہی عریشہ کی نظریں دو آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اس کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ لیکن وہاں اجنبیت اور بے نیازی تھی۔ عریشہ کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ سب کے ساتھ گھسنے لگی۔ فراز ایک جانب کھڑا سینے پر بازو لپیٹے خاموش نظروں سے ہنسی مسکراتی کھلکھلاتی ناعمہ کو دیکھ رہا تھا۔

ناعمہ مندی کا تھال اٹھائے اس کے بالکل قریب سے گزری تھی۔ مگر تے مگر تے اس نے نظریں اٹھائیں اور اس کے لب جیسے مسکراتا بھول گئے۔

(باقی آئندہ ملاحظہ فرمائیں)

نہیں پہلے نے فل والیوم میں ابرار کا ۲۲ ساں تیری گل کرنی "نگاہا تھا۔ تقریب کا رنگ یکجہت ہی بدل گیا۔  
ہی بانہ سے آئے ہوئے لڑکوں نے ٹولی بنا کر گانے پر رقص شروع کر دیا تھا۔ عباد، فراز اور عباد کے دیگر  
نہی ماحول کا اثر قبول کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور سارے لڑکے مل کر خوب خوب ہنگامہ کرنے

"اگرے بھی۔ پہلے رہیں تو کر لیتے۔" شفیقہ حیات نے پاٹ دار آواز میں کہنے کی کوشش بھی کی لیکن اتنے  
نہیں کسی نے ان کی ایک نہ سنی۔

ایاں بھی تاہاں بجا بجا کر اپنی طرف کی باری کو پوری دوا دے رہی تھیں۔ ربیعہ شوق اور دل جیسی کے عالم  
نہی یہ سارا ہنگامہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے کب اپنی زندگی میں اس طرح کا بے فکر اور خوش باش ماحول دیکھا  
پوری طرح سے تقریب کو انجوائے کر رہی تھی۔

ربیعہ ربیعہ۔ "کوئی اسے پکار رہا تھا۔"  
یہ چونکی۔ اس نے اپنے چہرہ پر دیکھا۔ دور کھڑی انقیہہ نے جانے کب سے اسے پکار رہی تھی اور ہاتھ ہلا ہلا کر  
کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ربیعہ جلدی سے کھڑی ہوئی اور شور مہا کرتے لڑکوں سے بچ بھاگ نکلتی گئی تب ہی بے خوشی میں دھمال ڈالتا  
اس کے سامنے آ رہا تھا۔ بچہ ٹھنک کر کی رافع بھی کھڑا ہو کر آگے بڑھتا اور شرمندہ ہوا۔  
"اگھاروں بے چارے! اسے کھڑا کر کے دور سے دیکھو۔"  
مستی گھر آ جا رہے تھے شیرے سو رہے۔

ایک برابر چٹک چلا تھا۔ ربیعہ اس نکر اوپر خامی ندوس ہو گئی تھی۔ وہ نظریں جھپک کر لوٹ گئی چہرہ موڑے جلدی  
اگے بڑھ گئی۔ رافع اپنی بیعت کو کوئی نام نہ دے سکا تھا۔ تاجتے شور عیاں لڑکوں کی ٹولی کے نیچے ایک ٹک  
نہی آج میں گم کھڑا تھا۔ اسے کسی کا دھکا تو دیا جلدی سے وہ بھاگتا تھا کر پھر شروع ہو گیا لیکن اب کی بار  
اس میں وہ پہلی ہی سرستی نہ تھی۔



یہ انقیہہ کے ساتھ چلی منزل پہنچی آئی جہاں سکون اور خاموشی تھی۔  
نہیں کسی کام سے نیچے آئی تو دیکھا عباد بھائی کا موبائل بج رہا ہے۔ "انقیہہ اسے بتانے لگی۔" میں نے کال  
کی تو دوسری جانب کوئی عبد الباری صاحب تھے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔

اوسے "ربیعہ کا دل غیر معمولی انداز میں دھڑکا۔" پچھلے پچھلے "اس نے بے تالی سے پوچھا۔  
بھم میں نے انہیں تقریب کے متعلق بتایا تو وہ کہنے لگے۔ بعد میں بات کر لیں گے اب اگر تم کو تو میں اسی نمبر  
پا دیتی ہوں یا پھر یہ تقریب ختم ہو لے تو بات کر لیتا۔ کیا خیال ہے؟"

انہی اس کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ربیعہ کو بھی احساس ہوا کہ یہ موقع اس امر کے لیے مناسب نہ  
ہی شہلا کی رہیں ہونا پاتی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں بعد میں بات کر لوں گی۔“

انہیہ مطمئن ہو کر پلٹ گئی۔ ربیعہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہر چند کہ اس کا دل ترانہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

لڑکوں کا جوش کچھ سرد رہا تو انہیہ اور ربیعہ شہلا کو قہقام کرا سٹیج پر لے آئیں۔ شہلا کے چہرے پر پہلے آنچل کا سایہ تھا اس لیے اس کے تاثرات سب ہی سے پوشیدہ تھے۔ سب ہی کی پرشوق نظریں اس کے سراپے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایقان سے صبر کرنا دشوار تھا۔ وہ جلد از جلد اپنی عزیز از جان سہیلی کے تاثرات معلوم کرنے کی خواہش مند تھی۔

رسمیں شروع کی گئیں۔ شفیقہ حیات، فردوس بیگم اور عذرا بیگم سب سے پہلے اسٹیج پر پہنچیں۔ انہوں نے اسے ایٹن، ہندی، تیل سب ہی کچھ لگایا۔ شہلا سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بڑے سے لڑکے میں جیسے اس کے وجود میں ارتعاش تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک انجانا سا شور مچا کر رہی تھی۔ اسے نجانے کیوں کہیں کچھ غلط ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ بے شمار نظریں اور دودی کیمروں کے لینس اس پر مرکوز تھے۔ وہ ماتھے پر آیا ہیسٹ تک پونچھنے سے قاصر تھی تب ہی اس کے قریب ایک شوخ اور مانوس آواز چہچکائی تھی۔

”ہمیں تو دیدار سے محروم نہ کرو شہلا۔“ آج تو پہلی بار وہ اسٹیج پر آکر کھڑی ہو گئی۔ یہ ایقان تھی جو شوخی پر کبھی بڑبڑاتی تھی پھر وہ اس کے گھونٹ میں سے جھانکے بغیر شہلا کے لبوں پر مدھم سی مسکان دوڑ گئی۔

”ہول۔“ پھر مطمئن ہو کر بولی۔ ”اب کم از کم دو لہا میاں کے سوالوں کے جواب تو دے پاؤ گی۔“ شہلا کے کانوں میں ایک مرتبہ پھر ساؤس ساؤس کی ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یہ حوالہ دیا جیسی لگ رہا تھا۔

ہاشم چائے کی طلب سے کمرے سے نکلا تھا۔ شادی کے کاموں کی غرض سے رخصتی جانے والی جزوقتی ملازمہ بچن میں موجود تھی۔ اس کا ہاتھ اس سے چائے بنوانے کا تھا۔ وہ بیٹھ چکی تھی پر آکر ٹھنک گیا۔ بیزار ہزار سی عریضہ بیٹھیاں چڑھ رہی تھیں۔ وہ سارے پتروں میں بیوس تھی اور اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ حالانکہ وہ تیار ہو کر سب کے ساتھ اس کی ہندی لے کر شہلا کے گھر گئی تھی۔

عریضہ نے بھی ہاشم کو دیکھ لیا۔ وہ چوری ہو گئی۔

”عریضہ! ہاشم نے تشویش سے پکارا۔

”جی سنی بھائی!“

”تم واپس آگئیں؟“

”جی!“ وہ نظریں جھکا کر بس اتنا ہی کہہ پائی۔

”کیوں خیریت؟“ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سر میں درد تھا۔“ اس کی نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔ ہاشم چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ دیکھ رہا۔

”اکیلی ہی آگئیں؟ اتنی رات میں۔“ پھر وہ بولا۔ ”چھا خیر۔“ آہی مٹی ہو تو ذرا چائے بنواؤ، میں بھی سرور



”جیہ“ راجہ کی۔

”کھڑکی!“ وقت درے پر اٹھ سوا۔

42

”اے اپنے بھوے کچھ کہا؟“

نیستی کیسے "مجبوراً" پھر سسکرائی

مہ جان سکا ہوں آپ کے متعلق؟ جیسے کسی کشمکش کا شکار تھا۔

”میںلا کیا؟“ پریشان ہوئی۔ ”کیا جانتا چلتے ہیں آپ؟“

سایکوں لگتا ہے جیسے آپ کو کیس دیکھا ہے؟

اس لیے کہ آپ نے دیکھا ہے۔"

1. 2. 3. 4. 5. 6. 7. 8. 9. 10. 11. 12. 13. 14. 15. 16. 17. 18. 19. 20. 21. 22. 23. 24. 25. 26. 27. 28. 29. 30. 31. 32. 33. 34. 35. 36. 37. 38. 39. 40. 41. 42. 43. 44. 45. 46. 47. 48. 49. 50. 51. 52. 53. 54. 55. 56. 57. 58. 59. 60. 61. 62. 63. 64. 65. 66. 67. 68. 69. 70. 71. 72. 73. 74. 75. 76. 77. 78. 79. 80. 81. 82. 83. 84. 85. 86. 87. 88. 89. 90. 91. 92. 93. 94. 95. 96. 97. 98. 99. 100. 101. 102. 103. 104. 105. 106. 107. 108. 109. 110. 111. 112. 113. 114. 115. 116. 117. 118. 119. 120. 121. 122. 123. 124. 125. 126. 127. 128. 129. 130. 131. 132. 133. 134. 135. 136. 137. 138. 139. 140. 141. 142. 143. 144. 145. 146. 147. 148. 149. 150. 151. 152. 153. 154. 155. 156. 157. 158. 159. 160. 161. 162. 163. 164. 165. 166. 167. 168. 169. 170. 171. 172. 173. 174. 175. 176. 177. 178. 179. 180. 181. 182. 183. 184. 185. 186. 187. 188. 189. 190. 191. 192. 193. 194. 195. 196. 197. 198. 199. 200. 201. 202. 203. 204. 205. 206. 207. 208. 209. 210. 211. 212. 213. 214. 215. 216. 217. 218. 219. 220. 221. 222. 223. 224. 225. 226. 227. 228. 229. 230. 231. 232. 233. 234. 235. 236. 237. 238. 239. 240. 241. 242. 243. 244. 245. 246. 247. 248. 249. 250. 251. 252. 253. 254. 255. 256. 257. 258. 259. 260. 261. 262. 263. 264. 265. 266. 267. 268. 269. 270. 271. 272. 273. 274. 275. 276. 277. 278. 279. 280. 281. 282. 283. 284. 285. 286. 287. 288. 289. 290. 291. 292. 293. 294. 295. 296. 297. 298. 299. 300. 301. 302. 303. 304. 305. 306. 307. 308. 309. 310. 311. 312. 313. 314. 315. 316. 317. 318. 319. 320. 321. 322. 323. 324. 325. 326. 327. 328. 329. 330. 331. 332. 333. 334. 335. 336. 337. 338. 339. 340. 341. 342. 343. 344. 345. 346. 347. 348. 349. 350. 351. 352. 353. 354. 355. 356. 357. 358. 359. 360. 361. 362. 363. 364. 365. 366. 367. 368. 369. 370. 371. 372. 373. 374. 375. 376. 377. 378. 379. 380. 381. 382. 383. 384. 385. 386. 387. 388. 389. 390. 391. 392. 393. 394. 395. 396. 397. 398. 399. 400. 401. 402. 403. 404. 405. 406. 407. 408. 409. 410. 411. 412. 413. 414. 415. 416. 417. 418. 419. 420. 421. 422. 423. 424. 425. 426. 427. 428. 429. 430. 431. 432. 433. 434. 435. 436. 437. 438. 439. 440. 441. 442. 443. 444. 445. 446. 447. 448. 449. 450. 451. 452. 453. 454. 455. 456. 457. 458. 459. 460. 461. 462. 463. 464. 465. 466. 467. 468. 469. 470. 471. 472. 473. 474. 475. 476. 477. 478. 479. 480. 481. 482. 483. 484. 485. 486. 487. 488. 489. 490. 491. 492. 493. 494. 495. 496. 497. 498. 499. 500. 501. 502. 503. 504. 505. 506. 507. 508. 509. 510. 511. 512. 513. 514. 515. 516. 517. 518. 519. 520. 521. 522. 523. 524. 525. 526. 527. 528. 529. 530. 531. 532. 533. 534. 535. 536. 537. 538. 539. 540. 541. 542. 543. 544. 545. 546. 547. 548. 549. 550. 551. 552. 553. 554. 555. 556. 557. 558. 559. 560. 561. 562. 563. 564. 565. 566. 567. 568. 569. 570. 571. 572. 573. 574. 575. 576. 577. 578. 579. 580. 581. 582. 583. 584. 585. 586. 587. 588. 589. 590. 591. 592. 593. 594. 595. 596. 597. 598. 599. 600. 601. 602. 603. 604. 605. 606. 607. 608. 609. 610. 611. 612. 613. 614. 615. 616. 617. 618. 619. 620. 621. 622. 623. 624. 625. 626. 627. 628. 629. 630. 631. 632. 633. 634. 635. 636. 637. 638. 639. 640. 641. 642. 643. 644. 645. 646. 647. 648. 649. 650. 651. 652. 653. 654. 655. 656. 657. 658. 659. 660. 661. 662. 663. 664. 665. 666. 667. 668. 669. 670. 671. 672. 673. 674. 675. 676. 677. 678. 679. 680. 681. 682. 683. 684. 685. 686. 687. 688. 689. 690. 691. 692. 693. 694. 695. 696. 697. 698. 699. 700. 701. 702. 703. 704. 705. 706. 707. 708. 709. 710. 711. 712. 713. 714. 715. 716. 717. 718. 719. 720. 721. 722. 723. 724. 725. 726. 727. 728. 729. 730. 731. 732. 733. 734. 735. 736. 737. 738. 739. 740. 741. 742. 743. 744. 745. 746. 747. 748. 749. 750. 751. 752. 753. 754. 755. 756. 757. 758. 759. 760. 761. 762. 763. 764. 765. 766. 767. 768. 769. 770. 771. 772. 773. 774. 775. 776. 777. 778. 779. 780. 781. 782. 783. 784. 785. 786. 787. 788. 789. 790. 791. 792. 793. 794. 795. 796. 797. 798. 799. 800. 801. 802. 803. 804. 805. 806. 807. 808. 809. 810. 811. 812. 813. 814. 815. 816. 817. 818. 819. 820. 821. 822. 823. 824. 825. 826. 827. 828. 829. 830. 831. 832. 833. 834. 835. 836. 837. 838. 839. 840. 84

نئے پارک میں شہر کی بارہ اعشاریہ سترالی

اب اس نے جیسے ریمیہ کی حرکت پر ماسف سے سر اٹایا۔ "تس اس سے بھی پہلے کی بات لہ رہا ہوں۔  
 بقتل آپ کے۔ اس سے پہلے کہ اللہ میاں کے بچھوڑے رہتی تھیں۔ شاید میں نے  
 آپ کو دیکھا ہو۔ سنا ہے، نو میں ایک بچہ کو پہچانی ہیں۔"

بیزایا تھا۔ ریحہ کی آنکھوں پر غمی پلوں کی پھلن آ کر تھی۔

## Index

المجلد الثاني

۱۰۔ آئیں کھائے اے بڑھئی۔

ت کے لہجے سے جب کسی شخص کا دروازہ بجایا۔ حریفہ جاگ رہی تھی اور نامعلوم ازیت کا شکارانہ آنکھوں کو سوتے چلے جا رہی تھی۔

از اسے برہائی کی ہلکائی نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ باہر  
 ایک عظیم الشان منظر تھا۔ اسے کڑے تیروں سے گھور رہی تھیں۔ عرشہ کی نظریں جھک گئیں۔

سید اسد وقت

ان لوگوں کی بیماریاں بے لگام خونروں کی طرح نکلیں گی جس کان کی میٹیس یو سی روئے کی جاتی ہیں یہی "ہفت

۴۔ ایک طرف میں ہو گئی تھی لیکن انہوں نے کمرے میں قدم نہ دھرا۔

کی سے اجازت لیے بغیر پھر زکریا کی دُعا ناپسندیدہ ہو گئی۔ اچھا اثر پڑا اور گناہ سے بچا گیا۔

مرکز طبیعت خراب، غریب، "سپار"

تو تمہاری پچھلے کئی ماہ سے خراب ہے مینا! اچھا ٹانگ رہا ہے بیٹھی ہو سنہ مرنے ہوئے ہمیں جینے رہتی

غریبہ کے دل پر چوٹ پڑی۔ اس نے آنسوؤں سے لبریز شکایتی نظریں اٹھائی تھیں۔  
 "گھر میں اتنے مہمان نئے لوگوں سے واسطہ بھائی کی خوشی کا موقع۔ ہمیں کسی شے کا لحاظ نہیں۔ تمہارا  
 ماتم ہے کہ پورا ہو کر نہیں رہتا۔ ہماری عزتوں کا بھی پاس نہیں۔ تمہیں  
 "ہمیں نے آخر کیا کیا ہے امی!" وہ دم حمل لہجے میں شکایتا بولی۔ "آخر کیوں سب لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟"  
 آپ لوگ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔" وہ خود بے اختیار سسکا اٹھی۔  
 "اتم اپنے حال پر توجہ کرو بیٹی، تو کسی دوسرے کو یہ تکلیف کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے۔"  
 ان کے دل کو بھی اس کی بے بسی دیکھ کر کچھ ہونے لگا تھا۔ انہوں نے لہجہ کچھ نرم کر لیا۔  
 "بھائی کی شادی کا موقع ہے اپنے آپ کو کچھ عقل کی بات سمجھاؤ۔ ہماری باتیں تو تمہاری سمجھ میں آتی نہیں  
 ہیں اب کسی کو تم سے شکایت نہ ہو۔"  
 اسے تنبیہ کرتی ہوئی وہ مزگنی تھیں۔ ان کے پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑے فاروق حسن دلعنا "راہداری میں  
 ہو گئے۔ فردوس بیگم اپنی دھن میں غلطی چلی گئیں۔  
 غریبہ دروازے سے سر نکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔



رات کے چار بجے کا مکمل تھا۔ گھر کے تمام افراد تقریب کے اختتام پر تھک کر چور ہو چکے تھے۔ رات  
 دو نوں ہاتھوں کا تھکا ہوا سر کے نیچے جمائے سیدھا لیٹا چمت کو گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ عجیب ہو رہا  
 تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔  
 اور شرم سے جھک جاتی تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سو رہا تھا۔  
 پیشانی کی محراب پر ہونے لگی تھی۔  
 بے چینی حد سے بڑھی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اسے ہاشم کی یاد آئی۔ بے سوچے  
 سمجھے اس نے موبائل اٹھایا اور نمبر پیش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہاشم کی نیند میں ڈوبنے لگا۔ "آواز ابھری۔"  
 "ابے آلو۔ تیرے سونے کا وقت نہیں ہوا۔"  
 "بار ہاشم۔ ہاشم۔ عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے مجھے۔"  
 "ہاشم۔؟ تمہارے منہ سے نام نہ دیکھنے دے۔ ہاشم! ابے الو کی دم۔ یہ اس وقت تجھے کون سی الجھن  
 ستانے لگی؟"  
 "پتا نہیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "جی جانتا ہے کچھ کہوں۔ کچھ کچھ اعتراف کروں۔"  
 "ہاشم یاد رہی نہیں ہوں میرے بھائی۔" وہ عاجزی سے گویا ہوا۔ "اور دیکھو مجھے سونے دے کل مجھے جاگنا  
 ہے۔ بلینز۔ کوئی الٹا سیدھا اعتراف کر کے کہیں تو میری نیند ہی عتاب کر دے۔"  
 "ابھی سے بے مروتی کا یہ عالم!" وہ چیخ کر بولا۔ "ابھی تو رات پڑی ہے درمیان میں۔"  
 "ہاشم۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "رات تو گزرنے والی ہے۔ ہاں پورا دن ضرور پڑا ہے۔ ایک عالم  
 انتظار کا بات ہے۔"  
 رافع کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر اسے ہنسی آ گئی۔ اس کی ہنسی کی آواز سن کر ہاشم نے پھر ایک سرواہ  
 بھری۔ رافع نے ہنستے ہنستے موبائل آف کر دیا۔



ہاشم اب خود سے مطمئن ہو چلا تھا۔ لہذا سرسری سا آئینہ دیکھنے لگا۔

”اور وہ اعتراف؟ جو وقت تجھ نازل ہوا۔ وہ کیا تھا؟“

”اعتراف؟“ رافع یوں بنا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”کون سا اعتراف؟“ ہاشم نے پھر ایک دھمو کا اسے رسید کیا۔ رافع کراہ اٹھا۔

”اوہ۔ کچھ نہیں یاد۔ ایسے ہی تجھے جھپٹ رہا تھا وقت تجھ۔ تو سچ سمجھ بیٹھا۔“

”اور جو میرے منہ سے کچھ نکل جاتا انا سیدھا۔ پھر؟ قبولیت کا وقت تھا۔“

”قبولیت کا؟“ رافع سوچنے لگا۔ ”قبولیت کا وقت تھا؟“

اسی لمحے کمرے میں حمزہ نے جھانکا اور اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

”حضرات۔ وقت سرا بندی ہوا چاہتا ہے۔ ابو جی دونوں ہاتھوں میں سرا تھا اسے دو لہا کے خنجر ہیں۔ تشریف لے آئے۔“

”س۔ سرا۔؟“ ہاشم کو جھٹکا سا لگا۔ ”یعنی کے سرا؟ میں سرا باندھوں تو نہیں پر؟“

رافع اور حمزہ ہنسنے لگے۔

”وہ بھی نوٹوں کا۔ ہزار ہزار ایک نوٹ ہیں آپ کے سرے میں۔“ حمزہ پھر ہلکا ہلکا۔

”نوٹوں کا سرا۔؟“ ہاشم کو پھر کرٹ لگا۔ ”خدا کے لیے بھائیو۔ مجھ پر ترس کھائو۔ میں ستر ہویں صدی کا

بکری نما دو لہا نہیں بولوں۔ اندھوں کی طرح کہاں ٹانگ ٹوئیاں ماروں گا؟“

کمرے میں رافع اور حمزہ کے قہقہے گونجنے تو علی اور رافع بھی چلے آئے۔

”تو بے فکر رہو۔ تمہارے خنجر اب تک سر پر لٹکا رہا ہے۔“

”خیر تک؟“ اس نے ابرو اٹھا کر کہا۔ ”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب یہ ہے۔ جب تک تو اپنے سارے آپ جلنے کے قابل نہیں ہوتا تب تک یہ

”میں ہرگز سرا نہیں باندھوں گا۔“ وہ ہنزا۔ ”اور وہ بھی نوٹوں کا سرا۔“

”سوچ لے۔ آیا ابو کو غصہ آئے گا تو جو توں کا سرا باندھ کر لے جائیں گے۔ تو رافع نے دھمکایا۔

”اچھا۔“ وہ سہم گیا۔ ”پھر نوٹوں کا ہی مسئلہ ہے۔ تو نے نوٹ ہوں گے اس میں لگس بھگ؟ ہنی

موئن کا بندوبست ہو جائے تو میں یہ قربانی بھی دے سکتا ہوں۔“

”صہ قے جاواں۔“ علی نے دانت نکالے۔ ”بھائی جان۔ محتاط رہیے ہزار کا تو اس میں صرف ایک نوٹ

سے باقی سب پانچ کے نوٹ ہیں۔“

”پانچ کے نوٹ؟“ وہ چیخا۔ ”وہ تو کب کے متروک ہو چکے ہیں۔“

”تب ہی تو ابو جی نے نوٹوں کا سرا بنوایا ہے۔ صرف نواں کیسے میسر دے ہیں انہوں نے۔“

”یا خدا۔“ ہاشم کو چکر آگیا۔ اسی لمحے ہانپتی کانپتی فردوس بیگم نمودار ہوئیں۔

”ارے بیٹا۔ سب کے سب ہی دو لہا بن رہے ہو کیا؟“ وہ حلقی سے بولیں۔ ”نیچے ہال میں ایک لڑکا نہیں جو

ہمارے کچھ کام آئے۔ اور ہاشم بیٹے تیار ہو تو چلے آئے۔ برات لے جانے میں اب کون سی کسر ہے؟“

”امی جی۔ میں سرا نہیں باندھوں گا۔“

”سرا۔؟“ وہ حیرت سے بولیں۔ ”کون سا سرا۔؟ تمہارے ابا میاں نے تو صرف پھولوں کے ہار منگوائے

پیرم کے لیے" ہاتھ لگے غصے سے مٹھیاں بھیج کر تنہا تلاش میں اور حرا دھڑکھا لیکن وہ گڑھے کے سرے سے ہینک کی مانند جانب تھا۔



اس نے اٹھنے کا لاشٹ پرل غراہ سوٹ پہنا تھا۔ لباس اس پر اس طرح سے سجا تھا جیسے اسی کے لیے بنا ہو۔  
 ڈرننگ روم سے نکلتی اٹھنے ٹھک کر روک گئی۔  
 اس کے لائے سیاہ بل کمر سے نیچے تک اپنی چھب کھلا رہے تھے۔ گوری رنگت ذرا سے سبک اب سے دیکھ  
 انھی بھی سیاہ آنکھوں کو لافنوں نے نمایاں کر دیا تھا۔ ہیٹ کا بڑا سا ہم رنگ لاپٹہ اوڑھے وہ کوئی مٹل شاہ زادی  
 لگ رہی تھی۔  
 "بی بی فلر!" بے ساختہ ہی اٹھنے کے لبوں سے نکلا۔ "ریجہ ریجہ یہ تمہی ہوتا۔" ریجہ شرابی تھی۔  
 "بس ایک لمبی ہے" اٹھنے اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

ریجہ اسے دیکھنے لگی۔  
 "جیوری کی گردن بھی خالی ہے اور کانٹوں میں بھی کچھ نہیں۔"  
 "اسی لیے میں اس کے لیے یہ لائی ہوں۔" منہ زور بیٹھم کی تار چڑھ گئی تھیں۔ ہاتھوں میں جیوری باکس  
 تھا۔ کمزری تھیں۔  
 "ریجہ تم پر ہنسنے لگا۔ یہ میرا سچے موتیوں کا میٹھ ہے۔" اس نے اس لباس کے ساتھ ہمت اچھا گئے کا۔  
 "اٹھو۔ لیکن۔" وہ چپک چپکی۔  
 "اور اب مجھے اسی کا کمر۔ میری بیٹیوں جیسی ہو تب۔" اس نے وہی بات کہی جو وہاں پہلے اٹھنے کی وجہ سے تھوڑے  
 ہوئیں۔ "تم بھی ڈانٹ تیار ہو جاؤ۔" اٹھنے نے چپک چپکی۔  
 "بس اسی رنگ میں یوں تیار ہو گئی۔" اس نے چپک چپکی۔  
 "یہ دیکھو تمہارے کمری روٹی تھی۔ کپڑوں کی خوشبو اس کے ارد گرد بھری تھی۔ اس کا درد پھول بن کر کھلے  
 لگا تھا۔



ناشر اندر داخل ہوتے ہی ٹھک کر رک گیا تھا۔ سفید موتیوں کے کاسر والے فیوڈی لباس میں ملبوس ایڈن کی  
 آنچ چھب بی نرالی تھی۔ ناشر کو ڈرننگ روم ٹھک ٹھک کے آہٹے میں اس کا ٹکس رکھائی دے رہا تھا۔ ایڈن نے ایک بے  
 نیازوی سے نظر اس پر ڈالی اور پھر اپنی لب اسٹک درست کرنے میں مگن ہوئی تھی۔ کھلے ہوئے براؤن بالوں اس کی  
 پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا بے پروا استہلال روپ بلبلی گرائے پر آتا تھا۔  
 ناشر نے اس کے قریب آکر اسے کمر سے تمام لیا اور اپنا چہرہ اس کے شانے پر ٹکا دیا۔ ایڈن گڑبڑا گئی۔  
 "ناشر! ناشر! دروازہ کھلا ہے۔ کیا کر رہے ہو۔"  
 "ایسا کچھ نہیں جس کے لیے دروازوں کا دھیمان رکھا جائے۔ یونہی قریب سے دیکھ رہا ہوں تمہیں۔"  
 آہٹے میں اس سے لگا چہرہ اچھا کرتے ہوئے شوخ رہے مسکرایا۔

"اول ہوں۔" وہ کنسیا کی۔ "ڈر اور سے دیکھو تو اچھا ہے۔ یہ میرا کچھ ہے۔ ابھی میرے ایک  
 امارت پر میرے بھائی زندہ آجائیں گے سمجھو۔"  
 "ڈرننگ" وہ ہنس رہا اور قریب رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ "یہاں لہکے ہے بھائی بندوں کا۔ ڈر اباؤ تو اب ہم نے  
 بھی کو قال نہ بلوالیا تو کھتا۔"

ایڈن نے بڑے تازے اہوج حاکر اسے دیکھا اور سخت سے تاک مکوڑی۔  
 "اڑی پر آجائیں ہم تو کو توکل بھی کچھ نہ کہہ سکتے یا در ہے۔"  
 "اور ہم اگر خد پر آجائیں تو بھری محفل میں بھی منہ چوم لیں گے۔ تمہیں بھی یاد رہے۔"  
 "اؤ!" وہ ہاتھ میں پکڑی لب اسٹک میز پر رکھ کر اسے معنوی حیرت سے دیکھنے لگی۔ "لا بچوں کی ماں کا منہ  
 ہوتے شرم نہ آئے گی آپ کو؟"  
 "اول ہوں۔ تم کو تو ہم کسی چار بچوں کی۔"  
 "ایڈن نے بیئر برش سے اسے لا تین ضربیں لگائیں۔ "جائو یہاں سے۔ مجھے تیار  
 ہے۔ جاؤ۔"

"بھائی! میں چاہتا ہوں!" اس نے طینان سے نفی میں سر ہلایا۔  
 ایڈن جبر زدہ ہوئی تب ہی ناشر کا سب باکل بننے لگا۔ ایڈن سنتی ہی ناشر اٹھ کھڑا ہوا۔  
 "اُد کے تم جلدی تیار ہو میں ذرا فون سن لوں۔" ناشر نے تیزی سے کمر سے نکلا تھا۔ ایڈن دل ہی دل میں خدا کا شکر  
 ادا کرتے ہوئے کی جانب توجہ دے رہی تھی۔  
 "تم نے ناشر کو روک دیا۔ ناشر کو روکنا اور کتنا ممکن ہو سکے۔" وہ انداز سے بولی۔  
 "مرا۔ میں تمہیں کتنا سمجھا کر آیا تھا لیکن۔" وہ منہ چڑھاوا۔  
 "لیکن سمجھ پاتی تبتا۔ کب آؤ گے؟"  
 "ابھی تو صبح پڑا ہے تم آرام سے رہو۔"  
 "آرام؟ تمہارے بغیر؟ NO!"  
 "کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ منہ چڑھاوا۔  
 "میں کچھ نہیں چاہوں؟" وہ فراخ دل سے بولی۔  
 "نرا! آج کر لو۔" اس نے حواسوں میں رہو اور یاد رہے اب فون مت کرنا۔ "وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔  
 ہاتھ سے علی اور ناخ آ رہے تھے ناشر نے فون آف کر کے جیب میں ڈالا اور مسکراتے لگا۔  
 "بلیس ناشر بھائی! بار بار بالکل تیار ہے۔ دو لہا ایک دم دیکھی۔" ناشر بولا۔  
 "جس میں ایڈن کو لے کر آتا ہوں۔" وہ جلدی سے کمرے کی جانب مڑ گیا۔



ات است شین سے اتری تھی اور ہاتھ بے حد ارباب لیے گاڑی سے باہر آیا تھا۔ رنگ بوی کا بچہ ہاں تھا۔  
 وہ ماری ہمار تھی۔ مسکراتے جھلکاتے چہرے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔  
 وہ اور اٹھنے خواتین کو گھر سے بیڑا کر رہی تھیں۔ تب ہی ایڈن سے کوئی مشورہ کرتے رہنے کی نظر اس کی



جانب انھی تھی سو چند لمحوں کے لیے تم ضم سا ہوا۔  
 ”لیکن بھائی صاحب کو ہوا کیا اچانک؟“ ایقان کچھ بھٹا کر پوچھ رہی تھی۔ رافع چونکا اور جلدی سے  
 کھٹکھٹا رہا۔

”پتہ نہیں۔۔۔ وجوہات کا علم نہ ہو سکا لیکن اصرار میں ہے حد شدت ہے۔۔۔ دادی جان راضی ہیں۔“  
 ”اچھا۔۔۔ اماں بھی مان گئیں؟ اور اصل باری؟ اس سے کسی نے پوچھا؟“  
 ”ابا جان اور تایا ابا اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔  
 ”نکال ہے! کوئی تک ہے بھلا۔“ اس نے خفگی سے سر جھٹکا ”اب میں کیا کر سکتی ہوں؟“  
 ”آپ سے انہوں نے عریضہ کو سمجھانے کے لیے کہا ہے۔۔۔ بلکہ بتانے کے لیے۔“  
 ”یا اللہ! اس نے سر تھام لیا۔

”قاضی صاحب کو میں لے کر آتا ہوں آپ اسے بھی وہاں لے آئیں۔“  
 وہ کہہ کر آگے بڑھا۔ تب ہی اس نے پھر ایک اچھتی سے نظر اس پر ڈالی تھی۔ مسکراتی ہوئی ریجہ بھی کسی سے  
 بات کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ رافع کو متوجہ پا کر اس کی نظریں فوراً جھٹک گئیں۔

ڈرننگ روم کے قہقہہ آئینے میں شہلا کو اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ موو اور لکھن گریں کامبی نیشن کے  
 غرابہ سوٹ میں اپنے اپنا آپ اجنبی لگ رہا تھا۔ یہ وہ شہلا تو نہیں تھی جسے وہ اب تک دیکھتی آئی تھی یہ تو کوئی اور  
 ہی تھی۔

UrduPhoto.com

اجنبی سا چہرہ!  
 اجنبی سی سوچ!  
 اجنبی سی راہیں!  
 سب کچھ کسی سے ادھار مانگا ہوا لگ رہا تھا۔ ہم صم سی بیٹھی تھی جب پروانہ کھلا اور بلخاری ہوئی۔ ایقان  
 ”ورنہ ثانیہ غذرا بیگم ہستی مسکراتی اندر چلی گئیں۔ شہلا کی نظریں جھٹک گئیں۔“  
 ”ہائے سہیلی۔۔۔ سن تو بیچانی نہیں جا رہیں۔“ ایقان نے اسے گد گدایا ”وہ میری سادگی اور متانت کا نمونہ  
 بنے رہنے والی دوست کہاں ہے؟“  
 شہلا دھیرے سے مسکرا دی۔

”خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ مجھے اس کی کچھ ایسی تلاش بھی نہیں۔ یہ نئی دوست مجھے زیادہ بھائی ہے۔ خدا کرے کہ ہمیشہ  
 ہمیں ایسا ہی سجا بنا مسکراتا دیکھوں۔“  
 ایقان نے اس کا گال چوم لیا۔ شہلا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ سب کی نظریں اس کے اس انمول روپ کو سراہ  
 رہی تھیں۔

تب ہی دروازہ کھلا اور فردوس بیگم عریضہ کو لیے چلی آئیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی رقم تھی عریضہ کا چہرہ از حد تپا  
 ہوا تھا۔ شہلا کے ہم سروں میں کیسے گے سلام کا بھی وہ جواب نہ دے پائی تھیں۔  
 ایقان اور غذرا بیگم نے ایک دوسرے کو بے بس نظروں سے دیکھا۔ ورنہ ثانیہ نظریں چراغ لگیں۔  
 اسی لمحے رافع اور عاشر قاضی صاحب کو لے کر وہاں چلے آئے تھے۔ پیچھے عباد اور فراز تھے۔ خواتین در در دور ہو

گئیں۔ فردوس بیگم نے عریشہ کا بازو پکڑ کر اسے شہلا کے قریب بٹھادیا اور اس کا دوشہ اس کے سر پر ڈال دیا۔ سب دم بخود تھے۔

قاضی صاحب نے شہلا سے ایجاب و قبول کروایا۔ اس نے سر جھکائے جھکائے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ مبارک سلامت ہوئی۔ پھر وہ عریشہ کی جانب متوجہ ہوئے۔

”عریشہ بی بی! آپ کو بھوسہ پچاس ہزار روپے سکھ رائج الوقت میاں بافع حسن ولد سلجوق حسن کے نکاح میں آنا منظور ہے؟“

عریشہ پتھر کے بت کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔ ایقان اور وردہ نے پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شہلا متعجب تھی۔

قاضی صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔ تب اس نے کاش وار نگاہیں اٹھا کر بے خونی سے عباد کے پہلو میں کھڑے فراز کو دیکھا تھا۔ وہ نظریں جھکائے سینے پر بازو لیٹے بے نیازی سے کھڑا تھا اور اپنے جوتوں کی شیب پر غور کر رہا تھا۔ عریشہ کے سینے میں سانس اٹکنے لگی۔

”بی بی! جواب دو۔“ قاضی صاحب نرمی سے بولے۔

”ہاں!“ وہ چٹختی۔ ”منظور ہے، منظور ہے مجھے۔“

سب چند لمحوں کے لیے دم بخود رہ گئے تھے۔ قاضی صاحب قدرے بوکھلائے۔ حتیٰ کہ بے نیازی سے کھڑا فراز بھی بے طرح چونکا۔

”ادھر دستخط کرو بی بی!“ قاضی صاحب نے جیسے اس کے رویے پر غور کرتے ہوئے کاغذات آگے بڑھائے تھے۔ اس نے جھپٹ کر لے لیے۔

”اس نے جھپٹ کر لے لیے۔“ وہ چٹختی۔ ”سب سے باہر نکل گئی۔ وہاں موجود افراد ایک دوسرے کے چہرے پر اس کے رویے کی وجہ خونچاہ تھے۔ فردوس بیگم بھی چپکے سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

عاشق نے بے وجہ کشتہ کھاندا کر کا صاف کیا اور گواد کے طور پر دستخط کرنے لگا۔

عریشہ کے اصرار پر حمزہ اسے گھر چھوڑ آیا تھا۔ تھوڑی بہت بد مزگی جو چند افراد نے محسوس کی تھی وہ کچھ ہی دیر میں ماحول کی ست رنگی اور تازگی میں کھو گئی تھی۔ سب ہی نے ہاشم میاں کی بے پناہ خوشی اور مسرت کو محسوس کیا تھا اور نئے جوڑے کے لیے دعاؤں کی تھیں۔

وقت رخصت شہلا کی مثلاًشی نظروں کا عندیہ پا کر انہیہ چپکے سے اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

”عمر کو فراز کے ساتھ مصروف کیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں میں اسے صبح ضرور لے کر آؤں گی۔“

اس کی سرگوشی شہلا نے اور شہلا کے عین عقب میں موجود ہاشم نے بھی سنی تھی۔ انہیہ کی بات پر شہلا بے اختیار ہی رو پڑی تھی۔ پھر منیذہ بیگم، عباد اور پھر بیچہ سے گلے لگ کر وہ سسکتی ہی رہی۔

ہاشم نے قدرے پیچھے ہو کر برابر کھڑے رافع کے کان میں کچھ کہا۔ رافع خاموشی سے مڑ گیا تھا۔ پھر جی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر شہلا زندگی کے نئے سفر روانہ ہو گئی۔



کرشل کا گلدان زور سے ڈرنسک ٹیبل کے آئینے سے ٹکرایا۔ گلدان وہ میز اور پھر فرش پر گر اور چکنا چور ہوا۔ آئینہ چٹ کر کئی حصوں میں بٹ گیا تھا۔ پھر شیشے کا گھاسا تاج محل دیوار پر لگا اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ چینی کی گڑیا، پلاسٹر آف پیرس کا مجسمہ اور ایسے ہی کئی شو پیس کمرے میں ابھرے اور ہر جا کر گرے اور انجام کو پہنچتے گئے۔ اس کے بعد بستر کے نیچے، بیڈ شیٹ، میک اپ کا سامان، سی ڈیز، کتابیں، غرض کہ کچھ بھی اس کے خون اور وحشت سے محفوظ نہ رہ پایا۔ ایک کے بعد ایک وہ ہر چیز کو توڑتی اور بھیرتی چلی گئی۔ ایک عالم جنون تھا جو اس پر طاری تھا۔ اس کی روح کسی ناویدہ قوت سے مصروف جنگ تھی۔ وہاں تو شاید کہیں تھا ہی نہیں، صرف اور صرف وحشت کا راج تھا۔

پھر اس نے چیخ چیخ کر رونا چاہا مگر اس کی آواز گٹے سے نکل نہ پائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ گونگی ہو گئی ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے دیکھنا چاہا مگر اسے کچھ بھائی نہ دیا۔ غم وغصے کی بے پناہ شدت نے شاید اسے اندھا بھی کر دیا تھا۔ اس نے خود کو آواز دینا چاہا لیکن اسے اپنی ہی ریکارڈ کا جواب نہ مل سکا۔ وہ شاید خود سے بھی بچھڑ گئی تھی! وہ دنیا میں بالکل اکیلی۔ اندھی، بھری اور گونگی ہو گئی تھی۔ اس سوچ نے اسے لرزاکر رکھ دیا۔ پٹی پٹی آنکھوں سے گرد و پیش کو دیکھتے ہوئے وہ خود کو پکارنے لگی، غبار مٹھنے لگے، وحشت شانت ہونے لگی، جنوں رخصت ہونے لگا۔

عریضہ تھک کر کمری گہری سانس بھرنے لگی تھی۔ اسی لمحے شہنائیوں کی آواز سے گھر کے در و دیوار گونج اٹھے۔ بارات دلن کو لے کر آچکی تھی۔

شہلا کو ماہرین نے کہا تھا کہ وہ ایک خوبصورت اور دلکش عورت تھی۔

دن بھر رانچ، نان، پھل، علی اور خود ہاشم میاں بھی کمرے میں موجود رہے تھے اور اب وہ لوگ ہال کی محنت کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پینڈ کے پتوں، بیج، گلاب کی سس، نرم پتیوں سے بڑا ہال بنایا گیا تھا۔ جبکہ بیڈ کے چاروں جانب گلابی اور نارنجی پھولوں کی لڑیاں تھیں۔ کمرے میں جا بجا گلاب سے سجے ہوئے تھے جن کی مہک سے ماحول میں حسن، محبت اور انتظار کی سب سے قیمتی نمایاں تھیں۔

ایقان اور ماہرین سحر انگیز ماحول کو زیادہ دیر نہ نہ پاس۔ وہ شہلا کو خدا حافظ کہہ کر باہر چلی گئیں۔ یوں بھی لڑکے لڑکیوں نے چمت بررت جگے کاروگر اسے بنایا ہوا تھا اور ان کا خوب خوب ہلا گلا کرنے کا پروگرام تھا۔ شہلا ایک نامعلوم سی کیفیت کا شکار تھی، بھاری بھاری سے پونے اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سب ہی کچھ محبت کی طرح خوب صورت تھا۔

تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونکی تھی۔

”مما۔۔۔“ چمکتی ہوئی آواز سن کر شہلا کا اپنا دل بھی جیسے چمکا تھا۔

سانے عمر کھڑا تھا۔ شہلا کی آنکھوں میں بے ساختہ جھک نمودار ہوئی تھی۔

”عمر۔۔۔“ انتہائی حیرت اور مسرت سے اس نے کہا تھا۔

وہ دڑ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔

”واؤ ممما! سب کچھ زبردست ہے۔ اب ہم یہاں سو یا کریں گے؟“



ارے نک نیل کے آئینے کے سامنے وہ قدرے غم صم سی بیٹھی تھی۔ واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی اسے چومک کر خود میں واپس آئی۔ لیوں پر خوبصورت مسکراہٹ سجائے فریش فریش سا ہاتھ ہاتھ گاؤں سے باہر نکلا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں تیزی سے بالوں میں چلاتے ہوئے وہ اس کے عقب میں آگھڑا

”ماں بھی خاموشی سے برش کرنے لگی تھی۔ ہاشم نے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو بغور دیکھا۔ لائٹ ریٹ کے لباس میں وہ بے حد سادگی کے عالم میں بھی بجلیاں گرا رہی تھی۔ سیاہ بالوں کی بدلی نے اس کے شش سراپے کو مزید جاذبیت بخش دی تھی۔

”نانوں میں میرے کے تھے تو بڑے دیک رہے تھے۔ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر شہلا نے خاموش نظریں اٹھا کر اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھا پھر ٹپکس گرائیں۔

”کیا بات ہے شہلا۔“ ہاشم قدرے عجیب کر بولا تھا۔ ”مگر بڑے اس پردے کو درمیان سے ہٹا کیوں نہیں آتیں تم؟ کھل کر مسکراؤ۔“ کھل کر کھینچ کر کھل کر اپنی لگو۔ یہ کیا کہ بے غمی کی یہ چادر تم ساتھ ساتھ لیے چلی آئیں۔“

وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لے آیا تھا۔ شہلا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ہاشم بھی بے ساختہ ہی سیدھا ہوا تھا۔

UrduPhoto.com

”اوس۔“ شہلا نے کہا۔ ”اچھا۔“ ہاشم نے جواب دیا۔ ”دستک ہوئی ہے۔“

ابھی شہلا کوئی آداب سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر کچھ دستک ہوئی۔

”بھئی۔“ ہاشم دھیرے دھیرے ہنس دیا۔ ”میں کچھ زیادہ ہی بے خود ہو گیا تھا شاید۔“

ہاشم دروازے کی جانب بڑھا تو شہلا نے خود کو کیوز کرنے میں چند سیکنڈ ہی لگاتے تھے۔

دروازہ کھلنے پر باہر کھڑے کئی افراد نے مسکراتے اندر آئے۔ ان کی رہنمائی میں ہانپتا، رعبہ، عمر، عباد کے علاوہ ناعیمہ، وردہ، ثانیہ اور سدرہ بھی تھیں۔ لمحہ بھر بعد ہی سب ہی چمک رہے تھے ہنس رہے تھے۔ شہلا عمر کیوں ساتھ لگائے بیٹھی تھی جیسے برسوں بعد ملی ہو۔

فردوس بیگم نے کمرے میں جھانکا۔ ان کی سب سے پہلی نگاہ شہلا اور عمر پر ہی پڑی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے ان کے چہرے پر نہایت بد مزگی کے تاثرات ابھرے۔ شہلا بھی اتفاقاً ”ان کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ قدرے خفیف سی ہوئی۔

”ای جی۔۔۔ آئیے نا۔ باہر کیوں کھڑی ہیں۔“ ہاشم اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی جانب بڑھا۔

”ہم باہر ہی بٹھلے۔ قی دھرنے کی جگہ نہیں اندر۔“ وہ بے زار سے لہجے میں گویا ہوئیں۔ ”اے ماہین۔۔۔ یہاں بیٹھی ہنسی مذاق کر رہی ہو، باہر ناشترہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ دلہن کی بہنیں جو سامان لائی ہیں، وہ بھی ویسا ہی پڑا ہے۔ چلو ذرا ناشترہ لگواؤ۔“

ان کے بیزار لہجے اور کرخت آواز نے لمحہ بھر کے لیے گل دگزار ہوئی محفل کو سراسیمہ سا کر دیا تھا۔ سب ہی خاموش ہو کر رہ گئے۔ ماہین خجل سی ہو کر انہی تو درود اور ثانیہ بھی جلدی سے اس کا ہاتھ بٹانے کے خیال سے کھڑی



ہو گئیں۔

”اویاس! ذرا رافع کی خبر لیں۔“ ہاشم نے عباد کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے بغیر ہر محفل کچھ ادھوری سی لگتی ہے۔“

عباد فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ ناعہ اور سدرہ بھی ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کمرے میں اب صرف شہلا، انیقہ اور ربیعہ ہی رہ گئی تھیں۔

”اویاس! کیا رائے ہے دو لہا بھائی کے بارے میں؟“ انیقہ نے مسکراتی نظروں سے شہلا کو دیکھا۔ وہ رسائیت سے مسکرا دی تھی۔

”رائے اگر اچھی نہ ہوتی تو ہای کیوں بھرتی میں۔ ظاہر ہے رائے تو شروع سے ہی اچھی ہے۔“ وہ عمر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

”اور ان کی رائے آپ کے بارے میں؟“ اب ربیعہ کی باری تھی۔ ”منہوں نے کیا بتایا آپ کو؟“

”کیا جانا چاہتی ہو تم دونوں؟“ شہلا نے دونوں کے کان پکڑ لیے۔ ”اب کیا میں لفظ بہ لفظ ان کی باتیں دہراؤں؟“

دونوں ہنسنے لگیں۔ عمر حیران لگا ہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

”مما۔۔۔ اب آپ یہاں رہیں گی؟“ بالآخر اس نے جلد ہی وہ سوال پوچھ لیا جو وہ جملہ نے کب سے لبوں میں دبائے بیٹھا تھا۔

”نہیں۔۔۔“ ربیعہ نے بار بھری سرزنش کی۔ ”میں نے آپ کو کیا سمجھا تھا؟ اب بھول گئے اسی باتیں؟“

”نہیں تو۔۔۔“ شہلا نے کہا۔ ”اس کی صورت دیکھ کر ربیعہ اور انیقہ کو ہنسی آئی جبکہ شہلا سنجیدہ سی ہو گئی تھی۔ اسی وقت دروازہ کمرے میں آئی تھی۔“

”اب لوگ آجائیں۔۔۔“ شہلا نے لگ گیا ہے۔ ”وہ انیقہ اور ربیعہ سے مخاطب ہوئی پھر اس نے شہلا پر نظر ڈالی۔

”شہلا بھابھی۔۔۔ آپ کا اور ہاشم بھائی کا بیٹھنے میں بیٹھیں لے آئی ہوں۔“

”نہیں وردہ۔۔۔“ شہلا جلدی سے کھڑی ہوئی۔ ”میں اور ہاشم اب سب کے ساتھ ہی ناشتا کریں گے۔“

وہ مسکرا دی تھی پھر اس کی ہمرای میں وہ تینوں کمرے سے نکلی تھیں۔

ڈائننگ ٹیبل کے آس پاس مزید کچھ کرسیاں لگا کر سب کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ یوں بھی خاندان کے بڑے اپنے کمروں میں ہی تھے۔

”آپ ادھر بیٹھیں شہلا بھابھی۔۔۔“ رافع جو ہاشم کے برابر والی کرسی پر بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا اسے سامنے بیٹھتے دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”کوئی بات نہیں رافع۔ آپ بیٹھیں۔“

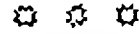
”پلینر۔۔۔“ رافع مصر تھا۔

شہلا جھکی جھکی نظروں سے ہاشم کے برابر آئی تھی۔ رافع وہ سری کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے پھر چونک اٹھا تھا۔ اس کی نظر ربیعہ پر پڑی تھی۔ وہ چند لمحے بے اختیار اسے دیکھتا رہ گیا۔ دفعتاً ”ہاشم کھنا کھا رہا۔“ رافع چونک اٹھا پھر وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

”عمر شہزادہ کی ماہرین آئی؟“ دلہتا“ انھیں کو خیال نہ تھا۔ ”ہم تو اسے انکس کی مبارکباد دینا چاہتے ہیں اور وہ ہے کہ سلیمانی ٹولہ پہن کر بیٹھ گئی ہے۔“

”وہ پہلے دراصل۔۔۔ بعد از اس سے اٹھتی ہے۔“ ماہرین سے بات نہ کی تھی تو جریز ہو کر دو گئی۔

دو دن اور ڈھائی کی گناہیں چار ہوئیں پھر وہ نولہائی گھنٹی سانس بھری تھی۔



”معباد بھائی! ریمہ نے بولے سے دھمک دے کر کمرے میں جھانکا۔ ”میں آج نہیں آؤں۔“

عباد کا تیزی سے چلا ہوا قلم رک گیا اس مرکز درد اذ نے کی طرف دیکھتے ہوئے خوش ہلکے مسکرایا۔

”اور یہ۔۔۔“

”آپ مصروف نہیں؟“ اس نے اس کے سامنے بھلے ہوئے کاغذات کے ڈھیر کو دیکھا۔

”کچھ ایسا خاص نہیں۔“ اس نے ریمہ کو سامنے بیٹھے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ”کوئی پراپر ہے؟“

”نہیں۔ بالکل نہیں۔“ وہ بیٹھتے سے مسکرائی۔ ”میں تو آپ کا شکر یہ ادا کر رہا ہوں کہ عباد بھائی! آپ سب میری زندگی میں بھائی نہیں فرشتہ بن کر آئے ہیں۔“

ریمہ کی نظر میں جھلک گئی تھی اور جیسے پراسرار مندی کے جذبات بھر پور تھے۔

”اوہ گاؤ! عباد نے مصنوعی ہنس سے اسے دیکھتے ہوئے اور مسکرایا۔ ”اگر تم صرف یہ بات کرنے آئی ہو تو نہیں مانو میں مست معمول ہوں۔“

”میں۔۔۔“ وہ جلدی سے بولتا۔ ”اس کے علاوہ یہ کہ میں۔۔۔“

ایڈیشن پورے روشنی میں کر دیا اس وقت۔

”دائے بائیں! سب کی بات مکمل کر سکا اور۔۔۔“ یہ تو بہت اچھی بات سوتی ہے تمہارے میں خود بھی نہیں چاہتا کہ تم کمرے میں فضول سوچوں سے الجھتی رہو۔ میں کئی کل ضرور نکالنا دیکھنا حاصل کرنا ہوں۔ تمہارا ایڈیشن ہو جائے گا۔ ہاں سبیکس وغیرہ کے بارے میں مجھے بتا دینا۔“

”معباد بھائی! ریمہ کچھ جھجکتے ہوئے بولتا۔ ”ایک بات اور۔۔۔“

”ہاں ہاں بولو۔“ جیسے گھبراہٹ کی ضرورت نہیں ہے ریمہ! میں نے تمہیں بہن مانا ہے میں دل سے سمجھا بھی ہے۔ تمہاری ہر ضرورت پوری کرنا میرا فرض ہے۔“

ریمہ کی پکوں پر مویں چمکتے تھے اس نے احسان مندی کے جذبات کے ساتھ اسے دیکھا۔

”عباد بھائی! میں اکثر لوگ مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں۔ میں سب سمجھ نہیں پاتی کہ انہیں کیا جواب دینی۔ آپ سب مجھے بتائیں کہ آپ نے میرے بارے میں سب سے کیا کہا ہے یا یہ کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔“

”ریمہ! ایک بات یاد رکھو۔“ عباد چہن رکھتے ہوئے تنبیہ کی سے بولا۔ ”مجھے بارے میں اتنا زیادہ کا نفس بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تو مجھے جو اپنا حالہ آپ ہو۔ کوئی دوسرا شخص تمہاری ذات کا حالہ نہیں بنا سکتا۔“ وہ لہجہ کے لیے سانس لینے کو دیکھ رہا تھا۔

”دوسرے یہ کہ میں نے تمہارے بارے میں سب کو مراد یہ بتایا ہے کہ تم میرے ایک عزیز جان دوست کی بہن ہو جو کچھ عرصے کے لیے تمہاری ہمدردی داری مجھے سوچ کر گیا ہے اور بس۔ تم سے کوئی کچھ پوچھتے تو نہیں کیا

کہتا ہے کہ بھائی کے سوا دنیا میں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ دیکھو ریمہ! دنیا کو بات سے بات نکالنے کی اور کھنڈر کو کھنڈ کی عادت ہوئی ہے۔ تم خود کو جتنا پردوں میں چھپاؤ گی دوسرے دنیا ہی تمہارے بارے میں تجسس رہیں گے۔ لہذا! ہمت کی ہے کہ تم خود کو دوسروں سے الگ رکھنے کی بجائے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ دوسروں کی پروا کرنا جھوٹا دوسرے تمہاری پروا کرنا جھوٹوں کے رائے!۔“

ریمہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور اب میرے لیے اچھی سی جائے بنا کر لاؤ۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔ ”تمہارے میرے سر میں درد کو دیا ہے۔“

ریمہ دھیرے سے ہنس دی اور انھ کو کمرے سے نکل آئی۔ لیکن میں انھ کو جاننے کے برتن نکالنے لگی۔ اس کا ذہن شملہ کی شادی کی وجہ سے بٹ گیا تھا لیکن اب بچہ سوں سے فاصلہ ہو کر مسلسل اس گھر کے حقیقی سوچ رہی تھی۔ خیال میں چھوڑا قیام کر کے اپنا سکہ زمین عمارت کر کے چلی آئی تھی۔ اس کے ذہن کے پردے پر ہمیشہ کی پانی رہتی تھی۔ لیکن ان دنوں اس کے نظر بھرے تھے تھکن کی منار مسکراہٹ تھی تصور کی حرص سے چٹکی آنکھیں تھیں۔ صورت کی گتہ کیچہ اور جتنا تنگ کی آوارہ ہوتی نظروں۔ اور ان سب سے پرے سب سے الگ تہذیب کی گھر جوش اور پر خلوص محبت کے مناظر تھے۔ ریمہ ترائے کو شدت سے یاد کر رہی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی کہ اس کی جگہ جاننے کے بعد اس پر کچھ کچھ یادیں سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔

اس نے دل ہی دل میں غمگین ارادہ کیا کہ کدات کو وہ ضرور ملوے گئے گی کہ اسے عبد الباری کا نمبر اپنے مہمانوں سے ملا دے۔ وہ کد کا فون اسے دیا۔ کد کے گریز کر رہی تھی کہ کس انفیضا مستعد و یکم کوئی غلط خیال نہ کرے۔ یاد آئے۔ دوسرے طبقہ میں کد کے کدے کی سب سے اعلیٰ کد کے علاوہ کے کمرے کی سمت پیہ پی۔



دلوں بانڈی کی صورت سر کے نیچے پر ہے وہ مسرور چت لیٹا ہوا تھا۔ سی ڈی پلیئر پر ہم سوں میں نور جہاں کی سترم تراز میں ”لڑکھڑکے“ کا بیٹا ”آپا“ چل رہا تھا۔ ذہن کے پردے پر کچھ مناظر متحرک تھے۔ اسے۔۔۔ شہزادہ شہنشاہ کی لڑکی کا عورت۔ بھوتی تھی جو ایک وزیر سے دھڑلے سے اس کی گاڑی کا دروازہ کھول کر ہوں بیٹھ گئی تھی۔ پیسہ کی زلفی گاڑی ہو اور وہ اس کا ڈرائیور۔ سارا راستہ وہ بیک و فوروٹ میں اسے بھولے کچھ بے گارہ تھیں۔ نگاہوں سے حکما رہا تھا۔ کیا خبر تھی کہ ذرا سی دل لگی لڑکی میں تبدیل ہو جائے گی پھر فون پر اس کا وہ شریا شریا۔ پیسہ بھرے۔ بچوں کی سی باتیں اس لڑکی کو شاید خبر نہ تھی کہ اس کا بچہ ذرا ماسکھیل کسی کے دل کی دنیا کا مسکھ چھن حمد والا کر ڈالے گا۔

فرز اپنے جذبات میں سنجیدہ ہو چلا تھا اور وہ۔۔۔ شخص ایک کھیل کھیل رہی تھی جس سے دل آہن جانے پر اب وہ اسے پہچاننے کی بھی راہ دار نہ تھی۔ کتنی بار وہ نکرائی تھی اور ہر بار اس کی نظروں میں بے نیازی۔ ہر نیست تھی۔ فرزانے کی بار اسے مخاطب کر کے دیکھا تھا اور ہر بار وہ کئی کترا کر نا آشنائی میں کر کر رہی تھی۔

”تمہارے میرے ساتھ آج نہیں کیا۔“ وہ دھک سے بڑبڑایا۔ ”میرے جذبے اتنے ازلوں تو نہیں تھے کہ تم انہیں بول رہی ہو۔“ تاکہ تم کو بھی مل کر اتنی ہی عزیز تھی ہو۔ جتنی کہ کل لیکن خود کی نا اہلی کی وجہ کہ دیکھ کی تم سزا بھی تو بولنا چاہیے تھ۔ سزا تمہیں ملے گی ضرور ملے گی۔“

وہ جتنی آنکھوں پر بازو دھک دھک کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہا تھا۔

صبح کے چھ بج رہے تھے۔ ایقان کو پہلے پہل نیند میں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کسسا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔  
عاشق کے موبائل پر مدھم مدھم سروں میں بیج بج رہی تھی۔ اس نے گردن اٹھا کر گہری نیند سوئے ہوئے عاشق کو دیکھا پھر  
ہاتھ بڑھا کر اسے جگانا چاہا۔ تب ہی عاشق از خود جاگ گیا تھا۔ وہ پڑ پڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ایقان نے پھر آنکھیں موند لیں۔  
”ہیلو“ عاشق کی مدھم مدھم لیکن قدرے خفا خفا آواز آئی تھی۔

نجانے کیوں ایقان کی سوئی ہوئی تمام حسیات جاگ اٹھیں۔ عاشق مزید کچھ بات کیے بغیر اٹھا اور ڈرننگ روم میں  
گھس گیا۔ وہاں سے اس کے مدھم مدھم پونے کی آواز آرہی تھی لیکن ایقان کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔  
چند لمحوں بعد وہ بے حد تیزی سے باہر آیا تھا۔ اس کی نظریں جاگتی ہوئی ایقان کی نظروں سے ٹکرائیں۔ عاشق  
ٹھٹک گیا۔

”کیا بات ہے عاشق؟ اس کا فون تھا؟“ ایقان اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
”کسی کا نہیں تم سو جاؤ۔“ وہ سیلینگ سوٹ کے ٹخن کھولنے لگا۔ ”میں ذرا ایئر پورٹ جا رہا ہوں۔“  
”ایئر پورٹ؟“ وہ نہایت حیرانی سے بولی۔ ”خیریت؟“  
”ہاں خیریت ہے۔ ایک دوست کی فیملی پہنچ رہی ہے۔ اسے گھر تک ڈراپ کرنا ہے۔“ اسی کا فون تھا۔“  
”تمہیں چاہئے بناؤں؟“ وہ بستر پر اتر آئی۔  
”نہیں۔“ وہ شرٹ پہننے لگا۔ ”جما لینڈ کر چکا ہے۔“ وہ چائے ایئر پورٹ پر ہی پی لیں گا۔“  
”ہوں۔“ اس نے مدھم مدھم سروں میں کہا اور اس کی غلٹ بھری حرکت دیکھنے لگی۔  
عاشق رانچ منسٹر میں تیار ہو گیا تھا۔ اس نے کم صم سی ایقان پر ایک نظر ڈالی اور پھر دھیرے سے اس کا کال  
تھمتے آیا۔  
”ڈونٹ وری ڈرنک۔“ میں کھنڈہ ڈیرہ خشک میں لوٹ آؤں گا۔ تم آرام سے سو جاؤ۔“ ایقان نے اثبات میں  
سر ہلایا۔ عاشق تیزی سے باہر نکل گیا۔



وہ برہم برہم سا کارڈ اسٹو کر رہا تھا۔ ”میں نے تمہاری نظروں سے اسے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا کالر کھینچا۔  
”اے مسٹر! میں تمہاری جدائی میں بے تاب ہو کر یہاں تک چلی آئی ہوں اور تم ہو کہ ٹھیک سے بات تک  
نہیں کر رہے ہو۔ یہی صلہ ہے میری بے پایوں کا تمہارے پاس؟“  
عاشق نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی۔

”تمہاری اس حرکت سے میری ازدواجی زندگی متاثر ہو سکتی ہے لڑا! تمہیں احساس نہیں؟“  
”اے ڈونٹ وری۔“ وہ اطمینان سے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ ”میں تمہاری بیوی سے کوئی مناظرہ  
کرنے کے ارادے سے نہیں آئی پھر بھلا تمہاری ازدواجی زندگی کس طرح متاثر ہونے لگی؟ ہر سال لاکھوں سیاح  
تمہارے ملک میں گھومنے پھرنے کے ارادے سے آتے ہوں گے۔ ایک میں بھی ہوں۔ تم کس بات کی فکر میں پڑ  
گئے؟“

”وہ لاکھوں سیاح ہر گھنٹے بعد میرے سیل فون پر کل نہیں کرتے۔“ اس نے ذرا تپسیے۔ ”تم سب کچھ سمجھ کر  
بھی کچھ سمجھنا نہیں چاہ رہی۔ بات یہ ہے۔“  
”لڑائے کن اکھیوں سے اسے دیکھا اور دکش انداز میں مسکرا دی۔“

"تمہاری بے بسی مزہ دے رہی ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔ "جلیان میں تو تم قابو میں آکر نہیں دیتے تھے۔ میں نے اچھا کیا جو یہاں تک۔"

وہ کار سے باہر دیکھنے لگی۔ "جی کریم و صوبہ بلذ گڑ کے اوپری حصے سے نیچے اتارنے کی تیاری میں تھی۔ لوگ گاڑیوں میں بیٹھے ہیں یا پھر سیدل ہی اپنی اپنی سڑکوں کی جانب رواں دواں تھے۔ محل میں صبح کی مخصوص پُرجوش سی چل چل تھی۔ گاڑی ایک نایاب اشار ہوٹل کے احاطے میں جا کر رکی تھی۔"

بادروہی دیوان نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔

"تم چلو۔ میں گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔" غاشر نے اسے ایک غلطو کیہ کر کہا۔

لڑا کھڑا کر سر ہلا کر اترتی تھی۔

\*\*\*

"میلو۔ نیلو۔ باری بھائی! میں رنجیدہ بات کر رہی ہوں کراچی سے۔" وہ لان میں بیٹھ کر خوش ہو رہی تھی۔

"اگر وہ سب کیسی ہو تم؟" عبدالباری اس کی توازن کر حسیٹنا معشوقہ بولتا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بالکل خیریت سے۔ تم مجھے ترانہ کے بارے میں بتائیں۔ کیسی ہے وہ ٹھیک تو ہے؟"

عبدالباری چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

"میلو۔" رنجیدہ بے آلی سے بولی۔ "باری بھائی۔"

"ہاں رنجیدہ۔" پھر وہ بولا۔ "سب ٹھیک ہے تم بے فکر بن جاؤ۔"

شکایت ہو تو سب سے پہلے مجھے فون کرنا۔"

"باری بھائی! مجھے ترانہ کے بارے میں بتائیں۔" وہ بے تابی سے بولی۔

باری کے لیے سے اتنا انداز تو ہو ہی گیا تھا کہ خیریت نہیں ہے۔ وہ خاموش سا لگ رہا تھا۔ رنجیدہ کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"ترانہ ہسپتال میں الٹو مٹ ہے۔" عبدالباری دھیرے سے بولا۔ "اسے خود ہی ایک ڈاؤن ہوا ہے۔ تمہارے چلے جانے کے بعد گھر والوں نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ اسے..."

بھی اتنا کچھ بڑا شت نہ کہا تھا۔

رنجیدہ کے ساتھ چلنے سے گویا جان نکل گئی۔ چند لمحوں کے لیے گویا اس کے دل نے نہ تو حرکت کیا نہ پھوڑ دیا تھا۔ باری کچھ دیر اس کے کچھ کئے کا شکر بار پھر بولا۔

"تم فکر مند مت ہو رنجیدہ! آزمائش کے یہ چند دن ہی ہیں، گزر جائیں گے ان شاء اللہ۔ جو کچھ بھی ہو گا ہمارے حق میں بہتر ہو گا۔"

"باری بھائی۔ میری کسی طرح ترانہ سے بات ہو سکتی ہے؟" وہ گویا کہیں سے بولی۔

"شکل ہے۔ میرا خورہ! بلے نہیں ہے۔ آس والوں کے ذریعے اس کی خیریت پتا چلتی رہتی ہے۔"

"تھو۔" بوسے تو اسے میرا سلام پہنچا دیتے گا۔" وہ آزدگی سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔" وہ بولا۔

"خدا حافظ۔" رنجیدہ نے جھکے ہوئے انداز میں موبائل آف کر دیا۔ اس کے ذہن میں پھر سے نئی مناظر دیاں

ہوتی تھیں۔

\*\*\*

شلالٹ آئی تھی۔ گھر میں گویا خوشیاں خوشی کی صورت اترتی ہوئی تھیں۔ اللہ ربیعہ، عمر منیرہ، بیگم سب آتا ہے گھر میں بے بیٹھے تھے۔

"سب لوگ کیسے ہیں وہاں اپنا؟" اللہ، خوش و خوش سے پوچھ رہی تھی۔ "جب تک کی اور ایقان پانی کی رت، خوشی تھی تب تو مجھے وہ گھر بہت اچھا لگتا تھا۔ اسے سارے لوگ اتنی دھیر ساری روئیں۔ اتنی چل

پہل۔ سب کچھ کتنا اہل کرتا تھا۔ اب جہاں کا محول کیسا ہے؟"

"وہ ر کے محول سامنے۔" شلالٹ دھیرے سے اس کی۔

"کیا مطلب؟" سب کی کان کھڑے ہو گئے۔

زمر نے سے فون کیا۔ "اب سب کے سب اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہیں۔ ان محفلوں کا ان دنوں کا تو اب دور ہے۔ ان دنوں میں رانا اپنے اپنے پورٹن میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں دورہ ستا چکی لڑکی ہے وہ اکثر گھر سے کچھ دیر آتی ہے۔" ثانیہ بھی خیال کرتی ہے۔

"گور عرش؟" اللہ نے جلدی سے پوچھا تھا۔ "وہ تو مجھے عجیب سے بھری سی لڑکی لگتی ہے۔ اپنے قب میں گم۔ نہ کسی سے کچھ لینا نہ دینا۔ شادی کے ہر لڑکے میں میں حجاب تھی۔"

"گور عرش؟" شلالٹ بھر کے لیے سوچ رہی تھی۔ "ہاں شاید۔" جتنی بار بھی وہ میرے سامنے آئی ہے۔ میں نے اسے گم سمجھا ہے۔ یہ نہیں اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی پرالم ہے یا کچھ اور۔ میں اب تک سمجھ نہیں

تھی۔ یہی باہر کا کسی کا وارن تھا کہ ان کے گھر سے ہو گئے۔ وہ لمحہ بھر میں باجھل کو تاپا پڑھا گا۔ شلالٹ نام رکھا اور کھڑی ہو گئی۔

"میرا خیال ہے باشم تمہیں نے کرا آئی ہو۔"

اللہ اور رنجیدہ اچھے کریم کی تھی ہوئی جس جگہ پر رکھنے لگیں۔ سنو ویکم وہ نہ ٹھیک کرنے لگیں۔ بھانگے ہوئے پھر کچھ دیر کے شلالٹ لڑکی کے گیت تک جا پہنچی تھی۔ تب ہی وہ ٹھیک کر دی اور بے اعتبار نظر آئی۔

یہاں۔ یہاں۔" گھر جاتا ہوا اس سے جا لینا۔

ابرار نے عمر کو گود میں اٹھا کر چڑا اور چند قدم آگے بڑھ آیا۔

"کیسی ہو شلالٹ؟" اس نے ایک گہری نگاہ اس کے سچے سنوے سے سراپے پر ڈالی تھی۔

"میں۔ ٹھیک ہوں۔" وہ قدرے ناگوار سے بولی۔ "جس میں یہاں آنے سے پہلے تپان چاہیے تھا۔ یوں اچانک۔"

"میں نے فون پر عمر کو بتایا تھا کہ میں اسے لینے کر رہا ہوں۔" اس نے ایک بار پھر اس کا کال ٹول۔ "یہ شاید جس سے بتا جا سکتا تھا۔" کیوں شلالٹ؟

"میں بھول گیا تھا۔" مہا کٹیں تو نہیں دیکھ کر میں ہر بات بھول گیا۔"

"بے قصور دیکھا۔" اس نے معنی خیز لہجہ اپنایا۔ "کچھ ایسی ہی ہیں تمہاری مہا۔"

شہلا نے اسے غصے سے دکھا۔ اس نے لمحہ بھر میں لہجہ اور انداز بدل لیا۔

”اینی بوسے اب تم یہاں تک آئی ہو جسے تو اجازت بھی دے دو۔ کیا میں عمر کو لے جاسکتا ہوں؟“  
شہلا متذبذب ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتی، کسی گاڑی کی روشن ہیڈلائٹس ان تینوں پر پڑی تھیں۔ شہلا اور ابراہار بے ساختہ ہی اس جانب متوجہ ہوئے۔ لائٹس آف ہوئیں اور گاڑی میں سے ہاشم برآمد ہوا۔

شہلا کو ایک پل کے لیے اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہوا۔ اس منظر میں اس کی پوزیشن کچھ آکورد سی تھی۔ اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔  
ہاشم گاڑی بند کر کے قدم قدم چلا اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ابراہار کو دکھا۔ گویا اس کا تعارف چاہتا ہو۔

شہلا کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو وہ پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی آئی۔ اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ شرمندگی کا ایک گہرا احساس اس کے پورے وجود پر غالب تھا۔ وہ سیدھی بچن میں چلی آئی۔ فریق کھول کر پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی اندر پلٹے لگی۔  
”کیا ہوا بیبا۔“ پیچھے سے انہی کی آواز آئی۔ ”میں ہاشم کو کبھی یہاں نہیں دیکھتا؟“  
”ہاں۔“ اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گلاس لبوں سے لگا لیا۔  
”السلام علیکم۔“ ہاشم کی خوشگوار آواز نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔  
انہی، ریحہ اور منیزہ بیگم ہاشم سے ملنے میں مصروف ہو گئیں۔ شہلا اتنے عرصے میں خوب فکر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

شہلا نے اپنے دل میں سوچا کہ میں اس کی کوشش کیوں نہیں کرتی؟  
”کیا بات ہے جناب اسے کمر تو ہمیں لفٹ ہی نہیں کرا رہیں۔“  
”جی۔ نہیں۔ وہ میں۔ دراصل میں شہلا کے ذہن میں سب سے زیادہ غلط فہمی کا شکار ہوں۔ ہاشم دھیرے سے ہنس دیا۔

”عمر کہاں ہے شہلا؟“ منیزہ بیگم کو اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔  
ریحہ اور انہی جلدی جلدی ڈانٹنگ ٹیبل پر کھانا لگانے لگی تھیں۔ شہلا ایک مرتبہ پھر الجھن کا شکار ہوئی۔ کیا کے کیا نہ کہے۔

”عمر کو اس کے والد ابراہار جیلانی لے کر گئے ہیں۔“ ہاشم نے ڈانٹنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی سلاوش سے کھیرے کا پیس اٹھا کر منہ میں ڈالا اور عام سے انداز میں اطلاع دی۔  
شہلا نے قدرے متحیر ہو کر اسے دیکھا۔ ریحہ اور انہی دلعنا ”اپنی اپنی جگہ ختم سی گئی تھیں۔ منیزہ بیگم بھی کچھ پریشان سی ہو کر ہاشم کو دیکھنے لگیں۔

وہ بے حد ناراض انداز میں اپنی بات کہہ کر اب پانی کا گلاس بھر رہا تھا۔  
”ابراہار؟“ پھر منیزہ بیگم بولیں۔ ”ابراہار آیا تھا؟“

”اباں؟“ وہاں سے ہی عمر کو۔ ”گئے ہیں۔ چند گھنٹے بعد چھوڑ جائیں گے۔“





تھی۔

رافع بھی مڑ کر جا لنگڑیک پر دوڑنے لگا۔ دل ٹھہر گیا تھا، قدم دوڑ رہے تھے، جب ایک جنگ سی اس کے وجود کے اندر پیا ہونے لگی۔

”یہ سپیدی افق سے اتری ہے۔ یا تری مر مر میں پیشانی سے۔“  
وہ خود بخود ہی گنگنایا تھا پھر ٹھہر گیا۔

”وہ خدا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔“ اس نے مڑ کر دیکھا۔

بارک دلاور دور تک خالی تھا۔ اس کی نظریں بے قرار ہو گئیں پھر اس نے سر جھٹکا۔ خود کو کوسا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔

”یہ سپیدی افق سے اتری ہے۔ یا تری مر مر میں پیشانی سے۔“

دل تھا کہ تکرار کیے جا رہا تھا۔ رافع یہ نظم شروع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نظم کی طرح جو اپنے انجام سے بھی واقف تھا۔ ایک ایک وہ ٹھٹھک کر رکا۔ ربیعہ اس کے سامنے سے آ رہی تھی۔ رافع کی مانند بھی پلٹ کر چل پڑی تھی۔ نتیجہ یہ کہ ایک گولائی میں جلتے جلتے پھر آئے سامنے تھے۔

فاصلہ اب اس قدر کم تھا کہ گریزنا ممکن تھا۔ رافع چوہ قدم آگے بڑھا۔

”السلام علیکم۔“ دہرا شہتہ سے مسکرایا۔

”و علیکم السلام۔“ بھی آگے رہا۔ ”مسکرائی تھی۔“ آپسے روز آتے ہیں یہاں؟“

”جی ہاں، تقریباً۔“ رافع کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ جلتے لگا۔

”پہلے ایک دوست مراد ہوا کرتا تھا اب کچھ عرصے سے وہ پھولا کی اور کا ہو گیا۔“

کے لیے مس کال ہو گیا۔

ربیعہ اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔

”چلیں صبر کریں اللہ خدا نے چاہا تو آپ کو کوئی اور دوست مل جائے گا۔“

رافع جلتے جلتے رک گیا۔ ربیعہ کی سان انداز میں کسی گئی بات نے اس کے اندر پر اثرات کی رنگ پھر کا دی۔ اس کے رک جانے پر ربیعہ نے گردن موڑ کر اس سے دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلا کی معصومیت تھی۔ رافع معمول کی مانند پھر چل پڑا۔

”بڑھتی ہیں آپ؟“

”میں نے گریجویشن کیا ہے۔ اب اسٹریز کرنے کا ارادہ ہے۔“ وہ مختصراً بولی۔

”آپ شہلا بھاگھی کی رشتہ دار ہیں؟ میرا مطلب ہے پہلے کبھی آپ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“

”نہیں۔“ ربیعہ کچھ کہتے کہتے رک سی گئی۔ ”جی۔ رشتہ دار ہی سمجھ لیجئے ہاں، وہ اس روز آپ کی ایک نظم میرے پاس رہ گئی تھی، آپ کہیں تو میں واپس کر دوں؟“

رافع مسکرایا اور ایک ٹھہری سی نظر اس پر ڈالی۔ صبح کی خوشگوار روشنی میں وہ ہار سنگھار کے پھولوں کی سی لگتی تھی۔

”نہیں۔ واپس کرنے کے بجائے آپ رکھ لیں تو مجھے اچھا لگے گا۔“

اس کے جواب میں نجانے کس جذبے کی حدت تھی۔ ربیعہ کی پیشانی چمک اٹھی۔ اس نے رسمی سا مسکرا کر اسے دیکھا اور گھر جانے والے رستے پر چل دی۔

آنکھوں میں گہری سوچ لیے رافع اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔  
 ”یہ سپیدی رافتی سے اتری ہے۔ یا تری مرمرس پیشانی سے۔“ ذہن نے پھر تکرار شروع کی۔ رافع نے گہری سانس بھری۔ نظم نے خود کو مکمل کر دیا کر ہی رہتا تھا۔



دوداش روم سے نکل کر لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک کر رہی تھی۔ ہاشم بستر نیمہ راز بے دلی سے لی بوی کے چیل بدل رہا تھا۔ شہلا کو آنا دیکھ کر اس نے لی بوی آف کر دیا۔ گویا وہ اسی کے انتظار میں تھا۔  
 شہلا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ ہاشم نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔  
 ”نا مرغ ہیں آپ؟“

”جی ہاں“ وہ آہستہ سے بولی۔  
 ”کچھ باتیں کر لی جائیں؟“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ شہلا چونک اٹھی۔  
 ”ضرور۔۔۔“

ہاشم کھسک کر اس کے قریب ہوا اور اپنی ہاتھیں پیچھے لپیٹ لیا۔  
 ”شہلا! کتنا اعتبار کرتی ہو مجھ پر؟“  
 ”جی؟“ شہلا نے حیران نظروں سے انہیں دیکھی۔ ”میں کچھ سمجھتی نہیں ہاشم۔“  
 ”میں نے پوچھا۔ کتنا اعتبار کرتی ہو مجھ پر۔ نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے اس میں؟“  
 ”آپ۔۔۔ میرے شوہر پر۔ میں نے اپنی مرضی سے یہ تعلقات قبول کیا ہے۔ تو سنا۔۔۔ کس اعتبار کروں گی آپ پر۔۔۔“  
 ”اسی طرح تم بھی میری بیوی ہو شہلا۔ میری عزت ہو۔ میری محبت بھی ہو۔ میں نے تمہیں بہت خواہش سے اپنایا ہے۔ کل تک مجھ پر اور اعتبار کرتا ہوں تم پر۔ اعتبار بھی، اعتماد بھی۔ تم سے وہ لاشے سب ہی رشتے استوار کر لیے ہیں میں نے۔ شہلا! نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہولناکی تھی۔  
 ”اس روز تمہیں گھرایا ہوا دیکھ کر مجھے دل میں یہ سوچا کہ شہلا! کیلئے کیا تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں؟ تمہارے انداز کہہ رہے تھے کہ تم مجھ کو کم کر پریشان ہو گئی ہو۔ ایسا کیوں تھا؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے حوالے سے کبھی کوئی غلط خیال میرے دماغ میں آسکتا ہے؟“  
 شہلا چند لمحے خاموش رہی۔ اسے ہاشم کی نگاہ کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔

”دیکھو شہلا! میں تمہارے ماضی سے بخوبی واقف ہوں۔ اس کے باوجود میں نے تمہیں اپنایا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میں نے تمہیں تمہارے سب ہی حوالوں کے ساتھ قبول کیا ہے۔ تمہارے اور عمر کے ساتھ اس شخص کا نام وابستہ تھا۔ عمر کے ساتھ اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس تعلق کے حوالے سے تمہارا اس سے سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ بات بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ خدا خواستہ تمہارے دل میں کوئی غلط خیال ہو۔ میں مر کر بھی یہ بات نہیں سوچ سکتا۔ تم میری جانب سے اپنا دل صاف کر لو۔ اور آئندہ ایسی کسی بھی چیز پر توجہ نہ دو۔ تم میری بیوی ہو شہلا! میرا اعتماد ہو۔“  
 شہلا دم بخود اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”ازاٹ کیلئے؟“ اس کی صورت دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔  
 ”ہوں؟“ وہ چونکی۔ ”لیس۔ آف کورس۔“

قرآن حکیم کی عکس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں تضاد اور تعلق کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔  
 ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات و روایات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق سن کر غصے سے محفوظ رکھیں۔

”خیر مانڈ۔“ وہ اپنا تکیہ اٹھا کر قدرے دور ہوا۔ ”یوں تو آپ جاگنا چاہتی ہیں لیکن اکیلے میں۔ چلیں  
جانبیدر۔ جیسے آپ کی مرضی۔ شب بخیر۔“

۱۵۔ تکیے میں منہ چپا کر لیٹ گیا۔ شہلا نے ہاتھ پر ہکا کر لائٹ آف کر دی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہاتھ نے درست کہا تھا۔ وہ جاگنا چاہتی تھی مگر تنہائی کے ساتھ اسے مختلف باتوں پر غور کرنا تھا۔ اس کے ذہن میں بکولے سے پھزرے تھے۔

ابراہیم کے انداز اسے بے حد خوف زدہ کر چکے تھے اس کے مقاصد اسے بے چین کر رہے تھے اس کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔

رات کا نجانے کیا ہوا تھا۔ ہم سب کو اپنے اپنے کمرے میں لے کر کرکٹ بیل کر دیکھا۔ عاشر اپنے کمرے میں کودے تھا۔ اور اس کے موبائل کی تھی سب سے اچھی کالی آرمی تھی۔ عاشر نے موبائل کی آواز بے حد سنائی ہوئی تھی۔

ایقان اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سولہواں یوم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ جس کا مطلب یہاں چھائسری موجودگی تھی۔  
 بیپ مسلسل بچ رہی تھی۔ شاید چار سو پانی گرنے کی وجہ سے بیپ سنائی دینے لگی تھی۔ ایقان نے ٹائم دیکھا،  
 صبح کے چار بجے کا عمل تھا۔ اس نے موبائل پر آٹھایا۔ روزین اسٹورین پر ٹولز کا لنک کے الفاظ چمک رہے تھے۔  
 "اٹھ اٹھ؟" اس کی نیند لمحہ بھر میں اڑن چھو، ہو گئی۔

موبائل آٹن کر کے اس نے کان سے لگایا اور خاموش رہی۔  
 ”عاشق دُستِ ناک ٹوی۔ پلیز۔“ لہجہ التجائیہ تھا۔  
 ایقان نے موبائل آٹن کر کے جگہ پر رکھا اور کسی چور کی طرح اپنے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ دواش دوم سے  
 عاشق نکلا تھا۔ وہ اپنی جگہ آکر لیٹا پھر اس نے بازو بڑھا کر ایقان کو گھیرے میں لے لیا۔  
 ایقان کی دُند، نر زنی پلکوں سے ایک موتی نکلا اور اس کے بالوں میں گم ہوا۔  
 ”مُزات یو؟“ وہ لہجہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

لیفٹن کے محل میں پہلی دراڑ پڑی تھی۔ اس کا وجود جیسے تیز ہوا کی زد میں تھا۔ عاشر کا بازو اسے آگ سے بٹا محسوس ہونے لگا۔

بے حد رغبت سے سیب کا مرتہ کھاتے ہوئے وہ بہت فریض اور قدرے خوش نظر آ رہا تھا۔ ایقان نے کن انہیں سے اس کی جانب دیکھا۔ عاشر اس کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا وہ مرتبے کی تیشی میں چھجھ ڈال کر سیب کے ٹکڑے نکالتا اور منہ میں رکھ لیتا۔ ایقان چند لمحے اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس قدر بے فکری خوش باشی زندگی سے بھرپور انداز سے جیسے کوئی غم کبھی چھو کر بھی نہ گزرا ہو۔ وہ اتنا خوش کیوں تھا؟ اس کے ارد گرد سوالیہ نشان پھرنے لگے۔

”عاشر وہ ازاں یو؟“ وہ لہجہ پھر اس کی سماعتوں میں سرسرا نے لگا تھا۔

”عاشر وہ ڈ۔۔۔ پلینز ٹاک ٹوی۔۔۔“ وہ التجائیہ انداز اس کا دل چھیدنے لگا۔

”نرا۔۔۔ یہ لڑا کون تھی؟ کیا عاشر اسے جانتا ہے؟ کیا وہ اس سے بات کرتا ہے؟ کیا وہ اس سے ملتا ہے؟“ سوالوں کی ایک یلغار تھی جو اسے رات کے پچھلے پہر سے لے کر اب تک پریشان کر رہی تھی۔ عاشر نے مرتبے کا جار بند کرتے ہوئے نظریں اٹھائی تھیں پھر وہ ٹھٹک سا گیا۔

ہاتھ میں سلاکس تھا وہ بے حد عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتا تھا۔ اس کے جواز ہی تھی۔ وہ اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اسے ہاتھ میں موجود سلاکس کی بھی خبر نہ تھی۔

عاشر نے مسکرا کر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ ایقان بری طرح سے چونکی پھر اس نے سلاکس واپس پلیٹ میں رکھ دیا اور پٹاٹے رکھی ٹھنڈی ہوتی چائے کا گھونٹ بھرنے لگی۔

”کیا بات ہے؟“ کوئی ڈانٹنگ پلان چل رہا ہے؟“ اس نے ایقان کی بات پر غصے میں عدم توجہی محسوس کی۔

”ہوں۔۔۔“ وہ پھر بولنے لگی۔

”کیا کہا؟“

عاشر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گال پر زور سے چٹکی بھری سوہ ”سی“ کر کے رہ گئی۔

”کیا ہے عاشر!“ خلاف توقع وہ بیزاری سے کہتے ہوئے کھڑی ہوئی پھر وہ ٹاٹے کے برتن سمیٹنے لگی۔

عاشر نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ان پر اپنا چہرہ رکھا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔ بظاہر وہ برتن سمیٹ رہی تھی لیکن اس کے پورے وجود میں ایک اضطراب سا تھا۔ ایک بے کلی تھی جو محسوس ہوتی تھی۔ ایک تناؤ تھا جو اس کے انداز سے بھی جھلکتا تھا اور چہرے سے بھی۔

”ایقان۔۔۔“ عاشر نے اسے پکارا۔

”کہو۔۔۔“ وہ کچن کی جانب جاتے جاتے رک گئی۔

”تمہارے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“

ایقان نے مڑ کر نجانے کیسی نگاہوں سے اسے دیکھا وہ گڑبڑ سا گیا پھر وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر کچن میں چلی گئی۔ عاشر الجھنے لگا۔ چند لمحے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس نے کچھ اندازے لگانے کی کوشش کی پھر اٹھ کر کچن میں چلا آیا۔ وہ ساس مین میں بانی ڈال کر جوئے پر رکھ رہی تھی۔ عاشر آہستگی سے اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔

ایقان چونکی۔ اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔

”کیا بات ہے ایقان۔۔۔“ عاشر نے اپنا چہرہ اس کے بالوں پر رکھ دیا۔ ”بیزار ہو گئی ہو مجھ سے واپس چلا جاؤں؟“

”پاکل ہوئے ہو۔۔۔“ وہ کھوکھلے گےجے میں بولی۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہو۔“



”بسیا تم سلوک کر رہی ہو۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”میں نے کہا کیا ہے عاشر؟“

”عدم تو جہی کی مار مار رہی ہو اور پوچھتی ہو۔“ اس نے اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔ ”کیا بات پریشان کر رہی ہے تمہیں؟“

اس کے دونوں ہاتھ ایتقان کے کاندھوں پر تھے۔ ایتقان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ نجانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ عاشر کے انداز میں بناوٹ کی پوند کاری بھی تھی۔

”یہ لڑا کون ہے؟“ اس نے پوچھنا چاہا لیکن الفاظ اس کے لبوں تک آنے سے پہلے ہی تحلیل ہو گئے۔ جانے اس سوال کا کیا جواب آتا؟ اگر وہ ٹکفٹ نظریں چرایلتا۔ اگر ایتقان کے شانوں پر دھرے اس کے ہاتھ بے اختیار پھسل جاتے۔ اگر وہ پھیکے سے انداز میں ایسی وضاحتیں دینے لگتا جو ایک آن دیکھے جھوٹ کا آئینہ معلوم ہوتیں۔ پھر کیا ہوتا؟ ایتقان اپنی خوش فہمیوں سے اس قدر جلد دستبردار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ ایک گہری سانس بھر کر اس نے پھر سے رخ موڑا اور چولہا جلانے لگی۔

”رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آتی تھی۔ طبیعت مضطرب ہو رہی ہے۔ دل چاہ رہا ہے جلد از جلد سب کام سمیٹ کر سو جاؤں۔“

”ہاں۔“ عاشر نے چند لمحوں کی بات پر غور کیا۔ ”نیند کیوں نہیں آتی؟ کوئی پریشانی؟“

”کمال ہے عاشر۔“ وہ زبردستی مسکرا دی۔ ”مجھے بھلا کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔“ ایتقان کا شکر ہے۔ کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ زندگی میں سب سے تمہاری۔ محبت میں۔“ اب کی بار اس نے سوچ میں گم ہوئے عاشر کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ تیز رفتاری سے چوڑا پھر مسکرایا۔

”چلو پھر ٹھیک سے تم آرام کر سکتے ہو۔“ ایتقان نے اسے دیکھا۔ ”کیا کام ہے؟“

”چند ایکسپیرانے دوستوں سے ملوں گا۔ سوچتا ہوں واپس لوٹ کر جو کاروبار کرنا ہے ابھی اس کی سمری تیار کر لوں۔“ اچھا ہے، یہ معلومات جمع ہوتی رہیں گی تو کام آئیں گی۔“

”ہوں۔“ وہ بے دلی سے بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ تازہ چائے تمہارے لیے ہی بنا دیتی تھی۔ اب بی کر جاؤ۔“

”نہیں یا۔ تم پی لو۔“ مجھے تو ابھی نہ چاہئے کہان (کہاں چاہئے پینا ہوگی۔“ وہ ایک بار پھر بے فکر اور خوش باش لگنے لگا تھا۔

”جیتا ہوں۔ دروازہ بند کر لو۔“ ایتقان پر سوچ نگاہیں لیے کچن کے دروازے پر ہی ایستادہ ہو گئی تھی۔ وہ آئینے میں خود کو بغور دیکھتے ہوئے سفید شرٹ کا کالر ٹھیک کر رہا تھا جب اس کے پیچھے شہلا کا عکس نمودار ہوا۔ ہاشم کے لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ جاگئی۔ اس نے غور سے خود کو اور اسے ایک ساتھ دیکھا اور پھر مسکرایا۔ شہلا آہستہ آہستہ جلتے ہوئے اس کے قریب آگئی۔

”صبح بخیر مدام! وہ بگمفنگی سے بولا۔

”ہاشم۔ ایک بات کہنا تھی آپ سے۔“

”ہوں ہوں جتنی چاہے کہیے۔ آپ کے لیے تو ہم آفس سے لیٹ بھی ہو سکتے ہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ شہلا مسکرا دی۔ ”میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ میں نے جتنی چھٹیاں لی تھیں وہ ختم ہو چکی ہیں۔ میں اب ہسپتال جایا کروں گی۔“

”ضرور جائیے۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔

شہلا چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی جیسے اسے کسی بات کے کہنے سے جھٹک سی تھی پھر وہ دھیرے سے بولی۔

”ای سے آپ بات کر لیجئے گا۔ وہ سمجھ رہی ہیں کہ میں جاب مستقل“ چھوڑ چکی ہوں۔ میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔“

ٹائی کی ٹاٹ باندھتے ہوئے ہاشم کے ہاتھ رک گئے تھے۔ اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے تذبذب ابھرا تھا۔ ”شہلا! تم ای کو مناسب الفاظ میں یہ وضاحت کرو کہ تم چھٹیوں پر تھیں۔ میرا خیال ہے میرا اس سلسلے میں کچھ کہنا غیر مناسب ہو گا۔ ہاں پھر اگر وہ کوئی نکتہ اعتراض اٹھاتی ہیں تو میں انہیں سمجھا لوں گا۔ یا ایسا کرنا۔“

ماہین بھی آئی ہوئی تھی۔ اس سے تذکرہ کر دیا۔ ای خود سمجھ جائیں گی۔ کیا خیال ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔“ وہ آواز ہو گئی۔ ”میں ماہین سے بات کر لوں گی۔ ایک بات اور بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“ وہ اب بریف کیس میں رکھی فائلیں چیک کر رہا تھا۔

”میں کچھ دن کے لیے عمر کو اپنے پاس لے آؤں؟“

ہاشم چونکا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے اس سوال کا جواب نہ دے پایا۔ چند تینہ ہی جملے اس کی یادداشت سے ٹکرائے تھے۔

”اس گھر میں صرف ہماری نسل پروان چڑھے گی۔“

”ہوگ کیا نہیں گے۔ بچے کے ساتھ پوتا بھی ملا ہے۔“

شہلا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی ہاشم چونک کر خود پر قابو پانے لگا۔

”آں۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔ ہم چلیں گے ان سب سے بچنے تو۔ عمر کو بھی لے آئیں گے۔ کچھ دن ہمارے ساتھ رہ لے گا۔“

”کچھ دن۔“ شہلا کے دل میں پھر سی چھبی۔

اس نے قدرے بے اعتباری سے ہاشم کا چہرہ دیکھا۔ ہاشم اس کی کیفیت سے خبر نہ لے سکا۔

اس نے مسکرا کر شہلا کو دیکھا اور اس کے قریب آکر اس کا کال پتہ پتہ پایا۔

”میں اب چلوں شام کو ملے ہیں۔“

اس نے بے دلی سے سر ہلادیا۔

”ایم اے کی کلاسز اسٹارٹ ہو چکی ہیں پھر بھی تم فکر مت کرو میری کچھ جان پہچان ہے تمہارا ایڈمیشن کروا دوں گا۔ ہاں یہ ہے کہ یونیورسٹی میں اب ایڈمیشن مشکل ہے۔ کالج سے ماسٹرز کر لو کیا خیال ہے؟“

ربیعہ نے چونک کر عباد کو دیکھا اور مسکرا دی۔

”میرے لیے پڑھائی اہم ہے عباد بھائی! یونیورسٹی یا کالج نہیں۔ آپ مجھے فارم اور پراسپیکٹس وغیرہ لادیں تاکہ یہ مراحل جلد سے جلد طے ہو جائیں۔“

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ سارے کام کل ہی ہو جائیں گے۔ تمہارے پاس تمہارے ضروری ڈاکومنٹس تو ہیں نا؟“

”جی ہاں۔ میں ابتدائی عملت میں بھی اپنی فائل لینا نہیں بھولی تھی۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ پرنڈھن پر چند مناظر پھر گئے تھے اس کا دل اداس ہوا۔

”شہلا آئی کے سسرال سے بھی کافی لڑکیاں کالج جاتی ہیں۔“ عباد بولا۔ ”تمہیں وہاں سے اچھی خاصی پہچان مل سکتی ہے۔ تمہیں کو کہ اینتہ کے ساتھ شام کو شہلا آپ سے ملنے چلی جاؤ۔ ان سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور

ضروری انفارمیشن بھی مل جائے گی۔“

”کیسی انفارمیشن درکار ہے جناب کو۔“ انیقہ چانے کی ٹرے اٹھا کر کمرے میں آ رہی تھی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”وہ بھی شہلا آپ کے سسرال سے۔ خیر تو ہے؟“ وہ جھک کر چائے میز پر رکھنے لگی تو عباد نے اس کا کان پکڑ لیا۔

”تمہاری کھوپڑی الٹی فٹ ہے اس لیے تمہارے سوچیں بھی الٹی سمت میں سفر کرتی ہیں۔“

”پھر اس میں میرا کیا قصور ہے میرا تو کان چھوڑیں۔“ وہ کراہی۔

”جلدی سے ڈاکٹر بن جاؤ تو تمہارا بھی کچھ علاج کریں۔“ انیقہ زور سے ہنس دی۔

”بھئی۔ ڈاکٹر بنوں میں۔ اور علاج کریں آپ۔ یہ تو لطیفہ ہو گیا اور مجھے آپ کہہ رہے ہیں کہ میری سوچیں الٹی سمت میں سفر کرتی ہیں۔“

”بہت نیک خیال ہیں۔“ وہ اسے اپنے بارے میں کیا خیال ہے جناب کا۔“

”بہت نیک خیال ہے۔“ وہ اطمینان سے پیر پھیلا کر بولا۔ ”چلو چائے بناؤ۔“

یہ کام ربیعہ کر رہی تھی۔ ”میرے کشن گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔“

ربیعہ دونوں ہنسن بھائی کی نوک پر چھینک مڑے سن رہی تھی۔ ”اپنی جگہ سے اٹھ کر میز کے قریب آ بیٹھی اور چائے بنانے لگی۔“

”ربیعہ۔ اتنے دن ہو گئے۔“ انیقہ نے کہا۔ ”تم نے کبھی اپنے بارے میں نہیں بتایا اپنی فیملی کے بارے میں۔ اپنا بیک گراؤنڈ۔“

”ہاں باب۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”اس کا ربیعہ کا دل دھڑکا ہاتھ کانٹا چائے کپ ہے جھلک کر اس میں گری۔ وہ عباد کو چائے پکڑ رہی تھی۔“

”وہ کون سا باب؟“ انیقہ نے پوچھا۔ ”عباد چائے کا کپ تھاتے ہوئے سکون اور اطمینان سے بولا۔“

”ایک ہی بھائی ہے۔“ وہ قریب سے آکر دیکھا۔ ”جواب دینے کے سلسلے میں اسے ملک سے باہر جانا پڑ گیا۔ چند لالچی رشتہ داروں کے خوف سے وہ ربیعہ کی ذمہ داری میرے سر و کپڑے کے گیا ہے اور اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں۔ ہم جو ہیں۔“ منیزہ تلیم اندر داخل ہوتے ہوئے مسکرائیں۔ ”ایسا کیوں کہتے ہو کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔ میں اس کی ماں ہوں۔“

”انیقہ اور شہلا اس کی بہنیں ہیں۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”منیزہ تلیم اندر داخل ہوئی۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”عریشہ۔۔۔ کیسی ہو۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اتنے دن ہو گئے، تم تو اب ملنے آتی ہی نہیں ہو۔ خود کو قید کر لیا ہے تم نے اس کمرے میں۔ ایسے تو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔“

عریشہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اداسی سے مسکرائی۔ ایک قطرہ اس کی آنکھوں سے نکل کر بالوں میں گم ہو گیا۔

”بیمار تو میں ہو گئی ہوں ناعمہ۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔“

”ایسا کیوں کہتی ہو، خدا نہ کرے جو ہمیشہ کے لیے بیمار پڑو تم۔“ ناعمہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے دھچکا سا لگا۔ اس کا ہاتھ ہڈیوں سے بنا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”ایک بات پوچھوں تم سے۔“ وہ سنبھکتے ہوئے بولی۔

”کون سی نئی بات ہے پوچھنے کو ناعمہ!“ وہ بے دلی سے بولی۔ ”کیا جان لو گی تم؟“

”تمہیں نافع پسند نہیں ہے؟“ وہ بے اختیار ہی پوچھ بیٹھی۔

عریشہ لختی سے ہنس دی۔ اس کے چہرے پر ہنس چھل گیا تھا۔

”اب ان باتوں سے کیا فائدہ ضرورے کو دفنا کر پوچھنا کہ تمہیں قبر پسند آتی یا نہیں۔ عجب لا حاصل سوال ہے ناعمہ!“

ناعمہ خوف اور وحشت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ اسے عریشہ واقعی ایک مروے کی مانند محسوس ہوئی۔ سرد اور بے جان۔

”عریشہ!“ وہ ایک مرتبہ پھر ہمت کر کے بولی۔ ”تم نے ایک جھوٹی سی بات کہی کہ خود پر سوار کر لیا ہے۔ باہر نکلو، ہنسو، بولو تو تمہاری یہ بے شکونی کچھ کم ہو۔ ماحول بدلنے سے خیالات پر بہت اثر پڑتا ہے عریشہ!“

”مجھے اب کبھی بات سے فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔ ”اب تم جاؤ ناعمہ! میرے پاس بیٹھنے سے تمہیں ضرور فرق پڑے گا۔ کہیں تم میں سے بھی کافور کی بونہ آنے لگے۔“

ناعمہ سن سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ عریشہ نے پھر آنکھیں نہیں کھولیں۔ ناعمہ اٹھ کر مرے مرے قدموں سے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔



”ہوں۔“

وردہ متفکر ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں وردہ آلی! وہ وہ مر جائے گی۔ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس نے خود کو ایک مروہ تصور کر لیا ہے اور اس کے اندر یہ یقین پنختہ ہوتا جا رہا ہے۔“

ناعمہ اسے لفظ بہ لفظ ساری کہانی سنا کر بیٹھی تھی۔ دونوں بہنیں حقیقتاً ”پریشان“ ہو گئی تھیں۔

”کیا کیا جائے۔“ وردہ سوچ رہی تھی۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے“ فاروق ماموں نے بہت عجلت دکھائی ہے فیصلہ سنانے میں۔ لڑکیاں بھی جیتی جاگتی مخلوق ہیں۔ وہ بھی جذبات و احساسات رکھتی ہیں، ان کی بھی پسند ناپسند ہو سکتی ہے۔ اگر اسے نافع پسند نہیں تھا تو بہوں کو اس بات کو سمجھنا چاہیے تھا۔ انہوں نے تو اسے اپنا کامسکہ بنا لیا۔ مجھے لگتا ہے ناعمہ! عریشہ کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے۔ وہ اتنی زیادہ حساس ہے، اس کا کسی کو اندازہ نہ ہو سکا۔“ ناعمہ

نے اثبات میں سرہلایا۔

”ایک بات تو بتاؤ۔“ ورہ نے ٹولتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم عریشہ اور ٹاٹا تو ایک دوسرے کی ہم رازو دساز تھیں۔ اس نے کبھی کسی اور کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا؟ کیا کبھی تم نے محسوس کیا کہ وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے؟“

”نہیں۔“ ناعمہ نے نفی میں سرہلایا۔ ”کبھی بھی نہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور ہم سے ذکر کرتی۔“  
”ہوں۔“ اس نے رسوج انداز میں کہا پھر تو سارا مسئلہ بس یہی ہے کہ وہ نافع کو شدت سے رد کر رہی ہے۔ اتنی زیادہ شدت سے کہ اس کی اپنی ہستی مٹی جا رہی ہے اور اسے یا کسی اور کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہے۔“  
”ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں اپنا؟“ ناعمہ نے ناسف کے احساس میں گھیر کر پوچھا پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔

”آپ۔ آپ۔ رافع بھائی سے بات کریں نا۔“ ورہ نے اسے بری طرح گھورا۔  
”یا گل ہوئی ہو، میں رافع سے کیوں بات کروں۔ بات کرنا ہوئی تو میں ڈائریکٹ نافع سے کروں گی۔ تمہارا دماغ بھی نجانے کہاں سے کوڑیاں لاتا ہے۔“  
وہ بڑبڑانے لگی تھی۔ ناعمہ کے لب شرارت سے مسکرا اٹھے۔ اس نے پیار سے بہن کی جانب دیکھا تھا۔



یہ سیدی افق سے اُتری ہے  
یا تری مرمریں پیشانی سے  
یہ کرن آسمان سے ٹوٹی ہے یا پھر  
تیری مسکراتی آنکھوں سے

UrduPhoto.com

دل کے جذبول نے بولنا سیکھا  
تیری نظروں کی مہربانی سے

وہ سارہ صفحے پر رقم الفاظ کو تک رہا تھا۔ عجب آرزو میں تھیں جو شہر تنہا میں مشو پانے لگی تھیں۔ رافع نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔  
”یار رافع!“ اس کے کانوں میں ہاسٹم کے الفاظ گونجنے لگے۔ ”خدا اگرے تجھے بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“  
وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بے چینی حد سے سوا ہونے لگی تھی۔ کھڑکی کے کھلے پیٹ سے کاسنی بیل جھک جھک کر اندر جھانکنے لگی تھی۔ رافع کا دل چاہا وہ بھاگے۔ بھاگتا جائے۔ اتنا بھاگے کہ تھک کر چور ہو جائے۔ ٹوٹے ہوئے، ٹھکے ہارے وجود میں صرف ایک دھڑکتے دل کی آواز ہو اور ہر آواز معدوم ہو جائے، ہر خیال پس پشت چلا جائے۔ ہر احساس ختم ہو جائے۔ صرف۔ صرف ایک احساس کے سوا، وہ ہر بات بھلا ڈالنا چاہتا تھا لیکن۔ لیکن کیا ایسا ممکن تھا۔

”کون ہو تم۔“ اس نے سختی سے آنکھیں میچیں۔ ”کہاں سے آئی ہو، کیوں آئی ہو؟ کیا ملا تمہیں کسی کی پرسکون دنیا کو بے سکون کر کے۔ کیا پایا۔ بولو۔ جواب دے۔“ ذہن کے افق پر ایک مرمریں وجود کی مسکراتی شبیہ نمودار ہوئی۔

”ہاں سنگھار کے پھولوں سی لڑکی لوٹ جاؤ، جہاں سے آئی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے گلاب جذبول کی خوشبو تم تک پہنچے اور۔ اور تم بھی میری طرح بے سکون ہو جاؤ۔ میں نہیں چاہتا۔ لوٹ جاؤ۔ لوٹ جاؤ۔“



”میری چھٹیاں بھی ختم ہو چکی ہیں۔“ اس نے سلا کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے بظاہر عام سے انداز میں کہا۔ ”میں بھی کل یا پرسوں سے جوائن کروں گی۔“

کھانا کھاتے فردوس بیگم کے ہاتھ رک گئے۔ ان کے ہاتھ پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ شہلا ان کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی پھر بھی اس نے ان شکنوں کو محسوس کر لیا۔ منہ میں نوالہ ڈالتی ماہین کے ہاتھ بھی سست ہو گئے۔

”ابھی سے... ابھی سے بھا بھی!“ پھر وہ بولی۔ ”ابھی تو ہم نے اپنے چاؤ بھی پورے نہیں کیے۔“

”اے باب!۔ کیسے چاؤ۔“ فردوس بیگم نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی روٹی ہاٹ پائ میں رکھ دی۔ ”ہم نے تو پہلے دن ہی ہر چاؤ چو پچلے سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ جیسے چاہو کرو۔ ہم بے چارے نہ لینے میں نہ دینے میں۔“

”ہی!“ ماہین نے ماں کو تنبیہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

شہلا خفیف سی ہو گئی۔ اس نے ایک نظر سب ہی پر ڈالی۔ مردہ دلی سے ٹونگتی ہوئی عریشہ نے ٹوکویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ حمزہ ماں کے انداز پر بے حد شرمندہ ہو کر ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ گیا تھا۔ ماہین چورنی بیٹھی رہ گئی تھی۔ ماحول میں عجیب سی ناگواری گھل گئی تھی۔

”ماہین!“ شہلا نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے... کیا امی جان کو میرا نوکری کرنا پسند نہیں ہے؟ دیکھو ماہین! میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ مجھے اس بات سے بے حد خوف محسوس ہو رہا ہے کیونکہ...“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ جھجک آڑے آگئی تھی۔ وہ جانتے ہوئے بھی اپنے پہلے تعلق کے بارے میں بات نہ کر پائی۔ ہر چند کہ وہ ماہین کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کا پہلا تعلق ختم ہونے کے نتیجے میں اسی تعلق کی بات کا ہاتھ تھا۔

”آپ دل پر نہ لیں بھابھی! کتنا ہی دل سے اسے انداز میں بولی۔ ”امی کی انوعاوت ہے ذرا اس بات پر سوڈ خراب کرنے کی پھر خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتی ہیں پھر اصل بات تو ہاتھ بھائی کی اجازت کی ہے اگر وہ راضی ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے بہترین سمیٹنے کے بہانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شہلا سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنا میکہ اور اس کا بے حد پرکشش ہونٹ پر کیا وہ آیا پھر وہ ایک لمحے سانس بھر کر کھڑی ہو گئی۔



گاڑی گریز کالج کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ فریجہ نے جوس کا خالی ڈبہ باہر پھینکا اور بھائی کی جانب دیکھا۔ وہ ہونٹ بھیچے نبھانے کس سوچ میں گم تھا۔ سن گلاسز کے پیچھے چھپی آنکھیں اپنا بھید چھپانے میں کامیاب تھیں۔ فریجہ نے اس کے تاثرات دیکھے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ کاندھے اچکا کر کالج کالٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ تب ہی گھڑی کی سوئیوں نے ایک بجنے کا اعلان کیا۔ چند لمحوں میں بڑا آہنی گیٹ واہوا تھا۔ لڑکیاں جوق در جوق باہر نکلنے لگیں۔ آپس میں باتیں کرتی، ایک دوسرے کو ہاتھ ہلاتی، خدا حافظ کہتی، بے فکر لڑکیاں ہستی کھلکھلاتی گھروں کو جانے کی عجلت میں تھیں۔

”وہ...“ فراز نے فریجہ کو مخاطب کیا۔ ”وہ سامنے۔ جس کے ہاتھ میں دو کتابیں ہیں اور کاندھے پر بلیک بیگ۔“

فریجہ نے جلدی جلدی گاڑی کے قریب سے گزرتی لڑکی کا مشاہدہ کیا اور مسکرائی۔

”گڈ! پسند تو آچھی ہے آپ کی۔“ فراز نے گہری سانس بھر کر گاڑی اشارت کر دی۔



”یاور کھوگی نا۔“

”بالکل۔“ وہ یقین سے بولی۔

”مجھے اس نے اپنا نام غلط بتایا تھا۔ شہلا آئی کی شادی میں علم ہوا کہ اس کا نام ناعمہ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں بالکل غلطی نہیں کروں گی۔ ویسے کیوں نہ اسے گھرتک ڈراپ کر دیں؟“

فراز نے ایک نظر ہنس پر ڈالی اور زخمی سے انداز میں مسکرا دیا۔

”غلطی بار بار نہیں دہراتے“ وہ بولا تھا۔

پھر اس نے گاڑی سڑک پر ڈال دی۔ فریجہ نے نا سمجھی سے کاندھے اچکا دیے۔



”ہم اندر آسکتے ہیں؟“ شہلا نے جالی کا دروازہ کھول کر اندر جھانک کر پوچھا۔

کرۂ شہ سے نکل بنائی رابعہ بیگم نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں اور ایک دم بڑجوش ہو گئیں۔

”زہے نصیب۔۔۔ زہے نصیب۔۔۔“ وہ والہانہ انداز میں انھیں۔ ”یہ آج چاند کہاں سے نکل آیا۔ وہ بھی

ہمارے گھر میں۔۔۔ آؤ آؤ نا۔“

شہلا مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی۔ اس کی ہمراہی میں انیقہ اور ربیعہ بھی تھیں۔ وہ آپس میں سلام دعا کرنے

لگیں۔ ان کی آواز میں سن کر اندر سے وردہ اور ناعمہ بھی نکل آئیں۔

”شکر ہے آپ کو ہمارا خیال تو آیا۔“ ناعمہ نے شہلا کے گلے لگ کر جھٹ شکوہ کیا۔ ”وردہ اسے آنکھیں

دکھانے لگی۔ انیقہ اور ربیعہ مسکرا دیں۔“

وردہ انہیں برا بھلا کہہ کر وہ خود باہر نکل گئی۔

”واہ بھئی! بہت ذوق و شوق سے سواریا ہے گھر۔“ شہلا نے خوشگوار آواز سے بولے۔ ”وردہ دیوار کو دیکھیں۔“

دیکھا۔

”یہ سب وردہ کا کمال ہے۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔ ”گھر کو سجانے بنانے کا جنون ہے اسے۔ کتنے ہی کورسز

کڑا لے ہیں اسی چکر میں۔ بہر وقت کچھ نہ کچھ بناتی ہی رہتی ہے۔“

”اور ناعمہ۔۔۔“ شہلا نے بھڑبھڑاتے ہوئے چہرے پر حیرت والی نگاہوں کو شوق سے دیکھا۔ رابعہ بیگم نے آہ سے مشابہ

سانس بھری تھی جو اس کے استفسار کا خوب جواب تھی۔ ناعمہ شرمندگی سے مزید سرخ ہوئی۔ انیقہ اور ربیعہ نے

ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”ہاں تو چھوٹی بھی تو ہے نا۔“ شہلا بول اٹھی۔ ”چھوٹی بیٹیاں بلاؤلی زیادہ ہوتی ہیں نا۔“

”کوئی نہیں اپنا۔“ انیقہ نے احتجاج کیا۔ ”میں چھوٹی ہوں لیکن امی آپ کو زیادہ چاہتی ہیں۔ مجھے تو ڈانٹتی ہی

رہتی ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔“ ناعمہ جھٹ سے بولی۔ ”گھر میں سب سے زیادہ ڈانٹ میں ہی کھاتی ہوں۔ کہاں کا لاڈ کیسا

لاڈ۔ سارے نمبر تو یہ وردہ آپ لے جاتی ہیں۔“ ایک بار پھر سب اس کے احتجاج پر ہنس دیے۔

”وردہ میری سب سے پیاری اور نیک بچی ہے۔“ رابعہ بیگم کے لہجے میں کچی محبت پوائی رہی تھی۔ ”میرا سب

سے زیادہ خیال کرنے والی سلیقہ مند اور سمجھ دار۔ یہ ناعمہ تو ابھی بچپن سے ہی نہیں نکلی۔“

وردہ چائے کی ٹرے اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ چائے کے ہمراہ پائین ایل کیک اور شامی کباب بھی تھے ٹرے

سینٹر ٹیبل پر رکھ کر وہ سب کو سرو کرنے لگی۔



لب۔ خاموش مگر ہمہ وقت کچھ کہتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ خاموش مہربان تبسم دل کو اچھا لگا تھا۔ نبانے کیوں اس وقت درد کے سوال پر ربیعہ کے ذہن میں اس نگاہ کا ہر لمحہ پھر گیا۔  
درد بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سمجھ کر مسکرا دی۔



”آپ کی امی کو میرا فیصلہ پسند نہیں آیا۔“ چہرے پر کلیئرنگ کریم ملتے ہوئے اس نے عام سے انداز میں کہا۔  
وہ کلیئرنگ میگزین کی ورق گردانی کرتا ہوا ہاشم قدرے چونکا اٹھا۔ اس نے چند لمحے اس کے لہجے اور بات پر غور کیا پھر محتاط سے انداز میں بولا تھا۔

”امی کی پسند ناپسند سے اتنا فرق نہیں پڑتا شہلا! میں بارہا تمہیں کہہ چکا ہوں، تمہیں میرا اور مجھے تمہارا اعتبار ہونا چاہیے۔ جب میں تمہیں اجازت دے چکا ہوں پھر تمہیں کسی اور کی اجازت درکار تو نہیں ہونا چاہیے اور امی کی پیچیدگی کسی حد تک تو سمجھتی ہی ہوگی۔ مزید وضاحت کی ضرورت تو نہیں ہے۔“

”فرق کیوں نہیں پڑتا ہاشم!“ وہ کاشن بال سے چہرہ صاف کرنے لگی۔ ”ایک گھر میں رہتے ہوئے ان باتوں سے فرق تو پڑتا ہے۔ خیر میں منہ بچ کر لوں گی۔ آپ میرے ساتھ ہیں تو میں مطمئن ہوں۔“

”میں تو کب سے آپ کے ساتھ ہوں؟“ ہاشم نے غصے سے کہا۔ ”آپ دھیان ہی نہیں دے رہیں۔ اب تو باپ بچ ہو کر سوچتا ہوں، رافع سے کپ شپ لگا آؤں۔“  
”ضرور۔“ مسکرائی۔ ”میں نے آپ کو کبھی رد کا تو نہیں۔“

”کاش!“ لپٹنے آہ بھری۔  
”آپ سچ جانتے ہیں؟“ شہلا کو حیرانی ہوئی۔

”روک لو، گھر چلا آؤ۔“ شہلا نے ہاتھ لگا کر اس سے کہا۔  
شہلا جھینپ گئی تھی۔ ہاشم مسکراتا ہوا باہر کی سمت بڑھ گیا۔



”یا حضرت۔“ رافع نے اسے حیرانی سے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ”یہ واقعی آپ کی سواری باورساری ہے یا پھر میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔“  
”اے۔۔۔“ ہاشم نے شرمندہ ہوتے ہوئے اسے ایک دھپ سے نوازا۔ ”تجھ پر بھی یہ اچھا وقت آئے گا“ بے فکر رہ۔“

”آہ۔۔۔“ رافع نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”یار ہاشم! اچھی دعائیں دیا کریا! مجھے لگتا ہے تیری زبان اچھی بھلی کالی ہے۔“

ہاشم نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ رافع آنکھیں موند کر دم سڑوں میں کچھ گنگناتے لگا۔  
”یہ جو ایک اچھی سی لڑکی ہے ربیعہ!“ ہاشم بولا۔

رافع نے اس قدر بے اختیار آنکھیں کھولیں کہ ہاشم کا دل حقیقتاً ”زور سے دھڑکا۔“  
”یار رافع! سنبھل کر میرے بھائی۔“ وہ حقیقتاً پریشان ہوا۔  
رافع کے لبوں پر جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔  
”یونہی۔۔۔ خواہ مخواہ ہو اؤں میں تیرا!“ وہ سر جھٹک کر بولا۔

”تیر تو ہواؤں میں ہی چھوڑے جاتے ہیں دست۔۔۔ تب ہی نشانے پر لگتے ہیں۔۔۔“ ہاشم کے لہجے میں یقین

بھی تھا، بے یقینی بھی۔ ”میں تیرا دوست ہوں رافع۔ تیرا ہدم، ہم نفس۔ تو مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔“  
 رافع سر جھٹکا کر اپنی ہتھیلیاں مسکنے لگا، پھر اس نے سر اٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔  
 ”میں خود اس سے بھی جھوٹ بولنے کی سعی پیہم میں مصروف ہوں دوست۔ پر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی تو  
 بڑا ظالم دوست ہے ہاشم۔ تو نے مجھے بہت بددعا میں دی ہیں۔“  
 ”اوہ۔“ ہاشم جیسے بالکل ہی بیٹھ گیا تھا۔ ”آئی۔ آئی ایم سوری رافع۔ کیا خبر تھی۔ اوہ۔ آئی ایم ریلیں  
 سوری۔“

\*\*\*

”چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ ایقان نے اسکول سے آئے ہوئے مومن کو ہدایت دی تھی۔  
 ”حمزہ بھائی آرہے ہیں ہمیں لینے۔ ہم نانی امی کے گھر چل رہے ہیں۔“ وہ خود ایمان کو شوز پہنا رہی تھی۔  
 ”ہرے۔“ مومن نے تعز لگایا۔ ”ہم وہاں رہیں گے نامما؟“  
 ”ہاں۔ آج رات رہیں گے۔ کل واپس آجائیں گے۔“ وہ اب ایمان کی پونیاں ہٹانے لگی۔  
 ”اتنی جلدی۔“ اس نے منہ سورا۔ ”مجھے عمر کے ساتھ کھیلنا ہے بہت بہتر۔“  
 ”بیٹا! آپ کی چٹھیاں تو نہیں ہیں پھر یہاں آئے ہوئے ہیں آپ کے بھائی نہیں گئے۔“  
 ”پہا کتنے دن بعد واپس جائیں گے ماما؟“ ایقان نے تھکر کر اپنے دیکھا اور گہری سانس بھری۔  
 ”پتا نہیں۔“ وہ قدرے خفگی سے بولی۔ ”آپ کپڑے چن کر لو جلدی۔“

وہ اچھلتا کودتا اندر چلا گیا۔ ایمان کو تیار کر کے اب وہ خود بال ہزارہی تھی۔ جب ڈور بیل بجی سبہر حسب توقع  
 حمزہ ہی تھا۔ اپنے لالہ بالی انداز میں ایمان کو کاندھے پر چڑھائے وہ اندر چلا آیا۔  
 ”چلیں پیچھو؟“

”ہاں چلو، ہم لوگ تیار ہیں بالکل۔“

”اور پیچھیا حضور۔ وہ کہاں ہیں؟“

”کچھ خبر نہیں ملتی ان کی۔“ وہ جلتے بھنے سے انداز میں بولی۔ ”بھئی بالکل فارغ، کبھی بے حد مصروف۔ سنا ہے  
 آج کل کسی بزنس وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ اکثر ہی شتر گھر سے باہر ہی پائے جاتے  
 ہیں۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا اور فریج کھول کر کوئی کام کی چیز تلاش کرنے لگا۔ ”میں نے انہیں چند دن پہلے دیکھا  
 تھا ایک ناز لڑکی کے ساتھ آئس کریم پارلر پر۔ شاید بزنس وغیرہ کے سلسلے میں مصروف تھے۔“

ایقان جہاں بھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے بے اعتباری سے حمزہ کی جانب  
 دیکھا کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہو لیکن وہ اپنی بات پوری کر کے اب سنجیدگی سے مٹھائی کے ڈبے پر ہاتھ صاف کر رہا  
 تھا۔

”تم نے۔ تم نے۔ عاشر کو دیکھا تھا۔ آئس کریم پارلر پر۔“ وہ بے اعتباری سے بولی۔ ”کب؟ کب کی  
 بات کر رہے ہو؟“

”اول۔“ اس نے سوچا۔ ”شاید پرسوں کی بات ہے۔ پرسوں رات کی۔ جی ہاں۔ یقیناً میں اسی دن رہبر کے  
 ساتھ لگا تھا۔“

”پرسوں۔“ ایقان نے کھوئے کھوئے انداز میں سوچا۔

اس روز عاشق رات بہت دیر سے لوٹا تھا اور ایقان کے استفسار پر اس نے ایک دوست کے ہاں دعوت کا ذکر کیا  
 تھا۔

”دچلیں پیچھو۔“ حمزہ نے قدرے اکتا کر کہا۔ ”مجھے دیر ہو جائے گی۔ میری شام کی کلاسز ہیں۔“  
 ”آں۔“ وہ چوکی۔ ”ہاں چلو۔“

خود پر قابو پانا اس وقت دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ بدقت تمام اس نے بیگ شانے سے لٹکایا۔ اس وقت  
 اس کا اپنا جی کسی کے شانے سے لگ کر آٹھوہانے کو چاہ رہا تھا۔

”ایک ناز لڑکی کے ساتھ۔ آئس کریم پارلر پر۔“ حمزہ کے الفاظ اس کا دل کاٹ رہے تھے۔  
 ”نرا کانگ۔“ عاشر کے موبائل کی اسکرین اس کے ذہن پر روشن تھی۔

\*\*\*

”اوکے۔ میں اب چلوں گا۔“ کافی کا خالی مک سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑانے الماری کے پٹ بند  
 کرتے ہوئے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

”آج پیس رک جاؤ۔“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔  
 ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ وہ برش سے بال کھٹوارنے لگا۔

”کیا حرج ہے؟“

”عاشر! آؤ گھورا۔“  
 ”نرا! یہی تمہیں ایک چیز ایک مرتبہ سمجھا چکا ہوں۔ ایسے مطالبات مت کرو جو میرے لیے ناقابل قبول  
 ہوں۔“

”جو مطالبات تمہارے لیے قابل قبول ہوں ان کی ایک لسٹ بنا دو۔“ وہ شرارت سے ہنسی۔

”میں تمہیں اپنا دائرہ عمل بتا چکا ہوں۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولا۔

”آہ۔“ اس نے منہ کھول کر کانڈھے آدھا۔ ”آپ کب آؤ گے؟“

”پرسوں تمہاری فلائٹ ہے۔“ عاشر نے سی آف کرنے آؤں گا۔ ”وہ چند لمحے ٹھہرا۔

”تم آؤ۔“ وہ منٹ سے کہ تم کل نہیں آؤ گے۔“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔

”اوکے۔“ وہ خوش گردن لگا۔ ”وہ نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر دروازے کی سمت برہہ گیا۔

”عاشر! اس نے پیچھے سے پکارا۔

وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”کل۔ شادی کرو گے مجھ سے؟“

عاشر اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔

”یہ کون سا مذاق ہے؟“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ وہ حقیقتاً ”سنجیدہ تھی۔“





تمہاری؟“ شفیقہ حیات نے بے حد محبت سے اسے مخاطب کیا  
ایقان نے مرتھائے ہوئے انداز میں ان کی جانب دیکھا۔ اس کا زبردستی بھی مسکرانے کو جی نہ چاہا تھا۔

”جی اماں!“ وہ گہری سانس بھر کر بولی ”طبیعت تو ٹھیک ہی ہے۔“  
”عاشق میاں سے کوئی کھٹ پٹ تو نہیں ہوگئی؟“ وہ قدرے فکر مند ہوئیں۔  
ایقان کے لبوں پر مرہ سی مسکان پھیلی۔

”کیا کھٹ پٹ ہوئی ہے اماں۔! کھٹ پٹ کے لیے بھی وقت درکار ہے اور وقت ان کے پاس ہے ہی نہیں۔“

”اوہ!“ انہوں نے بغور اس کی بات سنی اور اطمینان کی سانس بھری۔ ”تو بنیا! مرد آدمی ہے۔ سارا وقت تو تمہارے گھنٹے سے لگ کر بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ اس کے اپنے سودھ بندے ہوں گے نمٹانے کو۔ تم اپنے کاموں میں جی لگاؤ۔“

”جی جلاؤ کیسے۔۔۔“ وہ جل کر رہ گئی۔ ”اور میرے کسی گھنٹے، گھنٹے کی ایسی قسمت نہیں ہے کہ وہ اس کے ٹوٹے پر بھی دو گھڑی کو لگ کر بیٹھ جائیں۔ انسان کس سے دل کا دکھ کہے۔ مائیں بھی شادی سے پہلے بیٹوں کی اور شادی کے بعد دامادوں کی ہوتی ہیں۔“

”بنیا! بات تو حق کی کہنا چاہیے چاہے بیٹی ہو یا داماد!“ وہ اطمینان سے پان لگانے لگی تھیں۔  
ایقان زیر لب برزوانے لگی۔ عذرا بیگم نے اندر داخل ہونے کے آثارات کا جائزہ لیا اور مسکرا دی تھیں۔

”کیوں ایقان۔۔۔! عاشق کی واپسی قریب ہے کیا؟“ وہ اس کی پاس بیٹھتی ہوئے بولیں۔  
”نہیں بھئی۔۔۔ ابھی قریب!“ پندرہ بیس دن کا قیام مزید۔  
”تمہارا چہرہ تو کہہ رہا ہے جیسے وہ کل ہی جا رہا ہو۔“

”میرا چہرہ ہی ایسا ہے۔۔۔“ وہ خنکی سے بولی۔  
عذرا بیگم ہنس دیں۔ شفیقہ حیات بھی مسکرانے لگیں۔  
”آپ سنا میں کچھ نئی مازی۔“ وہ موضوع بدلنے کی خاطر بولی۔ ”کیا حال احوال ہیں سب کے۔۔۔ شہلا اور ہاشم خوش ہیں؟“

”سنائے بھالی بیگم کے مزاج اچھے نہیں ہیں۔“ عذرا بیگم دبا دبا سا مسکرائیں ”شہلا نے ڈوبنا چاہا تھا۔“  
اور بھالی بیگم کے مزاج پر یہ بات گراں گزری ہے۔

”کیوں۔۔۔ اس میں اعتراض کا کیا سوال؟“ وہ حیران ہوئی ”بھالی بیگم جانتی ہی تھیں کہ شہلا ڈاکٹر ہے۔ اب اس نے اتنی محنت کھر بیٹھ کر رت باندھنے کے لیے توکی نہیں تھی۔ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو انہوں نے بد مزگی پھیلاتا شروع کر دی ہے چاہی شہلا کتنی مشکلوں سے راضی ہوئی تھی۔ کتنے دھڑکے تھے اس کے دل کو۔ کیا سوچتی ہوگی وہ غریب؟“

”شہلا سمجھ دار بیٹی لگتی ہے۔۔۔ وہ معاملہ سنبھال لے گی۔“ شفیقہ حیات بولیں ”پھر اس کو پرانا تجربہ بھی ہے۔“  
سنبھال کر ہی قدم اٹھائے گی۔

”سب سے بڑھ کر یہ کہ خود ہاشم میاں بہت سمجھ دار ہیں۔ وہ بد مزگی کی فوجت آنے ہی نہیں دیں گے۔“ عذرا بیگم بولیں۔  
”ہاں۔۔۔ یہ کسی سوا توں کی ایک بات؟“ شفیقہ حیات نے خوش ہو کر سو کو داد دی۔

ایقان خاموش ہو کر اب شہلا کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

\*\*\*

بار کنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کر کے وہ مصروف و مطمئن سے انداز میں چابی بیگ میں ڈالتے ہوئے آگے بڑھی تھی تب ہی عقب سے آتی آواز سن کر اس کے قدم ٹھم گئے۔

”شہلا!“ شہلا تیزی سے گھوئی۔ اس کے گلاسز برابر جیلانی کا عکس پڑنے لگا۔

”تم۔۔۔“ اس کے لبوں نے بے آواز سرگوشی کی پھر اس نے جھٹکے سے گلاسز اتار کر ادھر ادھر دیکھا۔

”کیا چاہتے ہو تم ابراہ؟ میری بدنامی؟ میری تباہی؟ بربادی؟“ وہ دبلی دبی آواز میں بولی۔ وہ اداسی سے مسکرایا اور دو قدم آگے بڑھ کر اس کے مقابل آگیا۔

”میں تو خوشی سکون اور شاد آباد زندگی کے متعلق سوال کرنے آیا ہوں شہلا۔۔۔“

”جی جی! تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟“ اس نے جھٹکے سے رخ پھیرا۔

”سمجھ کر بھی انجان ہو کر ایک بات ہے۔“

”پبلک پلیس پر میرا تماشا بنانا چاہتے ہو؟ تم چاہتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ بدنام ہو جاؤں؟ ابراہ۔۔۔ خدا کا واسطہ مجھے اب سکون سے جی لینے دے۔۔۔ پھر میرے راستے میں آنا چھوڑ دو پلیز!“

”میں تمہیں تمہارے ہر راستے میں ملوں گا شہلا۔۔۔ جانتی ہو کیوں۔۔۔ اس لیے کہ اب تمہاری ہر راہ مجھ تک آتی ہے۔ میں تمہاری منزل ہوں یہ بات یاد رکھنا۔“ جہاں پل دوپل کے لیے ٹھہری ہو وہ تمہاری منزل نہیں محض ایک گزر گاہ برقی پڑاؤ ہے۔“

”شہلا نے رنج کا کرشمہ کر کے اپنے قدم پر دھکا دیا۔ ابراہ نے اپنا بازو گاڑی کی چھت سے ٹکا کر غیر محسوس طور پر اس کا رستہ روکا۔ شہلا نے پریشان ہو کر نگاہیں اٹھائیں۔ لمحہ بھر کو اس نے ابراہ کی نگاہوں میں دیکھا تھا پھر گہری سانس بھر کر نظر پھیریں۔“

”تم اچھا نہیں کر رہے ہو ابراہ۔۔۔ نہ اپنے منہ نہ میرے ساتھ۔“ پھر وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

”منزل پر پہنچ کر تمہارے خیالات بدل جائیں گے۔۔۔ یہ میرا دعوا ہے۔ زندگی میں اتنے رنگ بھر جائیں گے شہلا کہ تمہیں یقین نہیں پڑے گا۔ جلد سے جلد فیصلہ کر لو۔ میں تمہارا منتظر ہوں۔“

شہلا نے سر ہلاتے ہوئے پلٹ کر کھڑی رہی۔

”چھٹا ہوں۔۔۔ جو کچھ میں نے کہا اس پر منطقی انداز میں سوچنا۔۔۔ مشکلوں کو چھوڑ کر آسانوں کا انتخاب کر لو۔“

وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ چند لمحوں میں اس کی گاڑی شہلا کی گاڑی کے قریب سے نکلی تھی۔ شیشے میں سے ابراہ نے پتھر کا بت بنی شہلا کو غور سے دیکھا تھا۔

\*\*\*

وہ تہی تی سی فون تک آئی تھی۔

”ہیلو۔۔۔“ وہ اجنبی پن سے بولی۔

”ہیلو ایقان۔۔۔“ وہ سری جانب وہ قدرے تھکا تھکا سا تھا ”کمال ہے یار۔ بتائے بغیر چلی گئیں۔ کم از کم مجھے اپنے پروردگارم تو بتا دیتیں۔ کھڑوٹا ہوں تو سنا نے استقبال کر رہے ہیں۔ کیا کروں اس اکیلے پن میں؟“

ایقان لظف سے ہنسی۔

”افوہ... اتنے سالوں سے وہاں جاپان میں یہی ”اکیلاپن“ مسہر رہے ہو وہاں تو تمہیں کوئی شکایت نہ ہوئی۔ یہاں بہت قریبیں میسر ہیں؟“  
عاشق چونکا۔ اس کے لمحے کا طنز اور بدلاؤ بہت واضح تھا۔  
”بچے کہاں ہیں؟“ اس نے گویا سنی ان سنی کی۔  
”ہمیں ہیں گھر میں۔“ وہ مختصراً بولی۔  
”لینے آ جاؤں؟“

ایقان لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی۔ جی چاہتا تھا۔ کوئی ایسا جملہ کہے کہ اس کے اندر کی ساری تپش اس جملے میں گھل کر اس کی سماعتوں میں اتر جائے۔ پھر اگلے ہی لمحے ہر طرح کی مصلحتیں اس کی زبان کے آڑے آ گئیں۔  
”مرضی ہے۔“ وہ مختصراً بولی۔  
”کیا بات ہے ایقان۔“ وہ اچھ گیا ”تمہیں ہوا کیا ہے؟“  
”خدا حافظ! وہ فون رکھ کر مڑ گئی۔“

”انیقہ! ربیعہ نے کمرے میں جھانکا ”بڑی ہو؟“  
”ہاں ہوں تو سیدہ“ اس نے جرنل پر سے سر اٹھا کر جرے پر ڈال دیا۔ ”کوئی ضروری کام ہے؟ میں ذرا یہ ڈالیا کر امز بنا رہی تھی۔“  
”مجھے ورہ سے کچھ کام ہے۔ بکس کے متعلق بات کرنا چاہ رہی تھی“ انیقہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔  
”ہاں تو چلی جاؤ نا۔ اب تو تمہارا آنا جانا رہے گا۔“  
”میں اکیلے؟“ وہ متذنب ہوئی۔  
”یار ربیعہ! یہ گز بھر کے فاصلے پر تو گھر پہنچے پھر بھی تم کہہ کر چلتی ہو۔“ وہ کتابیں سمیٹنے لگی۔  
”نہیں نہیں۔ انیقہ! تم اپنی اسٹڈی کمرے میں چلی جاؤں گی۔ تم ٹھیک ہی کہتی ہو ”اب تو اکثر آنا جانا ہو گا۔“  
ربیعہ نے اسے کتابیں چھوڑ کر جلدی سے کہا۔  
”شیور؟“ اس نے پوچھا۔  
اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے نکل گئی۔

دوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے ماحول کو رنگ دیا تھا۔ اس سنہری سنہری شام میں اپنی دھن میں آگے بڑھتا ہوا رافع ٹھنکا تھا۔ لکڑی کے جھوٹے گیٹ کے دوسری جانب کھڑی ربیعہ بھی اسے دیکھ کر اپنی جگہ ٹھہر گئی۔  
”آپ؟“ وہ مسکرایا ”ہاں؟“  
ربیعہ بھی متانت سے مسکرائی ”کیوں... میں یہاں نہیں آ سکتی؟“  
”زہے نصیب“ وہ قدرے شریر ہوا۔ ”ہزار مرتبہ آئے۔“  
”آپ دروازہ کھولیں“ تب نا۔ وہ ہنس پڑی۔ رافع کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بھی ہنس دیا۔ پھر اس نے کندھی کھول کر گیٹ واکیا۔  
”تشریف لائیے۔ یو آر موسٹ ویلکم۔“  
ربیعہ قدرے جھینپ سی گئی۔ اندر آ کر اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنے سامنے پھیلے بیگلے کے طول و عرض کو دیکھا

تھا۔ شہلا کی ہمراہی میں وہ رابعہ بیگم کے پورشن میں گئی تھی لیکن اب اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس کے قدموں کو کس سمت میں بڑھنا ہے۔  
”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ رافع نے اس کا چہرہ پڑھا۔ ”میرا خیال ہے شہلا بمبالی اپنے کمرے میں ہی ہوں گی۔“  
”جی ہاں۔ لیکن اس وقت میں درن کے پاس آئی تھی۔ مجھے اس سے کچھ ضروری کام تھا۔ شہلا آپلی تو خود ہمارے کمرے آنے والی ہیں۔ میں واپس جا کر ان سے ملوں گی۔“  
”ورنہ؟“ رافع کا چہرہ واضح طور پر بجھا تھا ”اوہ... اچھا آئیں میں آپ کو پھپھو کے پورشن تک چھوڑ دیتا ہوں۔“

ربیعہ نے روش پر اس کی ہمراہی میں قدم بڑھائے تھے۔ رافع اس سے دو قدم ہٹ کر قدرے آگے چلنے لگا۔ اپنا ہاتھ دھو کر کمرے میں آئی۔ ربیعہ نے بھی قدموں کی رفتار تیز کی۔  
اسی لمحے سامنے رافع پورشن کا مرکزی دروازہ کھول کر باشم اور شہلا باہر نکلے تھے۔  
رافع اور ربیعہ رک گئے۔ باشم بھی انہیں دیکھ کر جیسے ٹھنک کر اپنی جگہ پر ٹھہرا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت اور استعجاب کے رنگ تھے۔

ربیعہ شہلا کو دیکھ کر تیز قدموں سے اس تک پہنچی۔  
”السلام و علیکم۔“ اس نے بے حد گرم جوشی سے ان دونوں کو سلام کیا۔  
”علیکم السلام۔“ شہلا نے محبت سے اسے بہا کر لگایا ”تم مجھ سے ملنے آئی ہو ربیعہ! اندر چلیں؟“  
”جی ہاں۔“ ربیعہ نے ہنس کر کہا ”میں تو شہلا سے ملنے آئی تھی۔“  
”کیونکہ مجھے علم تھا کہ آپ کو اب بھی ہم لوگوں سے ملنے آئے ہیں۔“ شہلا نے ورہ کے پاس آئی تھی۔ بکس خریدنے سے پہلے اس سے مشورہ کرنا چاہ رہی تھی۔  
”اچھا۔ یہ بات ہے۔“ شہلا نے گلابی لباس میں باشم کو غور سے دیکھا ”بہت پیاری لگ رہی ہو ربیعہ۔“  
”یہ رنگ بہت اچھا لگ رہا ہے تم پر۔“

”اچھا۔“ وہ جھینپ سی گئی۔  
باشم ان دونوں کو محو گفتگو کر چکے تھے رافع کی سمت کھسک لیا۔  
”ابے شاعر! اس نے شہلا کو گئی کی ”تو تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔“ یوں سرعام بہانہ بول۔  
”نیکو! کیوں بڑھتا؟“ اس نے دانت پیسے۔ ”میں اسے پھپھو کے پورشن تک پہنچانے جا رہا ہوں۔“  
”ہائے“ باشم نے آدھری ”قسمت کی خوبی دیکھیے کہ کہاں پہنچانے جا رہا ہے“ رافع نے زیر لب اسے برا بھلا کہا۔

”ویسے سچ کہوں رافع۔“ وہ نزدیک تر ہوا ”جوڑی خوب بیچ رہی ہے۔ اگر میں تعصب کی عینک اتاروں تو میری اور شہلا کی جوڑی کو بھی مات دے دی تو نہ۔“ رافع نے گہری سانس بھری تھی۔  
”باشم! باشم!“  
”اوہ کے۔“ اس نے مصاحبتی انداز میں دونوں ہاتھ اٹھائے ”ہم چلتے ہیں۔ تم تھوڑی دور اور اس کے ساتھ چل لو۔“

پھر اس نے پلٹ کر شہلا کو دیکھا۔ شہلا اس کی نگاہوں کا اشارہ دیکھ کر ربیعہ سے اجازت چاہ کر آگے بڑھ آئی۔  
”جلدی آ جانا۔“ اس نے ربیعہ کو تاکید کی تھی۔  
”بس آپنا۔“ دھسے گھٹنے میں آئی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

رافع نے جربز ہو کر اپنی نگاہ پھیری تھی۔

\*\*\*

”ہائے ربیعہ تم!“ وردہ اسے دیکھ کر کھل ہی اٹھی ”ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔۔۔ پوچھو تو ناعمہ سے۔“

”بالکل سچ!“ ناعمہ بھی مسکرائی ”وردہ آلی آپ کا ہی ذکر کر رہی تھیں۔“

”اؤ اندر چل کر بیٹھیں۔۔۔ ناعمہ! تم ہمارے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ وردہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب چل دی تھی۔

ربیعہ ان لوگوں کی محبت اور خلوص سے حقیقتاً متاثر ہوئی تھی۔ خصوصاً ”وردہ“ اسے بہت اچھی لگی تھی۔ ”حیات دلا“ کے جتنے افراد سے وہ اب تک متعارف ہوئی تھی ان میں سے دو افراد اسے خصوصیت سے اچھے لگے تھے۔ ان دو میں سے ایک وردہ تھی۔

ناعمہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دونوں گہری سیلیوں کی طرح کچھ بات پر غور کر رہی تھیں۔ ناعمہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

”کتنی اچھی لگتی ہیں آپ ہنستے ہوئے۔“ اس نے نرے ان کے ہنسنے رکھی اور خود بھی ہنسنے لگی۔

”زیادہ سے زیادہ ہنسا کریں۔“

ربیعہ دفعہ ”سنبھل رہی ہو کئی تھی۔“

”ایسی ہنسی تو کبھی کبھار ہی آتی ہے۔“ نجائے کیا سوچ کر وہ بولی تھی پھر قدرے چونک کر ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

”اور تم لوگ تو یوں ہی ہنسی مذاق کرتی رہتی ہو گی۔ بہنوں کی تو آپل میں خوب ہنسی ہے۔“ ناعمہ نے وردہ کو دیکھ کر منہ بنایا۔ وردہ مسکرا دی تھی۔

”ان کے ساتھ اور ہنسی مذاق؟“ وہ بولی۔ ”انہیں تو میری بہن بات پر نکتہ اعتراض اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ بہن کم اور تاح زیادہ ہیں یہ۔ ہاں رائے آلی سے میری خوب ہنسی ہے۔“

”بہنوں کی اصل قدر شادی کے بعد ہی آتی ہے۔“ وردہ نے اسے چڑایا۔ ”میں کون ربیعہ؟“

”بالکل ٹھیک۔“ وہ مسکرائی۔ ”وردہ کی شادی کے بعد تم اسے بھی یونہی یاد کر دی۔“

”جی رہنے دیں۔“ اس نے کپ ربیعہ کو تھمایا۔ ”یہ کون سا رائے آلی کی طرح کہیں دور جائیں گی جو میں انہیں یاد کروں گی۔“ ناصح بن کر بیٹھیں رہیں گی۔۔۔ دن رات نصیحتیں کرنے کے لیے۔“

”کیا مطلب؟“ ربیعہ نے دل چسپی سے وردہ کی شرکیں مسکراہٹ اور ناعمہ کے بھنائے ہوئے انداز کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ سلجوق ماموں کے بڑے صاحبزادے رافع حسن ان کے منگیتر ہیں۔“

ربیعہ کو نجائے کیوں لمحہ بھر کے لیے چکر یا آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منظر دھندلا گیا۔ ہاتھ کانپا۔ چائے سا سر میں چٹک لگی۔ لمحہ بھر کی بات تھی پھر منظر صاف ہو گیا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور دھیرے سے مسکرائی۔

”اچھا۔“ وہ بولی۔ ”وردہ نے تو بتایا ہی نہیں کہ یہ انکیجڈ ہے۔“

”یہ ایسی ہی ہیں۔۔۔ گھنی سی۔۔۔ ناعمہ مزے سے بولی۔“

”شرم کرنا کچھ۔“ وردہ نے اسے جھڑکا لیکن اس نے قطعاً ”روانہ کی۔“

”چند سال قبل بزرگوں کی باہمی رضامندی اور رافع بھائی کی پسند سے یہ رشتہ طے پایا ہے۔“ ناعمہ مسلسل بول رہی تھی۔

ربیعہ کو یوں محسوس ہوا گویا اس کی پیشانی پر سینے کے قطرے چکے ہیں۔ اس نے چائے کی پیالی نرے میں رکھ دی۔

”کوئی نہیں پسند و پسند۔“ وردہ جھٹ بولی تھی۔ ”ناعمہ! تم کچھ زیادہ ہی بول رہی ہو۔“

”بھئی“ میں تو سچ ہی بول رہی ہوں۔ کیا غلط ہے کہ رافع بھائی نے عریشہ کے بجائے آپ سے منسوب ہونا پسند کیا تھا؟ ان کے سامنے دونوں آپشنز تھے۔“

”انہوں نے محض ترجیح دی تھی کیونکہ ان کے مطابق عریشہ ان سے کافی چھوٹی ہے۔ باقی یہ کہ اس رشتے کے بڑے پائے پائے میں کس قسم کی ذاتی پسندیدگی نہیں تھی۔“

”اللہ۔ تو آپ اس قدر صفائیاں کیوں دے رہی ہیں۔“ ناعمہ شرارت سے آنکھیں مٹکا کر بولی۔ ”پسندیدگی اگر ہو بھی تو میں اور ربیعہ ہرگز ملنے نہیں ہوں گے۔ کیوں ربیعہ؟“

”ربیعہ محض مسکرا کر رہ گئی تھی۔ وہ بھائی کے افق پر چمکتی دو نگاہیں اپنی جگہ ہنوز موجود تھیں اور ان میں موجود وہ جذبہ وہ کہانی وہ سیاقی وہ اخلاص؟“

”جھوٹ کہاں تھا کس جگہ تھا؟ ربیعہ سمجھ نہ پائی۔“

”سب کس سوچ میں کیوں گئیں؟“ ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا تو وہ جلدی سے مسکرا دی۔

”اللہ! ہوں! آپ چاہتے ہیں کہ میں شادی کر لوں گی۔“ وہ سچ کھڑی ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم۔“ عاشق اندر داخل ہوا۔

شفیقہ حیات اور عذرا بیگم نے بے حد خوشی اور گرم جوشی سے اس کے سلام کا جواب دیا جبکہ وہ بے نیازی سے اپنے ناخنوں کا جائزہ لینے لگی تھی۔

عاشق نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔ لائٹ براؤن لباس میں اپنی شہتی آنکھوں سے بے نیازی سے اودھراؤں دیکھتی ہوئی وہ دل میں باتیں کر رہی تھی لیکن اس کی بے نیازی کی وجہ سمجھنے سے وہ ہنوز قاصر تھا۔

”اؤ بھئی عاشق میاں۔“ شفیقہ حیات نے قریب رکھے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہاں بیٹھو ہمارے پاس۔“

”اچھے لوٹے ہو باہر سے۔۔۔ دنوں چہرہ نہیں دکھاتے۔“

”بس اماں!“ وہ قدرے شرمندہ ہوا۔ ”کچھ دوستوں کے ساتھ مصروف تھا۔ بات بھی کچھ ایسی تھی کہ چاہنے کے باوجود جان نہ چھڑا سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔“

”ارے اب جانے بھی دو۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”میں نے تو یونہی ایک بات کی۔ تم اپنی طبیعت کا سناؤ خوش باش ہو؟“

”جی اماں! اللہ کا شکر ہے۔ آپ بتائیں آپ کیسی ہیں؟“ وہ سعادت مندی سے کہہ رہا تھا۔

ایقان منہ ہی منہ میں بربروانے لگی تھی۔ اس کا سعادت مندانہ رویہ دیکھ کر اس کی جان جل کر رہ گئی تھی۔

”اے بی۔۔۔ یہ تم کون سے منتر پڑھنے لگیں؟“ شفیقہ حیات نے اسے گھورا۔ ”بچہ کب سے آیا بیٹھا ہے چائے پانی کی پوچھ نہو۔“

بہنچ لیا۔

یقین اور بے یقینی کے اس بل پر سفر کرتی اس کی سوچ اب یقین کے سرے پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ وہ جیسے سارے قصے سے آگاہ ہو گئی تھی۔ شک اور بے یقینی اپنا کام دکھا کر تحلیل ہو چکے تھے۔ وہ ایک فیصلہ کن موڑ پر تھی۔

\*\*\*

بچوں کو اسکول کے لیے بھیج کر ایقان اندر آئی تو بیڈروم کے دروازے پر آکر ٹھہر گئی۔ وہ نہادھو کر آئینہ کے سامنے موجود تھا۔ بالوں میں تولیہ رکڑتے ہوئے بے حد فریش موڈ میں وہ کوئی گیت گنگنا رہا تھا۔  
 ”یاسا چائے دو جلدی ہے۔“ آئینے میں ایقان کا عکس دیکھ کر وہ بولا اور بالوں میں برش پھیرنے لگا۔  
 ایقان خاموشی سے پٹی تھی۔ بچن میں آکر چائے بناتے ہوئے وہ خود میں چولہے سے زیادہ تیش اور کھولتے ہوئے پانی سے زیادہ کھولاؤ محسوس کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا ”یہی آگ وہ عاشر کے وجود میں بھی بھڑکاوے۔“  
 بے حد مصروف سے انداز میں وہ ٹیبل پر اخبار بچھائے شہ سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ ایقان نے چائے کا کپ لہجے سے سامنے رکھا اور کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ باہر آئی تھی۔ کرسی ٹھیکٹ کر کے اس کے قریب بیٹھ گئی۔  
 چائے پیتے پیتے عاشر نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور بے حد چو نکا۔  
 ”ایقان! کیا ہوا تمہیں؟“

وہ جواب دیے بنا اسے دیکھتی رہی۔

”طبیعت خراب ہے؟ اتنی سرخ آنکھیں جیسے روتی رہی ہو رات بھر۔“ اس نے ہاتھ برسھا کر اس کا ہاتھ چھونا چاہا۔ ایقان نے اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پرے کیا۔  
 ”ایقان! اس نے بے یقینی سے دیکھا۔  
 ایقان نے عین اس کی نظروں کے سامنے مٹھی کھولی تھی۔ اس کے ہاتھ پر وہی نشو و نما تھا۔  
 ”کیا ہے یہ؟“ عاشر نے حیران ہو کر پوچھا۔  
 ”یہی تو میں جانا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟ اٹھاؤ اسے اور بتاؤ کہ یہ محبت کی نشانی کس کی ہے کس کے لیے ہے اور کیوں ہے؟“

عاشر محتاط سا ہو گیا۔ اس نے دھیرے سے ٹٹو اٹھایا اور اگلے ہی بل پر پہنچ گیا۔ اس میں سے لڑا کے مخصوص ریفریم کی نہایت تیز خوشبو آ رہی تھی۔  
 ایقان پلک جھپکائے بغیر اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ عاشر نے نشو کی تہ کھولی پھر غیر آواز میں غور پرانی اس کے لبوں سے گہری سانس برآمد ہوئی تھی۔  
 ”یہ کہاں سے آیا؟“ اس نے ایقان سے پوچھا۔

”غیر ضروری سوال ہے۔ ان ضروری سوالوں کا جواب دو عاشر! جو میں نے تم سے پوچھے ہیں؟“ عاشر نے جڑبڑہو کر اسے دیکھا تھا۔

”میں کہہ سکتا ہوں ایقان! اگر میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں کہوں گا۔ یہ لڑا کی حرکت ہے۔ اسی نے جان بوجھ کر یہ میری جیب میں رکھا ہو گا۔“

ایقان کا تنفس تیز ہو گیا۔ اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔  
 ”جانتے ہو عاشر! مرد کے زب تن کیے لباس میں آکر کوئی لڑکی کچھ رکھنا چاہے تو اسے اس مرد کے کتنا قریب ہونا پڑتا ہے؟“

عاشر لمحہ بھر کے لیے دم بخود سا ہوا پھر وہ کچھ بولنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کرنے لگا۔  
 ”دیکھو ایقان! بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ دراصل میں تمہیں بتانا چاہ رہا تھا۔“  
 ”کون سی بات؟“ وہ جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔

”لڑا! لڑا میری دوست۔ وہاں جاپان میں وہ میرے ساتھ۔“  
 ”جاپان؟“ بے یقینی سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”وہ جاپان سے تمہارے ساتھ آئی ہے۔“  
 ”نہیں۔“ وہ جڑبڑہو کر ہوا۔ ”وہ میرے ساتھ نہیں آئی۔ وہ بعد میں۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی آئی ہے۔“  
 ”تم تمہارے لیے ایرپورٹ گئے تھے؟“

ایقان کو گزشتہ دنوں میں رونما ہونے والے واقعات یاد آنے لگے۔  
 ”اور۔ اور تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے دوست کی فیملی آئی ہے۔ اور اس دن کے بعد سے تم پورا پورا دن اپنے دوست کی فیملی کے ساتھ رہے۔“  
 ”جھ سے مختلف جھوٹ بول کر اپنی مصروفیت کا جواز پیدا کرتے رہے۔ اور۔ اور عاشر! میں یا گل ہو جاؤں گی۔“  
 اس نے دونوں ہاتھوں سے نظریں بند کر لیں۔

”ایقان۔ پلیز! مجھ پر اعتبار کرنا۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ محض وقت گزاری کے چند لمحات۔ دراصل اس نے مجھے اتنا مجبور کر دیا کہ میں نہ چاہتی تھی ہوئے بھی۔ وہاں جاپان میں اکیلے پن کی وجہ سے ہم کچھ قریب ہو گئے تھے۔“

وہ بکھلنے والے انداز میں بے تکے پن سے وضاحت کرنے کی کوشش میں نجانے کیا کچھ کہتا چلا جا رہا تھا۔  
 ایقان اپنے لپٹنے والے ہاتھ میں اس کی آنکھوں سے ٹپٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔

”تم نے مجھے بہت برا دکھایا ہے۔ عاشر! بہت برا۔“ بے یقینی بے اعتباری کا دکھ۔ بے وفائی کا دکھ۔ میں سب کچھ سمجھ سکتی ہوں لیکن اپنی بے توقیری نہیں۔ تم نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔ کبھی، کبھی نہیں کروں گی تمہیں۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔“

وہ روتے ہوئے اٹھی اور بھاگتے ہوئے بیڈروم میں چلی گئی۔ دروازہ اس نے اندر سے لاک کر لیا تھا۔ عاشر پشیمانی کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا رہ گیا تھا۔

\*\*\*

ربیعہ کو در سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ سامنے جو جھللا ہٹ دکھائی دے رہی ہے۔ وہ یقیناً پانی کی ہے۔ وہ بہت بڑا تالاب تھا۔ اتنا بڑا کہ اس پر جھیل ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔ چاندنی رات میں اس کے شفاف پانی کی چمک چاند کی کرنوں کا عکس تھی۔ یوں جیسے رو پہلی چادر بچھی ہو۔

ربیعہ قدم برعکس چلی گئی لیکن یہ کیا؟ وہ جتنا آگے بڑھتی تھی۔ پانی بھی اتنا ہی دور ہٹ جاتا تھا۔ وہ تیز تیز چلتے گئی پانی بھی تیزی سے دور ہونے لگا۔

کیا وہ سراب تھا کیا؟ کسی ریگ زار میں تھی کیا؟ فریب نظر تھا کیا؟ کوئی تمنا تھی؟  
 ربیعہ بھاگنے لگی۔ بھاگتے بھاگتے اس کی ٹانگوں میں درد ہونے لگا لیکن پانی اتنا ہی دور۔

”ربیعہ۔“ ایک ٹھنڈی میٹھی آواز کہیں سے ابھری تھی۔ ”ربیعہ! آؤ۔ میرے پاس آؤ۔“ ربیعہ ٹھنک کر رک گئی۔

”کس کی آواز ہے یہ؟“ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ شاباشا مہربان آواز۔

”ربیعہ ربیعہ آؤ۔ میں یہاں ہوں ربیعہ تمہارے سامنے۔“

ربیعہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ دفعتاً چاند کو بادلوں نے اپنی اوٹ میں لے لیا۔ کچھ لمے قبل جگمگاتا ماحول اچانک اندھیرے میں بدل گیا اور پھر ربیعہ نے بارش برستی محسوس کی۔

اس نے ہاتھ پھیلائے اور آگے بڑھنا شروع کیا۔ آواز اسے مسلسل پکار رہی تھی۔ ربیعہ کا ذہن اس کی پہچان کو گرفت میں لانے سے قاصر تھا لیکن شناسائی مسلسل محسوس ہو رہی تھی۔

”کون ہو تم؟ کون ہو تم؟ کہاں ہو تم؟“ وہ پانگلوں کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔

یہ ایک اسے ٹھوکر لگی۔ بڑے زور کی ٹھوکر۔ اور اس سے پیشتر کہ وہ گر پڑتی اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بستر پر لیٹی ہوئی گہرے گہرے سانس بھر رہی تھی۔ اس کے سانسوں کی آواز اتنی تیز تھی کہ برابر میں لیٹی ہوئی انیقہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ربیعہ۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ ”کیا ہوا ہے؟“

ربیعہ بھی اٹھ کر بیٹھی۔ ”پانی۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔ ”مجھے پانی چاہیے۔“

”میں لاتی ہوں۔ تم شاید خواب میں ڈر گئی ہو۔“ انیقہ نے اس کا شانہ ٹھٹھکیا۔ ”بستر سے اتر کر فرنگ کی جانب بڑھ گئی۔“

اپنی سانسوں سے ابھرتی ربیعہ اب خود سے ابھ رہی تھی۔ کیوں؟ کبھی نہ ایسے خواب؟ کس کی دعوت بہیم اسے بلاتی تھی؟ اسے کہاں جانا تھا؟ اس کے لاشعور میں کیا رہا تھا؟

انیقہ اسے پانی پلا کر پھر سے لیٹ کر سوچنے کی تحریک کی۔ لیکن ربیعہ اب پچھلی کئی بار کی طرح نہ سو سکی۔ اب وہ سنجیدگی سے ان خوابوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ یہ تسلسل اتفاق نہیں تھا۔ کوئی واقعی اس کا منتظر تھا۔ لیکن کون؟

وہ تیزی سے ریکٹ گھماتے ہوئے اپنے پورشن کی جانب جا رہا تھا جب اس نے لان کے پچھلے حصے میں چھت کو جاتی ہوئی میڑھیوں پر کسی کو بیٹھ دیکھا۔

نافع ٹھہر گیا۔ دور سے واضح نہیں تھا لیکن سمجھ گیا کہ اس وقت اس یا سیت بھرے ماحول میں اس طرح تنہائی میں کون بیٹھ سکتا ہے۔ ایک کڑواہٹ سی اس کے حلق میں اتری تھی۔ جھٹک کر اس نے پہلے کی طرح ریکٹ گھماتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا لیکن نجانے کیا بات ہوئی۔ وہ آگے بڑھ نہ سکا۔

اس نے پھر اسی جانب دیکھا۔ چند لمے سوچا پھر اس کے قدم بے اختیار ہی میڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ وہ عریضہ ہی تھی۔ کاسنی رنگ کے لکچھے، شکن آلود لباس میں بلبوس، ٹخنوں پر تھوڑی نکا کے وہ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ نافع اس کے قریب جا رہا تھا۔ عریضہ نے سر اٹھایا، دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں پھر اس نے کسی تاثر کے بغیر واپس سر جھکا لیا۔ نافع نے دیکھا ان نگاہوں کی وہ پچھلی حقارت اور نفرت اب معدوم تھی۔ اب وہاں سنجے ہوئے چراغوں کی سی کیفیت تھی۔ نہ کوئی تاثر نہ سوچ نہ خیال۔

اس نے گہری سانس بھری پھر وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ عریضہ کے وجود میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

”عریضہ۔“ اس نے نرم لہجے میں پکارا۔

”کہو؟“ بے تاثر جواب آیا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“

”سب مسئلے ختم ہو چکے ہیں۔ اب تو ایک انتظار باقی ہے۔“

”کیسا انتظار؟“ وہ الجھا۔

اس بات کا کوئی جواب نہ آیا تھا نافع کچھ دیر خاموش رہ کر لفظوں کو ترتیب دینے لگا۔

”دیکھو عریضہ۔“ پھر وہ بولا۔ ”کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ نکالا جاسکے۔ میں جانتا ہوں۔“

جب سے ہماری منگنی ہوئی ہے تم ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گئی ہو اور جب سے نکاح ہوا ہے تب سے تو۔ تم جیسے بالکل بچھ ہی گئی ہو۔ دیکھو۔ میں ایک کھلے ذہن کا انسان ہوں۔ میں چاہتا ہوں ہر انسان کو اپنی ذاتی رائے پسند ناپسند کے مطابق فیصلے کرنے کا کلی اختیار ہو۔ میرا خیال ہے ہمارے معاملے میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اسی بات نے تمہیں ہرٹ کیا ہے غالباً شاید میں تمہارے اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو تم نے اپنے جیون ساتھی کے بارے میں اپنے ذہن میں قائم کیا تھا۔“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔ عریضہ یوں بیٹھی تھی جیسے وہ یہ سب کچھ کسی اور سے کہہ رہا ہو اور عریضہ نا۔

”ان باتوں کے متعلق ابی نہ ہو۔“

”عریضہ! اگر ایسی باتیں ہیں اور تمہاری اس کیفیت کی وجہ یہی ہے تو یقیناً مانو میں کسی جبر کسی زبردستی کا ساتھ نہیں دوں گا۔ تم میں نہ ہو لیکن مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں ایسے جبری فیصلوں کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہوں۔ قانوناً، شرعاً، تم میری بیوی ہو لیکن اگر تمہارا دل اس رشتے کو تسلیم کرنے سے شدت سے انکاری ہے تو میں اتنا ظریف رکھتا ہوں کہ تمہیں پابند رکھنے کے بجائے آزاد کروں لیکن۔ لیکن پلینرٹ ایک مرتبہ اپنے منہ سے کہہ دے کہ تم آزادی چاہتی ہو۔ یہ بند صن تمہارے لیے تکلیف دہ ہے۔ تم ایک مرتبہ کہہ دو پھر پھر وہی ہو گا تو تم باہر نکل جاؤ۔ ایک جیتے جاگتے انسان کو اس تکلیف دہ حالت میں دیکھنا، کم از کم میری برواشت کی حد سے باہر ہے۔“

”عریضہ! اگر ایسی باتیں ہیں اور تمہاری اس کیفیت کی وجہ یہی ہے تو یقیناً مانو میں کسی جبر کسی زبردستی کا ساتھ نہیں دوں گا۔“

”مجھے کسی بند صن یا آزادی سے اب فرق نہیں پڑتا نافع۔“ بالآخر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر گویا ہوئی تھی۔

”میں اب جیسی ہوں، مرتے دم تک شاید ایسی ہی رہوں گی۔ آخری دم سے بس اسی کا انتظار ہے۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔ اگر تم اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنا چاہو۔ کوئی قدم اٹھانا چاہو تو تمہیں اختیار ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے۔ میں ہمیشہ سے درست بردار ہو چکی ہوں۔“

وہ دیر سے دیر سے تپتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی۔ نافع حیرانی سے بیٹھا اس کے لفظوں پر غور کرتا رہ گیا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے مسکرا کر شیریں لہجے میں سلام کیا۔

”اول۔ والسلام۔“ انہوں نے جواب دینے کے ساتھ سر کو بھی جھکا دیا تھا۔

”آپ۔ کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے ان کے لیے کو نظر انداز کرتے ہوئے دوستانہ سے انداز میں پوچھا۔

”دور ہے ہیں اپنی جان کو۔“ وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوئیں۔ ”توڑ تھی ہڈیوں کو ٹکس رہے ہیں۔ سوچا تھا۔ سو گھر میں آئے گی تو جان کو سکھ نہییب ہوگا۔ ہم بھی تھوڑا آرام کر لیں گے۔ لیکن ہم سے بد نصیبوں کی قسمت



میں آرام ہو تب نا۔ صبح ہانڈی شام ہانڈی۔ یہی کرتے ہم چار دن بیمار ہوں گے اور خیر سے اپنی آرام گاہ کو پہنچیں گے۔ سو کوئی دوسرے مریض بنانے سے فرصت نہیں۔“

شہلا حد درجہ تجل ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر چچہ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

”آئی ایم وری سوری۔ میں کل سے ضرور کھانا پکا کر ڈیوٹی پر جاؤں گی۔ آفٹر آل یہ بھی میری ڈیوٹی ہے۔ آپ آرام کریں میں کھانا پکاتی ہوں۔“

فردوس بیگم نے ہاتھ میں پکڑا چچہ اسے دینے میں تامل نہ کیا تھا۔

”آلو ڈلیں گے گوشت میں۔ دال بھی رکھنی ہے دوسرے چوسے پر۔ میں سوچ ہی رہی تھی۔“

”میں۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔ آپ جائیں پلیز۔“ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

”اے ہاں۔ ہم بھی انسان ہیں۔ کہاں تک چپ رہتے۔“ وہ زیر لب برہماتے ہوئے باہر نکلی تھیں۔

شہلا نے نجانے کب کار کا سانس خارج کیا۔ اس نے کپڑے تبدیل کرنے کا ارادہ ترک کر کے گوشت بھوننا شروع کر دیا تھا۔

”ویسے سچ کہوں رافع! جوڑی خوب بچ رہی ہے۔“ اس کے کانوں میں ہاشم کا شرارتی لہجہ گونجا۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی گلابی کپڑوں میں ملبوس وہ بار سنگھار کے پھولوں سی لڑکی پردہ افق پر مسکرانے لگی تھی۔

رافع نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

”خدا کرے رافع! تجھے بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“ ہاشم کی ہنسی اس کے کانوں میں گونجی۔ رافع نے گہری سانس بھری۔

”ستیا ناس تیرا۔“ وہ برہم دیا۔ ”اور کوئی بدعا نہیں دے سکتا تھا ہاں!“

”میں نے تجھے بدعا نہیں بدعا دی ہے۔“ ہاشم کی ہنسی اس کے کانوں میں گونجی۔ رافع نے گہری سانس بھری۔

”ٹھیک ہی کہتے تھے تم ہاشم میاں! بدعا دی تھی تم نے مجھے میری پرسکون، مطمئن زندگی میں اضطراب کی لہریں تمہاری اس بدعا سے ہی اٹھی ہیں۔ ہم نے تمہارے لیے دعا کی ہیں اور وہ تمہیں مطمئن اور شاداب بنیٹھے ہو۔ بولو حق دوستی کس نے ادا کیا؟“

وہ اٹھ کر ٹھٹھکے لگا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ رات کی ٹھنڈی ہوا میں کھلی چست پر پہنچا رہا۔

رات پھیلی ہے تیرے سر میں آچل کی طرح

چاند نکلا ہے تجھے ڈھونڈنے پاگل کی طرح

نجانے کہاں کس نے نور جہاں کی آواز میں خوبصورت غزل لگائی ہوئی تھی۔ ہوا کے دوش پر تیرے ہوئے

ریلے لیکن اپنی آنچ میں مدھم مدھم سلکتے بول اس کی سماعتوں سے آکر اٹنے

رافع کا دل یکدم اداس ہو گیا بے طرح بے حد اداس۔ ایک عجیب تڑپ تھی جو اس کے اندر اٹھی تھی۔ اسے دیکھنے کی تڑپ۔ اسے پانے کی تڑپ۔

پھر اسے کچھ چہرے یاد آئے۔ اپنی ماں کا شگفتہ، مسکراتا چہرہ۔ اپنے باپ کا بارعب مگر پر شفقت چہرہ۔ اپنی بیوی پیمپس کا اداس مگر پر یقین چہرہ۔

وہ اتنے چروں سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ نہ صرف خود سے جھوٹ بول سکتا تھا اور اب تک بول رہا تھا لیکن شاید اب اس میں بھی ناکام ہو چلا تھا۔

”رافع! اسے اپنے باپ کے الفاظ اب تک یاد تھے۔“ تم میرے سب سے بڑے بیٹے ہو۔ میری امیدوں آرزوؤں کا مرکز۔ نجانے کیوں ہر باپ کو اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی اتنی شدید تمنا ہوتی ہے۔ تیرے تمنا پوری ہونے میں تو ابھی وقت ہے لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں بیٹا کہ اس خاندان کے افراد ایک دوسرے کی متنبو علی ہیں۔ ایک دوسرے کی طاقت، ایک دوسرے کا مان ہیں اور ہم بزرگوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طاقت میں اضافہ کریں گے، کمی نہیں۔ بیٹا! تم جوان ہو یقیناً تمہیں تمہارے فیصلے کرنے کا اختیار ہونا چاہیے لیکن اگر تم یہ اختیار اپنے والدین کو سونپ دو تو ہم مرتے دم تک تمہاری فرماں برداری پر مشکور رہیں گے۔“

”آپ جیسا کہیں بابا! اس نے سعادت مندی سے کہا تھا۔“

”بھائی صاحب کا عندیہ عریضہ کے لیے ہے اور رابعہ کا وردہ کے لیے۔ اب تم تہاؤ، تمہاری پسند کیا ہے؟“

”میری پسند نا پسند کچھ نہیں ہے بابا! میں نے کہا نا آپ کو اختیار ہے۔“

”تم کے رزق دیکھو۔“

”عریضہ تو۔“ وہ جھجکا۔ ”ابھی کافی کم عمر ہے اور قدرے نا سمجھ۔“

”ہوں! اور وردہ۔“

”وردہ فسق پاتا نہیں بابا! میں نے کبھی اس کی طرح نہیں سوچا۔ جو آپ بہتر سمجھیں۔“

”ہوں ٹھیک ہے بیٹا! اب تم جاؤ آگے سوچنا ہمارا کام ہے۔“

اور وہ مطمئن سا چلا آیا تھا۔ گزرے ہوئے سالوں میں اسے کبھی یہ باتیں یاد نہ آئی تھیں لیکن اب اکثر یاد آتی

”کبھی کبھی اس کی یاد آتی ہے۔“ وہ سوچوں کا رخ سوڑے۔ وقت اٹھے قدموں چل پڑے۔ اس کا دل اکثر یہ لہا حاصل تمنا کرنے لگا تھا۔

دیوار کے ساتھ گئے ہوئے چھوٹے گٹوں میں پانی ڈالتے ہوئے وردہ ٹھٹکی تھی۔

”تمز کی ہمارا ہی میں ایک بے حد خوبصورت چھوٹے قدم کی ماؤرن سی لڑکی اندر داخل ہوئی تھی۔“

”السلام علیکم۔“ وہ ٹھٹکی سے مسکرائی۔

وردہ اٹھ کر بڑھ آئی۔ اس سے ہاتھ ملایا۔

”ورن آئی! یہ ناعمہ کا پوچھ رہی تھیں۔“ حنزہ بولا۔ ”میں انہیں یہاں لے آیا ہوں۔“

”آپ! ناعمہ کی فرزند ہیں؟“ وردہ نے دلچسپی سے اس کا روشن چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔“ وہ ہولے سے ہنسی۔ ”میں نے انہیں کالج میں دیکھا ہے۔ ویسے میرا نام فریجہ ہے۔ آپ کی تعریف؟“

”میں ورن ہوں۔ ناعمہ کی بڑی بہن۔“

”اے ناعمہ گھر پر ہیں؟“

اسی لمحے کمرے سے کوئی گانا تیز سروں میں گنگنائی بے فکر ناعمہ باہر نکلی تھی۔

باقی حصہ شمارے میں

منور امین کی سخت باتیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن تراز اس کی ایک نہیں سنتی۔ جس پر ربیعہ کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ ربیعہ کا سبار کے گھر میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ منزہ بیگم ربیعہ کو اپنی بیٹی بنا لیتی ہیں۔ ہاشم اور شہلا کی شادی کی تقریب میں ہی رافع اور عریشہ کا نکاح پڑھا دیا جاتا ہے جس پر عریشہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔ شادی کی اولین رات ابرار جیلانی کا فون شہلا کو پریشان کر دیتا ہے۔ شہلا شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس کی ملاقات ابرار سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم شہلا کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔ فراز خود حقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عریشہ کے لیے فراز کی آمد پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فراز یہی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔ رافع کو ربیعہ میں اپنے آئینہ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا علم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔ لڑا عاشر کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے عاشر اسے لینے ایئر پورٹ جاتا ہے۔ ایقان عاشر کے پراسرار رویے پر مشکوک ہو جاتی ہے۔

شہلا سب کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا سرد رویہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے دلا سارے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شہلا ربیعہ کے ساتھ رابعہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ سب ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ وردہ کے مشورے سے ایم ایس سوسائٹی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ عاشر لڑا سے ملنے ہوئے آتا ہے تو لڑا اسے پرپوز کرتی ہے۔ عاشر لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا رومال ایقان کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشر سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشر بوکھلاہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان حقیقتاً ”صدے“ لگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ وردہ سے ملنے اس کے گھر آتی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ وردہ کی مگنی رافع سے ہو چکی ہے۔ عاشر اسے صدے سے دوچار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے جلد بلدی ہیں لگیا گیا ہے۔ وہ وردہ کے لئے اپنے دل میں خاص جذبات محسوس نہیں کرتا۔

۲۵

### پچیسویں قسط

فریحہ نے بے حد اشتیاق سے بھولے چہرے والی ناعمہ کو دیکھا تھا۔ وردہ جو فریحہ کو بغور دیکھ رہی تھی ان نگاہوں کی معنویت پر قدرے چونک سی گئی تھی۔ ناعمہ بھی ایک اجنبی مگر خوبصورت اور خوش لباس لڑکی کو گھر میں دیکھ کر تسکلی۔

”ناعمہ! یہ فریحہ ہیں۔ تم سے ملنے آئی ہیں۔“ وردہ نے نرم لہجے میں کہا۔

ناعمہ نے ایک مرتبہ پھر گڑبڑا کر ان دونوں کو دیکھا۔ ”مجھے سننے لگے؟“ وہ حیرانی سے ناک چڑھا کر بولی۔

فریحہ کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ وردہ قدرے بھنائی تھی۔

”آئیں فریحہ!“ وہ خود ہی بولی تھی۔ ”اندر چل کر آرام سے بیٹھتے ہیں۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔“

فریحہ نے ہنوز مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وردہ آگے بڑھی تو فریحہ بھی اس کی ہمراہی میں قدم بڑھانے لگی۔ ناعمہ پہلے تو ہونقوں کی مانند کھڑی رہ گئی پھر کچھ خیال آنے پر وہ بھی تیزی سے ڈرائنگ روم کی سمت بڑھی تھی۔

”کیا ایس گی آپ؟“ وردہ نے شائستہ انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ”کو لد ڈرائنگ یا پھر چائے؟“

”میں جائے شوق سے پتی ہوں۔“ وہ بات بے بات مسکراتے اچھی لگتی تھی۔  
 ”آپ ناعمہ سے باتیں کریں، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ ورنہ وہاں سے اٹھ گئی۔  
 اس کے جانے کے بعد فریحہ ناعمہ کی جانب متوجہ ہو گئی جو خود بھی اسے دھیان سے دیکھ رہی تھی۔  
 ”تو آپ ہیں ناعمہ!“

”جی ہاں۔ میں ہی ناعمہ ہوں۔ آپ مجھے کس حوالے سے جانتی ہیں؟“ وہ قدرے حیرانی میں مبتلا تھی۔  
 ”ہے ایک حوالہ۔“ وہ کھل کر مسکرائی۔ ”پھر بتاؤں گی۔“  
 ”آپ مجھ سے ملنے ہی آئی ہیں؟“ ناعمہ کو یقین نہ تھا۔  
 ”یہی سمجھ لیں۔“ وہ مختصراً بولی۔ ”کون کون ہوتا ہے آپ کے گھر میں؟“

”یہ میرے نانا ابو مرحوم کا بنگلہ ہے۔“ ناعمہ اسے بتانے لگی۔ ”یہاں ہم لوگ علیحدہ علیحدہ پورشنز میں آباد ہیں۔ دو پورشنز میں ہمارے دو ماموں اور ان کی لمبلیز ہیں۔ یہاں امی، میں اور وردہ آئی ہو جتے ہیں۔ بروہی، بہن کی شادی ہو چکی ہے۔“  
 ”آپ کے والد؟“

”ہمارے بچپن میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔“

”اوسہ بی سوری۔“ فریحہ بولی۔

”اور آپ؟“ ناعمہ اب تک اچھی ہوئی تھی۔ ”آپ بھی کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟“

فریحہ نے اچانک ہی اپنا پرس کھول کر ایک تصویر برآمد کی۔ وہ تصویر ناعمہ کی آنکھوں کے سامنے کی تھی۔

”میں ان کی بہن ہوں۔ انہیں جانتی ہیں نا آپ؟“

ناعمہ نے فراز کی تصویر دیکھی۔ کئی مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ اس کے چہرے کا رنگ واضح طور پر بدلا تھا۔

فریحہ نے تصویر واپس پرس میں ڈال لی۔

”فراز بھائی اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں، اسی لیے مجھے آپ سے ملنے کا شوق تھا۔ میں اسی شوق کے تحت میں یہاں چلی آئی۔“

ناعمہ گم صدمہ سی ہو گئی تھی۔ دو دو اناہ سال کا جو چند ایک مرتبہ اس سے ٹکرایا تھا، وہ بظاہر اس کا ذکر کیوں کرتا تھا؟ اور فریحہ کے ”یونی“ چلے آنے کے پیچھے کیا عندیہ پوشیدہ تھا؟ اس کا دماغ الجھ سا گیا۔

”تم پریشان کیوں ہو گئی ہو ناعمہ؟“ فریحہ نے اس کا چہرہ دیکھا تو اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں بولی۔  
 ”میں یہاں شہس پریشان کرنے تو نہیں آئی۔“

ناعمہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اسی لمحے وردہ چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی تو فریحہ اطمینان سے صوفے سے ٹیکہ لگا کر بیٹھ گئی۔ وردہ چائے بنانے لگی۔ اسی اثناء میں رابعہ بیگم بھی وہاں چلی آئیں۔

”السلام علیکم۔“ فریحہ انہیں دیکھ کر غظیماً اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”و علیکم السلام۔ جیتی آرہو۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”پرہت ہو ناعمہ کے ساتھ؟“

”جی؟“ وہ لمحہ بھر کور کی۔ ”یونی سمجھ لیں آئی!“

ناعمہ نجائے کیوں اس ساری صورت حال سے ہراساں سی ہو رہی تھی۔ رابعہ بیگم کے وہاں بیٹھتے ہی وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ فریحہ کی آمد کا مقصد کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا لیکن اس کا معنی خیر سا انداز اسے ابھار رہا تھا۔  
 ”میں نے ناعمہ کو شہلا آلی کی شادی میں دیکھا تھا۔“ فریحہ رابعہ بیگم کو بتا رہی تھی۔ ”میرے بڑے بھائی فراز احمد، عباد بھائی کے بہت اچھے جگر دوست ہیں۔ اسی حوالے سے ہم ان لوگوں کو جانتے ہیں۔“

”اچھا اچھا۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔  
 ”ناعمہ مجھے اچھی لگی۔ اسی لیے میں آج آپ لوگوں سے ملنے چلی آئی۔“ وہ ایک پس کھاتے ہوئے کہہ

رہی تھی۔  
 رابعہ بیگم اور وردہ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔ دونوں کی نگاہوں میں خوشی کی کیفیت تھی۔ فریحہ کو دیکھ کر اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کا بخولی اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

”بھریج، تم لوگ یہاں کی بچھوٹے بچھوٹے معنی خیز جملوں میں اپنا مدعا بیان کرتی رہی تھی۔“  
 ”اے گھر والوں کو کچھ بتاؤ!“

اس کے اٹھنے پر رابعہ بیگم نے عجیبے حد خوشی اور شوق سے کہا تھا۔  
 ”ضرور آئی، اب تو آنا جانا رہے گا۔“ مسکرائی تھی۔

”مما۔“ مومن نے ایتقان کا شانہ بلایا۔  
 ”مما، آپ کو کچھ بتاؤں؟“ مومن کی جانب سے کہا۔

”مما، آپ کو کیا بتاؤں؟“ وہ اس کی آنکھوں کو فوراً دیکھ رہا تھا۔ ایتقان نے گہری سانس بھر کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

”مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جانو۔ ہمیں بروہی سے اس لیے۔“  
 ”آپ بھاتے ناراض ہیں؟ انہوں نے رات آپ کو اتنی آوازیں دیں۔ آپ نے بیڈروم کا دروازہ کیوں نہیں کھولا؟“

ایتقان چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی پھر اس نے اس کے ماتھے سے بال ہٹائے۔ ”آپ نے ہوم ورک کیا؟“

”نہیں کروں۔“ وہ بولی۔ ”آپ کو بتا رہے ہیں اکیلا ہوم ورک نہیں کر سکتا۔ لیکن پہلے کھانا تو دیں مجھے اتنی بھوک لگی ہوئی ہے۔ آپ نے آج کھانا نہیں پکایا ممما؟“

چند آنسو ایتقان کے اندر گرے۔ اس نے مومن کو سینے سے لگا لیا۔  
 ”میں آنے بتایا تھا۔ آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے۔ ایمان سوری ہے اب تک؟“

”وہ تو سوری ہے ممما۔ لیکن مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“  
 ”چلو میں آپ کو برگر بنا دوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ مجھے آپ چکن ڈال کر نوڈلز بنادیں۔“ اس کے چہرے پر چمک آئی۔  
 ”اچھا۔ بنادیتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ اس کے سر میں درد سے دھماکے سے ہو رہے تھے۔ پچھلے چند روزہ تینوں سے اس نے اپنی کاغذوں تک حلق سے نہ اتارا تھا۔ ناشر نے پہلے اس سے بات کرنے کی بہتری کی کوشش کی تھی پھر وہ اسے

پانی کا گھونٹ تک حلق سے نہ اتارا تھا۔ ناشر نے پہلے اس سے بات کرنے کی بہتری کی کوشش کی تھی پھر وہ اسے

قرآن حکیم کی متعدد آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی روایتی معلومات میں اضافے اور مطلع کرنے کے لیے شامل کی جاتی ہیں۔  
ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق سب سے آخری سے محفوظ رکھیں۔

”آئی۔ آئی۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟“ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔  
”درد۔ درد۔ یہ ہے ربیعہ!“ وہ روڑے کو تھیں۔

شہر سے ان کا جہاز روانہ ہوا تھا۔ ان کے گھر کے حلقوں میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”میرے بچے میری بچی نہ! منہ زور دیکھ کر بڑے لڑکے تھیں۔“ میری بچی کو بلا دے۔“

”لوہ“ ربیعہ کی عقلی گویا ٹھکانے پر آئی۔

شہلا باہم پھل جانے کے لیے تیاری کے پندرہویں مراحل میں تھی جب اس کے موبائل کی سیپ بجی۔ غجلت میں  
 مائی برنازک کی سلور ریسٹو اور چھانڈتے ہوئے وہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل تک آئی۔

اسکریں پر روشن نہیں کیجئے۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔  
 ”ہاں، اے اے سرے جانب سے منیوہ جیم کی آواز کی توقع تھی۔  
 ”شہلا آئی۔! میں ربیعہ۔ آپ۔ آپ جلدی سے یہاں آئیں۔ آئی کی طبیعت بہت خراب ہے۔“  
 بیہ کانداز ہی نہیں الفاظ بھی ایسے تھے کہ شہلا کا وجود کانپ کر رہ گیا۔

”کیا کیا ہوا امی کو؟“ نہ بکلائی۔  
 ”جتنے نہیں بتا۔ بس آپ جلدی آئیں۔“ وہ روہنے کو تھکی۔  
 شہلا پلیٹ کردروازے کی طرف بھاگی۔ لکھ بھر میں وہ مرکزی گیٹ پر تھی۔ سامنے ہی ارفع اپنی بانٹیک اشارے  
 کر رہا تھا۔ شہلا تیزی سے لپکی۔

”نوافل! رافع پلینز۔ مجھے امی کے گھر لے چلو۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔“  
 ”کیا بوا بچا بھی۔!“ وہ بھی گھبرا گیا۔ ”ایسا کیا ہو گیا؟“  
 ”پتا نہیں۔ بس تم جلد ہی چلو۔“ وہ اس کے پیچھے بٹھتے ہوئے بولی۔  
 رافع نے بانٹک دوڑادی تھی۔

مومن کو نوڈلز کا پیالہ دے کر وہ فریق سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لے کر پھر کمرے میں چلی آئی۔ گھونٹ گھونٹ ٹھنڈا پانی اپنے اندر امارتے ہوئے اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اُسے کیا کرنا چاہیے؟ عاشر کو معاف کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ عاشر نے اس کے اعتماد کو بے حد ٹھیس پہنچائی تھی۔ اور بات صرف اعتماد کی کب تھی؟ یہاں تو محبت جیسی شے داؤ پر لگی ہوئی تھی جس کے پیچھے وہ آنکھیں بند کیے اتنے سالوں سے چلتی چلی جا رہی تھی۔

ایقان کی نگاہوں میں گزشتہ زندگی کے سارے مناظر ایک ریل کی مانند چل رہے تھے۔ وہ کالج کا خوبصورت زمانہ، شہلا اور اس کی بے مثال دوستی کے دن۔ پھر شہلا کو ابراہار اور اسے عاشق مل گیا تھا۔ ~~وہ دن سیکیٹیوں کے~~ ایک ساتھ ہی زندگی کے نئے دور کا آغاز کیا تھا۔

ایقان اس حساب سے خوش قسمت نکلی تھی کہ اس کی محبت کو کسی بڑی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ عاشق کا رشتہ آنے پر جب گھروالوں کو اس کی عاشق کے ساتھ انوالی منع کیا گیا تو اس کا حکم ہوا تب اماں اور بھائیوں کی پیشانیوں پر بل ضرور پڑے تھے لیکن کسی نے بھی ان دونوں کے مابین آگے کی کوشش نہ کی تھی، سوائے فردوس بیگم کے جو اس کی شادی اختر میاں سے کرنے کی خواہش مند تھیں لیکن گھروالوں نے ایقان کی خواہش کو مقدم جانتے ہوئے عاشق کا رشتہ قبول کر لیا تھا۔

عاشق ایک خوب رو، متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا لڑکا تھا۔ اس نے اپنے خوابوں میں جیسے دلا بھولا بھولا تھا، اسی طرح اس کی صورت بہت سے خوبصورت خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ لیکن اس کے خوابوں کا ایک بڑا حصہ حصول آسائش و ثروت سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے آگے سے آگے بڑھنے کی جستجو تھی۔ سو اقبال کے بہت روکنے پر بھی وہ خود کو آگے جانے سے نہ روک سکا۔ شادی کے ابتدائی چند سالوں میں ہی وہ بے چین رہا۔ اگر کچھ بننا ہے تو جدائی کے سمندر کو پار کرنا پڑے گا۔ سو وہ کوشش پیہم میں مصروف رہا اور ایک دن اسے سالوں کا سفر سنا کر جا آئے۔

ایقان محبت کے پانی کی پھلی تھی۔ اس کی زندگی میں سب کچھ محبت سے ہی عبادت تھا لیکن محبت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر نہایت متضاد صورت میں انا اور خود پسندی کا جذبہ بھی ایسی شدت کے ساتھ موجود تھا کہ وہ ایک وقت محب اور محبوب دونوں بننا چاہتی تھی۔ وہ محبت میں پوجا کی قائل نہ تھی۔ کچھ وہ کچھ لو کا اصول اس کے اندر پورے توازن کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اتنے سالوں بعد اچانک یہ توازن اس طرح بگڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود کو مچھلی کی صورت تالاب سے باہر بڑا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ ایک تڑپ تھی جو عضو عضو کو کرب میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس نے عاشق کو اتنا چاہا تھا کہ اس کی بے وفائی کا خیال اس کی رگ جال کو خنجر کی مانند کاٹ رہا تھا اور اتنا تڑپ رہی تھی کچھ گزر نے کا خیال اتنا ہی قوی ہوتا جا رہا تھا۔

۱۔ پلاؤ کو دوم دے کر بریعدہ سلا دینا نے کے لیے فرق سے سبزیاں نکال رہی تھی۔ جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اس سے آواز دے رہا ہے۔

چند منٹوں میں وہ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے۔ منیوہ بیگم کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔  
 نے انہیں سلام کیا۔ وہ پیستہ پیستہ ہو رہی تھی۔

شہلا نے اپنا فرسٹ ایڈ باکس منگوایا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اس نے انہیں فوری طور پر اڑا  
 کرنے والی بین کمر ٹیلٹ دی پھر سیڈ پر کچھ لکھنے لگی۔

”رافع۔ پلینز انجکشن لاؤ۔ اگر امی کو آرام نہ آیا تو میں انہیں انجکشن بھی دے دیتی ہوں۔“

”ضرور۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لیکن آئی کو ہوا کیا ہے؟“

”میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ٹیسٹ وغیرہ کروانے کے بعد ہی کوئی حتمی رائے دی جاسکتی ہے۔ شاید اینڈ کرس  
 ہو۔ لیکن اینڈ کس لگتا نہیں ہے۔“

وہ منیوہ بیگم کے چہرے پر سے بال ہٹاتے ہوئے بولی۔ رافع فوری طور پر نسخہ لے کر باہر نکل گیا تھا۔

”انیقہ؟“ شہلا نے سوالیہ نظروں سے ربیعہ کو دیکھا۔ ”کوئی نہیں اب شک؟“

”نہیں۔“ ربیعہ نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ ”لیکن اب آئی ہی ہوگی۔ عمر کے آنے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔“

عمر کے ذکر پر شہلا کے چہرے کے تناؤ میں قدرے کمی آئی تھی۔ وہ پھر منیوہ بیگم کو دیکھنے لگی جو اب آہستہ  
 آہستہ کراہ رہی تھیں۔ ان کے درد میں کافی کمی واقع ہوئی تھی۔ شہلا کافی متفکر انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

”شہلا آئی۔ آئی کو پہلے کبھی ایسا درد اٹھا ہے؟“ ربیعہ ان کا ہاتھ دباستے ہوئے پوچھنے لگی۔

”نہیں۔“ وہ کچھ پوچھنے لگی۔ ”کبھی کبھار ہلکے پھلکے سے درد کی شکایت کرتی تھیں۔ ہاتھ کی دوائیاں بھی

اکثر استعمال کرتی ہیں لیکن اتنا شدید درد۔ کبھی نہیں ہوا۔“

”آئی کا مکمل چیک آپ کروانا چاہیے نا؟“

”ہاں ربیعہ۔ میں انہیں بائیس دن کے اندر جانے دوں گی۔“

رافع ہوسٹل سے دروازہ بجا کر اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں شاپر تھا جو اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”بہت شکریہ رافع۔“ شہلا نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ ”میں تمہیں پیسے دینا بھی بھول گئی۔“

”بھابھی۔!“ وہ شگاہی ہوا۔ ”کیسی غیروں جیسی باتیں کرتی ہیں۔ آئی میرے لیے بھی ناں جیسی ہیں اب ان کی

طبیعت کیسی ہے؟“

”آرام آگیا ہے۔ لیکن کل میں ان کا مکمل چیک آپ کرواؤں گی۔“

”یہ بہت ضروری ہے۔“ پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ ”میں اب چلوں بھابھی؟“

”چائے پیتے جاؤ۔“ شہلا نے ربیعہ کو دیکھا۔

وہ جلدی سے گھڑی ہولی تھی۔ رافع نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”نہیں ربیعہ! پلینز میں چلوں گا۔ آپ ٹکلفٹ میں نہ پریں۔“

”ٹکلفٹ کیسا۔ چائے بننے میں بھلا کتنا وقت لگتا ہے؟“

رافع نے لمحہ بھر کے لیے نگاہ اٹھائی پھر بے بسی سے اُدھر اُدھر دیکھا۔

”بیٹھ جائیں نا پلینز میں صرف پانچ منٹ میں چائے بنا لیتی ہوں۔“ وہ شگفتگی سے مسکرائی۔ رافع کسی معمول

کی مانند کرسی پر بیٹھ گیا۔



”امی۔ امی جی۔ کیا ہو گیا تھا آپ کو۔“ ”انیقہ“ منیوہ بیگم کی گود میں منہ چھپائے منمنارہی تھی۔ انہوں نے



مسکراتے ہوئے اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”کچھ بھی نہیں۔ تم لوگ یونہی پریشان ہو رہی ہو۔ پرسوں میں نے بواکل اندھا کھالیا تھا اور تم جانتی ہو اندھا کچھ موافق نہیں آتا۔ پرسوں سے ہی ہلکا ہلکا سا درد تھا۔ کل وہی درد برہہ گیا۔ بد بھمی ہو گئی تھی اور کچھ بھی نہیں۔“

”درد ڈاکٹر کی موجودگی میں آپ کی اپنی رائے کا وزن کچھ بھی نہیں ہے امی جان!“ شہلا مصنوعی خفگی سے بولی۔ ”یہ معاملہ آپ ہم پر چھوڑ دیں ہم خود تحقیق کریں گے مرض کی۔ آپ کل میرے ساتھ ہاسپٹل چل رہی ہیں۔“

”اچھی ڈاکٹر ہو تم دونوں۔“ وہ ہنس دیا۔ ”مریض خود بتا رہا ہے اپنے مرض کے بارے میں اور تمہیں کچھ بتائی نہیں چل رہا۔ میسٹروں پر دارودار ہے تشخیص کا۔ ایک زمانہ تھا کہ ڈاکٹر اور حکیم نبض پکڑتے ہی مرض پکڑ لیا کرتے تھے۔“

شہلا اور انیقہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے لگیں۔

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ انیقہ نے تائید کی تھی۔ ”جیسے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی بڑھتی جا رہی ہے انسانوں کی اپنی قابلیت گھٹتی جا رہی ہے۔ آج کا ڈاکٹر جب تک دس میسٹروں کو اپنے لئے نسخہ تجویز نہیں کرتا۔“

”ہاں تو اپنے پاس ہی رکھو اپنی ڈاکٹری کو۔“ انیقہ نے ان سے پیار سے ہونے بولی تھیں۔ ”میں اپنا نسخہ خود تجویز کر چکی ہوں۔“

”وہ کیا؟“ وہ دونوں ایک ساتھ بولیں۔

”آئندہ میں اندھا نہیں کھاؤں گی۔“

شہلا اور انیقہ نے برا سامنہ بنایا تھا جبکہ ریحہ کی ہنسی اٹھ گئی تھی۔

ورد کافی پر جوش سے انداز میں ماں کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ رابعہ بیگم نے کروٹھیے کی بیل بناتے بناتے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر مسکرا دیں۔

”امی جی! آپ کا کیا خیال ہے؟“ ورد نے مدھم مدھم سی آواز میں پوچھا۔

”کس بارے میں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”افو۔ اسی لڑکی فریحہ کے متعلق۔“ اس نے اصرار سے دیکھ کر ناعمہ کے موجودہ نام پر ہونے کا یقین کیا۔

”ہول۔ لڑکی تو اچھی ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولیں۔

”امی جی! اس کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ کسی بہت اونچے اور شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ ہے نا؟“

رابعہ بیگم نے کروٹھیہ اور دھا کا ایک طرف رکھ دیا اور قدرے سنجیدہ سی ہوئیں۔

”لیکن درد۔ اپنی ناعمہ تو بہت بوگٹی سی ہے ابھی۔ مجھے تو رہ رہ کر یہی خیال آ رہا ہے کہ مجھے ناعمہ کا رشتہ خاندان میں ہی کرنا چاہیے۔ اپنے پھر اپنے ہی ہوتے ہیں۔“

”لیکن اپنے خاندان میں اب ہے کون؟“ وہ قدرے جڑی گئی۔ ”اور جب سے نافع اور عیشہ کا نکاح ہوا ہے، تب سے میں خاندان میں رشتہ ہونے سے خوف سا کھانے لگی ہوں۔ نجانے کیا بات ہے جو ان لوگوں کی خوشیوں کو کٹن سا لگ گیا ہے۔ آج کل کے لڑکے لڑکیاں کون سی ماورائی دنیا میں رہنے لگے ہیں جو حقیقتوں کو قبول ہی نہیں کر پاتے۔ خیرو یہ تو ایک بے حتی سی گفتگو ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر وہ لوگ ناعمہ کا رشتہ لے آتے ہیں جو کہ ایک لازمی بات ہے تو پھر ہمارا جواب کیا ہو گا؟“

رابعہ بیگم کے چہرے پر تفکرات کے سائے پھیلے۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو درد۔ اچانک کیوں مجھے بھی وہم سے نے لگے ہیں۔ رافع۔ یوں تو ہر لحاظ سے بہت ہی اچھا لڑکا ہے لیکن۔ لیکن تمہاری طرف سے وہ کچھ زیادہ ہی بے نیاز لگتا ہے۔ جیسے جیسے اسے اس رشتے کی اہمیت کا احساس ہی نہ ہو۔“

”افو۔“ ورد نے سر ہی پیٹ لیا۔ ”امی جی! یہ تو سوال گندم جو اب چناؤالی مثال ہوئی۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں؟“

”آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں اپنی نہیں ناعمہ کی بات کر رہی ہوں۔“

”ناعمہ سے زیادہ اب مجھے تمہاری فکر ہے ورد۔“ انہوں نے گہری سانس بھری۔ ”ناعمہ کا رشتہ طے ہو جانے کے بعد اگر انہوں نے فوری شادی کی فرمائش کی تو میں کیا جواب دوں گی؟“

”تو کیا؟ ہم ناعمہ کی شادی کر دیں گے۔“ وہ مزے سے بولی۔ ”پھر میں اور آپ عیش کریں گے یہاں۔ وہ مولیٰ پھری بتائی ہوئی ساری چیزیں کھا جاتی ہے۔ تنگ کیا ہوا ہے اس نے مجھے۔“

رابعہ بیگم ہولے سے مسکرا دیں۔

”نجانے کیا بات ہو رہی ہے ورد! اصل بات یہی ہے کہ عذرا بیٹھی ابھی رافع کی شادی کی بات نہیں کریں گی۔“

”نہ اور سرد رہی ابھی نہیں بات نہیں چلی۔“ نجانے انہوں نے تمہیں کتنے سال پونسی بٹھا کر رکھا ہے۔“

”تو آپ کو کاہے کی فکر ہے؟“ انہوں نے لاڈ سے ان کے گلے میں بانٹیں ڈالیں۔ ”میں تو خود بیٹیں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ ساری عمر۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”اچھی بات ہے نکالتے ہیں بیٹا! مائیں بیٹیوں کو ان کے گھروں میں بستا دیکھ کر خوش ہوتی ہیں اپنے ساتھ رکھ کر نہیں۔“

”اچھا! پھر اس بات کو۔ میں تو ناعمہ کی بات کر رہی تھی۔“

”وہ کچھ بولیں جو انہیں کانا ہے۔“ انہوں نے سالمہ کی بھڑکی۔ ”اگر اس کا نصیب اسی گھر میں جڑنا لکھا ہے تو ایسا ہی ہو گا لیکن سچی بات تو یہ ہے جتنا کہ رشتہ دیشہ اپنے جیسوں میں ہی کرنا چاہیے۔ وہ بہت اونچے لوگ لگتے ہیں۔“

”تو کیا ہوا۔ ہماری ناعمہ کسی سے کم ہے کیا؟ کم از کم اس کا داغ تو بہت ہی اونچا ہے۔“ وہ شرارت سے ہنس دی تھی۔

باشم بنیزہ بیگم کی مزاج پر جوشی کے لیے آیا تھا۔ کافی دیر سے وہ ان کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

”یہ لڑکی تو اچھی ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولیں۔

”امی جی! اس کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ کسی بہت اونچے اور شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ ہے نا؟“

رابعہ بیگم نے کروٹھیہ اور دھا کا ایک طرف رکھ دیا اور قدرے سنجیدہ سی ہوئیں۔

”لیکن درد۔ اپنی ناعمہ تو بہت بوگٹی سی ہے ابھی۔ مجھے تو رہ رہ کر یہی خیال آ رہا ہے کہ مجھے ناعمہ کا رشتہ خاندان میں ہی کرنا چاہیے۔ اپنے پھر اپنے ہی ہوتے ہیں۔“

”لیکن اپنے خاندان میں اب ہے کون؟“ وہ قدرے جڑی گئی۔ ”اور جب سے نافع اور عیشہ کا نکاح ہوا ہے، تب سے میں خاندان میں رشتہ ہونے سے خوف سا کھانے لگی ہوں۔ نجانے کیا بات ہے جو ان لوگوں کی خوشیوں کو کٹن سا لگ گیا ہے۔ آج کل کے لڑکے لڑکیاں کون سی ماورائی دنیا میں رہنے لگے ہیں جو حقیقتوں کو قبول ہی نہیں کر پاتے۔ خیرو یہ تو ایک بے حتی سی گفتگو ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر وہ لوگ ناعمہ کا رشتہ لے آتے ہیں جو کہ ایک لازمی بات ہے تو پھر ہمارا جواب کیا ہو گا؟“

باشم نے بے حد پر شوق انداز میں شہلا کو دیکھا تھا۔ اس کا خفا خفا سا انداز اسے بہت دلچسپ لگا۔ اسی لئے شہلا نے بھی نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور پرل سی ہو گئی۔

”گھر چلیں جناب؟“ وہ بٹناشت سے پوچھنے لگا۔

شہلا نے نگاہ اٹھا کر گہری میں غم نہ لگایا۔ نجانے کیا بات تھی اس کا ”حیات ولا“ میں دل لگ کر نہ دیتا تھا۔

یہاں آکر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی گم گشتہ جنت میں چلی آئی ہو۔

باشم نے اپنے سوال کے جواب میں اس کے بدلتے ہوئے تاثرات کو بے حد دھیان سے دیکھا۔ اسے احرار ہوا تھا کہ شہلا کا وہاں سے جانے کا موڈ نہیں ہے۔  
 ”میں چلوں پھر؟“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔  
 شہلا چونکی تھی۔ اس نے باشم کا سوال یاد کیا پھر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”میں بھی چل رہی ہوں آپ اس کے ہی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں کیا؟“  
 باشم ذرا سا مسکرایا ”لگ رہا تھا کہ اکیلے ہی جانا پڑے گا۔ چھٹی جس الارم بج رہی تھی۔“  
 ”ہیسے تو آپ کی چھٹی جس کا علاج کر دوں۔“ صحیح صحیح کام نہیں کر رہی یہ۔“ وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

باشم ایک مرتبہ پھر اسے غور سے دیکھنے اور مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ شہلا کے انداز میں جیون ساتھی والا رنگ ابھرنے لگے تھے۔ اس کی روز اول والی اجنبیت میں کمی آتی جا رہی تھی۔  
 ”اچھا ای جی۔! میں اب چلتی ہوں۔ کل آپ سے ملنے آؤں گی۔“ وہ اناٹا مہرے سے لگے ہوئے کانٹے میں سے آئی اور ربیعہ کو بھی یاد دہانی کرائی ہے۔  
 ”تم بے فکر ہو کر جاؤ۔“ وہ بھی مسکرائیں۔ ”ربیعہ تو میرے منہ منہ کا حساب رکھتی ہے۔ وقت پر کھا

وقت پر دو الی۔ بیٹیوں سے بڑھ کر ہو گئی ہے میرے لیے۔“  
 اندر داخل ہوتی ربیعہ نے ان کے جملے سنے۔ اس کی دھج دھج پھلکی ہو کر مسکرانے لگی جیسے ہر ریاضت کا عمل پالیا ہو۔ شہلا نے بھی اس کا پھر بہت محبت سے دیکھا تھا۔  
 ربیعہ کی ہم راہی میں اندر آتا عمر بھاگ کر شہلا سے مل گیا تھا۔  
 ”ماما۔! آپ جا رہی ہیں پھر۔“  
 ”عمر۔“ ربیعہ نے اسے پکارا۔  
 ”نہیں۔“ وہ ضدی پن سے بولا۔ ”میں آج ماما کے ساتھ جاؤں گا۔ میں بہت دنوں سے ماما کے ساتھ نہیں

سو یا۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔“  
 ”جھوٹے“ ربیعہ نے اسے ایک چیت لگائی۔ ”روزانہ میں نہیں کہانی سناتی ہوں اور تم کہانی ختم ہونے سے پہلے ہی سو جاتے ہو؟“  
 ”تو میں کیا کروں۔ آپ کی کہانی اتنی لمبی ہوتی ہے۔ پورنگ ہونے لگتی ہے تو میں سو جاتا ہوں۔“ عمر کی بات پر سب ہنس دیے۔  
 ”ربیعہ! اس کے کپڑے اور یونیفارم وغیرہ رکھ دو۔“ شہلا نے محبت سے اس کا سر ہلایا۔ ”میں اسے اپنے

ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔“  
 ”ہرے۔“ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔  
 ماں بیٹے کی خوشی دیکھ کر پھر کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا تھا۔

اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو  
 اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو

باشم اس کی بات پر دھیرے سے ہنس پڑا۔  
 ”کیوں؟ شادی محبت کا انتقام ہے۔“ جیسے ناٹانی جملے پر تیرا یقین ہے کیا؟“  
 ”نہیں۔“ رافع بھی مسکرا دیا۔ ”میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر محبت میں جدائی رت جگے دیتی ہے تو محبتوں کی قربت تو مدہوشی عطا کرتی ہے۔ یہاں دیرانے میں تو ہم سے الٹو بھلے لگتے ہیں۔“  
 باشم زور سے ہنس پھر دفعتاً خاموش ہو گیا۔  
 ”یار رافع۔!؟“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”یہ دن دے محبت کا فارمولا کیسا ہے؟ کیا کہتا ہے تو اس بارے میں؟ دن دے محبت کی قربت کتنی دیر مدہوش رکھ سکتی ہے بندے کو؟“  
 رافع چونک سا گیا۔ باشم کے لہجے میں کچھ تھا۔  
 ”ڈاکٹر صاحبہ سے کوئی شکایت؟“ اس نے محتاط سا ہو کر پوچھا۔

اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو  
 اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو

اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو  
 اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو

آپ کے سچے دوست  
 لفظ کے سچے دوست  
 ”پیار“ بھی بے ”ریا“ نہیں  
 اپنی گھرائیوں میں خدا نہیں  
 بت کدوں میں خدا نہیں

رافع ”حیات ولا“ کے پچھلے بڑے لان میں ٹھل رہا تھا۔ دماغ پر نجانے کیوں ایک پڑا بوجھ دھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ اس بوجھ کو خود پر سے اتار کر پھینک دینا چاہتا تھا لیکن کسی طور کا میابی نہ ہوتی تھی۔ ایسے عالم میں لفظ سے لفظ جڑا گیا۔ خیال سے خیال بننا گیا اور غرل ہوئی گئی۔  
 وہ گھاس پھوس سے بھرے ہوئے حوض کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن نجانے کیوں اسے

وقت بیکہ بیکہ سگریٹ کی طلب ہونے لگی تھی۔ ذہن میں بھرا ہوا دھواں کسی بہانے نکالنے کا جی چاہنے لگا تھا۔  
 نجانے وہ آسانی رنگ آٹا کیوں پہنتی ہے؟ شاید اسے علم ہے کہ آسانی رنگ اس کی صبح رنگت پر بہت چٹا ہے۔  
 اس رنگ میں اس کی سیاہ آنکھوں کی پچک اور سیاہی مزید بڑھ جاتی ہے۔ شکر فی لبوں کی مسکان اور پھلی معلوم ہوتی

لیکن نہیں۔ وہ تو خود سے اتنی بے نیاز محسوس ہوتی ہے، جتنی باقی دنیا سے۔ اس کا دھیان تو نجانے کہاں رہتا ہے، بادلوں پر۔ چاند کی چاندنی پر۔ ان بنی دنیا میں۔ پڑیوں کی گمری میں۔ شاید وہ خود بھی وہیں سے آئی ہے۔ وہ

کسی نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ رافع پچھل ہی پڑا پھر اس نے باشم کے مخصوص ”Gucci“ کی خوشبو محسوس کی۔ وہ اس کے برابر حوض کی منڈیر پر بیٹھ گیا تھا۔  
 ”تو یہ ملے ہے کہ تو اس سے محبت کر رہا ہے۔ تیرے رت جگے بتا رہے ہیں۔“  
 رافع خاموشی سے بیٹھا رہا۔ باشم نے اس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی لیکن رات کافی سیاہ تھی۔  
 ”تو کیوں جاگ رہا ہے؟“ رافع نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔ ”اگر محبت ہی جگاتی ہے تو اب تو تجھے سونا

باشم اس کی بات پر دھیرے سے ہنس پڑا۔  
 ”کیوں؟ شادی محبت کا انتقام ہے۔“ جیسے ناٹانی جملے پر تیرا یقین ہے کیا؟“  
 ”نہیں۔“ رافع بھی مسکرا دیا۔ ”میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر محبت میں جدائی رت جگے دیتی ہے تو محبتوں کی قربت تو مدہوشی عطا کرتی ہے۔ یہاں دیرانے میں تو ہم سے الٹو بھلے لگتے ہیں۔“  
 باشم زور سے ہنس پھر دفعتاً خاموش ہو گیا۔  
 ”یار رافع۔!؟“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”یہ دن دے محبت کا فارمولا کیسا ہے؟ کیا کہتا ہے تو اس بارے میں؟ دن دے محبت کی قربت کتنی دیر مدہوش رکھ سکتی ہے بندے کو؟“  
 رافع چونک سا گیا۔ باشم کے لہجے میں کچھ تھا۔  
 ”ڈاکٹر صاحبہ سے کوئی شکایت؟“ اس نے محتاط سا ہو کر پوچھا۔

اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو  
 اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو

اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو  
 اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو

اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو  
 اس کے گھر اک رہنا چھان  
 ہم کو عالم کو

”اوشیں یا سنا شکایت تو جب بھی ہوئی مجھے اپنے آپ سے ہوگی۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔  
 ”خدا نہ کرے۔“ رافع بددلیا۔  
 ”اچھا غزل سنا۔“ ہاشم قدرے بے فکری سے پھیل کر بیٹھا۔  
 ”کون سی غزل؟“

”جو ابھی وارد ہوئی ہے۔ ایسی رات اور ایسی تنہائی۔ شاعر غزل نہ کہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“

رافع دھیرے سے ہنس پڑا۔ ہاشم یا رغار تھا۔ اس سے کچھ بھی چھپانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اسے غزل سنانے لگا۔ ہاشم بغور سن رہا تھا۔

”ہوں۔ اس کا مطلب ہے۔“ پوری غزل سن کر وہ بولا ”خواہش کی رنگین تکی۔ تصور کی حسین نگار سے نکل کر اب حقیقوں کی دنیا کی جانب نحو سفر ہے۔“  
 ”وہ کیسے؟“

”تیری غزل کا وہ ماورائی تصور اتنی رنگ غائب ہو رہا ہے جس میں صرف محبوب کو سوچنے سے ہی خوشی بلکہ روحانی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ تیری سوچ میں اب لا حاصلی کی نئی اتر رہی ہے۔“ رافع خاموش سا ہو گیا۔ شاید ہاشم ٹھیک کہہ رہا تھا۔

”یا ر شاعر! خوش رہنا چاہتا ہے تو۔ اسی تصور اتنی دنیا میں لوٹ جا۔“ رافع نے ہاشم کو سوچا اور بس سوچ۔ جہاں اسے اپنے لیے کچھ نہ تھا۔ وہیں سے سوچ کا رنگ زار شروع ہو جائے گا اور تمنا شریک کی صورت دور دور ہوتی چلی جائے گی۔“

”ہاشم! وہ دھیرے سے بولا۔  
 ”ہوں؟“  
 ”تیرے پاس سگریٹ ہے؟“

”رکھتا تو ہوں۔“ اس نے جیب پر ہاتھ مارا پھر ٹوٹ کر ایک سگریٹ برآمد کی۔  
 رافع نے اس سے سگریٹ لے کر سلگائی اور بہت سادھواں چھوڑا۔

”بس اب تو جا۔“ پھر وہ بولا۔  
 ”اچھا۔“ ہاشم حیران ہوا پھر گہری سانس بھر کر کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے۔ چلتا ہوں۔“  
 پھر رافع پر ایک ترجم بھری نظر ڈال کر وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا چل پڑا تھا۔



شہلا کا ڈیوٹی ٹائم شروع ہونے میں اب زیادہ دیر نہ تھی۔ روٹی پکاتے پکاتے اس نے ایک نظر لاؤنج کی دیوار پر نظر آتے والے کلاک پر ڈالی۔ محض آدھا گھنٹہ ہی رہ گیا تھا۔ اس نے پریشانی سے ماتھے پر آتے بال بازو سے ہٹائے۔ فردوس بیگم کچن کی ہر ذمہ داری اس کے سپرد کر کے خود ہر فرض سے سبک دوش ہو چکی تھیں۔ عریضہ گا گھر میں ہونا نہ ہونا بالکل برابر تھا بلکہ شہلا کو تو اس کی صورت بھی ہفتہ میں دو تین بار بمشکل نظر آتی تھی۔ ایسے میں شہلا کو اپنی ذمہ داریوں میں توازن قائم رکھنے میں کافی وقت پیش آرہی تھی۔

”میرا خیال ہے،“ مجھے کچن کے لیے ایک عدد ملازمہ رکھ ہی لینا چاہیے۔“ اس نے ہاشم پاٹ میں روٹی رکھتے ہوئے سوچا۔ ”میں ہاشم سے کہتی ہوں تو اس سلسلے میں اپنی امی کو خود ہی قائل کریں تو بہتر ہوگا۔“  
 روٹیاں پک چکی تھیں۔ شہلا نے سنک میں ہاتھ دھوئے ہوئے اپنے آج کے ڈریس کے متعلق لمحہ بھر کے

لیے سوچا پھر مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

کیلے ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ جیسے ہی مڑی اس کی چیخ نکلتی نکلتی رد گئی۔ کچن کے دروازے پر ایک بڑے ڈبل ڈول سانولا آدمی کھڑا تھا۔ اس کی سرخ نظریں شہلا کو اپنے وجود کے آریار گزری محسوس ہوئیں۔ لمحہ بھر کے لیے شہلا کے اعصاب بالکل جواب دے گئے تھے۔

”آپ کے ہاں بھوں کو سلام کرنے کا رواج نہیں ہے کیا؟“ وہ بولا۔

تب شہلا کے حواس دھیرے دھیرے واپس لوٹے۔ اس نے اس آدمی کو غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔

”اوپس۔“ اس کے لبوں سے گہری سانس خارج ہوئی۔ ”السلام علیکم۔ کک۔ کیسے ہیں آپ۔؟“

”وعلیکم السلام۔“ وہ مسکرائے۔ ”ہم تو ویسے ہی ہیں شہلا بیگم! جیسا آپ کی دوست چھوڑ گئیں ہمیں۔“

”اوہ گاڈ۔“ شہلا نے دل میں سوچا۔ ”یہ اختر میاں اب تک۔“

”آپ کو شادی کی مبارکباد۔“

”شکریہ۔“ وہ مختصر بولی تھی۔

اختر میاں کچن کے دروازے پر جم کر کھڑے ہوئے تھے۔ باہر نکلتے کے راستے پر شہلا کو کوفت آگھیرا۔ اسے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔ نجانے فردوس بیگم کہاں تھیں جو اپنے بھائی کو منجھالتیں۔

”دلہن بیگم! ہمیں ایک کپ چائے بنا دیں اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔“ اختر میاں نے جیسے اس کی کوفت اور بیزاری محسوس کر لی تھی۔ وہ کچن کے دروازے پر سے ہٹ کر بولے۔

”جی ضرور۔“ شہلا نے اپنی کوفت کو حتی الامکان دبائے کی کوشش کی۔

اختر میاں پلٹ گئے تھے۔ شہلا نے جلدی جلدی سانس پین چوسے پر دھرا تھا۔ تب ہی اس کے کانوں میں دہلی دہلی آواز آئی تھی۔

”اے بے۔ تم پھر آن کر۔ ہمارا سکون ملا۔“ یہ جملہ بھٹا اندھا دھماکا خیز فردوس بیگم کے اور کس کا ہو سکتا تھا۔

”باتی۔! کوئی سلام دعا کا موقع بھی دے دیا کرو۔“ اختر میاں نے تھے۔ ”ہمیں دیکھتے ہی تم تو یوں کونے دیتی ہو جیسے ہم تمہارا کچھ لے بھاگے ہوں۔“

”ہماری عزت ہمارا وقار دو کوڑی کا کر جاتے ہو تم بھیا۔! اور بھلا کیا لایا ہے اور؟ نئی دلہن گھر میں ہے۔ کیا سوچے گی تمہارا یہ ”شرن خانہ“ حلیہ دیکھ کر۔“

”بابا بابا۔“ وہ ہنسے تھے۔ ”اچھا۔ تو یہ لکڑستانی تمہیں۔ کوئی بات نہیں باجی۔! زمانہ ہی عقیدہ رکھتا ہے۔“

سرخ لہو تو اب شاید ہماری ہی رگوں میں دوڑتا ہے جو ہم ”پنوں“ سے ملنے چلے آتے ہیں۔ ویسے ”نئی“ دلہن کی بات بھی خوب کی تم نے۔ ہم کیا اسے جانتے نہیں۔ بابا بابا۔“

”بے میں چائے اور بسکٹ لے کر آتی شہلا کے ذہن کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے ہنس گئی۔ اس نے اپنا چہرہ سرخ ہوتا ہوا محسوس کیا پھر گرم گرم لہو اس کے پورے جسم میں گردش کرنے لگا۔ اس نے ٹرے اختر میاں کے سامنے تقریباً ٹھنڈی ہی رکھی۔

فردوس بیگم نے حیرانی اور قدرے خفگی سے اسے دیکھا جیسے اس بدتمیز بی کا مطلب جاننا چاہتی ہوں۔

شہلا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے پھر لمحہ بھر سوچا۔ اس کے بعد وہ لب کاٹتے ہوئے مڑ گئی۔ تھکے تھکے ذہن اور پر مشرہ اعصاب کے ساتھ وہ میڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے تک چلی آئی تھی۔ اسے تازہ دم ہو کر اپنی دیوٹی پر پہنچنا تھا۔ سوچوں میں الجھ کر خود کو تھکا کرنے سے کچھ حاصل ہی نہ تھا۔



پوریوں کو پانی دیتی ربیعہ کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ لکڑی کے چھوٹے سفید پھاٹک کے دوسری جانب درہ۔

کھڑی تھی۔ ربیعہ نے نیاپ کیاری میں ڈال دیا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے پھاٹک تک آئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کرنے لگی۔

”وعلیکم السلام۔“ درہ اندر چلی آئی۔ ”کیسی ہو ربیعہ۔؟“

”بالکل ٹھیک۔“ آواز دے رہی تھی۔

وہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب پرہہ گئی۔ انہی اپنے کمرے میں اسٹڈی میں مصروف تھی جبکہ منیزہ بیگم عصر کی نماز سے فارغ ہو کر چائے پی رہی تھیں۔ درہ کی آمد پر دونوں بھی ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھیں۔

”اتنے سالوں میں تم کبھی مجھ سے ملنے نہ آئیں اور ربیعہ سے دوستی ہوئی تو اس سے ملنے آئی ہو۔“ انہی نے

”دو تہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ درہ ہنس دی۔ ”میں اپنی غلطی مانتی ہوں لیکن یہ بھی تو دیکھو ربیعہ بھی تو مجھ سے ملنے آئی ہے جبکہ اتنے سالوں میں تم کبھی مجھ سے ملنے نہ آئیں۔“

”چلو بھئی۔ تم نے تو بدلہ ہی چکا دیا۔“ انہی نے بے بسی سے بولی۔ سب ہی ہنس دیے۔

”یہ ربیعہ نے ہی ایسی۔“ منیزہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ ”یہ سب کو اپنا بنا لیتی ہے۔ سب ہی گرویدہ ہو جاتے ہیں اس کے۔“

”جسٹ کراچی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔“ درہ نے ناکید کی۔ ”ہمارے گھر میں بھی سب اس کے دیوانے ہیں۔“

”سب ہی اس کا زور کوڑھتے ہیں۔“ منیزہ بیگم نے کہا۔ ”سب کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھنکھائی۔ دو مہراں ربیعہ کا دل نجانے کیوں دھڑکا تھا۔

”آئی! عبا بھائی کے ایک دوست ہیں فراز احمد۔ ہیں نا؟“

”ہاں ہاں! فراز تو ہمارے گھر کے ایک فرد کی مانند ہے۔ ہمارے لیے تو وہ عبا جیسا ہی ہے۔“

”چھ! درد خوش ہو گئی۔“ میں دراصل یہی جانتا چاہ رہی تھی ”ان کا فیملی بیک کراؤنڈ“ خاندان کے

وغیرہ سب کیسے ہیں؟“

”سب بی بہت اچھے ہیں۔ وہ بہنیں اور وہی بھائی ہیں۔ سب ماشاء اللہ سنبھلے ہوئے پڑھے لکھے افراد ہیں۔“

”بہت کھانا پیتا کھرانہ ہے۔“

درد کے چہرے پر چمک آگئی تھی۔ منیوہ بیگم کے الفاظ اور انداز بہت حوصلہ افزا تھے۔

”پہلے یہ تو بتاؤ کہ بات کیا ہے؟“ انیقا نے اسے گھورا۔

”بات یہ ہے کہ فراز کی بہن فریحہ ہمارے گھر آئی تھیں ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ ناعمہ میں انٹرا

”دوری گڈ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ انیقا بھی خوش ہوئی۔ ”ان دونوں کی جوڑی تو خوب ہے۔“

فراز بھائی تو جیسے رستم نکلے۔ آنے والے نہیں سمجھتی ہوں ان سے۔“

”ارے نہیں انیقا! پلیز۔“ درد التجائی انداز میں بولی۔ ”میں تو ان لوگوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ یہ

محض میرا اندازہ ہے۔ ابھی تم ان سے کچھ مت کہنا ورنہ وہ ہمارے متعلق کیا خیال کریں گے۔“

”تم نے فکر ہو درد بیٹی! منیوہ بیگم نے اسے تسلی دی۔ ”ہمارے گھر سے ایسا کوئی ذکر نہیں ہو گا اور چار

تک ان لوگوں کا تعلق ہے وہ بہت اچھی فیملی ہے ہر لحاظ سے اچھی۔ اگر رشتہ آئے تو قبول کرنے میں تامل نہ

کرتا۔“

”بہت شکریہ آئی! درد منونیت سے بولی۔ ”میرا ابو تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

”یہ ناعمہ تمہارا ابو تہ کب سے ہو گئی؟“ انیقا حیرت سے اسے گھورتی رہی۔

درد نے اس کی بات پر غور کیا پھر خود بھی اس کی ہنس میں شریک ہو گئی۔ چائے لے کر اندر داخل ہوتی رہی۔

نے دھیان سے اسے دیکھا تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں والی بونٹ کی حامل درد واقعی پُرکشش تھی اور ہنسی اس

کے چہرے پر ملکوتی تاثر لے آتی تھی۔ ربیعہ نے دل سے اس کے لیے یہی مسکراتے رہنے کی دعا کی۔ نجانے کیوں یہ

لڑکی اسے بہت اپنی اپنی سی لگتی تھی۔

کو لڑ سے پانی لے کر وہ جیسے ہی پلٹی لمحہ بھر کے لیے ٹھک کر رک گئی تھی۔ سر نہ تکانے لیے وہ مقابل تھا۔ ایقان

ان نگاہوں میں دیکھنا نہ چاہتی تھی سو پانی لے کر سائیڈ سے نکلنے لگی۔ عاشر نے اس کا رستہ روکا۔

”یہ کون سا کھیل کھیل رہی ہو تم میرے ساتھ ایقان!“ نظروں کی طرح اس کا لہجہ بھی پتا پتا سا تھا۔

ایقان نے بھی سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”کھیل؟ کھیل کا مطلب جانتے ہو تم عاشر صاحب؟ میں ایک کمزور عورت بھلا کون سا کھیل کھیل سکتی ہوں؟“

کھیل تو تمہارے جیسے مرد کھیلتے ہیں۔ ہم عورتوں سے۔“

”یہ کیا الفاظی ہے!“ وہ چہنما لایا۔ ”میرے واپس جانے میں محض تین دن رہ گئے ہیں۔ محض تین دن۔ اور

تم۔ تم اپنی ہر ذمہ داری ہر تعلق کو پس پشت ڈال کر کمرہ بند کیے نجانے کس ماتم میں مصروف ہو۔“

”ذمہ داری۔ تعلق۔“ ایقان نے بھرا ہوا گلاس سنک میں دے مارا۔ ”میں یاد رکھوں اپنی ذمہ داریوں کو۔“

ہر تعلق بنا ڈالے۔ اور تم! اس نے انکی سے عاشر کی جانب اشارہ کیا۔ ”تم آزاد پنجھی بن کر ڈال ڈال پھرتے

رہو۔“

”کیا کیا ہے میں نے ایسا؟“

”تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

”وہ تم آئے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس

سوال کا جواب تمہیں اللہ کے موا کوئی نہیں دے سکتا۔“

وہ پھر اس کے قریب سے گزر کر جانے لگی تھی۔ عاشر نے اس کا بازو اس سختی سے پکڑا کہ اس کی انگلیاں ایقان

کے بازو میں کبکب کی گئیں۔

اسے کھینچتے ہوئے وہ کمرے میں لایا اور بستر پر دے مارا۔ ایقان کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی چیخیں برآمد ہوئی

تھیں۔

”تم مجھے میرے لہو رستے کا یہ صلہ دے رہی ہو؟ کیا کر لیتیں تم اگر میں اس سے شادی کر لیتا تو؟ کیا کر سکتی

”تم مجھے میرے لہو رستے کا یہ صلہ دے رہی ہو؟ کیا کر لیتیں تم اگر میں اس سے شادی کر لیتا تو؟ کیا کر سکتی

جواب دو؟“ جواب نہ دے سکتی تھی۔ تم میرا اور کیا بگاڑ لو گی اب؟“

ایقان بستر پر گری اسے خلی لٹک رہی تھی۔

”ایقان بیگم! تم نجانے کون سی فینسی میں زندہ ہو۔ تم انھیں کھول کر دیکھو کہ اس دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے۔

کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مرد اگر خراب ہونا چاہے تو اسے کبھی نہیں روک سکتا۔ کوئی نہیں بیوی تو ایک بہت کمزور سی

شے ہے۔“

ایقان کی آنکھوں میں دھندلکے آنسو آگئے تھے۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھنے جا رہی تھی۔

”میں اسے اس طرح ماتم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ سمجھیں تم!“

وہ سر ہاتھ رکھتے بے حد شگاف انداز میں کہہ رہا تھا۔

”مردوں کی زندگیوں میں ایسے چھوٹے موٹے واقعات آتے رہتے ہیں۔ ہوا کے جھونکے کی مانند عورتیں آتی

ہیں اور جلی جاتی ہیں۔ اور ہوا کے جھونکوں کے پیچھے کوئی نہیں بھاگتا۔ بچنے کی کوشش کرو۔“

ایقان نے اپنے چہرے پر سے بال ہٹا دیے اور آٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ قدم قدم چلتی اس کے سامنے جا کھڑی

ہوئی۔

”ہوا کے جھونکے کی مانند اگر کوئی میری زندگی میں بھی آجائے مسٹر عاشر! تب بھی تمہارے خیالات یہی رہیں

”میں اسے اس طرح ماتم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ سمجھیں تم!“

اس کے الفاظ اس کے لبوں میں ہی رہ گئے تھے۔ عاشر نے اس کے چہرے پر اس زور سے تھپڑ مارا تھا کہ وہ پلٹ

کر پھر بستر پر جا گری تھی۔

”ابنی احد میں رہو ایقان بیگم!“ وہ غرایا تھا۔ ”تم نے صرف میری محبت دیکھی ہے۔ اسی پر قناعت کرو۔ اس

سے آگے جانے کی کوشش کی تو تمہاری دل کلے گی۔“

وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ نجانے کیا بات تھی چہرے پر اٹھتی ٹیسوں کے باوجود اسے روانہ آیا تھا۔ کھلی

آنکھوں سے دیوار کو تکتے ہوئے وہ کچھ سے کچھ سوچے چلی جا رہی تھی۔

مندی مندی آنکھوں سے شہلانے ماتم دیکھا۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آج اس کا آف



ڈسے تھا۔ اس نے دوپہر بہت مزے سے سونے میں بتادی تھی۔

اس نے اپنے برابر خالی جگہ پر نگاہ کی۔ عمر کو اس نے اپنے ساتھ ہی سلایا تھا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا نجانے کونسا وقت وہ اسے سوتا چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

شہلا نے اپنے بال سمیٹے اور اٹھ کر لائنس آن کیں۔ پھر وہ واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔ ٹھنڈے پانی منہ دھو کر پرسکون اعصاب کے ساتھ چائے کی طلب لیے وہ کمرے سے نکلی تھی کہ میز دھویوں پر پہنچ کر وہ ٹھک گئی۔

”یہ چھو کر اتو جان کو آگیا ہے۔ اتنا شیطان اتنا شریر۔“ فردوس بیگم کا بارہ نہایت ہائی ہو رہا تھا۔

شہلا کی نظر پام کے گملے پر پڑی جو اونڈھا ہو کر ٹوٹ گیا تھا اور عمر اس کے قریب کھڑا منہ بسور رہا تھا۔

”مجھے کیا پتہ آپ لوگوں نے رستے میں گملے رکھے ہوئے ہیں۔“ وہ اپنے انداز میں بولا۔ ”یہ کوئی جگہ تو نہیں پوچھوں کی۔ انہیں باہر رکھیں نالان میں۔ آپ لوگوں کا لان کتنا بڑا ہے۔“

”اے ہے۔ اپنی زبان قابو کر لڑکے۔ اے لگام کہیں کا۔“ انہوں نے اس کی کمر پر ایک دھپک دیا۔

شہلا کے دل کو نجانے کیا ہوا تھا وہ لمحہ بھر میں میڑھیاں اتر گئی۔

”آئی پلیز۔“ اس نے عمر کو کھینچ کر خود سے لپٹا لیا۔ ”آپ اسے اپنی طرح ٹرسٹ نہ کریں بچوں۔“ غلطیان ہوئی جاتی ہیں۔“

اس کا لہجہ ضبط کے باوجود تلخ ہو چلا تھا۔

”بی بی! ہمارے گھر میں بچوں کو والک کا تیر نہیں پڑتا۔ سمجھیں تم۔“ انہوں نے ہاتھ ہلایا۔ ”اتنا ہی لا کا لڈو ہے تو رہے نالی اماں کے گھر۔ ہم نے تو پہلے دن اپنی صاف کہہ دیا تھا کہ ہم بہو تو لے جا رہے ہیں۔“

اپنا خون ای ہو گا۔ یہ پھر بھی ہر دے سر سے دین نہیں مونگ دیتا ہے۔ وہ بات کہنے کے لیے کھڑی ہوئی۔

”میری عریضہ کتنے شوق سے لائی تھی۔ سب ستیا پاتری لڑکیاں۔ وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ شہلا آنکھوں میں آنسو بھرے لب کاٹ رہی تھی۔ عمر نے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”آئی ایم سوری ماما! انہوں نے میری وجہ سے آپ کو آغا غیبا نونے تو آپ کو کبھی نہیں ڈانٹا۔ ہے نا۔!“

”چلو بیٹا! ہم تانوں کے گھر چلتے ہیں۔“ اس نے بے حد ضبط سے خود کو قابو پایا تھا۔

”ٹھیک ہے!“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں واپس نہیں آؤں گا ماما! مجھے آج بکھر گیا۔“ اس نے کہا۔

شہلا لب کاٹ کر میز دھویوں کی جانب بڑھ گئی تھی۔

\*\*\*

”یہ کیا کہہ رہی ہو ایقان تم۔“ عذرا بیگم خوف سے پیلی پڑ گئی تھیں۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بھابھی بیگم!“ اس کے لہجے کی استقامت سے انہیں مزید خوف محسوس ہوا۔ ”اور آپ جانتی ہیں میں کس قدر ضدی ہوں۔“

”لیکن ایقان! اماں! تمہارے بھائی۔“ وہ جھٹکا کر رہ گئیں۔ ”تم نے اماں سے ذکر تک نہیں کیا اور اب مجھے بتا رہی ہو۔“

ایقان نے گہری سانس بھری وہ اپنا ضروری سامان اور بچے لے کر دہلی میں ہی ”حیات ولا“ چلی آئی تھی۔ سارا دن عجب بے کلی میں گزرا تھا۔ دل کو پچھلے لگے ہوئے تھے۔ اماں کے سو جانے کے بعد وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔

\*\*\*

56

عذرا بیگم سے اس نے سب احوال کہہ ڈالا تھا۔

”اماں کو میں بتا دوں گی۔ بھائی کو آپ بتا دیں۔ دنیا کو خود ہی پتا چل جائے گا۔“

”ایقان! وہ رونے کے قریب ہو گئیں۔“ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ کیا کر رہی ہو۔ ارے کچھ سوچ سمجھ تولو۔“

”اتنا طے ہے بھابی بیگم! کہ میں پلٹ کر اس شخص کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ وہ بولی ”آپ جانتی ہیں نا۔ ابا مرحوم نے ”حیات ولا“ کے حصے اپنی زندگی میں ہی کر ڈالے تھے۔ وہ بڑے حصے دونوں بھائیوں کے لیے اور وہ

چھوٹے حصے ہم دو بہنوں کے۔ ہے نا۔ میرے حصے کا پورشن اب تک دیران اور خالی پڑا ہے۔ میں وہیں رہوں گی۔“

”ہمیں تمہارے رہنے کی نہیں۔ تمہارے آباد رہنے کی فکر ہے۔ ایقان! انہوں نے آنسو پونچھے۔“

”تمہارے لیے تمہاری اور سدرہ کی طرح ہو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ تمہارا ہنسا بستا گھر برباد ہو۔“

”آپ نے کیا میرے لیے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے بھابھی جان!“ وہ گہرے دکھ میں ڈوب کر بولی۔ ”تقدیر کا وار چل چکا۔“

”خدا نہ کرے۔ کچھ نہیں ہوا۔ تم تو بونہی باؤلی ہو رہی ہو۔“

”شاید آپ سب لوگ ایک آواز ہو کر یہی کہیں گے۔“ اس نے پلک پر اترا ہوتی توڑا۔ ”لیکن میری سوچ میرا دل اپنی ہی بات کہہ رہے ہیں۔ چاہے کوئی اس بات کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ اگر کسی نے مجھے مجبور کرنے کی کوشش کی۔ تو میں خود کو آگ لگا لوں گی۔ یاد رکھیے گا۔“

عذرا بیگم ہونٹ پر ہنسی بکھیر کر اسے دیکھ گئیں۔ ایقان اٹھ کر چل دی تھی۔

\*\*\*

بے حد تھکا ہارا عاشر دروازے کی جانب بڑھا تھا۔ کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ کر اس نے کافی دیر تک نہ ہٹائی۔

چند لمحوں تک کوئی جواب نہ آنے پر اس نے پھر کال بیل کا بٹن ہنسنے کی بات ہی سامنے والا دروازہ کھول کر اس کے پرہیز صاحب نظر تھے۔

عاشر غیر متوقع آواز پر چونک کر کھڑا۔ فضل صاحب نیند سے سرخ آنکھیں لیے کھڑے تھے۔

”جالی!“

”آپ کی کھڑکی کھلی تھیں۔ آپ کے لیے۔ آپ تو بڑی دیر سے لوٹے۔“

”اوہ۔“ وہ شرمندہ ہوا۔ ”آپ کو زحمت ہوئی فضل صاحب۔ معذرت بہت معذرت۔“ وہ سر ہلا کر مڑ گئے۔

عاشر جالی لیے سوچ میں گم کھڑا رہا۔ صبح کے مناظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے تھے۔ اس نے ڈیڑھ بجائی گھڑی کو دیکھا۔

دروازہ کھول کر وہ گھر میں داخل ہوا پھر سیدہ حاتفون کی جانب بڑھا تھا۔

\*\*\*

باقی آئندہ شمارے میں

57

سورامین کی سخت بائیں سنسن لر رہیہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن ترانہ اس کی ایک ہیں سمی۔ جس پر ربیعہ کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل غین کو قلع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

ربیعہ کا عباد کے گھر میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ منزہ بیگم ربیعہ کو اپنی بیٹی بنالیتی ہیں۔  
شمار شملہ کی شہن کی تقریب میں بی نافع اور عریشہ کا نکاح برہموا بیا جاتا ہے جس پر عریشہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔ شادی کی اولین رات ابرار جیلانی کا فون شملہ کو پریشان کر دیتا ہے۔ شملہ شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس کی ملاقات ابرار سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم شملہ کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔  
فراز جو در حقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عریشہ کے لیے فراز کی آمد پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فراز یہی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔  
رائع کو ربیعہ میں اپنے آئینہ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا علم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔

لڑا عاشر کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے عاشر اسے لینے ایئر پورٹ جاتا ہے۔ ایقان عاشر کے پراسرار رویے پر مشکوک ہو جاتی ہے۔

شملہ سب کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا سر درو یہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے دلا سادے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شملہ ربیعہ کے ہاتھ ہوا البیہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ دورہ کے مشورے سے ایم ایسے سویا لوجی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔  
عاشر لڑا سے ملنے ہوئے ہوتا ہے تو لڑا اسے پرپوز کرتی ہے۔ عاشر لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا رومال ایقان کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشر سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشر بوکھلاہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان حقیقتاً ”صدے سے تنگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ دورہ سے واپس آتی ہے تو اس کے گھر آتی ہے تو اس کے گھر کی صفائی رائے سے ہرچکی ہے۔ یہ خرابی سے صدے سے دوچار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رائے بھی اسے جلد بازی میں کیا لیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ دورہ کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات محسوس نہیں کرتا۔

۲۶

حکیم سوری قسط

بیل ایک تو اتر سے جی تھی۔ عذرا بیگم افتاں و خیزاں فون تک پہنچی تھیں۔

”ہیلو۔“ انہوں نے سمجھی ہوئی سی آواز میں کہا۔

عاشر چند لمحوں کے لیے خاموش رہا تھا پھر ان کے دوبارہ ”ہیلو“ کہنے سے قبل ہی وہ آہستگی سے بولا۔

”السلام علیکم بھابی جان۔ عاشر بات کر رہا ہوں۔“

اب چند لمحے خاموش رہنے کی باری عذرا بیگم کی تھی۔ پھر وہ بھی مزید مدہم آواز میں بولیں۔

”ہاں عاشر میاں! کیسے ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں بھابی جان۔ یہ ایقان کہاں ہے؟“ اس کی زبان اٹکنے لگی تھی۔ عجب شرمندگی کا احساس دامن گیر ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی دل کی تہوں سے غصہ بھی اُٹھ رہا تھا۔

”ایقان۔“ عذرا بیگم بھی جیسے اس کے جیسی کیفیات کا شکار تھیں۔ ”ایقان تو۔۔۔ شاید سو رہی ہے۔“

عاشر نے گہری سانس بھری۔ اسے نجانے کیوں ایک وہم سا تھا جیسے وہ اسے وہاں نہیں ملے گی جیسے وہ کہیں اور

## قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے خردی سے محفوظ رکھیں۔

یہ بات نہیں بھولوں گی۔

عاشر کا جی چاہا ریسپور مار کر اپنا سر پھوڑے۔

ایقان! یہ ایقان! تم کوئی سولہ سترہ سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کام لو۔ یہ کیا اول فول کے جا رہی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آجاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ کہنا سنا ہو رات بھر میں کہہ لینا تاکہ صبح تمہارا یہ پاگل پن اترے۔

عاشر صاحب! وہ طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ مجھے آپ کی طرح نہ کسی کے حسن کا نشہ چڑھا ہے نہ ہی غم غلط کرنے کے لیے میں نے شراب کا سہارا لیا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا وہ بقا کی ہوش و حواس کہا ہے۔ آپ کو نہ اس وقت زحمت کرنے کی ضرورت ہے نہ ہجرت میں یہاں سے واپس جانے کے لیے نہیں آئی۔ تمہاری صورت دیکھنا اب میرے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

ایقان! وہ تنگ آگیا۔ زاپنی اوقات میں رہو۔ زبان سنبھال کر بات کرو۔ بدتمیز ہی کی کوئی حد ہوتی ہے۔

آپ کے نزدیک تہذیب کیا ہے جس جان چلی ہو!

مروت! وہ بلبلا گیا۔ اور اور میں صبح آؤں کائنات کروں گا تمہارے گھر والوں سے۔ کیا سمجھا ہوا ہے تم نے میں تو اٹھا کر لے جاؤں گا تمہیں۔ قانونی بیوی ہو میری کوئی معشوقہ نہیں ہو جو یہ دھمکیاں دے رہی ہو۔ خناس چڑھ گیا ہے تمہیں۔

بڑبڑاتے ہوئے اس نے ریسپور کریڈل پر دے مارا تھا۔ ایقان چند لمحوں کے لیے سن سی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں برسات اتر آئی۔ پیاز کی طرح تہہ در تہہ اترتے روپ کے متعلق اس نے کئی بار سنا اور پڑھا تھا دیکھ کر بے پروا ہو کر بیٹھ گیا۔

\*\*\*

عاشر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے قدرے فاصلے پر چہرے پر خاصے تناؤ کی کیفیت لیے فاروق حسن بیٹھے تھے۔ ایک طرف شفیقہ حیات بیٹھی بار بار سفید دپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ان کے ایک طرف سلوٹی حسن اور دوسری جانب عذرا بیٹھ گئے تھے۔

کمرے کی کھڑکی کے قریب ایقان کھڑی تھی۔ دونوں بازو سینے پر لپیٹے وہ مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کتنا ہی وقت اسی خاموشی کے عالم میں گزر گیا۔ پھر عاشر نے سر اٹھا کر سب کی جانب دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سب ہی اس سے نظر چار رہے ہوں۔ اس نے پتھر کا بت بنی ہوئی ایقان کو دیکھا۔ پھر جیسے زچ ہو کر گویا ہوا تھا۔ کیا فیصلہ ہے تمہارا؟ تم میرے ساتھ چل رہی ہو یا نہیں؟

چلی گئی ہوگی۔ اب اس کی وہاں موجودگی کا علم ہو جانے پر وہ قدرے مطمئن سا ہو گیا۔

”نہیں بھابی جان۔۔۔ وہ سو نہیں رہی جاگ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ آپ پلیز میری اس سے بات کروا دیں۔“

”عاشر! وہ۔۔۔ ایسا ہے کہ کیا ہوسکتا ہو گا کہ تم صبح فون کرو۔“ عذرا بیگم اب کے قدرے شرمندگی سے گویا ہوئیں۔ ”ایقان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔“

عاشر نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

”بھابی جان۔۔۔“ آپ اسے بلائیں! وہ قدرے نرم گئے انداز میں بولا ”میں اس سے ابھی بات کروں گا۔“

”اچھا! وہ دم صدم پڑیں۔“ میں دیکھتی ہوں تم ہولڈر کھنا۔“

ریسپور ایک طرف رکھ کر وہ پریشانی کے عالم میں اس کمرے کی جانب بڑھی تھیں جہاں شفیقہ حیات اور ایقان لیٹی تھیں۔ انہیں خوف تھا کہ رات گئے شفیقہ حیات کی نیند اگر خراب ہوئی تو شاید ان کی طبیعت بھی بگڑ جائے۔ وہ گولیاں کھا کر سویا کرتی تھیں۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھنک گئیں۔ ایقان دیوار سے ٹیک لگا کر دونوں بازو سینے پر باندھے باہر ہی کھڑی تھی۔ نیم اندھیرے میں بھی وہ اس کے متورم پوٹوں کو دیکھ چکی تھیں۔

ایقان!

”مجھے خبر ہے بھابی جان! وہ ہولے سے بولی۔ میں نل کی آواز سن رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں کمرے میں جا رہی ہوں تم بات کر لو۔“

ایقان چپ رہی۔ عذرا بیگم پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ ایقان یوں بیٹھنے پر بازو لپیٹنے لگی تھیں۔

کالتی رہی۔

جی تو چاہ رہا تھا کہ فون کا ریسپور یونی ایک طرف رکھا رہے اور دوسری جانب وہ انتظار اور غصے کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ لیکن عقل کہہ رہی تھی کہ آج یا کل اسے بات تو کرنا ہی تھی۔ سو کچھ دیر بعد وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی فون تک آئی۔

”ہیلو۔“ اس نے بالکل بے تاثر انداز میں کہا۔

”کیا طریقہ ہے یہ۔۔۔“ وہ دوسری جانب اپنا غصہ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے چھوڑ کر بغیر کسی اطلاع کے یوں چلے جانے کا کیا مقصد ہے؟“

”مقصد صرف ایک ہے۔“ وہ مضبوط لہجے اور دھیمی آواز میں بولی۔ ”وہ یہ کہ میں تمہارا گھر اور تمہیں دونوں کو چھوڑ آئی ہوں ہمیشہ کے لیے۔“

”وہاٹ؟“ اسے جیسے کرنٹ لگا۔ اس بات کا تو اس کے وہم و گماں میں کہیں سایہ تک نہ تھا۔

”ایقان؟ تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟ جانتی ہو کہ کیا رہی ہو؟“

”بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ وہ ہنوز سابقہ انداز میں بولی۔ ”اتنے سالوں میں تم شاید مجھے نہ جان پائے۔ اور شاید اتنے سالوں میں بھی تمہیں نہ سمجھ سکی۔ شاید اتنے سال علیحدہ رہے اس لیے لیکن کیا اچھا نہیں ہو کہ بہت جلد میں نے تمہیں پہچان لیا؟ اوزیہ بھی اچھا ہی ہو گا کہ اب تم مجھے بھی جان لو میرے نزدیک محبت میں ہر خطا قابل معافی ہے ماسوائے بے وفائی اور ہرجائی پن کے۔ تم نے میرے جذلوں کی توہین کی ہے عاشر۔! میں مر کر بھی

ایقان نے سرخ پھیر کر اسے فٹیل ایک نظر دیکھا۔

”نہیں!“ وہ بے حد ٹھوس انداز میں بولی۔

کمرے میں موجود نفوس میں سے زیادہ تر نے بے اختیار مہربی سانس بھری تھی۔ عاشر نے ایقان کی بے پناہ ضدی طبیعت کے مقابلے میں ان سب کی بے بسی محسوس کی۔

”آخر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ چلا ہی اٹھا اور اگر کچھ کیا ہے تو تو ٹھیک ہے دنیا میں بے شمار مرز ہیں جو کبھی نہ کبھی رستے سے ہٹک جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے ہٹک بھی جاتے ہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ان کی بیویاں اس سرکشی پر اتر آئیں۔ اس طرح تو اس طرح تو کتنے گھر ٹوٹ جائیں برباد ہو جائیں۔ آپ آپ سب لوگ اسے سمجھاتے کیوں نہیں آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ اس سے کہیں یہ سامان اور بچے لے اور میرے ساتھ چلے۔ میں اسے لینے آیا ہوں ایک طرح سے معذرت خواہ ہی ہوں اور یہ ہے کہ اور اکثر رہی ہے آپ لوگ بھی اپنی خاموشی سے اسے شہم دے رہے ہیں۔“

اس کے لفظ لفظ سے بے بسی اور دبا دبا غصہ جھلک رہا تھا۔ ایقان کو ایک گونہ سکون کا احساس ہوا اور عاشر نے اس سے قبل ہی اس نے اپنی ماں اور بھائیوں پر واضح کر دیا تھا کہ فی الحال وہ اس کے ساتھ چلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور یہ کہ اگر کسی نے اسے مجبور کرنے کی کوشش کی تو وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ وہ ماں اور بھائیوں کی لاڈلی تھی۔ سب سے چھوٹی تھی اور ہمیشہ سے اپنی تنہائی آئی تھی۔ اس وقت بھی اس کی دھمکی نے جیسے سب کے لب سی لیے تھے۔ یوں بھی ان کا گھراؤن اخلاقی قدروں کی اہمیت کو بچانے اور ان پر زور دینے والوں میں سے تھا۔ فاروق حسن اور سجاد حسن کو ایقان کی ناراضی کی وجہ جان کر حقیقتاً ”دھچکا لگا تھا۔ انہیں عاشر سے اس بے راہروی کی امید نہ تھی۔ دل ہی دل میں وہ ایقان کو درست جان رہے تھے۔

فاروق حسن نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر وہ جیسے انداز میں بولی۔

”دیکھیں عاشر مایاں! آپ کہتے ہیں کہ آپ کا یہاں آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ معذرت خواہ ہیں۔ حالانکہ اب تک جو کچھ آپ نے کہا اس ساری گفتگو میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کو معذرت خواہ ثابت کرتا ہو۔ آپ دنیا کے سارے مردوں کے ایک ہی صف میں گھر دھونے پر اصرار کر رہے ہیں جس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے کئے کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور آپ کے خیال میں اس روش میں کوئی برائی نہیں ہے۔“

”میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا بھائی میاں!“ وہ بھی قدرے نرم پڑا۔ ”میں تو بار بار یہی کہہ رہا ہوں کہ ٹھیک ہے مجھ سے غلطی ہوئی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس ذرا سی بات کے پیچھے اپنا گھر خراب کیا جائے۔ میں اسے چاہتا ہوں۔ اپنے بچوں کو چاہتا ہوں۔ پھر یہ مجھے کس بات کی سزا دینا چاہ رہی ہے؟“

فاروق حسن نے اس کی بات مکمل ہونے پر سوالیہ نظروں سے ایقان کی جانب دیکھا تھا وہ اب ہونٹ چباتے ہوئے جیسے خود کو بہت کچھ کہنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔

”بولو ایقان!“ فاروق حسن بولے۔

”بھائی میاں!“ وہ سیکٹے لہجے میں بولی۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اگر معذرت خواہ ہیں بھی تو مجھے ان کی معذرت پر رتی برابر بھی یقین نہیں ہے۔ چور اگر چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے اور اسی وقت معافی مانگ لے تو کون ہے جو یہ یقین کرے گا کہ آئندہ یہ چور مزید چوری کا ارتکاب نہیں کرے گا؟ اس نے تو پکڑے جانے پر ایک رسمی کارروائی کے طور پر ہی معذرت کی ہے نا؟ یہی حال ان کا بھی ہے۔ یہ چکر کتنا پرانا ہے کب سے چل رہا ہے اور بات کہاں تک جا پہنچی ہے۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ میں نے ان کے رویے میں

کھنچاؤ اور فرق محسوس کیا لیکن یہ مجھے جھوٹی تسلیاں دیتے رہے۔ میں نے کئی بار ان سے وقت کی کمی کا رونا رویا یہ ہر بار کچھ نہ کچھ کہہ کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے اور جب میں نے ایک واضح ثبوت ملنے پر انہیں یہ باور کرایا کہ میں بہت کچھ سمجھ چکی ہوں تب انہوں نے اعتراف جرم اس انداز میں کیا جیسے سر سے بلا اتارتے ہیں۔ میرے نزدیک جو بات زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ ان کے لیے کھنچ و تفتی کھیل جسے بہت سے لوگ کھیلتے ہیں انہوں نے بھی کھیل لیا تو کیا برائی؟ معذرت اس کو کہتے ہیں؟ شرمندگی اس کا نام ہے؟ کیا گارنٹی ہے اس بات کی کہ کل کو یہ کھیل دوبارہ شروع نہ ہوگا؟ وہ حسین بلا وہاں جاپان میں ان کی دو روزہ جدائی برداشت نہ کر پائی۔ ان کے پیچھے وہ یہاں تک پہنچ گئی۔ یہ اسے لیے لیے پھرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہونٹوں میں عیاشیاں کرتے رہے۔ مجھ سے جھوٹ بولتے کہ آئندہ شروع کرنے والے بزنس کے متعلق معلومات حاصل کر رہے ہیں یا شاید یہی تھا ان کا ”آئندہ“ ہونے والا ”بزنس“ وہاں جاپان میں انہیں کس کا ڈر ہوگا؟ وہ حسینہ ہوگی۔ اور یہ ہوں گے میں یہاں ان کے پیچھے پالتی ہوں اپنی جان جلائی رہوں کھل کھل کر رہ جاؤں یہ ہر سال دو سال بعد تشریف لاؤں اور اپنا ”ہنسٹا بستا گھر“ دیکھ کر خوشی خوشی اپنی دنیا میں واپس لوٹ جائیں۔ بس! ان کی معذرت خواہی کے پیچھے یہی خواہش کار فرما ہے۔“

ایقان کے لفظوں میں سچائی گونج رہی تھی۔ کمرے میں کافی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر عاشر نے مہربی سانس بھرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”جو کچھ تم نے کہا سچ ہے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اپنا دل کھول کر تمہیں دکھا نہیں سکتا۔ تم میری کسی بھی بات پر تشویش نہیں کر دو گی۔ لیکن چلو یہ تو بتاؤ کہ تم اس مشکل کا کیا حل نکالتی ہو؟ اب جو ہوا سو ہوا لیکن آئندہ کیا کیا جائے؟ ہمیں شرف ایجاب ہے؟ اگر کسی چھوٹے گھر میں بیٹھا رہوں؟ کیا کروں میں؟ کیا چاہتی ہو؟“

”میں تم سے عین سچی چاہتی ہوں۔“ وہ قطعاً سچی نہیں بولی۔ ایک بجلی سی سب پر گری گئی۔ حقیقتہً حیات نے پھر رونا شروع کر دیا۔ دونوں بھائی بھی سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے رہ گئے تھے۔

”اس غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں کبھی تمہیں طلاق دوں گا۔“ عاشر غصے سے تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔

”تمہاری حماقت اور تمہارے باطل بن کی سزا میں اپنے بچوں کو کبھی نہیں دوں گا۔ سمجھیں تم!“

”میں طلاق نہیں چاہتی!“ وہ اطمینان سے بولی۔

”میں اپنے بچوں سے تم سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔ کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ یہ ایک بروکن فیملی کا حصہ بن جائے۔ لیکن یہ سب کچھ ہے کہ مجھ پر تمہارا کوئی حق نہیں ہوگا۔ قانونی طور پر تم سے وابستہ ضرور رہوں گی لیکن۔ لیکن عملی طور پر تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔“

وہ جھجک سی گئی تھی۔ بھائیوں کی موجودگی نے اسے بہت کچھ کہنے سے باز رکھا تھا۔ لیکن اس کے الفاظ کا مفہوم بے حد واضح تھا۔ عاشر ششدر رہی رہ گیا تھا۔

”ایقان!“ وہ قدرے بے بسی سے بولا۔ ”کیا کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”دوسرے یہ کہ میں اب تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی میں یہاں رہوں گی۔“ حیات ولا“ میں نے اپنے پورشن میں، لیکن اپنے بچوں کا ماہانہ خرچ تم مجھے دو گے کیونکہ بہر حال تم ان کے باپ ہو، ان کے کفیل۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن تم اپنا گھر چھوڑ کر یہاں رہنا کیوں چاہتی ہو؟ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو تمہیں وہاں رہنے میں کیا قیامت ہے؟“ وہ بالآخر ضبط کھوٹے ہوئے اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔

ایقان چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اس کی نظروں کی بے بسی، جھنجھلاہٹ اور کچھ نہ کچھ کہنے والی کیفیت سے وہ غجب مسرت سے ہنسنار ہوئی۔

ربیعہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کارڈ لیس اس کی جانب بڑھا رہی تھی۔  
 ”تمہاری کسی دوست کا فون ہے۔“  
 ربیعہ نے قدرے اچھے سے فون تھامنا۔  
 ”ہیلو۔“

”ربیعہ! دوسری جانب سے نہایت خوش و جذبے سے کہا گیا۔  
 ربیعہ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس کی تمام حسات بیدار ہو گئیں۔

”ترانہ۔۔۔ ترانہ۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔  
 ”ہاں ربیعہ! میں ہوں ترانہ، کیسی ہو تم ربیعہ؟ ٹھیک تو ہونا تم، تم خوش تو ہونا ربیعہ۔“ ترانہ بھی اس کی آواز  
 سن کر اس سے زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کی آواز میں بے پناہ جوش تھا۔  
 ربیعہ کی ہلکی سی ہنسی چمکنے لگی۔ کتنے عرصے بعد اس نے ترانہ کی آواز سنی تھی۔ کسی خونی رشتے کی مہک کو  
 محسوس کیا تھا۔ محبت کو محبت قریب محسوس کیا تھا۔

”ترانہ میں ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ تم میرے لیے بالکل فکر مند مت ہونا تم، تم کیسی ہو گھر میں سب  
 لوگ کیسے ہیں؟“

”ہاں ربیعہ۔ کیا باتوں تمہیں۔“ ترانہ دکھ سے بولی۔ ”یہ عرصہ کس طرح گزارا ہے میں نے۔ میرا دل  
 ہی جانتا ہے اور اور گھروالوں کا کیا پوچھتی ہو وہ سب ویسے ہی ہیں جیسا تم چھوڑ گئی تھیں۔“

”ترانہ! ربیعہ کو اس کی آواز سے گہرے دکھ کا اندازہ ہوا تو وہ بھی بے تحاشہ دھکی ہوئی۔  
 ”ترانہ! ربیعہ نے اپنے گھر والوں کو اپنی ساری باتیں سنائی تھیں۔ اس کی آواز زندہ گئی تھی۔

”ارے نہیں۔۔۔ نہیں ربیعہ۔“ ترانہ جلدی سے بولی ”تم جانتی ہونا۔ اتنی کمزور میں بھی نہیں ہوں کہ ہر کسی  
 کی بری بھلی سہ جاؤں اور جتنی محبت مجھے تم سے ہے اسی کے مقابلے میں یہ تھوڑی سی تکلیف اور پریشانی کوئی  
 حقیقت نہیں رکھتی ہے۔ ہر کسی کو اس کے لیے کچھ ملنا ہے ربیعہ۔ جیسے ابا کو ان کے کیے کا پھل ملنا ہے۔“

”پچھو کو؟ کیا ہوا انہیں؟“  
 ”پچھو بھی بتاؤں گی ربیعہ! یہی اتنا وقت نہیں ہے۔ میں اپنی دوائی کا بہانہ بنا کر گھر سے تھوڑی دیر کے لیے  
 نکلتی ہوں۔ پچھو اور قصبہ میں وہ وقت میری پیرے داری کرتے ہیں تاکہ مجھ سے انہیں کسی طرح تمہارا سراغ مل  
 سکے۔ میں صرف تمہاری خیریت جاننا چاہتی تھی۔ تم تم خوش ہونا ربیعہ؟“

”ہاں ترانہ! میں ٹھیک ہوں بالکل۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا ہے میں نے اور عباں بھائی کے گھر والے بہت  
 اچھے لوگ ہیں۔ میرے ساتھ بالکل اپنوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے۔“ ترانہ سچی خوشی سے معمور ہو کر بولی تھی۔  
 ”اور تم ترانہ؟“ ربیعہ نے جلدی سے پوچھا۔

اسی وقت لائن منقطع ہو گئی۔ ربیعہ نے گہری سانس بھر کر فون کی جانب دیکھا پھر عقیدت و محبت سے اسے چوم  
 لیا۔



شہلا نے ایک نگاہ چاروں جانب ڈالی تھی۔ دو کمرے، چھوٹا سا لاونج اور اس سے ملحقہ کچن! وہ ایک چھوٹے

”تمہارے گھر میں رہوں گی تو تم سے وابستہ رہنے کا احساس مجھے شکست و ریخت میں مبتلا رکھے گا۔“  
 مسلسل اسی کیفیت میں گہری رہوں گی کہ میں یہاں رہ کر تمہارے گھر کی دیکھ دیکھ ایک باندی کی طرح کر رہی ہوں  
 اور تم! تم وہاں کسی اور کی زلفوں کے سائے میں زندگی کی خوشیاں کشید کر رہے ہو۔ نہیں! میں اپنے گھر میں رہوں  
 گی اس احساس کے ساتھ کہ میں اور میری زندگی ہر قید و بند سے آزاد ہیں۔ کسی کو میری پروا نہیں اور مجھے کسی کی  
 پروا نہیں۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔ پہلا اور آخری۔ کسی رد و بدل کی توقع کے بغیر تم سے میرا تعلق صرف اور صرف  
 ہمارے دو بچوں کی زندگی کے اہم معاملات تک محدود رہے گا۔ جب بھی پاکستان آؤں سے ملنے آجانا اور بس  
 جا بھر کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے جیسے دھند سی اتری۔ پھر اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔“ وہ بولا تو اس کے لہجے میں دکھ کی گہری پرچھائیں کے ہمراہ سرکشی کا تاثر بھی نمایاں تھا۔ ”نہ  
 ساری زندگی ایک بیوہ۔ یا ایک مطلقہ کی سی محرومی میں مبتلا رہنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی۔ لیکن جیسے ہی تمہاری  
 کی رات میسر ہو تو یہ سوچنا کہ کس کو کتنا فرق پڑے گا۔“

وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے دروازے تک جا پہنچا۔ پھر لمحہ بھر کے لیے رک کر اس نے اپنے گھر کے  
 موجود افراد پر ایک نظر ڈالی۔

”صبح میری فلائٹ ہے۔ اب کب لوٹوں گا نہیں جانتا! میری طرف سے خدا حافظ۔۔۔ الوداع۔“  
 وہ کمرے سے نکل گیا۔ سب ہی نے دکھ کی گہری کیفیت میں ڈوب کر قدرے ملا متی نظروں سے ایقان کی جانب

دیکھا جو پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ سب کی نگاہوں کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے آپ میں لوٹی تھی پھر جیسے ان نگاہوں  
 میں موجود سوالوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بھی تیز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

”میری بچی۔۔۔“ شفیقہ حیات زار و قطار رونے لگیں۔ ”ٹھیک ہی تو کہہ گیا ہے وہ۔ شوہر والی ہو کر بھی بیوہ  
 یا طلاق یافتہ کی سی زندگی گزارے گی۔۔۔ ارے کوئی اسے کچھ نہ بولے۔“

”کچھ نہیں ہوتا اماں!“ فاروق حسن نے کسی سوچ سے نکلتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ ”یوں سمجھیں کہ ایک  
 طوفان تھا جو ٹل گیا۔ آج کی اس ملاقات میں ان دونوں کے لیے ہی اس انتہائی قدم کو اٹھانے سے گریز کیا جس سے میں

خوف زدہ تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں یہی چاہت انہیں ایک دن پھر قریب  
 آئے گی۔ ایقان نا سمجھ ہے لیکن میں بھی چاہتا ضرور ہوں کہ عاشر کو اس لیے کیے کی کوئی نہ کوئی سزا ضرور ملے

چاہے ایقان کا فیصلہ ایک لحاظ سے درست بھی ہے۔ آخر مرد کے لیے بھی خدا کی جانب سے مقرر کردہ حدود ہیں  
 جن کا اسے پاس کرنا چاہیے۔ عاشر نے ایقان کو زمانہ قدیم کی کوئی بے بس ناخواندہ عورت کو بھی غلطی کی تھی۔

اس کے نرم رویے اور وابستہ آجانے کے وعدے پر سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتی۔ ساری عمر کی جدائی چاہتی ہے یہ بھر  
 غلط! لیکن بہر طور جلد یا بدیر ان دونوں کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گا۔ تب تک انہیں علیحدہ علیحدہ اپنی سوچوں سے

نبرد آزما رہنے دیں یہی دونوں کے لیے بہتر ہے۔“  
 شفیقہ حیات کے آنسو ٹھہم گئے تھے۔ سلجوق حسن اور عذرا جیکم نے بھی مطمئن انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ

فاروق حسن ماں کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔



وہ سر جھکائے بے حد اشدھاک سے اپنی آنکھوں کا جائزہ لے رہی تھی جب انہی کمرے میں داخل ہوئی۔  
 ”ربیعہ۔۔۔“



سے رقبے پر بیٹھی ہوئی انیکسی یا ایک قدرے بڑے گیسٹ روم کی مانند تھا۔

”تو تم نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟“ اس کی نگاہ ہر جانب سے ہو کر سامنے بیٹھی ہوئی ایقان کے چہرے پر آئی۔

”تمہارے خیال میں یہ ایک غلط فیصلہ ہے؟“ ایقان نے جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے سوال کیا۔

”پتا نہیں ایقان۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ”ہر مسئلہ ایک دائرے کی مانند ہوتا ہے۔ دائرے کے

اندر موجود شخص کو وہ اور طرح سے دکھائی دیتا ہے اور دائرے سے باہر موجود شخص کو اور طرح سے۔ اور دائرے

کے باہر جو لوگ موجود ہوتے ہیں وہ دائرے کے اندر موجود شخص کی کیفیت کو پوری طرح سے نہیں سمجھ پاتے۔“

”پھر بھی۔۔۔“ ایقان نے اصرار کیا۔ اپنا اپنا نقطہ نظر تو ہوتا ہے نا۔ تم کیا کہتی ہو؟“

”ایک عورت ہونے کے ناتے میں اس انا کو سمجھ سکتی ہوں ایقان! جس نے تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا لیکن

ایقان ایک دن اپنی اسی انا کا گلا عورت اپنے ہاتھ سے گھونکتی ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں۔“

”تم مجھے بھی اچھی طرح سے جانتی ہو شہلا!“ ایقان ضدی پن سے بولی۔

”ہاں!“ اس نے گہری سانس لی۔ ”تمہیں بھی جانتی ہوں۔ اسی لیے کچھ بھی کہنے سے گریز کر رہی تھی۔

تمہاری انا کی سطح عام انسان کی سطح سے بلند ہے میں سمجھتی ہوں۔“

”شہلا شہلا تم جانتی ہو گواہ ہو تم میں نے اتنے سالوں سے کتنا بے تحاشا چاہا ہے۔ ہر لمحہ ہر مل اس کا خیال

دل و دماغ میں اس طرح پیوستہ رہا کہ اور کچھ سوچنے یا غور کرنے کی میں حسیں ضرورت ہی نہیں سمجھتی۔ اس کی

جدائی میں اس کی قربت اور اس کی قربت میں اس کی جدائی کے بارے میں سوچتی رہی اور اس نے اس نے

میری محبت میرے اعتبار و اعتماد کی دھجیاں اس قدر آسانی سے بکھیر دیں؟ وہ عورت کتنی ہی جھپٹتی ہو لیکن وہ

ایقان تو نہیں تھی۔ وہ اس کی محبت تو نہیں تھی۔ کیسے اس کا دل مانا کہ وہ اس کے قریب جائے۔ کیسے اس کے ضمیر

نے گوارا کیا کہ وہ اسے چھوئے؟ اس سے وہ باتیں کیے جو وہ اس کی انا میں سمجھ سکتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے ایقان یہ تمہاری غلط فہمی ہو۔ شہلا نے ضرور سے کہنے میں کہا تھا۔“ اس عورت نے عاشر بھائی

کو مجبور کر دیا تھا۔“

”نکن پوائنٹ پر؟“ ایقان نے طنز سے اس کی بات کاٹی۔ ”دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس بات پر قائل نہیں کر سکتی

کہ کسی عورت نے کسی مرد کو مجبور کر دیا۔ یہ صرف اور صرف مرد کے اندر چھپا بیٹھا ناپ ہے جو مخالف کو راضی برضا

دیکھ کر کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس نے مجھ سے جب وفا کی ہے بی بی یہ بات روستی کی مانند عیاں ہے مجھ پر اور

اور میں اب اس کے قریب نہیں جاسکتی۔ مجھے ہمیشہ اس کے ہاتھوں سے اپنے جذبوں کے خون کی بو آئے گی۔ مجھے

مجھے اس کی سانسوں سے کسی دوسری عورت کے وجود کا۔“

وہ بات مکمل نہ کر پائی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر رو دی۔ شہلا متاسف نظروں سے اس کی جانب

دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس نے ایقان کو اپنے شانے سے لگا لیا۔

”نمت رو ایقان۔۔۔ مضبوط فیصلے کرنے والوں کو پہلے اپنے آنسوؤں جیسی کمزور شے کو مات دینی پڑتی ہے۔ اگر تم

واقعی یہی سمجھتی ہو کہ تمہارا فیصلہ درست ہے اور اٹل ہے تو پھر اپنے آنسوؤں کو یہ یاد کرو اور نہ یہ ہمیشہ تمہارا

اور تمہارے فیصلے کا منہ چراتے رہیں گے۔ تمہیں جتانے رہیں گے کہ تمہارا فیصلہ غلط تھا۔“

”کبھی نہیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔

”اور ایقان! کوشش کرنا تمہارے معصوم بچوں کے ذہنوں میں قبل از وقت وہ سوال نہ اٹھیں جو انہیں بھی

پریشان کر دیں اور تمہیں بھی۔ انہیں یہ احساس مت دلا نا کہ ان کے باپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی پاداش

میں انہیں یہ ہجرت کرنی پڑی ہے۔ میں معصوم سوالوں کے درد سے آشنا ہوں اسی لیے تمہیں یہ مشورہ دے

رہی ہوں۔

”میں سمجھتی ہوں۔“ ایقان نے سر جھکا لیا۔

”میں اب چلوں۔“ شہلا گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اسپتال سے سیدھی تمہارے پاس ہی چلی آئی تھی۔

”سب ہی تمہارے مسئلے سے ڈسٹرب ہوئے ہیں ہیں نا۔“ وہ افسردگی سے مسکرائی۔ ”میرے اپنے ہیں۔ میرے دکھ پر لازماً“ دکھی ہوں گے۔ ہر کوئی تسلی اور دلاسا دینے آیا ہے۔ شام بھی آیا تھا ہاشم تو تم جانتی ہو مجھ سے کچھ زیادہ ہی افسوس ہے۔“

”ہوں۔“ شہلا ہلکا سا مسکرائی۔

ایقان نے اس کا چہرہ دیکھا پھر کچھ دیر دیکھتی رہی۔

”شہلا۔ ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں۔“ وہ چونکی ”ضرور۔“

”تمہیں ہاشم سے میرا مطلب ہے ڈیو لوو ہم؟“ اس نے پوچھا۔ ”جی ہاں۔“ وہ نے ہنسی سے اس سوال کی امید نہ تھی۔ پھر وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ ایقان نے قدرے خفگی سے اٹے دیکھا۔

”تمہارے سوال کا جواب کیا ہے مائی ڈیئر فرینڈ۔ یہ شاید میں خود بھی نہیں جانتی۔“ اس نے ایقان کا سر ہلایا۔

”جس دن مجھے مل گیا۔ اسی دن تمہیں بھی ضرور ملے گی۔“ ایک ہے؟“

ایقان اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

چھوٹے سے پارک کی پختہ روش پر وہ دونوں ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ راستے میں پڑے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو جوتے کی ٹوک سے اڑاتے ہوئے بے فکری سے چھپس کھاتے ہوئے منظر کا دل و دماغ بے حد فریش تھا۔

نافع یہ بات پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا اور اسے اس بے فکری اور فریش فیس کا پس منظر بھی معلوم تھا۔ کل ہی اس کی منگنی اس کی پسند سے اس کی پیچھے زاد سے ہوئی تھی۔ نافع نے کبھی اس فینکشن میں شرکت کی تھی اور وہ جانتا تھا کہ منظر صرف خوش نہیں بلکہ بے حد خوش ہے۔

منظر سے اس کی دوستی زیادہ پرانی نہ تھی۔ ابھی چند ماہ قبل ہی دونوں کی ملاقات ہوئی تھی اور پھر کئی دنوں میں ان ایک دوسرے سے کافی قریب ہو گئے تھے۔

کسی رومانوی گانے کی دھن پر سیٹی بجاتے ہوئے وہ بیچ پر جا بیٹھا تھا۔ نافع بھی خاموشی سے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ منظر نے لکھت سیٹی بجانا موقف کر کے اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے؟ آج گھر والے کی ہے کیا؟“

”نہیں تو۔“ نافع لہجہ بھر کے لیے گڑبڑا گیا۔ ”کیا مطلب؟“

”کدو؟“

”کیا ہے یار۔“ وہ جھلا گیا۔ ”تم سے کس نے کہا کہ میں تمہاری دعوت کر رہا ہوں۔ میرے گھر پر کیا پا کا ہے اس سے تمہیں کیا مطلب؟“

”مجھے اس سے مطلب نہیں۔ میں تو محض تمہاری سنجیدگی خاموشی اور افسردگی کے جملہ اسباب جاننے کی

کوشش کر رہا ہوں۔“

”تمہیں کس فرشتے نے خبر کی کہ میں افسردہ ہوں؟“ وہ مزید جھلایا۔

”سنجیدہ اور خاموش تو ضرور ہو۔ اس سے تو انکار نہیں کر سکتے نا؟“ وہ مسکرایا۔

نافع خاموش ہو گیا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ اس کی تردید چاہتا بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ منظر کی شگفتگی اور خوشی سے اس کے اندر عجب ملال سے اتر آئے تھے۔ وہ بہت سے سوالوں کے درمیان گھر گیا تھا اور یہی اس کی خاموشی کا سبب بھی تھا۔

”میں سوچ رہا تھا۔“ اس نے یونہی گھبرا کر بات بتانی چاہی۔ ”کہ تم تم آج بہت خوش نظر آتے ہو۔“

”ہاں تو میں ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”وجہ محض کل کی تقریب ہی ہے یا کچھ اور بھی؟“ وہ روکھے پن سے بولا۔

”یہ ہے۔“ نافع نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”یہ وجہ تمہارے نزدیک محض ہے؟ میری منگنی ہوئی ہے یا ز میری پسند سے کتنی بڑی وجہ ہے خوشی کی۔ جسے تم محض قرار دے رہے ہو۔ ویسے بانی دادے تمہارا بھی تو نکاح ہو گیا ہے نا۔“

”ہوں۔“ اس نے بے دلی سے ہنکارا پھر۔

”خوش نہیں ہو شاید؟“ منظر نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے میں نے تو سبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔“

”اب بناؤ مت یا ر تم کوئی فرشتہ ہو؟ انسان ہو یا فرشتہ جیسے اور یہ رشتہ تو ہوتا ہی انوکھا ہے۔ دنیا کے ہر رشتے میں ایک طرف محبت ہے۔“

”پتا نہیں۔“ نافع نے انہیں انداز میں دیکھا۔ ”میں نے کبھی اس طرح کی محبت کو محسوس نہیں کیا۔“

”کیوں؟“ گدھے ہو گیا؟“

نافع نے خفگی سے اسے دیکھا تو وہ دھناتی سے ہنسنے لگا۔

”کمال آوی ہو یا ر! محبت کی لطافت اور ندرت سے انکاری ہو۔ خیر شاید ابھی ہم اتنے کلوز نہیں ہوئے کہ تم اپنے اندر کی باتیں آشکار کرنے کے لیے میرا انتخاب کرو لیکن اتنا ضرور ہے کہ تمہارے اندر کچھ ہے ضرور کوئی غبار، کوئی جس زہ سوچ۔“ پھر اس نے سوچ میں ڈوبے خاموش بیٹھے ہوئے نافع کے کاندھے پر ہتھکی دی۔

”جس نے مجھ پر ہتھ کیا؟“

نافع نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔

\*\*\*

ہاتھوں میں کتابیں تھامے وہ بے حد مصروف سے انداز میں باہر نکلا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ سامنے سے آتی ہوئی دروازے پر پڑی۔ دروازے نے بھی رافع کو ٹھکرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ پھر وہ رافع کے سامنے آ کر۔

”آپ یونیورسٹی جا رہے ہیں نا؟“

”ہاں۔“ وہ بولا ”آج پینتیس جمع کروانا ہے۔ تم؟“

”میں آج نہیں جاؤں گی۔“ وہ سنت سے انداز میں بولی۔ ”ایقان خالہ کی وجہ سے کچھ بھی اچھا محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ آپ پلیز ایک پیغام پہنچا دیں گے؟“

”ہوں؟“ وہ چونکا۔ ”ہاں ضرور یوں۔“

”وہ ربیعہ میرا انتظار کر رہی ہوگی ہم دونوں ساتھ ہی نکلتے ہیں نا۔۔۔“

”ربیعہ؟“ رافع کے لب دھیرے سے بے اور چہرے نے کئی رنگ بدلے۔

”وردہ نے اس کا چہرہ دیکھا پھر سر جھکا لیا۔“

”آپ کو دیر ہو رہی ہو تو کوئی بات نہیں۔ میں خوب چلی جاتی ہوں اسے بتانے۔“

”ارے نہیں۔“ رافع مسکرایا۔ ”میں تمہارا میسج دے دیتا ہوں ڈونٹ وری۔“

”مختصک یو۔“ وہ ممنونیت سے مسکراتے ہوئے کرپٹ گئی۔

رافع مرکزی گیٹ کی جانب بڑھ گیا تھا۔ سیاہ سڑک پر آہستہ روی سے چلتے ہوئے وہ نجانے کیا کچھ سوچ رہا تھا۔

کیسے رستے تھے یہ جولا کھ گریز کرنے پر بھی ایک ہی سمت کو جاتے تھے۔ کتنے دن لگتے تھے دل کو سمجھانے میں اور

پل بھر میں وقت پھر اسے اس کے سامنے لا کھڑا کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر لفظ سے لفظ جڑنے لگتے تھے۔ تخیل کا سیل

رواں بہا کر کہاں سے کہاں لے جایا کرتا تھا اور اس کی سوچ ایک کمزور تنکے کی مانند بھٹکتی پھرتی تھی۔

یکدم رافع ٹھنک کر رک گیا۔ سفید بنگلے کی دیواروں پر چڑھی ہری بیلوں نے اس کے قدم روک لیے تھے۔ وہ

آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔

لکڑی کے چھوٹے پھانک سے قریب ربیعہ کھڑی تھی۔ لیمن کلر کے کپڑوں پر بڑا سا سفید دپٹہ اور سفید

اسکارف لیے وہ موسم سے بے ہوشی ہوئی گڑیا لگ رہی تھی۔

اس کا دھیان رافع کی جانب نہ تھا۔ وہ سڑک کے پار گھنے درختوں کے عقب میں چھپے پارک کی سمت دیکھ رہی

تھی۔ نجانے وہ اس قدر انہماک سے کیا سوچ رہی تھی۔

رافع اس کے قریب پہنچ کر ہوصلے سے کھٹک بھرا۔ ربیعہ بڑی طرح سے چونک اٹھی۔

”آپ! آپ! آپ! اللہ تعالیٰ آپ کو محفوظ رکھے۔“ رافع کا سامنے ہونا اس کے لیے بے حد حیرت تھا۔

رافع کو نجانے کیوں خوش فہمی سی ہوئی۔ شاید وہ اسی کو سوچ رہی تھی تب ہی اسے سامنے آکر لگیوں خیران سی ہو

گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ دیر سے مسکرایا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔“ ربیعہ بھی اپنی کیفیت پر قابو پا کر شگفتگی سے مسکرا دی۔

رافع کو یوں لگا تھا جیسے وہ صبح مزید خوب صورت، مزید چمکیلی ہو گئی تھی۔

”یونیورسٹی جانے کی تیاری میں ہیں؟“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

”تیاری تو کب کی ہو چکی میں وردہ کا انتظار کر رہی ہوں وہ اب تک نہیں آئی۔ پوائنٹ نکل جائے گا۔“

”وردہ کا ہی میسج ہے آپ کے لیے وہ آج یونیورسٹی نہیں جائے گی۔“

”اوہ۔“ ربیعہ یکدم پریشان سی ہو گئی۔ ”لیکن کیوں؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا شاید ناسازی طبع اس کی وجہ ہو۔“

”اچھا!“ ربیعہ مایوس سی ہوئی۔ ”پھر میں بھی نہ جاؤں۔“ اس نے جیسے خود کلامی کی تھی۔

”مشورہ مانگ رہی ہیں؟“ رافع شوخی سے مسکرایا۔

ربیعہ چونکی پھر دھیرے سے ہنسی۔

”نہیں۔۔۔ بلند آواز میں سوچ رہی ہوں۔“

”ویسے میں یونیورسٹی ہی جا رہا ہوں۔ مجھے پچاس کے سلسلے میں تھوڑا کام ہے۔“

ربیعہ اس کا مطلب سمجھ کر چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی تھی۔ پھر وہ لکڑی کا پھاٹک کھول کر باہر نکل آئی۔

”جب ایڈیشن لے ہی لیا ہے تو کبھی کبھار اکیلے کلاس اینڈ کرنے کی عادت بھی ہونی چاہیے۔“ وہ بولی۔

دونوں صاف ستھری سڑک پر ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ رافع نے ایک مرتبہ پھر صبح کی تازگی اور خوب صورتی کو پوری طرح سے محسوس کیا۔ سورج ابھی ٹھیک طرح سے طلوع نہ ہوا تھا۔ آسمان کا رنگ نظروں کو اپنی جانب کھینچتا تھا۔ پارک کی جانب سے آئی ہوا اپنے سنگ مختلف درختوں کی ملی جلی خوشبو کھینچ لاتی تھی۔

”کئی دنوں سے آپ پارک میں نہیں آئیں۔ کیا صبح کی سیر سے جی بھر گیا؟“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں چل قدمی تو کرتی ہوں لیکن گھر کے لان میں ہی شوق پورا کر لیتی ہوں۔“

”اچھا۔۔۔“ رافع ہنسا۔ ”میں بے وجہ ہی منتظر۔“

وہ اچانک ہی خاموش ہوا تھا۔ بے خودی میں گھر کر نجانے زبان کیا کہنے چلی تھی۔ لیکن قابو پا رہی تھی۔

دیر ہو گئی تھی۔ لفظوں کا مفہوم پوری طرح سے عیاں ہو گیا تھا۔ رافع جی ہی جی میں ہنسنے لگا۔ شرمندہ ہوا۔ اس سے پھر کچھ بھی نہ بولا جاسکا۔

دوسری جانب ربیعہ بھی سن ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کو اپنے چہرے پر ہونے والی گری محسوس ہوئی تھی۔ ان ادھورے انگوٹوں کا مفہوم کیا تھا؟ وہ سمجھ کر بھی نا سمجھی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ تب ہی مین سڑک پر آتے ہوئے پوائنٹ کو دیکھ کر دونوں کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

”خدا حافظ!“ ربیعہ نے رسمی سا مسکراتے ہوئے کہا۔

”خدا حافظ!“ رافع کے لبز اس لیے۔

وہ اب تک اپنے کپے پر شرمندہ تھا۔

وہ راؤنڈ مکمل کر کے لوٹی تھی۔ ڈیوٹی روم کی وقت خالی پڑا تھا۔ شہلا نے انٹر کام پر چائے کے لیے کہا اور بیٹھ کر ضروری فائلز دیکھنے لگی۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ شہلا نے جھپکی اسکرین پر دیکھی۔ کال انویک کی تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو آپ!“ دوسری جانب لہجے سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔

”ہاں اینٹہ بولو۔ کیا بات ہے؟“ وہ یکدم متفکر ہوئی۔

”وہ میں عمر کو لینے اسکول گئی تھی۔“

”تو پھر؟“ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

”وہاں ابراہیمائی موجود تھے وہ عمر کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

شہلا کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ساتھ۔۔۔ کیا مطلب ساتھ لے گئے ہیں۔ کیوں لے گئے۔ تم نے عمر کو جانے کیوں دیا۔“

”اوہ آپ! اتنی زیادہ نیشن نیلیں۔“ وہ نرمی سے بولی۔ ”آپ تو جانتی ہیں عمر مسلسل ان سے کانٹیکٹ میں رہتا ہے عمر نے ان سے فرمائش کی تھی کہ انے پھر انے اور شاہجنگ کروانے کی اس نے مجھے خود بتایا کہ وہ یہاں کے ساتھ جانا چاہتا ہے میں پھر کیا کہہ سکتی تھی۔“

”اوہ انیہ۔۔۔! تم نہیں جانتیں یہ شخص مسلسل عمر کی برین واشنگ میں لگا ہوا ہے۔ نجانے کیا کر کے رہے گا یہ۔“

وہ بے حد پریشان ہو چکی تھی۔

”اور عمر۔۔۔ یہ لڑکا تو میرے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ میں اسے کتنا سمجھاتی ہوں لیکن۔۔۔“ اس کے الفاظ اس کے لبوں میں ہی رہ گئے۔ اس کی ساتھی ڈاکٹر زردروازہ کھول کر ہنستی مسکراتی اندر آ رہی تھیں۔

”واپسی کے متعلق کیا کہا اس نے؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابراہیمائی کہہ رہے تھے وہ اسے ورن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ مدھم سا بولی۔

”وہ؟ ورن؟“

”جی ہاں یوں بھی ویک اینڈ ہے۔ عمر کی چھٹی بھی ہے اسکول سے۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں آپ! عمر تو بے حد خوش تھا۔ اس نے مجھے بالکل لفٹ نہیں کروائی۔“

”وہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوہ؟ ورن؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”اوپاں یاد آیا پہلے بھی آپ نے بتایا تھا“ وہ خوش ہوا۔ ”پھر تو میرا گھر یہ ہے نا یا؟“  
 ”ہاں میری جان! میں نے کہا نا یہی تمہارا گھر ہے۔“ وہ اپنی پلیٹ میں چاول ڈالنے لگا۔  
 ”لیکن بابا! یہاں تو صرف آپ رہتے ہیں اکیلے۔ میں تو نانو کے ساتھ سوتا ہوں یا پھر ربیعہ خالہ کے ساتھ۔ میں  
 یہاں کیسے سوؤں گا؟“

ابرار نے اس کی جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرایا۔  
 ”میرے ساتھ سونا۔۔۔“

”ہاں بابا!۔۔۔“ وہ نیم دلی سے بولا۔ ”لیکن مجھے کہانی سنے بغیر نیند نہیں آتی نا۔“  
 ”میں تمہیں ڈھیر ساری اسٹوری بکس دلوں گا۔۔۔ روز بڑھا کر نا۔“  
 ”ایسا کیوں نہ کریں بابا!۔۔۔ نانو ربیعہ خالہ اور خالہ جانی کو بھی یہاں لے آئیں۔“ اسے نئی ترکیب سوچھی تھی۔  
 ”کتنا مزہ آئے گا سب لوگ مل کر رہیں گے۔“  
 ”مما کا نام نہیں لیا تم نے۔۔۔؟“ ابرار نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ ”تمہاری ممما کو یہاں لے آئیں تو کیسا  
 رہے؟“

عمر ایک دم خاموش ہوا تھا۔ وہ دوست پیس کاٹنے سے توڑنے لگا۔ ابرار نے اس کے انداز کو بطور خاص دیکھا۔  
 ”بولو عمر۔۔۔؟“ اس نے اصرار کیا۔ ”تم نے جواب نہیں دیا۔“  
 ”بابا!۔۔۔ مجھے تھوڑے بہتے چاول دیں نا۔۔۔“  
 ابرار نے اس کی پلیٹ میں چاول ڈالے اور اپنا چمچ پلیٹ میں رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر وہ چاول کھاتے عمر  
 کو غور سے دیکھنے لگا۔

”عمر!“  
 ”جی بابا!“

”آپ اپنے بابا کی بات کو انور کر رہے ہو جانو؟“  
 ”نہیں بابا یہ بات نہیں ہے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔  
 ”پھر کیا بات ہے؟ مجھے سچ بتاؤ۔۔۔“  
 ”وہ۔۔۔ ممما کہتی ہیں اپنے بابا سے میری باتیں بالکل مثبت کرنا۔ اگر بابا کوئی بات کہیں بھی تو تو تم خاموش رہنا۔“  
 ”ہوں!“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”اصل میں جانو بات یہ ہے کہ آپ کی ممما ہم سے ناراض ہیں اسی  
 لیے۔“

”انہوں نے ہاشم انگل سے شادی کر لی؟“ وہ بے ساختہ ہی بولا تھا۔ ابرار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔  
 ”لیکن بابا!۔۔۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وہ ہاشم انگل کی دلہن بن کر ان کے گھر چلی گئی ہیں۔ اگر آپ نے  
 انہیں یہاں لانا تھا تو آپ ان سے شادی کرتے۔ اب وہ یہاں نہیں آسکتیں۔“  
 ابرار گم صدم سا ہو کر اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔  
 ”اور آپ بھی ان کی باتیں نہ کریں بابا! ممما ناراض ہوتی ہیں۔“ اس نے بے حد مدبرانہ انداز میں گویا اسے  
 سمجھایا تھا۔

ابرار دھیرے سے مسکرایا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔  
 ”دو نوٹوری عمر! تم دیکھنا ایک دن ہم تمہاری ممما کو منالیں گے۔“  
 ”ریٹلی؟“ اس کی معصوم آنکھیں چمک اٹھیں تھیں۔ ”ممما ممما مان جائیں گی بابا؟“



”جی ممانی جان! کیسے کچھ چاہیے آپ کو؟“ وہ کیتلی کوئی کوزی لے کر دھانچتے ہوئے بولی۔

”اے ہٹو کچھ نہیں چاہیے۔ یہ بتاؤ یہ لوگ پہلے بھی آئے ہیں کیا؟“

”سب تو نہیں البتہ فریحہ ایک مرتبہ آئی تھی۔ ثانیہ! پلیریز برتن رٹالی میں لگا دو۔“ وردہ نے ان کی بات کو جواب دیتے ہوئے ثانیہ کو ہدایت بھی دی۔

”دیکھنے آئے ہیں یا باقاعدہ رشتہ ہی ڈال رہے ہیں۔“

”مجھے خبر نہیں ممانی جان!“ وہ مسکرا دی۔ ”میں تو تب سے کچن میں ہوں۔ اندر کیا بات چیت چل رہی ہے مجھے خبر نہیں۔ لیکن آپ تو اندر سے ہی آ رہی ہیں نا!“

”ارے، ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آیا ان کے انداز تو ایسے ہیں جیسے منتقلی ہوئے بھی مدت گزر گئی ہو۔ اب تم لوگ کچھ چھپاؤ تو ہمیں کیا خبر!“

وردہ تنہا رہ گئی۔ وہ اپنی بات کہہ کر پھر پلٹ کر ڈرائنگ روم کی سمت چل پڑی تھیں۔

”دیکھا تم نے۔“ وردہ ثانیہ کی جانب مڑی۔

”برسوں سے دیکھ رہے ہیں۔“ وہ بے پروائی سے کباب پلیٹ میں رکھتی رہی۔ ”میں اپنا کام کرو۔“ وردہ گہری سانس بھر کر رٹالی کا جائزہ لینے لگی تھی۔

اس چھوٹے سے گھر کے لیے وہ ایک بے حد خوشی کا دن تھا۔ انہی کی پیشی نے وقت رخصت اپنے نفیس سے پرس سے ایک مٹھلیں ڈھیا نکالی تھی اور رابعہ بیگم کی جانب سے اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا تھا اور رابعہ بیگم سوائے مسکرائے کے کچھ نہ کہہ پائی تھیں۔

تب انہوں نے ڈائمنڈ رنگ ناعمہ کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں ڈال کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

”یہ صرف شکر ہے۔“ وہ بولی تھیں ”باقاعدہ رسم، شہزادہ صاحب کی مرضی کی تارن پر کچھ ہے۔“

”اور رسم کیسے ہوتی ہے۔“ فردوس بیگم نے ناگوار لہجے میں پوچھا۔ ”مٹھلی اور پھولوں کے بوکڑوں کو دیکھا تھا۔ صد شکر کہ ان کی برور ہاٹ صرف ان کے پہلو میں کھڑی ثانیہ ہی سن پائی تھی۔“

ان کے جانے کے بعد سب ہی ہنسی خوشی رابعہ بیگم اور ناعمہ کو مبارکباد دینے لگے تھے۔ رابعہ بیگم کا پتلا چہرہ ان کی کچی خوشی کا منظر تھا۔ ناعمہ ہونٹوں سے محض سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ خود پر سے گزرنے والی افاد نے جیسے اس کے حواس مفلوج کیے ہوئے تھے۔

”رائمہ کو فون کر کے بلاؤ وردہ۔“ رابعہ بیگم کو بڑی بیٹی کی یاد ستائی۔ ”اس غریب کو تو کچھ خبر ہی نہیں ہے۔“

”اے میں بھی چلوں!“ فردوس بیگم انھی تھیں۔ ”ماہین کو اطلاع کروں جیسے ہمیں اپنی پھولی بات چاہیے۔“

اسے بھی بتا دیں ہاں!“

کئی افراد انہیں جاتا دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔

\*\*\*

ماہین دوڑی دوڑی چلی آئی تھی اور اب بے حد دلچسپی اور اٹھناک سے ماں کی گفتگو سن رہی تھی۔

”یہ بڑی گاڑیاں اور دونوں میں ڈرائیور موجود یوں جیسے کہیں کے رئیس زادے ہوں۔ اے ماہین! یہ بوگی ناعمہ تو بڑی ہوشیار نکلی۔ نجائے کہاں سے اس نے ایسا ر میں زادہ قابو کیا۔ ہمیں نہ آئیں ایسی ہوشیا ریاں اور بیٹیاں ہم سے زیادہ بھولی۔“

”کچھ پتا نہیں چلا آپ کو یہ رشتہ آیا کیونکر؟ انہوں نے ناعمہ کو کہیں دیکھ کر پسند کیا یا لڑکے اور لڑکی کی باہمی

پسند ہے؟“

”ارے ہمیں کوئی کچھ بتائے تو ہمیں پتا بھی چلے۔“ وہ مایوسی سے بولیں۔ ”کن سوئیاں لینی تو ہمیں آج تک نہ آئیں۔“

”وہاں موجود افراد کی باتوں سے اندازہ نہ ہوا آپ کو؟“ ماہین قدرے خفگی سے بولی۔ ”ایک تو آپ کی سمجھ بھی ایسی ہی ہے نا۔“

”اب تمہیں بلایا ہے تم پتہ کرو ماجرا کیا ہے۔“ وہ سرگوشی میں گویا ہوئیں۔ ”ارے ہم نے بھی بس جلد بازی سے ہی کام لیا۔“

”کس معاملے میں؟“ اس نے نا سمجھی سے ماں کو دیکھا تھا۔

”اپنی عریشہ کے معاملے میں اور کس معاملے میں۔“ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

فریحہ نے ماں کی بوتل نکالتی عریشہ کے ہاتھ اپنا نام سن کر سست پڑے تھے۔

”وہ تو اب تنگ نا لڑاؤں ہے آپ لوگوں کے اس غیر منصفانہ فیصلے پر۔ نہ لڑکی کی رضا مندی ڈھنگ سے لی نہ کسی اور کی رائے کو کوئی اہمیت دی۔ اب دیکھ لیجئے باغ میں رکھا ہی کیا ہے؟ یہاں ہماری بہن برتن مانجھے گی اور وہاں ہونکمی ناعمہ راج کرے گی۔“ ماہین نے بھی پیچھوسلے پھوڑے تھے۔

”بس ماہین! غلطی ہی ہوئی!“ انہوں نے کیف افسوس ملے۔

عریشہ فریحہ کے پاس ہی کھڑی نجائے کیا سوچنے لگی تھی۔

”کر کیا ہے لڑکا؟“ ماہین پھر اپنے تفتیشی انداز میں بولی۔

”نکلیا گیا جانوں۔“ اس نے بتایا تو ہوتا۔

”لیجئے پھر لڑکا نکلا۔“ لڑکی لہجے میں ”ماہین کو مان کر ہٹا دیا۔“

”فراز نام ہے لڑکے کا۔ تصویر وردہ نے مجھے دکھائی تھی اس کی۔ اے! ماشاء اللہ ایسا خوبہ جوان کہ نظر بھر کر نہ دیکھے کوئی۔“

”اچھا۔ واقعی؟“ ماہین کو حسرت ہوئی۔

”گھر والے ایسے عمدہ لوگ اور ہمیں ایک سے بڑھ کر ایک۔ بڑی شادی شدہ ہے بلکہ اور چھوٹی والی شادی کی ابھی کہیں بات نہیں ہوئی۔“

”عمر عریشہ نے دیوار کا سارا لیا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگی تھی۔ ان سب ناموں سے وہ بخوبی واقف تھی۔

”مجھے تو لگتا ہے ماہین! یہ ناعمہ کا ہی کام ہے۔ اسی نے کہیں سے یہ لڑکا پیچھے لگایا ہے۔ کیسی گھنی نکلی ہے یہ اور صورت دیکھو تو فرشتوں کی سی۔“

”کیا خبر ای۔“ ماہین بے دلی سے بولی۔ ”بغیر جانے بوجھے کیا کسی پر الزام دھرتا ناعمہ اور وردہ ایسی لڑکیاں نہیں ہیں۔“

عریشہ سکتے کی حالت میں اب تک اپنی جگہ کھڑی تھی۔

بقیہ اگلی صفحہ پر

انراہمن کی سخت باتیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن تراز اس کی ایک نہیں سہتی۔ جس پر ربیعہ کو براہ راست سے گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

ربیعہ کا عہد کے گھر میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ مندرجہ گیم ربیعہ کو اپنی بیٹی بنا لیتی ہیں۔

تمدد شہلا کی شادی کی تقریب میں ہی نافع اور عریشہ کا نکاح پر عواذیا جاتا ہے جس پر عریشہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔

ایا اولیں رات ابرار جیلانی کا فون شہلا کو پریشان کر دیتا ہے۔ شہلا شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس

رات ابرار سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم شہلا کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔

ابراہیم اور حقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عریشہ کے لیے

نئی اندر پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فرازی بھی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔

ایا کو ربیعہ میں اپنے آئینہ کی جھلک نظر آتی ہے جس کا غلم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔

ایا ناشر کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے عاشر سے لینے ایئر پورٹ جاتا ہے۔ ایقان عاشر کے پراسرار رویے پر مشکوک

ہوتا ہے۔

شہلا کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فریوس گیم کا سرد رویہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے

دوبارہ کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شہلا ربیعہ کے ہناؤ کے راجعہ گیم کے گھر آتی ہے۔ شہلا ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے

ربیعہ دورہ کے مشورے سے ایم ایچ کو شیاو جی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔

عراشہ سے ملنے ہوٹل پہنچتا ہے تو لڑا اسے پرپوز کرتی ہے۔ عاشر لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا رومال ایقان

پر لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشر سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشر بوکھلاہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان

بہت صدمے سے گنگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ دورہ سے ملنے اس کی کھلائی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑا کی دشمنی رافع سے ہے۔ یہ سچا خبر اسے صدمے

پر چار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ دورہ کے لیے اپنے دل میں

بجذبات محسوس نہیں کرتا۔

ایا ڈائری میں دیکھ کر اس نے نمبر ملایا تھا پھر دوسری جانب ہوتی ہوئی بیل کی آواز سننے لگی تھی۔ جلد ہی فون

بانا گیا تھا۔

ہیلو۔ حسن اتفاق سے وہ دورہ ہی تھی۔

ہیلو دورہ۔ ربیعہ بول رہی ہوں۔

دورہ کی آواز میں خوشی در آئی۔ ”کیسی ہو ربیعہ۔ سچ میں ابھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“

اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ کل یونیورسٹی نہیں آئیں۔ ربیعہ نے پوچھا۔

”میری طبیعت؟“ دورہ قدرے گڑبڑا سی گئی تھی۔ ”اوہ۔ ہاں۔ میں تھیک ہوں ربیعہ! بس یونیورسٹی کچھ موڈ

پر تھا اور پھر شام کو اچانک ہی وہ لوگ چلے آئے۔“

”وہ لوگ؟“ ربیعہ کچھ نہ سمجھی۔

”ہاں! وہ فرار کے گھر والے۔ میں نے تم لوگوں سے ذکر کیا تھا نا پہلے بھی۔ بس وہ اچانک ہی آگئے۔ بنا کسی پروگرام کے۔ اور افراتفری میں ہی ناعمہ کو انگوٹھی بھی پہنا گئے۔ مصروفیت ایسی ہو گئی تھی کہ میں تمہیں فون بھی نہ کر پائی۔“

”ارے۔“ ربیعہ خوش ہو گئی۔ ”پھر تو مبارک ہو بہت بہت۔ یہ تو بہت اچھی خبر سنائی ہے تمہیں۔ ناعمہ کو میری طرف سے بہت مبارک بادوں۔ فرار بھائی تو اتنے اچھے ہیں کہ کسی شک شبہ کی گنجائش ہی نہیں بنتی۔ ناعمہ واقعی خوش قسمت ہے۔“ ورنہ دیکھتے سے ہنس دی۔

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ ویسے تم مبارک باد دینے خود کیوں نہیں آ جاتیں؟ تم سے ملنے کو بہت اہل چاہ رہا ہے۔“

”یعنی منگنی کی مٹھائی کھانے بھی میں خود چل کر آؤں؟“ ربیعہ مسکرائی۔

”مٹھائی یہاں بھی کھلائیں گے اور گھر بھی دینے آئیں گے۔ تم بے فکر رہو۔“ ورنہ بھی ٹھانگنی سے بولی۔

”اچھا میں کوشش کرتی ہوں۔ امی سے پوچھ لوں۔“ ربیعہ بولی۔

”اوکے۔ میں منتظر ہوں۔“

ربیعہ نے ریسیور رکھ دیا پھر وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ ”حیات دلا“ کی سمت جاتے ہوئے رستے میں جو مانوس سی خوشبو اپنی جانب بلانے لگتی تھی وہ خوشبو ایک طلسم کی مانند تھی اور ربیعہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس طلسم کا شکار ہونا نہ چاہتی تھی۔ ورنہ کی صورت میں بے حد خلوص تھا۔ ورنہ خود بہت معصوم اور پر خلوص لڑکی تھی۔ ربیعہ گہری سانس بھرتے ہوئے اپنے گھر کے کی جانب چل دی۔ اس نے ”حیات دلا“ جانے کا آواز ملتی کر دیا تھا۔

”ربیعہ آ رہی ہے۔“ ورنہ نے ناعمہ کو مطلع کیا۔ ”وہ نہیں بہت مبارک باد دے رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ یہاں آکر مبارک باد دے لے۔“

ناعمہ نے سستی سے ہنس دیا۔ ”جانی کی جان! وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی۔“

”آپ ان کے لیے چائے تو ضرور بنائیں گی۔ ایک کپ مجھے بھی دے دیجئے گا۔“

ورنہ نے اچانک ہی بے حد خفگی سے اسے دیکھا۔

”تھوڑی سی شرم کسی سے ادھار ہی لے لو ناعمہ! امی ویسے ٹھیک ہی فکر مند ہوتی ہیں تمہاری طرف سے۔“

بے وجہ انہیں طفل تسلیاں دیتی رہتی ہوں۔ دو گھنٹے سے بستر میں تھمتی ہوئی ہو اور بجائے اس کے کہ ربیعہ کے آنے پر تم ہمیں چائے وغیرہ سرو کرو! الٹا فرمائشی پروگرام شروع کر دیا۔ کیا بنے گا تمہارا۔ اب تو عقل کرو مسرال والی ہو گئی ہو۔“

”اف آپ! پلیز نہ۔“ وہ بھٹکا کر اٹھ بیٹھی۔ ”آپ تو امی کی زبان استعمال نہ کریں۔ سچی میں تو پہلے ہی بے حد کوفت کا شکار ہوں۔ کیا مصیبت سر پہ پڑ گئی ہے بیٹھے بٹھائے۔“

”ناعمہ! عقل کرو! لٹی سیدھی باتیں وقت بے وقت منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ خدا نے تمہیں اتنی بڑی نعمت بن مانگے دی ہے۔ لڑکیاں تو ایسے رشتوں کے لیے وظیفہ بڑھا کرتی ہیں۔“ ورنہ سنجیدگی سے بولی۔

ناعمہ زور سے ہنس دی۔ ورنہ نے پھر اسے گھورا تھا لیکن وہ اس کے گھورنے کی پروا کیے بغیر ہنسی رہی۔

”میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے تمہیں؟“ وہ چڑ گئی۔

”اور کیا۔“ لطیفہ ہی ہو گیا یہ تو۔ یعنی دنیا جہان کے پند و نصائح سننے کا لڑکیوں کو اس قدر شوق ہوتا ہے کہ وہ وظیفے کرنے لگتی ہیں۔ سچی آئی! جب سے یہ بلا میری انگلی میں آئی ہے میں مصیبتیں سن سن کر مرنے والی ہو گئی ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے دس پندرہ اقوال امی کی جانب سے عطا ہوتے ہیں۔ سوتے جاتے چھ سات آپ بھی ساتھ لگا دیتی ہیں۔ ابھی تو ذرا رات نہ آئی کو آئے دیں سب سے زیادہ خطرہ تو مجھے ان سے ہے۔ وہ تو مجھے حالت نیند میں بھی نہ بخشیں گی۔ جگا کر کہیں گی۔ ناعمہ! تمہارا منہ کھلا ہوا ہے۔ اسے بند کر کے سونے کی عادت ڈالو۔ سرال والے کیا کہیں گے۔ ماں نے سونا بھی نہیں دکھایا۔ آئی! یہ سرال والے ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں؟“

ورنہ نے خود پر بہت ضبط کرنا چاہا لیکن مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آئی گئی تھی۔

”بے وقوف۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

اسی لمحے ابن دونوں کو ہی کمرے کے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ دروازے کی جانب دیکھا تھا۔

”ارے۔“ ناعمہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ”عریشہ! تمہ۔“ وہ خوش ہو کر بستر سے نکل کر اس کی جانب بڑھی۔

”دکھو! ناخدا خدا کر کے۔ تو آخر تمہیں ہماری یاد آئی گئی۔“

اس کے قریب پہنچ کر ناعمہ قدرے ٹھٹھکی سی گئی۔ عریشہ بے حد بے تاثر سے انداز میں کھڑی تھی۔ ناعمہ دیکھتے مگر مجروح جوش اور التانہ انداز نے بھی اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری واضح تھی۔

”او عریشہ! ورنہ نے بھی خوش مزاجی سے اسے مخاطب کیا۔ ”اندر آکر بیٹھو نا وہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے کیا؟“

عریشہ نے ناعمہ سے نظریں ہٹا کر ورنہ کی جانب دیکھا پھر وہ ایک ایک قدم بڑھاتی اندر چلی آئی اور بستر کے کونے پر بے حد تکلف سے ٹک گئی۔ ناعمہ بھی اس کے قریب آ بیٹھی۔

”تم دونوں باتیں کرو میں تیلے تنگ چائے بنا لاؤں۔“ ورنہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”ہم نے بھی شام کی چائے اب تک نہیں پیا ہے۔“

عریشہ نے اسے گھرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھا پھر دوبارہ ناعمہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کی نظریں بے حد نیچتی ہوئی تھیں۔ جس نے ناعمہ کو نجانے کیوں خوف زدہ سا کر دیا۔

”کیا بات ہے عریشہ۔“ وہ بالآخر بول اٹھی۔ ”تم مجھے اتنے عجیب سے انداز سے کیوں دیکھ رہی ہو؟“

”سنا ہے تمہاری منگنی ہو گئی ہے۔“ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولی۔

”بالنسہ تم نے ٹھیک سنا ہے۔“ ناعمہ نے سر ہلایا۔

”بہت خوش نظر آ رہی ہو۔“ اس کے لہجے میں زہر سا گھلا۔ ”کہاں کھلی ہے قسمت؟“

ناعمہ کا منہ حیرت سے کھلا۔ اسے لگا یہ وہ عریشہ ہی نہیں تھی جسے وہ بچپن سے جانتی تھی۔

”ایک بات بتا دوں تمہیں۔“ اس سے پیشتر کہ ناعمہ کچھ بول پاتی وہ پھر اسی لہجے میں گویا ہوئی۔ ”دوسروں کے لئے بڑا دکھ ڈالنے والے کبھی خوش نہیں رہا ہے۔ سو قتی طور پر انہیں خوشیاں راس آ بھی جائیں تو بھی ایک دین کسی کا آنا نہیں لے دو جتی ہے۔“

”عریشہ...“ ناعمہ کے لب کا نیپہ۔ ”ییسے یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کس کے حصے پر ڈاکہ ڈالا ہے میں نے کس کے ساتھ زیادتی کی ہے؟“

اس سے قبل کہ عریشہ کچھ بولتی، رابعہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔  
”ماشاء اللہ... بھی آج تو ہماری عریشہ بیٹی آئی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔“ عریشہ بادل خواستہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ جیسے زر لب بولی۔  
”وہ ایکم السلام۔ جیتی رہو۔ کیسی ہو بیٹی؟“ رابعہ بیگم نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ ہنوز سرواندا ز میں بولی۔  
”ناعمہ کی منگنی کے بارے میں پتا چلا تمہیں؟“ رابعہ بیگم خوش دلی سے بولیں۔

عریشہ کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔  
”مجھے تو چل گیا ہے۔ ناعمہ کو بھی چل جائے گا۔ چلتی ہوں۔“

وہ مڑ کر اچانک ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔ رابعہ بیگم نے از حد حیرت سے ناعمہ کی سمت دیکھا۔ ناعمہ نے سر جھکا لیا۔

”کیا مطلب اس بات کا؟“ وہ بڑبڑائیں۔

”پتا نہیں امی جی...“ ناعمہ منمنائی۔

اسی لمحے دروازہ چائے کی رے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

”ہاں امی جی... عریشہ کہاں گئی؟“ اس نے از حد حیرت سے دیکھا۔

ناعمہ کے چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیں تھیں۔



وہ دوسرے کھانے کی تیاری کر کے کچن سے نکلی تھی۔ سامنے بیٹھی منیوہ بیگم کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ٹھک سی گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”امی جی...“ رابعہ ان کے قریب چلی آئی۔ ”کیا بات ہے... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ جب سے ان کی طبیعت ایک مرتبہ بگڑی تھی تب سے نجانے کیوں اس کے دل کو دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ وہ اب انہیں کچھ بھی نہ کرنے دیتی تھی۔ یونیورسٹی جانا ہوتا تو وہ اگلے دن کے کھانے کی زیادہ تیاری رات میں ہی کر لیا کرتی اور اگر آف ہوتا تو نہ صرف ناشتہ بلکہ دوسرا اور رات کا کھانا بھی وہی بناتی تھی۔  
منیوہ بیگم اپنی سوچ سے نکل کر اب محبت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھیں۔

”ہاں رابعہ...“ پھر وہ اس کے ہاتھ تھام کر بولی تھیں۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں... تمہاری جیسی خدمت گزار بیٹی جس ماں کو مل جائے... اسے کچھ ہو سکتا ہے بھلا؟“ رابعہ کے دل کو نجانے کیا ہوا تھا۔ وہ یکدم ہی ان سے لپٹ گئی۔

”امی جی... آپ کی بیٹیاں واقعی بہت خوش قسمت ہیں... اتنی اچھی، اتنی پیاری، شفیق ماں قسمت والوں کو ملتی ہے۔“

”تم بھی میری بیٹی ہو رابعہ! یقین جانو مجھے شہلا، انیقہ اور تم میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔“ انہوں نے

”آپ سے بات ہو رہی ہے جناب!“ وہ شرارتاً بولا۔ ”موڈ تو خود بخود ہی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ ویسے آپ مابدولت کا سوال ٹال گئی ہیں۔“

”نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کا دل چاہ رہا ہے تو ضرور چلتے ہیں۔“ وہ چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک آئی تھی۔ ”آپ کو کیا بات اب تک محض ہمارے ہی دل تک محدود ہے۔“ اس نے قدرے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔ ”خیر۔۔۔ پھر کچھ دیر سا دیکھ کر کہاں چلیں؟“

”چائنا ٹاؤن۔۔۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”دوری ٹاؤن۔۔۔“ اس نے فوراً اتفاق کیا۔ ”چلو پھر گھر پہنچو، تھوڑا ریسٹ کر کے فریش ہو کر نکلیں گے۔“

”عمر کو بھی لے لیں گے نا۔۔۔ میں اسے بتا دیتی ہوں۔“ ہاشم کی جانب سے لمحہ بھر کا توقف ہوا۔ ”جی۔۔۔“ چند لمحوں بعد وہ بولا تھا۔ ”خدا حافظ۔۔۔ شہلا اپنے سلسلہ منقطع کر دیا۔“

پھر وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔ ہاشم کی جانب سے وہ لمحہ بھر کا توقف اسے دُسترب کر گیا تھا۔ نجانے اسے عمر کو بھی ساتھ لے جانے کی بات کرنا چاہیے تھی یا نہیں۔ پھر وہ سر جھٹک کر گاڑی کا لاک کھولنے لگی۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ عمر کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کینسل کر چکی تھی۔ نجانے کیوں اس نے محسوس کیا تھا کہ اگر وہ اپنا تھیں چاہتا تھا تو وہی الوقت صرف شہلا کی ہرمانی کا خواہش مند تھا اور شہلا نے شاید اس کی تمنا کو نہیں پہنچائی تھی۔ اس لیے شہلا نے اپنے گھر والوں کو ہمیشہ ہی انجانے میں اسے دکھ دے دیا کرتی تھی۔ ”گویا بات اب تک محض ہمارے ہی دل تک محدود ہے۔“

اسے ہاشم کے الفاظ یاد آئے۔ گاڑی سے نکل کر وہ اپنے خد مضمحل سوچوں کا شکار اندر پہنچی تھی۔ بلاؤنچ کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی عریضہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ شہلا کو قدرے حیرت ہوئی۔ وہ لڑکی اسے اب تک اپنے کمرے میں محدود ہی رہی۔ ہونے کی مرکزی جگہ پر وہ کم ہی ملا کرتی تھی۔

عریضہ نے نگاہ اٹھا کر اسے لمحہ بھر کے لیے دیکھا اور پھر اسے اپنی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ ”کیسی ہو عریضہ!“ شہلا نے اس کے قریب ٹھہر کر ملائمت سے پوچھا۔ ”جی؟“ اس نے بادل خواستہ سرا اٹھایا۔ ”ٹھیک ہوں۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی تھی۔

”آئی کہاں ہیں؟“ اس نے اصرار و ہرنگہ ڈالی۔ ”پتا نہیں۔“ اس نے کاندھے اچکائے۔ ”نجانے اس لڑکی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“ شہلا نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔

پھر وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ پورچ میں اس نے اپنی گاڑی ہاشم کی گاڑی کے پیچھے پارک کی تھی لہذا اسے علم تھا کہ ہاشم اپنے کمرے میں موجود ہے۔ اس نے دل میں ارادہ کیا کہ وہ ہاشم سے کہے گی کہ آج دُور پر وہ دونوں ہی جائیں گے۔ عمر کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام بعد میں بھی رکھا جاسکتا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی اور پھر جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ ہاشم بستر پر لیٹا ہوا تھا اور عمر اس کے پیٹ پر بیٹھا زور زور سے ہنس رہا تھا۔ ہاشم نے اسے کوئی بہت مزے کا

محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔

”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔ ”جی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔



”جہاں پہا لے کر گئے تھے“ وہ جوش سے بولا۔ ”وہاں بہت سارے جھولے تھے۔ پہا نے مجھے سارے جھولوں پر بٹھایا تھا پھر انہوں نے مجھے ڈھیر سارے ٹوٹے بھی لے کر دیے تھے۔ آکس کریم بھی کھلائی تھی۔ پتا ہے ہاشم انکل! میرے پہا بہت گریٹ ہیں۔“

”عمر! شہلا نے قدرے غصے میں اسے پکارا۔ ”کیسے کو اسٹ ناؤ!“

عمر سم کر ایک دم ہی خاموش ہو گیا تھا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔

”بولنے دو یا۔“ ہاشم آہستگی سے بولا۔ ”بچہ ہی تو ہے۔“

شہلا نے محسوس کیا ہاشم کے انداز میں قدرے سنجیدگی آگئی تھی۔

”میں ذرا چیخ کر لوں!“ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔

\*\*\*

”مما! ہم یہاں کیوں آ گئے ہیں؟“ موسن بسور رہا تھا۔ ”مجھے یہاں رہنا زیادہ پسند نہیں ہے۔“

ایقان نے لحظہ بھر کے لیے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”اچھا! تو گویا اس عمر میں بھی آپ کی پسند ناپسند کی بہت اہمیت ہے۔ بڑے ہو کر تو جانے کیا حال ہو گا۔“

”مما! یہاں کبھی کبھی آتا تو مجھے اچھا لگتا ہے لیکن آپ تو یہاں رہنے لگی ہیں۔ اپنے سارے کپڑے بھی لے آئی ہیں۔ وہاں میرے فریڈز میرا انتظار کر رہے ہوں۔ تم سب شام کو کرکٹ کھیلتے تھے، کتنا مزہ آتا تھا۔“

”موسن! میرا دماغ مت کھاؤ۔“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”فریڈز یہاں بھی بن سکتے ہیں اور عمر بھی تو ہے یہاں! اس کے ساتھ کھانا کھا کر۔ شام کو پارک چلے جانا۔“

”نہیں، ممما! مجھے اپنے آپ کو چھوڑنا ہے۔ یہاں میرے کھلونے ہیں اور وہ گھر رہا ہے۔ یہ تو بالکل چھوٹا سا ہے یہاں کھیلنے میں مزہ نہیں آتا۔“

ایقان خاموش ہو گئی۔ بچے سے بحث کرنا فضول تھا۔ وہ اٹھ کر کچن کی جانب چلی گئی۔ لیکن وہ پیچھے ہی چلا آیا تھا۔

”آپ سامان رکھ لیں، ہم شام کو چلیں گے۔“ ایقان نے مڑ کر خفگی سے اسے دیکھا۔

”موسن! تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آتی؟“

”آپ کو کبھی میرا بیڑی بانیں سمجھ میں نہیں آئیں۔“ اس نے منہ بگاڑا۔ ”مجھے تو ہر وقت پہا یاد آتے ہیں وہ میری ہر بات سمجھتے ہیں۔“

غصے کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔

اسی لمحے بچنے والی فون کی بیل نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔ وہ غصے میں چلتی ہوئی فون تک آئی۔

”ہیلو۔“

”عاشقہ! بات کر رہا ہوں۔“

دوسری جانب سے آئی ہوئی آواز نے اسے سر سے پیر تک سن کر دیا تھا۔ اس سے چند لمحوں کے لیے کچھ بولانا

جاسکا۔ پھر کا ایک اس کا غصہ پھر عود کر آیا۔

”تم؟ تمہیں یہ نمبر کس نے بتایا؟“ وہ پھنکاری تھی۔

لطیفہ سنایا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر دونوں ہی نے مڑ کر دیکھا۔

”مما! ممما! آگئیں!“ عمر ہاشم پر سے اتر کر دوڑتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

ہاشم بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے لبوں پر بے حد خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ وہ بھی ابھی پہنچا تھا۔

شرٹ اتار کر اس نے ایک طرف ڈالی ہوئی تھی اور پینٹ اور بنیان میں بے حد فراغت سے بیٹھا تھا۔

وہ اس قدر پرکشش نظر آ رہا تھا کہ شہلا چند لمحے اس کی جانب دیکھتی ہی رہ گئی۔

”کس بات پر یہ آئینہ محو حیرت ہے؟“ ہاشم گنگنایا۔

شہلا چونکی پھر عمر کو خود سے لپٹا لے ہوئے آگے بڑھ آئی۔

”یہ عمر؟“ وہ بیڈ کے کنارے آگئی۔

”نہیں اسے پک کر تا ہوا آگیا تھا۔“ ہاشم نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”کیوں؟“ بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

ہاشم نے قدرے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

”کیوں؟ کیا مطلب کیوں؟“ بھی میرا دل چاہ رہا تھا اس سے ملنے کا۔ ہاشم نے کرنے کا اور پھر صاف جزا دے ہمارے ساتھ ڈنر کے لیے بھی تو چل رہے ہیں نا۔“

اس کے لہجے میں بے ساختہ تھی۔ شہلا ایک بار پھر جی جی میں شرمندہ ہوئی۔

”نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں سوچ رہی تھی کہ۔“

پھر اس کی نگاہ عمر پر پڑی جو بے حد دل چسپی سے ان دونوں کی گفتگو میں رہا تھا۔

”عمر! شہلا نے اس کے بال بگاڑے۔“ ممما کے لیے پانی لے کر آئی۔

”جی ممما۔“ وہ فریق کی جانب چلا گیا۔

شہلا نے ہاشم کو دیکھا جو دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے اسی کی جانب متوجہ تھا۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔

”میں میں سوچ رہی تھی اگر آج ہم دونوں ہی چلتے عمر کے ساتھ پھر کسی دن اچھا سا پروگرام بنالیں گے۔“

”لیکن تمہارے ہی کہا تھا کہ ہم عمر کو۔“ ہاشم کی نظریں میں الجھن در آئی تھی۔ ”اچانک تبدیلی کیسی؟“

”سوری ہاشم۔ میں شاید آپ کے احساسات سمجھ نہیں پاتی تھی۔“

ہاشم چند لمحے اس کی جانب دیکھا رہ گیا۔

”کم آن شہلا تم تمہارے کیا سمجھیں۔ عمر جیسا تمہارے لیے ہے ویسا ہی میرے لیے بھی ہے۔“

یہ اہم بلکہ جب تم نے مجھے اس کی بابت یاد دلایا تو میں تو بے حد شرمندہ ہو گیا تھا۔ یہ بات تو مجھے خود کہنی چاہیے تھی کہ ہم عمر کو بھی ساتھ لیں گے۔“

شہلا سے کچھ بولانا نہ جاسکا تھا۔ ہاشم کے جذبات نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔

”مما! ممما! آج ہم کہاں جائیں گے؟“ عمر پانی کا گلاس بھر کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔ شہلا نے چونک کر اس کی

سمت دیکھا تھا۔

”آج ہم چائنا ٹاؤن جائیں گے اور پھر جہاں عمر بایا کہیں گے وہاں چلیں گے۔“ ہاشم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو گیا۔

”کہاں جاؤ گے؟“

”بھابی بیگم نے سہ ”وہ بولا۔ ”اور زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے محض یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں نے پچاس ہزار کاڈرافٹ بھیج دیا تھا اپنا اکاؤنٹ چیک کر لیتا۔ دوسرے یہ کہ میں اپنے بچوں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا!“

ایقان چند لمحے خاموش کھڑی ہوئی کانتی رہی پھر اس نے ریسیور سائیڈ میں پٹختا تھا۔  
”مومن۔! یہاں آؤ۔“ وہ چلائی۔  
مومن دوڑتا ہوا آیا تھا۔

”جی مماسہ!“

”فون پر بات کرو۔“ وہ وہاں سے جانے لگی۔

مومن نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تھا پھر اگلے ہی لمحے اس نے بے ساختہ مسرت اور اشتیاق سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

”یہاں! السلام علیکم میں آپ کو بہت یاد کر رہا تھا۔“

ایقان کمرے میں چلی آئی۔ ایمان بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ ضبط محال تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کئی قہقہے نکل کر اس کے گریبان میں جذب ہوئے۔ کس سنگ دلی سے اور بے مہری سے اس نے بات کی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہی لہجہ پھول پر سنا تھا۔  
مومن بات ختم کر کے کمرے میں آیا تو وہ اچھا خاصا رو چکی تھی۔ پوٹے متورم ہو چکے تھے وہ اسے دیکھ کر جلدی جلدی چہرہ صاف کرنے لگی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

”مماسہ! اچھا ایمان کا پوچھ رہے تھے وہ بھی ہم لوگوں کو مومن کو کہہ رہے ہیں۔“

”اچھا!“ وہ کاڈرافٹ بھیج دینا چاہتی تھی۔

”اور مماسہ! یہاں ہمارے لیے پارسل بھی بھیج رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے لیے شاپنگ کی ہے!“

”اچھا بیٹا! ٹھیک ہے۔“ اس کا دل پھر بھر آنے لگا تھا۔

”مماسہ! آپ پہاڑ کو نہیں نہیں کرتیں؟“ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

ایقان گہری سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔

شہلا چہرے پر کلنزنگ ملک لگا کر اب نشو سے صاف کر رہی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز پر اس نے گہری کی جانب دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ یقیناً ”ہاشم ہی تھا۔ شہلا آئینے کے سامنے سے ہٹ کر دروازے تک چلی آئی۔

لاک کھولنے تک اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ تھا کہ باہر یقیناً ”ہاشم ہی ہے۔ دروازہ کھولتے ہی وہ یکایک اوٹ میں ہو گئی۔ باہر فاروق حسن ہوں گے اس کے تو وہم و گمان میں نہ تھا۔

شہلا بیٹے! آپ کا فون ہے۔“ وہ باہر سے بولے۔ ”کارڈ دروازے ایکسٹینشن سے بات کر لیں۔“  
”جی۔۔۔ جی انگل۔!“ وہ ہکا کر رہ گئی تھی۔

پنک نیٹ کی ٹائٹی میں بنا شمال کے ان کے سامنے آ جانے پر وہ حد درجہ خفت کا شکار ہوئی تھی۔ اس نے خود کو سخت سست سنا نہیں۔ دروازے پر کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ اسے خود شمال یا گاؤں وغیرہ لینا چاہیے تھا۔

خود سے لڑتی جھگڑتی برا بھلا ہستی وہ فون تک چلی آئی تھی۔ اس نے یہ بھی خیال نہ کیا تھا کہ اس وقت بھلا کس کا فون ہو سکتا تھا۔

”ہیلو۔“ اس نے ریسپونڈ کیا تھا۔

”ہیلو۔“ دوسری جانب ابرار تھا۔

شہلا کے اوپر جیسے ہمارا ٹوٹا۔ ابرار کا فون اور وہ بھی گھر کے نمبر پر! فون فاروق حسن نے ریسپونڈ کیا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

”تم تم تم تم تم نے یہاں...“ اس کے حلق سے آواز نکلتا مشکل ہو گئی۔

”کیا کروں؟“ وہ بے حد مطمئن تھا۔ ”موبائل پر نمبر دیکھ کر تم فون ریسپونڈ نہیں کرتیں۔ مجبوراً“ مجھے اس نمبر پر فون کرنا پڑا۔

”نہیں نہیں ریسپونڈ کروں گی تم اس نمبر پر کال کرو۔“ اس نے بے تحاشہ دھڑکتے دل سے کہہ کر ریسپونڈ کیا تھا۔ کچھ دیر وہیں کھڑی وہ اپنے دل کی دھڑکنیں سنتی رہی پھر تیز تیز قدموں سے چلتی اپنے بکھرے کپڑے میں چلی آئی۔

جب توقع اس کا موبائل بج رہا تھا۔ شہلا نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا تھا۔

”کیا بات ہے ابرار! کیوں میرا تماشنا بنا رہے ہو تم...؟“ اس کے لہجے میں عاجزی در آئی تھی۔

”تم میرے جذبات سے کھیل رہی ہو تمہیں اس بات کا خیال ہے؟“ وہ شکایتی انداز میں بولا۔

”کتنے دن سے میں تمہارا سیل فون نمبر زانی کر رہا ہوں لیکن تم ہر مرتبہ مجھے مایوس کرتی ہو“ آخر بات کر لینے میں تمہارا کیا جاتا ہے؟“

”ہمارے دور میاں اب ایسا کیا ہے جس پر بات کی جاسکے؟“

”عمر! عمر ہے ہمارے درمیان!“ شہلا ایک سخت خاموش ہوئی۔

”شہلا! میں عمر کو اپنی کسٹڈی میں لینا چاہتا ہوں۔“ قانونی طور پر!

شہلا کو یوں لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔

”نہیں...“ بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ ”نہیں ابرار! پلٹ کر چلا جانا۔“

”تو پھر تم ایک راستہ منتخب کیوں نہیں کر لیتیں؟ کیا رکھا ہے اس شخص میں گھر میں یہاں اگر دیکھو شہلا! میں نے تمہارے لیے کیا کچھ رکھا ہوا ہے اور جو کچھ میرے دل میں ہے وہ تو میں تمہیں دکھا بھی نہیں سکتا۔

یقین کرو شہلا! تم مایوس نہ ہو گی۔“

شہلا کو اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا۔

”دیکھو شہلا! صاف بات یہ ہے کہ میرے صبر کی حد اب ختم ہو چکی ہے۔“ وہ مزید بولا ”میں اپنے بیٹے سے اب کسی طرز علیحدہ نہیں رہوں گا۔ وہ بھی خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا ہے۔ نہ اس کے پاس ماں رہی نہ باپ۔

جب تک تم اس گھر میں نہیں تب تک بات دوسری تھی۔ اب میں سمجھتا ہوں اس کے وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جبکہ اس کے باپ کے پاس کسی چیز کی کمی بھی نہیں ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیا بہتر سمجھتی ہو؟“

”میں؟“ وہ غائب دماغی سے بولی۔

”ہاں تم۔“ فیصلے کی تمام ڈوریاں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ یونسی ایک مختلف خانوں میں بیٹھی ہوئی زندگی جیتی رہو یا پھر یہاں آجاؤ جہاں زندگی مکمل ہے۔ گھر مکمل ہے۔ ہر چیز تمہاری ہے مکمل تصرف کے ساتھ!“

شہلا کو کمرے میں سرسراہٹ کا احساس ہوا تھا۔ اس نے ذرا سا مڑ کر دیکھا۔ ہاشم نے کس وقت چلا آیا تھا۔

لباس تبدیل کر کے وہ ڈریسنگ روم سے باہر آ رہا تھا۔ شاید جس وقت وہ فون سننے کمرے سے باہر گئی تھی تب ہی ہاشم کی واپسی ہوئی تھی۔ موبائل کان سے لگائے وہ غائب دماغی سے ہاشم کو تکتے لگی تھی۔

”اور سنو شہلا! ایک بات یاد رکھنا جتنے عرصے تم وہاں ہو اس درمیان تمہیں کسی طور بھی ریگینٹ نہیں ہونا۔ یہ وہ چیز ہے جو تمہیں ایک ناقابل تصور مشکل میں مبتلا کر ڈالے گی۔ تم کسی کنارے نہ لگ سکو گی اسی بھنور میں ہمیشہ کے لیے پھنس جاؤ گی۔ سمجھ رہی ہو نا!“

شہلا کے منہ سے ایک لفظ کا نکلتا محال تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہاشم کو تکتے جاری تھی جو کبھی کبھار اس پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔

”حتی الامکان اس بات کا خیال رکھنا۔ لی کیئر فل!“

شہلا نے موبائل آف کر کے بے جا ہاتھوں سے ایک طرف ڈال دیا۔

”یہ کیسی گفتگو تھی؟“ ہاشم نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا تھا ”نہ ہوں نہ ہاں ہوں تمہیں لمبی۔ بحری غزلیں سنا رہا تھا؟“

”جی؟“ شہلا نے اچھے نہ بیکھا ”کیا کہا؟“

ہاشم نے بغور اس کا چہرہ دیکھا پھر بھتی میں سر ہلایا۔

”کچھ نہیں!“ وہ بولا تھا۔

”تم اس دن آئیں نہیں۔ میں تمہارا انتظار کرتی رہ گئی۔“ دورہ نے شکوہ کیا تھا۔ ربیعہ نے لان کی روش پر چلتے

پہلے ایک کر اس کی جانب دیکھا۔

”اوہ ہال دورہ! وہ معذرت خود اپنے انداز میں بولی تھی۔ ”مجھے تو تم سے معذرت کا بھی خیال نہ رہا بس اس

دن چند ایک کام ایسے نکل آئے تھے میں جانتے ہوئے بھی نہ آسکی۔“

”خیر جانے دو۔ میں اب تم سے معذرت کی منتہی نہیں ہوں یونسی ایک ذکر کر رہی تھی۔“

دونوں پھر آگے بڑھنے لگی تھیں۔ کلاس آف ہونے کے بعد وہ چل قدمی کر رہی تھیں۔ اگلی کلاس شروع

ہونے میں تقریباً ”آدھا گھنٹہ باقی تھا۔“ سو وہ گپ شپ کی غرض سے باہر چلی آئی تھیں۔

”تم نے سرزیدی کے نوٹس لیا کر لیے ہیں؟“ دورہ نے اس سے پوچھا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”نہیں...“ سرزیدی نے سر ہلایا۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ دونوں ہی بولی تھیں۔

ربیعہ نے محسوس کیا اور وہ کے گالوں پر ہلکی سی سرفنی آگئی تھی اور لب مسکرانے لگے تھے۔ ربیعہ بھی بشارت سے مسکرا دی۔

”کلاس بنک ہو رہی ہے؟“ رافع نے انہیں چھیڑا تھا۔

”جی نہیں۔ ہم بہت ریگولر اور پینکچرل اسٹوڈنٹس ہیں۔“ ربیعہ مسکرائی ”آپ اپنی سنائیے کلاسز ختم ہو جانے کے بعد بھی یہاں نظر آ رہے ہیں۔“

”مجھے ذرا لائبریری میں کام تھا۔“ وہ ہنس دیا۔ ”اور یوں بھی یہاں سے جس کا رشتہ ایک بار جڑ جائے وہ اتنی آسانی سے ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔“

”لائبریری!“ ربیعہ کو اچانک ہی خیال آیا تھا ”وہ بکس نکلاؤ دیں اگر زحمت نہ ہو تو۔“ آپ کے توانے خاصے تعلقات بنے ہوئے ہیں!“

”مائی ہلیڈ بس۔“ اس نے ذرا سا سر خم کیا۔

ربیعہ نے بیگ سے نوٹ بک نکال کر اسے کتابوں کے نام لکھ دیے۔ رافع نے ایک نگاہ ان ناموں پر ڈالی۔

”اوکے ربیعہ! میں یہ بکس نکلاؤں گا مجھے ذرا دیر ہو جائے گی۔ میں شام کو آپ کے گھر دے جاؤں گا۔“

”بہت مہربانی ہوگی آپ کی۔“ ربیعہ خوش ہو گئی۔

”اب پلینز تکلف سے گریز کریں!“ وہ ہنسا ”میں اب چلتا ہوں۔ مجھے چند ایک ضروری کام ہیں۔ اونسے خدا حافظ!“

وہ ایک سمت کھڑے اپنے منتظر دوستوں کی جانب بڑھ گیا۔ ربیعہ نے مسکراتے ہوئے ورنہ کی جانب نگاہ کی اور پھر چونک سی گئی۔ ورنہ کے رخساروں پر آجانے والی وہ چمک غائب تھی اور لبوں پر وہ گزشتہ پندرہ دنوں کا شائبہ نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ خالی خالی نظروں سے دو سری جانب دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کو سب کچھ سمجھنے میں لمحہ بھر لگا۔

رافع اس مختصر عرصے میں محض ربیعہ سے محو کلام رہا تھا۔ ورنہ سے مخاطب ہونے کی اس نے ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ دو سری جانب ربیعہ بھی اس کی اندرونی کیفیت کے لیے خرابی ہی کہے گئی تھی۔ شاید ان دونوں نے ورنہ کو نظر انداز کیا تھا۔ ربیعہ نے اپنے اندر شرمندگی کی لہر اٹھتی محسوس کی۔ لیکن اس کے پاس ایسا کچھ نہ تھا جس کے لیے وہ ورنہ سے معذرت ہی کر سکتی۔

”چلیں!“ ورنہ نے اسے سوچا دیکھ کر خود ہی کہا تھا ”سرنیر کی کلاس شروع ہونے والی ہے۔“

”ہوں؟“ ربیعہ چونکی ”ہاں چلو۔“

جی ہی جی میں شرمندہ ہوئی وہ اس کے ساتھ چل دی تھی۔

\*\*\*

”آئی بس!“ ناعمہ نے کمرے میں جھانکا تھا ”جائے بیس گی؟“

نوش بناتی ہوئی ورنہ چونک اٹھی۔

”ہاں ضرور۔ میں تو خود ابھی جائے بنانے کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔“ وہ مصروف سے انداز میں گویا ہوئی۔

”پکوڑے بنالوں ساتھ میں؟ پودے کی چٹنی کے ساتھ؟“

ورنہ نے اب کی بار خاصی حیرت سے اس کی جانب نگاہ کی۔

## قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی محاورات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے خنثی سے محفوظ رکھیں۔

”اس میں پوچھنے کی کیا بات؟ نیکی اور پوچھ پوچھ؟“

ناعمہ کچھ تھیںب کر مسکرائی اور غائب ہو گئی۔ ورنہ پین دانٹوں میں دبا کر کچھ سوچنے لگی تھی۔ اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ شاید اس کی اور رابعہ بیگم کی نصیحتیں اثر کر رہی تھیں۔ سر جھٹک کر اپنی کتابوں کی جانب متوجہ ہوئی۔ پھر یکدم ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کچھ سوچنے لگی۔

”نجانے کیا کیا بات تھی ایسی! کتابوں میں دل نہ لگ رہا تھا۔ نجانے کیسا احساس تھا جو مسلسل تعاقب کر رہا تھا۔“

وہ کس سوچ سے چیخا چھڑانا چاہتی تھی! اسے خود سمجھ میں نہ آ رہا تھا! ناعمہ جلد ہی آگئی تھی۔ اس نے رُے میں قرینے سے برتن سیٹ کیے ہوئے تھے۔ ایک پلیٹ میں گرم گرم پکوڑے، چینی کی پیالی میں خوش رنگ چٹنی اور ساتھ میں دم کی ہوئی چائے۔

ورنہ نے بے حد حیرانی سے ہر چیز ملاحظہ کی۔

”یہ اتنی جلدی؟“ اس نے کھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ”آگے گھٹنے سے بھی کم عرصے میں تم نے یہ سب کچھ کر لیا؟“

”کیا کرنا تھا آئی؟“ وہ بے حد اطمینان سے تھی۔ ”پکوڑا بکس سے پانچ منٹ میں پکوڑے بن جاتے ہیں۔ یہ گڑ گڑ چٹنی بھی پختہ ہوتی ہے۔“

”اور وہ؟“ ورنہ نے ٹھنڈی سانس بکھری۔ ”میں نے کہا، میری بہن سکھائیے میں مجھ سے بھی وہ ہاتھ آگے نکل سکتی ہے شاید۔ ویسے پیاری بہن! یہ ریڈی میڈ چیزیں کھانے کی ہوتی چیزوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتیں۔ خیال رکھنا!“

”میں تو بس اتنا ہی کر سکتی ہوں۔“ وہ گرم گرم پکوڑوں سے انصاف کرتے ہوئے بولی۔ ”اور اس سے پہلے کہ یہ پلیٹ میں اکیلی ہی صاف کر جاؤں اور پھر خور و صولی کر لیں!“

”امی کو بھی بلا لو نا۔“ ورنہ نے اسے گھورا۔

”جنتا اب! امی بانی امی کی طرف گئی ہوتی ہیں۔ وہ اور ثانی اماں آج کل ایقان خالہ کے مسئلے پر روزانہ پرزور گفتگو کرتی ہیں۔“

”ہاں!“ ورنہ کے چہرے پر ملال ابھرا ”ایقان خالہ!“

”آئی!“ ناعمہ نے روئے کے پلو سے ہاتھ صاف کیے ”ایک بات کہنی تھی آپ سے۔ میں کئی دن سے سوچ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے کروں؟“

”ہاں۔“ ورنہ کو حیرت ہوئی ”تمہارے منہ پھٹ پن سے مجھے یہ امید تو نہیں ہے کہ کوئی بات کہنے میں تم کوئی دن لگاؤ اور وہ بھی مجھ سے؟ مجھ سے تمہارا کیا پردہ ہے؟“ ناعمہ کے چہرے پر کش مکش کے رنگ ابھرے تھے۔

”آئی! فریجہ کافون آیا تھا کچھ دن پہلے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں فراز سے فون پر بات کروں۔ میں نے اسے پہلے تو منع کر دیا لیکن اس کے اصرار پر میں نے کہا کہ میں آئی سے پوچھ کر تاؤں گی۔“

ورنہ کے ہاتھ میں پکوڑا تھا جسے وہ منہ میں ڈالنا بھول گئی۔ وہ ناعمہ کو دیکھ گئی۔ جو جھکی جھکی نظروں سے بات کر

راہی تھی۔  
 ”پھر تائیں آئی۔! مجھے کیا اس سے بات کر لینی چاہیے؟ یا پھر امی سے بھی پوچھ لوں؟“  
 ”ناعمد! وہ ہولے سے مسکرائی۔“ مجھے امید تو نہیں تھی کہ میری بدھوسی بہن میں اتنی عقل بھی ہو سکتی ہے!“  
 ”آپ تو ہمیشہ مجھے انڈر اسٹیمٹ کرتی ہیں!“ اس نے شکایتی نظروں سے بہن کی جانب دیکھا ”اب میں اتنی بھی کم عقل نہیں ہوں۔“

”تبی بھی؟“ ورد کو ہنسی آئی ”سچ کہا تم نے۔۔۔ بس تھوڑی سی کم عقل ہو اور مجھے لگتا ہے کہ یہ خامی بھی دور ہوتی جا رہی ہے۔ خیر جہاں تک فراز سے بات کر لینے کی بات ہے، میرا خیال ہے کہ ایک حد اور تمیز کے اندر وہ بات کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں امی سے بھی دس کس کر لوں گی مجھے نہیں لگتا کہ انہیں کوئی اعتراض ہو گا۔ رافع کے حوالے سے انہوں نے کبھی مجھ پر کوئی معمولی سی پابندی بھی نہیں لگائی۔ اسی لیے مجھے کبھی اس پر رشہ کے خاص ہونے کا اتنا احساس بھی نہیں ہوا اور پھر ان کی فیملی آپھی جھلی ماؤرن ہے جب ہم نے ان سے رشتہ جوڑا ہے تو پھر ہمیں ان باتوں کو بھی بد نظر رکھنا ہو گا۔ اب اگر فریجہ کا فون آپنے تو ہم بے شک فراز سے بات کر لینا لیکن اخلاقی تقاضوں کو بد نظر رکھتے ہوئے سمجھ رہی ہوں تا میری بات کو بھٹکا۔“

”جی آئی۔“ ناعمدہ کی آنکھیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ اسے ورد سے یہ ٹاپک ڈسکس کر تے ہوئے جو جھینپ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا عکس اس کے چہرے پر واضح تھا۔

”نچلو اب تم مجھے چائے کا کپ دو اور اپنے یہ ریڈی میڈ پکوانے لے کر بھاگو یہاں سے۔۔۔ مجھے بہت سارا کام کرنا ہے۔“

وہ اپنی کتابوں کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ ناعمدہ اس کے لیے چائے بنانے لگی۔ ناعمدہ کے جانے کے بعد ورد ایک مرتبہ پھر سوچوں کا شکار ہونے لگی تھی۔ فراز اس نئے رشتے کے حوالے سے ناعمدہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کہیں کسی گوشے میں اس احساس کو ڈھونڈنے کی ناکام سعی کی۔ پھر ایک سال بھر کر چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا تھا!

رات کا شاید آخری پہر تھا۔ سوئے کی کوشش میں ہر طرح سے ناکام ہو کر شملہ نے بے چینی سے ایک مرتبہ پھر۔۔۔  
 گھڑی کی جانب دیکھا تھا۔

ساڑھے تین بج رہے تھے۔ شملہ نے بے قرار ہو کر گرو شبدلی۔  
 ”میں عمر کو اپنی کسٹڈی میں لینا چاہتا ہوں قانونی طور پر۔“ اس کے کانوں میں ابرار کے الفاظ گونجے۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر وہ بستر سے اتر کر بے قراری سے کمرے میں گھلنے لگی۔

”جب تک تم اس کمرے میں نہیں تب تک بات دوسری تھی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ اس کے وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب کہ اس کے باپ کے پاس کسی چیز کی کمی بھی نہیں ہے!“ شملہ نے بے بسی سے لب کاٹے ابرار کی بات کسی صورت بھی غلط نہ تھی۔ عمر اپنے ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی اپنی نانی کے گھر رہا تھا۔ وہاں سے بھی دور ہو گیا تھا اور باپ سے بھی۔ ایسی صورت میں اگر واقعی ابرار قانون کے ذریعے اسے حاصل کرنا چاہتا تو اسے پہلی کوشش میں ہی کامیابی مل جاتی۔ یوں بھی شملہ بخوبی جانتی تھی کہ قانونی طور پر عمر ابرار کا ہی تھا۔

اسے یوں لگا جیسے اس کے حلق میں کانٹے آگے آئے ہوں۔ عمر سے جدا ہونے کا تصور جان لیوا تھا۔ عمر تو اس کے سینے میں دل کی جگہ دھرتا تھا۔ وہ کیسے اسے نظروں سے دور کرنے کے بارے میں سوچ سکتی تھی بھلا؟  
 ”میں نے غلطی کی ہے۔“ وہ زیر لب بربرائی ”شادی کر کے میں نے اپنی زندگی کی بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ اگر عمر کو لے گیا تو کیا رہے گا میرے پاس؟“ یہ درست تھا کہ وہ شادی کر کے ہاشم کے ساتھ جلی آئی تھی لیکن اسے اطمینان تھا کہ اس کا عزیز از جان بیٹا چند قدم کے فاصلے پر موجود ہے۔ وہ جب چاہے اس سے ملنے کے لیے جا سکتی ہے۔ بلکہ وہ خود روزانہ ہی چلا آتا تھا، فروس بیگم کے نامناسب رویے اور غصیلی نگاہوں کی پروا کیے بغیر۔ پھر شروع سے ہی وہ ہنترہ بیگم کے بے حد قریب رہا تھا۔ ماں سے زیادہ اسے نانی کے قرب کی عادت تھی۔ ابرار کے ساتھ جا کر وہ مینٹلی طور پر کس قدر دسترب ہو سکتا تھا، شملہ کو بخوبی اندازہ تھا۔ اس کی شخصیت وہ حصوں میں بٹ کر رہ جاتی۔

”میں نے اپنی تمام دُوریاں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔“ اسے پھر ابرار کی بات یاد آئی ”یونہی ایک مختلف خانوں میں بنی ہوئی زندگی جیسی رہی ہو یا پھر یہاں آجائے۔ جہاں زندگی مکمل ہے، گھر مکمل ہے، ہر چیز تمہاری ہے، مکمل تصرف کے ساتھ!“

شملہ نے لب بھینچتے ہی ایک تکلیف دہ احساس نے اس کے وجود کا احاطہ کیا تھا۔ وہ اس شخص کا گریبان پکڑ کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ جب اس نے ساری دنیا کو چھوڑ کر اس کا انتخاب کیا تھا تب یہ مکمل زندگی، مکمل گھر اور مکمل تصرف کہاں تھا؟ تب کیوں اس نے اسے ایک ایسے گھر میں لے جا چھوڑا تھا جہاں کچھ بھی اس کا نہ تھا بلکہ جہاں ابرار کی دعوے دار ایک عورت تھیں۔

وہ عورت اب کہاں تھی؟ وہ کبھی کہاں آئے؟ وہ کبھی کہاں آئے؟ سوال پوچھنا چاہتی تھی لیکن اسے ایسا کرنا ذہن بند دیتا تھا۔ ان سوالات سے وہ کوئی بھی مطلب اخذ کر سکتا تھا۔ شملہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو جاتی اگر اس کے الفاظ کوئی اور معنی اختیار کر لیتے۔ لیکن اب بھی کوئی راستہ بچھا کر دیتا تھا۔ اب بھی ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ بے بسی کے احساس تلے دب کر اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے وہ بستر تک چلی آئی۔

اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے اسے اچانک ہی دوپچ کا ساگا ہاشم کھلی آنکھوں سے اس کی جانب متوجہ تھا۔ شملہ نے بے اختیار ہی ایک مرتبہ پھر اپنی آنکھیں صاف کرنا چاہی تھیں۔ ہاشم نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار کو چھوا اور اپنی انگلیوں سے اس کے آنکھوں کو خشک کیا۔

”شملہ!“ وہ گہیر آواز میں بولا۔  
 ”جی بس۔“ وہ اپنی جگہ چوری بن گئی تھی۔  
 ”رات کے اس پہر۔۔۔ یوں اکیلے میں اس طرح رونے کی وجہ جان سکتا ہوں؟“  
 ہاشم کے لمبے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے شملہ کے اعصاب کو پتھر کی طرح منجمد کر دیا تھا۔

باقی (شدہ سہ ماہی) ۲۶



ماشر کی اجانگ پاکستان آمد پورے غاندان کو مسرور کر دیتی ہے۔ تاہم ایقان اس کے رویے میں کچھ تبدیلی محسوس کرتی ہے۔ منور امین کی سخت باتیں سنیں کر بیحد گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن ترانہ اس کی ایک نہیں سنتی۔ جس پر ربیعہ کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عین موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

ربیعہ کا خیال ہے کہ گھر میں خسر مقدم کیا جاتا ہے۔ منتر، بیگم، ربیعہ کو اپنی بیٹی بنا لیتی ہیں۔ ہاشم اور شہلا کی شادی کی تقریب میں ہی نافع اور عریضہ کا نکاح پڑھوایا جاتا ہے جس پر عریضہ سخت کبیدہ خاطر ہوتی ہے۔

شادی کی اوّلین رات ابراہیم جیلانی کا فون شہلا کو پریشان کر دیتا ہے۔ شہلا شادی کے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس کی ملاقات ابراہیم سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم، شہلا کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔

فراز جو درحقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے، ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ دوسری طرف عریضہ کے لیے فراز کی آمد پریشان کن ثابت ہوتی ہے۔ فراز بھی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔

واقعہ کو ربیعہ میں اپنے آئینہ دل کی جھلک نظر آتی ہے جس کا قلم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔ لڑا، ماشر کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے۔ ماشر اسے لینے ایر پورٹ جاتا ہے۔ ایقان، ماشر کے پراسرار رویے پر مشکوک ہو جاتی ہے۔

شہلا سب کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا مسرورہ اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم ماہین اسے دلاسا دے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شہلا، ربیعہ کے ساتھ رابعہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ سب ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ درود کے شور سے ایم اے سوشالوجی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔

ماشر لڑا سے ملنے بول آتا ہے تو لڑا اسے پتہ چل کر لڑتی ہے۔ ماشر لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا رد مال، ایقان کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس پر وہ ماشر سے جھگڑت پونہتی ہے۔ ماشر لو کھلا ہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے جس پر ایقان حقیقتاً صدمے سے گنگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ درود سے ملنے اس کے گھر آتی ہے تو اسے بتا جاتا ہے کہ درود کی سنگی رافع سے ہو چکی ہے۔ یہ خبر اسے ہلکا سے دوچار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ درود کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات محسوس نہیں کرتا۔

ایقان، ماشر کا گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اٹھکے آجاتی ہے اور ماشر کی تمام تر تعلیم دہائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے تابع اعلق کر لیتی ہے۔ وہ ماشر کی بے وفائی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ یہ صورت حال گھر کے تمام افراد کے لیے بے حد پریشان کن ہے۔ ماشر خایان جاتے ہوئے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔

۲۸

رنگھائی شادی

”شہلا گھبرا کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ بظاہر سویا ہوا محسوس ہوتا ہاشم نہ صرف جاگ رہا ہو گا بلکہ اس کی بے چینی اور بے قراری کا عینی شاہد بھی ہو گا۔ شہلا کو یوں لگا جیسے ہاشم کی آنکھوں میں اس کے سوال سے بڑھ کر بے اعتباری تھی۔ ہاشم نہایت آہستگی سے اٹھ بیٹھا۔ تکیے سے ٹیک لگا کر اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ لیے تھے اور اب سوالیہ نظروں سے شہلا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ خوب صورت ٹائٹ لیمپ کی مدد ہم درودھیار روشنی میں شہلا ان آنکھوں کو بخوبی پڑھ سکتی تھی۔ اس نے غیر شعوری طور پر اپنے گالوں پر آئے آنسو کو ایک بار پھر صاف کرنا چاہا۔ ہاشم پورے حواسوں کے ساتھ اس کی جانب متوجہ تھا۔

”شہلا!“ اس نے بے حد دھیمی آواز میں پکارا۔ ”میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟“ شہلا سے کوئی جواب بن پرانہ ہی نظریں اٹھائی گئیں۔

”کیا ان آنسوؤں کی آمد میں میری کسی کوتاہی کا عمل دخل ہے؟“

”نہیں نہیں۔“ اب کی بار وہ بے اختیار ہی بولی تھی۔ ”ایسا ہرگز نہ سوچیں ہاشم! آپ سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی یہ تو بس یونہی میں کچھ ڈپریشن تھی!“

”وہی تو پوچھ رہا ہوں وجہ ڈپریشن؟“ اس نے سر ہانے رکھے ٹائم پیس کی جانب دیکھا۔

”آخر ایسی کون سی بات ہے جو رات کے اس پہر تمہیں یوں رلا رہی ہے۔ یہ وقت تو اللہ والوں کا ہوتا ہے پھر دل والوں کا۔“

شہلا نے بے اختیار چونک کر اسے دیکھا۔

”نہیں۔۔۔ سنبھلی نہیں؟“

ہاشم کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی۔

”جیسے میں نہیں سمجھا۔ میرے سوال کا جواب ابھی تک ادھار ہے۔“ شہلا بے طرح جزبہ ہوئی۔

”ہاشم! میں شاید عمر کو مس کر رہی تھی۔ مجھے یونہی رونا آگیا ہے وجہ بے اختیار۔ آپ پلیز بریشان نہ ہوں۔“

”عمر کو مس کر رہی تھیں؟“ اس نے جیسے خود کلامی کی۔ ”عمر کو تو ہم نے رشتہ بارہ بجے گھر ڈراپ کیا ہے۔ کتنے دیر تک ہم نے ساتھ وقت گزارا ہے اور تم عمر کو مس کر رہی تھیں؟“ اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا۔ شہلا کا جی چاہا وہ سلیمانی ٹوپی پہن کر وہاں سے غائب ہو جائے۔

”پلیز ہاشم! وہ لیٹ گئی۔“ میں سوتا چاہتی ہوں بہت دور ہو گئی ہے۔“

اس نے آنکھوں پر یوں بازو رکھا جیسے اب مزید گفتگو کے لیے کچھ بچانہ ہو۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ نیند تو اب بہت دیر کے لیے آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے ہاشم کی سائیڈ ٹیبل کی درواز کھلنے اور پھر کھڑکے کی آواز سنی۔ پھر اس نے ہاشم کو اپنی طرف سے اٹھ کر جاتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ گیلری کا دروازہ کھول رہا تھا۔

شہلا سمجھ گئی تھی۔ جب کبھی اسے سگریٹ کی طلب ہوئی تھی تو وہ گیلری میں چلا جاتا تھا۔ رات کے اس پہر اسے سگریٹ کی طلب کیوں ہوئی تھی؟ شہلا کا دل معمول سے ہلکا کر دینے لگا۔ شہلا کی حرکت سے نجانے اس نے اپنے طور پر کیا اخذ کیا تھا۔ شہلا کا جی چاہا کہ وہ جا کر اس سے صاف تصانیف لے لے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے لیکن اس کے اندر اتنی ہمت نہ تھی۔ وہ چپ چاپ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی رہی۔ گیلری میں کھڑا ہاشم سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کہیں دور دیکھ رہا تھا۔

باہر گاڑی کا ہارن بجتے ہی وہ تینوں پر جوش انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ عمر سب سے پہلے شور مچاتا ہوا باہر کی جانب دوڑ گیا۔

”ماموں آگئے۔۔۔ ماموں آگئے۔“

ربیعہ، انیقہ اور منیہ بیگم بھی لاؤنج کا دروازہ کھول کر بیڑھیوں تک آگئی تھیں۔ فراز اور عباد لکڑی کا دروازہ کھول کر اندر آ رہے تھے۔ عمر کو دیکھ کر عباد نے اپنا پیچی کیس نیچے رکھ دیا اور اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”بھئی۔۔۔ بھائی! ماشاء اللہ شیر بن گیا ہے!“ اس نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”اب تو جم کر ریسنگ ہوگی۔“

”ہراووں گا۔“ اس نے مکالمہ کیا۔

”مائی ہلز ر جانوس۔!“ عباد نے تہقہہ لگایا۔

پھر عمر کو مار کر وہ ان تینوں کی جانب بڑھا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔“ وہاں سے لپٹ گیا۔

اللہ تمہیں ہر طرح سے کامیاب کرے بیٹے! وہ کچھ متفکر تھیں۔  
 میں بینک سے کافی بڑی رقم بھی نکلاؤں گا امی! ان کی پلکوں پر نمی چمکنے لگی۔ ”تم جانتے ہو۔۔۔“  
 میرے بچے سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔“

عباد نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔  
 ”سب کچھ آپ کا ہے امی! بینک بیلنس، یہ گھر اور ہم سب۔“  
 ”جیتے رہو۔۔۔“ وہ آنکھوں کے گوشے صاف کرنے لگیں۔  
 پھر جیسے انہیں کچھ دھیان آیا تھا۔

”عباد! ایک بات کہوں تم سے۔۔۔ ڈرتی ہوں کہیں کچھ غلط نہ کہہ بیٹھوں!“  
 ”کمال ہے!“ وہ خفا ہوا۔ ”آپ ماں ہو کر ایسی بات کرتی ہیں، آپ کو ہر طرح کی بات کرنے کا حق حاصل ہے۔“  
 ”میں کیا بات ہے؟“

”میرا ربیعہ کی شادی کی بات کر رہے تھے نا!“ وہ کچھ ہچکچاتی تھیں۔  
 ”جی ہاں کیوں کوئی مسئلہ ہے؟“ وہ متعجب ہوا۔  
 ”میں نہیں۔۔۔“ وہ جلدی سے بولیں۔ ”مسئلہ کیا ہونا ہے۔ میں سوچتی ہوں عباد! ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی آج کے  
 میں میں۔۔۔“ اگر تم راضی ہو تو کیوں ربیعہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں؟“  
 عباد ایک گتہ ہی خاموش ہو گیا۔ منیہہ بیگم نے امیرہ بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ عباد نے سر جھکا لیا

”میں نہیں نہ جانے کیوں اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔“  
 ”میں نہیں۔۔۔“ وہ جلدی سے بولیں۔ ”مسئلہ کیا ہونا ہے۔ میں سوچتی ہوں عباد! ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی آج کے  
 میں میں۔۔۔“ اگر تم راضی ہو تو کیوں ربیعہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں؟“  
 عباد ایک گتہ ہی خاموش ہو گیا۔ منیہہ بیگم نے امیرہ بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ عباد نے سر جھکا لیا

”میں نہیں نہ جانے کیوں اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔“  
 ”میں نہیں۔۔۔“ وہ جلدی سے بولیں۔ ”مسئلہ کیا ہونا ہے۔ میں سوچتی ہوں عباد! ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی آج کے  
 میں میں۔۔۔“ اگر تم راضی ہو تو کیوں ربیعہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں؟“  
 عباد ایک گتہ ہی خاموش ہو گیا۔ منیہہ بیگم نے امیرہ بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ عباد نے سر جھکا لیا

”میں نہیں نہ جانے کیوں اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔“  
 ”میں نہیں۔۔۔“ وہ جلدی سے بولیں۔ ”مسئلہ کیا ہونا ہے۔ میں سوچتی ہوں عباد! ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی آج کے  
 میں میں۔۔۔“ اگر تم راضی ہو تو کیوں ربیعہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں؟“  
 عباد ایک گتہ ہی خاموش ہو گیا۔ منیہہ بیگم نے امیرہ بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ عباد نے سر جھکا لیا

”میں نہیں نہ جانے کیوں اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔“  
 ”میں نہیں۔۔۔“ وہ جلدی سے بولیں۔ ”مسئلہ کیا ہونا ہے۔ میں سوچتی ہوں عباد! ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی آج کے  
 میں میں۔۔۔“ اگر تم راضی ہو تو کیوں ربیعہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں؟“  
 عباد ایک گتہ ہی خاموش ہو گیا۔ منیہہ بیگم نے امیرہ بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ عباد نے سر جھکا لیا

”میں نہیں نہ جانے کیوں اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔“  
 ”میں نہیں۔۔۔“ وہ جلدی سے بولیں۔ ”مسئلہ کیا ہونا ہے۔ میں سوچتی ہوں عباد! ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی آج کے  
 میں میں۔۔۔“ اگر تم راضی ہو تو کیوں ربیعہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں؟“  
 عباد ایک گتہ ہی خاموش ہو گیا۔ منیہہ بیگم نے امیرہ بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ عباد نے سر جھکا لیا

”میں نہیں نہ جانے کیوں اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔“  
 ”میں نہیں۔۔۔“ وہ جلدی سے بولیں۔ ”مسئلہ کیا ہونا ہے۔ میں سوچتی ہوں عباد! ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی آج کے  
 میں میں۔۔۔“ اگر تم راضی ہو تو کیوں ربیعہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں؟“  
 عباد ایک گتہ ہی خاموش ہو گیا۔ منیہہ بیگم نے امیرہ بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ عباد نے سر جھکا لیا

وہ اپنا کہا پورا کرتے ہوئے حقیقت میں منیہہ بیگم کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔ اور وہ محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

”بس اب کہیں نہیں جانے دوں گی۔ یاد رکھنا! بہت پردھانیاں ہو گئیں۔ اب ماں کے ساتھ رہو۔ نجائی زندگی میں اب کتنی سانسوں کی مہلت باقی بچی ہے!“  
 ”امی۔۔۔“ وہ سیدھا ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ”ایسی باتیں کریں گی تو میں سچ مچ کہیں دو دروازے ملک میں مشکل سے کورس کے لیے ایڈمیشن لے لوں گا۔ خدا نخواستہ آپ کو کیوں کچھ ہونے لگا۔ ابھی تو ہم نے بہت خوشیاں ساتھ مل کر دیکھنا ہیں۔“

”ان شاء اللہ۔۔۔“ وہ کچھ مطمئن سمجھ کر وہی ہو کر رہی تھیں۔  
 ”سب سے پہلے انیقہ اور ربیعہ کے لیے رشتے دیکھنے ہیں تاکہ ان کی پردھائی مکمل ہوتے ہی ان کے فرض سے سکدوش ہو جائے۔“

”بے فکر رہو۔۔۔“ انہوں نے اس کا کان کھینچا۔ ”وہ کہتی ہیں کہ اب تمہارے لیے اچھی سی لڑکی ڈھونڈنا ہے۔ تمہارا اللہ پردھائی سے بھی فارغ ہو چکے ہو۔ اور عباد! سچ پوچھو تو میری اپنی خواہش بھی یہی ہے کہ جلد از جلد تمہارے سر پر سہرا سجا ہوا دیکھوں۔“

”اوہو امی!“ وہ اٹھ بیٹھا۔ ”یہ آپ کن چکروں میں پھنس گئیں ابھی تو میری ڈھیر ساری پلاننگز ہیں جن پر مجھے عمل کرنا ہے۔ پردھائی سے فارغ ہوتے ہی سر پر سہرا باندھنے کا مجھے بالکل شوق نہیں ابھی تو میدانِ عمل میں قدم رکھنا بھی ہے اور جمانا بھی۔“

”تمہارے ابو اتنی زمین چھوڑ گئے ہیں تمہارے لیے۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”تمہیں ابھی سے یہ فکر کرنا پڑی ہے؟“  
 ”ضرورت؟ اچھا بھلا گزارا ہو رہا ہے ہمارا۔“  
 ”اوہ میری بھولی ماں۔۔۔!“ اس نے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ ”یہ دو باب راداکا جاگیر پر غیش کرنے والا نہیں ہے یہاں اپنا زور بازو دکھانا پڑتا ہے تب انسان کی لگائی پلپو بنتی ہے۔“

”ہاں چاند پر کتہہ ڈالو گے۔۔۔“  
 ”کوشش تو ضرور کریں گے۔“ وہ ہنسا پھر قدرے سنجیدگی سے بولا ”امی! میری ہلاکت بچھلے دنوں امیر حسن سے ہوئی ہے۔“

”امیر حسن؟“ وہ تعجب سے بولیں۔ ”یہ کون ہے؟“  
 ”ہے تو میرا ہم عمر۔۔۔ لیکن پردھائی اور تجربے میں مجھ سے کہیں آگے ہے۔ اس کا بزنس لندن میں ہے اب اسے وسعت دینے کے لیے وہ یہاں آیا ہوا ہے۔ وہاں لندن میں اس کے کاروباری پارٹنرز بزنس سنبھال رہے ہیں بہت بڑے پیمانے کا کام ہے جس کے لیے اسے یہاں بھی پارٹنرز کی ضرورت ہے جو پیسہ بھی لگائیں اور کام میں بھی مدد دیں میں نے امیر حسن کے ساتھ بزنس شروع کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ چند ایک روز میں ہم پروجیکٹ سائن کر لیں گے اس کے بعد کچھ عرصے تک لندن رات کی مصروفیت ہوگی۔“

”عباد۔۔۔!“ وہ کچھ پریشان ہوئیں۔ ”تم نے سب کچھ دیکھ بھال لیا ہے؟“  
 ”آپ بے فکر رہیں۔۔۔ ہاں لیکن ہر نماز کے بعد کامیابی کے لیے دعا کرتا نہ بھولیں۔۔۔“ وہ مسکرایا۔ ”مجھے آپ کی دعا اور اپنی محنت کی قبولیت کا پورا یقین ہے۔“

”آپ کی دعا اور اپنی محنت کی قبولیت کا پورا یقین ہے۔“

دوست تھی وہ اسے کتابیں پہنچا دیتی لیکن دل! دل کہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، بھول بھال کر اسے کتابیں پہنچانے چل دے۔ آنکھیں ایک مرتبہ اس کے دیدار سے سیراب ہو جائیں پھر جو ہو سو ہو۔  
”تم واقعی اچھی لڑکی ہو  
یا مجھ کو اچھی لگتی ہو!“

اس نے آنکھیں موند کر سوچا تھا۔ پردہ ذہن پر لمحے کے ہزاروں حصے میں وہی موہنی صورت مسکرانے لگی تھی۔ رافع بے بسی سے آنکھیں کھول کر پیشانی پر ہلکے ہلکے مکے مارنے لگا، اسے ہاشم یاد آنے لگا تھا۔ کتنا مذاق اڑا کرتا تھا وہ اس کے جذلوں کا، اس کی محبت کا، اس کی بے بسی کا۔ آج وہ خود اسی مقام پر کھڑا تھا اور اس کے اپنے جملوں کی بازگشت اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

”یار شاعر!“ اسے ہاشم کا انداز مخاطب یاد آیا۔ اس کے لبوں پر اداسی بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”یار! بندر کا جانے اور ک کا مزہ!“

”بچلو، ہم بندر ہی سہی!“ وہ مزے سے کہا کرتا۔

”تو گویا عشق نے انسان بنا دیا!“ اس نے سوچا اور دھیرے سے مسکرا دیا۔  
”عشق؟“ کسی نے چپکے سے سرگوشی کی تھی۔ ”عشق کرنے لگے ہو؟ واقعی؟“ رافع گھبرا سا گیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ جیسے چوری پکڑ لیے جانے کا ڈر ہو۔  
”ہاں۔۔۔ شاید!“ پھر اس نے بھی دل میں چپکے سے کہا تھا۔  
”انجام جانتے ہو؟“

”آغاز پر انجام کب سوچا جاتا ہے۔۔۔“ دل ضدی ہوا۔

”جو عقل کہتے ہیں وہ سوچ کر چلتے ہیں۔“  
”عشق اور عقل؟“ اس نے پوچھا۔ ”دل استہزائیہ ہنسنا۔“ ”عشق ہی انکرشمہ سازیاں دیکھ کر تو عقل کا منہ حیرت سے کھلا رہ جاتا ہے!“

”اچھا!“ کوئی اور بھی ہنسا۔ ”عشق تو جرات و بے خودی سے معمور ہوتا ہے۔۔۔ جرات ہے تو اٹھاؤ کتابیں اور چل بڑو اس کے گھر کی راہ پر۔۔۔“  
”لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ بے کل ہوا۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔“ دوسری جانب سے زبردست قہقہہ پڑا۔

رافع نے بے بسی سے اپنی پیشانی میز پر ٹکادی تھی۔



رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ ربیعہ نے ایک نگاہ اپنے برابر سوئے ہوئے عمر پر ڈالی پھر اس نے فرط محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

انیقہ کے امتحان ہو رہے تھے سو اس نے اسٹڈی روم کو ہی اپنا بیڈ روم بھی بنالیا تھا۔ ربیعہ عمر کے ساتھ سو جایا کرتی تھی۔ لیکن آج نجانے کیوں نیند آنکھوں سے روٹھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑکی تک چلی آئی۔ پردہ ہٹا کر اس نے سلائیڈنگ ڈور کھول دیا اور باہر دیکھنے لگی۔ لان میں رات کی رانی کا مکمل راج تھا۔ ربیعہ نے گہری سانس بھری تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے ساتھ ڈھیر سی خوشبو اس کے اندر اتر گئی۔

”ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی آج کل کے دور میں نایاب ہے۔ اگر تم راضی ہو تو کیوں نہ ہم اسے ہمیشہ کے لیے ساتھ رکھ لیں۔“

اس کے کانوں میں منیوہ بیگم کی آواز کی بازگشت لہرائی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بے کل ہوئی تھی۔ پھر عباد کی یاد آنے لگیں تو اس نے سکون کا سانس بھرا۔

”ج تو یہ تھا کہ یہ گھرا ہے بھی بے حد پسند تھا۔ یہاں کے مکینوں کے لیے اس کے دل میں بے حد فطری اور بے حد سچی محبت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ یہیں رہنا چاہتی تھی لیکن جس حوالے سے منیوہ بیگم نے یہ بات سنا لی تھی ربیعہ کے لیے اس کا تصور بھی محال تھا۔ عباد نے ٹھیک کہا تھا۔ ربیعہ کے لیے اب اپنے پرانے حقیقی حقیقی کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ اس کے لیے عباد بھائی تھا صرف بھائی۔ منیوہ بیگم ماں تھیں اور انہما اور شہلا بہن اسی گھر میں رہتے ہوئے ان رشتوں کے بدلنے کا خیال قطعاً ناقابل قبول تھا۔ لیکن طمانیت کی بات یہ تھی خود عباد بھی اس کا ہم خیال تھا۔ ربیعہ وہیں کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اسے خیال آیا۔

”کیا اس کی بے کلی بے قراری کی وجہ محض یہی تھی؟“

اس سے پرے اس سے سوا بھی کچھ تھا جس نے اس کی آنکھوں سے نیوہ کو دور کیا ہوا تھا۔ کیا تھا وہ؟ ربیعہ انگلیاں چٹانے لگی۔ عجب مشکل میں دل آن پہنسا تھا۔ آخر کیا تھا؟ اس میں جو اسے یوں بے چین کر گیا تھا؟ کیوں نا چاہتے ہوئے بھی اس کے متعلق سوچتی تھی؟ وہ کیوں اپنے دیکھنے کی متمنی رہتی تھی۔ ان مسکرائی آنکھوں کے سر کو کیا نام دیا جاسکتا تھا؟

دیوار سے لگ کر کھڑے کھڑے اس نے خود سے لائق اور سوالات کر ڈالے تھے جن میں سے کسی کا بھی جواب اس کے پاس نہ تھا۔

”کیا تم اس سے محبت کرنے لگی ہو؟“ اچانک ہی ایک بڑا سوال اس کے اندر سے اٹھ اٹھا۔

ربیعہ اس سوال سے خوفزدہ ہو گئی۔ اس جواب سے تو وہ سجانے کب سے نظریں چرا رہی تھی۔

”شاید ہاں۔“ اس نے سوچنا چاہا۔

تب ہی ایک معصوم مسکراتی صورت اسے یاد آئی۔ وہ روز کا چہرہ تھا۔ پر خلوص اور سچی درد کا۔

”نہیں۔“ اس نے بے چین ہو کر کہا ”نہیں بالکل نہیں۔ میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ میں اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی مجھے نہیں پتا وہ کون ہے۔“

اس نے سلائیڈنگ ڈور بند کیا اور ایک ٹینک سے پردہ برابر کر دیا۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے آئی تھی۔

”کچے کے سہارے نیم دراز ہو کر اس نے آنکھیں موندیں۔ تب اسے احساس ہوا اس کے اندر کوئی چپکے چپکے اس پر ہنس رہا تھا۔ ربیعہ نے بے بسی سے اپنا سر ہینڈ کی پشت سے ٹکا دیا۔“

”ناعمہ۔۔۔ ناعمہ!“ رابعہ بیگم اسے آوازیں دے رہی تھیں۔ وہ کپڑے استری کر رہی تھی۔ یونہی اٹھ کر باہر چلی آئی۔

”جی امی!“ اس نے وردازے کی جو کھٹ سے ہی پوچھا تھا۔

”تمہارا فون ہے۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولیں۔ ”بات کر لو۔“

”کس کا ہے؟“ وہ فون کی جانب بڑھنے لگی۔

”فریحہ کا!“

ناعمہ کے قدم یک لخت ہی سست پڑے چہرے پر پریشانی سی نمایاں ہوئی۔ اس نے تنکھوں سے ماں کی جانب دیکھا۔

وہ جانتی تھی فون فریحہ کا ہی تھا لیکن فریحہ کے ساتھ کون موجود تھا اسے اس بات کی بھی خبر تھی۔ پر چند کہ وردازے سے اجازت دے چکی تھی بلکہ شاید اس نے اب تک رابعہ بیگم سے بھی یہ بات نہ مکس کر لی تھی لیکن پھر بھی ایک حجاب تھا جسے اٹھانا ناعمہ کے لیے بے حد مشکل امر تھا۔

”ہیلو!“ اس نے ریسور اٹھا کر حتی الامکان آہستہ آواز میں کہا۔

”ہائے!“ دوسری جانب سے فریحہ کی شہنشاہی ہوئی آواز آئی ”کیا ہو رہا ہے جناب؟“

”کچھ بھی نہیں۔ بس پوچھی۔“

”وہ جلد ہی سے بولی۔“ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے آپ سنا نہیں کیسی ہیں؟“

”نہیں نہیں۔“ وہ جلد ہی سے بولی۔ ”یہ ہم عمر مند بھانجی ہیں آپ جناب نہیں چلنے والا۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”میری اور تمہاری تو بہنیں۔“ یہ ہم عمر مند بھانجی ہیں آپ جناب نہیں چلنے والا۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔

”خوب لڑائیاں ہوا کریں گی۔ میں بہت لڑا کا طبیعت کی ہوں۔ خیال رکھنا۔“

ناعمہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”مجھے پوچھوئے اے صاحب قدرے ڈھیلے پڑے تھے شاید فریحہ نے ہی گس شب لگانے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ غلط سمجھ بیٹھی تھی۔“

”تو تمہیں بھی نہیں ہون۔“ وہ اپنی جون میں آئی۔ ”مقابلہ تو پھر کانٹے کا ہی ہو گا!“ فریحہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

”اچھا۔۔۔ بھائی سے خوب شکایتیں لگایا کرو گی میری؟“ ناعمہ چھینپ سی گئی۔

”نہیں خیر لگائی۔ بھائی کی عادت تو نہیں ہے مجھے۔“ وہ تو وہ اپنی ہی مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔ انہوں نے ہی کہا ہو گا۔

”تھکتے۔“

”لو بھئی۔۔۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔“ ایک اور قہقہہ لگا۔ ”اچھا خیر ہمارا نام تو پورا ہوا۔ یہ بھائی مجھے خوب خوب گھور رہے ہیں اور اب تو انہوں نے تار کھینچنی شروع کر دی ہے۔ تم اب ان سے صفائیاں پیش کرو میں تو چلی!“

ناعمہ کو اچانک ہی پرگوں میں خون خشک ہونے کا احساس ہوا اسے لگا اس کی آواز بیٹھ گئی ہے۔

”جی۔۔۔“ دوسری جانب سے قدرے سنجیدہ لیکن خوب ضرورت مردانہ آواز ابھری تھی۔ ناعمہ خاموش رہی۔ اس نے کن اکھیوں سے قدرے فاصلے پر بیٹھی ماں کی جانب دیکھا تھا جو کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ یہ نہیں وہ اس کی جانب متوجہ تھیں یا نہیں۔

”ہیلو!“ دوسری جانب سے پھر کہا گیا۔

”جی۔۔۔“ وہ کسی مجرم کی طرح مری مری آواز میں بولی تھی۔

”یہ میری آواز سن کر سناپ کیوں سو گئے کیا ہے تمہیں؟ آواز پہچانی نہیں یا پھر آواز پہچان کر یہ حال ہوا ہے؟“

نہایت سنجیدہ اور قدرے سخت انداز میں کہا گیا تھا۔ ناعمہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”جی۔۔۔“ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کیسی بات؟ کھل کر بتاؤ۔ آواز پہچانی ہے یا نہیں پہچانی؟“ فراز قدرے طنز سے بولا۔

”آواز میں بھلا کیسے۔“ اسے پھر قریب بیٹھی ماں کا خیال آیا۔

”ہوں!“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”زیادہ لوگوں سے باتیں کرنے سے یہی ہوتا ہے۔ آوازیں آپس میں گڈھ ہو



جاتی ہیں۔ یہ سچ کہوں تو مجھ سے بھی تمہاری آواز نہیں پہچانی جا رہی ہے۔ تمہارے انداز بڑے بد لے بد لے ہیں۔ تم کیا ٹکٹ قیل کر رہی ہو؟

”جی؟“ اب کی بار وہ حقیقتاً پریشان ہوئی۔ ”میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“ فراز دھیرے سے ہنسا تھا۔

”بہت خوب۔۔۔ بالی راوے یہ نیا نمبر کیوں لیا گیا ہے؟ وہ پچھلا نمبر اب کس کے پاس ہے؟“

”پچھلا نمبر؟“ وہ گم صم سی ہوئی۔ ”آپ؟ آپ؟“

”ناعمہ! رابعہ بیگم اچانک ہی زور سے بولی تھیں۔

”جی ای جی! وہ پہلے ہی ہراساں تھی۔ زور سے ریسیور زلہ کر پٹی۔

”کیا جل رہا ہے؟ تم استری کھلی چھوڑ آئی ہو؟“

ناعمہ تیزی سے اندر کی سمت دوڑی تھی۔ رابعہ بیگم بھی اس کے پیچھے آئیں۔ کچن سے نکل کر دروازہ بھی آگئی تھی۔ ناعمہ نے واقعی استری بند کیے بغیر اپنی نئی قمیص پر چھوڑی ہوئی تھی۔ قمیص جل کر سیاہ ہو چکی تھی اور اس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔

وردہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر بٹن بند کیا اور استری اٹھا کر جگہ پر رکھی۔ ناعمہ صدمے سے اپنی قمیص کا حشر دیکھ رہی تھی۔

”یہ لڑکی اپنے حواسوں میں کبھی ہوتی ہے؟ نجانے دھیان کیا ہے؟“

رابعہ بیگم بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ ناعمہ ان کا مطلب سمجھ کر خفت سے سرخ ہو گئی تھی۔ وردہ نے اس کی صورت دیکھی۔ اسے بے اختیار ہی اس پر تڑپ آگیا۔

”چلو کوئی بات نہیں یہ کپڑا تو بہت ہے مارکیٹ میں تمہیں کل ہی نئی قمیص کا کپڑا لا دوں گی۔“

”ہوں؟“ اس نے چونک کر بہن کو دیکھا۔ ”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

وردہ نے غور سے اسے دیکھا تھا۔

”کس کا فون تھا؟“ اس نے سرسری سا پوچھا۔ ”فریحی؟“

”جی۔۔۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

وردہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ناعمہ اسی پوزیشن میں کھڑی اپنی جلی ہوئی قمیص کو گھورتی رہی۔

دل قدموں کو اور قدم اسے یہاں تک لے تو آئے تھے لیکن تیل بجا کر اب وہ خفت کا شکار تھا۔ نجانے کیوں اس کے جی میں پلٹ جانے کا خیال آیا۔ تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھول کر عبادا باہر آیا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے ٹیٹ کے اوپر سے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ کا تبادلہ کیا تھا۔

”راغب بھائی! عباد نے پر جوش انداز میں باتہ ملایا۔ ”آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“

”یہ تو تم سناؤ!“ اس نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”کبھی ملتے ہی نہیں۔۔۔ چھٹیوں میں آکر بھی چپ چاپ تے نکل جاتے ہو۔“

”بس آپ کی شکایتیں ختم“ وہ ہنسا۔ ”اب مستقل طور پر یہیں ڈیرہ جمالیا ہے ہم نے۔ اب خوب محفلیں جا کریں گی اور ہم آپ کی غزلیں سنا کریں گے۔“ راغب دھیرے سے ہنسا تھا۔

”آئیں نا اند۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں!“

راغب نے ایک نگاہ سفید سنگ مرمر سے مزین دیواروں پر ڈالی تھی پھر اس نے گہری سانس بھری۔

”نہیں یا۔۔۔! بس چلوں گا میں۔ یہ کتابیں ربیعہ کو دینا تھیں یہ پلیرا سے پہنچا دینا۔“

”اچھا! عباد نے کتابیں لے کر ان کے نام دیکھے۔ ”لا بھری سے لائے ہیں؟“

”ہاں! ربیعہ اور وردہ نے نوٹس وغیرہ بنائے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن چائے پیے بغیر تو آپ جا نہیں سکتے۔۔۔ کچھ تو ہمارے جذبہ میزبانی کا خیال کیجیے۔“

”پھر سی۔۔۔“ وہ مسکرایا۔

”اچھا۔۔۔ چلیں جیسے آپ کی خوشی۔ آپ ہمارا دل توڑ کر خوش ہوتے ہیں تو یونہی سی!“ عباد! شگفتگی سے بولا تھا۔

”میں پھر آؤں گا عباد ابھی زرا ضروری کام سے جا رہا تھا۔“

”اوپر کے رافع بھائی! عباد نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”نافع سے کہیے گا مجھ سے ملے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اسے ایک نظر دیکھ لینے کا خیال کس قدر فرحت بخش تھا۔ رافع نے اس خیال کو کس مشکل سے مات دی تھی۔ وہی جانتا تھا دل اداس ہو گیا تھا پھر آج آرزو ہوئی تھی لیکن وہ جانتا تھا یہی ٹھیک تھا۔

گاڑی اسکول کے سامنے رکتے ہی وہ گیٹ سے بھاگا بھاگا چلا آیا تھا۔ شہلانے جھک کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ اندر آ بیٹھا۔

”اسلام علیکم مہما۔۔۔“

”و علیکم السلام! میں نے جھک کر اس کے کان چومے ”ہاؤ آریو؟“

”مہما کو تنگ کرنے لگے ہونا۔۔۔“ اس نے گاڑی سے اتر کر بھائی۔

”نہیں مہما۔۔۔! وہ جلدی سے بولا۔ ”بس آج میرا موڈ ہو رہا تھا کہ آپ مجھے پک کریں۔ اسی لیے آپ کو فون کیا۔۔۔ آپ تنگ ہوئیں؟“

شہلانے ایک مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”نہیں! آج تو خیر میری ٹائمنگز بھی یہی ہیں لیکن روز روز یہ نہیں چلے گا۔ سمجھے؟“

”جی۔۔۔“ اس نے سمجھ داری سے سر ہلایا۔

پھر وہ باہر گزرتے مناظر دیکھنے لگا تھا۔

”پر رھائی کیسی جا رہی ہے؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”فرسٹ کلاس منتھلی ٹیسٹ میں میری رپورٹ سب سے اچھی ہے۔“

”زبردست۔۔۔“ شہلانے خوش ہو کر اس کے بال سلانے ”اب آئندہ بھی یہی کارکردگی ہونی چاہیے۔“

”جی مہما۔۔۔“ اس نے اچانک ہی پکارا۔ ”اس روڈ پر اگر ٹرن کریں نا تو آگے جا کر ایک اور روڈ ہے۔ وہاں میرا گھر ہے۔“

شہلانے متعجب ہو کر اس رستے کی جانب دیکھا جو شہر کے پوش ایریا کی طرف جاتا تھا۔

”کس کا گھر ہے؟“

”میرا! وہ مزے سے بولا۔

”تمہارا؟ وہ کیسے؟“

”میرے پیہا نے بنوایا ہے میرے لیے۔“

شہلا خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

”پیہا تمہیں یہاں لائے تھے؟ اس گھر میں؟“ کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

”جی ہاں! بہت شاندار گھر ہے۔ پیہا بولے یہ تو میں نے اپنے بیٹے کے لیے بنوایا ہے۔ میں نے کہا کہ میں

اتنے بڑے گھر میں اکیلا کیسے رہوں گا۔ تو وہ بولے۔۔۔“ اچانک وہ زبان دانتوں میں دبا کر خاموش ہو گیا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ وہ قدرے خالی الذہنی سے بولی۔ ”کیا بولے؟“

”وہ بولے۔۔۔ تمہاری ماما کو بھی اس گھر میں لے کر آئیں گے۔“

شہلا خالی خالی نظروں سے سامنے سرک کو دیکھتی رہی۔ قریب گزرتی گاڑی نے زور سے ہارن دیا تب وہ چونکی

تھی۔ اس نے عمر کی جانب دیکھا جو اب مزے سے ٹانگیں ہلا رہا تھا۔

”ماما! کچھ دیر بعد وہ پھر بولا تھا۔“

”ہوں۔۔۔ بولو۔“ وہ دمھم آواز میں بولی۔

”بچوں کا گھر کون سا ہوتا ہے؟ ان کے پیہا کا یا ان کی ماما کا یا پھر ان کی نانو کا؟“

شہلا خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی ابھری تھی۔ اس کے معصوم بیٹے کے لیے واقعی یہ ایک بڑا سوالیہ

نشان تھا کیونکہ ہر بچے کی طرح اس کے ماں باپ کا گھر ایک نہیں تھا۔ ان دونوں کے گھر علیحدہ علیحدہ ہو چکے تھے۔

اس پر ستم یہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ رہنے کے بجائے ایک تیسرے گھر میں رہنا تھا جو کہ اس کی

ثانی کا تھا۔

UrduPhoto.com

”بتائیں نا ماما! اس نے اصرار کیا۔“

شہلا نے ایک گہری سانس بھر کر پلکیں جھپکیں اور نمی اپنے اندر اتارنے لگی۔

”بچوں کے تو سارے ہی گھر ہوتے ہیں بیٹے! پیہا، ماما، نانو سب ہی پیار کرتے ہیں بچوں سے۔“

”لیکن پیہا کہتے ہیں کہ نانو کے گھر رہنا میرے لیے صحیح نہیں ہے۔۔۔ وہ کہتے ہیں پیہا کا گھر ہی بچوں کا اصل گھر

ہوتا ہے۔“

شہلا کے اندر طال اترنے لگے۔ اس سے کچھ بولا نہ جا سکا۔

”ماما! میں اب اپنے پیہا کے ساتھ رہوں گا۔۔۔ ان کے گھر میں۔“ وہ اچانک ہی منہم انداز میں بولا۔

شہلا کی گرفت اسٹیرنگ پر کمزور پڑنے لگی۔

”کس نے کہا تم سے؟“

”پیہا نے کہا ہے۔۔۔ لیکن مجھے ان کی بات بہت اچھی لگی ہے۔ میں نانو سے ملنے جاؤں گا روز، لیکن رہوں گا

اپنے پیہا کے ساتھ ٹھیک ہے نا ماما!۔“

شہلا نے مضطرب سی ہونٹ دانتوں تلے دبایا تھا۔

”اور اگر آپ ہمارے ساتھ رہنا پسند کریں تو آپ بھی آجائیں۔۔۔“ پھر وہ آہستگی سے بولا۔

”ہا شتم انگن بہت اچھے ہیں ماما! وہ آپ کو ضرور پریشاں دے دیں گے۔“

شہلا کی اب سمجھ میں آیا تھا کہ عمر آج اس سے ضد کیوں کر رہا تھا کہ وہی اسے اسکول سے واپسی پر لینے آئے۔

اس نے بے حد صراحت سے ابرار کا پیغام اس تک پہنچا دیا تھا۔ یہ بات ابرار کی زبان سے سن کر وہ جھلا جاتی تھی

وردہ جب ٹیبل صاف کر کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ چائے کا کپ لیے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ وردہ اس کے قریب آ بیٹھی۔

”عامر!“

”کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تم نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔ مجھے تم کچھ پریشان معامہ ہوتی ہو۔“

”لیکن میں اتنی بدحوئیوں ہوں آپ کی؟“ وہ بے بسی سے بول رہی تھی۔ ”مجھے تو کوئی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔“

وردہ اس کی بات سن کر پریشان سی ہو گئی۔

”مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا تم نے میری آواز نہیں پہچانی؟ پھر کہنے لگا تم شاید گلٹ فیل کر رہی ہو۔۔۔ بھلا میرے پاس ان باتوں کا کیا جواب؟ جب میں پہلی مرتبہ اس کی آواز سنوں گی تو پہچانوں گی کیسے اور مجھے گلٹ کیوں ہونے لگا نہیں بنے کون سا جرم کیا ہے؟“

"ہاں۔۔۔ ہاتھ بھائی کی شادی میں اس نے دو ایک مرتبہ مجھے مخاطب کیا تھا۔ لیکن تب بھی اس کا رویہ عجیب سا ہی تھا۔۔۔ اور ہاں!"

”ہائے آہی۔ اب کیا ہو گا۔ آپ لوگوں نے ایک پاگل سے میری متعلق کر دی ہے۔ میں تو کبھی اس سے شادی نہیں کروں گی۔“

طبیعت سے بخوبی واقف ہوں۔ مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔“

”اور میری بات پر آپ کو یقین نہیں؟“ وہ آزر کی سے بولی۔

”چل جائے گا پتہ، تم خود کو پریشان مت کرو۔“  
وہ اسے تسلی دے کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

عذرا بتلم گم رہے میں داخل ہوئیں تو شفیقہ حیات کو گہری سوچ میں کم پایا۔ ان کے چہرے پر از حد رنج و غم کے آثار تھے۔ وہ ان کے قریب آ بیٹھیں۔

”کتنے دن ہو گئے ہیں یہ ایتھان دو قدم کے فاصلے پر ہو کر بھی شکل نہیں دکھاتی۔ پہلے گھروں پر تھا تو ہر دو سرے دن

”در اصل وہ ہماری نصیحتوں سے چڑے لگی ہے۔ یا تو آپ کوئی بات پتیر کر دیجے یا نہیں۔“

تک اس موضوع پر بالکل بات نہیں کرنا چاہتی۔ ہمیں بھی اس کے جذبات کا خیال کرنا چاہیے۔

”اگر آپ آواز میں آنسوؤں

”اماں! سارا قصور اسی کا تو نہیں ہے نا۔“ انہوں نے دلی آواز میں نند کی حمایت کرنا چاہی۔

سے۔ ارے عورتیں تو شرابی، کبابی، جواری، مرووں کو زندگی بھر ہنس تھیل کر برداشت کرتی ہیں کہ گھر نہ ٹوٹے، بچے

بے گھر نہ ہوں۔“

عذرا بیگم خاموش ہو گئیں۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔۔۔“ انہوں نے دل میں سوچا تھا۔ ”ظلم، جبر، بے ایمانی، فریب عورت ہانسی خرابداشت کرتی رہے تو عورت! ان کے خلاف آواز اٹھائے فریب دینے والے کا گریبان پکڑے، اپنے بندوں توہین کی سزا دینا چاہے تب سارے الزامات کا رخ اس غریب کی طرف۔ اس نے گھر توڑا؟ اس نے بچوں کو بے گھر کیا۔ خاموش بے زبان گائے جیسی زندگی گزار کر دنیا سے چلے جانے والی عورتوں کو مثال بنانا کر پیش کیا جاتا۔“

”میں کہتی ہوں عذرا! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔۔۔“ شفیقہ حیات نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کر دئی تھی۔

”اس کو سمجھاؤ اب بھی وقت ہے معافی مانگ لے اس سے۔ اپنا گھر پھر سے آباد کرے۔ ارے یہاں بیٹھی اچھی لگ رہی ہے بھلا؟ اپنے گھر کو تالا ڈال کر چلی آئی ہے، تالا ڈال کر چلے آئے سے کیا ہو گھر پر ایسا اور یہ دیکھ کا جائے گا؟“

”آپ جانتی ہیں اماں! وہ کس قدر ضدی ہے۔۔۔“ انہوں نے دھیمے دھیمے لہجے میں کہا۔  
 ”اور یہ ضد انسان کو تباہ کر دیتی ہے تم بھی جانتی ہو گی۔“  
 ”خدا نہ کرے۔۔۔“ وہ بڑبڑا میں۔

”ارے بد دعا نہیں دے رہی اسے ماں ہوں اس کی لیکن ماں ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ میں بے جباباؤں میں اس کا ساتھ دوں۔ اسے اتنے برے کی تمیز نہ سکھاؤں، آئینہ نہ دکھاؤں۔۔۔ میرا توجہ کرتا ہے اچھی طرح سن رہی ہے۔“

”جلدی نہ کریں اماں!۔۔۔“ انہوں نے بولے سے ان کا ہاتھ دبا دیا۔ ”(ابھی رخم تازہ ہے۔۔۔)“  
 ”ارے میرے جی پر بیٹھا رہتا ہے اس کا خیال۔“ وہ سسکیں۔ ”کچھ اور نہ ہو جائے عذرا!“  
 ”سب ٹھیک ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔ عاشر انا کم بخت نہیں ہے۔“ انہوں نے ساس کو تسلی دی تھی۔

”دنوں ہی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو کر اپنی اپنی سوچ میں گم ہوئی تھیں۔ تب ہی سدرہ کمرے میں داخل ہوئی اس نے ایک نگاہ ماں اور دادی پر ڈالی پھر اصرار عذر دیکھا۔“  
 ”پچھو کہاں گئیں؟“  
 ”پچھو؟“ وہ دونوں ہی چونک اٹھیں۔

”ہاں۔۔۔ ایقان پچھو آئی تھیں نا ابھی۔۔۔ میں کچن میں تھی۔۔۔“  
 ”ایقان آئی تھی؟“ شفیقہ حیات حیران سی ہوئیں پھر جیسے بہت کچھ سمجھ گئیں۔  
 ”اس نے یقیناً ہماری گفتگو سنی ہے۔“ عذرا بیگم متفکر ہوئیں۔ ”بے چاری اسے قدموں لوٹ گئی ہے۔“

شفیقہ حیات کچھ سوچنے لگی تھیں۔

ہاشم نے گاڑی گھر کے اندر کھڑی کی تو دیکھا شہلا کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ اس نے رسٹ ورائج پر نگاہ ڈالی۔ اس کا ڈیوٹی ٹائم آف ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ منیوزہ بیگم کی طرف چلی گئی تھی۔ اپنا بریف کیس اٹھائے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا گھر کے اندر دلی جھبھے میں داخل ہوا۔ لاؤنج میں فاروق

سن اور فردوس بیگم موجود تھیں۔

”اسلام دو ٹیکم۔“ وہ بریف کیس میز پر رکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔

”عذرا بیگم اسلام۔“ فاروق حسن نے جیسے کے اوپر سے اسے دیکھا۔

”شہلا ہمیں آئیں اب تک؟“ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔  
 ”دہلے وہ طے تو کر لیں کہ ان کا گھر ہے کون سا۔۔۔“ فردوس بیگم کو گویا اس کے سوال نے تیلی ہی دکھادی تھی۔

”جک کر لیں۔“

ہاشم چونک سا گیا۔ اس نے باری باری ماں کاٹنا ہوا اور باپ کا سپاٹ چروہ دیکھا۔  
 ”کیا مطلب۔۔۔ میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”مطلب یہ بیٹے جی۔۔۔ کہ کچھ ہمارا اور ہماری عمروں کا خیال کرو۔ ہمیں ہو چاہیے تھی ہماری خدمت کے لیے۔“

وقت پر کھانا وقت پر دوا دار۔۔۔ یہاں تو ہو بیگم کو ڈیوٹی اور پھر میکے سے فرصت نہیں۔ فارغ اوقات میں سیر

کرتے ہیں۔۔۔ میں نے ان کو یہ کہنا یاد دلایا کہ اب تک چلے گا آخر۔“

ہاشم خاموش سا ہو گیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ شہلا کے لیے کچھ بھی غلط سننے پر اس کا دل آمادہ نہ ہوتا تھا لیکن ماں

آخر کو ماں تھی۔ اس کی بات رد کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ وہ شہلا کی طرف داری کرتا۔

”ہاشم بیٹے!“ فاروق حسن نے جیسے اناکر گریز پر رکھا۔ ”تمہاری امی کی بات میں اتنی سچائی تو ضرور ہے کہ ہو کو

اب کچھ عرصہ گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔ ہاشم لوگ اس گھر میں سچی خوشیوں کے منتہی ہیں۔ سب مل کر

رہیں ساتھ وقت گزاریں نہیں بولیں زندگی کے نئے رنگوں سے لطف اندوز ہوں۔ بیٹا! ہمیں اب نیچے نیچے

نہیں دیکھنا۔۔۔ ضرورت ہے۔۔۔“

جی۔۔۔ جی بابا جان!۔۔۔“

وہ آستکی سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے قدم سست پڑ چکے تھے۔

آج کئی دن کے بعد وہ پارک پہنچی۔ شام کی تازہ ہوا میں چل قدمی کرتے ہوئے سورج کی الوداعی کرنوں

کے رنگوں پر غور کرتے ہوئے وہ کافی آگے تک چلی آئی تھی۔

تب ہی اسے عمر کا دھیان آیا۔ وہ اسے سوتا پھوڑ کر آئی تھی۔ اٹھ کر وہ یقیناً ”اسے تلاش کرتا۔ شہلا کے اس

گھر سے چلے جانے کے بعد وہ ریجہ سے بہت زیادہ اٹھ بچ ہو گیا تھا۔ اکثر وہ اسی کے ہاتھ سے کھانا کھانے کی ضد کرتا

تھا۔ منیوزہ بیگم یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ ریجہ نے ان کی تقریباً ”سب ہی ذمہ دار یاں بانٹ لی

تھیں۔“

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے وہ پارک سے نکل کر سڑک پر چلی آئی۔ عین اسی لمحے ایک سیاہ کتا نجانے کہاں سے

نکل کر دوڑتا ہوا اس کی جانب آیا تھا۔

عاشق کی اچانک پاکستان آمد پورے خاندان کو سرور کرتی ہے۔ تاہم ایقان اس کے رویے میں کچھ تبدیلی محسوس کرتی ہے۔ منور ایمین کی سخت باتیں سن کر ربیعہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے لیکن ترانہ اس کی ایک نہیں سنتی۔ جس پر ربیعہ کو بارہونا پڑتا ہے۔ گھر سے نکلنے سے قبل عینی موقع پر تمدن گھر پہنچ جاتا ہے۔ جس پر ربیعہ خود خرد ہو جاتی ہے۔

ربیعہ کا عہد کے گھر میں ختم ہونے کا کیا جاتا ہے۔ منترہ بیگم، ربیعہ کو اپنی بیٹی بنا لیتی ہیں۔ اشم اور شہلا کی شادی کی تقریب میں ہی نافع اور عریضہ کا نکاح پڑھوا دیا جاتا ہے جس پر عریضہ سخت کیندہ خاطر ہوتی ہے۔

شادی کی اولین رات ابراہیم جیلانی کا فون شہلا کو پریشان کر دیتا ہے۔ شہلا شادی سے بعد اپنی ماں سے ملنے آتی ہے تو وہیں اس کا ملاقات ابراہیم سے ہو جاتی ہے۔ عین موقع پر ہاشم، شہلا کو اطمینان دلاتا ہے کہ وہ اس پر اعتماد کرتا ہے۔

فراز جو درحقیقت ناعمہ کو پسند کرتا ہے، ہاشم کی تقریب میں اسے دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف عریضہ کے لیے فراز کا آمد پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ فراز بھی سمجھتا ہے کہ فون پر اس سے ناعمہ باتیں کرتی تھی۔ رافع کو ربیعہ میں اپنے آئینہ دل کی جھلک نظر آتی ہے جس کا قلم ہاشم کو ہو جاتا ہے۔

لڑا، عاشق کو پاکستان پہنچ کر فون کرتی ہے۔ عاشق اسے لینے ایر پور ٹ جاتا ہے۔ ایقان، عاشق کے پراسرار رویے پر مشکوک ہو جاتی ہے۔

شہلا سب کے سامنے چھٹی ختم ہونے کا ذکر کرتی ہے تو فردوس بیگم کا سرور و قہر اسے پریشان کر دیتا ہے۔ تاہم مایہن اسے دلا سادے کر مطمئن کر دیتی ہے۔ شہلا، ربیعہ کے ساتھ رابعہ بیگم کے گھر آتی ہے۔ سب ربیعہ کی سادگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ربیعہ،

وردہ کے شور سے ایم اسے سویا لوجی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ عاشق، لڑا کی پیش کش رد کر دیتا ہے۔ تاہم لڑا کا درد مال ایقان کے ہونٹ لگ جاتا ہے جس پر وہ عاشق سے حقیقت پوچھتی ہے۔ عاشق کو کھلا ہٹ میں سب کچھ بتا دیتا ہے۔ ایقان حقیقتاً صدمے سے گنگ رہ جاتی ہے۔

ربیعہ، وردہ سے ملنے اس کے گھر آتی ہے تو اسے بتا جاتا ہے کہ وردہ کی منگنی رافع سے ہو چکی ہے۔ یہ خبر اسے صدمے سے دوچار کر دیتی ہے۔ دوسری طرف رافع بھی اسے جلد بازی میں کیا کیا فیصلہ سمجھ رہا ہے۔ وہ وردہ کے لیے اپنے دل میں خاص جذبات محسوس نہیں کرتا۔

UrduPhoto.com

ایقان، عاشق کا گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے میکے آ جاتی ہے اور عاشق کی تمام تر یقین دہانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے قطعاً تعلق کر لیتی ہے۔ وہ عاشق کی بے وفائی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ یہ صورت حال گھر کے تمام افراد کے لیے بے حد پٹان کن ہے۔ عاشق جاپان جا چکے ہوئے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔

انٹیمس سیریں

قریب آکر اس شخص نے ربیعہ کو سہارا دے کر اٹھانا چاہا۔

ربیعہ جھجک کر خود کھڑی ہونے لگی لیکن اس کے ہی لمحے اس کے لبوں سے چیخ برآمد ہوئی تھی۔ اسے اپنے پہلو بٹایا میں بازو میں درد کا احساس ہوا۔

”میں بے حد معذرت خواہ ہوں میڈم۔“ وہ شخص بے طرح شرمندہ اور ہراساں ہو رہا تھا۔

تب ہی ایک بایک ان دونوں کے نہایت قریب آکر رکی۔ بایک پر بیٹھا ہوا رافع تیزی سے اتر اور ان لوگوں کی جانب بڑھا۔

”ربیعہ! ربیعہ آریو آل رائٹ؟“ وہ ربیعہ سے پوچھنے لگا۔

”میں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔“ ربیعہ نے رسائییت سے بوسنے کی کوشش کی۔ نجائے کیوں رافع کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ سرک پر اچھا بھلا تماشا کھڑا ہو گیا تھا۔

رافع اب اس کا رڈ رائیور کو کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا۔ اس کا ہر نہ چلتا تھا کہ وہ اس کا گریبان پکڑ لیتا۔



”اتنی بڑی گاڑی ملی ہے تو اس کو استعمال کرنے کے تقاضوں کو بھی مد نظر رکھیں مسٹر!“ وہ نہایت غصے سے اس شخص سے مخاطب ہوا ”کوئی نشہ وغیرہ کر کے کھر سے نکلے تھے آپ؟“

”دیکھیں سرسید! میں معذرت چاہتا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں میں قصور وار نہیں ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولا۔

”جی ہاں۔۔۔ بھلا آپ قصور وار کیوں ہونے لگے۔“ رافع طنز سے بولا ”ان معاملات میں اکثر ہی گاڑیوں والے بے قصور ہوتے ہیں۔“

”رافع۔۔۔ رافع پلیز۔“ ربیعہ درد کی شدت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ واقعی بے قصور ہیں۔ دراصل میں ہی بغیر دیکھے بھالے سڑک کر اس کر رہی تھی۔“

”میرا خیال ہے ہمیں باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے انہیں ہاسپٹل لے کر جانا چاہیے۔“ وہ شخص ربیعہ کا زرد پڑا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ رافع نے اب ربیعہ کا جائزہ لیا تھا۔

”نہیں نہیں۔۔۔“ ربیعہ مزید زور پڑی۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں میں اب گھر جاؤں گی۔“

اس نے قدم بڑھانے کی کوشش کی تو ایک مرتبہ پھر چیخ اٹھی۔ اس نے احساس ہوا کہ اسے واقعی چوٹیں آئی تھیں۔

”ربیعہ۔۔۔!“ رافع نرمی سے بولا۔ ”میرا خیال ہے یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ تمہیں چیک آپ کروالینا چاہیے۔ ہمیں قریب ہی میرے دوست کے بھائی کا کلینک ہے۔“

”میں گھر جاؤں گی۔۔۔“ وہ اٹل انداز میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ رافع مزید نرم پڑا۔ ”میں شملہ بھالی کو فون کر دیتا ہوں۔“

وہ شخص عجیب کش کش کا شکار ہیں کھڑا تھا۔ رافع نے اپنی بائیک سائیڈ میں کھڑی کی پھر وہ ربیعہ کے قریب چلا آیا۔

”اگر تمہیں سہارے کی ضرورت ہے تو میں۔۔۔“ وہ قدرے جھجکا تھا۔

ربیعہ کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ خود کو چلنے سے قائل نہیں بارہی تھی لیکن وہ رافع کا بازو تھامتھی یا رافع اس کا ہاتھ پکڑتا اس خیال نے ہی اسے شرم سے پالی پالی کر دیا تھا۔

”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں مس ربیعہ!“ عجیب سی صورت حال شکار میں شخص نے مدخلت کی۔

رافع نے ایک نظر اس کے جھل چہرے پر ڈالی پھر اس کی گاڑی کو نہ دیکھا۔

”یہ شاید ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ رافع نے ربیعہ کو قائل کرنے والے انداز میں دیکھ کر کہا۔ ”تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔۔۔ میرا نہیں خیال کہ تم گھر تک آرام سے چل پاؤ گی۔“

اتنی بات ربیعہ بھی سمجھ چکی تھی۔ وہ چپ چاپ گاڑی کا ہی سہارا لے کر بچھلے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اجنبی نے اس کے لیے لپک کر دروازہ دیا کیا تھا۔ ربیعہ کے بیٹھ جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کر کے رافع کو نہ دیکھا۔

”پلیز۔۔۔ آپ بھی بیٹھیں۔۔۔“

”نہیں! میں بائیک پر آجاتا ہوں۔ آپ انہیں گھر تک پہنچا دیں۔ بے حد نوازش ہو گی!“ وہ اپنی بائیک کی جانب

بڑھ گیا۔

ربیعہ کو آتا دیکھ کر منہ زہ بیگم اور انیقہ بے حد گھبرا گئی تھیں۔ ان کی آوازوں سے پریشان ہو کر عباد بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔

”دیکھا ہوا ہے ربیعہ! خیر تو ہے زیادہ جوش تو نہیں آئی۔“

سب کے سب اس سے مختلف سوالات کرنے لگے۔ ربیعہ انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی انیقہ نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کا بازو چیک کرنے لگی۔

ایسے میں عباد کی نگاہ ایک لخت سامنے کھڑے اس شخص پر گئی۔

”ارے امیر حسن۔۔۔ آپ!“ وہ بے ساختہ ہی آگے بڑھا۔

”جی ہاں۔۔۔“ وہ مسکرا رہا تھا ”میں آپ ہی کو دیکھ رہا تھا کہ آپ کب متوجہ ہوتے ہیں!“ عباد گرم جوش انداز میں اس سے ملنے لگا۔

”امی جی۔۔۔ میں نے آپ کے متعلق بات کی تھی۔ شاید آپ کو یاد ہو!“

”امیر حسن!“ منہ زہ بیگم سوچنے لگیں۔ ”ہاں شاید یہ وہی ہیں نا جن کے ساتھ تم اپنا بزنس اشارت کرنا چاہتے ہو۔“

”جی ہاں۔۔۔“ عباد مسکرایا۔

امیر حسن نے بے حد احترام سے منہ زہ بیگم کو سلام کیا۔

”جی جی۔۔۔“ وہ ملاجعت سے بولیں ”میرا تو خیال تھا کوئی بڑی عمر کا شخص ہو گا۔۔۔ تم تو بالکل میرے عباد جیسے لگتے ہو۔“

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”در اصل بزنس میرے پاپا اور بھائی سنبھالتے ہیں۔ میں یہاں پاکستان میں اس کی پروموشن کے سلسلے میں آیا ہوں۔ یہاں عباد صاحب سے ملاقات ہو گئی تو ہم نے سوچا کیوں نہ مل کر کام کیا جائے۔ آج بھی میں اس سلسلے میں عباد سے ہی ملنے یہاں آیا تھا۔“

”اور ہمارے گھر کے ایک بڑے سے آپ سڑک پر ہی مل لیے۔“ انیقہ نے مزاحاً شکایتی انداز میں کہا۔ سب لوگ ہی ہنس پڑے۔

”یہ گواہی تو آپ کے گھر کا بندہ ہی دے گا جناب!“ امیر حسن اب بشارت سے گویا ہوا تھا ”کہ اس حادثے میں میرا ہاتھ سرمو نہیں ہے کیوں مس ربیعہ!“

”جی ہاں۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ربیعہ آہستگی سے بولی تھی ”در اصل میں ایک کتے سے خوف زدہ ہو کر دوڑی تھی۔ بنا دیکھے ہی سڑک کر اس کرنے لگی۔ آپ نے تو پھر بھی حاضر دماغی سے کام لیا ورنہ شاید یہ حادثہ خطرناک ہو سکتا تھا۔“

”بچانے والی ذات خدا کی۔“ وہ مسکرایا۔ ”ہم انسان تو خطا کے پتلے ہیں۔“

ربیعہ نے اب کی بار پہلی مرتبہ اسے نظر بھر کر دیکھا۔ خوب صورت بھاری آواز رکھنے والا وہ شخص خود بھی متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ آف وہائٹ شلوار سوٹ میں اس کا قد و قامت بے حد جاذب نگاہ نظر آتا تھا۔ اس کا لہجہ اور بات کرنے کا انداز بھی بہت خوب صورت تھا۔

## قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی متعدد آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

”ایسا! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں ہرگز ڈرائنگ روم میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ بین پیمینک کر قدرے ضدی پن سے بولی تھی۔

دورہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔  
”ناعمہ! یہ نیا دور ہے، اس کے کچھ مختلف تقاضے ہیں، نہ چاہتے ہوئے بھی کہیں کہیں دنیا داری بنا ہونا پڑتی ہے۔“  
”اگرچہ میں اس کا اعتراف کرتی ہوں، لیکن میں یہ نہیں سمجھتی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنا لباس تبدیل کر دوں۔“  
”آئی! وہ رو ہانسی ہو گئی، اس کا دل کس نے کھاتھا آنے کو۔“

اس کے انداز میں ہار ماننے کا اشارہ تھا، دورہ کو اس کی بات اور اس کی سب سے بے بسی پر ہنسی آگئی۔ وہ ہنسی چھپاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔ ناعمہ کچھ دیر پریشان صورت بنائے بیٹھی سوچتی رہی۔

پھر وہ تھکے تھکے سے انداز میں اٹھ کر الماری کی جانب بڑھ گئی۔  
”میں نے تبدیل کر کے لائٹ تنک لپ اسٹاک کے چہرہ سجائے، جب وہ کچن میں داخل ہوئی تو دورہ کی تیاری بھی ختم ہو گئی۔“  
”اگرچہ میں اس کی تیاری نہیں کرتی، لیکن میں اس کے لباس کو لانا پسند کرتی ہوں۔“

”دیکھ کر اس نے مطمئن نظروں سے اس کا سراپا دیکھا۔“  
”چلو، یہ چائے لے کر جاؤ اور سیٹے اور تمیز سے سرو کرو۔“  
”یہ کام آپ کر لیں نا آئی!۔“ دورہ نے بھڑکے انداز میں بولی۔ ”میں آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ مجھ سے قہرے اور دورہ کا تہ سب بچھڑکتا نہیں رہتا۔“

”نہ زیادہ پہانے بازو کی ضرورت نہیں ہے۔“ دورہ پر اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ”چلو، سنبھالو!“ اس نے زالی چیخ کر ناعمہ کے آگے کر دی۔ مزید بحث کی گنجائش ہی نہ تھی۔ سو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر زالی لیے آگے بڑھ گئی۔ دورہ بھی اس کے پیچھے تھی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر اس نے نگاہ اٹھائے بغیر ہی سلام کیا تھا۔ جواب میں فریج کی گرم جوش آواز سے اسے اندازہ ہو گیا کہ کون کہاں بیٹھا ہے، سو وہ اسی جانب بڑھ گئی۔

”ناعمہ! بیٹا پہلے سب کو چائے دو۔“ رابعہ بیگم نے اسے دھیمے سے پکارا۔  
وہ صوفے پر بیٹھنے لگی تھی، لیکن اسے ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ ناچار وہ زالی رابعہ بیگم کے ساتھ بیٹھے ہوئے فراز کے قریب لے آئی۔

”میں صرف چائے لوں گا۔“ بنا دیکھے پلیز!“ اس نے سرونگ پلیٹ واپس زالی میں رکھ دی۔  
”جینی؟“ ناعمہ نے دھیمے سے پوچھا۔  
”بغیر جینی کی چائے دیں۔“ اس کے لمبے میں ہلکی سی تیش تھی۔

”ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں ای!۔ ذرا چائے وغیرہ بھیج دیں۔“ عباہ نے منہ زہ بیگم سے کہا پھر وہ امیر حسن کو لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہو تم!“ انیقہ نے اس کے بازو وغیرہ اچھی طرح ہلا کر دیکھ لیے تھے ”میں بین کمر دیتی ہوں۔ گرم گرم دودھ سے کھا کر تھوڑی دیر آرام کرو۔ کل تک بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“  
”میں اسے گرم دودھ میں بلدی ملا کر دیتی ہوں۔“ منہ زہ بیگم بولی تھیں ”کسی اندرونی چوٹ کا خطرہ نہ رہے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ انیقہ نے سر ہلایا ”ہم دونوں اپنے اپنے ہنر اس پر آزمائے ہیں!“  
رابعہ مسکرا دی۔ منہ زہ بیگم کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ انیقہ اس کے لیے گولیاں لانے کے لیے اپنے کمرے کی سمت چل دی۔ اس نے گہری سانس بھر کر صوفے کی پشت سے سر نکالیا۔ اس کا ذہن رافع کے متعلق سوچ رہا تھا۔

وہ اسے چھوڑنے گھر تک تو آیا تھا۔ پھر نجانے کیوں اندر آنے کے بجائے باہر سے ہی لوٹ گیا۔ لوٹتے سے اس کا چہرہ اس کی آنکھیں رابعہ کے لیے فکر مند تھیں۔ رابعہ کا دل فکر میں ہی آگئی اس دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ان نگاہوں سے پھوٹا ”اپنا خیال رکھنا“ کا پیغام اس کے پردہ ذہن پر سایہ کیے گھر آ تھا۔ وہ بہت دیر کے لیے کہیں کھوی گئی تھی۔

اس نے کال بیل کی آواز سنی ضرور تھی لیکن سنی ان سب سے کہیں نہیں آتی تھی۔ دورہ نے اس کی طرف سے مسکراتی ہوئی چلی آئی۔ ناعمہ نے ایک مصروفیت میں نظر اٹھا کر اس پر زالی پڑا دی۔  
”کون ہے آئی؟“

”ایسے بنی بیٹھی ہو جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔“ اس نے اچھے گھورا ”کھنٹی ہوتی جا رہی ہو!“  
”جی؟“ ناعمہ نے حیران نظریں اٹھائیں۔ ”میں سمجھی نہیں کہ کس بات کی خبر ہوئی ہے مجھے؟“  
”فریج نے تمہیں اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی؟“ دورہ نے سوال کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی غور سے دیکھا۔

”فریج نے؟“ ناعمہ مزید حیران ہوئی۔ ”فریج آئی ہے کیا؟“  
”جی ہاں۔۔۔ نہ صرف فریج بلکہ آپ کے وہ ”مجنوں“ بھی ساتھ ہیں۔“ دورہ مسکراتی ”فنا فٹ پکڑے تبدیل کر کے آ جاؤ۔“

”میں؟ میں آ جاؤں؟“ ناعمہ کی جان خشک ہونے لگی۔ ”نہیں ایسا۔۔۔ میں ہرگز ان موصوف کے سامنے نہیں آؤں گی۔“

”کہہ دیں آپ جا کر انہیں۔“  
”ای ڈرائنگ روم میں ہی موجود ہیں اور تمہیں بلارہی ہیں۔“ دورہ سنجیدگی سے بولی۔ ”اور کوئی تمہیں کھا نہیں جائے گا۔ حالات کو نہیں کرنا سیکھو۔ چلو اٹھو، پکڑے بدل لو۔ بال بناؤ سلیتے سے۔۔۔ قسم سے اگر وہ لوگ تمہیں اس جیلے میں دیکھ لیں نا۔“

”تو شوق سے منتظر تو رہیں۔“ ناعمہ جلی کر بولی تھی۔ ”میں تو دودن سکون کی نیند سوتی رہوں گی!“  
”بکو مت!“ دورہ ناراضی سے بولی ”شکل اچھی نہ ہو تو انسان بات ہی اچھی کر لے۔“

ناعمہ نے گھبرا کر نظر اٹھائی۔ تب اس نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لہجے سے بھی بڑھ کر تپش تھی۔  
 ”ہائے! کیا ہو گیا بھائی آپ کو۔“ فریحہ شوخ انداز میں بولی تھی ”گھر میں تو آپ آدھا کپ چینی سے بھر لیتے  
 ہیں اور یہاں چینی کی بچیت کر رہے ہیں۔“  
 ”کبھی کبھار لکھی اچھی لگتی ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

ناعمہ نے اسے واقعی بغیر چینی کی چائے تھما دی پھر وہ ٹرائی فریحہ کے قریب لے آئی۔  
 ”بھئی! اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ فریحہ نے پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا ”میں تو دل بھر کر انصاف کروں گی۔  
 ویسے سچ بتاؤ ان میں سے کیا کچھ تم نے بنایا ہے؟“  
 ”کچھ بھی نہیں!“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی ”سب کچھ وردہ آپنی کا کمال ہے!“ وردہ اسے گھورنے لگی تھی  
 لیکن ناعمہ چونکہ یہ بات جانتی تھی سو اس نے وردہ کی جانب دیکھنے سے گریز ہی کیا۔  
 ”ویل سیڈ!“ فریحہ مسکرائی۔

نہ جانے کیوں ناعمہ کی نگاہ ایک مرتبہ پھر اس کی جانب اٹھ گئی۔ وہاں ہنوز وہی تپش برقرار تھی۔ ناعمہ کو  
 الجھن ہونے لگی۔

چائے کا کپ خالی کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھا۔ فریحہ بھی جلدی جلدی پلیٹ صاف کرنے لگی پھر دونوں بھائی بہن  
 کے درمیان نظروں ہی نظروں میں کسی بات کا تبادلہ ہوا تھا۔ فریحہ نشوونما سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے رابعہ بیگم  
 کی جانب بڑھی۔

”آئی۔ ایک فرمائش کر سکتی ہوں۔“

”ضرور بیٹا!“ رابعہ بیگم مسکرا دیں۔ ”اس میں بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے۔“ بولو۔

”مجھے امینہ سے آپ خاندانہ جوں کی بلکہ خواتین کی زبان جاننا ہے۔ وہ لاؤ پھرے انداز میں بولی۔

”کیوں نہیں۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں ”تم کہو تو سہی!“  
 ”آئی۔ امینہ لوگ کچھ دیر کے لیے ناعمہ کو باہر لے جائیں؟“

اس کی بات سن کر رابعہ بیگم دفععتاً ”خاموش سی ہو گئیں۔ وردہ کا چہرہ بھی یکایک بخجیدہ ہوا تھا اور ناعمہ پر تو جیسے  
 بجلی ہی گری تھی۔ وہ تو ہر اس کی ہی کھڑی سب کے چہرے دیکھنے لگی تھی۔  
 فراز دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے یوں لا تعلق سے کھڑا تھا جیسے اس کا اس بات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو  
 حالانکہ ناعمہ کو پورا اندازہ تھا کہ اس فرمائش میں فریحہ کی صرف زبان ہی استعمال ہوئی ہے۔ اسے یہ خیال  
 بے طرح ستا رہا تھا کہ کہیں رابعہ بیگم اسے ان دونوں کے ساتھ جانے کے لیے نہ کہہ دیں۔ ایسی صورت میں یقیناً  
 فریحہ درمیان سے ہی کہیں غائب ہو جاتی اور وہ اس کی تپش بھری نظروں کا سامنا کرنے کے لیے تنہا اور بے یار و مددگار  
 رہی رہ جاتی! رابعہ بیگم نے ہنوز فریحہ کی بات کا جواب نہ دیا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھیں۔

”بولیں نا آئی!“ فریحہ اٹھلائی ”ہم آئیں کریم کھا کر لوٹ آئیں گے۔ زیادہ دور ہرگز نہیں جائیں گے۔ آپ  
 بالکل بے فکر رہیں۔“

”دیکھو بیٹا!“ رابعہ بیگم دھیمی آواز میں بولیں ”میں جانتی ہوں کہ یہ نیاز مانہ ہے اس کے کچھ اور ہی تقاضے  
 ہیں۔ نئے رنگ ڈھنگ ہیں لیکن ہمارے خاندان اور ہمارے گھر میں اب تک ان ہی پرانی قدروں کا رواج ہے  
 ہمارے ہاں شادی سے پہلے لڑکا لڑکی کے آپس میں ملنے یا ساتھ باہر آنے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تم  
 لوگ یہاں آئے مجھے بے حد خوشی ہوئی، بلکہ میں نے خاص طور پر ناعمہ کو بھی سامنے بلوایا کیونکہ میں اس بات  
 میں کوئی حرج نہیں سمجھتی لیکن بیٹا! جہاں تک تمہارے ساتھ باہر جانے کی بات ہے اس کی اجازت میں نہیں

دے سکتی کیونکہ ہمارے مشترکہ نظام میں اسے نہ صرف برا سمجھا جائے گا بلکہ میری بیٹی ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی کی نگاہ میں بے باک قرار پائے گی۔ اللہ نے مجھے بیٹا نہیں دیا لیکن میرے بھائیوں کے بیٹے ان لوگوں کو بھائیوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا سامنا ہو گیا تو ناعمہ کبھی ان سے نظر ملا کر بات نہ کر پائے گی۔ اس لیے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور برا مت ماننا لیکن میں معذرت خواہ ہوں۔“

فریحہ سے کوئی جواب نہ بن رہا۔ وہ قدرے خفت کا شکار نظر آرہی تھی لیکن فرائز چند قدم آگے بڑھ آیا۔ ”آئی۔ آپ کو معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!“ وہ بولا۔ ”مہجذرت تو ہمیں کرنا چاہیے کہ ہم نے آپ سے ایک غلط فرائش کی۔ آپ کا لفظ لفظ سچائی پر مبنی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے آپ کی باتیں سن کر۔ آپ پلیز ہم لوگوں کو معاف کر دیں۔ آئندہ ہماری طرف سے ایسی کوئی فرائش نہ ہوگی۔“

رابعہ بیگم کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر فرائز کی پیشانی چومی۔ ”ماشاء اللہ جیتے رہو بیٹا! بیٹی کی ماں ہوں۔ یہ سب کچھ کہتے ہوئے دل میں خوف بھی تھا کہ بچانے والا سب کچھ سن کر کس رویے کا مظاہرہ کرے۔ لیکن تم نے میرا دل ہلکا کر دیا۔ اللہ تمہیں اور سچائی سے نوازے۔ خوش رکھے۔“

ناعمہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ اس لمحے فرائز اپنی جانب متوجہ نہ تھا۔ وہ رابعہ بیگم کی دعاؤں پر دیکھے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس لمحے اس کا وہ انداز ناعمہ کے دل میں اتر آیا چلا گیا۔ ان نگاہوں کی واپس غائب تھی ہونٹوں پر وہ تلخ کھینچاؤ نہ تھا۔ اس کے چہرے پر بے نیاز نرمی اور محبت تھی اور خوب صورت مسکراہٹ سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔

”اب اجازت چاہیں گے آئی!“ وہ بولا۔ ”آتے رہا کرو بیٹا! تمہارا اپنا گھر ہے نیسے۔ اس میں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔“ ”اور آئیں کریم میں بہت اچھی بنائی ہوں۔“ ”دورہ شوخی ہے بولی۔“ پہلے سے بتا کر آئیں گے تو آئیں کریم کھانے کے لیے باہر جانے کی اجازت نہیں لینا پڑے گی۔“ ”وہ ہنس دیا۔“

فریحہ اور ناعمہ بھی مسکرا دیں۔ چند لمحوں پہنچاؤ میں جو کھینچاؤ اور کھینچاؤ اب کبھی اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ فریحہ اور فرائز باہر جانے کے لیے بڑھے تو رابعہ بیگم اور دورہ انہیں رخصت کرتے ہوئے ارادے سے باہر کی جانب بڑھ گئیں۔ ناعمہ نے سکون کا سانس لیا تھا!

\*\*\*

اس کے ہاسپٹل سے ڈیوٹی انچارج کا فون آیا تھا۔ شہلا سوتے سے اٹھی تھی۔ اس نے قدرے غائب دماغی سے فون ریسیو کیا۔

”ہاں ڈاکٹر شہلا! آپ کو آتا ہو گا۔“ وہ کہہ رہے تھے ”ایمر جنسی ہے اس وقت!“ ”لیکن سوہ! میں تو ابھی وہ بچے واپس آئی ہوں۔“ اس نے پریشانی سے گھڑی کی سمت دیکھا جو چار بج رہی تھی۔

”آئی نو ڈاکٹر شہلا! لیکن مجبوری ہے! ڈاکٹر رضوانہ اور ڈاکٹر ارم دونوں کے ساتھ کچھ پر اہم ہو گئی ہے اور ہاسپٹل میں چار کیس موجود ہیں جبکہ ڈیوٹی پر صرف ڈاکٹر ناصری ہیں۔ آپ اس وقت ڈیوٹی دے لیں۔ کل آپ کو ریسٹوے دیں گے۔“ وہ نرمی سے سمجھا رہے تھے۔

”اوکے۔۔۔ سر!“ وہ بولی ”میں آجاتی ہوں۔“ ”مہجذرت ہو ڈاکٹر شہلا!“ انہوں نے ممنونیت سے کہا۔ ”اٹس اوکے!“ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

چند منٹ سے بھی کم وقت میں تیار ہو کر وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ سامنے کھڑی فردوس بیگم نے بے حد بڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔

تیز گلابی شرٹ کے ساتھ سفید شلوار پہنے میں کھلی کھلی سی ہوا انہیں ذرا متاثر نہ کر سکی تھی۔ سفید پرس بڑھے پر لٹکائے وہ ان کے قریب آ کر۔ ”آئی۔ میں ذرا ہاسپٹل جا رہی ہوں۔“

”جہاں مرضی ہو جاؤ۔“ وہ نخوت سے بولیں ”اجازت کی تو تم نے کبھی ضرورت محسوس ہی نہیں کی۔ یہ اطلاع کی تو اس کی ضرورت ہم محسوس نہیں کرتے۔“

”آئی۔ ایمر جنسی ہے۔ ہاسپٹل سے فون آیا تھا۔“ وہ نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ”ورنہ آپ اتنی ہیں میں ابھی آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی کر کے آئی ہوں۔“

”ارے ہم سب جانتے ہیں۔ تم کیا سمجھا رہی ہو۔“ وہ ہنس کر بولی ”تمہیں“ وہاں سے آٹھ گھنٹے بعد لوٹو تو اپنے میکے لی جانا۔ یہ تو تمہارا بس آؤ ہے کھانے پینے کا ٹھکانا!“ شہلا کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”آئی۔ آپ زیادتی کر رہی ہیں۔“ ”جتنے اولیے گھر سے آئی ہو اس سے اونچا جانتے ہیں تمہیں ہم اور تم خود اس سے بھی اونچا جانتی ہو۔“ ”آئی۔“ ”آب سے بات کرنا فضول ہے۔“ شہلا کا ضبط جواب دے کر گیا تھا۔

”کیا کہا؟“ وہ چلا آئیں۔ ”تم نے وہاں کو۔“ پوچھتی ہوں میں یہ کیسی ہو میرے سر پر لا بٹھائی ہے۔ ڈاکٹر نہ ہوئی۔“ ”رہوئی کہیں کی۔ ہم کوئی باز پرس بھی نہیں کر سکتے۔“ ”گلابی! تمہیں کہ ماں باپ نے کبھی کوئی تربیت کی ہے۔“ ”شہلا کو اپنے پیچھے سے مسلسل ان کی آواز مل رہی تھی۔ لیکن وہ سنی ان سنی کر کے چلتی چلی گئی۔ اسے اپنے داغ بندھانے کے ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے اپنے گھر کا ماحول اس قدر شائستہ اور سلجھا ہوا تھا کہ ایسی کی بند لگائی کا اس نے سوچا ہی نہ تھا۔

گازٹی کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے وہ چند لمحوں کے لیے یونسی بیٹھی رہی۔ کچھ بھٹائی نہ دے رہا نہ کچھ دیر کے بعد اس نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی تھی!

\*\*\*

دورہ اس سے ملنے آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں گلابی پھولوں کا بہت خوب صورت بکے تھا۔ ربیعہ کی طبیعت ڈھنگدار ہو گئی۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔؟“ ”بالکل ٹھیک ہوں۔“ ربیعہ نے پھول لیتے ہوئے مسکرا کر کہا ”پلو اسی بہانے تم ملنے تو آئیں۔“ ”مجھے افسوس ہے ربیعہ!“ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”بچھلے کچھ دن اتنے مصروف گزرے کہ میں تمہیں فون تک نہ کر سکی۔ اور پھر رافع نے مجھے تو اس حادثے کے متعلق کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ مجھے تو شانیہ نے بتایا“ آج صبح نہ۔“

”ایسی کوئی بڑی بات ہوئی نہیں جسے خاص طور پر یاد رکھا جاتا یا اس کا ذکر کیا جاتا!“ ربیعہ ہلکے پھلکے شگفتہ سے انداز میں بولی۔

”شکر ہے خدا کا کہ کوئی بڑی بات نہ ہوئی!“ وردہ نے اس کا بغور جائزہ لیا پھر اس کے قریب پڑی اسٹک کو دیکھا۔  
”اور یہ اسٹک کیسی؟“

”تخنے کی ہڈی میں ذرا سی تکلیف ہے۔۔۔ جلتے وقت سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے بس اسی لیے۔“  
”کسی اسپیشلسٹ کو دکھانا تھا ربیعہ!“ وردہ فکر مندی سے بولی۔ ”ایسی باتوں کو معمولی نہیں لیا کرتے۔“  
”ہاں۔ انہی مجھے لے گئی تھی زبردستی۔ ایک سرے وغیرہ بھی کروالیا ہے سب ٹھیک ہے!“  
”کل سے یونیورسٹی بھی کھل رہی ہے کیا ارادے ہیں؟“

”ایک دو دن تو نہیں جاسکتی!“ ربیعہ بے چارگی سے بولی ”جیسے ہی اس اسٹک سے جان چھوٹے گی۔ میں تیار ہو جاؤں گی۔ لیکن پلیرز وردہ! میرے لیے نوٹس وغیرہ بنالینا لیکچرز کے ذریعہ میرا بہت حرج ہو گا!“  
”تم بے فکر رہو ربیعہ! یہ بھی بھلیا کہنے کی بات ہے۔“ وردہ نے محبت سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ربیعہ چند لمحوں کے لیے اس کی جانب دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وردہ کے چہرے پر جو روشنی تھی وہ اس کی بہترین طبیعت اور بے پایاں خلوص کا مظہر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت وسیع جلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور لبوں کا تبسم جاوہلی کیفیت رکھتا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس قدر محبت سے؟“ وردہ نے اس کا ایک ٹک دیکھنا محسوس کر کے کہا۔  
ربیعہ چونکتی اٹھی پھر وہ ایک گہری سانس بھر کر مسکرا دی تھی۔

”کچھ نہیں!“ وہ دھیرے سے بولی ”سوچ رہی تھی بہت خوش قسمت ہو گا وہ شخص جس کے نصیب میں اللہ نے تمہاری سہیلیاں محبت و رحمت کی ہوگی!“  
وردہ نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا پھر مسکرا کر سر جھکا لیا۔ ربیعہ نے اس کے ہاتھ کو دھیرے سے دبایا۔ اس دن وردہ کافی دیر اس کے پاس بیٹھی تھی۔ دونوں سہیلیاں آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ پھر وہ وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اب چلوں گی ربیعہ!“  
”بہت اچھا! تمہارا آنا۔۔۔“ ربیعہ خلوص اور محبت سے مسکرائی۔ ”آئی رہا کرو نا۔۔۔“  
”چلو باریاں لگا لیتے ہیں اب کے تمہاری باری ہے!“ وردہ شوخی سے ہنسی۔  
”منظور ہے۔۔۔“ ربیعہ بھی ہنس دی۔

”میں منیہ آنٹی سے دعا سلام کر لوں پھر چلوں گی۔“ وردہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ تب ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ منیہ بیگم کی ہمراہی میں فریش سارا فچ آ رہا تھا۔ سفید بے داغ شرٹ اور مسٹرڈ کلر جینز میں وہ بے حد خوب نظر آتا تھا۔ وردہ اپنی جگہ پر کھڑی اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ رافچ کے ہاتھوں میں سفید گلابوں کا بڑا سا گلدستہ تھا۔  
”ارے!“ رافچ اسے دیکھ کر رک گیا ”وردہ۔۔۔ تم!“

”نجانے کیوں وردہ نے محسوس کیا کہ اسے دیکھ کر رافچ کا روشن چہرہ قدرے بجھ سا گیا تھا۔“  
”جی۔۔۔ میں ربیعہ کی خیریت پوچھنے آئی تھی۔“ وہ دھیمے سے بولی ”ٹانہ سے پتہ چلا تھا کہ ربیعہ کا معمولی سا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا مل آؤں!“  
اس کی نگاہ رافچ کے ہاتھوں میں موجود گلدستے پر تھی۔ سفید گلاب بے حد تازہ اور بہت خوب صورت محسوس ہو رہے تھے۔ وردہ کا جی ان پر ہاتھ پھیرنے کو چاہا۔



”ہاں۔ اچھا کیا۔“ رافع قدرے غائب دماغی سے بولا ”میں بھی سسے میں نے بھی سوچا۔ دراصل اس دن میں بھی ادھر سے ہی گزر رہا تھا۔“

”اچھا آئی! میں اب چلوں گی!“ ورنہ نے اپنی توجہ گلدستے پر سے ہٹا کر منہ زہ بیگم کو دیکھا۔

”آئی رہا کرو بیٹی۔! ربیعہ کا بھی دل لگ جاتا ہے۔ انیقہ کو تو اپنی پرہیزی سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ گھر میں رہ کر بھی اس کا پتا ہی نہیں چلتا میں اور ربیعہ ہی ایک دوسرے کی تنہائی کے ساتھی ہیں۔“

”جی!“ ورنہ مسکرائی۔

نہ جانے کیوں رافع کو اس کی مسکراہٹ بے حد بخشنی تھی سی محسوس ہوئی تھی۔ ورنہ اس کے قریب سے نکل کر آگے بڑھ گئی تب وہ چونکا۔

”ربیعہ۔! منہ زہ بیگم اس کے کمرے کے دروازے پر اسے پکارنے لگیں ”یہ رافع آیا ہے تمہاری طبیعت کا پوچھنے۔“

اندر بیٹھی ہوئی ربیعہ بری طرح سے چونکی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا دپٹہ ٹھیک کیا۔

”اندر آجائیں رافع۔!“ رافع کو سامنے کھڑا دیکھ کر بولی۔

”کیسی ہیں آپ!“ اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”شکر ہے اللہ کا۔ بالکل ٹھیک ہوں۔“

رافع نے گلدستہ اس کی جانب بڑھایا۔ ربیعہ نے اسے تقابم کیا۔

”اوسے“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”کتنے خوب صورت پھول ہیں۔ ابھی ورنہ بھی میرے لیے بہت اچھے پھول لائی تھی۔“

رافع نے اس کی نظروں کے تعاقب میں نگاہی پھولوں کے دانے کے دانے سے ربیعہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے دانے ہونے پھول ورنہ کے پھولوں کے برابر میں رکھ دیے۔

”آپ کو جوٹ وغیرہ تو نہیں آئی تھی زیادہ۔“ رافع خون کو قدرے غائب دماغ محسوس کر رہا تھا۔

”آئی تو تھی لیکن بچت ہو گئی۔“ ربیعہ دھیسے سے ہنسی۔ ”پڑیوں پسیلوں کی۔“

”آپ۔۔۔ روز ہمیشہ ایسے ہی کر اس کرتی ہیں؟“

”اگر ایسا ہوتا تو میری کوئی ہڈی سلامت نہ ہوتی۔“ ربیعہ غلغلگی سے ہنسی۔ ”سب میں کریک ہوتے۔“

دراصل میں ایک کتے سے ڈر کر بھاگی تھی۔ جو شاید مجھے کانٹے کے ارادے سے بڑی تیزی سے میری سمت آ رہا تھا۔ مجھے تو اب پیارک کے خیال سے ہی خوف آ رہا ہے۔“

”تنہا کیوں جاتی ہیں۔“ وہ بے خیالی سے بولا۔ ”کسی کو ساتھ لے لیا کریں۔“

اس نے نجانے کس سوچ کے تحت کہا تھا لیکن ربیعہ چند لمحوں کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

”اپنا خیال رکھا کریں۔“ وہ پھر اسی انداز سے بولا۔

پھر ایک دہ چونک کر کھڑا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیسوں میں ڈال کر اس نے گہری سانس بھری اور جیسے حواسوں میں آتے ہوئے خوش دلی سے مسکرا دیا۔

”میں اب چلوں گا۔“

”ارے۔“ ربیعہ بھی چونک اٹھی۔ ”اس طرح کیسے جاسکتے ہیں آپ۔ میرا خیال ہے اسی جائے بناری ہیں۔“

”میرا مقصد آپ کی عیادت کا تھا سو پورا ہوا چائے پینے پھر کسی دن حاضر ہوں گا!“ وہ شرارتاں بولا۔

”پھر آنے کا ہانا؟“ نجانے کس رو میں ربیعہ کہہ بیٹھی۔

رافع حیران سا ہوا۔ ربیعہ بے حد خفت زدہ ہو گئی تھی۔ جو کچھ لبوں سے بے اختیار اور بے سبب ہی نکل گیا تھا۔

”میں میں کہیں اس کا نشان نہ تھا نجانے کیسے وہ کہہ بیٹھی تھی اور اب جی بھر کر شرمندہ ہو رہی تھی۔“

”خدا حافظ!“ وہ دھیسے سے کہہ کر نکل گیا۔

”خدا حافظ!“ ربیعہ کے بھی ہونٹ ہلے تھے۔

\*\*\*

کمرے کی لائٹ آف کر کے اس نے بے حد مدھم آواز میں ریڈیو لگایا ہوا تھا۔ ریڈیو پر لیٹ اور ز کا غزل پروگرام چل رہا تھا۔ ہر چند کہ یہ کام اس کی طبیعت اور مزاج سے میل نہ کھاتا تھا پھر بھی نجانے کیوں آج ناعمہ کا دل آدھی رات کو موسیقی سے لطف اندوز ہونے پر آمادہ تھا۔ کھلے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ مسلسل زندگی کے نئے اور نئے حالات کے متعلق سوچ رہی تھی۔ واقعات میں اتنا الجھاؤ اور اتنی گتھیاں تھیں کہ انہیں سلجھانا اسے اپنے بس کی بات نہ لگتی تھی۔

آج اس نے فراز کا بے حد خوب صورت روپ دیکھا تھا۔ اس کی بہت اچھی باتیں سنی تھیں۔ اب تک وہ اس سے جس انداز سے مخاطب ہوتا آیا تھا اور جس نظر سے اسے گھورا کرتا تھا اس سے ناعمہ کے دل میں اس کی طرف سے گہری برائی تھی لیکن آج اس کا آواز گوارہ و نرم، مسکراتا روپ اس کے دل میں کھب گیا تھا۔

کتنا اچھا لگ رہا تھا وہ۔۔۔ رابعہ بیگم سے بات کرتے ہوئے۔ ناعمہ کے دل نے اس کی پچھلی سب خطائیں بخش دی تھیں۔ آج پہلی مرتبہ دل نے اسے اس کی باتیں بچانا تھا جو تقدیر نے ان دونوں کے درمیان قائم کیا تھا۔

ناعمہ کا جی چاہا ”آج وہ اسے فون کرے۔ اس سے بات کرے۔ اس سے پوچھے کہ وہ کیوں اس کے ساتھ اس طرح کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔“

ناعمہ کو علم تھا کہ اس کی منتہی ہونے میں فراز کے فیصلے کا عمل دخل تھا۔ اس کے باوجود وہ اس سے بات کرتا تھا تو اس کے لہجے سے تیش پھوٹتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ کبھی اپنے فون پر بلواتا ہے، کبھی اپنے ساتھ باہر لے جانے کا متمنی ہوتا ہے، اس کے باوجود وہ بات نہ کرتی تھی۔ عجیب طرز پر انداز روا رکھتا تھا۔ اسے عجیب لگا ہوں سے گھورتا تھا جیسے کسی مجرم کو دیکھ رہا ہو۔

بھلا ایسا کیوں تھا؟

وہ بے طرح الجھ کر رہ گئی تھی۔ وہ شخص کیا چاہتا تھا کیا سوچتا تھا کیا جاننا چاہتا تھا۔ اس کے لفظوں کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

”آواز پہچانی نہیں۔ یا پھر آواز پہچان کر یہ حال ہوا ہے؟“

”تم کیا گلٹ ٹیل کر رہی ہو؟“

”یہ نیا نمبر کیوں لیا گیا ہے؟ وہ بچھلا نمبر اب کس کے پاس ہے؟“

ناعمہ کو عجیب سے احساس نے آگیرا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا

نور جہاں کی آواز ریڈیو سے ابھری تھی۔ بے حد خوب صورت غزل بے حد خوب صورت انداز میں گائی جا رہی

تھی۔ ناعمہ سب کچھ بھول بھال کر غزل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

بیٹھ کر سایہ گل میں ناصر  
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

آخری شعر بر ناعمہ کی آنکھوں میں نجائے کیوں آنسو بھر آئے۔ شاید یہ نور جہاں کی آواز کی گہرائی کا اثر تھا یا پھر لفظوں کی سچائی کا۔ اس نے انگلی کی پور سے آنسو صاف کیے۔

یگانہ اسے کچھ یاد آنے لگا۔ کوئی بات بے چین کرنے لگی۔ اس نے سوچا، غور کیا۔ کیا بات تھی؟ اسے اس غزل سے عریشہ کیوں یاد آنے لگی تھی؟

تب ایک ایک کر کے بہت سی باتیں بہت سی یادیں کسی البم کی طرح اس کے ذہن میں کھلنے لگیں۔ اسے بہت سے پے در پے واقعات تفصیل سے یاد آئے۔

عریشہ کا اس سے یہ غزل مانگنا۔ اس کا ہر روز کھویا کھویا سا انداز۔ کبھی اداسی، کبھی بے پناہ خوشی۔ اس کا نافع سے منگنی ہو جانے پر شدید احتجاج۔ ہر شخص ہر شے سے روٹھ جانا۔ ناعمہ کا سانس تیزی سے جلنے لگا تھا۔ اس کا ذہن آج شاید ہر راز سے پرور اٹھانا چاہتا تھا۔ اپنے ذہن کی ایسی مثالی کارکردگی سے وہ خود ناواقف تھی!

ورہ تو اسے نہایت کم عقل اور بے پروا گردانتی تھی۔ برا بھلا سب معصوم اور سیدھی سادی کہا کرتی تھی۔ ثانیہ اسے کوئی عقل کی بات کہتا دیکھتی تو قرط حیرت سے دانتوں میں انگلی دبائی دیتی تھی اور آج ناعمہ کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس نے کسی بڑے راز سے پرور اٹھالیا تھا۔ جیسے اس نے وہ سمجھ لیا تھا جواب تنگ کسی کی سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ سمجھ کر کس رد عمل کا مظاہرہ کرے؟ لیکن کیا جو کچھ اس نے سمجھا تھا وہ واقعی درست تھا؟ سچ تھا؟ یا پھر لوگوں کی اس کے بارے میں رائے بے حد وثاق تھی۔ جو ربط اس نے بنایا تھا۔ وہ اس کی کم عقلی کا مظہر تھا؟ اس کی انتہا درجے کی حماقت کا کرشمہ؟

ناعمہ کو اب بھی اس کے کتنی کو بھگانا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کئی ارادے باندھنے لگی تھی۔



چہرے پر پانی کے چھپا ہونے پر تے ہوئے اس کا ذہن مسلسل الفاظ کے چناؤ میں مصروف تھا۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا وہ اس کے لیے تو بے حد واضح تھا لیکن فریق ثانی کا رد عمل کیا ہو سکتا تھا اور کیا نہیں۔ وہ اس سلسلے میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی!

واش روم سے نکل کر وہ تولیہ سے چہرہ تھپکتی ہوئی بیڈ پہ آ بیٹھی۔ ہاشم اپنی جگہ پر نیم دراز تھا۔ ایک بازو اس نے آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔

شہلا کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ آج ہاشم ضرورت سے زیادہ خاموش تھا۔ اس نے شہلا کی چند باتوں کے جواب میں سنجیدگی سے چند الفاظ ہی استعمال کیے تھے اور خود سے کوئی بات اب تک نہ کی تھی۔ شہلا اور ہاشم کمرے میں ہوتے تو ہاشم کی توجہ مسلسل اس پر مرکوز رہا کرتی تھی اور موڈ بے حد خوشگوار ہوتا تھا۔ وہ شگفتگی سے اکثر اس کی بے توجہی پر فقرے کسا کرتا تھا۔ آج معاملہ بے حد برعکس تھا۔ شہلا اس کی جانب متوجہ تھی اور وہ آنکھوں پہ بازو رکھے نجائے سو رہا تھا یا کچھ سوچ رہا تھا۔

شہلا نے ہونے سے کھنکھار کر اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن نتیجہ حسب توقع برآمد نہ ہوا۔

”ہاشم! اس نے پکارا۔

”ہوں!“ وہ اسی انداز میں لیٹے لیٹے بولا۔ بازو ہٹا کر اس نے شہلا کی جانب نہ دیکھا تھا۔ شہلا کے دل کو کچھ ہوا۔

چوٹی سی لگی۔

”آپ سو رہے ہیں؟“

”نہیں! واضح جواب آیا تھا۔“

”پھر یہ ایسے کیوں لیتے ہیں؟“

”بس۔ یونہی۔“

شہلا کچھ سوچنے پر مجبور ہوئی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے غور کیا پھر بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

”آپ سے۔ کسی نے کچھ کہا ہے میرے بارے میں؟“ ہاشم نے بازو ہٹایا اور اسے غور سے دیکھا۔

”مثلاً۔ کس نے؟“

”آپ کی امی نے؟“ وہ قدرے بے رخی سے بولی۔

ہاشم اس کی بات پر چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”شہلا۔“

”جی؟“

”تم صرف ”امی“ بھی کہہ سکتی ہو ”آپ کی امی“ کہنا کچھ معنی رکھتا ہے۔ شاید تم انہیں اپنی ماں نہیں سمجھتیں۔“

شہلا خاموش ہو کر انگلی سے بستر کی چادر پر لائنیں کھینچنے لگی۔

”انہوں نے شاید آپ سے میری شکایت کی ہے۔“ پھر وہ بولی تھی ”اور آپ مجھ سے کچھ بھی پوچھتے، ناکوئی بھی وضاحت مانگے بغیر یوں خفا ہو کر لیٹے ہوئے ہیں۔ اس بات پر ہاشم!۔“

”تم سے کس نے کہا کہ میں تم سے خفا ہوں۔“ وہ سمجھنے لگے انداز میں بولی اور کیا وضاحت مانگولی تم سے؟

میں نے تو تم سے کبھی کسی بھی بات کی وضاحت نہیں مانگی۔ شاید مجھے وضاحتیں طلب کرنے کی عادت نہیں ہے۔“

”خفگی کا اظہار صرف لفظوں سے نہیں ہوتا ہاشم! اگر آپ نے بھی کہیں تب بھی میں سمجھ سکتی ہوں۔ اور آپ کو وضاحت طلب کرنے کی عادت نہیں ہے تو مجھے بھی صفائیاں پیش کرنے کی عادت کبھی نہیں رہی لیکن

میاں پیوی کو دل کی باتیں کہانی چاہئیں ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔“

ہاشم اس کی بات پر اسے بہت دیر تک دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔

”یہ تم کہہ رہی ہو شہلا؟“

”آپ کے انداز میں شکایت کیوں ہے؟“ شہلا نے ابرو چڑھایا۔ ہاشم نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

”کیا آپ کے دل میں بھی میرے لیے شکایت ہے؟“ شہلا نے پوچھا تھا۔

ہاشم خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ اس کی بات کے جواب میں کیا کہے۔

”بتائیں ہاشم؟“ وہ جاننے پر مصر تھی۔

ہاشم کو بہت پہلے رافع سے کی گئی اپنی گفتگو یاد آئی۔

”واکٹر صاحبہ سے کوئی شکایت؟“ رافع نے پوچھا تھا۔

”او نہیں یا۔! شکایت تو جب بھی ہوئی اپنے آپ سے ہوگی!“ اس نے کہا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر خود میں لوٹا۔ وہ شاید اپنے کسے سے پھر رہا تھا۔

شہلا اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر اب سنجیدگی سے کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے سراخا کر ہاشم کو دیکھا۔

”ہاشم میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں“ آپ سے امید ہے۔ آپ میرا مسئلہ برامانے بغیر حل کر دیں گے۔“

”ہاں کہو کیا بات ہے ایسی۔؟“ وہ سب کچھ بھول کر اب اس کے مسئلے کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

”میں علیحدہ گھر لینا چاہتی ہوں۔“ وہ قدرے رک کر بولی۔

”علیحدہ گھر؟“ ہاشم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ۔ میں میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ یہاں سب لوگوں کی ٹیبلٹی مختلف ہے۔ میری سوچ بے حد

مختلف ہے۔ میں میں یہاں رہوں گی تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ آپ، آپ پلیز میرا مسئلہ سمجھنے کی کوشش

کریجیے۔“ ہاشم ایک ٹک ایسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہ آرہا تھا کہ شہلا آخر اس سے کہہ کیا رہی ہے۔

”شہلا۔! کیا کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ اٹکتے ہوئے بولا تھا۔

”میں چاہتی ہوں کہ میں اور آپ علیحدہ الگ گھر میں رہیں اور اور عمر ہمارے ساتھ رہے۔“

”وہ! ہاشم! ہاشم! کیا اس لیے تو یہ بات ہے!“

”پلیز ہاشم! میری اس درخواست کو لائٹلی نہ لیجیے گا۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑی پرابلم بنتی جا رہی ہے

اے سولو (Solve) کرنے کی کوشش کریں پلیز!“

وہ ملتیانہ انداز میں بولی تھی۔ ہاشم سر ہٹا کر کچھ سوچنے لگا تھا۔

وہ بے حد خاموش خاموش سی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ دورہ نے چپکے سے آکر ان کے گلے میں بائیں ڈال دیا۔

”اے! کیا سوچ رہی ہیں! ایسے ایسے کیا کر رہی ہیں!“

”آؤ۔ بیٹھو میرے پاس۔ میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔“

دورہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

راجہ بیگم چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی پھر انہوں نے دورہ کی جانب نگاہ کی۔

”دورہ بی! ایک بات کہوں۔“

”لیجیے۔۔۔ اب یہ اجازت کیوں درکار ہوئی۔ ایسی کیا بات ہے؟“

مشق محمد علی محمد علی کے حوٹے

کھانا پکانے کی مزیدار

ترکیبوں کے

رنگارنگ کتاب

خانوں کا  
دسترنواں

شائع ہوئی

یگولہ کاہتہ : سارا اندوہا زہرا



ربیعہ نے قدرے غائب دماغی سے چند لمحوں کے لیے غور کیا تھا۔ فوری طور پر اسے وہ نام شناسا تو محسوس ہوا لیکن مکمل طور پر کچھ یاد نہ آسکا۔  
”امیر حسن؟“ وہ بڑبڑائی۔

”شاید آپ پہچانی نہیں، حالانکہ میں اپنا تعارف ایک مجرم کی حیثیت سے کروا بھی چکا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔  
تب ہی اچانک اسے امیر حسن بھی یاد آگیا اور اپنے ننھے کا در بھی۔  
”اوہ۔ کیسے ہیں آپ۔“ وہ نجانے کیوں شرمندہ سی ہوئی۔

”یہی پوچھنے کے لیے تو میں نے فون کیا ہے۔“ وہ ہنس دیا۔ ”یہ بتائیں کہ آپ کیسی ہیں، آپ کا پیر ٹھیک ہو گیا؟  
عبادت گزار تھا کہ آپ کو چلنے میں کچھ پر اہم ہو رہی ہے۔ میں تو یہ سن کر بے حد پشیمان ہوا۔ بس ربیعہ! ایک بار پھر  
بے حد معذرت چاہتا ہوں۔“

”ارے امیر حسن صاحب! آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ ربیعہ فوراً بولی تھی۔ ”میں بھی جانتی ہوں آپ  
آپ بھی کسے قصور صرف اور صرف میرا تھا۔ میں ہی اندھا دھند بھاگتی ہوئی آپ کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔“  
”آپ خواہ مخواہ الزام اپنے سر لے رہی ہیں۔“ وہ ٹھنٹکی سے بولا۔ ”حالانکہ اصل قصور وار تو وہ پارک کا کتا  
ہے۔ کیا نام بتایا تھا آپ نے اس کا؟“

ربیعہ کو بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکی۔  
”میں نے کتے کا نام بھی بتایا تھا؟ شاید میرے اوسان پر کچھ زیادہ ہی خطا ہو گئے تھے۔“ دوسری جانب امیر حسن  
بھی ہنسنے لگا تھا۔ اس کی ہنسی میں ٹھنٹکی اور دوستانہ پن تھا۔ ربیعہ کو احساس ہوا کہ وہ ایک متوازن اور خوبصورت  
شخصیت کا مالک ہے۔

”اوسان تو آپ نے میرے خطا کر دیے تھے۔ عین  
گواہی دینے کے لیے آپ ہوش و حواس میں تھیں۔“  
ربیعہ قدرے جھینپ گئی۔

”مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔ اب جانے بھی دیں اس ذکر کو۔“  
”چلیں جانے دیتے ہیں۔“ وہ فوراً ہی بولا۔ ”اب اجازت دیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ کسی دن حاضر ہوں گا۔ آنٹی  
کو میرا سلام کہیے گا۔“

”جی ضرور۔“ ربیعہ بولی۔  
”خدا حافظ۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔  
ربیعہ ریسور تھا کہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے ریسور رکھ دیا تھا۔

ہاشم بھائی۔۔۔ میں نے آپ سے سیمسٹو کی فیس کے لیے کہا تھا۔“  
بریف کیس بند کرتا ہوا ہاشم چونک اٹھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ حمزہ شاید یونیورسٹی جانے کے لیے ہی تیار کھڑا  
تھا۔ ہاشم کو یاد آیا کہ اس نے دو دن پہلے ہاشم سے اپنے سیمسٹو کی فیس کا ذکر کیا تھا۔

ہاشم کو قدرے شرمندگی ہوئی۔ اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی بھائی کو اپنی کسی ضرورت کا ذکر  
دوسری مرتبہ کرنا پڑا ہو۔ وہ اپنے گھروالوں کی ضروریات پوری کرنا اپنی پہلی ترجیح سمجھتا تھا لیکن پچھلے کچھ دنوں سے  
وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب سا تھا۔ اسے بہت سی باتیں بھول جاتی تھیں۔

”سوری حمزہ۔۔۔ یار! مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“ وہ پشیمانی سے بولا۔  
پھر اس نے اپنی چیک بک نکالی اور چیک کاٹ کر حمزہ کی جانب بڑھا دیا۔  
”اصلی کو بھی تو فیس جمع کروانی ہوگی؟“

”اس نے بابا سے لے لیے تھے۔“ وہ مسکرایا۔ ”مجھے تو آپ ہی سوٹ کرتے ہیں ان کاموں کے لیے بہت  
غیر دلچسپ سوالات کے جواب نہیں دینا پڑتے۔“ ہاشم بھی مسکرا دیا۔  
”میں بھی کسی دن بابا جانی کا روپ دھار سکتا ہوں۔ ہشیار رہنا۔“

”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔  
ہاشم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔  
ہاشم بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہوا تب ہی ڈرننگ روم سے شہلا نکلی تھی۔ وہ بھی بالکل تیار تھی۔

”آپ مجھے بھی ڈراپ کر دیجئے گا۔ آج تو ٹائمنگز تقریباً ایک سی ہیں۔ واپسی بھی ساتھ ہو جائے گی۔“  
”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔  
ہاشم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔  
ہاشم بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہوا تب ہی ڈرننگ روم سے شہلا نکلی تھی۔ وہ بھی بالکل تیار تھی۔

”آپ مجھے بھی ڈراپ کر دیجئے گا۔ آج تو ٹائمنگز تقریباً ایک سی ہیں۔ واپسی بھی ساتھ ہو جائے گی۔“  
”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔  
ہاشم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔  
ہاشم بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہوا تب ہی ڈرننگ روم سے شہلا نکلی تھی۔ وہ بھی بالکل تیار تھی۔

”آپ مجھے بھی ڈراپ کر دیجئے گا۔ آج تو ٹائمنگز تقریباً ایک سی ہیں۔ واپسی بھی ساتھ ہو جائے گی۔“  
”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔  
ہاشم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔  
ہاشم بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہوا تب ہی ڈرننگ روم سے شہلا نکلی تھی۔ وہ بھی بالکل تیار تھی۔

”آپ مجھے بھی ڈراپ کر دیجئے گا۔ آج تو ٹائمنگز تقریباً ایک سی ہیں۔ واپسی بھی ساتھ ہو جائے گی۔“  
”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔  
ہاشم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔  
ہاشم بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہوا تب ہی ڈرننگ روم سے شہلا نکلی تھی۔ وہ بھی بالکل تیار تھی۔

”آپ مجھے بھی ڈراپ کر دیجئے گا۔ آج تو ٹائمنگز تقریباً ایک سی ہیں۔ واپسی بھی ساتھ ہو جائے گی۔“  
”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔  
ہاشم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔  
ہاشم بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہوا تب ہی ڈرننگ روم سے شہلا نکلی تھی۔ وہ بھی بالکل تیار تھی۔

”آپ مجھے بھی ڈراپ کر دیجئے گا۔ آج تو ٹائمنگز تقریباً ایک سی ہیں۔ واپسی بھی ساتھ ہو جائے گی۔“  
”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔  
ہاشم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔  
ہاشم بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہوا تب ہی ڈرننگ روم سے شہلا نکلی تھی۔ وہ بھی بالکل تیار تھی۔

”آپ مجھے بھی ڈراپ کر دیجئے گا۔ آج تو ٹائمنگز تقریباً ایک سی ہیں۔ واپسی بھی ساتھ ہو جائے گی۔“  
”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔  
ہاشم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔  
ہاشم بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہوا تب ہی ڈرننگ روم سے شہلا نکلی تھی۔ وہ بھی بالکل تیار تھی۔



”مناسب لفظ؟“ شہلا چونکی۔ ”مناسب لفظ تو کسی معذرت یا انکار کے لیے ڈھونڈے جاتے ہیں۔“  
 ہاشم پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نرم لہجے میں بولا۔

”تم نے جو فرمائش کی تھی شہلا! میں اس کے جواب میں معذرت کے سوا اور کوئی چارہ نہیں پاتا ہوں۔ ہو سکتا ”ہیلو۔“ رابطہ قائم ہونے پر دوسری جانب سے وہی شناسا آواز سنائی دی تھی۔  
 ”ہیلو۔ السلام علیکم۔“ وہ مدھم لہجے میں بولی۔ ”میں۔۔۔ ناعمہ بات کر رہی ہوں۔“  
 ”علیکم السلام۔“ وہ چند لمحوں کے بعد بولا تھا۔ ”میں ہنڈرڈ پرسنٹ شیور تھا کہ فون ورنہ نے کیا ہو گا۔ زہے تھی۔“

”آپ اگر معاشی مسائل کے حوالے سے بات کر رہے ہیں ہاشم! تو میں نے آپ سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ آپ اپنے گھر والوں کی معاشی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیں نہ ہی میں نے اپنے اخراجات میں اضافے کی بات کی تھی۔ میں نے اپنے لیے ایک علیحدہ رہائش کی بات کی تھی لیکن میرا مقصد آپ کے مسائل میں اضافہ کرنا نہیں تھا۔ خدا کا فضل و کرم ہے میرے اخراجات کے لیے میری اپنی آمدنی کافی ہے۔ میں صرف اپنے ذہنی سکون اور بے شکار ہوں۔ ایک ماں ہوتے ہوئے میں اپنے بیٹے کی آمد پر ایک خفت سے دوچار ہو جاتی ہوں۔ آپ مجھ سے محبت کا دعو کرتے ہیں لیکن اتنی معمولی سی بات نہیں سمجھ پارہے ہیں۔ اگر ہاشم فریب ہی کوئی گھر لے کر وہاں شفٹ ہو جاتے ہیں تو اس میں کون سی برائی ہے؟“

”میں نے۔۔۔ ورنہ آپ سے ہی نمبر لیا ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔  
 فراز نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ناعمہ، وہ اس کے بے وجہ ہنسے پر حیرت ہوئی۔  
 ”کیوں ہنسے آپ؟“ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔  
 ”تجربہ کار فنانس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے مس ناعمہ۔“ وہ عجیب انداز میں بولا۔ ”میرا موبائل نمبر آپ نے ورنہ میں نے۔۔۔“  
 ناعمہ کا دل ایک مرتبہ پھر اسی اجنبی انداز سے دھڑکا تھا۔ اندازوں کی تصدیق ہونے لگی تھی۔ وہ ایک ایسا راز بانے کی منتہی تھی جسے جان کر اسے خوشی نہیں دکھ ہونا تھا پھر بھی وہ سب کچھ جانتا چاہتی تھی۔  
 ”میں نے۔۔۔ پہلے آپ سے کب بات کی تھی؟“ اس نے ہولے سے پوچھا۔ ”کتنا عرصہ ہو گیا اس بات کو؟“  
 ”عرصہ کتنا ہوا یہ تو مجھے یاد نہیں۔ مجھے تو صرف پچیسٹک اور دھوکے کا مطلب پوچھنا ہے تم سے۔“ وہ قدرے ملتے ہوئے انداز میں بولا تھا۔

”سوختے کی حد تک تو سب ٹھیک ہے شہلا! لیکن ایک بات سے کئی باتیں نکلتی ہیں۔ تم بھی میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اس گھر کا بڑا بیٹا ہوں۔ صرف معاشی مسائل کی بات نہیں ہے اور بھی کئی ذمہ داریاں ایسی ہیں جو علیحدہ ہونے کی صورت میں میں احسن طریقے سے نبھاتا ہوں گا۔“  
 ”مثلاً۔۔۔“ شہلا نے چڑ کر اسے دیکھا۔

”مثلاً۔۔۔ کچھ نہیں۔“ وہ دھیسے سے بولا۔ ”تم اس وقت ایسے موڈ میں ہو جب صحیح بات بھی غلط لگتی ہے۔ اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔ تمہارا ہاسپٹل بھی اگیا ہے۔“  
 شہلا خاموش ہو کر سڑک کو دیکھنے لگی۔ ہاشم کے انکار نے اسے زچہ کا سا لگا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہاشم اس مطالبہ پر زیادہ اعتراض نہ کرے گا اور ہنسی خوشی اس کی بات مان لے گا لیکن ہاشم کا فیصلہ کن انداز اسے حیران بھی کر گیا تھا اور برہم بھی۔ ہاشم نے گاڑی ہاسپٹل کی پارکنگ میں روکی تو شہلا اپنا بیگ ہینسلے ہوئے قدرے آف موڈ میں اترنے لگی تھی۔

”خدا حافظ۔“ ہاشم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔  
 ”خدا حافظ۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی تھی۔

”جی ہاں۔“ وہ مزید مدھم ہو گئی تھی۔ ”میں نے تسلیم کیا۔ آپ جو سزا دینا چاہتے ہیں دے دیجئے۔“  
 فراز چند لمحے کو خاموش ہوا۔ وہ اسے پے در پے حیرت سے دوچار رہی تھی۔  
 ”سوچنا پڑے گا۔ اتنا تو طے ہے من ناعمہ۔ کہ یہ منگنی میں نے نہیں سزا دینے کے لیے ہی کی تھی لیکن سزا کیا ہوگی اس بات کا فیصلہ میں اس وقت کروں گا جب تم مجھے ان مجبوریوں کے متعلق بتاؤ گی جن کا تم نے ذکر کیا اور میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔“

”میں۔۔۔ میں اگر نہ بتانا چاہوں۔۔۔“ وہ گھبرا سی گئی۔  
 ”تب تو سزا میں کسی نرمی کی گنجائش نہیں نکلے گی۔“ وہ بے رحم انداز میں بولا تھا۔  
 ناعمہ کو اس لمحے اس سخت گیر شخص سے عجب خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے ریسور رکھ دیا۔

فون نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ اس گھبراہٹ کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ وہ اپنے منگیتر سے بات کرنے جا رہی تھی۔ وہ بہر حال پڑھی لکھی، باشعور، اکیسویں صدی کی لڑکی تھی۔ البتہ حیا دار اور اپنی حدود میں رہنے کی قائل ضرور تھی۔  
 مگر اس عجیب سی گھبراہٹ کی اصل وجہ وہ نامعلوم سا احساس اور وہ اندازہ تھا جو اس نے نجانے کیسے ایک پھر کے جاوٹی لمحے کے طفیل قائم کیا تھا اور اب وہ اپنے اندازے کی تصدیق چاہتی تھی۔ دوسری جانب بیل جا رہی

ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ نجانے کیا سوچے جا رہی تھی۔ کیا ہوا تھا، کیا ہو رہا تھا اور کیا ہونے جا رہا تھا، سب کچھ ایک باریک پردے کے پیچھے تھا، نظر آ بھی رہا تھا اور نظروں سے اوجھل بھی تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ ہمتہ تھیک اسی انداز میں حل ہوا تھا جس طرح اس نے اندازہ لگایا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ تھل ہونے لگا تو وہ بے جان سی ہو کر بستر پر گر گئی تھی۔



ٹائی کی ٹائٹ درست کرتے ہوئے اس نے ایک نظر آئینے پر ڈالی پھر خوش دلی سے مسکرایا۔

”آدمی تم ڈیشننگ ہو رافع حسن!“ اس نے زیر لب کہا اور دھیرے سے ہنس دیا۔ اسے ہاشم یاد آ گیا تھا جو ہمیشہ آئینہ دیکھ کر خود کو یوں ہی مخاطب کرتا تھا۔

”بے وفا دوست۔۔۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”بالکل ہی بیوی کو پیارا ہو گیا ہے،“ مہنتوں شکل نہیں دکھاتا۔۔۔ چلو اچھا ہے، اگر بیوی کو پیارا ہو جائے تو۔۔۔ بڑی مشکلوں سے یہ دن دیکھا ہے اس نے۔۔۔ اور پتہ نہیں پیارا ہوا بھی ہے یا۔۔۔ اب بھی کیلری میں کھڑے ہو کر سگریٹ پیتا ہے۔“

آستین کا بن بند کرتے ہوئے وہ کمرے سے نکلا تھا۔ چائے کے کپ میں دودھ ڈالتی ہوئی عذرا بیگم نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور دل ہی دل میں بابتشاء اللہ کہنے پر مجبور ہوئیں۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر کپ میں چمچہ ہلانے لگا۔ عذرا بیگم بھی دو سہری کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

”رافع۔ ایک بات کرنا تھی تم سے۔“

”جی امی۔۔۔ کیسے۔“ اس نے عجلت میں کئی گھونٹ بھرے۔

”ثانیہ کے لیے جو لوگ بچھلے دنوں آئے تھے، انہوں نے کہا، ”امی، تمہاری سب سے اور بڑی بیٹی لڑکا پسند آیا ہے۔ کاروبار بھی اچھا ہے، ان لوگوں کا۔۔۔ پھر کیا خیال ہے تمہارا؟“

”بابا کیا کہتے ہیں؟“ اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔

”وہ تو براہ راست کہتے ہیں۔۔۔ کہتے ہیں رافع سے بھی پوچھ لو۔“

”ہوں۔۔۔ تھیک ہے۔۔۔ اس نے کپ خالی کیا۔“ ”میں دو مرتبہ ملا ہوں اس سے۔۔۔ اس اچھا لڑکا ہے۔ شریف ہے، ذہین ہے اور کیا چاہیے؟“ اس نے ہنس کر کہا۔

”لیکن ایک مسئلہ ہے بیٹے! وہ دو ماہ بعد عید کی مارچ مانگ رہے ہیں۔ اتنی جلدی بازی میں سب کچھ کیسے ہوگا؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ ثانیہ کے لیے تو تقریباً“ سب ہی کچھ تیار ہے۔ مسئلہ کس بات کا ہے؟“ وہ ماں کے ہچکچاہٹ بھرے انداز پر حیران ہوا۔

”مسئلہ۔۔۔ مسئلہ تمہارا ہے نا۔ تمہاری نوکری جب تک کسی اچھی جگہ نہ ہو جائے۔۔۔“

”میرا۔۔۔؟ میرا کیا مسئلہ ہے امی؟“ اس نے مزید حیرت سے ماں کی بات کالی۔ ”بات ثانیہ کی ہو رہی ہے مسئلہ میری نوکری کا کیسے ہو گیا؟“

”بچھنے کی کوشش کرو بیٹا! تمہارے والد کا خیال ہے کہ ثانیہ کی شادی اور تمہارا ولیمہ ساتھ کر دیں، اسی طرح سدرہ کی شادی اور نافع کا ولیمہ ساتھ ہو جائے۔ دو بیٹیاں جائیں گی تو دو بہویں آجائیں گی اور پھر اس طرح کچھ کفایت بھی ہو جائے گی اب تمہاری نوکری کی ہو جائے تو میں رابعہ سے بات کروں۔ وہ بھی وردہ کی وجہ سے فکر مند ہے۔ ناعلمہ کی منگنی کے بعد اب وہ حق بجانب بھی ہے اور سب ہی کا خیال ہے کہ اب تمہاری اور وردہ کی شادی

کردی جائے۔

بات کرتے کرتے انہوں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا پھر یکدم حیران سی ہوئیں۔ رافع کا چہرہ یوں بچھتا جیسے کسی نے شمع دان کو ہوا دکھادی ہو۔ وہ بالکل گم سم سا ہو گیا۔ عذرا بیگم پریشان ہو گئیں۔

”رافع... انہوں نے پکارا۔“

”جی... وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔“ جی ای۔ کیسے۔“

”کیا کہوں میں تو اپنی بات مکمل کر چکی۔“

”کون سی بات؟“ وہ غائب دماغی سے بولا۔

”شادی کیسے اور کون سی۔ یہ تم اتنا پریشان کیوں ہو گئے ہو؟ کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی الجھن ہے؟“

”جی... نہیں... نہیں... امی... کوئی الجھن نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو مجھے کچھ جواب تو دو۔“ وہ اسے جانے کے لیے تیار دیکھ کر قدرے خفا سی ہوئیں۔

”میں ایک سنجیدہ موضوع پر بات کر رہی تھی اور تم یوں ہو گئے جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔“

”جائے کو پر تو لے لے لے۔“

”امی... میں ایک انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں۔“ اس نے ریسٹ ورائج پر نگاہ کی۔ ”دعا کیجئے گا اللہ کامیاب کرے۔“

”اچھا۔“ ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”بیٹا! میرا تو رونا روناں تم ہی لوگوں کے لیے دعا گو رہتا ہے۔ کیسی نوکری ہے؟“

”بہت اچھی جاب ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنی ہے۔ اچھی تنخواہ دیں گے۔ دیگر مراعات علیحدہ۔“ کہتے ہوئے چل پڑا۔ عذرا بیگم اس کے پیچھے آرہی تھیں۔

”پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں ہے۔ تم اگر خیر سے کامیاب ہو جاؤ گے تو میں رات بھر بات کر لوں گی۔“ وہ بھی اپنی تیاری رکھے۔

”امی... وہ اچانک ہی پلٹا۔“ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ زندگی میں ابھی کربے کو بہت کچھ باقی ہے۔ شادی میرے مسائل میں اضافہ کرے گی۔ آپ سچے سچے ابھی کچھ بھی نہ کہیں، صرف ثانیہ کے لیے سوچیں۔“

”ہائیں۔“ عذرا بیگم کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟“

”یالی باتیں پھر کریں گے امی! میں پہلے ہی لیٹ ہو گیا ہوں۔ خدا حافظ۔“ وہ چمپا کے پاس پہنچ گیا۔

”خدا حافظ۔“ وہ بڑبڑاتا تھا۔ ان کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھنے لگا تھا۔

”سیاں بنا گھر سونا سونا... سیاں بنا گھر سونا... چاندنا جیسے سونی زیتیاں... بن خوشبو جیسے سونی گھیا... سیاں بنا گھر سونا...“

بچن میں کھڑی ایقان لمحہ بھر کے لیے سُن سی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ گانا جو کبھی جنون کی حد تک پسند تھا، آج اس کے بولوں نے اس کا دل چیر کر رکھ دیا تھا۔ وہ دوبارہ اس کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی چھری ایک طرف پھینک کر وہ باہر نکل آئی۔

سامنے ہی ایمان بیٹھی تھی۔ سی ڈی پلیئر آن کر کے وہ اپنے کارٹائپ پر بے حد خوش نظر آتی تھی۔

”مماسہ مماسہ... آپ کا فورٹ ساٹنگ۔“ اس نے تالیاں بجا کر اس سے بھی داد وصول کرنا چاہی۔

ایقان نے آگے بڑھ کر پلیئر آف کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

”کیوں مماسہ... یہ ساٹنگ اچھا نہیں لگا؟“ ایمان اس کے آنسوؤں سے خوفزدہ سی ہو گئی۔ ”میں دوسرا ساٹنگ ہاؤس؟ بلورے گھر۔“

”آپ نی وی پر کارٹون لگا لو بیٹا! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ گانے کی آواز اچھی نہیں لگ رہی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ ماں کی کیفیت سے پہلے ہی گھبرا گئی تھی۔ سعادت مندی سے اٹھ کر بیڈروم میں چلی گئی۔

ایقان وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ رات بھی کتنے ہی عجیب و غریب خوابوں سے گھبرا کر اس کی آنکھ کئی مرتبہ کھلی تھی۔ اس کے بعد اسے نیند ہی نہ آئی۔ اب دکھتا ہوا سراور بھتے ہوئے آنسو لیے وہ سوچ رہی تھی کہ مومن کے اسکول سے آنے سے قبل کھانا کیسے بنائے؟

”یہ گانا میرے دماغ میں سرنگ بنا چکا ہے۔“ ایک تھنجلائی ہوئی آواز تھی۔ ”آخر کیا جادو ہے اس میں جو تم

”یہ گانا اور اس کے بول میرے دل میں سرنگ بنا چکے ہیں اور جو چیز ایک بار دل کو چھو جائے، وہ ہمیشہ یونہی بے خود کرتی ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولی تھی۔ ”آپ کو آخر کیا اعتراض ہے اسے سننے میں؟“

”اچھا...“ وہ قریب ہوا تھا۔ ”تب ہی تم ہمیشہ مجھے یونہی بے خود کر دیتی ہو۔ آخر ایک بار دل کو چھو چکی ہو۔“

”ایک بار؟“ وہ ابرو تان کر بولی تھی۔ ”کیا مسئلہ ایک بار؟“

”پہلے ایک بار... پھر بار بار... بار بار...“

ایقان اس کی ہنسی کی آوازیں سے کمرہ بھر گیا تھا۔

ایقان چونک کر اپنے آپ میں غور کیا۔ کسی نے کال بیل بجائی تھی۔ اس نے دوبارہ بارہ بجائی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا۔

”اماں ہیں شاید۔ اس وقت وہی ہوتی ہیں۔“ اسے خوشی سی ہوئی۔

شفیقہ حیات اس سے خفا تھیں۔ وہ بس کبھی کبھار ہی اس کی خیریت پوچھنے یہاں تک چلی آتی تھیں، ورنہ اکثر ایقان ہی ان سے مل آتی تھی۔ ایک ہی گھر میں آجانے کے باوجود ماں بیٹی میں ایک نادیدہ سی دوری ہو گئی تھی۔

ایقان تیزی سے دروازے کی سمت بڑھی۔ دروازہ کھول کر وہ کچھ دیر کے لیے پتھر کی سی ہو گئی۔ باہر اختر میاں کمرے تھے۔

”اماں... اماں... میں بہت پریشان ہو کر رہ گئی ہوں۔“ صبح سے دیوانوں کی مانند ادھر سے ادھر پھرتی عذرا بیگم بمشکل دوپہر تک ہی ضبط کی پائی تھیں۔ کوئی چار دنہ پانچ سال آخر وہ ساس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”پہلے سوچا تھا کہ سبقتوں سے کہوں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اگر وہ انہیں غصہ آگیا تو کیا ہوگا۔ گھر میں کوئی بڑا فساد نہ گھڑا ہو جائے۔ میرا دل تو بہت گھبرا رہا ہے۔“

”خدا خیر کرے بس۔ ایسا کیا ہو گیا؟“ شفیقہ حیات بھی گھبرا سی گئی تھیں۔ ”دیکھو مجھے کوئی الٹی سپدھی خبر نہ سناؤ۔ میرا دل تو پہلے ہی بہت کمزور ہو چکا ہے۔“ عذرا بیگم خاموش سی ہو کر ساس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ انہیں الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے بھی وقت سی محسوس ہو رہی تھی۔

”اماں! میں نے صبح رافع سے شادی کی بات کی تھی۔ ثانیہ اور رافع کی شادی چونکہ ایک ساتھ ہی کر دینے کا



”ہاں۔ شاید۔ لیکن اتنا زیادہ نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔“ انہوں نے اس کا دھواں دھواں ہوتا ہوا چہرہ دیکھا۔  
 ”کوئی میڈیسن دوں آپ کو؟“ ربیعہ کو اچانک خیال آیا۔ ”اس دن شملہ آئی نے جو ٹیبلٹ دی تھی آپ کو۔ وہ ہے میرے پاس۔“  
 ”ٹیبلٹ سے نہیں اس انجکشن سے آرام آیا تھا لیکن تم ابھی ٹیبلٹ ہی دے دو۔ میں کھا لیتی ہوں۔ شاید اسی سے آرام آجائے۔“

ان کا چہرہ مزید پیلا ہوتا تھا۔ ربیعہ ڈری گئی۔  
 ”امی۔ میں شملہ آئی کو فون کر دیتی ہوں وہ ابھی گھر پر ہی ہوں گی۔“  
 ”نہیں ربیعہ۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”اس کی ساس اس کا یہاں روز روز آنا پسند نہیں کرتی۔ یہ میرا سن کر رو ڈی چلی آئے گی۔ خواجوا کوئی ناچاتی نہ ہو۔“

”لیکن امی! طبیعت۔۔۔“  
 ”انیقہ آتی ہی ہوگی۔“ انہوں نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی۔ ”تم تب تک وہ گولی دے دو مجھے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ربیعہ ناچار وہاں سے اٹھ کر لاؤنج نہیں آئی تھی۔  
 میڈیسن بکس سے گولی لا کر اس نے انہیں کھلائی پھر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں انہیں قدرے آرام آگیا تھا۔

”انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔“  
 ”جی امی! وہ ان کا اٹھا ہوا ہے ہوئے داری تھی۔“

”جاؤ بیٹا! ماموں ہیں آپ کے۔“ ایقان قدرے طنز سے بولی۔ ”ماموں سے ملو۔“  
 اختر میاں کھیانے ہو کر عجیب سے انداز میں کھی کھی کرنے لگے۔ ایمان اب تنگ ان کے قریب نہ گئی تھی۔  
 ”بھابھی بیگم کو سلام کہیے گا۔“ ایقان نے انہیں دھڑا پیر پا کر کہا۔  
 ”اچھا۔“ انہوں نے مائع داری سے سر ہلایا۔ ”ابھی جائیں گے تو ضرور کہہ دیں گے اور کوئی کام ہو تو ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔ اب ہم یہیں رہیں گے باجی کے پاس۔ اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔“  
 ”آپ کے کیے تو اتنا کام ہی کافی ہے اختر میاں! یہ بھی اگر آپ سہولت سے کر سکیں تو۔“ وہ جل کر بولی تھی۔  
 اختر میاں کے چہرے پر گہرے دکھ کے آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایک آہی بھری۔  
 ”آپ نے ہی کسی قابل سمجھا ہوتا ایقان بیگم تو ہم تو دنیا فتح کر لیتے۔ یہ سبے کار بے مصرف زندگی آپ کی میرانی تو ہے۔“

”اب آپ جائیں اختر میاں!“ ایقان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ ”مجھے ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ میں آپ کی ان عجیب و غریب باتوں کو قابل جواب نہیں سمجھتی ورنہ کہنے کو تو بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔“  
 ”اچھا۔ ہم جائیں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے پیاسی نظروں سے دیکھا۔ ایقان گولہ بھر کے لیے بے حد خوف سا محسوس ہوا۔ اختر میاں کا ذلیل ذلیل کسی بھی نازک اندام عورت کو خوف میں مبتلا کر سکتا تھا۔  
 ”رافع۔“ وہ ایک دم ہی بولی تھی۔ ”رافع آنے والا ہے۔ اسے آپ کی یہاں موجودگی اچھی نہیں لگے گی۔“  
 ”اچھا۔“ وہ قدرے مایوسی سے بولے۔ ”پتہ نہیں ہم اپنے بڑے کیوں ہیں۔ کسی کو ہماری کہیں بھی موجودگی اچھی نہیں لگتی۔ آپ غصہ نہ کریں ایقان بیگم! ہم تو یوں ہی آپ کو ایک نظر دیکھنے چلے آئے تھے اب ہم چلتے ہیں۔“

”جی ہاں۔ ضرور۔“ اس کی جان میں جان آئی۔  
 اختر میاں دروازے کی جانب بڑھے۔ ایقان دروازہ بند کرنے کے خیال سے ان کے پیچھے ہی لپکی۔ ”ایک۔۔۔“

”اگر آپ برائے ماں نہیں تو۔۔۔ ہم کبھی کبھی آجایا کریں۔“ وہ پوچھ رہے تھے۔  
 ”کیوں؟“ وہ بھٹائی۔  
 ”یونہی۔ آپ کو دیکھنے۔“

”خدا حافظ۔ بھابھی کو سلام کہیے گا۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولی۔  
 ”اچھا۔ خدا حافظ۔“ وہ مایوس سے ہو کر باہر نکلے تھے۔

”امی۔ آپ کے لیے چائے بنا دوں۔“ ربیعہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔  
 پھر ایک وہ رکی۔ بیڈ پر بیٹھی منیوہ بیگم کے چہرے پر درد کے آثار نمایاں تھے۔ ربیعہ تیزی سے ان کے قریب پہنچی۔

”امی۔ امی۔ کیا ہوا ہے؟“  
 ”پتا نہیں ربیعہ۔ پیٹ میں ایک گولہ سا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔“ انہوں نے تکلیف سے نڈھال ہوتے ہوئے کہا۔

”پھر وہی درد اٹھا ہے نا آپ کو۔“ ربیعہ نے ان کے برف ہوتے ہوئے ہاتھ تھامے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے تحفہ کا تحفہ

## خوبصورت و مقبول ناول

☆ **میرزا ریزہ ریزہ** مایا ملک 300/- \* **لاما شیل** عبداحد 180/-  
 ☆ **اک دیا جلائے کھنڈا** مایا ملک 300/- \* **شہر دل کے دروازے** شادی چوہدری 250/-  
 چادوں ناول ایک ساتھ منگوانے پر ڈاک خرچ فوری  
 خوبصورت سرورق • خوبصورت چھپائی • مضبوط جلد • آفسٹ پیپر

شائع ہو گئے ہیں

آج ہی قریبی بکسٹال سے حاصل فرمائیں

37 اردو بازار، کراچی  
**مکتبہ عمران ڈائجسٹ** فون 2216361



”ہست اچھی بیٹی ہو تم۔ خدا کا احسان ہے مجھ پر جو اس نے تمہیں یہاں میرے پاس بھیج دیا۔“  
 ”میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی امی۔ اس نے مجھے ماں بھائی، بہنیں۔ سب ہی کچھ دے دیا ہے۔“

منیہہ بیگم کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی تھیں۔

”تمہارا بھائی۔۔۔ کبھی تمہیں فون بھی نہیں کیا اس نے۔۔۔ کون سے ملک گیا ہے وہ؟“

انہوں نے اچانک ہی پوچھا تھا۔ ربیعہ کو تھوڑی دیر کے لیے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

”جی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی تب ہی فون کی بیل بجنے لگی۔ منیہہ بیگم چونک اٹھیں۔“

”دیکھو تو کس کا فون ہے۔۔۔ اور سنو۔ عبادیہ انبیقہ کا ہو تو میرے درود کے متعلق کچھ مت کہنا۔ وہ اپنے کام و اہم چھوڑ کر چلے آئیں گے۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“

”جی اچھا۔“ ربیعہ ناچار انبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکلی تھی۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے فون اٹھایا۔

”ہیلو۔۔۔“ دوسری جانب درود تھی۔ ”ربیعہ! کیسی ہو تم؟“

”ارے درود تمہیں۔۔۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔۔۔ پھر پھر ہی نہیں لگایا تم نے۔“

”میں نے تم سے کہا تھا نا۔ اب تمہاری باری ہے۔“ وہ بولی۔

”پتا۔۔۔ چاد میں ضرور آؤں گی۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔ ”یوں بھی میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“

”ربیعہ! تم نے اس دن یونیورسٹی میں زائچہ سے بکس کا کہا تھا نا۔؟“

”ہاں زائچہ دے گئے تھے مجھے، میرے پاس ہی ہیں۔“

”لے لیتا۔“

”ہوں۔“ درود جیسے چونکی تھی۔ ”ہاں ٹھیک ہے۔ میں پھر درود سری بکس ایڈیٹر کروالوں گی۔ اچھا خدا حافظ۔“

اس نے اچانک ہی فون بند کر دیا تھا۔ ربیعہ کو بے حد حیرانہ ہوئی۔ اس نے ریسیور کو حیرانی سے دیکھا اور کریڈل پر رکھ دیا۔

”چو لے پر کچھ چڑھایا ہوا ہو گا منیڈم نے۔ وہی یاد آگیا ہو گا۔“ اس نے ہنسنے لگا۔

”جی۔۔۔“

ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ گیلری میں کھڑی شہلا کو سردی سی محسوس ہوئی لیکن وہ پھر بھی کھڑی رہی۔ باریک

پنک ٹائی خنکی کا بردھتا ہوا احساس دبانے میں ناکام ہو رہی تھی لیکن شہلا کو وہاں کھڑے ہو کر بے حد سکون محسوس

ہو رہا تھا۔

رات کے دوسرے پہر کی گہری خاموشی، ٹھنڈی ہوا اور ہر طرف پھیلا ہوا اندھیرا تاروں سے اپنے مسائل

ڈسکس کرنا سے بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چند کہ صبح اسے جلدی ہاسپٹل پہنچنا تھا پھر بھی وہ سونا نہ چاہتی تھی۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلنے کی تھوڑی سی آواز ہوئی اور ہاشم نے باہر جھانکا۔

”شہلا۔۔۔“ اسے شہلا کا ہولہ دکھائی دے رہا تھا۔

”جی۔۔۔“ اس نے چند لمحوں بعد مڑے بغیر کہا۔

”تم یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو۔؟“ وہ بھی باہر ہی چلا آیا۔ ”اتنی رات گئے!“

”بس۔۔۔ یونہی۔۔۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ ”نیند نہیں آرہی تھی تو میں۔۔۔ کچھ دیر کے لیے یہاں

آئی۔۔۔ تازہ ہوا۔ اچھی لگ رہی ہے۔“

ہاشم اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ شہلا کے مخصوص پرفیوم کی مدھم سی مہک اس نے سانس کھینچ کر اپنے

اندرا تازی پھر اس نے آہستگی سے اسے خود سے قریب کیا تھا۔

”نیند نہیں آئی تو کسی کے ساتھ مل کر بھی جاگ سکتے ہیں۔ تم بیٹھنا اکیلے ہی جاگنے پر اصرار کرتی ہو۔“

اس کی آواز میں محبت، نرمی اور پیار بھرا بلاوا تھا۔ شہلا کے لیے یہ بے حد مانوس انداز تھا۔ اس نے ہاشم کو ہمیشہ

اتنا ہی نرم اور محبت سے بھرا ہوا پایا تھا۔

لیکن نجانے کیوں اس وقت دل تنہائی مانگ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے ہاشم کا ہاتھ بٹایا۔

”ہاشم۔۔۔ میں۔۔۔ میں کچھ دیر تنہا رہنا چاہتی ہوں۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔“

ہاشم کچھ دیر خاموش رہا۔

”او۔۔۔“ پھر وہ بولا۔

چند لمحوں بعد وہ مڑ کر اندر چلا گیا۔ شہلا کا دل عجب خالت میں مبتلا ہوا۔ شاید اس نے ہاشم کے ساتھ زیادتی کی

تھی۔ وہ وہیں کھڑی چند لمحے بیٹھ کر اپنی صورت حال پر غور کرتی رہی پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے واقعی ہاشم کے

نرم جذبوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ گفٹ کا احساس برہماتو وہ مڑ کر اندر چلی آئی۔

یہ ایک ہی دیر کی گئی تھی۔ ہاشم بیڈ کی اس سائیڈ پر بیٹھا ہوا تھا جہاں شہلا سوئی تھی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل کی

دراز کھول دی تھی۔

شہلا کو اندر آتا دیکھ کر اس نے دروازہ بند کر دی۔ شہلا آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے قریب جا بیٹھی۔

”ہاشم۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولی تھی۔

”ہوں۔“ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

سائیڈ ٹیبل کی درودھیار روشنی میں ہاشم کی بے پناہ شفاف نگاہوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ شہلا کا دل مزید دکھ گیا۔

اس نے ہاشم کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

”ہاشم۔۔۔ آئی ایم ویری سوری۔۔۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں۔۔۔ میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتی۔۔۔ لیکن ہر مرتبہ

زیادتی کر جاتی ہوں۔“

ہاشم اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”شہلا۔۔۔“ وہ عجیب انداز میں بولا تھا۔

”جی۔۔۔“

”یہ کیا ہے؟“

اس نے اپنی نڈ مٹھی کھول کر اس کے سامنے پھیلائی۔ شہلا کا دل لمحہ بھر کے لیے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ گولیاں۔۔۔ یہ تم کھاتی ہو؟“

شہلا خاموشی سے شیشی دیکھ رہی تھی۔ مانع حمل گولیاں وہ اوپری دراز میں ہی رکھتی تھی۔

باقی آئینہ شہلا کے یوں

اس کی جھکی ہوئی نظریں پھر اٹھ نہ پائی تھیں پھر بھی اس نے ہاشم کی نگاہوں سے برستی شکایت اور بے اعتباری کو محسوس کر لیا تھا۔

”شہلا! کافی دیر خاموش رہ کر وہ بالآخر بولا۔ ”تمہیں تم اگر۔“

شہلا نے جھبرا کر نظریں اٹھا لیں۔ ہاشم کہیں اور دیکھ رہا تھا۔

”دفتر مت کرو شہلا!“ وہ ایک بار پھر بولا۔ ”آئندہ تمہیں یہ گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”ہاشم! نہ جانے کیوں اس کا دل جیسے رکا تھا۔

ہاشم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کے رویں رویں میں ایک اضطراب کی کیفیت پنہاں تھی۔

”ہاشم!“ شہلا نے بے تاب ہو کر اسے پکارا۔

وہ کھٹکے کھٹکے قدموں سے چلتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

”ہاشم!“ میری بات سنیں۔ فار گاؤں تک۔“ شہلا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہاشم رکنا نہیں تھا وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ شہلا مضطرب ہو کر دروازے تک گئی پھر واپس

ٹھہر گئی۔ ہاشم اس وقت غم و غصے کی جس کیفیت میں تھا اسے نہ چھوڑنا ہی بہتر تھا۔ وہ اس وقت اس کی بات نہ

دھنک سے سن سکتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا۔ شہلا اس کے پیچھے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے بے بس سی ہو کر بیڈ پر

گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ اپنا چکراتا ہوا سر اس کے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ تقدیر کے برزخ شور مچانے

دیریا کی لہروں پر وہ خود کو بے آسرا تنگے کی مانند محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر تک انتظار رہے کی بے بسی اور

اضطراب کا مقابلہ کرنے کے بعد اس نے خود کو ٹوٹا ہوا ٹکڑے میں کیڑا توڑ سائڈ ٹیبل کی دیوار پر کھول کر پینڈ کر کے کمرے کی کشتی

نکالی۔ وہ گولیاں پانی کے ساتھ نکل کر اس کے لیے دروازے پر بند کر لیا جاوے۔ تب ہی اس کی نگاہ سرائے

کاربٹ پر گری اس تیشی پر پڑی جو ہاشم وہاں پھینک کر گیا تھا۔

”دفتر مت کرو شہلا! آئندہ تمہیں یہ گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

اس کے الفاظ ایک مرتبہ پھر اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ شہلا نے جھک کر تیشی اٹھائی۔ کچھ دیر اسے دیکھ

رہی پھر اس نے وہ تیشی ڈسٹ بن میں ڈال دی۔

\*\*\*

وائٹ ٹریک سوٹ میں ملبوس، تمہما تا چہرہ لیے وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ پاس سے گزر گئے ہوئے ملازم کو دیکھ

تھا کر اور بج چوس لانے کا کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

نہاں ہو کر جس وقت وہ واش روم سے برآمد ہوا، بیڈ پر بے نیازی سے بیٹھی ہوئی فریحہ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

”آپ کا اور بج چوس۔“ اس نے سائڈ ٹیبل کی جانب اشارہ کیا۔

”بڑی تکلیف کی آپ نے۔“ اس نے شرارتاً اس کے کاندھوں پر تولیہ ڈال دیا۔

”چھوٹی مولیٰ تکلیف تو آپ دیتے نہیں ہیں نا۔“ اس نے بھائی کو گھورتے ہوئے اٹھ کر تولیہ جگہ پر ڈالا۔

”ڈیش زائٹ۔“ وہ بیڈ کے مزے سے جوس پینے لگا۔ ”آوی کو کام بڑا ہی کرنا چاہیے۔“

”اچھا۔ تو یہ فرمائیے کہ ایک بے حد بڑا اور اہم کام کب کرنے کا ارادہ ہے؟ اسی چاہتی ہیں

جلد از جلد آپ کے فریضے سے سبکدوش ہوں نا کہ۔“

اس نے بات اور چھوڑ دی اور مسکرائی۔

”آں۔“ گہری سوچ میں ڈوبا فراز چونکا۔ ”ناکہ کیا؟“

”ناکہ میری باری آئے۔“ اس نے بیٹھی رکھائی۔

”شرم کرو لڑکی!“ فراز نے مسکراہٹ روک کر اسے گھورا۔ ”بڑے بھائی کے سامنے ایسی باتیں۔ اور پھر مسکرا

بھی رہی ہو؟“

”جیسے بڑے بھائی جب فتنے کر کے پسند کی لڑکی دکھائے اس سے زیادہ فتنے سما جتیں کر کے منگنی رچائے۔

مچھتر کو ذون پر بلوانے کے لیے آئی کریم اور سوپ کی پیش کش کرے تب کچھ نہیں اور میں نے صرف امی کا پیغام

صراحت سے پہنچا دیا تو بے شرمی کا لیبل فنانٹ فٹ کر دیا تو وہ بے پروائی سے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

”ویسے اصل بات آپ گول کر گئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ شادی کے لیے کون سا مہینہ اور تاریخ رکھی جائے؟“

اس نے سوچ میں گم ہوتے ہوئے بھائی کا چہرہ غور سے دیکھا۔

”ہوں؟“ وہ پھر چونکا۔ ”تم۔“ ننھی فاختہ زیادہ فکر مت کرو۔ اس موضوع پر میں امی سے خود بات کر لوں

”کیا بات کریں گے؟“ وہ اب بھی۔ ”اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہیں؟“

”اب تم جاؤ۔“ وہ ریموٹ سے لی ویں ٹی وی پر کرتے ہوئے بولا۔

”سوچ لیں۔ اب میں فون پر ناعمہ کو نہیں بلوایا۔“ وہ تب کر کھڑی ہوئی۔

”ڈیٹسوری۔ اب ایسی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وہ مطمئن تھا۔

”ہائیں آپ کو ہوا کیا ہے؟“

”ناعمہ اور مجھے آرام کی سخت ضرورت ہے اور شادی کی بھی۔ ناؤ۔ پلیز۔ لیوی الون۔“ اس کے پرسکون

فون پر کچھ دیر بعد۔ ”فریحہ کا کیا تھا؟“

”اچھا۔ پھر امی سے بات کر لیں۔ میں چلی۔“

”تھینکس۔“ وہ برسرِ پایا۔

Ph

\*\*\*

چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لیے وہ کسی سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ ورنہ کمرے میں داخل ہوئی پھر چند لمحوں

کے لیے غم سی گئی۔

”فریحہ! سوچ میں نہ رہو۔“ ناعمہ بہت معصوم اور سادہ سی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سوچ کا تاثر تھا اور

آنکھوں میں قدرے اداسی۔ ورنہ کچھ سوچ کر اس کے قریب آئی تھی۔ ناعمہ کے اشتغراق میں فرق نہ آیا۔ ورنہ

مسکرائی اور کشاکش جاری۔ تب وہ چونکی۔

”اڑے آپ۔“ دھل گئے آپ کے کپڑے؟“ وہ شرمندہ سی ہوئی۔

”صرف میرے نہیں آپ جناب کے کپڑے بھی دھل گئے ہیں۔“ ورنہ نے طنزاً کہا۔

”جب آپ کی شادی ہو جائے گی تب تو مجھے ہی دھونا پڑیں گے کپڑے۔“ اس نے منہ بنایا۔

”جیسے آپ سے پہلے رائے آلی کی ڈیوٹی تھی۔“

”ہاں۔“ ورنہ نے فراغت سے بیٹھتے ہوئے ہنڈلوں اور ہاتھوں پر ملنے لگی۔ ”ویسے محترمہ۔ ناعمہ علی

خانہ۔ آپ کو نوید ہو کہ مجھ سے پہلے امی آپ کو سسرال بھیجنے کی فکر میں ہیں۔ سنا ہے پچھلے دنوں آپ کی ساس

صاحبہ کا فون آیا تھا وہ اس سلسلے میں امی کا عندیہ لینا چاہ رہی تھیں۔“



”ٹھیک ہے خالہ جانی۔“ وہ نیم دلی سے بولا۔

”اور اس ہو؟“

”ہاں ہوں تو۔“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔

”مما یاد آ رہی ہیں؟“ ربیعہ نے آہستگی سے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں یکایک ہی آنسو ابھرے وہ انہیں پینے کی کوشش کرنے لگا۔ ربیعہ کو اس چھوٹے سے معصوم بچے پر بے حد پیار آیا۔ اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”عمریہ“

”خالہ جانی! مجھے ممایا د نہیں آ رہی۔“ وہ اس سے علیحدہ ہوا۔ ”میں اب مما کو بالکل یاد نہیں کرتا۔ مما مجھے چھوڑ کر ہاشم انگل کے گھر چلی گئیں۔ اب وہ مجھ سے روز ملنے بھی نہیں آتیں۔ حالانکہ انہوں نے مجھ سے پراس کیا تھا۔“ ربیعہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”میں تو اب صرف پیما کو یاد کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا وہ مجھے لینے آئیں گے۔ ابھی تو وہ اپنے ضروری کاموں سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”آپ کو ہم لوگ اچھے نہیں لگتے عمریہ؟ میں آپ کی نانا ننی سے اچھا خالہ۔ عبادا ماموں۔ ہم سب کتنا چاہتے ہیں آپ کو۔“

وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولی۔

”جی ہاں۔“ اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔ ”میں بھی آپ سب سے بہت پیار کرتا ہوں اور۔ اور مماسے بھی۔“

UrduPhoto.com

اس کی نانا ننی بڑا بڑا بھرا بھرا تھا۔

”پچھلے آپ ہم سب کو چھوڑ کر جانے کی بات کیوں کرتے ہو؟“

”اس لیے خالہ جانی! کہ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔ یہ گھر نانا ننی کا ہے۔ میرا گھر وہ ہے جو میرے پیما کا ہے۔“

ربیعہ نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”اتنی سی عمر میں اتنی بڑی باتیں کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے بڑے ہو کر تم ضرور سائنس دان بنو گے یا کوئی بڑے فلسفی۔“ وہ لہجہ بذل کر بات بھی بدلنے لگی۔

عمر پر اس کی بات کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا تھا وہ پھر سے کچھ سوچنے لگا۔

”اچھا۔ ایسا کرتے ہیں۔ سامنے پارک میں چلتے ہیں۔ میں تو بہت دنوں سے نہیں گئی اور میرا خیال ہے کہ بھی گھر میں بور ہو رہے ہو؟“ عمر نے ایک نظر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں میں تو بور نہیں ہو رہا۔ ویسے اگر آپ کو اسی کتے سے ڈر لگ رہا ہے تو میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔“

ربیعہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو روکا تھا۔ کتا تو گویا باہر اسی کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔

”ہاں سچ عمریہ۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”مجھے واقعی اکیلے جاتے ہوئے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ تم پلیز میرے ساتھ چلو نا۔“

”چلیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں اپنا بیٹ لے آؤں۔ وہاں میرے دوست کرکٹ کھیل رہے ہوں گے۔ میں بھی تھوڑا سا کھیل لوں گا۔“

”تھوڑا سا کیوں اتنا سارا کھیلنا۔“ ربیعہ نے مسکرا کر دونوں ہاتھ پھیلائے تھے۔

\*\*\*

پارک میں واقعی عمر کے کئی ہم عمر بچے کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اس کے انداز ہی بدل گئے۔ وہ ایک چھوٹے سے بچے کی ساری خوشی اپنے چہرے اور مسکراہٹ سے چھلکا ناان کی طرف لپک گیا تھا۔ ربیعہ مسکراتے ہوئے ایک سچ پر جا بیٹھی۔

”ہیلو۔“ وہ ستانہ انداز میں کہا گیا تھا۔ ربیعہ بے طرح چونکی۔

”ارے آپ۔۔۔“ رافع کو دیکھ کر اس کے اندر کون سا جذبہ ابھرا تھا وہ سمجھ نہ پائی یا شاید اس نے جان بوجھ کر اس جذبے سے نظرس چرائی تھیں۔

”کئی دن کے بعد دیکھا۔۔۔ اک شخص۔۔۔“ وہ منہ ہی منہ میں گنگنایا۔

ربیعہ سمجھ کر بھی نا سمجھی سے مسکرائی۔ رافع بچ کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔

”آپ تو بہت ڈر پوک نکلیں ربیعہ۔۔۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”آنا ہی ترک کر دیا اس جاذبہ کے بعد۔۔۔“

”جی۔۔۔“ اس نے سر جھکا دیا۔ ”سمجھ دار لوگ حادثات سے بچ کر چلتے ہیں۔۔۔“

رافع چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے جیسے نہ معنی بات سمجھ سکے اس لیے غصے پر غور کیا تھا۔

”آپ کا خیال خیال ہے ربیعہ!“ پھر وہ بولا۔ ”جو لوگ حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔۔۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میرا مطلب ہے جان بوجھ کر غلطی نہ کی جائے تو عقل مندی ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”بے سوچے سمجھے دل غلطی کر رہے ہیں۔“

”جی؟“ اس نے حیران ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

”آپ۔۔۔ دل کی غلطیوں پر یقین رکھتی ہیں ربیعہ؟“ رافع اسے اتنی گہری اور بھرپور نظر سے دیکھ رہا تھا کہ ربیعہ چند لمحوں کے لیے ان آنکھوں میں نہ دیکھ سکی۔ اس کی پگلیں بے اختیار اس کے رخساروں پر آگری تھیں۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ رافع اس چہرے کی دلکش سی سحر میں گرفتار ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا۔۔۔ کیا جواب دوں؟“ اسے خود اپنی آواز جتنی محسوس ہوئی تھی۔

”ایک غلطی کی ہے دل نے۔۔۔ جاننا چاہتا ہوں کہ واجبِ تعزیر ہوں یا بے اختیار قرار دوں۔۔۔“

گاہ کہہ رہے۔۔۔ جو بھی آپ کہنا چاہیں۔۔۔“

ربیعہ دیر کھینچتے ہوئے عمر کو دیکھنے لگی تھی۔

”بڑا یا سزا کا اختیار مجھے نہیں ہے رافع! غور کیجئے، جرم اگر ثابت ہو جائے تو کس کے گناہ گار ٹھہریں گے؟“

آپ۔۔۔ پھر وہ گہرے لہجے میں بولی۔

رافع بہت دیر تک کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا۔

”دل۔۔۔ اپنی پسند کا کھرا چاہے تو؟“ پھر وہ قدرے آزر دگی سے بولا۔

”کھڑے اور منصفِ دل کی پسند کے تابع تو نہیں ہوتے نا۔“ وہ مسکرائی۔

رافع کو اس کی مسکراہٹ ڈوبے سورج کی آخری کرن کی مانند لگی تھی۔

عمر نے رافع کو وہاں بیٹھ دیکھ لیا تھا۔ وہ بیٹ گھماتا، دوڑتا چلا آیا۔

”آہا۔۔۔ رافع انکل۔۔۔ السلام علیکم۔۔۔“

”و علیکم السلام۔۔۔“ رافع نے اسے جواب دیا۔

”اب آپ خالہ جانی سے شادی مت کر لیجئے گا۔“ اس نے منہ بنایا۔

ربیعہ اس کی بات پر دھک سے رہ گئی تھی جبکہ رافع بے حد حیران۔

”کیا۔۔۔ کیا مطلب؟“ وہ اسی حیرانی سے بولا۔

”مطلب یہ کہ جب بھی میں اور مہیا پارک میں آتے تھے، ہمیں یہاں ہاشم انکل مل جاتے تھے پھر انہوں نے مہیا سے شادی کر لی۔ اب خالہ جانی آتی ہیں تو آپ ملتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ آپ بھی خالہ جانی سے شادی کر کے انہیں اپنے گھر لے جائیں۔“

”عمم۔۔۔“ ربیعہ کھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم بہت عجیب باتیں کرنے لگے ہو۔ چلو گھر۔۔۔“

”نہ نہ۔۔۔“ رافع کی گنگناہٹ ہر چند کہ بہت مددگار تھی پھر بھی ربیعہ نے اسے بخوبی سنا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے چاہنے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

”بیٹے! چلو میرے ساتھ۔۔۔“ رافع نے عمر کو پکارا۔ ”اپنی مہاسے مل لو۔“

عمر کی نگاہوں میں چمک اے اتنی تھی جیسے اندھیرے میں جگنو جگمگاتے ہوئے ہو۔

”نہیں انکل!“ وہ بولا۔ ”مجھے تو کل کے میسٹ کی بیٹیا پر بھی کرنی ہے اور۔۔۔“

”اور کیا؟“

”اور مہیا کی ساس مجھے پسند نہیں ہیں۔“ اس نے بے نیازی سے کہہ کر ربیعہ کی انگلی تھام لی تھی۔ ربیعہ جزبز ہوئی۔

UrduPhoto.com

وہ آئینے کے سامنے کھڑائی کی ٹاٹ باندھ رہا تھا۔ شہلا اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ ہاشم نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”ہاشم! میں۔۔۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔“ شہلا کی زبان اٹکنے لگی۔

ہاشم کی نظر نے ایک ساعت کو اپنے دل سے نکالا پھر وہ ہیر ریش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگا۔

”ہاشم! جو آپ سمجھ رہے ہیں۔۔۔ بالکل غلط ہے۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ چاہتی ہوں کہ آپ میری بات سن لیں۔“

شہلا کا غصہ اب اس کے عالم میں انگلیاں چمکاتے ہوئے بولی۔

”در اصل ہاشم! میں صرف عمر کے لیے فکر مند تھی۔ میں ایسا نہیں چاہتی ہاشم! کہ میں دوبارہ ماں نہ بنوں۔ بخدا میں ایسا نہیں چاہتی۔“

ہاشم آئینے کے سامنے سے ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھا۔ سامنے رکھے بریف کیس کو کھول کر وہ اپنی فائل اور ضروری کاغذات اس میں رکھنے لگا۔ شہلا اس کے قریب آ بیٹھی۔

”ہاشم! میں عمر کی حیثیت کا تعین چاہتی تھی اور بس۔۔۔ میں۔۔۔ میں سوچتی تھی کہ ایک بار عمر کو ایک گھر۔ ایک جائز مقام مل جائے تب۔۔۔ تب میں دوبارہ ماں بنوں۔ بصورت دیگر وہ بہت کا پیلیکسڈ ہو جاتا۔ آپ۔۔۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات۔“

”شہلا!“ وہ بریف کیس بند کرتے ہوئے بے حد نرم لہجے میں بولا۔ ”میں نے آپ سے کسی بات کی وضاحت نہیں مانگی۔ آپ کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہیں۔“



”میں جانتی ہوں ہاشم! آپ کے دل میں بدگمانی ہے۔“ وہ روبانسی سی ہوئی۔

”گناہ دل میں ہو تو گناہ نہیں ہوتا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”عمل میں در آئے تب اس پر بات ہو سکتی ہے۔“

اس نے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ شہلا اس کے پیچھے لپکی۔

”میں نے جو کچھ آپ سے کہا“ آپ کو اس پر یقین نہیں ہے ہاشم؟“

ہاشم کھسک رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر شہلا کو دیکھا اور دھیس سے مسکرایا۔

”یقین تو آپ نے میرا نہیں کیا شہلا! دکھ تو صرف اس بابت کا ہے۔ اپنی وسوسے۔ طے شدہ بات پر مزید کیا باز

کی جائے؟ میرا خیال ہے میں لیٹ ہو رہا ہوں اور آپ کا بھی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ خدا حافظ۔“

وہ باہر نکل گیا تھا۔ شہلا اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ ہاشم کا انداز مخاطب اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ ”آپ“

”تم“ تک کا فاصلہ اس نے خوش رنگ تمناؤں کے سہارے طے کیا تھا اور اب وہ واپس پلٹ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے میں لیٹ ہو رہا ہوں اور آپ کا بھی وقت ضائع ہو رہا ہے۔“

شہلا کو چکر سا آیا تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ ہاشم اس سے بدگمان ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا نہ تھا لیکن اب

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ واقعی ایک طے شدہ بات تھی۔

”مممم“ اس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ ”میں آسکتا ہوں۔“

ریحانہ بیٹھ گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آنکھوں پر رکھا ہوا بازو ہٹایا۔

”ہاں! آؤ فرانسہ اندر آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی“ اسی لیے نیند بھی نہیں آئی۔ ”فراز نے تلے قدر

اٹھا تا اندر آیا۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ریحانہ نے ہاشم کو دیکھا۔ ”فراز! میں نے ناعمہ کی ماں سے

شادی کی بات کی تھی کہ آیا وہ درود سے پہلے ناعمہ کی رخصتی کر دیں گی یا پھر ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے خوش

ہے کہ وہ ایک لمحہ سمجھ دار خاتون ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ ناعمہ کا ہاتھ ہمیں دے دیں گی۔ سب بھی ہم چاہیں

تم سن رہے ہونا؟“

فراز جو کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا ایک لخت چونکا۔

”جی۔ سن رہا ہوں۔“

”دراصل بیٹا! میری طبیعت تمہارے سامنے ہے۔ کبھی دن کی طرح بالکل تازہ اور روشن ہوتی ہے تو کبھی رات

رات سی تاریک۔ مجھے خود اپنا اعتبار نہیں۔ میں چاہتی ہوں جلد از جلد تمہارے سر پر سہرا سجا دیکھ لوں۔ کیا باز

ہے فراز! تم کہاں کھوئے ہوئے ہو۔ میں اتنی اہم بات کر رہی ہوں اور تم دھیان ہی نہیں دے رہے ہو۔“

”نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں سب سن رہا ہوں لیکن بات یہ ہے امی کہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہ

ہوں۔“

”ہوں۔ یہ مت کہنا کہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے علاوہ جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کو۔“ وہ سائیڈ میز

سے اپنا چشمہ اٹھا کر نرم کپڑے سے صاف کرنے لگیں۔

فراز نے ایک نظر اپنی بہت عجیب محبت کرنے والی لیکن قدرے سخت گیر ماں کو دیکھا۔ اپنی اولاد میں سب

زیادہ وہ اسے چاہتی تھیں لیکن ان سے بات کرتے ہوئے ایک حد فاضل قائم رکھنا بہت ضروری ہوتا تھا۔ البتہ

فریح سب سے چھوٹی ہونے کے ناطے اس چیز سے مستثنیٰ تھی۔ وہ ان کی لاڈلی تھی اور ان سے ہر بات شیر کر

کرتی تھی۔

”امی! آپ کو یاد ہو گا۔ میری منگنی آپ رخسانہ آنٹی کی بیٹی فرحین سے کرنا چاہتی تھیں؟“  
 ”اب اس بات کا یہاں کیا ذکر۔“ انہوں نے اسے گھورا۔

فراز قدرے پرل ہوا۔

”وہ امی! اصل میں چاہتا ہوں کہ میں آپ کی خواہش پوری کروں۔“ وہ آستنی سے بولا۔  
 ”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہو گئی۔ ”میں کچھ سمجھتی نہیں؟ کھل کر کہو؟“  
 ”امی! میں ناعمہ سے شادی نہیں کروں گا۔“ بالآخر وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

رخسانہ بیگم چند لمحوں کے لیے سکتے میں رہ گئیں۔ ”ان کی آواز جیسے کسی کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔“  
 ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں آپ میری شادی جلد کرنا چاہتی ہیں مگر میں لیکن ناعمہ سے نہیں فرحین سے۔“

رخسانہ بیگم چند لمحے اسے غم و غصے سے دیکھتی رہیں پھر ان کا ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر ایک زوردار طمانچہ کی صورت پر۔ پوری زندگی میں انہوں نے پہلی مرتبہ اپنی کسی اولاد پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ فراز بیگم شہر دروہ گیا۔  
 ”امی! اسے یقین نہ آیا۔“

”تم تم کسی غریب کی عزت کو مذاق سمجھتے ہو۔ چار دن کا بھلا ہے تمہارے لیے؟ کسی کے گھر کی خوشیاں تم اپنی دل لگی کے لیے استعمال کرو گے؟ فراز! میرا دل چاہ رہا ہے میں تمہیں شوٹ کروں۔“  
 ”مگر میں شوٹ ہوا! وہ اٹھ کھڑا ہوا۔“ لیکن یہ امر قابل غور ہے۔ ”میں ناعمہ سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ لڑکی اس قابل نہیں ہے۔ جو الزام آپ نے مجھ پر لگایا ہے۔“ ان ہی الفاظ میں اس لڑکی پر عائد کرتا ہوں۔ کسی کی خوشیاں اس کے لیے محض چار دن کا کھیل اور دل لگی جیسی ہیں۔ اس نے اپنے منگنی کی لگی بات میں یہ منگنی توڑ دوں گا تاکہ اسے کھیل اور دل لگی کا بیچ مطلب سمجھ سکیں۔ اس نے یہ منگنی کی لگی بات رخسانہ بیگم بھی اس کے عقب میں کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے فراز کا کاندھا پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑا تھا۔

”سنو فراز!“ وہ بولیں۔ ”اس سارے معاملے کے پیچھے کیا کمانا پوشیدہ ہے۔ میں نہیں جانتی مجھے جاننے میں دلچسپی بھی نہیں ہے۔ تمہارا ناعمہ سے کس طرح تعارف ہوا بات کہاں تک پہنچی مجھے علم نہیں ہے لیکن اب میں یہ جانتی ہوں کہ یہ معاملہ دو افراد کا نہیں دو خاندانوں کا ہے۔ افسوس کہ تم نے ایک کرہہ عمل کے لیے اپنے خاندان کی عزت داؤ پر لگانا چاہی لیکن بیٹا! تمہاری ماں ابھی مری نہیں زندہ ہے۔ میں تمہیں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانے دوں گی۔ کیسے سمجھ لیا تم نے کہ جس طرح تمہاری ضد کے آگے مجبور ہو کر ہم منگنی کر لیں گے اسی ضد کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اسے توڑ بھی دیں گے۔ میں وہ لڑکی جیسی بھی ہے اس نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا اس کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ ہے۔ ہمارے لیے وہ ہماری ہونے والی ہو ہے۔ سمجھے تم۔“

”آپ جذباتی ہو رہی ہیں ماما!“ وہ چڑ گیا۔

”جذبات کا دھارا صحیح سمت میں بہتا ہو تو جذباتی ہونے میں حرج نہیں۔“

”آپ! آپ! آپ! ہو پا کر بیٹا کھونا چاہتی ہیں۔“ وہ چراغ غباہ ہونے لگا۔

”اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ ناعمہ ہر صورت تمہاری دلہن بن کر اس گھر میں آئے گی۔ اس گھر کے لوگ تمہاری طرح عمدہ شکل اور بے زبان نہیں ہیں۔ سمجھے تم۔ منگنی زبان ہے عمدہ ہے۔“  
 فراز پیر پختے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

”ایقان! میری بچی! کیوں خود کو تباہ کرنے پر تکی ہوئی ہے۔ تجھے اپنے بچوں پر بھی ترس نہیں آتا۔“ شفیعہ حیات بے بسی اور لجاجت سے بولیں۔

ایقان کی آنکھیں شدت غلبہ سے سرخ ہونے لگیں۔ اس نے نچلا لب و انتوں تلے دیا۔

”کیوں ترس کھاؤں اپنے بچوں پر؟ خدا انخواستہ سڑک پر تو نہیں بیٹھتے ہوئے اپنی ماں کے گھر میں ہیں۔ یہ حصہ ابامیاں نے میرے نام کیا تھا۔“

”اری باؤں! عورت! اہم عقل! بچوں کو باپ کا سایہ چاہیے۔ اسلام اور قانون اسی لیے متنا کو فراموش کر کے بچہ باپ کے حوالے کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اتنا بھی سمجھتی؟ کل کو اگر اس کے دماغ میں کوئی فتور آجائے خدا انخواستہ اپنے بچے پیچھے لے دے۔ تو کیا کرے گی؟ اپنے ابامیاں کا حصہ لے کر بیٹھی رہ جانا۔ بھلا یہ دو کمروں کی چھت بھی اتنا غرور کرنے کے لائق ہے۔“

”اماں!“ وہ چٹک بڑی۔ ”کیا کہہ رہی ہیں آپ! میں بھلا کیا غرور کروں گی جس عورت کا شوہر اس کا مان اعتماد اعتبار سب کی بچہ لپک راہ چلتی کو سوئپ دے لیکن آپ اگر مجھ سے یہ چاہتی ہیں کہ میں اس کے پیر پڑوں اسے مناؤں بلاؤں اور ایک بار پھر بے شری سے اس کے ساتھ چل دوں تو یہ ممکنات میں سے نہیں ہے۔ اتنی عزت نفس میرے اندر ہے ابھی۔“

شفیعہ حیات نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”بھولی انا کو عزت نفس کا نام مت دو ایقان! یہ تو شیطان کا بہکاوا ہے جس میں اگر اپنا گھر اپنے ہاتھوں برباد کرنے پر تکی ہوئی ہو تو تمہارے غلطی انسانوں سے ہوئی ہے۔ اس نے بھی مانا تھا کہ اس سے غلطی ہوئی۔“

”نجانے کیا باتیں پڑاؤں اس نے آپ کو کس کوئی کر رہی۔“ اس کی خامیاں بھی آپ کو دیدہ زیب محسوس ہوتی ہیں۔ خوبیاں شہر آتی ہیں۔“

”ارے بچی! مجھے تو صرف تیرا گھر نظر آیا ہے۔“ ابیدہ ہو گئیں۔ ”اس سے میرا کیا رشتہ کیا نا تا۔ سارے رشتے تیرے حوالے سے ہیں۔ میں تو صرف تجھے چاہتی ہوں۔“

”مجھے چاہتی ہیں اماں تو خدا کا واسطہ پڑے مجھ کو مجبور نہ کریں۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گی مجھے میرے جان پر چھوڑ دیں۔“

شفیعہ حیات بے بسی اور تاسف سے اسے دیکھتی رہیں۔

”تیرا ام میری جان لے لے گا ایقان!“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”نہیک ہے بچی! ماں مر جائے گی تو تجھے علم ہو گا کہ ماں جانیوں کی محبت اور مروت کتنے دن کی۔“

ایقان کے رونے میں شدت آگئی۔

”میں کب کسی سے کچھ مانگتی ہوں اماں!“

”نہاں تو اس بچے کے دل میں نیکی ہے اس لیے جس دن اس نے ہاتھ کھینچ لیا اس دن ہاتھ بھی پھیلا تا پڑ جائے گا۔ اتنی سی بات نہیں سمجھتی؟ ارے جس کی کمانی کھا رہی ہے اس کی چار خطاؤں سے نظر حیرا لے تو کون سی قیامت آجائے گی؟“

”اپنے بچوں کی کفالت اس کی ذمہ داری ہے۔“ وہ رونا بھول کر زور سے بولی۔ ”کوئی احسان نہیں کر رہا ہے مجھ پر۔ پیسہ بھیجتا ہے اپنے بچوں کے لیے۔ نہیں لکھی بھیجے گا تو ہم بھوکوں نہیں مریں گے۔ پڑھی لکھی ہوں تو کڑی کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیش پال سکتی ہوں۔“

”وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”اس وقت سے دُر جب وقت سمجھانے پر اتر آئے۔ ابھی تو ماں بد نصیب ہی سمجھا رہی ہے۔“

”چھوڑیں آپ میرے حال پر چھوڑیں مجھے۔“ اس نے گالوں پر اتری نمی صاف کی۔  
 ”یہ بتائیں چائے بناؤں آپ کے لیے۔ کتنے دن کے بعد آپ کو میرا خیال آیا ہے۔ آپ تو مجھے ماں کم اور ساس زیادہ لگتی ہیں۔“

”میں نہیں پتی چائے۔“ انہوں نے خفگی سے سر جھٹکا۔ ”ماں کی ممتا پر تو شک مت کر شوہر پر تو جو کیا سو کیا۔“  
 ایقان نیم دلی سے مسکرائی۔ اسی لمحے فون کی بیل بجی۔ ایقان کا دل دھڑکا۔ یہ وقت تو عاشق کے فون کا تھا۔ مومن کے اسکول سے آ جانے کے بعد وہ کبھی کبھار فون پر اس سے اور ایمان سے بات کرتا تھا۔ مومن نہار ہا تھا اور نہ وہ بیل سن کر دوڑتا بھاگتا چلا آتا تھا۔ ایقان ٹھس سی بیٹھی رہی۔

”فون کیوں نہیں اٹھاتیں؟“ شفیقہ حیات نے ناگوار سی پوچھا۔  
 ایقان نے سانس بھری۔ بیل بند ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ ناچار اسے اٹھنا پڑا۔  
 ”ہیلو۔“ اس نے اپنے دل کی دھڑکن اپنی سانسوں میں محسوس کی۔  
 ”ہیلو۔“ دوسری جانب عاشق ہی تھا ”عاشقیاں کر رہا ہوں۔“  
 ”ہوں۔ مومن نہار ہا ہے۔“ وہ شفیقہ حیات پر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی کہ فون کس کا ہے۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ سنجیدہ تھا۔  
 ایقان کی پتیلیاں بھگنے لگیں۔ دل کی حالت اسے بتا رہی تھی کہ اس شخص سے کیسے کیسے باتیں تھیں۔ اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔  
 ”کچھ دیر بعد کر لیتا۔“ وہ استغنی سے بولی۔  
 ”نجانے کیا بات تھی شفیقہ حیات کے سامنے بات نہ کرنا ہی بہتر تھا۔“  
 ”ہوں، ٹھیک ہے۔“ وہ جیسے سمجھ گیا۔

لائسنس کنکٹ ہوئی تو ایقان نے بے جان ہاتھوں سے ریسور رکھ دیا۔ وہ مڑ کر واپس آئی تو اسے احساس ہوا کہ شفیقہ حیات پوری طرح چوکنی تھیں۔  
 ”کس کا فون تھا؟“ انہوں نے بے تالی سے پوچھا۔  
 ”مومن کے دوست کا۔“ وہ بستر کی چادر ٹھک کرتے ہوئے اپنے تاثرات چھپانے لگی۔  
 ”اچھا۔“ وہ مایوس ہو کر کچھ سوچ میں ڈوب گئیں۔ ”عاشقیاں! کبھی فون تو کرتے ہوں گے؟“  
 ”جی؟“ ایقان چونکی۔ ”ہاں کرتے ہیں کبھی کبھار۔“  
 ”اچھا۔“ انہیں جیسے خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی۔ ”کیا کہتے ہیں؟“  
 ”کیا پتا۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”مومن اور ایمان سے ہی بات ہوتی ہے۔“  
 ”کبھی تم سے بات نہیں کی؟“  
 ”نہیں۔“ وہ بے رخی سے بولی۔  
 شفیقہ حیات مایوس ہوئی تھیں۔



منیزہ بیگم کو دوائی دے کر وہ کمرے سے نکلی تھی تب ہی باہر گاڑی کا ہارن بجا اور چند لمحوں بعد ہی ڈور بیل

”کیونکہ بیٹا!“ منیوہ بیگم بولی تھیں۔ ”میں جانتی ہوں کہ قانوناً تم ہی عمر کے اصل حق دار ہو۔ ہم لوگ تمہیں کسی طور اسے یہاں سے لے جانے سے نہیں روک سکتے لیکن اگر تم ہم پر ترس کھا کر دماغ کے بجائے دل سے سوچو۔ توہ عمر کے لیے تمہارا فیصلہ تمہیں نامناسب لگے گا۔ وہ ہم لوگوں سے بہت اچھی ہے۔ نہیں رہ پائے گا ہمارے بغیر اور۔۔۔ اور ہم سب عمر کے بغیر۔۔۔ ان کی آواز بھرا گئی۔

”آئی۔۔۔ اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ”کیا شہلا کی شادی سے پہلے کوئی سوچ سکتا تھا کہ عمر شہلا کے بغیر رہ پائے گا یا شہلا عمر کے بغیر رہے گی؟ نہیں نا۔ یہ تصور ہی بے معنی لگتا ہو گا خصوصاً ”شہلا کو لیکن اب آپ دیکھیں“ دونوں نے اس جدائی کو ایک زندہ حقیقت کی مانند قبول کر لیا ہے۔ یہ سب تو کہنے کی باتیں ہیں۔ سو کھنا یہ ہے کہ بیچ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے بیٹے کو میرے ساتھ رہنا چاہیے۔ ثانی اور راموں کے پاس رہنا مناسب نہیں جبکہ ماں باپ حیات ہوں۔ بچے کو ان باتوں کا احساس نہیں ہو سکتا لیکن آہستہ آہستہ وہ یہ سب اکورڈ فیل کرے گا۔ لوگوں کے سوالات اس کے اندر احساس کمتری پیدا کر دیں گے اور ایک دن وہ ہم سب سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہو گا کہ ”میں جسے ماں باپ کے ہوتے ہوئے وہ آخر اپنی نانی کے گھر کیوں رہتا ہے؟ ابھی اسے آپ لوگوں سے پچھرنے میں تھوڑی تکلیف تو ہوگی لیکن آخر کار وہ اس تبدیلی کو ذہنی طور پر قبول کرے گی۔“

منیوہ بیگم خاموش ہی رہ گئیں۔ دکھ کی گہری پرچھائیں ان کے چہرے پر تھیں۔ وہ عمر کو اس طرح چاہتی تھیں جیسے وہ ان کا نواسانہ ہو۔ سب سے چھوٹا بے حد لاڈلا بیٹا ہو۔

”میں جانتا ہوں آئی! اس کی جدائی وقتی طور پر آپ سب ہی کو شاق گزرے گی لیکن اس میں عمر کا مستقبل اس کی بھلائی پوشیدہ ہے“ اس لیے اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کر لیں پلیز۔“

”ابھی ابھی ہوں۔“ وہ آنرز کی سے بولیں۔ ”تمہاری باتوں کی نفی بھی نہیں کر سکتی لیکن اپنی محبت سے کیا توں؟“

”آئی! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ نے یقیناً ثانی نہیں ماں بن کر پالا ہے اسے لیکن یقیناً جانیں میں اسے آپ سے جدا نہیں کروں گا۔ وہ اسی طرح آپ سے ملا کرے گا۔ اس کا صرف گھر تبدیل ہوگا۔“

رشتے نہیں۔“ اس کے لہجے میں نجانے کیسا اطمینان تھا۔ ربیعہ کو کسی گہرائی کا احساس ہوا۔

”اور جب آپ داوی بنیں گی تو ان بچوں کی قلقاریوں میں ساری اداسیاں کھو جائیں گی۔ آپ کو یہ سب یاد بھی نہ رہے گا۔“ وہ شائستگی سے بولا۔

منیوہ بیگم اور ربیعہ خاموش تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں کل تمام اگر اسے لے جاؤں گا۔ اب اجازت دیجئے۔“ وہ کمرے سے نکل گیا۔ منیوہ بیگم نے صوفے کی پشت سے سر نکا دیا ان کی آنکھوں سے آنسو تو اتارے بہہ رہے تھے۔ ربیعہ نے ان کے پاس بیٹھ کر ان کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

خوشی سے چمکتا ہوا چہرہ لیے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ تسبیح کرتی شفیقہ حیات نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ ان کے قریب آ بیٹھا۔

”جلد ہی سارا اثر میری پیشانی میں داخل کر دیجئے پھر آپ کو خوش خبری سناں ہوں۔“

شفیقہ حیات نے اس کی پیشانی پر دم کیا پھر پیشانی چوم لی۔

بھی۔ ربیعہ نے لاؤنج میں لگی دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا۔ یہ وقت ایسا تھا جب شاد و نادر ہی کوئی آیا کرتا تھا۔ لاؤنج کا مرکزی دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی تب اس نے دیکھا۔ لکڑی کے گیٹ کے دوسری جانب ابرار جیلا کھڑا تھا۔ ربیعہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ مرکز اندر چلی آئی۔

”امی!“ اس نے دھیرے سے منیوہ بیگم کو آواز دی۔

”ہوں۔“ وہ غنودگی کے عالم میں تھیں۔

”باہر عمر کے پایا آئے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کیا؟“ وہ چونکیں اور بیٹھ گئیں۔ ”کون ابرار؟“

”کیا کہتا ہے؟“ ان کے چہرے پر از حد پریشانی نمودار ہوئی۔

”پتا نہیں کس مقصد سے آئے ہیں۔ میں نے ابھی انہیں اندر نہیں بلایا۔“

وہ چند لمحوں کے لیے سوچتی رہیں پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”دیکھتی ہوں بات تو کرتی ہی ہوگی ربیعہ۔“

ربیعہ نے ابرار کے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ اور لا کر بیٹھا دیا۔

”آپ کی تعریف؟“ وہ پوچھے بنا رہ نہ سکا۔ ”پہلے کبھی دیکھا نہیں آپ کو۔“

”ربیعہ۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اوس۔۔۔ پس یاد آیا۔ مجھے عمر نے آپ کے متعلق بتایا تھا۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

ربیعہ نے لہجے کی شائستگی سے متاثر ہو کر قدرے غور سے اسے دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں اعتراف کے بنانے لگی۔ شہلا نے اگر اتنا برا قدم اٹھایا تھا تو یقیناً بے حد مجبور ہو کر اٹھایا ہو گا۔

ابرار ایک حد درجہ متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ شاد و نادر کے باوجود وہ نہایت کم عمر تو جوان نظر آتا تھا۔ براؤن جدید تراش خراش کے ٹوپس سوٹ میں وہ بہت جاذب نظر اور ہنڈ سم لگ رہا تھا۔ اس کے بالوں کا اسٹائل اس کی ریسٹ ورج اور بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی تھی۔ قیمتی پتھر کی انگوٹھی۔ ہر شے سے امارت اور جدید انداز نمایاں تھا۔

وہ ہولے سے کھنکھار ا۔ ربیعہ چونک اٹھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کتنے اٹھا ک سے اس کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ شائستگی سے بولی۔ ”میں آئی کو بھیجتی ہوں۔“

وہ تیزی سے باہر کی سمت بڑھ گئی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے سوچا تھا۔ اتنا جاذب نظر بندہ اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اپنے مگن ہو کر اسے دیکھنے کے خیال سے وہ شرمندہ بھی ہوئی اور اسے ہنسی بھی آئی۔

یہن میں اگر اس نے چائے کے لیے پانی لینے کو رکھا اور برتن نکالنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کتنا اچھا ہوا جو اس وقت عباد اور انیقہ دونوں ہی گھر پر نہیں تھے وہ دونوں قدرے جذباتی ہو کر سوچتے تھے۔ ان کی موجودگی سے کوئی مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا تھا۔

چائے کی ٹرے لے کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ابرار اور منیوہ بیگم دونوں ہی خاموش تھے۔ ابرار کی خاموشی میں اطمینان تھا جبکہ منیوہ بیگم کے چہرے کا نقش نقش ان کے اضطراب کی داستان سنارہا تھا۔

ربیعہ نے چائے بنا کر دونوں کو دی۔

”تھینکس۔“ ابرار شائستگی سے بولا۔

”تمہیں دیکھنا ہی بڑی خوشی ہے بچے! ماں باپ کی نظر تو اپنے بچوں کو صرف دیکھنے سے ہی راضی رہتی ہے۔“ کوہا

کیا بات ہے؟

رافع نے ان کے ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگائے۔

”دادی جان! آپ بہت اچھی ہیں۔ خوشی کی خبر یہ ہے کہ میری نوکری پکی ہو گئی۔ اپائنٹ منٹ لیٹر لے آیا

ہوں۔“

”اگر سہ ماہی مبارک ہو بہت بہت۔“ ان کی ساری خوشی ان کی آنکھوں میں اتر آئی۔

”تمہارے باپ کا بھی بوجھ ہلکا ہوا۔ بڑے بیٹے کے روزگار سے لگنے کی تو خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔“

پکواؤں گی۔ کیسی نوکری ہے؟

”نوکری بہت اچھی ہے اماں۔“ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ”اس سینی میں پہلے بھی ایک مرتبہ ٹرائی

کر چکا ہوں تب کامیابی نہ ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لیں یہ میرا خواب تھا جو پورا ہو گیا۔“

”ماشاء اللہ۔ تب ہی تو خوشی ایک ایک اواسے چھلک رہی ہے۔“ وہ ہنسیں۔ ”ماں کو بتایا؟“

”امی شاید پھپھو کی طرف گئی ہیں۔“ اس نے بند آنکھوں سے ہی بتایا۔

”راجہ کی طرف؟“

”جی ہاں۔“ اسے جیسے دادی کی گود میں نیند آنے لگی تھی۔

”اچھا رافع! ہاں سنو۔ یہ تمہارا وردہ سے شادی کے متعلق کیا ارادہ ہے؟ تمہاری ماں کچھ فکر مند ہو رہی

تھی۔“

انہوں نے بنا کسی پیش لفظ کے اچانک ہی اصل بات کا آغاز کیا تھا۔ رافع اس اچانک حملے پر چونک اٹھا۔

”امکھیں کھول کر دیکھو! تمہاری ماں نے ایسا کیا کہا؟“ وہ غماط ہو کر پوچھنے لگا۔

”امی! فکر مند کیوں ہیں؟ میں نے ایسا کیا کہا؟“ وہ غماط ہو کر پوچھنے لگا۔

”اگر سہ ماہی مبارک ہو بہت بہت۔“ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ”اس سینی میں پہلے بھی ایک مرتبہ ٹرائی

کر چکا ہوں تب کامیابی نہ ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لیں یہ میرا خواب تھا جو پورا ہو گیا۔“

”ماشاء اللہ۔ تب ہی تو خوشی ایک ایک اواسے چھلک رہی ہے۔“ وہ ہنسیں۔ ”ماں کو بتایا؟“

”امی شاید پھپھو کی طرف گئی ہیں۔“ اس نے بند آنکھوں سے ہی بتایا۔

”راجہ کی طرف؟“

”جی ہاں۔“ اسے جیسے دادی کی گود میں نیند آنے لگی تھی۔

”اچھا رافع! ہاں سنو۔ یہ تمہارا وردہ سے شادی کے متعلق کیا ارادہ ہے؟ تمہاری ماں کچھ فکر مند ہو رہی

تھی۔“

انہوں نے بنا کسی پیش لفظ کے اچانک ہی اصل بات کا آغاز کیا تھا۔ رافع اس اچانک حملے پر چونک اٹھا۔

”امکھیں کھول کر دیکھو! تمہاری ماں نے ایسا کیا کہا؟“ وہ غماط ہو کر پوچھنے لگا۔

”امی! فکر مند کیوں ہیں؟ میں نے ایسا کیا کہا؟“ وہ غماط ہو کر پوچھنے لگا۔

”اگر سہ ماہی مبارک ہو بہت بہت۔“ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ”اس سینی میں پہلے بھی ایک مرتبہ ٹرائی

کر چکا ہوں تب کامیابی نہ ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لیں یہ میرا خواب تھا جو پورا ہو گیا۔“

”ماشاء اللہ۔ تب ہی تو خوشی ایک ایک اواسے چھلک رہی ہے۔“ وہ ہنسیں۔ ”ماں کو بتایا؟“

”امی شاید پھپھو کی طرف گئی ہیں۔“ اس نے بند آنکھوں سے ہی بتایا۔



”نہ جانے کیوں میرا دل اور دماغ کسی بھی بات پر متفق نہیں ہو رہے ہیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس وقت زندگی سے کیا چاہ رہا ہوں اور زندگی مجھ سے کیا چاہ رہی ہے؟ شاید یہ دونوں علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں اور میں اس چیز سے ذہن سرب بھی ہوں اور خوف زدہ بھی۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس صورت حال میں میں کسی سے بھی انصاف کر سکوں گا۔ اسی لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ فی الوقت میں شادی جیسی بڑی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا۔“

اس نے سر اٹھا کر شفیقہ حیات کی جانب دیکھا جو نظروں میں بے تحاشا تشویش اور الجھن لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی بھندلی بوڑھی آنکھوں میں بہت گہرائی تھی۔ رافع زیادہ دیر ان سے نگاہیں نہ ملا سکا۔

”رافع!“ انہوں نے کچھ دیر بعد اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ”میرے بچے تو نے اس وقت میرے دل کا سب چین سارا قرار مجھ سے چھین لیا ہے۔ دیکھ بیٹے! دادی کو سچ سچ بتادے کیا تجھے کوئی اور لڑکی پسند آگئی ہے؟“ رافع خاموش بیٹھا رہا۔ چین اور قرار کی بات کر کے جب وہ یہ بات پوچھ رہی تھیں تو وہ کچھ بھی کہنے کے قابل ہی کہاں رہا تھا۔

”رافع!“ ان کی آواز بھیک گئی۔ ”میری بیٹی رابعہ بہت ظریف دلی بڑے صبر والی بچی ہے، زندگی کی کھنکھنایوں کا اس نے بہت پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔ خدا نے اسے تین بیٹیوں سے نوازا اس نے بہت خوش دلی سے اپنی پھول سی بچیوں کی پرورش کی۔ وہ دادی کی بہت عزت محروم رہی لیکن کبھی کوئی حسرت کوئی شکوہ اس کے لبوں پر نہ آیا۔ شوہر کی بھرپور ثقافت اس سے چھوٹی۔ ہا۔۔۔ آہ! اس خدا کی بھڑکی نے بہت جلد خود پر اور حالات پر قابو ہانے کی اپنی پہچان کی۔ ایقان پر تو اس کے حوصلے اور صبر کا سایہ تک نہیں پڑا۔ خیر۔۔۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ بیٹا! تم جو بچہ خون ہو۔ ذہن کے بجائے زیادہ تر دل سے سوچتے ہو گے۔ یہی تمہاری عمر کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن میرے بچے۔ جو بھی فیصلہ کرو اپنی صبر والی پھپھی کے صبر اور حوصلے کو مت آزمانا اور پھر وردہ بہت پیاری بچی ہے۔ بات تین لڑکیوں میں سے اپنی ہان پر گئی ہے۔ اس میں بھی وہی ظرافت اور وسایا ہی صبر ہے اور۔۔۔ حل عورت میں یہ دو خوبیاں جرم کہ ہوں وہ مرد کی زندگی میں کچھ بھڑکتی ہے۔ ہم ایسی بات سمجھ رہے ہو نا۔۔۔“

”جی! رافع جو نکا پھر اس نے ایک گہری سانس بھری۔ ”سن رہا ہوں دادی! سب سن رہا ہوں سب سمجھ رہے ہیں یہ ہوں۔ آپ کیا سوچتی ہیں؟ ان میں سے کوئی بات ایسی بھی ہے جو میرے علم میں نہ ہو؟ شب جانتا ہوں میں۔ سب فکر رہے۔ میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کروں گا جس سے کسی کو کوئی دکھ پہنچے۔ بس مجھے وقت درکار ہے دادی۔ زندگی اور زندگی کے مطالبات کو سمجھنے کے لیے وقت چاہیے۔ خود کو سمجھانے کے لیے وقت چاہیے۔“

”رافع!“ شفیقہ حیات نے اچانک ہی سرگوشی کی۔ ”وہ کون ہے؟“

”وہی لڑکی جسے تو شاید چاہنے لگا ہے۔“

”اوہ!“ وہ یک لخت ہی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”بہت۔۔۔ خوبصورت ہے کیا؟“

”کم آن دادی جان۔۔۔“ وہ ہنس دیا۔ پھر اس نے جھک کر ان کا سر چوم لیا۔ ”کہہ رہا ہوں نا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”سب گمانیوں کو دل میں جگہ نہ دیں۔“

”بیٹا۔۔۔ اپنی وردہ بھی بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ تم نے تو کبھی اسے غور سے بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ کب سے تمہاری سنگیتر ہے وہ۔ لڑکیوں کو اچھے رشتوں والوں سے بہت توقعات وابستہ ہو جایا کرتی ہیں۔ بہت نازک جذبے ہوتے ہیں ان کے۔۔۔ ان باتوں کا کبھی خیال نہیں کیا تم نے۔“

”یا اللہ۔۔۔“ رافع بے حد گھبرا گیا۔ ”میں چلوں دادی۔۔۔ بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔“

”اٹھاؤ۔۔۔ چائے پیو۔۔۔ فریش ہولو۔ لیکن میری باتوں کو ذہن میں دہرا ضرور لینا۔“  
 راجہ رائے نے منہ سے محسوس کرتا ہوا وہاں سے نکلا۔

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

جانتی ہیں بھابھی جان! امی کے مشورے سے زیادہ میں آپ کے مشورے کو صائب جانتی ہوں۔ آپ لی  
 میرے نزدیک بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اسی لیے فراز کی امی کا فون آتے ہی میں نے آپ کو کھلا بھیجا۔  
 ”کیا رائے ہے آپ کی؟“

راجہ نے ایک نظر قدرے خاموش اور سنجیدہ نظر آتی عذرا بیگم کو دیکھا۔  
 ”اور آپ کا نند بھانج کا کم اور بہنوں والا معاملہ زیادہ ہے۔ اس لیے اپنی رائے دینے میں کوئی تردد نہ کریں  
 جیسی بھی آپ کی آسانی ہو ہم دیا ہی کر لیں گے۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ آپ ثانیہ اور رافع کے  
 تفریق ہو جائیں میں درود اور ناعمدہ کے فرض سے سبکدوش ہوں۔ کیسی آسانی ہو جائے گی ہماری۔“  
 ”میں عذرا بیگم کے لیے چائے بناتی ہوئی درود کے ہاتھ سست ہو گئے تھے۔ وہ بے دلی سے چائے کی پیالیاں  
 دینے لگی۔

”جی تو تم بالکل درست ہو راجہ۔ تمہاری بات سنی ہو ہے میں کوئی شک نہیں ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ  
 جیسے سے بڑا ہے اور درود ناعمدہ کے بڑی ہے۔ پہلا حق بھی ان دونوں کا ہی بنتا ہے۔ لیکن۔“ وہ قدرے  
 سست ہوئی۔

”میں کیا بھابھی جان؟ آپ کھل کر کیسے اگر کوئی پریشانی ہے تو ہم مل کر اس کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔“  
 ”یہ ہے کہ رافع۔ رافع ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔“ وہ نظر میں جھجکا کر آہستگی سے یوں بولی کہ جیسے  
 ”اقرار کر رہی ہوں۔“ وہ دھکیں۔ اسے یا اعتراض ہے بھابھی جان؟“ ان کے اچھو ہم و گمان  
 ”نہ کہ اس چھاپے میں رافع کی جانب سے بھی کوئی گریز ہو سکتا ہے۔“

”میں راجہ! اگرچہ میں اس بات کو۔ دراصل وہ اپنے گہریر اپنے مستقبل کے حوالے سے کہتا ہے یہ  
 جانتی ہو آج کل کے لڑکے ایک جست میں ہی آسمان چھو لینا چاہتے ہیں۔“  
 ”وہ شادی، پاؤں کی زنجیر سمجھتا ہے؟“ وہ خود پر ہنس مکھ ہنسنے لگی۔ ”وہ تو الناس کی بددگرے  
 سے بیروٹا ہے۔“

”میں راجہ سے بات کروں گی۔ تم خاطر جمع رکھو۔“ عذرا بیگم نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر جیسے  
 ”جی۔۔۔ چائے لے کر اٹھی تو۔۔۔ دونوں ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ درود نے بسکٹ ان کے سامنے کیے تو  
 ”ایک بسکٹ اٹھا لیا۔ پھر کوئی خیال آنے پر انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

”جی۔۔۔ ثانیہ کب سے یا، کر رہی ہے تمہیں۔۔۔ اسے بازار سے بھی کچھ کام ہے اور اپنی ایک  
 ”پہلے تو تم اکثر چکارا گالیا کرتی تھیں اب تو صورت نہیں دکھائیں۔“  
 ”نہاں! وہ لی مل سوں تک۔“ وہ اچھکی سے بولی۔

”جی۔۔۔ ایک دو اچھا کے سٹ تیار کروں۔ کیا پتہ اس کی ساس کا کب ارادہ بن

”اور اگر تیسرا ہی سانس تارا دے بھی دین کیا پھر؟“ سروں سے اس کی ہلوزی بودا اسانوالہ شرارت سے پوچھا۔  
 ”تو تندرستے، پیچپ کی گئی۔“ راجہ بیگم اور بندرا بیگم ہنس دی تھیں۔

دور: قدر سے، خجیب سی گئی۔ رابعہ، بیگم اور عذرا بیگم ہنس دی تھیں۔

$$\frac{1}{2} \quad \frac{1}{3} \quad \frac{1}{4}$$

نہ بے حد بے قراری سے منہ رہی تھی۔ کل سے وہ اسی بے چینی اور بے کلی کا شکار تھی۔ ناشر کے فون نے بہت نیس کر دیا تھا۔ شفیقہ حیات کی موت ہو گئی کے باعث وہ اس سے بات نہ کر پائی تھی۔ اس نے دوبارہ فون کیا۔ عذرا بیگم اس کی خیریت دریافت کرنے آئی: دلی تھیں۔ ایقان نے فون کا تاثر ہی نکال دیا تھا اور تب سے اب تک وہ ایک ناقابل بیان کیفیت کا شکار تھی۔ ناشر نے اسے کیوں فون کیا تھا۔ وہ آخر کون سی ضروری بات کرنا چاہتا تھا اس سے؟

شاید تنہا زندگی کے تعاقب میں دوڑتے دوڑتے وہ تھک گیا تھا۔ شاید جھکنا چاہتا تھا۔ اپنی بار کا اقرار کرنا چاہتا تھا۔ اور ایقین اس کی بار کا اعتراف سننے کی بے حد شدتوں سے متنبی تھی۔ اس نے واقعہ کھانک کی جانب سے دیکھا۔ مومن کے اسکول سے آ کر وقت ہو گیا تھا۔ یہی دو وقت تھا جب ناشر عہدہ مہنون کیا کرتا تھا۔

ایتنے اپنے مہیا کی سڑا کن تیز ہوتی محسوس کی اور تب ہی ٹپل ہوئی تھی۔ وہ اچھل ہی پڑی پھر تیزی سے

نیا۔ اس سائنس فیہر معولیٰ ہو رہا تھا۔

نبیلہ ماشریات کر رہا ہوں۔ ان کے اندر ایسے بے حد سنجیدگی تھی۔

”تباہ و فاسد کیا بات ہے؟“ ایقان نے اُسے میں زما نے بھر کی بے رخی سمیڑ کر کہا۔ اس کی بار کے اعتراف کے موجب پروردگار نے خود کو بہت بے نیاز اور بے پروا ثابت کر لیا تھا۔ وہ جسے اچھا پس دانا چاہتا تھا اس کی ہر حرکت میں اپنی مرضی کی پیروی اور مظلوم اور غلام نہیں ہوتی جتنا کہ اُسے اچھا پس دانا چاہتا تھا اس کی ہر پروا اور ضرورت ہی نہیں تھی۔ اپنے بچوں — شفیع اور خورشیدوں کے لیے سچا کھانا پیدا کرنا بھی —

میں نے ایک بے خبر و بی بات کرنا چاہتا ہوں۔ "وہ قدرت رکھتا۔"

”میں سن رہی ہوں۔“

”ایقان۔۔۔ میں۔“ ایسا سن سانس بڑک دھوم بخود سننے لگی۔

”یقین! میں اسے شادی کر رہا ہوں۔“ بالآخر کہنے لگا۔

یہ ہے کہ میں نے اپنے شاگردوں کو بتایا کہ ان کی تعلیم کے لیے میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ سب ان کے لیے ہے۔

ایک لڑکے نے اس کی کھوپڑی پر ہاتھ رکھا۔ اس نے فوری طور پر دیوار کا سہارا لیا ہوتا۔ کلمات شاید "ہی جاتی۔۔" کی جانب خاموشی تھی۔ شاید وہ اس کے جوابی رد عمل کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن ذہنی ہنسٹکا کے اندر ساغر۔ ایتان نہ۔۔۔ خدج تھمہ رگڑ رہی تھی۔

”یہاں، اچھا، بخیر، یہ جودو، بڑا۔ اس۔ لبتے میں طنز تھا۔

دنیا میں؟ تمہاری تعداد بڑھ رہی ہے ایک منطقی نتیجہ ہے سوخو، گوشتا پاش، وایقان یکم۔“

ایقان: جب بسا ست نکلا، وہاں سے دیوار کے ٹھوکر بھی تھکی۔

زندگی کی دشواریاں، اذیتوں پر تم اپنی چٹل سکتی ہو۔ میں تمہاری ہمت و سات ساہم کرتا ہوں تاہم میرے بھروسے کے لیے یہ سب چند بہت مشکل تھا۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے ایک ساتھی کی ایک ہمارے کی ضرورت تھی۔ اسی لیے

2007 ج 266

انتخابات 2007 مارچ 267

خیر فیملے کر لیا ہے اب شخص اس پر عمل در آمد پائی جب سوچا تو ہمیں نہ در تانہ نہ در تانہ کہہ کر دھکیلا۔  
 مگر میں نے کہا کہ یہ تو میری زندگی ہے اور یہ رشتہ قائم ہے اور یہ رشتہ قائم کرنا ہے کہ تمہیں یہ بات بتانی ہے۔  
 آئی ہے یوں۔ بالآخر اس کے کیوں سے سرسرائی آواز میں اٹھا اور ماتھے پر آنکھوں سے آنسو بہا۔

نہیں ہیں یو عاشر۔ مجھے نفرت ہے تم سے۔ تمہارے ساتھ جڑے ہر رشتے سے۔ میں تمہارے ساتھ نہ رہنے رکھنا نہیں چاہتی۔  
مجھے ملاقات چاہیے۔ ابھی۔ اسی وقت۔“

ریسپورٹوں سے لگائے پاٹھوں کی مانند بیخ رسی تھی۔ عاشر کافی دیر خاموش رہا۔ اس کی چپخند تھمیں دوپہر تھا۔

۱۰۱. جاذبه - ۱۰۲. ذرات - ۱۰۳. بارها از ذرات - ۱۰۴. همواره در مرکز الکتریکی - ۱۰۵. بارها

ہماری صاف اجتہادیت اور جلد بازی نے ہی ہمیں اس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ یقیناً، لیکن بہرحال میں اتنا

دوم اس میں ہوں۔ سوچا جہ کرانی کیلئے کر رہا ہوں۔ نہیں طلاق دینے میں مجھے عار نہیں۔ آ: میں نے اس کو یہ ہمارے بچوں کی زندگی برکے اثرات مرتب کرے گا۔ س: اچھی طرح سوچو۔

”کچھ نہیں مسیحیان۔“ وہ ہنس دہری سے بولے۔ ”کچھ بھی نہیں، مجھے طلاق ابھی آگیا ہے۔“

خفص کے ساتھ ایک پل بھی جڑی رہنا نہیں چاہتی۔"

نفسے سے دیر دیا لی ہو رہی تھی۔ اس کا ہنس نہیں چل رہا تھا کہ ریسپورٹ میں ہاتھ ڈال کر اس کا مہیاں پکڑ

دیوانہ وار مارتی۔ اس کا چہرہ لوہا نہ تھا۔

ج لو اقبال۔! اچھی طرح سمجھ لو۔ میں چند دین بعد فون کروں گا۔ ”دوسری جانب اس نے لائن ڈس  
ہدی تھی۔

نہا کہنے۔ ذیل میں بات کر رہی تھی۔

وہ کریڈل پر ہاتھ مارنے لگی۔ حالانکہ وہ

..... "رہسور بخنک کر دینا، اتنا ہے۔"

وصاف کرنے لگی۔ ”تم طلاق نہیں دے سکتے تھے تو میں عیدالت جاؤں گی۔“

تھیں کہ راتے تھے۔ سبکیاں تھیں کہ ختم کرنے دیتی تھیں۔ ہر جگہ کمرے میں آکر رہتے

☆ ☆ ☆

۱۴- انہوں نے ایک جانب منیہ و بیہم جیٹھی تھیں اور دوسری طرف اینٹہ تھی۔ ندرے

ہے بے نیاز ایک بال کا احاطہ کرتا پھر اچھا لڑکھائی کرتا ہے۔

بہت بزدل اور خوش نظر آ رہا تھا۔ شہلا کا رخ امرتھ انڈیا کے طور پر نیا لباس پہنا تھا اور وہ اپنی حرکات

ایک شہسکی سی لکھی تھی۔

آپ کے کہنا نے بھی رکھ دیوں؟" رتبیہ نے قدرت سے آواز لگائی۔

یا کر دے تو کمپلا کرنا ان سے۔" "یا انہیں بیس چموز جاؤ۔"

”اِس نے بے نیازی سے سر ہلایا۔ ”وُسے بھی ہالانے پر اُس کے

کالی سارے انہوں نے لے کر بھی رکھے ہیں۔

ناہوا شہلا کے قریب آیا اور اس کے گلے میں بازو ڈال کر ننگ گرا۔

اپ کو بتا ہے یہاں میرا روم سیٹ کروادیا ہے۔ اتنا اچھا اتنا اچھا۔ اگر تم بھی چاہو تو

پہا پنا انا چھا۔ پھا کہہ رہے تھے انہوں نے۔

کاسب سے خوبصورت کمر میرے لیے سیٹ کر دیا ہے۔ ماما! آپ کبھی آئیں گی۔ مجھ سے ملنے! میں آپ کو اپنی چیزیں دکھاؤں گا۔ پلیز ماما۔ آپ آئیں گی نا؟“ شملا کی آنکھوں سے چند قطرے نکل کر اس کے بالوں میں گم ہو گئے۔ اس نے سر اٹھا کر شملا کا چہرہ دیکھا۔

”ماما پلیز۔ آپ رو میں مت۔ میں مگنی فیل کرنے لگتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے آپ میری وجہ سے رو رہی ہیں۔ دیکھیں نا۔ آپ بھی وہاں انکل کے ساتھ گئی تھیں۔ میں تو نہیں رویا۔ آپ سے پراس جو کیا تھا میں۔ اب میں جا رہا ہوں تو آپ کیوں رو رہی ہیں۔“

”مے اپنے ہاتھ سے شملا کا چہرہ صاف کیا۔ شملا سک پر ہی۔ اس نے عمر کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ منہ زور سے دل سادینے والے انداز میں اس کے شانے پر بازو پھیلا دیا تھا۔

”بچے کو خوشی خوشی بھیجو شملا! کسی غیر کے نہیں اپنے باپ کے ساتھ جا رہا ہے۔ دل مضبوط رکھو بیٹا پھر اس نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں محسوس نہیں ہونے دے گا کہ عمر یہاں سے چلا گیا ہے۔ وہ روز عمر کو بھیجے گا۔ ہم روز اس سے ملیں گے۔ اسے پیار کریں۔ اگر دماغ سے سوچو تو یہی ٹھیک ہے۔ عمر کو باپ کے مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ تمام کی ضرورت ہے۔“

”نہیں سوچ سکتی دماغ سے۔“ اس کے بولنے میں سرگوشی کی۔ ”نہیں سوچ سکتی۔ محبت کے پاس صرف دل ہوتا ہے ای۔ دماغ تو اسے ملا ہی نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ کیا لگتا ہے لکیرا۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں عمر کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”ماما۔“ عمر نے اس کے انداز سے رویا سنا ہو گیا۔ ”آپ ایسے بی بی ہونہ کریں پلیز۔“ وہ نے میں بھی روؤں گا۔ مجھے آپ کے آنسوؤں سے رونا آ رہا ہے۔ ماما۔ آئی لو۔“

اس نے شملا کو پیار کیا۔ شملا نے اسے دیوانہ وار لپٹا لیا تھا۔ عجب منظر تھا۔ سب ہی کی ہلکی ہلکی نم تھیں اور دل آزار تھے۔

ہر باڑی کے باہر بجا و سب۔ چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ عمارت کے آگے دوڑنے والے لوگوں سے باہر کی جانب بڑھ کر چہرے پر حیرت اور اندر آیا تھا۔

”امی۔“ وہ منہ سے پتلی سے مخاطب ہوا۔ ”ابراہیم صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ چائے وغیرہ بھیج دیں۔“ ویسے وہ جلدی میں ہیں۔ فوراً کھانا جا رہے ہیں۔ بہر حال میں انہیں چائے کے لیے اندر لے آیا ہوں۔ آپ بھی مل لیں اور۔“ وہ منہ سے پتلی سے مخاطب ہوئی۔ ”کوئی عطا نہیں۔“

نمر کہ چند لمحوں میں شروالی خوشی شملا کے آنسو دیکھ کر ہول چکی تھی۔ وہ خوفزدہ سا نظر آ رہا تھا۔ شملا نے اس کی صحت دیکھی۔ ”اے۔“

”نمر۔“ وہ منہ سے پتلی میں بولی۔ ”تمہارے پیارے آگئے ہیں۔“

”ماما۔“ وہ رویا سنا رہا تھا۔ ”پہلی چلیں تا میرے ساتھ۔“ وہ کہہ رہے تھے اگر آپ جاہیں تو۔“

”نمر۔“ انیکہ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ ”ڈونٹ ٹاک مان سینس۔“ ماما کو تنگ نہ کرو جانو۔ وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔ چاہے ہم تمہارے ساتھ ملے ہیں۔ کم آن۔“ شملا نے لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ انیکہ نے نری سے اسے چہرے کی کوشش کی۔

”انیکہ۔ میں مر جاؤں گی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”آئی۔ پلیز۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”انیکہ۔ میں مر جاؤں گی۔“ وہ پھر سسکی۔ ”اس سے جا کر کہو مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ پلیز۔“





ماہنامہ عمان (273) مارچ 2007

”بائیں۔“ عذرا بیگم حیرن گئیں۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ ایسا کہیں ہوا ہے کہ بڑا بیٹا کیرے بنانا چاہتا ہے اور یہمو ناجو ابھی نوکری پر بھی نہیں لگا اس کی شادی کر دوں؟ پھر رابعہ کیا سوچیں گی؟“

”تمہیں رابعہ کی فکر کیوں ہے بسو؟ رابعہ میری بیٹی ہے میں اسے تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ وہ کچھ نہیں سوچے گی۔ دراصل یہ مشورہ میں نے اس لیے دیا ہے کہ فردوس بیگم، عریضہ کے لیے فکر مند ہیں۔ وہ کچھ بیمار رہتی ہے اور ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اس کا علاج جلد از جلد شادی ہے۔ نافع نوکری پر نہیں ہے تو کیا ہوا، ہم خدا نخواستہ بھوکوں نہیں مرتے۔“

”عمریشہ؟“ عذرا بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔  
 ”پتہ نہیں۔“ پھر وہ نے دنا سے بولیں۔ ”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ کچھ بھی صحیح نہیں لگ رہا ہے۔ جب صحیح ہے نہیں تو کیا خاک لگے گا اور آپ اماں! آپ رافع کی بے جا حمایت کر رہی ہیں۔ میں کلبھوتہ سے کہوں گی کہ وہ خود رافع سے بات کریں۔ بعض معاملات گھر کے آدمیوں کے بس میں ہی ہوتے ہیں۔ وہی نمٹائیں۔“  
 ”تم بے فکر رہو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری مانو تو نافع سے بات کرو۔ فردوس نے کہلوایا نہ ہوتا تو میں زبان نہ کھولتی۔ ایسا کرنے میں حرج کیا ہے؟“ عجب! ملا نیلادہ عمریشہ کی مسہلیاں ہیں بچپن سے اچھا ہے تینوں ساتھ رہتے ہوں خیر ہے۔  
 ”اور بے چاری! وہ؟“ وہ شکایت سے بولیں۔

”اللہ مالک ہے۔ اگلے برس سی۔“  
”تپ پٹاں بالکل نہیں سمجھ رہیں۔ بالکل رافع کی طرح۔“ عذرا بیگم ان سے بالکل مایوس ہو گئیں۔

UrduPhoto.com

وہ سخت غم و غصے کی کیفیت کا شکار تھا۔ کسی بھرے ہوئے سیر کی مانند کمرے میں ٹھہل رہا تھا۔ فریجہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے انداز دیکھ کر قدرے سہم سی گئی۔

”ایسا بات ہے؟“ ماما نے تھوڑی ڈال کر اس نے بے رخی سے پوچھا۔  
 ”فراز بھائی! مجھ سے کیوں اچھے طرح بات کر رہے ہیں۔“ وہ روہانسی ہو کر کہنے لگی۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“  
 ”تم خیر امی، سمجھاتی کیوں نہیں ہو۔“ وہ ہنسنا شروع کرتا تھا۔ ”وہ بہن کا چہرہ دیکھ کر قند رے نرم پر  
 آیا۔ ”امی آج تک ہماری بربرابلم کو سمجھتی آئی ہیں۔ ہماری بات ماننی آتی ہیں پھر زندگی کے اتنے اہم فیصلے لگے  
 متعلق ان مارویہ اس طرح ٹاکے دل بے؟“

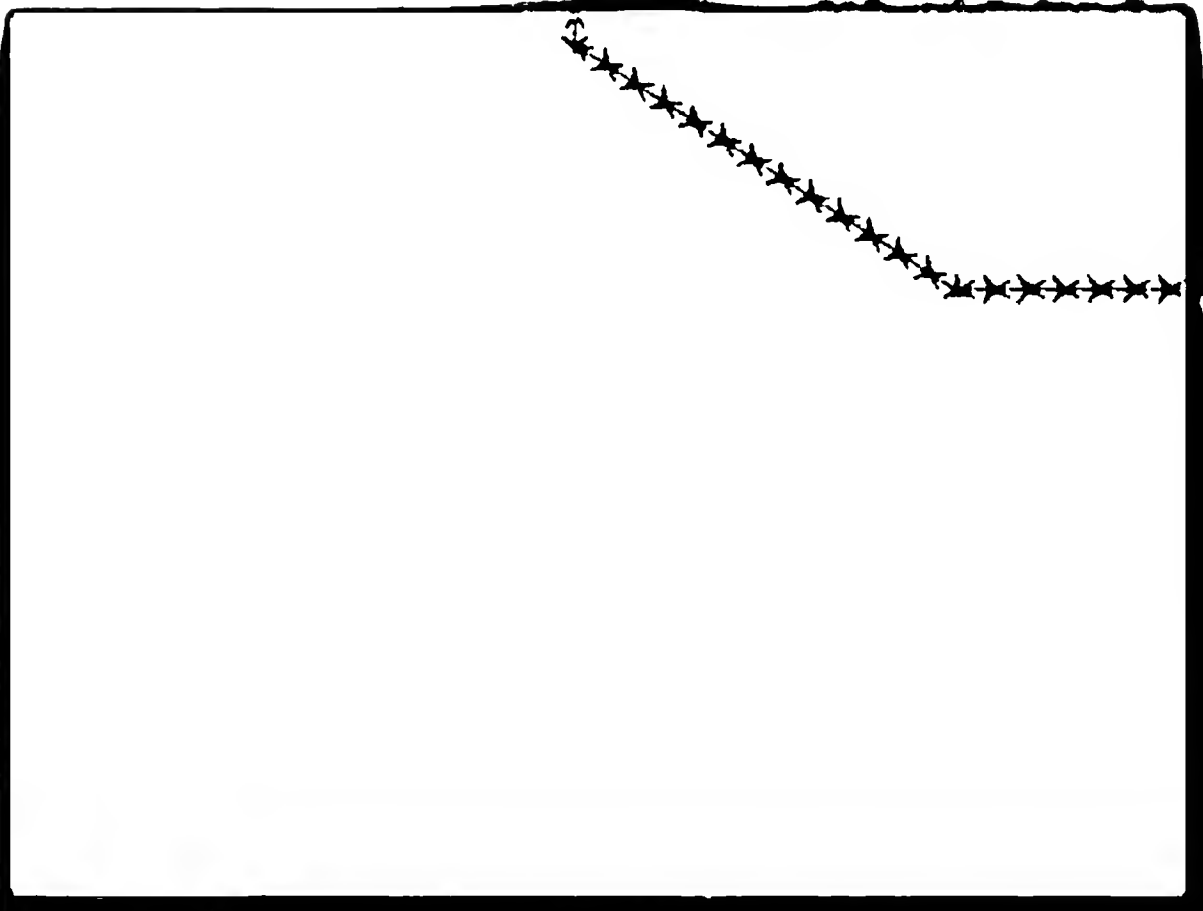
[illegible]

مجلس علماء ہندوستان  
مجلس علماء ہندوستان  
مجلس علماء ہندوستان

مجلس علماء ہندوستان  
مجلس علماء ہندوستان  
مجلس علماء ہندوستان

مجلس علماء ہندوستان

Us: a p. 10t













کاربر ہوا تھا۔  
 "اے! وہ طہر سے ہنس دیا۔" رنکی: وہاں آجوک مس ناعمہ!"  
 "یہ مذاق نہیں ہے فراز! حقیقت ہے۔ چاہے آپ مائیں یا نہ مائیں۔"  
 فراز چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

"مسلّم میں یہ ایسی ہیج منٹ توڑنا چاہتا ہوں ناعمہ" بکھرہ ہوا تھا۔ "میں اعتراف کرتا ہوں کہ رنکی کھیل کا جواب بھی دے دے میرے ساتھ کھیلے۔ ہر چند کہ تمہارا اصرار ہے کہ تم فینس چھیں۔ تاہم میں اس سے انکار کرتا ہوں۔ تم چھو ہو۔ وہ فینس لڑی اور میں۔ میں تم جیسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔"  
 ناعمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔  
 "بھئی آپ کی مرضی۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "میں ایک نمبر ہونے پر اصرار نہیں کرتی۔ آپ ہو جائیں۔"

فراز نے غصے سے سانس پھینچی تھی۔  
 "تھک تھک آئی دل شوٹ ہو۔"

ناعمہ خاموش کھڑی رہی۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔  
 "تمہیں۔۔۔ تمہیں خود اس شکلی سے انکار کرتا ہو گا مس ناعمہ۔" بولے گھر والوں سے کہو۔  
 اس شادی کے لیے میرے گھر والوں سے معذرت کر لیں۔"  
 "میں۔۔۔" وہ کھڑکی۔ "میں بھلا کیسے کہہ سکتی ہوں؟"  
 "جیسے۔۔۔ تم سے محبت کے اقرار کیے تھے۔" وہ طہر سے بولا۔ "ان ہی لمحوں سے کہو جن سے تمہیں رجوع ہونے کی عادت ہے۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن میرے پاس کیا جواز ہے اس انکار کے؟"  
 "جواز کھڑے تو نہیں خوب آتے ہر۔۔۔ اے۔۔۔ کس۔۔۔ جبروری کا دروازہ دو۔"  
 "دیکھیں فراز! پلیز۔"  
 "تب یاد رکھنا۔ میں تمہاری زندگی برباد کر دوں گا۔ ساری عمرات سے قبر کی رات تک۔ تم ہر رات۔۔۔ کی۔۔۔ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

"فراز! فراز! پلیز! ناعمہ کی صبح تک کانپ گئی تھی۔  
 "میں بھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے اسے استعمال کرو۔ مجھ سے شادی سے انکار کرنا۔۔۔"

انکار۔۔۔  
 "لیکن۔۔۔ لیکن آپ مجھ سے ایسا کیوں چاہتے ہیں؟" اس کے ہاتھ کھپکھپا رہے تھے اور توازن بھی۔  
 "میں لے لے کہ میں نے تمہارے لیے یہی سزا تجویز کی ہے اور تم نے کہا تھا کہ تم ہر سزا کے لیے تیار ہو۔ ہاؤ۔  
 پلے یور ورڈز۔"

"فراز۔"  
 دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ ناعمہ کھلی آنکھوں سے دیوار کو تکتے ہوئے اپنے دل کی آواز سن رہی تھی۔



"مجھے یہ کسی ذہنی شکاک کے دیرپا رنگ رہی ہیں۔" ڈاکٹر نے رافع کے کاندھے پر ہانڈ رکھ کر اسے کمرے کے

اس سے کچھ دور رکھ۔ کوئی مسئلہ ہے ان کے ساتھ؟"  
 "مسئلہ۔۔۔" رافع دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "مسئلہ تو ہے ڈاکٹر صاحب! پیچھو کے اپنے بندے سے کچھ اختلافات چل رہے ہیں لیکن۔۔۔ کوئی بہت نی یا اچانک لئے والی خبر نہیں ہے جو شک ثابت ہو۔  
 رانا مسئلہ ہے۔"

"پھر بھی۔۔۔ ان کی ذہنی کیفیت یہی کہہ رہی ہے۔ ہر حال انکیشن میں نے لگا دیا ہے ان کے اعصاب قدرے خون۔۔۔ وجہ اس کے سو کر انھیں کی تو بہتر محسوس کریں گی۔ بخار تو ویسے بھی اتنی ہی گیا ہے پھر بھی دو اور دن کٹنی تیر کریں گے۔"

"انی ڈاکٹر صاحب! تعذیبک ہو۔"

"میں اب چلا ہوں۔ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کریں۔ شاید انہوں نے رست ٹینشن سہلی ہے۔"  
 "ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ ہیں کھڑا کچھ سوچا رہا۔

رانے کی حالت کی توازن پر دوچٹکا۔

"نی ڈاکٹر! کیا ہے؟" وہ کھڑکی کی جانب بھاٹھا۔

"کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر! تمہیں باہر جانے کی کیا؟" نہیں تشویش تھی۔

"کچھ نہیں وادی جان! پیچھو یا انکل ٹھیک ہیں۔ صرف ٹینشن ہے اور کچھ نہیں۔" وہ کمری پر بیٹھے ہوئے بولا۔

ایسا انکیشن کے زیر اثر اب کمری خند سوچتی تھی۔ اس کے نفس کا وہ جزو اس کی ہر سکون خند کا نماز تھا۔

"میرا خیال ہے بہت ہو چکا۔" رافع "جان کا درد دیکھتے ہوئے بولا۔" اب ہمیں اس مسئلے کے سنجیدہ حل کے

تلاش کرنی ہے۔"

"میں۔۔۔" وہ دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "عذرا بیگم نے آمیزگی۔" ذرا اسی منہ کے پیچھے اپنا کھر

خراب کر رہی ہے۔ رافع اہم عناصر میں سے بات کر دے۔ دیکھو کیا کہتے ہیں۔ اگر وہ مسئلہ سلجھانا چاہتے ہیں تو ہم

سہل کر انہیں کو مجبور کرنے کی کوشش کریں۔"

"نہیں ای! ہم نے سر ہلایا۔" رافع "جان کا درد دیکھتے ہوئے بولا۔" اب ہمیں اس مسئلے کے سنجیدہ حل کے

"تم ناشر سے بات کرو۔"

"جی۔۔۔ رات کو کرنا چاہتا ہوں۔"

و حیرت ہوا اس کے علم میں نہیں تھا کہ وہ وہ بھی دوسری ہوگی۔

"تھینک ہو۔" اس نے نظریں جڑا کر آہستگی سے کپ اٹھایا۔

وہ نرے لے کر آگے چلے گئی۔ رافع کا نظریں اتنا اس نے بے حد واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ وہ ایک عرصے

سے ان نظریں کو پڑھ رہی تھی۔ پہلے ان میں ایک خوش حالی سیٹھاسا کی اور اپنا نیت کا جو جذبہ ہوتا تھا عرصے سے اس

کی جگہ اجنبیت اور بے دلی نے لے رکھی تھی۔ وہ وہ جیسی حساس لڑکی کے لیے۔ تبدیلی اتنی غیر امنہ تھی کہ وہ

اسے محسوس ہی نہ کرتی۔ سب کو چاہئے کہ وہ وہ ان کی جانب بڑھ رہی تھی جب چانک رافع نے اسے پکار لیا۔

"کو۔۔۔"

و ٹھیک کر رہی۔ اس آواز میں اپنا نام اس نے رست عرصے بعد سنا تھا۔

"جی۔۔۔" وہ مڑی۔

”تمہیں پونیہ رشتی نہیں جارہی آج کل؟“

”نیدرلینڈ کی چھٹیاں ہیں۔ تو آہستگی سے بولی۔

رائع نے پھر کوئی سوال نہ کیا تھا اور درود بخانی تھی کہ اب اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی اور سوال نہ تھا۔



نچانے کس احساس کے تحت اس کی آنکھ کھلی تھی اس نے ذرا سا اٹھ کر دیکھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کے مین سامنے جو کمرہ تھا اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ابراہان اپنے بیڈ پر تباہ آسمانی مہرا بیڈ دیکھ سکتا تھا۔

اس نے دیکھا ”عمر اپنے بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ نکیہ گود میں دکھ کر اس پر کنڈیاں نکا کر اس نے ہاتھوں کے پیالے میں چور کھا ہوا تھا۔

ابراہان کے کمرے میں مائٹ بلب کی مدھم مدھم روشنی تھی لیکن عمر نے کمرے کی لائٹس آن کی ہوئی تھیں وہ بستر سے اتر کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھا تھا۔

”عمر بالی سن۔“ وہ اس کے قریب آئیندا۔ ”کیا بات ہے جان! سوئے نہیں رہے تھیں؟“

”نیدر نہیں آ رہی ہے ہا!“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کیوں؟ کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا ہوگا۔ بھوک لگی ہے؟“

”نہیں کل خوں نے دودھ دیا تھا وہ ٹین ڈال کر۔ میں نے پی لیا تھا۔“

”پھر نیند کیوں نہیں آ رہی؟“ ابراہان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”ہا!“ اس نے اکیلا نہیں سوتا تھا۔ ”وہ مجبوری سے بولا۔

”اوہ!“ ابراہان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”میں نے تمہارے کمرے کی جلدی تھی۔“

جیسے اپنے کمرے میں سوئے کی جلدی تھی۔

”کیونکہ میں بڑا ہونا چاہتا ہوں۔ بڑے لوگ اپنے کمرے کے اکیلے سوئے ہیں جیسے آپ۔“

ابراہان شرارت سے مسکراتے ہوئے ”میری جان تمہارے ہا!“ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں نے سوئے بھی اکیلے سوئے ہوں۔“

پسند نہیں کرتے۔

اس نے عمر کو ہاتھوں میں بھر لیا۔

”اور جب تک تم بڑے ہو گے تب تک ہم تمہاری دلہن بھی بنے آئیں گے۔“ عمر نے ہنسنا شروع کیا۔

چل کر سوئے۔ ”اس نے کمرے کے دروازے پر کھڑکیوں میں اٹھایا اور اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

”یہاں لیٹ جاؤ ہا کے برابر۔“ وہ کھانسی لگتی لگتی اٹھی نیند آئی ہے۔ کو تو ہوا تھیں ریڈ رائیڈنگ بڈ بھی سنا سکتے ہیں۔

تمہارا ہاتھ اتنے بھی ہلکا نہیں ہوتا کہ تم خیال کرتے ہو۔“

ابراہان جانتا تھا کہ اسے گروالوں کی یاد ہے طرح ستارہ سی ہے تب ہی وہ اس کا حیران باطنی کی کوشش کرنے لگا۔

اسے لگا کہ اس نے اپنا نکیہ بھی اس کے نیچے سے دوڑ کر دیکھا اور اس کے قریب لیٹ گیا۔

”ہاں تو جادو میری جان! گون سی کمانی سٹاکس؟ بالی داوے تمہارے ہا کو صرف دو کنڈیاں ہی یاد ہیں۔ ریڈ رائیڈ ٹیبلٹ اور طوطا پینٹ۔“

”میرے پاس بہت سی بکس ہیں ہا۔ آج خالہ کتنی ہیں کہ مجھے اب کمانی پڑھ کر سونا چاہیے۔ میں اتنا چور ہوں کہ کمانی سٹاکس پڑھنے میں زبان مرز آتا ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے چند سے غور کیا۔ ”جیسے کہ وہی ملدی ہوئے ہو کر کیا کرو گے یا رہا کو بڑھا

رہنے کی بہت جلدی ہے۔ تمہیں؟ ہم آجے دفن کی آس میں بیٹھے ہیں اور تم ہو کہ باور بخوان ہوئے کاڑوا دیتے

”آپ کیسے بوڑھے ہو سکتے ہیں۔ آپ تو اتنے شان واد ہیں اتنی اچھی باڈی ہے آپ کی۔“

”اوہ! ٹھیک ہے۔“ ٹھیک ہے۔ ”وہ ممنونیت سے بولا۔ ”ایسی ہی باتیں کیا کرو جن میں ہبا کی تعریف اور

تمہارا بچپنا نظر آئے۔“

عمر پھر خاموش ہو کر چمت کو گھورنے لگا۔

”ہا!“ آپ نے ماسے شادی کیوں کی تھی؟“

ابراہان نے تھری سانس بھر لی۔

”آپ کی مہاراجہ اچھی لگتی تھیں ہم نے شادی کر لی۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”پھر آپ کی ڈاکی دوس کیوں ہوئی؟“

”ہوں۔“ ابراہان نے لکھنوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ ”بس بیٹا! کبھی کبھار بڑے غلط سے آجاتے ہیں زندگی میں۔

انسان ناز دھا بھرا ہوا ہوگا۔ وہ ایسا ہی ایک لمحہ تھا۔ شبیطان غالب انسان مغلوب۔“

وہ اسی کے دھند لکھنوں میں بھاگنے لگا۔

”پھر آپ نے مجھے بھی مہا کو دے دیا تھا؟“

”تم۔“ وہ چونکا۔ ”میں تب تک تمہارے

دو خاموش ہو گیا۔ اس بات سے بے پروا کیا۔ ”سہا سکتا تھا۔“

”ہا!“ اس نے اس وقت آپ نے مجھے سے کہا تھا۔ ”میں نے اسے

میں نے اسے اس کی سہا سکتی تھی۔ ”میں نے اسے چکارا۔“ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ ہم سے

ملا ہو ہے۔ ہم اس کی سہا سکتے ہیں۔ سوئے کی پرنس کر رہے ہیں۔“

”ہا!“ وہ سوئے ہوئے بولا۔ ”مہا ایسی تمہاری کی؟“

”بالکل آئیں گی۔“ وہ بے حد تعجب سے بولا۔

”نہ ہا اسم انکل کو چھو دوں گی۔“

”ہا!“ عمر نے تمہارے لیے۔ ”میں نے مجھے یقین ہے۔“

”اسم انکل کو دیکھو ہا۔“ وہ متعجب ہے۔

”ہا!“ عمر نے اس کا ہاتھ دلا۔ ”میں نے اس کا ہاتھ دلا۔“

اکر تمہاری مہا کو یہاں لانا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے ہا کا ساتھ دینا پڑے گا۔ تمہیں اپنی مہا کو فورس کرنا پڑے گا۔

ابھی ادا بہت گرم ہو گا۔ چوٹ اٹھنی نکانا ہو گی۔“

”چوٹ۔“ وہ حیران ہوا۔ ”چوٹ کس کو لگے گی؟“

”خوب ہے کو۔“ وہ اپنے خیال سے لوٹ کر مسکرایا۔

”مہا کمال ہے؟“

”دو بے میں تمہاری مہا کے۔“

”کیا کہہ رہے ہیں ہا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“ وہ الجھ گیا۔

”کیونکہ تمہیں سخت نیند آ رہی ہے۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ لیٹ بچا دیا۔ ”اب سو جاؤ باقی باتیں کل

UrduPhoto.com





UrduPhoto.com

دور و خاموشی رہی۔ ربیعہ نے اس کا چہرہ دکھا۔

"تم کچھ خاموش خاموش سی ہو رہی ہو، آخر تو بے باک ہے۔"

"ہاں خیر ہے۔ ربیعہ ایک بات بتاؤ، تم نے کبھی کسی کو پسند کیا ہے؟" درود نے اچانک ہی پوچھا۔

ربیعہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

"نہیں۔ نہیں۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"نہیں کبھی کوئی اچھا نہیں لگا رہا ہے۔"

ربیعہ خود پر قابو پا کر ہنسنے لگی۔

"اب تک تو کوئی نہیں لگا، آئندہ کی خبر نہیں۔ جب بھی یہ ماجرہ ہو، تمہیں ضرور بتاؤں گی۔"

"پراسس؟" درود نے جلدی سے ہاتھ آگے کیا تھا۔

ربیعہ نے چونک کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔

"پراسس۔" پھر اس کی جینس پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔



"عجب۔ عجب۔" شملانے اس کے چہرے کے کئی پوسٹ لے لیا۔ اس کے بالوں کو چومے۔ "میرا بیٹا۔ میری

جانب۔"

"آپ مجھے یاد کر رہی تھیں ماما!"

"ہاں! میری جان۔ بہت مست یاد کر رہی تھی میں تب کہ۔"

"میں بھی آپ کو یاد کر رہا تھا ماما! آپ کو ایسا لگا ہو گا جیسے میں آپ کو اس گھر میں گر رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا۔"

"تجربہ مس کر رہی ہیں۔"

"میں بہت مس کر رہی تھی آپ کو یہ سب تب کہ میں گڑبڑا رہی تھی۔"

دونوں میں بیٹا ساتھ ساتھ گئے گئے سکھ سکھ رہے تھے۔

"آپ خوش ہو عمر؟" پھر شملانے آستین سے پوچھا۔

"جی ماما! میں بہت خوش ہوں۔ بہت بہت خوش ہیں۔ ان کا گھر بھی بہت اچھا ہے۔"

"آج تھا۔" وہ آڑھیں سے بولی۔

"ماما! آپ باشم انکل سے کہیں وہ آپ کو چھوڑ دیں۔"

"عمر! شملانے کو یکدم ہلکے سا شاک سا لگا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ماما! پلیز۔ ہمارا گھر پھر سے بن جائے گا۔ مجھے ماما بھی مل جائیں گی اور بہا بھی۔"

"آپ کب پلیز ہمارے پاس آجائیں۔"

"عمر! خدا کے لیے سب کو اللہ۔"

"ماما! اگر تب کہیں تو میں باشم انکل سے بات کرتا ہوں وہ ضرور میری بات سمجھ جائیں گے، وہ بہت اچھے۔"

"مہ۔" وہ سناٹے میں اس میں کوئی شک نہیں ہے اور بیٹا! اچھے لوگوں کو دیکھ نہیں دیا کرتے۔"

بڑے بچے جھپکا جھپکا کر آنسو روکے۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ غلطی سے منہ پھٹا کر بولا۔ "آپ کو میرے لیے یہ سب کچھ کرنا ہو گا ماما! مجھے آپ چاہئیں۔"

اپنی ماں چاہیے۔ پلیز ماما۔"

شملانہ خود بخود۔

"مہ۔ نہیں۔ تمہارے یہاں یہ سب کچھ سکھایا ہے۔ اتنی جلدی؟ تم ان کی باتوں میں ڈکرتے مجھے مجبور

کرت کر بیٹا۔ میں ساری زندگی خود سے نظر نہیں ملایاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے ماما! پھر آپ مجھے بھی فورس مت کرنا کہ میں یہاں آکر آپ سے ضرور ملوں۔" اس کی آواز زندہ

ہوئی۔

شملانہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اسے لگا اس کا دل مطلق کے رستے باہر آنا چاہتا ہے۔ اس مرتبہ کی

گھر بہت دور کی تھی۔ شملانہ اس کا ہاتھ پکڑے۔



دل دہان بالکل سن ہو رہے تھے۔ وہ بہت آہستہ چلتے چلتے لان کے آخری کونے تک آگئی تھی۔ اسے واضح

تجربہ تھا کہ اگر اس کے ساتھ اس کے بچے نہ بیٹھتے تو اس کی کیفیت میں وہ بیٹھتا صرف اور صرف خود کشی کے

نتیجے ہی سوچتی۔ کچھ ایسا کرنے کا بھی چاہتا تھا کہ ساری دنیا میں ایک دور دراز گونج اٹھے۔ ہر کوئی چونک اٹھے اور

پوچھ لے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ شملانہ نے آواز سے وہ چونکی۔ کوئی آہستہ اندھیرے میں آنے والے

لے کر آئے۔ شملانہ نے ایک لمحہ کے لیے اس کی طرف دیکھی۔

"کون۔؟" اس نے پکارا۔

"ہم ہیں۔ اختر میاں۔" وہ قریب آگئے۔ "ایقان بیگم۔ آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں۔ اتنی

رات کے۔"

"خاک چھانک رہی ہوں۔ تمہارے بچے۔" وہ تلی سے بولی۔ "آپ کہیے۔ آوارگی کو اب تک گزار نہیں آیا۔"

اختر میاں افسردہ سا ہنسنے لگی۔

"دعنا! وہ بچہ مجھے تم ہو گیا ہے ایقان بیگم! کیا کریں۔"

دعنا! ایقان نے ان کی جانب دیکھا پھر وہ کھنکھاتی ہی رہی۔ اندھیرے میں اختر میاں کی ناامید لہجہ آنکھیں

افسردہ لگتی تھیں۔

"اختر میاں۔"

"جی۔"

"آپ مجھ سے شادی کریں گے؟ اگر میں عاشرہ سے طلاق لے لوں تو؟"

اختر میاں سن کر رہ گئیں۔

مائی لینا شملانہ کے سینے

اختر میاں یوں کھڑے تھے گویا مٹی کا بے جان بت ہوں حتیٰ کہ ان کے وجود میں سانس کی جنبش تک محسوس نہ ہوتی تھی۔ ایقان نے اپنی بات کہہ کر تو ڈالی بھی لیکن اب اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا پورا وجود ایک آگ کے گولے میں تبدیل ہو گیا ہو۔ اس کی سانس رحو کئی کی مانند چل رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ بس چند ہی لمحوں میں وہ پوری کی پوری دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائے گی۔

ایقان بیگم! "احترامیاں کے بت میں سے لرزتی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ہم ایک بے توقیر ذرے سے درخشاں ستارہ بن جائیں گے۔ ہم نے تو آپ سنے میں بھی یہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے اور آپ ہمیں حقیقت میں نہیں۔ شاید آپ ہم سے مذاق کر رہی ہیں آپ آج بھی وہی ایقان ہیں شوخ، زندہ دل، غصیلی، کاناچ سے بنی ہوئی اور سب کاناچ کی طرح توڑ دینے والی ایقان۔"

انہی آواز بھرائی تھی۔ ایقان جواب گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، چونکے بنانہ رہ سکی۔  
 ”آخر میاں! آپ کی ہی بد دعا لگی شاید۔“ وہ آستکی سے بولی جیسے نیند میں محو کلام ہو، ”دور بندہ اور کسی کا تو  
 کبھی نہیں دکھایا میں نے۔“

”ہم نے تو ہمیشہ آپ کے لیے دعا کی ہے۔“ وہ جیسے منمنائے۔ ”اور ہمیشہ پکڑھٹے رہیں گے۔ لیکن ابھی کچھ دیر قبل جو آپ نے کہا اسے سن کر تو ہر غم کا نشہ اتر گیا ہمارے سر پر سے۔ ہم سمجھ نہیں پائے کہ ہم حواسوں میں لوٹے ہیں یا حواسوں سے حقیقتاً بے گانہ ہو گئے ہیں۔ آپ کیسے ایسا کیوں کہا؟ کیسب یہ مہربانی ہمارے نصیب پر؟“

”جانتی نہیں۔“ ڈیٹلی سے ہنس پڑی۔ ”یہ آپ کے نصیب پر مہر لانی ہے یا پھر اپنے نصیبوں سے بے مہر کی انتہا ہے جو کچھ بھی سمجھ لیجیے اسے۔ لیکن اتنا یقین کر لیں کہ میں نے نہ آپ سے خیانت کیا ہے نہ حضور سے۔ میں نے کسی میں بھی نہیں ہوں اور فینڈ میں بھی نہیں ہوں۔ میں نے اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ یہ بات کہی ہے اور اب آپ کے جواب کی منتظر ہوں میں۔ بتائیے ایک مطلقہ کی حیثیت سے اپنا میں گئے مجھے؟“

”ہم نے کیا پتہ کیا ہے آپ کو ایقان!“ آخر میاں جو تین جذبات سے پھٹی ہوئی آواز میں بولے تھے۔ ”ہم تو سر سے پاؤں تک آپ کے بن جائیں گے۔ پھر کھو کر بھی ماریں گی تو آپ کی چونکٹ سے نہ انھیں گے ہم۔ قسم لے لیں ہم۔“

”قسموں وعدوں کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ تلخ انداز میں بولی۔ ”آپ نے گھر دیا، تمہیں کافی ہے۔ اب آپ جائیں اور ہاں پھر منہ اٹھا کر کہیں چل مت پڑیے گا۔ پتا چلے کہ عین موقع پر آپ کے نام کی دھڑکنی ہو اور دیا آپ دھواں سے بے گانہ کسی گلی میں پڑے سو رہے ہوں۔“

”لعنت ہو ہماری صورت پر اگر ہم ایسا کریں تو۔“ وہ جذباتی ہوئے ”ہم تو آج سے ہی گھر سے ٹھٹھنا چھوڑ دیں گے۔“

”جی ہاں۔۔۔“ وہ کھول اٹھی تھی۔ ”میں عدت میں بیٹھتی ہوں۔۔۔ آپ بایوں بیٹھ جائیں۔“ آخر میاں لرزے گئے تھے۔

”یقیناً بیگم! ایک۔ ایک بات پوچھیں آپ سے۔ یہ اچانک آپ کو کیا ہوا؟ ایک ہنسی بستی زندگی سے منہ موڑ کر آپ ہم سے دیوانے سے یہ کیا مانگ رہی ہیں؟ ہم تو اپنا دیوانہ پن ہی دے سکتے ہیں آپ کو۔۔۔ آپ کی زندگی کو کسی بہار کی نوید نہیں سنایا میں تجھے ہم۔۔۔“

ایقان نے زخم زخم نظروں سے اندھیرے میں ان کے اجاز نقوش کو دیکھا تھا۔  
 ”میری زندگی کو کسی بہار کی ضرورت نہیں رہی اختر میاں! یہاں تو بس ہر شے کو جلا کر راکھ بنا دینے کی تمنا

میں اپنے جلنے کا تماشا آپ دیکھنا چاہتی ہوں۔ بسنا چاہتی ہوں اپنی راکھ پر۔“

ایقان اور اختر میاں دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ پھر یکدم ہی رافع سامنے آگیا تھا۔  
 ”پچھو! آپ یہاں ہیں؟ اس وقت؟“ وہ سخت حیران تھا اور اختر میاں! یہ آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے

اخترمیاں کی شمی غم ہو گئی لیکن ایقان کے جامد انداز میں فرق نہ آیا تھا۔  
 ”نہیں نہیں آ رہی تھی راضی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”ایک جگہ سی برپا تھی و جو میں‘ میں کچھ دیر شلنے کے  
 لے رہا تھا۔ اور۔۔۔ اخترمیاں ان کی اختر شمار یوں سے کون واقف نہیں ہے۔“

لے یہاں انہی سے اور بیسہ سڑمیاں ان کی سڑمیاں کے لیے لے رہی تھیں۔ رافع نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا ”چلیں اندر سے آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ آپ کو آرام کی کتنی ضرورت ہے۔ پھر ڈاکٹر نے خاص طور پر آپ کو مینشن سے دو رہنے کے لیے کہا ہے۔ اس طرح راتوں کو جاگ کر سوائے مینشن کے کیا حاصل ہوتا ہے بھلا؟“ وہ اسے اپنے ساتھ لیے اس کے پورشن کی طرف جانے لگا۔

”بچوں کو اکیلا ہی چھوڑ آئی ہیں؟ اگر سوئے تھے ہیں ڈر جائیں تو؟ آپ لوھر میں نہ پاروہ میں ندرد سربا ہوئے ہیں؟ کچھ اندازہ ہے آپ کو؟“

”رافع۔“ وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ ”اگر میں مراؤں رافع تو شہلا سے کہنا میرے بچوں کو وہ

Urdu

”ایک دو گولیوں سے فرق نہیں پڑتا رافع!“ وہ بچوں کی طرح بولی۔ ”پھر دل چاہتا ہے کہ روز بینہ کی سبقت  
ساجت کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی پوری شیشی کھا کر ایک بار موت کی دعوت ہی کر ڈالے۔“  
”خدا کا واسطہ ہے پچھو سن!“ وہ اس کے روازے کے سامنے ٹک گیا۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ کو میں

نے کبھی ایسا تصور نہیں کیا تھا۔ اقدی مولیت نے اس قدر جذباتی پن سے شادی شدہ زندگی میں بڑے بڑے معترضے سر کرنے پر مجبور ہونے پر پچھو۔ آپ تو بہت دلوں کو نکلیں۔

”جواب دے سو جاؤ۔ اتنی رات کو تم کس لیے جاگ رہے ہو؟“ اس نے گہری سانس بھری تھی۔ ”جاؤ۔ سو جاؤ۔ اتنی رات کو تم کس لیے جاگ رہے ہو؟“

”میرا میدان کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں ڈیر سچ چھنڈا! ایک مصرعہ اٹک گیا تھا زہن میں سو بھائیں نکالنے کے لیے۔“

دودھ پینے اور اپنے بچوں کے ساتھ سکون سے لیٹیں۔۔۔ پھر میں جاؤں گا۔“  
 ”روائی میں کھانوں گی۔۔۔ دودھ بھی پی لوں گی۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”بچوں کے ساتھ لیٹ بھی جاؤں گی  
 لکڑی کے گھر میں۔۔۔ راجہ، میں نہیں اس لیے تم جاؤ۔ اپنا وقت مجھ تکم نصیب کے لیے خراب مت

لیکن سکون؟ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہاؤس چھوڑنے کے بعد آخر کو انسان ہوں۔“

سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ بھروسہ کیجیے۔۔۔  
 ”جانتی ہوں رافعہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے جیسے سرگوشی کی تھی۔

”اب میں چلوں؟“ وہ مشکوک سا تھا۔  
 ”ہاں تم جاؤ۔ شب بخیر۔“ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔  
 رافع پریشان سا کالی دیروہیں کھڑا رہا تھا۔

\*\*\*

”ای جی۔۔۔!“ درد کافی گھبرائی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔ ”یہ ان لوگوں کا ہر کام ایسے جلد بازی اور افراتفری میں ہی کیوں ہوتا ہے بھلا؟ انہیں سکون و اطمینان کے معنی نہیں آتے کیا؟“  
 ”کیا ہوا؟ خدا خیر کرے۔“ رابعہ بیگم گھبراہٹ میں کہتی تھی۔ ”کس کی بات کر رہی ہو؟“  
 ”فراز کے گھر والوں کی۔۔۔ اب ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ان کے سروں پر ریوالتا ہے۔ کھڑا ہے۔ ابھی فریج کا فون آیا تھا۔ کہنے لگی ہم لوگ آپ کے گھر آ رہے ہیں۔ میں نے کہا ضرور آؤ۔ سر آنکھوں پر تپ بولی۔ ہم شادی کی تاریخ رکھنے آ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اس موقع پر بہت خاص قسم کے لڈو بنوائے جاتے ہیں لیکن چونکہ وقت کم ہے اس لیے کس مٹھائی کے ٹوکے بنوائے ہیں۔ آپ لوگ پسند کر لیں گے یا؟“  
 ”ہائیں!“ رابعہ بیگم بھی چونک کر کھڑی ہو گئیں۔ ”تاریخ رکھنے؟ یوں اچانک؟“  
 ”جی ہاں!“ وہ تپتی ہوئی تھی۔ ”ہے کوئی شام کی تقریب پر سروس جمائے کی؟ اب شام تک دعوت کا بندوبست کرنا آسان کام ہے بھلا؟ اس نے کہا ہے کہ قریباً آٹھ دس افراد ہوں گے۔“  
 ”لیکن ہم بھی تو اپنے سب ہی رشتے داروں کو بلا میں گے۔ اس طرح پچاس ساٹھ افراد تو بن جاتے ہیں۔“ رابعہ بیگم کے چہرے پر پریشانی جھلکنے لگی۔

”بخیر آپ نیشن نہ لیں۔“ درد نے ان کی صورت دیکھ کر فوراً انہی پر سکون انداز لیا۔ ”سب ہو جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔ ہم بازار سے پکایا کھانا منگوا لیتے ہیں۔“  
 ”ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔ ”میں رافع جیسے کتنی ہوں وہی انتظام سنبھالے گا۔“  
 ”ای جی۔!“ درد آہستگی سے بولی تھی۔ ”ہاشم بھائی بھی تو ہیں گاؤں جزوہ اور علی بھی اتنے چھوٹے نہیں ہیں۔ میں بڑے ماموں کے یہاں جا رہی ہوں۔ انہیں شام کی دعوت بھی دے دینی تو ہون اور کھانے کے متعلق بھی سارا کچھ ڈسکس کر لوں گی۔ آج چھٹی کا دن ہے۔ ابھی سب گھر پر ہی ہوں گے۔ وہ میزوں کی بکری سارا انتظام سنبھال لیں گے۔“

”اچھا! جیسے تمہاری مرضی۔“ رابعہ بیگم چپ سی ہو گئیں پھر جیسے انہیں خیال آیا تھا۔

”آج چھٹی ہے۔۔۔ بینک سے پیسے بھی نکلوانے ہوں گے۔“  
 ”کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔“ اے ٹی ایم سے نکال لوں گی میں۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں سب بالکل خیریت سے ہو جائے گا۔“

وہ پلٹ کر جانے لگی تھی۔

”بات سنو درد!“ رابعہ بیگم نے اسے پکارا۔

”جی ای۔!“ وہ اٹھ لڑھکیوں پلٹ آئی۔

”وہ لوگ۔۔۔ کب کی تاریخ رکھنے کا کہہ رہے ہیں؟“ وہ قدرے فکر مندی پوچھتے لگیں۔

”میرا خیال ہے اگلے چاند کی کوئی تاریخ۔“

”ہائیں۔!“ وہ سچائی کہیں۔ ”اس قدر افراتفری؟ تم ٹھیک کہہ رہی ہو ان کا کوئی کام بھی جلد بازی سے خالی

نہیں ہے۔ یہ ناعمہ ہے کہاں؟“

”سورہی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اٹھاؤ اسے۔۔۔“ وہ جھلا میں۔ ”ہم یہاں دبلے ہوئے جا رہے ہیں اور وہ ٹھانڈے سے بستر کی سیر کر رہی ہے بلکہ

تم جاؤ میں خود جگاتی ہوں اسے۔“

”بستر کی سیر؟“ درد کو ہنسی آگئی۔ ”تب ہی اکثر پٹنگ سے نیچے گر جاتی ہیں محترمہ۔ فراز کو کھنا پڑے گا کہ اس

کے سائیڈ میں تکیہ لگا دیا کرے۔“

رابعہ بیگم بھی ساری فکر بھول کر ہنس پڑی تھیں۔

\*\*\*

شیشے کا پیرونی دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ فردوس بیگم سامنے ہی صوفے پر براجمان ہرے پتے

”السلام علیکم ممانی جان!“ درد ان کے قریب جا بیٹھی۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے نوکری پرے کی۔ ”آؤ بھئی عرصے بعد شغل دکھائی ہے تم

نے لگتا ہے کوئی خاص کام ہے آج ہم کو کوئی سے۔ کیوں؟“

درد دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

”ٹھیک سمجھی ہیں آپ۔ بہت ذہین ممانی ہیں آپ میری۔“

”ہاں ہاں۔۔۔ یہ تو سنا سننے کی بات ہے۔“ درد نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”یوں تو ہم بہت کڑھ مغز ہیں ذہین تو تمہاری چھوٹی ممانی ضرور ہوں

اپنی بات سے محفوظ ہو کر انہوں نے خود ہی قہقہہ لگایا۔ درد بھی دھیرے دھیرے ان کی بے تکی ہنسی میں

شریک ہوئی تھی۔

”اچھا! کوسے کیسے آنا ہوا؟“ نہیں فوراً ہی اصل بات یاد آگئی۔

”آج شام ہمارے ہاں آپ سب کی دعوت ہے۔ اصل میں ابھی ابھی فریج کا فون آیا تھا۔ وہ لوگ ناعمہ

کے لیے تاریخ لینے آ رہے ہیں۔ اس موقع پر آپ سب لوگوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔“

”ناعمہ کی تاریخ؟“ ان کا منہ کھل گیا۔ ”شادی کی تاریخ؟“

”جی ہاں۔“ وہ ان کے انداز سے قدرے گھبراہٹ ہو گئی۔ ”شادی کی ہی تاریخ رکھنا ہے ممانی!“

”اور تم اب بتا رہی ہو۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”بخیر۔۔۔ شکوہ بے جا ہے۔ پہلے کون سا تم لوگوں نے کسی بات میں

شریک کیا ہے جواب کرو گے۔ مہمانوں کی طرح وقت سے ہلاتے ہو۔ ہم بھی مہمانوں کی طرح ہی آئیں گے۔“

انہوں نے ذہن نہ توکری اپنے آگے کر لی اور چپنے نکالنے لگیں۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے ممانی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ابھی فریج کا فون آیا ہے اور میں ابھی آپ کے پاس

چلی آئی ہوں۔ بلکہ آپ یوں یقین کریں کہ اگر جنٹ نوٹس پر کھانا بھی پکا ہوا منگوانا ہے اور مجھے اس سلسلے میں ہاشم

بھائی اور جزوہ سے بھی مشورہ کرنا ہے۔“

”مگر مشورہ۔۔۔“ وہ بے نیازی سے بولیں۔ ”ہم نے کب روکا ہے۔“ پھر دفعہاً ”ان کے ہاتھ رکے تھے ان کے انداز میں یکدم ہی اپنا سیت در آئی۔“

”خیر تم فکر مت کرو۔ رائہ آتی ہی ہوگی۔ خود ہی سمجھا دے گی تمہیں سب کچھ۔ اتنا پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ موقع تو خوش ہونے کے ہوتے ہیں بیٹا۔ لڑکیاں تو انجوائے کرتی ہیں ان چھوٹی چھوٹی رسموں کو۔ تمہارا تو رنگ یوں اڑ گیا ہے جیسے کپڑے پر ہلیج چڑھا دیا۔“

”اُمی! اس کی آنکھیں بھر آئیں۔“ چتا نہیں مجھے ڈر بہت لگ رہا ہے!“  
 رابعہ بیگم کو بے اختیار ہی اس پر پیار آیا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔  
 ”آپ۔ آپ۔ آپ ان لوگوں کو منع کریں۔“

”ناعمہ! وہ حد درجہ حیران ہوئیں۔“ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ خوشی کے موقعوں پر ایسی بے سروبا باتیں منہ سے نہیں نکالتے بیٹی!“  
 پھر وہ قدرے اداس ہوئی تھیں۔

”تمہارے والد اگر زندہ ہوتے۔ تو کیسی تسلی ہوتی مجھے۔ اس وقت تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ایک کار دشوار ہے۔“  
 رابعہ بیگم کا بوجھ تھا ناٹھنا تھا۔ بہت کم حوصلہ ہو رہی ہوں میں اور تم ایسی صورت بنا کر اور ایسی فضول باتیں کر کے مجھے مزید بے حوصلہ کر رہی ہو۔ خدا کے لیے سب اچھا بولو۔ کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نہ نکلے۔“  
 ”لیکن اُمی جی! پہلے درد آتی کا کچھ تھا!“ وہ کچھ اور سمجھ میں نہ آنے پر احتجاجا بولی۔

”یہ سب تو اللہ کو بتا ہے بیٹا جی! یہ لکھا ہوا ہے کہ اس نے اگر تمہاری خوشی درد سے پہلے لکھی ہے تو اس کی کوئی مصلحت ہوگی۔ یہ باتیں ایسی نہیں کہ انہیں زیادہ سوچا جائے۔ پھر وہ مطمئن ہے تو تمہیں کاہے کی فکر؟  
 درد میری بہت پیاری بچی ہے مجھے فخر ہے اس پر۔“

”میں بلا رہی نہیں ہوں!“ اس نے منہ بسور آ کر کہا۔  
 ”یہ میں نے کہا تھا کہ اس کے ساتھ کتنی شہنی کی شہنی میں ہے۔ اب کبھی سوچتی ہوں تو افسوس بھی ہوتا ہے۔“  
 رائہ سے پوچھو اس کے ساتھ کتنی شہنی کی شہنی میں ہے۔ اب کبھی سوچتی ہوں تو افسوس بھی ہوتا ہے۔“

وہ بچانے کیا کچھ سوچنے لگی تھیں۔ پھر کچھ خیال آگئے پر چونک اٹھیں۔  
 ”اچھا خیر۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ وقت شائع مت کرو کپڑے ایک مرتبہ پہن کر فنگ وغیرہ چیک کر لو۔  
 کہیں عین وقت پر کچھ کام نہ نکل آئے تو اس کے ساتھ مل کر فائٹ گھر کو سدھار لو۔ میں ذرا ماں جی کی طرف جاتی ہوں۔“

”جی! اس نے منہ بسور آ کر کہا۔“  
 رابعہ بیگم کے جانے کے بعد وہ بے کلی سے ٹھننے لگی تھی۔ شادی کی رات سے قبر کی رات تک رونے کا تصور انتہائی لرزہ خیز اور جان لیوا قسم کا تھا لیکن وہ اپنے پارے میں بھی جانتی تھی۔ اس سلسلے میں اس کی لبوں سے کوئی بات نکلنے والی نہ تھی۔ اپنی ماں کے دکھوں سے وہ بخوبی واقف تھی اور اس میں رتی بھر اضافہ اسے کسی طور گوارا نہ تھا۔ خواہ اس کے لیے اسے حقیقتاً شادی کی رات سے قبر کی رات تک رونا ہی کیوں نہ پڑتا۔

وہ کمرے میں اندھیرا کیے لیٹی ہوئی تھی۔ ساری رات نیند پلوں کے قریب نہ پہنچی تھی۔ اب سردی سے پٹنا تار ہا تھا اور طبیعت بے حد بھاری ہو رہی تھی۔ یکدم موبائل کی لرزش سے اس کی غنودگی ٹوٹی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر اسکرین پر نام دیکھا پھر موبائل آن کیا۔  
 ”ہیلو۔“

”جی! میں کچھ سمجھی نہیں ممانی جان!“ وہ الجھ سی گئی۔  
 ”ممانیہ کی بھی تاریخ رکھی جانی ہے چند دنوں میں۔“ تو کیا تمہاری اور رافع کی بھی۔“  
 ”نہیں نہیں۔“ وہ گھبرا سی گئی۔ ”مجھے تو ایسی کوئی بات نہیں نکلی۔ پھر ناعمہ کے جانے سے امی کے پاس میرا ہونا ضروری ہے۔ میں خود اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں ہوں۔ امی بہت اکیلی ہو جائیں گی۔“  
 ”سنا ہے رافع بھی ٹال مٹول کر رہا ہے۔“ انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔  
 ”مجھے تو اس کی خبر نہیں ممانی جان!“ اس کے چہرے کی جوت بجھ گئی تھی۔  
 ”کیا خیال ہے تمہارا۔“ وہ اچانک ہی پراسرار ہو گئیں۔ ”اگر ہم رافع اور عریشہ کی بات چلائیں تو ٹھیک ہے؟“

”ضرور۔“ وہ مختصراً بولی۔  
 ”تم حمایت کرو گی ہمارے مطالبے کی؟“  
 ”کیوں نہیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔  
 ”جیتتی رہو۔“ وہ یکا یک ہی خوش ہوئیں۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ ایک ہی فخر کے تین بوجھ اتر جائیں گے۔  
 عریشہ، ممانیہ اور ناعمہ۔ تین سہیلیاں تینوں ساتھ ہی دکن نہیں گئی کیوں درد؟“  
 ”بالکل ٹھیک ہے ممانی! وہ مسکرائی۔“

”تم تو تینوں سے بڑی ہو درد۔“ انہوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”تمہارا دل تو خراب نہ ہوگا؟“  
 ”کمال کرتی ہیں ممانی جان۔! یہ تو نصیب نصیب کی بات ہے۔“ وہ رسائی سے بولی۔ ”جس کا جیسے لکھا ہو۔“  
 ”آپ میری فکر نہ کریں۔ میں اتنی چھوٹی باتوں پر دل خراب نہیں کرتی۔“  
 ”تم کھانے کی بات کر لو ہاشم اور حمزہ سے۔“ انہوں نے اسے دو گزین شکل دکھایا۔ ”دونوں اوپر ہیں۔“

دیکھ رہے ہیں۔“  
 ”جی! اچھا۔“ وہ سیرھیوں کی جانب برہم ہوئی تھی۔  
 اسے آنا دیکھ کر عریشہ آڑ میں ہو گئی تھی۔

اس کا رنگ سفید بر لیا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے تھے۔  
 ”لیکن امی! اتنی جلدی سے کیوں؟“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔  
 ”ممانی! کیا کریں۔ جلدی تو لگتا ہے ان لوگوں کی کٹھی میں شامل ہے۔ ہر کام جلدی دوڑ بھاگ میں۔  
 لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جلد یا بدیر۔ کام تو بہر حال ہونا ہی ہوتا ہے۔ تم اس روز ممانیہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں تو ایک ہرے رنگ کا سوٹ لائی، تمہیں نا؟ وہی جس پر شاید سفید کام تھا؟“  
 ”وہ۔ بالکل گرین سوٹ موتیوں کے کام والا؟ وہ تو۔۔۔ درد آتی کے لیے لائی تھی۔“ وہ اب تک ہم صم سی کیفیت کا شکار تھی۔

”ہاں تو تمہارا ٹاپ تو تقریباً ایک سا ہے۔ وہ سوٹ پہن لو۔“ ساتھ میں میرا موتیوں والا سوٹ بھی پہن لو۔ ہاں ہاں پھلکا میک آپ ضرور کر لیں۔ لڑکیاں تو ایسے موقعوں پر خوب جی جان سے تیار ہوتی ہیں، تمہیں تو کسی بہت کی تمیز ہی نہیں ہے بالکل۔“  
 وہ ایک دم خفاسی ہوئیں پھر اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر نرم پڑ گئیں۔



کرنے سے بچائیں۔ عاشق بھائی سے رابطہ کرنا ناگزیر ہے۔ ”وہ سوچ انداز میں کہہ رہا تھا۔  
 ”تم اماں کے سامنے ہرگز ان باتوں کا ذکر مت کرنا۔“ عذرا بیگم نے اسے ٹوکا۔ ”وہ پہلے ہی ایتقان کے بارے میں  
 در درجہ فکر مند رہتی ہیں۔ ایسی باتیں سنیں گی تو بیمار پڑ جائیں گی۔“  
 ”جانتا ہوں۔“

”اب کیا کرو گے؟“ عاشق کا نمبر کہاں سے لو گے؟  
 ”آپ اپنے طور پر پچھو سے پوچھنے کی کوشش کریں شاید وہ بتا ہی دیں۔“  
 ”لیکن کیوں؟ کیا کہوں اس سے؟“ وہ جزبز ہوئیں۔  
 ”کوئی بہانا بنا دیں۔ کہہ دیں ان کا کوئی دیرینہ دوست ملا تھا وہ مانگ رہا تھا۔“  
 ”تو پھر تم ہی کہو نا۔“ وہ بھنا میں۔ ”عاشق کا دیرینہ دوست مجھے کہاں مل جائے گا؟“ رافع چونکا پھر مسکرا دیا۔  
 ”ٹھیک ہے میں ہی کہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

تقریب کا اہتمام لان میں کیا گیا تھا۔ ہاشم نے انتظام بہت عمدگی سے سنبھالا تھا۔ ہر چیز میں ”بینجمنٹ“ خاص  
 طور پر نظر آ رہی تھی۔

”راجہ! سن! یہ سب بہت زیادہ کر لیا آپ نے۔“ وہ بیگم ان کا ہاتھ تھام کر بولی تھیں۔  
 ”جی آئی۔“ فریجہ بھی قریب ہی موجود تھی۔ ”ہم نے تو خاص طور پر کوشش کی تھی کہ بالکل گھریلو انداز میں  
 تقریب کو منایا جائے۔“ تب ہی ارجنٹ ٹوٹس دیا تھا آپ لوگوں کو لیکن آپ لوگوں نے تو بہت عمدگی سے سب  
 کچھ مانج کر لیا۔“

”اللہ سلامت رکھے بچوں کو۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔ ”ان ہی کے دم سے ساری رونق ہے اور رہی بات  
 تقریب کی تو ان بچیوں کے سوا میرا کون ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر اگر اپنے ارمان نہ نکالوں گی تو پھر کب  
 ذسیاں اتریں گی یہاں۔“

”آئی! میں ناعمہ کے پاس چلی جاؤں؟“ فریجہ کھڑی ہوئی تھی۔ ”وہ اندراہیل بیٹھی ہوگی۔“  
 ”ہاں ضرور۔“ لیکن ابھی اصل کام تو باقی ہے اور تم اندر جا رہی ہو۔“  
 ”ماتن! آپ لوگ بیٹھ کر اس یہ اپنا ڈپارٹمنٹ نہیں۔“ وہ ہنسی تھی۔ قریب بیٹھی دور کو ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ  
 در کی جانب بڑھ گئی۔

سفید موتیوں کے کام سے مزین بائبل گرین کلر کے کپڑوں میں ملبوس وہ بہت معصوم اور شگفتہ نظر آ رہی تھی۔  
 ڈرائنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھ کر وہ قدرے محویت سے خود کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس نے آئینے میں  
 ایک اور عکس کو اپنے عکس کے پیچھے ابھرتا ہوا دیکھا۔ ناعمہ چونک کر مڑی۔  
 ”عزیز! تم۔“

وہ دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی ہوئی تھی۔ ناعمہ کے پکارنے پر وہ چند  
 قدم بڑھا کر اندر چلی آئی۔ سیاہ کپڑوں میں اس کی رنگت زرد اور مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔  
 ”مبارک ہو۔“ اس کے لب ہلے۔ ”فراز کا ساتھ ملنا کس قدر خوشی کی بات ہے۔ ہے نا۔ تمہارا یہ دیکھتا روپ  
 آ رہا ہے۔“

”شعلا! ہاشم بات کر رہا ہوں۔“ وہ گہیر آواز میں بولا تھا۔  
 ”جی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”دشرب تو نہیں کیا تمہیں؟“ وہ محتاط انداز میں بولا تھا۔  
 شعلا کچھ دیر کے لیے خاموش رہ گئی۔ ہاشم کے انداز میں پچھلے کچھ دنوں سے در آنے والی اجنبیت اس کے لفظ  
 لفظ سے چپکتی تھی۔ نجانے کیوں۔ شعلا کے دل کو نہیں سی لگتی تھی۔  
 ”ایسی باتیں نہ کیا کریں ہاشم! بہت اجنبی سے لگتے ہیں۔“

”اجنبیت تو احساس ہے شعلا! باتوں سے در آنے رویوں سے یا پھر دو افراد کی قسمت میں ہی رقم ہو۔ خیر۔ میں  
 کہہ رہا تھا کہ تمہیں لینے آ رہا ہوں۔“

”خیریت؟“ وہ پوچھ بیٹھی۔  
 ”کیا بات ہے شعلا! کیا تم یہاں آنا نہیں چاہتیں؟“ ہاشم الجھ سا گیا تھا۔ ”اپنے گھر واپس آنے کے لیے بھی  
 تمہیں اور مجھے ایسے سوال جواب کی ضرورت ہے؟ ہر حال بات یہ ہے کہ ناعمہ کے بھڑال والے اس کی شادی  
 کی تاریخ رکھنے آرہے ہیں۔ امی کا خیال ہے کہ ہم لوگ اس موقع پر عریشہ اور بٹاخ کی تانت بھی ساتھ ہی رکھ لیں۔  
 اسی سلسلے میں چچا جان کی طرف جارہے ہیں۔ میرا خیال ہے اس موقع پر تو تمہارا یہاں ہونا ضروری ہے؟“  
 ”جی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”میں خود آجاتی ہوں۔ کون سا زیادہ رستہ ہے۔ آپ خواجواہ تکلیف کریں  
 گے۔“

ہاشم چند لمحے خاموش رہ کر دھیرے سے ہنس دیا تھا۔  
 ”اور ابھی تم میرے الفاظ سے چپکتی اجنبیت کی شکایت کر رہی ہیں۔“ فریجہ نے کھنکھہاتے ہوئے کہا۔  
 آپ کی ہمراہی عین راحت و سعادت ہے۔ تم تیار رہو۔ میں آتا ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ شعلا اس کے  
 لطف طفر کے متعلق سوچتی رہ گئی۔

یہ حد پریشانی کے عالم میں اس نے فون بند کیا تھا۔ ریسور پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہت استغراق کی کیفیت میں نظر آیا۔  
 عذرا بیگم اٹھ کر اس کے قریب آ گئیں۔  
 ”رافع! انہوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔  
 وہ چونکا اٹھا۔

”جی! امی۔“ اس نے ایک لمبی سانس بھری۔ ”وہ کہتے ہیں کہ کمپنی کے ساتھ کیا گیا ان کا مائٹریکٹ ختم ہو گیا  
 ہے۔ اب وہ کہاں گئے ہیں؟“ نہیں خبر نہیں ہے۔“  
 ”یا خدا۔“ وہ پریشان ہو گئیں۔ ”یہ کیا ماجرا ہے۔ ایتقان تو کہتی ہے کہ وہ اکثر وہ بستر بچوں سے بات کرنے کے  
 لیے فون کرتا رہتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ایتقان کو نہ سنی بچوں کو تو ضرور بتاتا۔“  
 ”ہو سکتا ہے پچھو کو اس کا علم ہو۔“ رافع نے خیال ظاہر کیا۔

”لیکن ہم اسے تو نہیں کہہ سکتے ناکہ ہمیں عاشق سے رابطہ کرنا ہے۔ اس کی فطرت سے تم بخوبی واقف ہو۔“  
 عذرا بیگم سوچ میں پڑ گئی تھیں۔  
 ”کچھ بھی ہوا امی! میں کل رات کے واقعہ سے سخت خوفزدہ بھی ہوں اور پریشان بھی۔ پچھو کو قطعاً اندازہ  
 نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہی ہیں؟ کچھ بھی غلط کر سکتی ہیں۔ ایسے میں ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ انہیں کسی کھائی میں

ناعمہ خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھے گئی۔ اس کے چہرے پر اس کی آنکھوں میں اس کے انداز میں وحشت کا راج تھا۔ عریشہ آکر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ نجانے کیوں ناعمہ کو اس دیوانی لڑکی سے خوف سا محسوس ہوا تھا۔

”بہت خوش ہو ہوں؟“

”نہیں۔“ ناعمہ نے سر جھکا کر قدرے اداسی سے کہا تھا۔ ”بالکل خوش نہیں ہوں۔ محض مجبوری ہے۔“  
 ”اوہ۔“ وہ طنز سے بولی۔ ”مجبوری۔۔۔ مجبورا شادی کر رہی ہو اس سے؟ جانتی ہو ناعمہ! مجبورا شادی کیسے کی جاتی ہے؟ جیسے میں کر رہی ہوں ایسے۔“  
 ”جانتی ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تم کیا جانو گی۔“ وہ حقارت سے بولی۔ ”تمہارے دل پر تو ان عذابوں کا سایہ تک نہیں اترا جو میری ذات کے اندر پر پھیلائے کھڑے ہیں۔ صرف اتنا جان لو جو تمہارا بننے جا رہا ہے اس نے کبھی میری محبت کا دم بھرا تھا۔ میرے فراق میں آہیں بھرنی تھیں، میرے لیے راتیں جاگی تھیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ جب میں زنجیروں میں جکڑی گئی، تب وہ تمہارے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ جانتی ہو کیوں؟ صرف اور صرف مجھے جلانے کے لیے، میرا تماشا بنانے کے لیے۔ یہ جتانے کے لیے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ صرف دل کا بہلاؤ اور تفریح تھی اور تم۔۔۔“ اس نے نفرت سے ناعمہ کو دیکھا۔ ”تم بھی خوشی خوشی اس کے ٹھیل میں شریک ہو گئیں۔ میں نہیں جانتی کہ تمہیں ان ساری باتوں کا علم ہے یا نہیں۔ لیکن۔۔۔ لیکن اتنا جان لو کہ میرے قاتلوں کی فہرست میں تمہارا نام بھی شامل ہے۔ مجھے تم سے بھی نفرت ہے، مجھے سب سے نفرت ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی تھی ناعمہ آسف سے اسے دیکھتی رہی۔

”مت رو، عریشہ! پھر وہ آہستگی سے بولی۔ ”تم رو، کوئی تمہارا یا تمہاری خوشیوں کا قاتل نہیں ہے یہ سب نصیبوں کے پھیر ہیں۔ دل کسی کا ہوتا ہے، وجود کسی اور کا ہو جاتا ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔“  
 ”مت بہلاؤ مجھے ان جھوٹے لفظوں سے۔“ وہ پھنکارنی۔ ”ابھی تم بہت خوش ہوئے تھے پانے جا رہی ہو اسے آسمان کا چاند سمجھتی ہو لیکن یاد رہے چاند صرف چند لمحوں کے لیے اپنا ہوتا ہے، پسند چل گزرتے ہیں اور وہ دوسری چھت پر نظر آتا ہے۔ وہ جو کل مجھے مجھتے ہوئے تھا۔۔۔“  
 ”وہ آج بھی تم سے محبت کرتا ہے۔“ ناعمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”فرق اتنا ہے کہ محبت نے روپ بدل لیا ہے اور اسے اس کی خبر نہیں ہے۔“

عریشہ اس کی بات پر حیران ہوئی۔  
 ”کیا مطلب؟“ پھر وہ بولی تھی۔

”تمہیں یاد ہے عریشہ!“ ناعمہ آہستہ آہستہ بولنے لگی تھی۔ ”جب ہم اپنی اسکول میں پڑھتے تھے تب ہمیں انگریزی کے استاد گھر پر رکھانے آتے تھے۔“

”ہاں۔۔۔ یاد ہے۔ لیکن یہاں ان پر اپنی باتوں کا کیا ذکر؟“

”تب ہم اکثر ان کے گھر فون ملا کر انہیں مختلف طریقوں سے تنگ کیا کرتے تھے۔ ہے نا؟“

”ہاں۔“ وہ قدرے اکتاہٹ سے بولی۔ ”پھر؟“

”انہیں کبھی اندازہ نہ ہوا تھا کہ ہم ایک نہیں دو مختلف لڑکیاں ہیں۔ تب ہمیں پتہ چلا تھا کہ ہماری آوازیں اور ہمارے بولنے کے انداز میں بے تحاشا مماثلت ہے۔ تب ہم نے تنوں کو ایک لڑکی بن کر بے وقوف بنایا تھا۔ آدھی بات تم کیا کرتی تھیں، آدھی میں اور کبھی کوئی ہماری چوری نہ پکڑ پایا تھا۔ ہے نا؟“

عریضہ یوں چونکی تھی جیسے اسے کرنشل لگا ہو وہ ششدر سی اسے دیکھے گئی۔

”تم تمہارا تمہارا مطلب ہے کس۔“

”ہاں۔“ ناعمہ نے سر جھکا لیا۔ ”فراز کو بھی کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے ایک نہیں دو مختلف لڑکیوں سے بات کی ہے۔“

عریضہ یکدم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اور یوں تم نے میری محبت، ہتھیالی اور۔۔۔ اور اتنے اطمینان سے مجھے بتا رہی ہو۔“

”نہیں عریضہ! ناعمہ بات کو بننے کے بجائے بگڑا دیکھ کر گھبرا گئی۔ ”تم میری بات تو سمجھو۔“

”تب ہی تم نے کہا کہ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ تم نے سچ میں آکر نجانے کس طرح اس کی راہ کھولی کر دی۔ اسے اپنی جانب کھینچ کر لے گئیں۔“

”نہیں عریضہ! تم جانتی ہو تمہارا نکاح تافع سے ہو گیا تھا۔“

”ہاں ہوا تھا نکاح لیکن میری نظر میں صرف اور صرف میرے دل کے رشتے کی اپہٹ تھی۔ وہ مجھے چاہتا ہے

اور میں اسے۔۔۔ اسی بات پر میں عمر گزار سکتی تھی لیکن۔۔۔ لیکن تم بے ایمان لڑکی! تم نے ہمیں ایک عجیب انجانی

کسک میں مبتلا کر ڈالا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو میں اس بات کو آسانی سے بھٹول جاؤں گی؟ نہیں، تمہیں تمہاری اس

بے ایمانی کی پوری سزا ملے گی۔ نہ میں تافع کی بنوں کی اور نہ فراز کو تمہارا بننے دوں گی۔ سنا تم نے۔“

”آہستہ بولو عریضہ! ناعمہ کا کلیجہ کانپ گیا۔ ”کوئی سن نہ لے۔“

”جس کو سننا چاہیے وہ یہ سب ضرور سنے گا۔“ وہ ایک عزیمت سے بولی۔

پھر وہ بچی اور کمرے سے نکل گئی۔ ناعمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔

محسوس ہو رہے تھے۔ حلق میں کانٹے کانٹے لگے تھے۔ نجانے تقدیر اس کے ساتھ کیا کرے والی تھی۔

”بھابھی! کسی نے یکدم قریب سے کہا۔“

ناعمہ بری طرح چونک اٹھی۔ اس کے پاس فریحہ کھڑی ہوئی تھی۔

\*\*\*

تارکول کی سیاہ سڑک تاحد نگاہ نظر آتی تھی۔ اس سے پرے سیاہ بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے ایک دوسرے

سے جڑ کر کھڑے ہوئے تھے۔ گویا کسی کارستہ روکنے کی تیاری کر رکھی ہو۔ مغرب سے پرے کا وقت تھا۔

نے سر اٹھا کر وہ بھاتو سرمئی آسمان اپنا رنگ بدلنے لگا۔ اس کے کناروں پر جیسے بدلیوں میں آگ سی لگ گئی۔ پل بھر

میں آسمان گلابی ہو گیا تھا۔

ربیعہ کو احساس ہوا دور دور تک محض ویرانہ تھا۔ کہیں آبادی کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ ربیعہ گھبرا سی

گئی۔ ایسے سنسان پہر میں وہ تنہا وہاں کھڑی تھی۔

”ربیعہ! اسے کسی کی سسکی سنائی دی۔ ”ربیعہ! میں۔۔۔ میں یہاں ہوں۔ یہاں۔“

ربیعہ نے پلٹ کر دیکھا۔ دائیں پھر میں۔ وہاں کوئی نہ تھا تب ہی ایک شور کے ساتھ ہوائیں چل پڑی تھیں

جیسے سارے بادل ابھی برسنے والے ہوں۔ ربیعہ کا جی جا ہوا وہاں سے بھاگ جائے۔

”ربیعہ! ربیعہ! کوئی رو رہا تھا۔ ”ربیعہ! یہاں آؤ۔ میں۔۔۔ میں ہوں۔ تمہارے قریب۔ آؤ۔“

دیکھو تو۔۔۔ دیکھو تو۔۔۔

ربیعہ کو خوف محسوس ہوا پھر وہ یکایک بھاگی۔ تارکول کی سیاہ سڑک جیسے اس کے پیر تھا منے کے۔ لیے اس کے

ساتھ ساتھ بھاگی تھی۔ ربیعہ اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔

”ربیعہ! ربیعہ!“ آواز اس کے قریب تر آئی تھی جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔

تب ربیعہ نے دیکھا تارکول کی سیاہ سڑک کے آخری کونے پر کوئی کھڑا تھا۔ ربیعہ ٹھہر گئی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا

جیسے ربیعہ کے انتظار میں ہو۔

”ربیعہ! اس نے بائیں پھیلائیں۔“ آؤ۔ آؤ۔ میرے پاس۔“

ربیعہ اپنی جگہ رک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

”ربیعہ!“ کوئی اس کے بالکل قریب بولا تھا۔ ربیعہ کو اپنی گردن پر کسی کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوئی۔ اس

کے لبوں سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی۔

تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سانس نہایت تیز رفتاری سے چل رہی

تھی اور پورا جسم ہلچل مچھل رہا تھا۔

”ربیعہ!“ منہ ذہن یکدم تیز رفتاری سے چلتی ہوئی اندر آئی تھیں۔ ”ربیعہ! کیا ہوا؟“

”امی جی۔۔۔“ وہ ان سے پلٹ کر رو پڑی۔ ”امی۔۔۔“

”ربیعہ! میری بچی کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

چند لمحوں میں ہی عباد اور انیقہ بھی چلے آئے۔ وہ سب اس کے پاس بیٹھ گئے۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر ان

سب کو دیکھا۔ چند لمحوں بعد اس کے اوسان اس کے قابو میں آئے تھے۔ انیقہ نے اٹھ کر اسے پانی کا گلاس بھر کر

دیا تو ایک سی سانس میں پی گئی۔

”دور آؤ نا خواہ! کیا تھا؟“ عباد اس کا چہرہ غور سے دیکھ رہا تھا۔

”بہت دن بعد۔“ اس نے لرزئی آواز میں کہا۔ بہت دنوں کے بعد مجھے پھر۔۔۔ پھر سے۔۔۔“

”کیا مطلب پھر سے۔“ انیقہ حیران ہوئی۔ ”کوئی تیرے خوابوں کی؟“

ربیعہ نہ چاہتے ہوئے بھی بدھم سا مسکرائی تھی۔

”پتا نہیں انیقہ! سیریز ہی لگتی ہے۔“ ربیعہ نے اپنی بات کو ختم کر دیا۔

دوسرے دن ایسا ہی کوئی خواب دیکھتی تھی۔ کبھی دادی نظر آتیں، کبھی ایک نادیدہ شخصیت کا واضح احساس ہوتا

تھی خوف اور صرف خوف محسوس ہوتا۔“

وہ بیٹوں حیران سے ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ لوگوں کے پاس آنے کے بعد ان خوابوں میں کی آگئی تھی پھر یہ سلسلہ بالکل موقوف ہو گیا تھا لیکن آج

پھر اتنے دن کے بعد۔“

”تم کو تو میں تمہیں ہا پر نفسیات کے پاس لے چلوں گا؟“ عباد ہمدردی سے بولا۔

”ارے نہیں عباد بھائی! وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ”جو کچھ آپ لوگ کرتے ہیں، میں اسی کا احسان نہ آتا پاؤں گی

ساری عمر۔“

”احسان؟“ عباد ناراض ہوا۔ ”تم ہماری محبتوں کو احسان شمار کرتی ہو ربیعہ! ہم سب تو بھول چکے ہیں کہ تم کوئی

آؤٹ سائڈر ہو۔ امی کے لیے تم تیسری بیٹی ہو اور میرے لیے تیسری بہن۔“

”عباد ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ منہ ذہن یکدم نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ”اور یہ بات تم بھی جانتی ہو بلکہ ہم سب

جانتے ہیں کہ تم بھی ہمارے لیے ایسے ہی سچے جذبات رکھتی ہو۔“

”آئندہ یہ احسان وغیرہ کی بات میں نہ سنوں۔“ عباد بولا۔ ”اور کل شام میں تمہارے لیے کسی ڈاکٹر سے







”ربیعہ! عباد نے اسے ملاحت سے نکالا۔ ربیعہ چونکی۔  
پھر وہ ان دونوں کو دیکھ کر غائب و غایب سے شکر ادا کیا۔  
”چلیں! اس نے عباد سے پوچھا۔  
”آپ نے بتایا نہیں ربیعہ! امیر حسن نے تجھ سے جسکی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔  
”کیا؟ کیا نہیں بتایا؟ وہ حیران سی ہوئی۔  
”یہی کہ شیر کی تصویر میں آخر آپ کو اپنی کون سی غیر معمولی بات محسوس ہوئی؟ آپ اس طرح گرو؟  
پیش سے بے خبر کیسے ہو گئیں؟  
ربیعہ چند لمحے غور کرتی رہی پھر اس نے بے جا رنگ سے کاندھے اچکا دیے۔  
”میں خود نہیں سمجھ سکی۔ لیکن اس چہرے میں ایک مقناطیسی محسوس کی میں نے۔ ایک عجیب سی کشش۔“  
”شیر کی۔۔۔ کبھی پاکستان نہیں آیا۔“ امیر حسن مدھم سا مسکرا کر بولا۔  
”آپ کبھی پاکستان سے باہر گئی ہیں؟“  
”نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔  
”بس پھر اتنا تو طے ہے کہ آپ لوگوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ باقی اگر دور پر ہے کی کوئی رشتہ داری نکل آئے تو الگ بات ہے۔“  
”میں ہی اس لیے تھ۔“  
”یہ ربیعہ۔۔۔ دیکھو بھی کچھ۔“ عباد نے انگلی کو کپڑے کے پاس لا کر گولائی میں گھمایا۔ ”اس کی باتوں پر اتنا دھیان مت دو۔“  
امیر حسن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر وہ ان دونوں کو سی آنت کرتے باہر نکل گیا۔  
”آپ جاب وغیرہ میں انٹر سٹڈ نہیں ہیں؟“ عباد پارکنگ آریا سے گاڑی لینے گیا تو امیر حسن نے گلہ سز کے پیچھے چھپی نظروں سے اسے دیکھا۔  
”جواب؟“ ربیعہ حیران سی ہوئی۔ ”میرا ایم اے ابھی مکمل نہیں ہوا۔“  
”اگر اسے ضروری نہ سمجھا جائے تو؟“ وہ مدھم سا مسکرایا۔  
”تو۔“ ربیعہ سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا ”تو شاید۔۔۔ میں اپنا کام اچھی طرح سے نہ کر سکوں گی۔“  
”خوبصورت معذرت ہے۔“ اس نے خوش دلی سے سر ہلایا۔  
”آپ کی گاڑی آگئی۔“  
”ربیعہ نے دیکھا۔ عباد اس کے انتظار میں تھا۔  
”اللہ حافظ! وہ دیکھو جیسے سے مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔  
امیر حسن کے لب۔۔۔ آہستگی سے ہلے تھے۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے بے حد گہری نگاہ سے اس کے ہر انداز کو دیکھا۔ ”بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔“  
”جی امی۔“ ہاشم نے آنکھوں کو بازو سے ڈھانپ لیا۔ ”آفس میں اتنا کام ہے کہ لپچ کرنے کا نام بھی نہیں مل پاتا۔ چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو جاتی ہے لیکن گھونٹ بھرنا مشکل لگتا ہے۔“  
”اے ہے۔ کیا وزیر اعظم لگ گئے۔“ وہ تشویش سے بولیں۔  
”بتاؤ۔۔۔ ناشتہ بھی نہیں کر کے گئے تھے۔ خالی پیٹ کیا خاک کام کرتے ہو گئے۔ اس طرح تو آدمی کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اے ہاں۔ پونہ تو نہیں کہتے کہ مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ سیانے لوگوں نے بھی سوچ سمجھ کر یہ کہا دیکھ کر ہنسی ہیں۔ بیگم کا حال دیکھ لو صبح سے رات ہونے کو آئی ہے۔ انہوں نے شکل نہیں دکھائی۔ کیا پکا ہے کیا نہیں۔ کس نے کھایا کس نے نہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہے۔ اور کسی کا نہیں اپنے شوہر کا تو خیال کریں۔ اسے تو دیکھیں۔ پر یہاں کسے پروا ہے۔ نہ بی بی کو نہ شوہر کو۔ ایک کولوہ ہے جس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ ان کی گرہستی ہے۔“  
ہاشم نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا سانس ہی ماہین کا بیٹا اپنا بیٹ اٹھائے بھاگا پھر رہا تھا۔  
”ماہین آئی ہے؟“ ہاشم نے پوچھا۔  
”ہاں بلایا ہے ہم نے۔ ناعمہ کے ساتھ حشریشہ کی تاریخ تو رکھ دی ہے۔ لیکن عذرا بیگم نے نہ تو شگون کی مٹھائی ہی بھجوائی نہ مزید کوئی پیش رفت کی۔ اب ماہین سے مٹھائی ملے کی جانچ کرواتے ہیں۔“  
”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ ہاشم نے بیٹھ کر بریف کیس نزدیک کیا۔ میری اس سلسلے میں رافع سے بات ہو چکی ہے۔ وہ لوگ تانیہ کے سسرال والوں سے تمام معاملات طے کر کے پھر ہماری طرف آئیں گے۔ تاریخ وہی ہے۔ جو ناعمہ کی رکھی ہوئی ہے۔  
”اس نے بریف کیس کھول کر چیک بک نکالی۔ پھر خچکے لکھ کر کانا اور ان کی جانب بڑھایا۔  
”فی الحال تین لاکھ کا چیک دے رہا ہوں۔ ماہین اور حشریشہ مل کر زیور اور کپڑوں وغیرہ کی تیاری کر لیں۔ فرنیچر کا آرڈر میں خود دوں گا۔“  
اس نے بریف کیس بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔  
”جیتے رہو۔“ وہ نہال نظر آنے لگیں۔ ”آب کہاں چل دیے۔ کھانا لاتی ہوں۔ صبح کے بھوکے ہوں۔“  
”میں ہاتھ لوں گا پہلے۔“ حشریشہ نے حشریشہ محسوس ہو رہی ہے۔  
”اس نے بڑھتے ہوئے قدم ایک کھمبے پر تھمے تھے۔  
”شہلانے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا؟ آپ اس سے پوچھ تو لیتیں۔“  
”ہم سے پوچھنا اس کا کام ہے۔ اس سے پوچھنا ہمارا کام نہیں۔“ وہ بے نیازی سے چیک دیکھ رہی تھیں۔  
”ایسے بے جالاؤ ہم نے بیٹیوں کے نہیں اٹھائے کبھی۔“  
”بہت اچھا کیا۔“ اس نے ہڑبڑا کر سرد آہ بھری تھی۔ پھر وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔  
کرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو اسے جس اور حشریشہ کا احساس ہوا تھا۔ نیم اندھیرے یا حول سے شامسا ہونے میں اس کی آنکھوں کو چند لمحے لگے پھر اس نے دیکھا۔ شہلا تکیے میں منہ دیے اوندھی لیٹی تھی۔  
”کم از کم اے سی تو آن کر لیتیں۔“ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ریموٹ اٹھا کر اے سی آن کیا۔  
”امی بتا رہی ہیں۔ آج کرے سے نکلیں ہی نہیں۔“ وہ بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ ”کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

شہلا کی جانب سے کسی رد عمل کا اظہار نہ ہوا۔ ہاشم ڈریسنگ روم میں ٹکس گیا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنا گاؤں پہنچے۔  
برآمد ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے آرام کرنا چاہتا تھا، ایک اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ شہلا کی پوزیشن میں رتی بھر تبدیلی نہ آئی تھی۔ ہاشم بے ساختہ اس کی جانب بڑھا۔  
”شہلا!“ ہاشم نے اسے کاندھے سے پکڑ کر سیدھا کیا پھر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔  
شہلا کا جسم تیز بخار میں پھنک رہا تھا وہ تقریباً ”تیم بے ہوش“ تھی۔  
”شہلا، شہلا! آنکھیں کھولو۔“ ہاشم نے اسے زور سے ہلایا۔  
پھر وہ بجلی کی تیزی سے اٹھا، شہلا کو بازوؤں میں اٹھا کر وہ تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھا۔

\*\*\*

”ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے یہ کئی دنوں سے حالت فاقہ میں تھیں۔ انہوں نے کب سے کچھ کھایا یا نہیں ہے؟“ اسے احساس ہو رہا تھا جیسے شہلا کی اس حالت کا ذمہ دار وہی ہے۔  
”آپ کے درمیان کوئی کشیدگی ہے؟“ ڈاکٹر سلطان نے اس کے چہرے سے اس کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔  
”جی؟“ وہ بری طرح چونکا ”کشیدگی؟“  
پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے؟ ”ہاں شاید۔“  
ڈاکٹر نے اس کی کیفیت سے از خود ہی کوئی مطلب اخذ کیا پھر اس کا شانہ تھپتھپایا۔  
”میاں بیوی کے درمیان کبھی بھی سیدھا راستہ نہیں ہوتا بیٹے۔ یہ ایک زگ زگ ہے۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ بے تحاشا توقعات بے تحاشا بہتات۔ لیکن۔۔۔ بہت سی محبت اسی لیے ہر زگ زگ کے بعد ایک خوبصورت موڑ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“  
ہاشم گوگو کا شکار اپنی ہی سوچوں میں گم کھڑا تھا۔ اس نے ہیشکل ڈاکٹر سلطان کی جانب دیکھا۔  
”جی۔۔۔“  
”آپ اتنا کھلی فیل منت کرو۔ خواتین کو ذرا سی بات پر کھانا پینا چھوڑ دینے کی بیماری بہت پرانی ہے۔“ وہ مسکرا رہے تھے۔  
”ڈاکٹر شہلا بالکل ٹھیک ہیں۔ میں نے انجکشن بھی دیا ہے۔ یہ ڈرپ ختم ہو جائے تو آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“  
”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! ٹھیک ہو، ٹھیک ہو۔ سوچ۔۔۔“ وہ بہت ممنونیت سے بولا۔  
وہ اس کا شانہ تھپتھپاتا کر کے سے نکل گئے تھے۔ ڈاکٹر سلطان اس کے والد کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کے گھرانے کی ان سے پرانی شناسائی تھی۔ اسی لیے ہاشم شہلا کو ان کے کلینک لے آیا تھا۔ اس نے شہلا کے گھر کسی فرد کو بھی اس بات کی خبر نہیں دی تھی۔ اس کے اپنے گھر میں بھی کسی نے اسے شہلا کو لے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔  
دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا وہ شہلا کے قریب آکھڑا ہوا۔ وہ ہر سکون انجکشن کے زیر اثر غنودگی میں تھی۔ ہاشم نے اس کے پہلو میں رکھے ہوئے نرم ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔  
”آپ اتنا کھٹ فیل مت کرو۔“  
ڈاکٹر سلطان نے اسے کہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہاشم اس وقت سخت پیشانی محسوس کر رہا تھا۔ کتنے دن

ہوئے اس نے شہلا کے خال سے واقف رہنا چھوڑا ہوا تھا۔ عمر کے چلے جانے سے اس کے دل پر قیامتیں بیت گئی تھیں۔ وہ غم سے نوٹ پھوٹ گئی تھی۔ لیکن ہاشم نے اس کے دکھے دل پر اپنی محبت کے اظہار کا مزہم رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ اسے وہ منظر صرف ابرار کی فاتحانہ مسکراہٹ کے حوالے سے یاد آ رہا تھا۔ اسے شہلا کی آنکھیں یاد نہ آتی تھیں۔  
پچھلی رات جب شہلا نے اسے جگایا تھا تب وہ کس قدر شکستہ دل لگتی تھی۔ اس نے فردوس بیگم کے خراب رویے کی شکایت کی تھی تب ہاشم نے اس سے کتنا خشک رویہ رکھا تھا۔ اسے سب یاد تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔  
وہ بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اس نے شہلا کی بند پلکوں کو دیکھا۔ اس کے زرد چہرے کو دیکھا۔ وہ کتنی کمزور ہو رہی تھی۔ نجانے اس نے کب سے کھانا پینا چھوڑا ہوا تھا۔ وہ اکثر شدید سر درد کی شکایت کرتی تھی۔ اس نے اسے قابل توجہ نہ جانا تھا۔

”شہلا!“ شہلا نے آئی ایم سوری۔ آئی ایم ویری سوری۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”محبت کرنے والے یقیناً ایسے نہیں ہوتے۔ تم نے میری دعوت کو چھوٹا لیا ہو گا۔“ نجانے کس بات پر یقین کر کے تم میرے ساتھ چل پڑی تھیں۔ اور۔۔۔ میں نے دکھ کے سوا تمہیں کچھ نہیں دیا۔“ اس نے شہلا کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیا۔  
”میں۔۔۔ اپنے ہی اندیشوں کا شکار بدگمانی کی دھند میں رستہ ڈھونڈتا رہا۔ تمہارے رستے میں بڑے پتھروں کو چٹنا بھی میرا فرض ہے میں نے نہیں سمجھا۔ میں میں وہ نہیں نکلا شہلا جس کا میں نے تم سے دعوا کیا تھا۔ یقین جانو۔ اتنا یقین رکھنا کہ میری محبت میں تمہارے کلیے آج بھی وہی شدت ہے۔ وہی حدت ہے۔ وہی خلوص ہے۔ وہی سچائی ہے۔ سارے رستے صرف تمہاری جانب آتے ہیں۔“  
اس کی آنکھوں میں سے آنسوؤں سے شہلا کا ہاتھ نم ہو گیا تھا۔

”مما۔۔۔ ممما۔۔۔“ مومن نے زور سے اس کا شانہ دھڑکیا۔ تب وہ چونکی۔  
”جی بیٹا۔۔۔ بولو۔“ اس نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔  
”مما۔۔۔ میرا پروگریس کارڈ ہے۔ اس پر مسکنیہ جو کریں۔“ اس نے ایقان کی سمت کارڈ اور پین بڑھایا۔  
ایقان نے دونوں چیزیں تھامیں اور کارڈ کھول کر ”پیرنس مسکنیہ جو“ کے خالی خانے میں دستخط کر دیے۔  
”بیٹا بولو۔۔۔“ اس نے مومن کو کارڈ واپس کرنا چاہا۔  
مومن نے کارڈ نہیں تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے ایقان کا چہرہ دیکھا۔  
”کیا بات ہے؟“ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔  
”آپ نے۔۔۔ مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔“ وہ دم سم سا بولا۔  
”کیا مطلب؟“ وہ ابھی پھر اگلے لمحے ہی سمجھ گئی۔  
اس مرتبہ اس نے کارڈ دوسری ہی نظر سے دیکھا تھا۔ پورے کارڈ پر نظر دوڑاتے ہی اس کا دل جیسے بند ہونے لگا۔  
”مومن۔۔۔ مومن۔۔۔ وہاٹ از دس؟ یہ۔۔۔ یہ پروگریس ہے تمہاری۔ اتنا خراب کاہ۔ اتنے برے رہمار کس۔۔۔“  
وہ خاموش کھڑا لب کاٹتا رہا۔ ایقان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”میں اتنی ذہنی ٹینشن میں بھی تمہیں پڑھاتی ہوں۔ تمہارا کام چیک کرتی ہوں۔ تمہیں یاد کرواتی ہوں۔ پھر بھی تم نے اتنے خراب میسج دیے کیوں۔ کیوں مومن؟ باپ نے کیا کم احسان کیے ہیں میری ذات پر جو تم بھی مجھ ناتواں کو جلاسنے پر تل گئے ہو۔“

”آپ اب اس طرح نہیں پڑھاتیں جیسے پڑھایا کرتی تھیں۔ وہاں اپنے گھر میں۔“

”وہ گھر اب اپنا نہیں ہے۔ اپنا گھر یہ ہے۔ ہمیں یہیں رہنا ہے۔ سمجھے تم؟“

”جی نہیں، میرا گھر وہی ہے۔ میرے پیار والا۔ یہ گھر آپ کے پیار کا ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔“ وہ ہٹ

دھری سے بولا۔

ایقان نے غور سے اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھا۔

”ٹھیک ہے“ پھر وہ ٹھنڈے سبجے میں بولی۔ ”اپنی ماما کو چھوڑ کر چلے جاؤ وہاں دیکھو تمہیں وہاں اپنے پیار ملتے ہیں یا نہیں۔“

”جا بھی سکتا ہوں۔“ وہ بے خوفی سے بولا۔ ”عمر بھی اپنی ماما کو چھوڑ کر اپنے پیار کے پاس چلا گیا ہے۔ وہ وہاں بہت خوش ہے۔ اس کے پیار بھی بہت اچھے ہیں۔ میں بھی اپنے پیار کے پاس خوش رہ سکتا ہوں۔“

ایقان کا غصے سے برا حال ہو گیا اس نے کھیچ کر ایک پھیڑا اس کے گال پر جڑا پھر دو سرا پھیڑا دوسرے گال پر مارا۔ ”تم سب کے پیار بہت اچھے ہیں، تمہاری مائیں ہی خراب ہیں۔ ان کے نصیب جو خراب ہیں، اپنے لہو کی بوندوں سے تمہارے جسم پر آئے۔ تمہیں جنم دیا۔ تمہارے لیے راتوں کو جاگے۔ سوتے جگر پلا کر تمہیں اتنا کیا ہے ہم نے۔۔۔ اچھے جاؤ اپنے باپ کے پاس جو ان ہو کر بھی تم نے یہی کہنا اور یہی کرنا ہے۔ اچھے لیے ابھی چلے جاؤ تو بہتر وہاں جس گوری ڈائن کو اس نے سر پر بٹھایا ہوا ہے نا وہ تمہیں تمہاری اوقات کا پتا دے گی۔“

وہ خود بھی چیخ کر رونے لگی تھی۔ مومن ابو مار کھا کر بڑی طرح رو رہا تھا اس کے رونے سے سہم کر خاموش ہو گیا اور اگلے دیکھنے لگا۔

ایمان اندر سو رہی تھی ان کی آوازوں سے ڈر کر جاگی اور بھاگتی ہوئی باہر چلی آئی۔ اب ایقان کی آواز میں اس کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔

دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے رافع کے لیے یہ منظر ناقابل یقین اور ناقابل پروا نشت تھا وہ انتہائی تیزی سے اندر آیا۔

”پھپھو۔۔۔ پھپھو کیا ہوا ہے؟“ اس نے بلکتی ہوئی ایقان کو کاندھے سے لگایا، دو سرا بازو برہا کر ایمان کو سمیٹا۔ ”رافع! رافع! میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں، وہ بے ایمان شخص کسی اور کا ہو گیا۔ میری اولاد بھی اسی کی ہے۔ یہ بچے اسی کے ہیں رافع، اسی کو دے آؤ۔ مجھے زہر لاؤ۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔ مجھے تھوڑا زہر لاؤ۔“

”پھپھو۔۔۔ پلینرز سنبھالیں خود کو۔ خدا کا واسطہ میں آپ کو دیتا ہوں۔ اتنی کم ہمت نہ بنیں میں تو آپ کو بہت اسٹرانگ سمجھتا تھا پھپھو۔ بہت برابر اور نڈر۔ آپ اتنی کمزور کیسے ہو گئیں؟“

”کوئی عورت بہادر نہیں ہو سکتی۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیسے ہو سکتی ہے بہادر۔ مٹی سے نہیں جذبات سے بنی ہے عورت۔ ذرا سی تپش سے پکھلنے لگتی ہیں۔ چاہے تپش غم کی ہو، غصے کی ہو یا محبت کی، اسی لیے تو اتنی آسانی سے بے وقوف بن جاتی ہے کم بخت۔“

”مت ہنومیری بے چارگی پر۔ میں اس وقت بہت تنہا محسوس کر رہی ہوں خود کو۔ سیسہ۔ مومن جس کی آواز سے میری صبح میری شام ہوتی ہے یہ مجھے کہہ رہا ہے کہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وہاں اپنے باپ کے پاس کیونکہ میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ باپ کے پاس بہت کچھ ہے۔“

وہ پھر ہلکی مومن اب سخت نام نظر آتا تھا۔

”ٹھیک ہی کہتا ہے اب میرے پاس بچا کیا ہے۔ اسے دینے کے لیے، جنم میں اسے دے چکی ہوں، اپنی خوبصورت نیند سے بھری راتیں۔ اس کی دیکھ بھال میں گزار دیں میں سنبھالوں اس کے پوتے وودو تو کرنا تھا چھل گئے تھے میرے۔ وہ وقت بھی گزر گیا۔ اب یہ بڑا ہو گیا ہے اسے اب میری ضرورت نہیں ہے۔ سب کچھ دے چکی ہوں میں اسے۔ اب اسے وہ چاہیے جو اس کے باپ کے پاس ہے۔ اسی لیے اب یہ وہاں جانا چاہتا ہے۔“

مومن خاموش کھڑا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو جھرنے جھرنے رہے تھے۔ ایمان رافع کے بازو میں منہ دیے سسکیاں بھر رہی تھیں۔

رافع نے مومن کو اشارے سے قریب بلایا۔ جب سے رومال نکال کر اس کا چہرہ صاف کیا۔ ایمان کو چہرہ دکھ کر اس کے بال سنوارے پھر ایمان کا ہاتھ مومن کو تھمایا۔

”جاؤ بیٹا، بس کو لے کر جاؤ، سرد رہا جی کے پاس بہت سارے چاکلیٹ ہیں ان سے کہو وہ آپ دونوں کو مزے دار چاکلیٹ دیں گی۔ چاکلیٹ لے آؤ پھر میں آپ دونوں کو گھمانے لے کر چلتا ہوں۔“

بچوں کا موڈ اچھا ہو گیا تھا، دونوں اپنی پسندیدہ چیز کا نام سن کر فائف ڈیڑھ گئے۔ رافع نے ایمان کا تانا سا چہرہ دیکھا۔

”پچھو! بہت افسوس ہوتا ہے مجھے کتنا خوش حال گھرا تھا آپ کا ہنستا مسکراتا۔ غم و فکر سے دور آپ کو دیکھ کر شوخی اور مسکراہٹ کے معنی سمجھ میں آتے تھے۔“

”عورت کی مسکراہٹ اور شوخی مرد کی دین ہے۔ رافع! آؤ اور ہمیں ایسی ہی سوغات دیں۔“

”عورت مرد سے سب کچھ لے سکتی ہے پچھو۔ اپنی مرضی سے جو لینا چاہے۔“ وہ آہستگی اور نرمی سے بولا۔

”ہو نہ ہو مرد ہوسکتی ہو گئے۔“ وہ پھنکاری۔

”مرد ہوں۔“ وہ مسکرایا، ”تب ہی اس قدر وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ میں یہ نہیں کہتا پچھو کہ اس سارے معاملے میں سراسر آپ ہی قصور وار ہیں۔ لیکن کچھ نہ کچھ غلطی آپ کی بھی ہے۔ کیا آج اپنے بچوں کو اس طرح رو یا بلکنا دیکھ کر بھی جو کچھ ہوا اس پر آپ نظر ثانی نہیں کریں گی؟“

”ہر شخص کے کچھ اصول ہوتے ہیں رافع! کوئی ایک متاع ایسی ضرور ہوتی ہے جس پر سوئے بازوی ممکن نہیں ہوتی۔ میری متاع میری محبت تھی۔ وہ محبت جو میں نے عاشر سے کی اور عاشر نے مجھ سے کی۔ بس اس محبت پر میں سو بے بازی نہیں کر پائی۔ باقی جو کچھ ہوا جو کچھ ہو رہا ہے۔ ثانوی ہے۔“

”آپ کے بچے بھی ثانوی ہیں پچھو؟“

”بچے! وہ آہستگی سے بول کر رہ گئی۔“ بچے۔ مجھے تو آج احساس ہوا ہے رافع کہ بچے بھی اس کے ہیں۔ جتنے عرصے کا بھی تعلق تھا۔ وہ امرتیل کا تعلق تھا۔ ایک کے لیے صرف لینا ہی لینا۔ دوسرے کے لیے بس دینا ہی دینا۔“

”ایسی بات نہیں ہے پچھو۔ آپ کی سوچ غلط سمت میں بھٹک گئی ہے۔ اسے سیدھا راستہ دکھائیے۔ انصاف پسندی سے سوچیے۔ آپ وہ منصف ہیں جو غلطی کی سزا بھی موت دیتا ہے۔“

”میں نے کہا نا رافع تم مرد ہو۔ مرد کا ساتھ دو گے۔ عہدا کو بھی سوا“ کو گئے۔ ورنہ ایک اعتماد اور محبت سے

بھرے دل کے قتل کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔ یہ ایک عورت سے پوچھو۔“

”آپ سب بہت لکھو رہے ہیں۔ پچھو! وہ گہری سانس لے کر بولا۔“ مومن کو اس طرح روٹا دیکھ کر میرے دل پر کیا ہتی ہے۔ میں آپ کو تنہا نہیں سکتا۔ آپ سمجھتی ہیں وہ آسانشات کے لیے اپنے باپ کے پاس جانا چاہتا ہے؟ نہیں پچھو ایسا نہیں ہے اس عمر کے بچوں کو ماں اور باپ دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اگر اپنے باپ کے پاس جاتا تو آپ کے پاس آنے کے لیے یونہی بے قرار ہوتا۔“

”تو میں کیا کروں رافع؟ کیا کروں؟ اس کے باپ کے سامنے روؤں۔ گڑاؤں؟ اپنے بچوں کے لیے شفقت پوری کی بھیک مانگوں؟ کیا کروں؟ وہ وہاں دو سری شادی رچا کر بیٹھ گیا ہے۔ اب اس کے پاس اتنا بھی وقت نہیں ہے کہ فون کر کے میرا بچوں کا حال پوچھ لے۔ اور تم سب مجھے مورد الزام ٹھہراتے ہو۔ کیوں؟“

وہ چیخی تھی۔ رافع سن ہو کر رہ گیا۔

”پچھو! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں میں اس نے خود فون کر کے یہ اطلاع دی تھی مجھے۔“ وہ سسکی۔

”پچھو! آپ نے کیا کہا؟“ رافع کے اعصاب کو دھچکا لگا تھا۔

ایقان چند قحوں کے لیے خاموش ہوئی تھی۔

”میں نے اس سے طلاق مانگی ہے۔“ پھر وہ ٹوک انداز میں بولی۔ ”میرے پاس وہ سزا کوئی آپشن نہیں ہے۔“

رافع نے سانس بھری تھی۔ اسے اسی بات کا اندیشہ تھا۔

”پچھو! بچوں کے سر سے ان کے باپ کے نام کی چادر نہ کھینچیں۔ پلینس۔“ وہ ہلکی ہوا۔

”انکھوں نے لکھ دیا ہے تو قہری رکھ لے تو کم از کم آپ تو عقل کریں۔ انہیں جانیں ایک دن انہیں ضرور اپنی ٹانگیوں کا احساس ہو گا۔ یہ بچے ان کے دل کو اپنی جانب کی ضرور موڑیں گے۔ وہ لوٹ آئیں گے۔“

”تب یہاں ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہو گا۔“ وہ چیخی سے بولی۔ ”میں بھکاری بنی اس کے نام کی چوکنٹ پر کبھی نہیں بیٹھوں گی۔ ہر روز اذہ بند کر لوں گی۔“

”آپ مجھے ان کا کنٹیکٹ نمبر دیں۔“ رافع نے بالآخر مایوس ہو کر کہا۔

”میں وہی لینے آیا تھا۔“

”کیوں؟ کس لیے؟“ اس نے آہستہ آہستہ چڑھائے۔

”میں نے ایک بار ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں بہر حال ایسا نہیں چاہتی۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”اور تمہیں مجھ سے نمبر مانگنے کی ضرورت پیش ہی کیوں آ رہی ہے۔ پہلے تو تم اکثر اس سے بات کیا کرتے تھے۔“

”وہ اس نمبر پر نہیں ہیں۔ جاب چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ رہائش کا نمبر بھی تبدیل ہو چکا ہے یا شاید رہائش ہی تبدیل کر لی ہے۔ موبائل نمبر بھی نہیں لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی دوسرے شہر یا شاید دوسرے ملک شفٹ کر چکے ہیں۔“

ایقان کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ اس نے رافع کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

”کہاں؟ کہاں چلا گیا وہ؟“

رافع جو مزید کچھ کہنا چاہتا تھا رک گیا وہ ایمان کی پھیلی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ پھر وہ دھک سے مسکرا دیا۔

”ان نگاہوں میں تو اب تک ان کے نام کا شہر آباد ہے پچھو! آپ کیوں خود سے ان سے سب سے جھوٹ

بول رہی ہیں؟

ایقان نے یکدم نگاہیں چرائی تھیں۔

”شرابا تو نہیں ہے رافع۔“ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”برابر ہو چکا ہے۔“

”نہیں۔ پچھنوں۔ ایسا نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”میرا یقین مجھے بہت کچھ کہہ رہا ہے۔“ وہ جانے کے لیے آگے بڑھا۔

”رافع۔“ ایقان کی سرگوشی نے اس کے قدم روکے تھے۔

”جی۔۔۔؟“ اس نے مڑ کر دیکھا۔

”دیکھ۔ کہاں چلا گیا؟“

رافع چند لمحے اسے دیکھتا رہا تھا۔

”ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ڈونٹ وری۔ لیکن اتنا ہے کہ خود کو سمجھانے کی کوشش کریں۔“ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

”یہ لیجئے ایسا۔“ انیقہ نے اسے پائن اپیل جوس کا گلاس تھماتے ہوئے دیا۔ ”بالکل فریش فرام دی فارم ہے۔“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

شہلا نے گلاس لبوں سے لگایا۔ ساتھ ہی اس کی نظر قدرے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ہاشم سے ٹکرائی۔ نجانے ان نظروں میں کیسے جذبات پوشیدہ تھے۔ شہلا جھینپ سی گئی تھی۔

”انیقہ!“ ہاشم کے لیے بھی جوس لے آؤ نا۔“ وہ اپنے اچھا سا ہاتھ پھیلانے کے لیے انیقہ کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”ہاشم بھائی نے چائے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس لیے ربیعہ ان کے لیے چائے بنا رہی ہے۔“ وہ محبت سے اس کے چہرے پر آئے بال ہٹانے لگی۔ ”اور آپ نے اپنا گلیا حال بنایا ہوا ہے؟ یوں لگ رہا ہے جیسے برسوں سے بیمار ہوں ہاشم بھائی! آپ انہیں کچھ بھی نہیں کہتے نا؟“ انیقہ ہاشم کی جانب متوجہ ہوئی۔ ہاشم نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”بہت بری بات ہے۔ کہا کریں نا۔ بلکہ ڈانٹا کریں۔“

”یہ تو اپنے بس کی بات نہیں۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

”بہت مشکل کام ہے؟“ انیقہ شرارت سے پوچھنے لگی پھر زور سے ہنس دی۔

ماحول قدرے شگفتہ ہو گیا تھا۔ ہاشم بھی یہی چاہتا تھا وہ اسپتال سے شہلا کو یہیں لے آیا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کے گھر کا ماحول شہلا کو مزید شینس کر سکتا تھا۔

منیوہ بیگم نماز پڑھ کر آئی تھیں۔ وہ شہلا پر دم کرنے لگیں۔ ربیعہ بھی چائے بنا کر لے آئی تھی۔

”کیا ہو گیا تھا میری بچی کو؟“ منیوہ بیگم پوچھنے لگیں۔

”کچھ نہیں ای! بس یونہی ذرا ویک نیس ہو گئی تھی۔“ شہلا نجانے کیوں اس ذکر سے شرمندہ سی ہو رہی تھی۔

”مت سوچا کرو اتنا۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”اتنا اچھا شریک سفر ملا ہے خدا کا شکر ادا کرو۔ سب کچھ تمہارے پاس ہے۔ کچھ بھی تمہاری دسترس سے دور نہیں ہے۔“

شہلا قدرے خاموش سی ہوئی تھی۔ ہاشم ایک ٹک اسی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کے ہر انداز کو، ہر رنگ کو

مجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہاشم بھائی۔ چائے۔“ ربیعہ کی نرم آواز پر وہ چونکا۔

”آپ ہی کی بیگم ہیں۔ اتنا غور پھر کبھی کر لیجئے گا۔“ ربیعہ کو بھی شرارت سو جھی۔

سب ہی ہنس پڑے تھے ہاشم قدرے شرمندہ ہوا۔ شہلا بھی جھینپ سی گئی۔

”مہما۔“ خوشی سے چھکتی ہوئی آواز پر سب ہی چونک اٹھے تھے۔

سب نے ایک ساتھ دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ وہاں عمر کھڑا تھا۔

”عمر۔ میری جان۔۔۔“ شہلا کے وجود میں بجلیاں سی بھر گئیں۔ وہ اٹھ کر اس کی جانب لپکی۔ دونوں ماں بیٹا بے

آبی سے کپٹے تھے۔ شہلا نے بار بار اسے چوما۔

”میرا بچہ۔۔۔ میری زندگی۔۔۔ کہاں چلا گیا تھا۔ ایک ہفتہ ایسے گزرا ہے جیسے روح کے بغیر جسم ہو۔“ وہ مسلسل

بل رہی تھی۔

”مہما۔۔۔ آپ کو پتا ہے میں نے مجھے پہلی کاپڑ لے کر دیا ہے۔ وہ بہت اوپر تک فلائی کرتا ہے۔ ریموٹ سے چلتا

ہے۔ میں لے کر آیا ہوں۔ آئین آپ کو دکھاؤں۔“

شہلا کے انداز سست پڑے۔ عمر اس کا ہاتھ کھینچ رہا تھا۔

”آئیں نا مہما۔۔۔“

”بعد میں دیکھیں گے بیٹا! پہلے سب سے مل تو لو۔ تاکہ سے ملو۔ خالہ جانی سے۔“

عمر نے کمرے میں موجود افراد پر غور کیا پھر خوشی سے کھل اٹھا۔

”آپا! ہاشم انکل۔“ وہ بھاگتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔

ہاشم نے اس کے ہاتھ ملا کر پھر اسے اٹھا کر گود میں اٹھالیا۔

”کیا رابیہ بیٹی کا پیر کیول لے آئے؟“ وہ شگفتگی سے پوچھ رہا تھا۔

”ارادے تو نیک ہیں؟“

شہلا بڑل سی ہوئی۔ ہاشم نے یونہی بے ارادہ کہہ دیا تھا یا اس کے دل میں کچھ تھا۔ وہ سمجھ نہ پائی۔

”آپ دیکھیں گے میرا پہلی کاپیر؟“

”ضرور۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”میں آپ کو اڑا کر دکھاتا ہوں۔“ وہ ہر جوش ہو کر بھاگا تھا۔

ہاشم اس کے پیچھے چل دیا تھا۔ شہلا اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ منیوہ بیگم ربیعہ اور انیقہ ایک دوسرے کی

ہنس دیکھنے لگیں۔

”یہاں سب کچھ سیٹ ہے۔ بالکل پرفیکٹ! بس اب بہت اسیو تھلی اشارٹ لینا ہے۔ بہت اچھے طریقے

وہ باتھ روب لیٹے، بالکنی میں کھڑا بہت نیچے نظر آتی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کان پر کارڈ لیس لگا تھا جب کہ کافی کا

کرم کپ بالکنی کی زینو اوپر رکھا ہوا تھا۔

”میں بہت پرامید ہوں شیری۔ یہاں کی مارکیٹ میں بہت مارجن ہے ہمارے لیے۔ پھر خدا کے فضل سے

ہرگز بھی بہت اچھا ملا ہے۔ عباد بہت عمدہ انسان ہے۔ میں بہت پسند کرنے لگا ہوں اسے۔“



ماں ہوں اس کی۔ بہت خفا ہے وہ ہم سب سے کچھ کہتا نہیں لیکن دل ہی دل میں کڑھ رہا ہے۔  
 ”کس بات پر؟“ سردہ حیران تھی۔

”ایک تو بے چارے کے سر زبردستی کا سہرا بندھ رہا ہے۔ صرف رافع کی ضد کی وجہ سے۔ اگر رافع راضی ہو جاتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ دوسرے عریشہ کے رویے کی سبب ہی شکایت کرتے ہیں۔ وہ بھی سنتا رہتا ہے۔ نافع بہت ٹینس ہے۔ میں سب سمجھ رہی ہوں لیکن کچھ بولوں گی تو ایک پینڈورا بکس کھل جائے گا۔ جو میں نہیں چاہتی۔“ وہ پیکنگ چھوڑ کر افسردہ سی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

”عریشہ کو صرف فینٹسی تنگ کر رہی ہیں۔ شاوی کے بعد خود سیٹ ہو جائے گی۔“ ثانیہ بے فکری سے بولی۔  
 رہی بات نافع کی تو ابھی اسے اس بات سے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ چھوٹا ہونے کے باوجود پہلے اسے دولہا بنایا جا رہا ہے۔ وہ دن بعد دیکھنے گا باجپیس کھلی جا رہی ہوں گی۔“

”چپ کر۔ بد تمیز!“ سردہ ماں کے سامنے ایسی بات سے جھینپ گئی۔

”ثانیہ پھر نہیں دی تھی۔ آج کل اسے بات بے بات ہنسی آتی تھی۔“

عذرا بیگم فکر مند تھیں۔ نافع جس طرح فحاشی سے اٹھ کر گیا تھا۔ انہیں سوچ میں مبتلا کر گیا تھا۔ ثانیہ اور سردہ عریشہ کے لیے شکون کے جواڑے اور دیگر سامان کی پیکنگ کر رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ وہ لاؤنج سے باہر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ عذرا بیگم اس کے قریب آئیں۔

”کیا سوچ رہا ہے میرا بیٹا!“ وہ محبت سے پوچھنے لگیں۔

”میں کیا سوچ سکتا ہوں امی!“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اور مجھے کچھ سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“

”کیوں؟“ عذرا بیگم نے پوچھا۔  
 ”اس لیے کہ میرے بارے میں سوچنے والے ہر شخص سے متعلق فیصلہ کرنے والے مجھے ہر فیصلے سے آگاہ کرنے والے بہت لوگ ہیں یہاں۔ میں۔ میں۔ میں۔ کچھ سوچ کر لیا کروں گا۔“

”نافع! تم ناراض ہو ہم سب سے؟ مجھ سے؟“

”نافع نے بے اختیار ہی اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔“

”نہیں امی۔ میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ میں آپ سے ناراض ہو بھی نہیں سکتا۔ بہت کچھ کر گزرتا میں۔ لیکن آپ کا خیال کتاب کی محبت مجھے بے اختیار رکھتی ہے۔“

”بھئی! میرا چاند!“ انہوں نے جبک کر اس کے بالوں پر بوسہ دیا۔ ”ماں کو خوش رکھنے والے۔ ماں کو خوش دیکھنے کے معنی ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ نافع۔ یاد رکھنا، میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔“

”لیکن اندیشے تنگ کرتے ہیں امی!“ وہ کچھ دیر بعد بولا تھا۔ ”آپ نہیں جانتیں۔۔۔ معنی سے نکاح اور نکاح سے اب تک کا وقت بہت بے چینی اور بے اعتباری سے گزارا ہے، میں نے۔“

”میں سب جانتی ہوں نافع!“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ ”ماں ہوں تمہاری، کیا پوشیدہ رہ سکتی ہے تمہاری بے چینی مجھ سے؟ لیکن میرے بیٹے! مشترکہ خاندان کو جوڑے رکھنے کے لیے بہت سے دریا پار کرنا ہوتے ہیں۔ بہت سی اُن چابی باتوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ ہونٹ سے رہنمائی عقل مندی ہے۔“

”عقل مندی؟ زندگی ہی برباد کر دے ماں؟ پھر نہ؟“ اس نے قدرے طنز سے کہا۔  
 ”نہیں بیٹا! ایسا نہیں ہوتا۔ صبر کا پھل میٹھا ہی نکلتا ہے۔ بس امید اچھی رکھو۔“

”وہ میرا ساتھ یا کہ بہت ناخوش ہے امی۔“ وہ جیسے سرگوشی میں بولا۔ ”کیا امید رکھوں؟“

”میں تمہیں منع بھی کر رہی ہوں لیکن تم باز نہیں آئیں۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”تم نہیں جانتیں میں جانتی ہوں“

دوسری جانب سے کچھ کہا گیا۔ امیر حسن نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا تھا۔  
 ”اوہ! میں۔ نوڈاؤٹ۔ بابا بابا۔ تو تمہیں یاد ہے؟“  
 وہ مسکراتے ہوئے دوسری جانب سے ہونے والی گفتگو سننے لگا۔

”شی ازناٹ اونٹلی پر پڑی۔۔۔ بیٹ ڈفرنٹ۔۔۔ کچھ الگ سا ہے اس میں۔“ وہ اپنا کپ اٹھا کر اندر لاؤنج میں چلا آیا۔  
 ”تو جانتا ہے یا؟ میں بہت دلچسپ ہوں۔ ہزار بار لڑکیاں دیکھی ہیں لیکن کچھ کہتی ہوئی کچھ چھپالی ہوئی آنکھوں کی بات ہی اور ہے۔ یہ میں نے اب جانتا ہے۔“

وہ نرم لیدر کے گداز صوفے میں دفھنس گیا اور کافی کے سبب لینے لگا۔  
 ”ہاں یا۔۔۔ اب تو کچھ سیریس ہی لگتا ہے معاملہ صاف گوئی سے بتا رہا ہوں۔ میں کبھی کبھار بہت سنجیدگی سے سوچتا ہوں اس کے بارے میں۔“

دوسری جانب سے کچھ کہا گیا تھا۔

”کوئٹہ یا۔۔۔ ابھی اس سے کیا کہہ سکتا ہوں۔ ابھی ملا ہی کتنی بار ہوں۔ کیا؟ بابا بابا۔۔۔“  
 ایک ہی وار کافی ہوتا ہے بالکل۔“

لاؤنج میں اس کی بے فکر ہنسی گونجنے لگی تھی۔

”ضرور آئے۔ میں تو بے چین ہوں تمہیں دیکھنے کے لیے۔ تم بے ملنے کے لیے۔ ارنے یہاں۔ ایک بات بتانا بالکل بھول گیا۔ جانتے ہو شیری! میرے آفس میں تمہاری تصویر دیکھ کر مس رہیجہ نجانے کیوں بہت گم ہنسم سی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ تمہیں جانتی ہوں۔ حالانکہ وہ کبھی پاکستان سے باہر نہیں گئیں۔ اور تم کبھی پاکستان آئے نہیں۔“

وہ کپ خالی کر کے میز پر رکھنے لگا۔  
 ”میں خود حیران ہوا تھا۔ اب تم جلد سے جلد آؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں جنہیں میں میری جان اپنی جگہ کرتے ہیں۔ اور سنو! بابا کیسے ہیں؟“

پھر جیسے وہ مایوس ہوا تھا۔  
 ”چلو بس اللہ بستر کرنے لگا۔ میرا سلام کہنا انہیں۔ اوکے۔ اللہ حافظ۔“ اس نے فون آف کیا پھر کچھ سوچ کر مسکراتے لگا تھا۔

وہ بالکل خاموش بیٹھا ماں اور بہنوں کی کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ سب کی سب بے حد اہمک سے سب چیزیں چمکتے کانڈوں میں پیک کر رہی تھیں۔

”جوڑے لے تو لیے ہیں اب اللہ کرے عریشہ کو پسند آجائیں۔ اس کی طبیعت بھی عجیب ہے۔ وہ ہی لگتا ہے۔“ ثانیہ نے بے لاگ بھڑک دیا۔

عذرا بیگم نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں نافع کی وہاں موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ ثانیہ کھلکا لائی۔  
 ”اسے کیا بتا نہیں ہے اور اگر نہیں ہے تو سب سے پہلے اسے ہی پتا چلنا ہے۔ میم صاحبہ کا۔“

نافع ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ثانیہ اور سردہ حیران سی ہو کر عذرا بیگم کو دیکھنے لگیں۔  
 ”اسے کیا ہوا؟“

”میں تمہیں منع بھی کر رہی ہوں لیکن تم باز نہیں آئیں۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”تم نہیں جانتیں میں جانتی ہوں“

ماں کی تھوڑی سی محبت، ذرا سی ہمدردی نے جیسے کسی آبلے کا منہ کھول دیا تھا۔

”وہ بے عقل ہے۔ ابھی زندگی کو دیکھا ہی کہاں ہے اس نے؟ دلہن بنتی ہے تو عورت، عورت بن جاتی ہے نافع۔ اس کی آنکھوں پر دور اندیشی کی عینک خود بخود لگ جاتی ہے۔“

”جانے دیں امی۔! ایسا ہوتا تو دنیا میں کبھی کوئی گھر نہ بگڑتا، ایقان پھپھو کی مثال آپ کے سامنے ہے۔“

”پھر بھی نافع۔ کوئی ایک فریق اگر اپنا گھر بسائے رکھنا چاہے تو گھر ضرور بسا رہتا ہے۔ میں خود بھی اس سلسلے میں بہت فکر مند ہوں۔ اکثر اس بارے میں سوچتی ہوں۔ لیکن پھر تمہارے بارے میں سوچ کر بہت مطمئن۔ اور پرسکون ہو جاتی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں، عریشہ کم عقل اور جذباتی ہسی۔ میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔“

”آپ نے کہا امی! کہ ایک فریق اگر گھر بسائے رکھنا چاہے تو گھر ضرور رہتا ہے۔ لیکن اگر ایک فریق گھر اجاڑنے پر آمادہ ہو جائے پھر کیا ہو؟“

”ایسی باتیں مت کرو۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”مرد ہو۔ مرد بن کر دکھاؤ۔ محبت کی نوا تنی تیز رکھنا کہ ناخوشی موم بن کر پگھل جائے۔ بیٹا! میں تم سب کو ہمیشہ ہنستا ہوں، کھنٹا چاہوں گی۔ رافع کی جانب سے مجھے بہت خوف ہے۔ اس کے انداز مجھے خوف زدہ کر رہے ہیں۔ لیکن تم میرے بہت پیارے بیٹے ہو۔ مجھے تم پر پورا یقین ہے۔“

نافع نے ان کا ہاتھ پکڑ کر عقیدت سے چومایا۔

”میں آپ کے یقین پر پورا اترنے کی اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔“

عذرا بیگم بے فکر ہو کر ہنس کر اوی تھیں۔



”یہ کیٹلاگ ہی دیکھ کر کچھ بھوٹ دو منہ ہے۔“ عریشہ کی سب سے بڑی برہان بیٹی اشلی آتھی۔

”میں یہاں تمہاری شادی کی شاپنگ کروالانے آئی ہوں۔ تمہاری اس جائد خاموشی سے اڑنے نہیں آتی۔“

”آپ۔! چو آپ کرنے آئی ہیں، کیجئے۔ شاپنگ کرنے آئی ہیں تو شاپنگ کریں۔ ہر بات میں میری رائے اور میری رضامندی کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”لو۔ یہ بھی کوئی بات ہے؟ بھی شادی تمہاری، پہننا اور ڈھنسا تمہیں۔ پسند بھی تمہاری ہو تو اچھا ہے۔ چلو ڈیزائن میں پسند کر لیتی ہوں۔ یہ بتاؤ کوئی رنگ ڈریسنگ کا رنگ کیا ہو؟“

وہ اس کا تباہ کن موڈ دیکھ کر مصالحانہ انداز میں بولی۔

”سیاہ! عریشہ سکون سے ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

”کیا؟“ اسے جھٹکا لگا۔ ”سیاہ؟ عروسی لباس؟“

”کیا حرج ہے؟ شادی خوشی کو کہتے ہیں۔ جب خوشی کا کوئی رنگ ہی نہ چمکے دل میں تو پھر سیاہ رنگ ہی مناسب ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو عریشہ!“ ماہین پریشان ہو گئی۔ ”تم اب تک اس ناراضی سے باہر نہیں نکلیں۔ اگر یہی معاملہ کرنا تھا تو اس وقت بولتیں، چیختیں، چلاتیں۔ اسٹینڈ لے لیتیں۔ اب ان فضول باتوں سے کیا حاصل؟“

عریشہ نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتی رہی۔

”اسٹینڈ؟ اسٹینڈ تو پھر کسی وقت بھی لیا جاسکتا ہے۔“

”کیا کیا مطلب؟“ ماہین ڈر گئی۔ ”دیکھو عریشہ! خاندانی لڑکیوں کے یہ اطوار نہیں ہوتے، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب خود کو سمجھا لو۔“

”سمجھانے کی بات کرتی ہیں۔ میں نے تو خود کو ماری لیا تھا لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔؟“

”کسی نے ایسی آگ لگائی ہے اس مرد وجود میں کہ راکھ بننے کے بجائے شعلہ بن گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے جلا ڈالوں سب کچھ۔“

”کس نے آگ لگائی ہے۔ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ ماہین پریشان ہو گئی۔ ”خدا کے لیے عریضہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا جس سے اس گھر کو اس گھر کے مکینوں کو کوئی صدمہ ہو۔ کوئی دکھ اٹھانا پڑے۔“

عریضہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”میں بھی تو اس گھر کی مکین تھی۔ کسی نے میرے بارے میں نہیں سوچا۔“ پھر وہ دکھ سے بولی۔ ”مجھے ایک اکائی ایک ذات نہیں سمجھا کسی نے کیوں آپی؟“

”میں جانتی ہوں عریضہ! تمہیں نافع دل سے قبول نہیں تھا۔“ ماہین نے افسردگی سے اس کے کان پر ہاتھ رکھا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم کسی اور کو پسند کرتی ہو ہر چند کہ تم نے کبھی اس سلسلے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن عریضہ! ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے ان معاملات میں وقت کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ وہ وقت نکل جائے تو پھر صبر ہی کرنا اچھا ہے۔ تمہارے ہاتھ میں اب کچھ نہیں ہے۔ جب تم متنی ہو گئے وقت خاموش رہیں ٹکاج پر مرہ لب رہیں تو اب کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ اب کچھ کہو گی۔ کچھ کہو گی تو سوائے زلت کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

منت سوچو بری باتیں۔ اچھی باتیں سوچو۔ یہ وقت انجوائے کرو۔ خوشی خوشی اپنی شادی کی خریداری کرو۔ ثانیہ کو دیکھو ناعمہ کو دیکھو۔ وہ دونوں انجوائے کر رہی ہیں یہ ناٹم پیر پڑے اور تم! آگ راکھ اور شعلوں کی باتیں کر رہی ہو۔“

عریضہ نے اس کی پوری بات سنی ہی نہیں تھی۔

”ناعمہ۔۔۔ ناعمہ انجوائے کر رہی ہے۔ یہ ناٹم پیر پڑے۔“

جاری ہے۔ فراز اس کا بن جائے گا۔ فراز اور چاند جس کی پچھوڑ بن کر تمنا کی میں نے۔ وہ فراز اس کا ہونے جا رہا ہے۔ جھوٹ سے دھوکے سے فریب سے ناعمہ اسے خالص کر لے گی۔ اپنی جیت پر فتح پر مسکرائے گی۔ اور مجھے نافع کے ساتھ دیکھ دیکھ کر ہنسے گی۔“

اس کا تخیل تیز تر ہونا لگا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں ناعمہ! میں تمہیں ہنسنے نہیں دوں گی۔ میں روؤں گی تو تمہیں بھی رو پڑے گا۔“

ماہین اسے خاموش بالکل خاموش پا کر بے دلی سے اٹھ گئی تھی۔

درد نہا کر بال سکھارہی تھی۔ کال بیل بجی تو اس نے کھو جتی نظروں سے ناعمہ کی تلاش کی پھر اسے غائب پا کر ٹھنڈی آدھ کر دروازے کی سمت بڑھی تھی۔

”آپ۔۔۔! دروازہ کھول کر اس نے بلند قامت کو سامنے پایا تو بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔“

”آپ۔۔۔ ہاں! رافع نے اس کے صبح چہرے پر ایک نگاہ کی پھر اس سے پرے دیکھنے لگا۔“

”چھپو۔۔۔ چھپو ہیں اندر؟ انہیں بھیج دو۔“

”نہیں۔۔۔ ائی تو نہیں ہیں۔“ درد کو حیرانی ہوئی۔ ”آپ اندر آجائیں کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔“

”چھپو نہیں ہیں۔؟“ رافع کو حیرانی ہوئی۔ ”کہاں گئی ہیں؟“

”مارکیٹ۔“

”لیکن انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ جائیں گی۔ وہ اکیلی کیوں چلی گئیں؟“

”شاید دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے۔“ درد اتنا ہی کہہ سکی۔

رافع نے سوچ کے عالم میں چند لمحے اس کے چہرے کو نظروں کی گرفت میں رکھا تھا۔ درد پر زل سی ہوئی۔ شانوں پر تولیہ پھیلائے لیے سیاہ بالوں کے حصار میں وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ پھر وہ دھیمے سے بولا۔ ”میں چلتا ہوں۔“

وہ پلٹا پھر جیسے پتھر کا ہو گیا۔ اس کے عین عقب میں ربیعہ کھڑی تھی۔ رافع نے اپنے جذلوں میں اس تیزی سے تبدیلی محسوس کی تھی کہ وہ خود ہی خوف زدہ ہو گیا۔ ربیعہ جو ابھی ابھی وہاں پہنچی تھی رافع کو دیکھ کر سٹپٹا گئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے رافع کی آنکھوں میں اترتے رنگوں سے نظریں چرا کر کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ رافع کی آواز میں خوشی کی آمیزش تھی۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”شکریہ خدا کا۔“ وہ مختصراً بولی۔

مود اور فیروز کی کاجی ٹیشن کے سوٹ میں اس کی رنگت دمک رہی تھی۔ آنکھوں میں شام کے سب ہی رنگ مسکرا رہے تھے۔ نرم لبوں پر وہی انہی مسکان تھی جو ان لبوں کا خاصا تھی۔

یہ ایک رافع کو عقب میں کھڑی درد کا اظہار تھا۔ وہ درمیان سے ہٹ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ ربیعہ نے بے ارادہ ہی گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر وہ چونک کر درد کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

”کیسی ہو درد؟“ وہ مسکرا کر آگے بڑھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ درد نے اسے راست دیا۔ ”آپ۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے مسکرائی۔ ”میں اس وقت کام سے آئی ہوں۔“

”اچھا لیکن کام کیا ہے؟“

”شہلا آپی کے کمرے سے ان کا کچھ ضروری سامان لینا ہے۔ دراصل ہاشم بھائی شہلا آپی کو اچانک ہی لے آئے تھے۔ بنا سامان کے۔ پھر شہلا آپی وہیں رک گئیں ہمارے پاس اب انہوں نے مجھے بھیجا ہے ان کے وارڈ روب سے کپڑے وغیرہ لینے ہیں۔ تم پلیر میز پر ملے ساتھ چلو میں ان کی ساس سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔“

”اچھا۔۔۔ میں یہ تولیہ رکھ دوں۔“ درد پٹی تھی۔ ”اور ناعمہ کو بھی بتا دوں۔“

فردوس بیگم نے خاصی خطرناک نظروں سے ربیعہ کو دیکھا تھا۔

”ہاشم نے تو ہم سے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ ہم کیسے اس کا کمرہ کھول دیں۔“

”جی۔۔۔! ربیعہ سٹپٹا گئی۔ قدرے نجل بھی ہوئی۔ ”آپ۔۔۔ آپ ہاشم بھائی سے پوچھ لیجئے۔ یا شہلا آپی سے۔“

”تمہاری آپی کے پیروں میں شاید مہندی لگی تھی۔ جتنا رستہ تم نے طے کیا اتنا وہ بھی تو کر سکتی تھیں۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی انہی تھیں۔ ربیعہ ایک مرتبہ پھر پانی پانی ہوئی۔

”آپی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو تو علم ہو گا۔“

”اے ہاں۔۔۔ ہم نے تو انہیں بیمار ہی پایا ہے۔“ انہوں نے کسی گوشے سے چابیاں برآمد کر کے ربیعہ کے ہاتھ پر رکھیں۔ ”یہ لو۔ کمرے کی اور الماری کی سب ہی چابیاں ہیں۔ ہمارا تو خیال ہے سب ہی سامان ایک بار ہی لے جاؤ۔ بار بار چکر لگانا پڑیں گے تمہیں۔“

”جی...!“ ربیعہ کامنہ حیرت سے کھل گیا۔

ان شعلہ بیانیوں کا ذکر بھی کبھی شہلا نے نہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کی تعریف کیا کرتی اور ادب سے ان کا ذکر کرتی تھی۔ ربیعہ کو شہلا سے عقیدت سی محسوس ہوئی۔

”تائی امی!“ روزہ نے انہیں تنبیہ کرنا چاہی پھر خاموش ہی ہو رہی۔

وہ دونوں مزید گفتگو سے بچنے کے لیے تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی تھیں۔ تب ہی کسی گوشے سے نکل کر  
اختر میاں چلے آئے۔

”آپ! یہاں!“ وہ ربیعہ کو دیکھ کر کھل سے اٹھے۔

ربیعہ بے طرح پریشان ہوئی۔ ایک مرتبہ پہلے بھی وہ کافی پریشان ہو چکی تھی۔

”آپ کی تعریف؟“ وہ وردہ سے پوچھنے لگے۔

”یہ میری دوست ربیعہ ہے۔ شہلا بھالی کی بہن!“

”بہت خوب۔۔۔ ایسے لوگوں کو خدا نہ جانے کتنی محبت سے بناتا ہو گا۔ کیوں باجی؟“

”ادھر آکر بیٹھو اختر میاں!“ فردوس بیگم بھنا کر بولیں۔ ”انہیں ان کا کام کرنے دو۔“

ربیعہ اور وردہ سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ آخر تمناں مسکو اترے ہوئے لیکن کے پاس آ بیٹھے۔

”جانتی ہیں باجی!“ اس لڑکی کو دیکھ کر ہمیں کیا یاد آتا ہے؟“

”کیا یاد آتا ہے؟“ انہوں نے ابو جرحہ سے کہا۔

”ایقان کی خواہی۔“ ان کی آواز اونداز میں عجب حسرت تھی۔ ”وہی سونڈھیں، وہی خوشبو، وہی روشنی۔“

”خدا کی پکار تم پر ہے۔ آہستہ بولو۔ یہ بھی شریف لوگوں کے مکرچنے کی باتیں ہیں۔ برائی لڑائیوں کے مارے میں۔“

اور ایقان کی یادوں کی ہو گی ہے جو اس کی جوانی یاد کرتے ہو۔

”ہا۔۔۔! وہ پندرہ برس پہلے کی بات تو نہیں پا جی۔“

نزدوں بیگم نے انہیں غور سے دیکھا۔

”بیابا کروادیں تمہارا لڑکی سے؟“ وہ ان کے قریب جھک کر سرگوشی میں پوچھنے لگیں۔

بابی؟ "ختر میاں کا منہ کھلا، کل کھلا رہ گیا تھا۔

ہاشم نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور گہری سانس بھر کر فائل بند کی۔ آج پھر اسے آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ ریو الونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے کمر سیدھی کرنا چاہی۔

تب ہی اس کے موبائل پر کال آئی تھی۔ ہاشم نے اسکرین پر کالر کا نام دیکھنا چاہا لیکن وہاں اجنبی فون نمبر تھا۔ ”ہیلو...!“ وہ تھکن کے احساس کے ساتھ بولا تھا۔

”ہیلو... مسٹر ہاشم...!“ دوسری جانب کسی کی گنجھیر خوبصورت آواز تھی۔

”جی... آپ کون ہیں؟“

”ہاں سیریس ابراہام بات کر رہا ہوں ابراہام جیلانی!“

ہاشم کی تھکن لمحہ بھر میں ہوا ہو گئی۔ وہ سیدھا ہوا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

”فرمائیے۔“ وہ بے حد محتاط انداز میں بولا تھا۔

دوسری جانب ابرار نے کھٹکھٹا کر اپنا گلا صاف کیا تھا گویا کسی اہم بات کی تمہید باندھ رہی تھی۔  
”بات قدرے لمبی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ اگر بہت مصروف نہ ہوں تو کچھ وقت لوں گا آپ کا۔ اور اگر اس وقت آپ بات کرنے کے موڈ میں نہ ہوں تو۔ میں پھر کسی وقت۔“  
”نہیں میں مصروف نہیں ہوں۔“ ہاشم نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ ”آپ کو جو کہنا ہے کہیں۔ میں بغور سن رہا ہوں۔“

اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل بند کی تھی۔ ابرار کے فون بٹن جیسے اس کے دماغ میں کسی علاقہ غیر و ممنوعہ کی کھڑکی کھول دی تھی۔ اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی اس کی سوچ نے مختلف سمتوں میں پرواز بلند کی تھی۔ پہلے تو میں ایک اہم سوال پوچھنا چاہوں گا ہاشم۔ ایسا سوال جس کا جواب مجھے میرے بہت سے اندازوں کے صحیح یا غلط ہونے کا پتہ دے گا۔

”پوچھیے۔“ ہاشم نے محسوس کیا کہ وہ ٹینشن کا شکار ہونے لگا ہے۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنی ٹانگیں پائنتی ڈھیلی کی تھیں۔

”آپ کے اور شہلا کے درمیان کبھی میرے متعلق گفتگو ہوئی ہے؟“ ابرار نے پوچھا۔ اس کے انداز میں بے حد اعتماد تھا جیسے اسے یہ سوال پوچھنے میں کوئی عار نہ ہو۔ ہاشم نے اپنے منہ پر قبضہ کر لیا۔ اسے احساس ہوا کہ ابرار کے لبوں پر شہلا کے نام نے اس کی شائستہ روی کو عجیب سی پٹائی ہے۔  
”نہیں کبھی بھی نہیں اور میرے اور میری بیوی کے درمیان کبھی آپ کا ذکر آئے بھی کیوں؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا تھا۔

دوسری جانب لمحہ بھر کے لیے سکوت سا طاری ہوا۔ ابرار نے سنبھل جانا۔  
”اس لیے کہ میں آپ دونوں کے لیے اس قدر اچھی یا۔۔۔ بد خواہ نہیں ہوں۔ آپ دونوں کی میری یاد دلاتا ہو گا۔“

”جی نہیں۔ اپنے متعلق میں بے حد وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے لیے عمر آپ کا حوالہ نہیں ہے۔“  
”اور نہ شہلا کے متعلق؟“ دفعنا ابرار کے لہجے میں چیخ مچا کر آئی۔ ”اس کے متعلق بھی آپ اپنا یہی وثوق استعمال کریں گے؟ آپ سمجھتے ہیں مسٹر ہاشم کہ شہلا مجھے بھول چکی ہے؟ بھول سکتی ہے؟“  
”آپ اپنا سوال کر چکے۔ جواب آپ کو مل گیا۔ اب اپنی بات کہیے۔“ ہاشم نے اس کا یہ سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے آپ کے موڈ کا اندازہ ہو چکا ہے۔ اس لیے زیادہ تمہید نہیں باندھتا۔ ہاشم! میں جانتا ہوں آپ ایک بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہنڈرڈ پرمینٹ آجنٹل مین۔ آپ کی اچھائی نے ہی آپ سے یہ بات کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ ورنہ شاید میں یہ طریقہ نہ اپناتا ہاشم! عمر کے بھلے کے لیے۔ میرے بھلے کے لیے۔ اور سب سے بڑھ کر شہلا کے بھلے کے لیے۔ شہلا کو دبی دوسرے دن سے دیں۔“

ہاشم کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے پورے بدن میں ایک ظالم تباہی بھرا تھا۔ اس کی ایک ایک نس کھینچ کر رہ گئی تھی۔  
”آپ کو یہ بات کہنے کی جرات کیسے ہوئی مسٹر ابرار۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”کہا آپ مجھے اپنے جیسا ایک کہنہ خیال کرتے ہیں؟ میرے لیے عورت وصال نہیں ہے مسٹر ابرار۔ میری بیوی میری ہم نفس ہے۔ آپ نے مجھے اتنا شریف خیال کیا کہ مجھے ہنسی آتی چاہیے جو کہ نہیں آ رہی۔ مجھے اس قدر شدید غصہ آ رہا ہے کہ اگر میں نے اس کا مکمل اظہار کیا تو میرے متعلق آپ کی رائے قطعاً تبدیل ہو جائے گی۔ میں اتنا بھی ”جینٹل مین“ نہیں

ہوں جتنا آپ نے سمجھا ہے۔“

اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ ابرار نے اس کا لفظ لفظ بغور سنا تھا۔

”آپ کو یقیناً غصہ آنا چاہیے۔“ وہ بے حد نرم لہجے میں بولا ”میں آپ کی جگہ ہوتا تو مجھے بھی آتا۔ لیکن پلیر ہاشم۔ پلیر۔ آئی بیک یو۔ اس وقت اپنے جذبات پر کنٹرول کرنے کی کوشش کیجیے۔ یہ بہت اہم گفتگو ہے۔ جس میں بہت حقیقت پسند ہونے کی ضرورت ہے۔“

”ریشٹل؟“ ہاشم طنزاً بولا۔ ”گویا ابھی جو ”مشورہ“ آپ نے مجھے دیا۔ وہ آپ کے حقیقت پسند ہو کر سوچنے کا ثبوت ہے؟“

”ہاشم۔ یہ بہت سے لوگوں کی زندگی کا۔ ان کی خوشیوں کا۔ ان کے آئندہ کا سوال ہے۔ آپ غصہ نہ کیجیے پلیر۔۔۔“ ابرار مزید نرم ہوا۔ ”یہ بات آپ کے احساسات پر ایک کوڑے کی مانند برسی ہوگی۔ میں اندازہ کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بتائیے کہ میں اور عمر۔ جو کہ ایک مثلث کے دو کونے ہیں۔ اور اپنے تیسرے کونے کے متعلق اچھی اور خیر خواہی ہے۔ ہم یہ بات چھیڑے بغیر کیونکر رہ سکتے ہیں؟ میں شہلا کی فطرت سے واقف ہوں ہاشم۔ وہ حساس، زود رنج اور قدرے بڑبڑیل ہے۔ ساری عمر کڑھتے ہوئے گزار دے گی لیکن خود اپنے منہ سے یہ بات نہیں کہے گی۔ وہ عمر کو مس کر رہی ہے۔ اپنی اہم شیوہ کہ وہ مجھے بھی مس کر رہی ہے۔ ایسے میں کیا یہ اچھائی کی ایک صورت نہ ہوگی کہ اتنے لوگوں کی اداسی کا بار ایک کندھا اٹھالے اور بہت سے دل کھل انھیں۔ غموں کے بوجھ سے آزاد ہو جائیں۔“

”کندھے کا انتخاب اچھا کیا ہے آپ نے۔“ ہاشم خشک انداز میں بولا۔ ”دادرتا ہوں۔“  
”ہاشم! یہ اچھا ہے کہ یہ واحد انتخاب ہے۔ اس کے سوا چار نہیں۔“

”وہ کیا ہیں ابرار؟“ ہاشم نے خود کو کاٹ لیا۔ بے پناہ تھکا ہوا محسوس کیا تو کرسی پر بیٹھ گیا۔ بات آپ محض اس رخ سے کر رہے ہیں۔ جہاں آپ خود کھڑے ہیں۔ اس ساری پتویشن کے بہت سے رخ ہیں۔ اچھائی اور بہتری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ عمر کو واپس ہمارے پاس بھیج دیں۔ وہ یہاں خوش تھا۔ اس معصوم بچے کو آپ نے ڈسٹرب کیا اس کے شفاف ذہن کو آپ نے بے عزت کیا۔“

”جسٹ اے منٹ ہاشم۔ آپ نے کیا کہا؟ عمر کو واپس آپ کے پاس بھیج دیں؟ آپ کے پاس؟“ وہ آپ کے پاس کب تھا؟ آپ تو صرف شہلا کو لے کر گئے ہیں ہاشم۔ عمر کو تو آپ وہیں چھوڑ گئے تھے اس کی نانی کے گھر۔“  
ہاشم کا ایک جیسے لہجہ اب تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ فاروق حسن اور فردوس بیگم کے بھرپور دباؤ کے باعث وہ کبھی بھی عمر کو واپس کے سارے ساز و سامان سمیت اپنا بیٹا بنا کر اپنے گھر نہ لے جاسکا تھا۔ اسے اس بات کی خواہش ضرور تھی لیکن شادی سے قبل ہی اسے یہ بات باور کرا دی گئی تھی کہ ”حیات ولا“ میں صرف وہاں کے کینڈوں کی نسل ہی پروان چڑھ سکتی ہے کسی اور کی نہیں۔“

ہاشم اس بات پر رضا مندی کا اظہار کر کے ہی شہلا کو حاصل کر لیا تھا۔ بعد میں کبھی بھی حالات ایسی کسی خوشگوار رنج پر نہ آسکے تھے کہ وہ اور شہلا عمر کو وہاں لے آتے۔ خود شہلا بھی فردوس بیگم کے رویے سے ناالاں تھی وہ اپنی اس خواہش سے دستبردار ہی ہو چکی تھی۔

”آپ خاموش ہو گئے؟“ ابرار کو جیسے اس کی خاموشی سے مسرت ہوئی تھی۔ ”اب تو میں آپ کے رخ سے پتویشن کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں مسٹر ہاشم۔ کیا کہتا ہے یہ رخ؟“ اس ازرائش یا کہیں یہ کچھ غلط بھی ہے؟“  
”اگر کہیں یہ کچھ غلط بھی ہے تو یہ آپ کی وجہ سے ہے ابرار!“ اب کے ہاشم کے لہجے میں بھی وہ پہلے والی سرد مہر نہ تھی۔ وہ جیسے بات کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔



”بات وہیں سے غلط ہے جہاں آپ نے غلطی کی۔“ اس نے اپنے الفاظ پر زور دیا۔ ”آپ نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی خراب کی۔ اسے سچ منہ دار میں لا کر تماچہ چھوڑا۔ اور اب جبکہ اسے ایک کنارہ میسر ہے۔ آپ پھر الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے ہیں۔“

”مجھے اپنے ماضی پر از حد شرمندگی ہے ہاشم! سب کچھ غلط کیا۔ سوائے ایک بات کے۔ میں نے اس سے جو محبت کی وہ سچی تھی۔ اور آپ کو برا محسوس ہو گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شہلا نے بھی مجھے ٹوٹ کر چاہا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں ہاشم! آپ نے کبھی اس کی محبت کی ہلکی سی رمتی بھی محسوس نہ کی ہوگی۔ جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ آج بھی جب وہ مجھ سے بات کرتی ہے تو اس کے لہجے میں اس پرانی محبت کی خاموش خوشبو ہوتی ہے۔ وہ خوشبو صرف میں محسوس کر سکتا ہوں۔ صرف میں۔“

ہاشم کو یوں لگا جیسے اس کا موی دل کسی تیز شعلے پر ٹھہرا ہو۔ قطرہ قطرہ۔ لڑکی بوندیں اس کے مساموں سے پھوٹ نکلیں۔

”ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا ہاشم! میرا اب بھی دعوا ہے کہ میں اسے چاہتا ہوں وہ بھی یقیناً میرے لیے وہی جذبات رکھتی ہے۔ ہمارا ایک بیٹا جسے ماں کی بھی ضرورت ہے اور باپ کی بھی۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جو خوبصورت ہے۔ مکمل ہے لیکن ایک حادثے نے اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اگر آپ کی قربانی سے یہ تصویر پھر سے جڑ جائے۔ پھر سے ویسی ہی خوبصورت اور مکمل ہو جائے۔ تو کیا آپ یہ قربانی نہیں دیں گے ہاشم؟“

ہاشم کے لب سختی سے باہم ہوسٹ تھے۔ وہ خلا میں گھور رہا تھا۔

”میں نے شہلا سے کہا تھا کہ اگر وہ میرے پاس لوٹ کر آتا ہے تو کسی صورت پر یکنیمیں بیٹا ہونے دے۔ وہ میری بات پر عمل کر رہی ہے۔ وہ اب تک پر یکنیمیں نہیں آئی۔ کیا یہ بات اس کا ثبوت نہیں ہے؟“

شہلا بھی اسی ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی تصویر میں زندہ ہے؟ پلٹ کر ہاشم! آپ اس سے محبت کے دعوے دار ہیں۔ میں اس میں کسی قسم کا شک نہیں پاتا لیکن محبت کبھی کبھی ثبوت کے طور پر بہت کچھ مانگ لیتی ہے۔ کیا آپ شہلا کو خوش رکھنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک بچہ اپنی ماں کو اپنے باپ دونوں کی محبت کے سائے میں پروان چڑھے؟ یا۔ پھر آپ صرف اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے اس خوبصورت تصویر کے ٹکڑوں کو بے رحمی سے منہ کر دیں گے؟“

ہاشم اتنا کچھ سن چکا تھا کہ مزید کی گنجائش ہی نہ تھی اس نے سیل آف کر کے ٹیبل پر ہیمنگ دیا پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ ابرار کا کہا ہوا لفظ لفظ اپنی بازگشت بنا رہا تھا۔

\*\*\*

”ربیعہ!“ منیزہ بیگم کچن میں داخل ہوئی تھیں۔

تندہی سے اٹھنے پر پوچھتے ہوئے ربیعہ چونک کر رہی۔

”جی امی؟“ اس نے پتھر آف کیا۔

”بہت مصروف ہو؟“ وہ ایک لمحہ گوا سے دیکھ کر محبت سے مسکرائیں۔

”میں عمر کے لیے ماربل کیک بنا رہی ہوں۔ بس پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔ آپ بتائیے کیا کہہ رہی تھیں مجھ سے؟ کوئی کام ہے؟“

”میں سوچ رہی تھی کہ گھر کی کتنی ہی چیزیں بے کار اور فرسودہ سی ہو گئی ہیں۔ کیوں نہ ایک چکر مارکیٹ کا

لگا لیں۔ انیقہ کہتی ہے وہ مصروف ہے۔ میں اور تم مارکیٹ چلیں؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ ”میں کیک کا بیڑ تیار کر لوں پھر اسے ادون میں رکھ کر نہالیتی ہوں۔ تب تک آپ بھی تیار ہو جائیں۔“

منیزہ بیگم نے دیکھا۔ وہ پسینہ سے بھیگ رہی تھی۔ انہوں نے دم پر رکھے چاولوں پر نگاہ کی پھر وہ اس کے قریب آئیں اور اس کی پیشانی پر ہوسہ دیا۔

”میری بیٹی! میرا ہے ہیرا۔ جس کی زندگی میں شامل ہوگی اس کی قسمت کو جگمگا دے گی۔“

ربیعہ شرمندہ ہوئی اسے ایسی باتوں سے جھینپ آتی تھی۔

”جیتتی رہو۔ خوش رہو ہمیشہ۔“ انہوں نے محبت سے دعا دی۔

پھر وہ کچن سے نکل گئی تھیں۔ ربیعہ چند لمحے ان کی بے لوث محبت پر غور کرتی رہی پھر مسکرا دی۔ ایک مزیدہ پھر وہ جلدی جلدی کام نمٹانے لگی۔

کیک کا آمیزہ ادون میں رکھ کر ٹیمپریچر سیٹ کر کے وہ کمرے میں چلی آئی۔ مارکیٹ جانا تھا سوالماری سے اپنا استری شدہ جوڑا نکال کر وہ واش رووم میں گئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ نہادھو کر بالکل فریش ہو کر بالوں میں برش پھیرتے ہوئے منیزہ بیگم کے کمرے کی جانب بڑھی تھی۔

”ای جی!“ اس نے دستک دی۔

پھر کوئی جواب نہ آنے پر اس نے ہینڈل پر ذرا سا پاؤں والا توڑواڑہ کھلتا چلا گیا۔

”ای جی۔“ اس نے اندر جھانکا پھر اس کے اوشان خطا ہو گئے۔

منیزہ بیگم اپنے کپڑوں کی التاری کے قریب گزری ہوئی تھیں۔ وہ بے ہوش معلوم ہوتی تھیں ربیعہ کے لبوں سے چھ لگی تھی۔

\*\*\*

ہاسٹیل میں سب ہی ان کے قریب موجود تھے۔

عباد شہلا! ”انیقہ“ عمر ہاشم اور ربیعہ! ”منیزہ بیگم نے دھیمے سے مسکر کر ان سب کے چہرے دیکھے۔

”یہ مجھے یہاں کیوں لگے؟“ وہ قدرے نقاہت سے بولیں۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ عباد۔ بیٹا۔ مجھے گھر لے چلو۔“

”ضرور چلیں گے ان شاء اللہ۔“ وہ بشارت سے مسکرایا۔ ”آپ فٹ فاٹ ہو جائیں تو ابھی چلتے ہیں۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے اصرار کیا۔

”ہمیں بھی توبہ چلے۔“ وہ بھی مصر ہوا۔

”تمہیں میں بستر سے اتر کر چل پھر کر دکھاؤں؟“ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں آپ کے کہے پر نہیں۔ ڈاکٹر کے کہنے پر اعتبار آئے گا؟“

انیقہ بولی تھی۔ کب سے ٹال رہی ہیں بیماری کو۔ کسی سے کچھ کہتی نہیں۔ درد ہوتا ہے چپ چاپ سے جاتی ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے امی جی! بس اب آپ بالکل صحت یاب ہو کر یہاں سے اٹھیں گی۔“

منیزہ بیگم نے اس کا خفا خفا سا انداز دیکھا اور بے بسی سے مسکرائیں۔

”مجھے ان اسپتالوں سے سخت خوف آتا ہے انیقہ! اسپتال کے بستر پر لیٹنا مجھے خوفزدہ کرتا ہے۔ میں نہیں لیٹ سکتی۔“

”خیر سے کسی کام سے آئی ہو۔“ شفیقہ حیات قدرے ناراضی سے بولیں۔ ”ہم سمجھے ہماری محبت نے بالآخر جوش مارا۔۔۔؟“

”اماں۔۔۔“ ایقان نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اتنی بدگمان ہیں مجھ سے؟ میں نے کہا تھا آپ تو جیسے میرے خون میں رواں ہیں۔ ہر وقت آپ کی محبت کا احساس رہتا ہے مجھے۔ ماں سے بڑھ کر دنیا میں چاہے جانے کے لئے کون ہے؟ میں بھی ماں ہوں، پورا اندازہ ہے مجھے۔“

”ٹانہ اور نافع کی تاریخ ٹھہر گئی۔ کتنے چکر کاٹنے عذرا اور بچیوں نے بازاروں کے۔ تو نے نہ پوچھا اگر کسی بات کا۔ ایسی ہوتی ہیں مہینو پھیاں۔“

اب نموں نے واضح اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

”اب رہتے بھی دیں نا اماں!“ عذرا بیگم جلدی سے بولی تھیں۔ ”وہ بے چاری آئی تھی ہے تو اسے پریشان تو نہ کریں۔ اور وہ چھوٹے بچوں کی ماں۔ اسے کہاں اتنا تاگم کہ وہ ہمارے ساتھ پورا پورا دن بازاروں میں خوار ہو۔ تم

ایقان مدھم سا مسکرائی تھیں۔ ”سکراہٹ اس کے چہرے پہ بجتی نہ تھی۔“

”مجھے اپنی کوتاہیوں کا اندازہ ہے بھلائی بیگم۔“ وہ لڑکتیلی سے بولی۔ ”بکھی بہت شوق تھا ان سارے کاموں کا۔

بہت بے تابیوں سے سوچا کرتی تھی کہ ”جیسا کہ“ میں خوشیاں اتریں گی تو ہر کام میں بھرپور حصہ لوں گی۔ ساری

تیا ریاں کرواؤں گی۔ بھاپ کی طرح اڑ گئیں ساری تمنا میں پتے ہوئے دل پر تے۔“

اس کا لہجہ بھرا تھا۔ اس نے خود پر بمشکل قابو پایا۔

”خیر سے کسی کام سے آئی ہو۔“ شفیقہ حیات قدرے ناراضی سے بولیں۔ ”ہم سمجھے ہماری محبت نے بالآخر جوش مارا۔۔۔؟“

”اماں۔۔۔“ ایقان نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اتنی بدگمان ہیں مجھ سے؟ میں نے کہا تھا آپ تو جیسے میرے خون میں رواں ہیں۔ ہر وقت آپ کی محبت کا احساس رہتا ہے مجھے۔ ماں سے بڑھ کر دنیا میں چاہے جانے کے لئے کون ہے؟ میں بھی ماں ہوں، پورا اندازہ ہے مجھے۔“

”ٹانہ اور نافع کی تاریخ ٹھہر گئی۔ کتنے چکر کاٹنے عذرا اور بچیوں نے بازاروں کے۔ تو نے نہ پوچھا اگر کسی بات کا۔ ایسی ہوتی ہیں مہینو پھیاں۔“

اب نموں نے واضح اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

”اب رہتے بھی دیں نا اماں!“ عذرا بیگم جلدی سے بولی تھیں۔ ”وہ بے چاری آئی تھی ہے تو اسے پریشان تو نہ کریں۔ اور وہ چھوٹے بچوں کی ماں۔ اسے کہاں اتنا تاگم کہ وہ ہمارے ساتھ پورا پورا دن بازاروں میں خوار ہو۔ تم

ایقان مدھم سا مسکرائی تھیں۔ ”سکراہٹ اس کے چہرے پہ بجتی نہ تھی۔“

”مجھے اپنی کوتاہیوں کا اندازہ ہے بھلائی بیگم۔“ وہ لڑکتیلی سے بولی۔ ”بکھی بہت شوق تھا ان سارے کاموں کا۔

بہت بے تابیوں سے سوچا کرتی تھی کہ ”جیسا کہ“ میں خوشیاں اتریں گی تو ہر کام میں بھرپور حصہ لوں گی۔ ساری

تیا ریاں کرواؤں گی۔ بھاپ کی طرح اڑ گئیں ساری تمنا میں پتے ہوئے دل پر تے۔“

اس کا لہجہ بھرا تھا۔ اس نے خود پر بمشکل قابو پایا۔

”خیر سے کسی کام سے آئی ہو۔“ شفیقہ حیات قدرے ناراضی سے بولیں۔ ”ہم سمجھے ہماری محبت نے بالآخر جوش مارا۔۔۔؟“

”اماں۔۔۔“ ایقان نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اتنی بدگمان ہیں مجھ سے؟ میں نے کہا تھا آپ تو جیسے میرے خون میں رواں ہیں۔ ہر وقت آپ کی محبت کا احساس رہتا ہے مجھے۔ ماں سے بڑھ کر دنیا میں چاہے جانے کے لئے کون ہے؟ میں بھی ماں ہوں، پورا اندازہ ہے مجھے۔“

”ٹانہ اور نافع کی تاریخ ٹھہر گئی۔ کتنے چکر کاٹنے عذرا اور بچیوں نے بازاروں کے۔ تو نے نہ پوچھا اگر کسی بات کا۔ ایسی ہوتی ہیں مہینو پھیاں۔“

اب نموں نے واضح اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

”اب رہتے بھی دیں نا اماں!“ عذرا بیگم جلدی سے بولی تھیں۔ ”وہ بے چاری آئی تھی ہے تو اسے پریشان تو نہ کریں۔ اور وہ چھوٹے بچوں کی ماں۔ اسے کہاں اتنا تاگم کہ وہ ہمارے ساتھ پورا پورا دن بازاروں میں خوار ہو۔ تم

ایقان مدھم سا مسکرائی تھیں۔ ”سکراہٹ اس کے چہرے پہ بجتی نہ تھی۔“

”مجھے اپنی کوتاہیوں کا اندازہ ہے بھلائی بیگم۔“ وہ لڑکتیلی سے بولی۔ ”بکھی بہت شوق تھا ان سارے کاموں کا۔

بہت بے تابیوں سے سوچا کرتی تھی کہ ”جیسا کہ“ میں خوشیاں اتریں گی تو ہر کام میں بھرپور حصہ لوں گی۔ ساری

انہوں نے اچانک ہی اٹھنے کی کوشش کی۔

”مجھے بس گھر لے چلو۔ میں اچھی ہو جاؤں گی۔“

”پلیز ای، جی۔۔۔“ شہلا نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں لٹا دیا۔ ”ہم ضرور گھر چلیں گے۔ بس چند ایک ضروری

ٹیسٹ ہیں جن کے لیے آپ کو ایڈمٹ کیا ہے۔ ٹیسٹ ہو جائیں تو ہم چلتے ہیں۔ تب تک صبر کر لیں۔“

وہ بے بس ہو کر خاموش ہو گئیں۔

”مجھے خبر ہے۔ آپ کو مارکیٹ جانے کی جلدی ہے۔“ ربیعہ نے ماحول کو شکستہ کرنا چاہا۔ ”بے فکر رہیں۔ وہ

پروگرام بالکل میٹ ہے۔ ہم گھر جاتے ہی مارکیٹ چلیں گے۔“

”گھر جانے کی ضرورت کیا۔“ عباد بولا۔ ”رستے میں ہی اتر جانا۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ ربیعہ نے سر ہلایا۔

سب مسکراتے لگے تھے۔

”آپ لوگ میری نانہ کو تنگ نہ کریں۔ دفعہاً ”عمر دیر انداز میں بولا۔ ”وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہیں اور

آپ لوگ انہیں ایسی باتوں سے تنگ کر رہے ہیں۔ وہ بیمار ہیں وہ نہیں جائیں گی مارکیٹ۔“

سارے ہنس دیے تھے۔ منہ زور بیگم بھی سب کچھ بھول بھال مسکرا دیں۔

”اسلام علیکم۔“ وہ سنجیدہ سنجیدہ سی اندر داخل ہوئی تھی۔

شفیقہ حیات اور عذرا بیگم چونک اٹھیں۔

”و علیکم السلام۔“ دونوں ہی قدرے پر جوش انداز میں بولی تھیں۔

عذرا بیگم نے اٹھ کر اس سے محبت سے معاف کیا۔ وہ ان کے بل کر مائیں کی جانب آئی۔ بچی انہوں نے اس

کی پیشانی چومی۔

”شکر ہے تیری صورت نظر آئی۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”ایقان! تو ماں کو بھی بھول گئی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں اماں!“ وہ تھکے تھکے انداز میں ان کے قریب بیٹھ گئی۔ ”آپ تو میرے خون میں گھلی ہوئی

ہیں۔“

”پھر تو یقیناً شوگر ہوگی آپ کو۔“ اندر آتا ہوا رافع شرارت سے ہنسا تھا۔ ”اتنی سوچیں سوچیں سی رادی جان

جس کے خون میں گھل جائیں۔ کیوں رادی! دادا ابو کو شوگر کبھی؟“

”کیا الناسد حا بول رہے ہو؟ عذرا بیگم خفا ہوئیں۔ ”بیاریوں کو مذاق میں بھی یاد نہیں کرتے۔“

”آپ سنائیں پیچھو! کیا حال چال ہیں؟“ وہ ایقان کے قریب بیٹھ گیا۔ ”خفگلوں کو کچھ افاقہ ہے یا اب بھی

سارے جہاں سے نالاں ہیں۔“

”اتنے شوخ ہو رہے ہو۔“ ایقان نے اسے گھر کا۔ ”خیریت؟ بھابی بیگم۔ کہیں اس کی ڈیٹ بھی تو فکس نہیں

ہوگئی ٹانہ کے ساتھ ہی؟“

”تم اسے سمجھاؤ۔“ شفیقہ حیات بولیں۔ ”شاید تمہاری ہی سن ہے۔“

”پہلے تو سب مل کر پیچھو کو سمجھائیں۔“ رافع نے تقہر لگایا۔ ”یہ کسی کی سنیں گی؟“

ایقان قدرے جزبزی ہوئی۔

”زبردست اندازہ نہیں ہو رہا ہے آپ کو۔“ وہ نیٹ کنکٹ کرتے ہوئے شوخی سے مسکرایا۔

”ہاں ہو رہا ہے۔“ وہ ہولے سے ہنس دی۔ ”تب ہی پوچھ رہی ہوں۔“

رافع نے اب اس کی اکاؤنٹ انفرمیشن کھولی تھی۔ ایقان بھی قدرے جھک کر دیکھنے لگی۔

پھر ایک دو نوٹوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

”اتنے پیسے؟“ رافع نے حیران نظروں سے ایقان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہیکٹس لاکھ روپیہ پچھلے ماہ جمع کروایا

کیا ہے۔“

”عاشق نے اتنے پیسے۔“ ایقان متحیر و پریشان تھی۔

”کوئی فون آیا تھا ان کا؟“ رافع نے پوچھا۔

”نہیں۔ اور میں اسی لیے اکاؤنٹ چیک کرنا چاہتی تھی میں سمجھ رہی تھی کہ عاشق نے روپے بھی نہیں

بھجوائے ہوں گے لیکن اس نے تو۔“

”کہاں چلے گئے ہیں وہ؟“ رافع متفکر سا برہنہ پایا۔ ”اتنا روپیہ انہوں نے آپ کے اکاؤنٹ میں اسی لیے ڈلوایا ہوگا

تاکہ بعد میں آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔“

”بعد میں؟“ ایقان جیسے خوف زدہ ہوئی تھی۔ ”کیا مطلب بعد میں؟“

رافع چونکا پھر ہلکے سے مسکرا کر اس نے کرسی گھمائی۔

”میرا مطلب ہے جب تک وہ پاکستان نہیں آجاتے تب تک آپ کو یہاں کوئی مشغلہ نہ ہو۔“

”پاکستان؟“ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے رافع کا چہرہ دیکھا۔ ”وہ۔۔۔ یہاں کیوں آئے گا رافع! مجھے سچ بتاؤ۔“

کیا اتنے سارے روپے بھجنے سے اس کا یہ مطلب ہے کہ اس وقت وہ ہم لوگوں سے کوئی سلسلہ کوئی رابطہ نہیں رکھنا

چاہتا ہے؟ اپنے بچوں کے لیے؟“

رافع نے نظریں پڑالیں پھر وہ کمپیوٹر آف کرنے لگا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں پھپھو! ان سے کوئی رابطہ ممکن ہو تب ہی صحیح صورت حال کا علم ہو سکتا ہے۔ میں نے

امریکہ میں مقیم اپنے ایک دوست کو ان کا پتہ بھیجا ہے۔ وہ معلومات حاصل کر کے مجھے مطلع کرے گا۔ ان سے

ایک مرتبہ تفصیلی بات کرنا بہت ضروری ہے تب ہی صحیح صورت حال سامنے آئے گی۔“

\*\*\*

ضروری ٹیسٹوں کے بعد منیوزہ بیگم گھر آگئی تھیں۔ رپورٹس چند ایک دن میں ملنا تھیں۔ ہاشم ان کی خیریت

لے کر اٹھا تھا۔ عباد سے مصافحہ کر کے وہ باہر کی جانب بڑھا۔

یکن کے دروازے پر کھڑی شہلا نے حیرت سے جاتے ہوئے ہاشم کی پشت دیکھی تھی۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ

ہاشم اسے الوداع کہے بنا ہی چلا جائے۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے گئی۔ تب تک وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر چکا

تھا۔

”ہاشم! شہلا نے اسے پکارا۔“

وہ مڑ کر دیکھنے لگا۔ چند قدم اوپر کھڑی شہلا کو اس نے نجانے کن نظروں سے دیکھا تھا شہلا کو عجیب سے

احساس نے گھیرا۔

”آپ۔۔۔ جارہے ہیں۔۔۔؟“ اس نے بے معنی سوال کیا۔

”شاید نہ۔“ وہ شہجاری سے بولا۔

ہاشم نے پارک کا دروازہ دیکھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر اندر داخل ہو گیا۔

دو دونوں اس کاموڈیکھ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ اتنے میں باہر بھی چائے لے کر چلی آئی۔

میں کھا ہی لیتی ہوں لیکن پھر مارکیٹ چلتے ہیں۔ اس دن بھی نہیں جاسکے تھے۔  
ربیعہ کو بہت زور سے ہنسی آئی تھی۔

”یا اللہ۔ امی جی۔۔۔ آخر ایسی کون سی اہم شاپنگ کرنا چاہتی ہیں آپ۔ کچھ دن آرام کر لیں، مارکیٹ کون سا کہیں بھاگی جا رہی ہے۔“

”یہ کچھڑی میں اسی شرط پر کھاؤں گی۔“ وہ ضدی لہجے میں بولیں۔

ربیعہ نے دلچسپی سے انہیں دیکھا اور پھر ہنس دی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ اگر عباد بھائی پر تیش دے دیتے ہیں تو پھر چلے چلیں گے۔“

”ہمیں عباد کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ میں ماں ہوں اس کی۔ وہ میری ماں نہیں ہے۔“

ربیعہ ہنس ہنس کر دھری ہو گئی۔

”آپ اسپتال میں رہ کر بہت بزدلہ سنج ہو گئی ہیں۔“

”وہ ہم ہو گئی ہو۔ میں تو بہت چڑچڑی ہو کر آئی ہوں۔ یہ تمہارا حوصلہ ہے کہ مجھے برداشت کر رہی ہو۔“

ربیعہ ان کے قریب بیٹھ گئی اور اپنا سر ان کے شانے سے ٹکا دیا۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ ساری عمر آپ کے ساتھ گزار دوں۔ آپ نے مجھے کیا دیا ہے۔ میں لفظوں میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔ میرے اندر ایک پتھر تھا جسے آپ کی محبت نے میرا بنا دیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا کہوں امی جی۔“

منیزہ بیگم نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”اب اسے صرف تمہارے اندر نہیں تھی ربیعہ! پھر تو میرے اندر بھی تھی۔ اسے تم نے بچایا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میرے ہی وجود کا اکٹم گشتہ ہو گیا ہو۔ تم نے ان تینوں نے ربیعہ کا چہرہ تھام کر غور سے دیکھا۔ ”بارہا پوچھا تم

اسی لمحے عباد اندر داخل ہوا۔

”امی جی۔۔۔ امیر حسن آئے ہیں۔ آپ کی طبیعت کے بارے میں سن کر عیادت کے لیے آئے ہیں۔ ویسے بابی

واوے۔ یہاں کون سا جذباتی سین چل رہا ہے۔“

اس نے ربیعہ اور انہیں یوں سا جھٹکنا تھا کہ ہنسنے لگے۔

”اس سے تمہیں کیا۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔ ”یہ ہم ماں بیٹی کا معاملہ ہے۔ امیر حسن سے ہمارا کوئی پردہ تو

نہیں ہے۔“

”میں کچن میں جاتی ہوں۔“ ربیعہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چائے وغیرہ تیار کر لوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ عباد نے سر ہلایا۔ ”میں امیر کو پیس لے آتا ہوں۔ ڈرائنگ روم تو ذرا ٹکلف ہے۔“

ربیعہ کچن میں چلی آئی پھر وہ دفعیاً ”چونکی تھی۔ ڈرائنگ ٹیبل کی کرسی پر شہلا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے

پر اسی اور فکر کی انتہائی گہری لکیر تھی۔ ربیعہ اس کے قریب چلی آئی۔

”شہلا آئی۔۔۔“

”آں۔“ شہلا جیسے نیند سے جاگی۔ ”ربیعہ۔۔۔ کہو؟“

”کیا سوچ رہی ہیں؟“

”کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔ ”بس یونہی۔۔۔ یہاں بیٹھ گئی تھی۔“

”آپ کچھ پریشان لگتی ہیں۔“ ربیعہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”خیریت ہے نا؟“

”تمہاری بہن بہت بدل گئی ہے ماہین!“ نوین نے تبصرہ کیا۔

”اچھا۔“ ماہین پھینکی سی ہنسی دی۔ ”ہاں، یہ کچھ سنجیدہ مزاج ہو گئی ہے۔“ وہ ان دونوں کو چائے دینے لگی۔

”وہ جو تمہاری کزن ہے، کیا نام ہے اس کا؟“ نوین سوچتے ہوئے بولی۔ ”ناعمہ! وہ کیسی ہے؟ اس کی منگنی تو بہت اچھی جگہ ہوئی ہے۔“

عریشہ نے نگاہ اٹھائی، اس کے لب بھینچ گئے۔

”ہاں، وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔“ ماہین نے تائید کی۔

”پسند کی شادی ہو رہی ہے؟“ انہیں تجسس لاحق تھا۔

”شاید۔۔۔ ہمیں تفصیل نہیں دینا۔“

”کزنز میں بھی پردے ہوتے ہیں کیا؟ وہ بھی ہم عمر کزنز میں؟ عریشہ کی تو دوست ہے ناعمہ! اسے تو خبر ہوگی؟“

”تمہیں کیا دلچسپی۔۔۔ اس قصے سے؟“ ماہین نے جیسے برا مان کر طیبہ کو دیکھا۔

”میں جانتی ہوں تا فریحہ کو اس لیے تجسس ہے۔ برا مت ماننا لیکن وہ تو بہت ہائی فائی قسم کی فیملی ہے۔ وہ لوگ

یہاں رشتہ لینے آئے تو یقیناً اس کے پیچھے کوئی کہانی ہوگی۔“

”ہونے دو۔“ ماہین عریشہ کی صورت دیکھ کر بیزار ہو رہی تھی۔ ”تم لوگ چائے پو۔ یہ بتاؤ عریشہ کے کپڑے اور جیولری کیسی لگی؟“

”زبردست۔ بہت اچھی ہیں ساری چیزیں۔“ طیبہ نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ”بڑی کیسی بنائی ہے تمہاری چچی

نے؟“

”پتا نہیں۔ جب دیکھیں گے تو پتہ چلے گا۔“

”پتا نہیں کہنا، بڑی ایسی ہو کہ فراز والوں کی بری کے سامنے پھینکی نہ لگے۔ ویسے ان کا مقابلہ مشکل نہیں، ناممکن

ہے پھر بھی۔“

”خدا کے لیے نوین۔“ ماہین نے اسے جھٹک دیا۔ ”یہ مقابلہ بازی ہمارے ذہنوں میں نہیں ہے۔ ایسی باتیں

نہ ہی کرو تو اچھا ہے اور یہاں نہ نہیں، تین شادیاں ہیں۔ ثانیہ کی بری بھی آئی ہے۔ مقابلہ کس کس سے کیا جاسکتا

ہے۔ یوں بھی عریشہ، ناعمہ، ثانیہ، بہنیں ہی ہیں۔ ہمیں مقابلہ بازی نہیں کر تیں۔“

نوین اور طیبہ، ماہین کا موڈ خراب ہوتا دیکھ کر خاموش ہی ہو گئیں۔ چائے پی کر ان دونوں نے رخصت چاہی۔

عریشہ دنیا دانیہا سے گم اپنی جگہ بیٹھی سوچے چلی جا رہی تھی۔

\*\*\*

”ارے بھئی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ تم لوگوں نے کیا ولیہ اور کچھڑی کھانا شروع کر دیا ہے مجھے۔“ منیزہ بیگم

کچھڑی کی پلیٹ دیکھ کر بولی تھیں۔

ربیعہ ہنس دی۔

”ہم نے مانا کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ یوں سمجھیں کہ ہفتہ بھر کی صفائی منائی جا رہی ہے پیٹ کی۔ لہذا ولیہ اور

کچھڑی ہی کھانا ہوں گے۔“

”یہ پٹیاں تمہیں شہلا اور انیقا پر دھا رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔“ وہ روہانے انداز میں بولیں۔ ”خیریت۔ یہ تو



”ارے سب خیریت ہے۔“ اس نے بشارت سے مسکراتے کی کوشش کی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں دراصل ہاشم کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ کل میں نے کہا تھا کہ مجھے بھی لے جائیے گا۔ شاید بھول گئے۔ آج۔ آج بتا رہیں۔“

وہ متذبذب سی ہو کر خاموش ہو گئی۔  
 ”اوہ۔“ ربیعہ شوخی سے مسکرائی۔ ”تو یوں کہتے میاں جی یاد آ رہے ہیں اور بے فکر رہیے۔ وہ زمانے کو بھول سکتے ہیں لیکن آپ کو نہیں۔“  
 ”آجھا۔“ شہلا نے جیسے بھل کر اسے دیکھا تھا۔ ”یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟“  
 ”کتنی دقتوں سے تو آپ کو حاصل کیا ہے انہوں نے۔ بھلا بھول سکتے ہیں وہ۔“ ربیعہ کو اذیت دینا ہی کچھ بتا چکی تھی۔

شہلا جیسے اس کی کم عقلی پر تاسف سے مسکرائی۔  
 ”بھولنا اسے مشکل ہوتا ہے ربیعہ! جولا حاصل ہو۔ حاصل کو بھلانا نہیں یاد رکھنا مشکل ہے۔“ ربیعہ نے چند لمحے اس کی بات پر غور کیا پھر ہنس پڑی۔  
 ”آپ ہاشم بھائی کی محبت پر بھی شک کر سکتی ہیں ایسا؟ بہت بری بات ہے۔ ہم شہب تو آپ پر رشک کرتے ہیں کہ اتنا محبت کرنے والا جیون سا بھی ملا آپ کو۔“  
 شہلا نے گہری سانس بھری۔  
 ”زیادہ محبت بھی ایک مشکل ہے ربیعہ! تم نہیں سمجھو گی۔ میں تو دراصل سوچ رہی تھی کہ ماہین آئی ہوئی ہے کیا سوچے گی وہ۔ ایک نئی بھابی ہے وہ بھی اسے میکے بھاگ گئی۔“  
 ”تو فون کر لیں ہاشم بھائی کو وہ آفس سے انٹیں گے تو آپ کو بھی ملے گی خاناں گے۔“  
 دفعہ ”ربیعہ کو بہن میں اپنی آمد کا مقصد یاد آیا تو وہ چائے بنانے لگی۔  
 شہلا کچھ سوچتے ہوئے بہن سے باہر نکلی تھی۔

چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ ٹرائی سجا کر وہ کمرے میں داخل ہوئی تو منیوزہ بیگم کے ساتھ گفتگو میں مصروف امیر حسن اسے دیکھ کر بے ساختہ ہی کھڑا ہوا تھا۔  
 ”السلام علیکم۔“ ربیعہ نے شگفتگی سے مسکرا کر اسے سلام کیا۔ ”تشریف رکھیے نا۔“  
 ”وعلیکم السلام۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیسی ہیں مس ربیعہ آپ۔۔۔ اور۔۔۔ یہ اتنا کچھ آپ اسی کے لیے آئی ہیں۔ امیں پر ہیز کرائیں بھی۔“

ربیعہ دھیرے سے ہنس دی سوہ یقیناً دل چسپ شخصیت تھا۔  
 ”یہ ”اتنا کچھ“ نہیں ہے۔“ وہ منیوزہ بیگم کے ساتھ بیٹھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ”اور یہ امی کے لیے نہیں آپ کے لیے ہے اور آپ بالکل بھی تکلف نہیں کریں گے۔“  
 ”چلیں جناب ٹھیک ہے۔ سزا ہے تو سزا ہی سی۔“

”اس سزا میں ہمیں بھی برابر کا شریک ہوں۔“ عبادت حشر بولا تو سب ہنس دیے۔ ربیعہ چائے بنانے لگی۔  
 ”چینی؟“ اس نے اچانک نگاہ اٹھا کر امیر حسن سے پوچھا۔  
 اور تب جیسے امیر حسن کی چوری پکڑی گئی تھی۔ وہ اسے بے حد جذب اور لگن سے دیکھ رہا تھا۔ شوق، جستجو اور

دلچسپی سے بھرپور وہ نظریے اختیار جھک گئی۔ وہ اپنی چوری پکڑ لیے جانے پر شرمندہ تھا۔  
 ”چینی۔“ ربیعہ کو احساس ہوا کہ اس کی آواز گانہ پی گئی۔

”آپ کی مرضی۔“ وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے قدرے اعتماد سے بولا۔  
 ”آدھا کپ ڈال دو۔“ عبادت نے رس ملائی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے نکل اگیا تھا۔  
 ربیعہ بھی دھیرے سے ہنس دی۔ اس نے چائے بنا کر اس کے ساتھ بڑی کارنر ٹیبل پر رکھ دی۔  
 ”یار امیر! یہ رس ملائی لو نا۔ یہ اپنی ربیعہ آج کل اچھی بھلی شیفت بنی ہوئی ہے۔ روز کوئی نہ کوئی نئی چیز ہم پر آزماتی ہے لیکن آج کی ڈش واقعی اچھی ہے۔ ٹرائی کرنا۔“  
 امیر حسن بھی ٹرائی کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ ربیعہ چپکے سے کمرے سے باہر نکل گئی۔



رات کا آخری پہر تھا۔ عریضہ نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور برابر میں سوئی ہوئی ماہین کو دیکھا۔  
 ”خوش نصیب ہو آپ! اس نے دل میں اٹھتی ہوئی ہوک کو دبا کر سوچا۔“ نیند سے لطف اندوز ہونا قسمت والوں کا کام ہے۔ ہم سے حرام تعجب تو دن کو رات کو دن کرنے کے چکر میں ہی زندگی گزار لیتے ہیں۔“  
 آج پھر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آج پھر وہ کہہ کر ابھری تھی۔ ماہین کی سندیں پھر دل کے دکتے ہوئے تاروں کو چھیڑ گئی تھیں۔

فرانس۔ فرانز۔ فرانز۔ یہ نام اس کے لیے جیسے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ جب کبھی وہ اپنے خال پر صبر کرنا چاہتی تھی کسی نہ کسی کے لبوں سے اس نام کا ذکر سن کر رداشت کی حدیں ختم ہونے لگتی تھیں۔  
 ”ماہینا تم اسی وقت اسٹینڈ لے لیں۔“ ماہین نے چلی کہا تھا۔  
 ”اسٹینڈ تو پھر کسی بھی وقت لیا جاسکتا ہے۔“ اس کا جواب تھا۔

اسے اپنا جواب ابھی تک یاد تھا۔ وہ اپنی بات پر قائل تھی۔ سچ کہا تھا اس نے اور اب ہر گزرتا دن اسے کہتا تھا کہ ابھی وقت ہے۔ ابھی وقت ہے۔ وہ ابھی کسی کاغذ بننا اور تو کسی کی بن کر بھی نہ بنی۔ بن بھی نہیں سکتی۔ یہ بے کار کا زبردستی کا ناٹھ کبھی کسی کو خوش نہیں دے سکتا۔  
 ”وہ تعاقب بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا آجھا۔“ دل نے سفاکی سے کہا۔  
 وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی پھر اس نے ماہین کو دیکھا۔

یہ ناعمد۔ یہ کیسے پہنچی اس تک۔۔۔ وہ میرا تھا۔۔۔ میرا ہے۔۔۔ میں اس کی بھی میں اس کی ہوں۔“  
 وہ بیڈ سے اتر آئی پھر کسی ردیوٹ کی مانند چلتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی۔

”کسی کا ڈر نہیں ہے مجھے ہر خوف سے آزاد ہو چلا ہے یہ دل۔ بس ایک ہی لگن ہے وہ میرا نہیں بن سکتا تو ناعمد بھی اسے نہ پاس کے ناعمد نے اسے عریضہ بن کر بھانسا ہے میں اسے بتاؤں گی کہ میں کون ہوں۔“  
 وہ صوفے پر بیٹھی اور برابر میں رکھا فون سیٹ اٹھا لیا۔ فراز کا سیل نمبر اب تک یادداشت میں اسی آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔

بانی امت مسلمہ ﷺ

ہستارہا۔

”او گاؤ۔“ پھر وہ بولا۔ ”آپ کی معصوم کم عمر شخصیت بندے کو احساس نہیں ہونے دیتی کہ آپ اتنی برجستہ اور ذہین ہیں۔ ویسے جناب سفید فاموں کو ہم نے کبھی اتنا حاوی ہی نہیں کیا خود پر کہ ہم بھول جائیں کہ ہماری جڑیں دلی میں بھی ہیں۔“

ربیعہ اس کی بات کے پہلے جیلے پر کچھ محتاط سی ہوئی تھی۔

”ارو تو ہمیں خاص طور پر پرہیزگاری تھی تاکہ ہم اپنی تہذیب سے دور نہ ہو جائیں۔ شہر یار سے مل کر بھی آپ کو یہی احساس ہو گا۔ انگریزی ہم بولتے ضرور ہیں لیکن اردو بولنے پر آئیں تو سننے والے سنتے ہیں اور کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے بڑی شائستہ شائستہ باتیں کریں جیسے اس وقت دل چاہ رہا ہے۔“

وہ بہت موڈ میں معلوم ہوتا تھا۔ عموماً ”اتنی بے تکلفی سے اتنی زیادہ باتیں نہ کرتا نہیں تھا۔

ربیعہ ہولے سے کھینکاری۔ اس نے ہتھیلی پر رکھی کباب کی ٹکیہ کو دیکھا جسے وہ گولائی میں تراش کر اس فرائنگ بین میں رکھنا ہی چاہتی تھی جب تیل کی آواز پر اسے کچن سے نکلنا پڑا تھا۔

”کوئی کام تھا۔ آپ کھینچیں۔“ اس نے امیر حسن کو یاد دلانا چاہا اور نہ وہ تو بہت فراغت سے معلوم ہوتا تھا۔

”آں۔“ وہ چونکا۔ ”نہیں۔“ اس نے کورس۔ ”غالباً عباد سے بات کرنا دوسرا۔“ وہ پھر معمول کے انداز پر آگیا۔

”عباد بھائی تو گھر پر نہیں ہیں آپ نے ان کا سیل نمبر ڈالنا نہیں کیا؟“

”نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”تو کبھی سہا۔“ ربیعہ مسکرائی۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے عباد سے بات کرنا ہو تو پہلے گھر کا نمبر ہی ڈال کر دیا۔ ”وہ جیسے شرارت سے مسکرایا۔ ربیعہ پھر محتاط ہوئی تھی۔ امیر حسن کے انداز پر اسے تبدیل شدہ تھے۔

”میں ذرا بڑی تھی کچن میں۔“ اس نے جیسے معذرت اور خفیت چاہی تھی۔

”بڑی تو میں بھی تھا جناب اپنے آئس میں پھر کوئی میں نے وقت نکال کر نبھانے کیوں نہ مصروفیت کے لحاظ سے کبھی کبھی چوری کرنے کا جی چاہتا ہے۔“ اس نے جیسے جیسے چراتا بہت دلچسپ کام ہے ربیعہ۔ کبھی کیا ہے آپ نے؟“

یکدم باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ربیعہ چونکا اٹھی۔

”میرا خیال ہے عباد بھائی آگئے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”آپ ہولڈ کریں گے؟“

”نہیں۔“ وہ پھر سے ہنسنا۔ ”اس اوسکے خدا حافظ۔“

”آں۔“ ربیعہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ فون بند کر چکا تھا۔ ربیعہ نے قدرے حیرانی سے ریسیور کو دیکھا پھر فون بند کر دیا۔ اسی لمحے لاؤنچ کا دروازہ کھول کر عباد اندر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا جسے اس نے صوفے پر رکھ دیا اور خود کچن میں چلا گیا۔ ربیعہ اس کے پیچھے گئی۔

”امیر حسن صاحب کا فون تھا آپ کے لیے۔“ اس نے کباب فرائنگ بین میں رکھا اور آؤنج تیز کی۔

عباد کو لڑ سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔ لحد بھر کر کا۔

”امیر حسن سے تو میری ابھی بات ہوئی ہے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ قبل۔ میں رستے میں ہی تھا۔“

ربیعہ سٹپائی گئی اسے یہ تو مع نہ تھی۔

”پتا نہیں۔ شاید انہیں کوئی ضروری بات یاد آگئی ہو۔ آپ پوچھ لیجئے گا۔“

”ہوں۔“ اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔

رات کے گھرے سنانے میں ٹیلی فون سیٹ گود میں دھرے وہ اپنے اندر اترے ہوئے بناٹوں کو سننے میں محو تھی۔ ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا جو ذہن کے پردے پر یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جلنے، گڑھنے، سوچنے اور پھر کر گزرنے میں فرق تھا۔ اس کی ایک فون کال محض ایک فون کال نہ تھی۔ یہاں یہ ایک سوڈن تھا جس سے آگے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اندھا کنواں گھری کھائی خوشیوں سے بھری رہ گزری۔ جو کچھ بھی تھا اس کا اندازہ لگانا ممکن ہی نہ تھا۔

وہ اندھیرے میں بیٹھی لب کاٹتی رہی۔ کیا کرے؟ کیا نہ کرے؟ اسے فون کر لے۔ اسے فون نہ کرے اسے حقیقت بتا دے۔ اسے لاعلم ہی رہنے دے۔ زندگی کو نیا موڑ دینے کی کوشش کرنے یا پھر جو کچھ بھی ہے اسے اندر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لے۔ اس نے اپنے اندر آوازوں کو ابھرتا ہوا محسوس کیا۔ آوازیں ہی آوازیں۔ شور ہی شور۔ اس کے باپ کی آواز۔ اس کے سر پر ٹھہرا وہ بھاری ہاتھ۔ اس کی ماں کی آواز۔ اس کا رونا۔ تسکنا۔ رابعہ بیگم کی آواز۔ نافع کی آواز۔ اس کے بھائیوں کی آوازیں۔ ناعمہ کی آواز۔ ناعمہ کی بھینک۔ ناعمہ کے قہقہے اور پھر یہ آہستہ آہستہ ساری آوازیں اس ایک آواز میں مدغم ہوتی چلی گئیں۔ ناعمہ کے بلند آہنگ قہقہوں نے اس کی ہستی کو پر خچوں میں بانٹنے کی کوشش کی۔

سریشہ نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس کے وجود کے مہیب سمندر میں دل کسی بے آسرا کشتی کی مانند ڈول رہا تھا۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ براہ مہربانی پھر دیر بعد کوشش کیجئے۔ شکریہ۔“ شائستہ آواز میں ریکارڈ شدہ پیغام سنتے ہی اس کی بہت دیر سے رکی سانس آواز ہوتی تھی۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی، فراز کا سیل آف تھا۔ یقیناً وہ صبح تک آف ہی رہنا تھا۔ عربیہ کو احساس ہوا کہ وہ صرف بلکہ خود قسمت کی آواز ہے۔

مصروف جنگ تھی۔ بے حد مایوسی کے عالم میں اس نے ریسیور پر بات آگئی تھی۔ ”کریڈل پر رکھ دیا۔“

اس وقت جس عالم جنون میں وہ یہ حرکت کر گزری تھی بچانے پھر کبھی اس پر طاری بھی ہونا تھا یا نہیں۔ وہ وہیں بیٹھی لب کاٹتی رہی۔

”نہیں۔“ پھر اس نے سوچا۔ ”آج نہیں تو پھر سہی۔ میں اپنی آخری سانس تک یہ کوشش کروں گی۔ یہ وقتی جنون نہیں ہے ایک آتش نشان ہے جو نیند سے جاگے۔ اسے ہنسنا ہی ہو گا۔“

شیشوں سے باہر۔ بیگلی ہوئی رات۔ مدھم مدھم جلنے لگی تھی۔

\*\*\*

تیل کی آواز پر وہ کچن سے نکلی تھی۔ ایک ہاتھ پر کباب کی ٹکیہ رکھے دوسرے ہاتھ کی پشت سے ماتھے پر آتے بال ہٹاتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو۔“ نہایت مصروفیت کے عالم میں اس نے کہا تھا۔

”تسلیمات۔“ شائستہ انداز میں کہا گیا۔

ربیعہ کو آواز پہچاننے میں لمحہ بھر لگا۔

”وہ امیر حسن صاحب۔ کیسے ہیں آپ؟“

”بخیریت ہیں جناب۔“ وہ بشتاش سے انداز میں بولا۔ ”آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتے ہیں۔“

ربیعہ ہنس دی۔ ”لگتا نہیں آپ سفید فاموں کے ملک سے آئے ہیں۔ آپ تو دلی کے لگتے ہیں۔“

امیر حسن نے اس کی بات پر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ربیعہ کی بات اسے دلچسپ محسوس ہوئی تھی۔ وہ کافی دیر

ربیعہ نے بغور اسے دیکھا وہ کچھ پریشان سا لگتا تھا۔

”آپ کے لیے کھانا لگا دوں عباد بھائی؟ ناشتہ بھی بہت لائٹ سا کیا تھا آپ نے۔“

”ہوں؟“ وہ چونکا۔ ”نہیں ربیعہ! بھوک نہیں ہے۔“

”میں نے مٹر چاول اور چکن کباب بنائے ہیں۔ آپ کافیورٹ کبھی میٹن۔ ساتھ لوکی کا راستہ بھی ہے۔“

”میں۔۔۔ کچھ دیر لیٹوں گا ربیعہ۔“ اس نے جیسے معذرت کی۔

”آپ۔۔۔ ٹھیک تو ہیں؟“ ربیعہ کو وہ بہت تھکا ہوا، مست سا معلوم ہوا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”یہ کہاں ہیں؟“

”سو رہی ہیں۔ بس اب اٹھتی ہی ہوں گی۔ آج میں ضرور انہیں مارکیٹ لے جاؤں گی۔ کب سے ضد کر رہی

ہیں ٹھیک ہے نا عباد بھائی؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ بچھے بچھے سے انداز میں بولا۔ ”لیکن رات کو ان کے چند ایک ٹیسٹ اور ہوں گے۔ میں

انہیں اسپتال لے کر جاؤں گا۔ ان کی پچھلی رپورٹس کچھ اتنی ٹھیک نہیں آئیں۔ چند ایک ٹیسٹ کروا دیتے ہوں

گے۔“

”اللہ خیر کرے۔“ بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے نکلا۔

”میں کچھ دیر سوؤں گا۔“ عباد نے ایک گہری سانس بھری۔ ”تم لوگ تیار ہو جاؤ تو مجھے جگا رہنا۔ میں چھوڑ آؤں

گا۔“

”آپ ریسٹ کریں۔ ہم تو ٹیکسی میں بھی چلے جائیں گے۔“

عباد شکر سے انداز میں بچن سے نکل گیا تھا۔ ربیعہ بھی پر سوچ انداز میں کھڑی رہی۔

”آپ تیار ہیں امی؟“ سب کاموں سے فارغ ہو کر کپڑے تبدیل کر کے اس نے ان کے کمرے میں جھانکا۔

مینہ بیگم چونک اٹھیں۔

”ہاں ربیعہ! میں تو تیار ہوں۔ ذرا یہاں آؤ۔“ ربیعہ کمرے میں چلی آئی۔

مینہ بیگم ایک چھوٹی صندوقی کھول کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ربیعہ ان کے قریب بیٹھتے بیٹھتے اچانک چونک سی

گئی۔ صندوقی میں سونے کے زیورات بھرے ہوئے تھے۔

”یہ دیکھو ربیعہ۔“ انہوں نے صندوقی اس کے آگے کی۔ ”یہ زیورات شہلا کے والد نے میرے جواہرے

کے تھے۔ اس میں ان کے کئی خاندانی زیورات ہیں اور یہ۔ یہ سونا میرا حق مہر ہے۔“

انہوں نے چند چھوٹی چھوٹی نکلیاں اسے دکھائیں۔

”یہ تو۔۔۔ لاکھوں کا زیور ہے امی!“ ربیعہ حیران تھی۔

”ہاں۔۔۔ قریباً“ پچاس لاکھ مالیت ہوگی اس کی۔ میں اسی لیے مارکیٹ جانا چاہ رہی ہوں۔ مجھے اپنے سارے پاس

جانا ہے۔ یہ تین نکلیاں میں نے تمہارے نام کی رکھی ہیں۔ میں چاہتی ہوں، میں اپنی اور تمہاری مشترکہ پسند سے

تمہاری شادی کا زیور بنواؤں۔ رہے یہ خاندانی زیورات۔ تو ان پر شہلا، انیقہ اور عباد کا حق ہے۔ یہ ان کی دادی

پر دادی کے زیورات ہیں۔ جو سونا میرا ہے وہ میں نے سارے کا سارا تمہارے نام کر دیا ہے۔“

ربیعہ سے کچھ بھی بولا نہ جاسکا۔ وہ ششدر سی انہیں دیکھتی رہی۔

”اتنا زیور ٹیکسی میں لے جانا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ تم عباد کو جگا دو۔ اس سے کہو ہمیں صرافہ مارکیٹ تک

چھوڑ آئے۔ رہی کپڑوں وغیرہ کی شاپنگ تو وہ ہم خود چلے جائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“

”لیکن امی جی!“ وہ بے شکل بولی۔ ”جیسے سونا آپ کا ہے اس پر بھی میرا نہیں شہلا آپنی اور انیقہ کا حق ہے۔

بخدا مجھے محبتوں سے اتنا زیر بار نہ کیجئے۔ میں کیسے اتنا بوجھ اٹھاؤں۔۔۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ مینہ بیگم نے چند لمحے

اسے تنگنی باندھ کر دیکھا۔

”ربیعہ۔۔۔ پھر وہ جسے سرگوشی میں بولی تھیں۔“ مجھے تو لگتا ہی نہیں کہ تم کسی اور کو کھ سے پیدا ہوئی ہو۔ میری

مسا کو تمہاری صورت دیکھ کر کیوں قرار آتا ہے۔ میں سمجھ نہیں پاتی۔ تم مجھ سے ایسی پرانی باتیں مت کرو۔ جو

جس کا حق ہے وہ اسے ہی ملنا چاہیے۔ میں شہلا اور انیقہ کا حق تمہیں نہیں دے رہی۔ اپنا حصہ دے رہی ہوں

کیونکہ میرے دل نے تمہیں ہی مانا ہے۔“

ربیعہ کو جانے کیا ہوا تھا وہ ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی۔

”ربیعہ۔۔۔“ وہ دھیرے دھیرے اس کے بال سہلانے لگیں۔ ”جب ہم لوٹیں گے تب مجھے اپنے بارے میں

سب کچھ بتا رہنا۔ میں نے بہت انتظار کیا کہ شاید تم خود سے کچھ کہو۔ اپنا بوجھ بانٹنا چاہو۔ دل ہلکا کرنا چاہو لیکن شاید

تمہیں ہم پر۔“

ربیعہ نے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا اس کی آنکھیں موتی بہا رہی تھیں۔

”عباد بھائی نے ہی مجھے منع کر دیا تھا امی! صرف ان کی زبان کا بھرم رکھنے کے لیے میں نے بھی آپ سے کچھ کہا

نہیں ورنہ کتنی راتیں صرف اس سوچ میں مبتلا رہ کر گزار رہی میں نے کہ میں آپ سے جھوٹ بول کر اس چھبب

کے نیچے موجود ہوں۔“

”میں تمہیں تنگ نہیں ہوں امی! اب یہ خیال چھوڑ رہی۔“ انہوں نے اس کے آنسو پونچھے۔ ”لیکن اب سوچتی ہوں کہ

جانے کتنی سادگی اور مقدار میں لگتی ہیں۔ تمہارے اور انیقہ کے فرض سے جلد از جلد سکدوش ہو جاؤں تو

بہتر۔“

ربیعہ کو عباد کی بات یاد آئیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے مضطرب سی ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔

”میں آپ کو چھوڑ کر کبھی بھی کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔“ وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آپ انیقہ اور عباد

بھائی کی شادی کی تیاریاں کریں مجھے شادی وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔“

مینہ بیگم محبت سے مسکرائیں۔

”تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بھی تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”آپ نے کہاں جانا ہے؟“ ربیعہ ان کے سارے لہجے میں کسی گئی بات کا مطلب بالکل نہ سمجھی۔

”جہاں ایک دن سب نے جانا ہوتا ہے جہاں جانے سے پہلے ماں میں اپنی اولاد کے فرض سے سکدوش ہو جانے

کی اپنی سی کوشش تو ضرور کرتی ہیں۔ آگے ان کی قسمت۔“

”ایسی باتیں نہ کیا کریں امی جی!“ ربیعہ دل گرفتہ ہو گئی۔ ”آپ کو کوئی خوشی ملتی ہے مجھے یوں دکھی کر کے؟“

مینہ بیگم نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر جوم لیے۔ ربیعہ نے محبت سے انہیں دیکھا۔

”آپ اکثر میرے ہاتھ جو متی ہیں۔ میں نے بھی آپ کو شہلا آپنی یا انیقہ کے ہاتھ جو متے نہیں دیکھا۔“

”تمہارے ہاتھ دیکھ کر مجھے کچھ یاد آتا ہے اس لیے۔“

”کیا۔۔۔“ ربیعہ محبت سے ان کے سلونے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھنے لگی۔

”امی جی۔۔۔“ عباد اندر آیا۔ ”میں کچھ زیادہ ہی سولیا شاید آپ لوگوں کو دیر تو نہیں ہو گئی؟“

وہ دونوں چونک اٹھیں۔

”نہیں دیر نہیں ہوئی ابھی۔“ منیوہ بیگم معنی خیزی سے مسکرائیں۔ ”چلو، چلیں۔“



ربیعہ کے بہتیرا منع کرنے کے باوجود منیوہ بیگم نے وہی کیا جو انہوں نے کہا تھا۔ انہوں نے اپنے حصے کا سارا سونا ربیعہ کے زیورات تیار کرنے کے لیے جیولر کے حوالے کر دیا تھا۔

”تم مجھ سے بار بار مذاق میں پوچھتی تھیں کہ میں مارکیٹ آنے کے لیے اتنی بے چین کیوں تھی۔“ انہوں نے ربیعہ سے کہا۔ ”تو یہی وجہ تھی۔ میں یہ کام نمٹانے کے لیے از حد بے چین تھی۔ آج میں مطمئن ہوئی ہوں۔“ وہ دونوں جیولری شاپ سے نکل رہی تھیں۔ ربیعہ خاموش ہو گئی تھی لیکن وہ دل ہی دل میں سخت شرمندہ تھی۔ اس کے خیال میں منیوہ بیگم کی ملکیت پر ان کی بیٹیوں کا حق تھا۔ اسے انیقا اور شہلا سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

”کیوں نہ کچھ گرم کپڑوں کی شاپنگ کریں، سردی بس پہنچنے ہی والی ہے۔“ منیوہ بیگم نے مسرور سے انداز میں کہا۔ وہ اپنا بوجھ اتر جانے سے بہت خوش لگتی تھیں۔

”آپ نے اپنی ضروری کر لی۔“ وہ ہار مانے والے انداز میں بولی۔ ”جو چاہے سو کریں۔“

”اچھی بیٹیاں باپ کی باتیں مانتی ہیں۔“ وہ بردبار انداز میں بولیں۔

پھر وہ دونوں ایک شاپنگ پلازہ میں داخل ہو گئی تھیں۔ منیوہ بیگم ایک کپڑے کی دکان میں داخل ہوئیں تو ربیعہ ونڈو میں لگے ڈیزائن دیکھنے لگی۔ تب ہی کسی نے بے حد مسرت، جوش اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے اسے پکارا تھا۔

UrduPhoto.com

ربیعہ نے مڑ کر دیکھا پھر لمحہ بھر کے لیے جیسے پتھر کی ہو گئی۔

”ترانہ!“ اس کے لبوں سے سرگوشی کے عالم میں نکلا۔ ”ترانہ۔۔۔ تم۔۔۔ یہ تم ہو؟“

ترانہ نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔ عالم جوش میں وہ جیسے بولنا بھول گئی تھی۔ بس ربیعہ کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

”اوہ خدا۔۔۔ آج میں کچھ اور مانگتی تو وہ بھی ملتا۔“ آج وقت قبولیت تھا ربیعہ! پھر وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”آج گھر سے نکلنے وقت میں نے نجانے کیوں شدت سے تمہیں یاد کیا تھا۔“

دونوں بے اختیار ہو کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ چند لمحوں بعد انہیں آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگوں کا احساس ہوا تو وہ علیحدہ ہوئیں۔

”ایک منٹ ترانہ!“ ربیعہ بولی۔ ”میں ابھی آئی۔“

ترانہ کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے دکان میں داخل ہوئی تھی۔ منیوہ بیگم کاؤنٹر کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دکاندار انہیں مختلف کپڑے دکھا رہا تھا۔

”امی جی۔۔۔“ ربیعہ نے انہیں مخاطب کیا۔ ”میں باہر ہوں، آپ اطمینان سے شاپنگ کریں۔“

”خیریت؟“ وہ چوٹیں۔

”میں بعد میں بتاؤں گی۔“ وہ اسی تیزی سے باہر نکلی تھی جیسے اسے پھر سے ترانہ کے کھوجانے کا خدشہ تھا۔ ترانہ وہیں کھڑی تھی۔ ربیعہ اسے لے کر قدرے کم رش والے حصے میں چلی آئی۔

”اب کہو، تم یہاں کراچی میں کیسے؟“

”ایک لمبی داستان ہے۔“ ترانہ کی مسکراہٹ عجیب سی تھی۔ ”سننے کے لیے کم از کم بورا دن چاہیے ہوگا۔ بس مختصراً یہ کہ میں نے اور عبدالباری نے کورٹ میرج کرلی اور یہاں آگئے۔ خدا کے فضل سے باری کو اچھی نوکری مل گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہیں۔“

”اوسے اوسے پیچھے والے لوگ سب کیسے ہیں؟ منور پھینکا۔ مینا آئی۔ صولت۔ تصور اور تمدن بھائی۔ سب سب لوگ کیسے ہیں۔ میرے چلے آنے کے بعد کیا گزری وہاں۔“

ترانہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر مسکرائی۔

”بہت محبت سے بنایا ہے خدا نے تمہیں۔ تمہارے اندر کتنی محبت ہے ربیعہ! یونہی تو نہیں تم اتنی خوبصورت ہو۔ وہاں شاید ہی کبھی کسی نے تمہیں اس انداز میں یاد کیا ہو اور تمہیں اس طرح ان سب کے نام لے رہی ہو جیسے جیسے۔ کوئی بہت اپنوں کو یاد کرے۔“

ترانہ کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

”ہاں۔ کیا شک ہے اس میں۔ روئے زمین پر شاید اسی ایک گھر سے میرا خونی رشتہ ہے۔ ترانہ اور نہ تو مجھے کہیں اپنی جڑیں نظر نہیں آتیں۔“

”نی زمانہ خون پانی سے کم قیمت ہے ربیعہ!“ ترانہ دھیمے سے ہنس دی۔ ”مستمر جانوان خونی رشتوں کو۔“

”ایسے نہ کہو ترانہ!“ ربیعہ کو دکھ سا ہوا۔

”خیر۔ تم اپنی سناٹے عباد بھائی کے ساتھ آکر کوئی مشکل تو نہیں پڑی؟ کبھی کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟ تم سوچتی ہوگی کہ ایک آدھ مرتبہ فون کے بعد میں نے کبھی تم سے رابطہ نہیں کیا تو میری بہن! جب ساری داستان تمہیں سناؤں گی تب تمہیں حقیقت کا علم ہوگا۔“

”میں بہت خوش ہوں ترانہ! عباد بھائی کے گھر میں مجھے عجیب محبت مل رہی ہے۔ غرض محبت مخلصوں کا احترام کرو جانی سرخوشی۔ سچے گھرے رشتے جن میں کوئی غرض نہیں کوئی کدورت نہیں۔“

”شکر ہے خدا کا۔ میرے دل سے آج ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں اکثر تمہارے بارے میں سوچتی تھی کہ بنجانے تم کس حال میں ہوگی۔ تم ہمارے خاندان کا حصہ تھیں۔ تمہاری حفاظت ہمارا فرض تھا لیکن جب رکھوالے ہی دشمن بن جائیں تو۔“

وہ دل گرفتہ سی خاموش ہو گئی۔ ربیعہ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے مگر ترانہ نے جلدی سے خود پر قابو پایا۔

”میں تمہیں اپنا ایڈریس دیتی ہوں۔“ وہ اپنا پرس کھول کر پین نکالنے لگی۔ ”تم کل ہی مجھ سے ملنے آؤ۔ مجھے احساس ہوا ہے کہ دنیا میں میرا اپنا بھی کوئی ہے۔ ہم دونوں جی بھر کر باتیں کریں گے۔ اف خدا! میں کس قدر خوش ہوں۔ باری بھی تم سے تمہیں مل کر بہت خوش ہوگا۔“

وہ پتہ لکھنے کے دوران بھی بول رہی تھی۔ پتہ ربیعہ کو تھا کہ اس نے گرم حوشی سے اس کے ہاتھوں کو دبایا۔

”اوہی نارہیجہ!“

”یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ میرا تو بنجانے وقت کیسے گزرے گا کل تک۔“

”تم سے علیحدہ ہونے کو جی نہیں کرنا لیکن میں چند ضروری چیزیں لینے نکلی تھی۔ باری کے آنے سے پہلے مجھے کھانا بھی تیار کرنا ہے۔“

”کل میرے آنے سے پہلے ہی کھانا تیار کر لینا۔“ ربیعہ شرارت سے ہنسی۔

”ضرور۔“

”اچھا۔ خدا حافظ۔“ ربیعہ نے محبت سے ہاتھ ہلایا۔

ترانہ مڑ کر چل دی تھی۔ ربیعہ وہیں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر جب وہ ہجوم میں گم ہو گئی تب وہ مڑ کر سینہ بیکم کی طرف آگئی تھی۔

”کوئی مل گیا تھا؟“ انہوں نے اس کا چمکتا چہرہ دیکھا۔

”جی۔ میری پچھلی زاد بہن۔“

”پچھلی زاد بہن؟“ وہ تعجب سے بولیں۔

ربیعہ کو یاد آیا۔ عباد نے سب سے اس کے متعلق یہی کہا تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار یہاں نہیں ہے۔

”میں۔ میں گھر چل کر آپ کو بتاؤں گی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ہوں۔“ انہوں نے جیسے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ ”اچھا۔ یہ رنگ دیکھو۔ یہ سوٹ تمہارے لیے لیا ہے۔“

”نہ انقد کے لیے۔ تمہیں کون سا زیادہ پسند ہے؟“

ربیعہ ان کا دل رکنے کے لیے ان سے شاپنگ ڈسکس کرنے لگی ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ترانہ سے ملنے کے بعد اب اس کا کسی بات میں ہلکی سی دلچسپی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ سچ کا عرصہ پلک جھپکتے ختم ہو اور وہ اڑ کر ترانہ کے پاس جا پہنچے۔ اس کا ذہن اندرون لاٹھور کی پرچہ گلیوں میں بھٹک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

شہلا نے آٹھ مرتبہ بجنے پر وال کلاک کی جانب دیکھا اور پر سوچ انداز میں کچھ دیر بیٹھی رہی پھر وہ اٹھی اور جا کر ڈسٹنگ ٹیبل کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی اور اپنا عکس دیکھنے لگی۔

آج صبح وہ خود ہی اگلے چل آئی تھی بنجانے کیوں ہاشم اسے لینے نہیں آیا تھا۔ شاید وہ ان دنوں کچھ زیادہ ہی مصروف تھا۔ اتنا مصروف کہ اب اسے شہلا کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔

شہلا نے آئینے میں خود کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ قدرے کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھیں بے جان سی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے میرون رنگ کے لباس پر چڑھتی کا زرد دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ کبھی ان گہرے رنگوں میں اس کا چہرہ بہت پرکشش لگتا تھا لیکن آج شہلا کو اپنے چہرے پر ایک اداسی ایک بے رنگی کی کیفیت محسوس ہوئی۔

اس نے دراز کھول کر لباس نکالے اور ہونٹوں پر لگانے لگی پھر اس نے آنکھوں میں گہرا کاہل لگایا۔ چند لمحوں خود کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے جینوزی باکس میں سے اپنے ربی اور زرقون کے آویزے نکالے اور کانوں میں ڈال لیے۔

نیچے گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ شہلا بے قراری ہو کر کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں پھر باہر کی جانب چل دی۔ حقیقت یہ تھی کہ اتنے عرصے میں اس نے کبھی دروازے پر جا کر ہاشم کا استقبال کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی لیکن آج وہ اپنی کیفیات سمجھنے سے خود قاصر تھی۔

تیزی سے سیڑھیاں اترتی وہ نیچے چلی آئی۔ ماہین اور فردوس بیگم عذرا بیگم سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ عریشہ اپنے کمرے میں تھی۔ خنزہ اور علی بھی گھر میں موجود نہ تھے۔ شہلا نے لاؤنج کا دروازہ کھولا۔ ہاشم عین اس کے مقابل تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ حکم سے گئے۔

”السلام علیکم۔“ شہلا آہستگی سے بولی۔

”وعلیکم السلام۔“ ہاشم کو اسے گھر میں دیکھ کر یقیناً چیرانی ہوئی تھی۔

شہلا نے ہاتھ برہا کر اس کا برف کیس لینا چاہا۔ ہاشم نے چونک کر ہاتھ پیچھے کیا۔



”اٹس اوکے۔“

”نہیں دے دیجئے۔“ اس نے اصرار سے کہا۔

”رہنے دو یہ کافی فزنی ہے۔“

”دے دیں نا۔ میں کمرے میں رکھ دیتی ہوں۔“

ہاشم نے از حد حیرانی سے بادل خواستہ بریف کیس اسے تھمایا۔ شہلا نے سر جھکا کر اسے اندر داخل ہونے کا رستہ دیا تھا۔ ہاشم قدم بڑھاتا بھول گیا تھا۔ وہ اس کے آویزے دیکھنے لگا جو شاید اس نے پہلی بار پہنے تھے۔ شہلا مڑ کر چل دی، تب اس نے بھی چونک کر قدم بڑھائے تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ اس کے قدم گنتا اس کے پیچھے تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر ہاشم کو خوش گوار سا احساس ہوا۔ اس کے پسندیدہ ایئر فریئر کی دھیمی ممک میں بسا صاف ستھرا کمرہ سجا ہوا تھا۔ شہلا نے بریف کیس الماری میں رکھ دیا پھر مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”کپڑے چنچ کر لیں۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔“

”ہوں۔“ اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔

شہلا کو یاد آیا وہ جب بھی خوش ہوتا تھا اسے باہر کھانا کھانے کے لیے کہتا تھا۔

”قیمہ کر لیے بنے ہیں۔ آپ۔ آپ شوق سے کھا لیں گے؟“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”جو بھی ہو۔“

شہلا الماری سے پشت لٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہاشم کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے ٹالی کی ٹاٹ ڈھیلی کی پھر آستین کے بٹن کھولنے لگا۔

”کپڑے ڈرنگ روم میں لٹکائے ہیں میں نے استری کر دیے۔“

ہاشم نے اس کا سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔“

اس نے ٹالی گردن سے نکال کر پیٹکی پھر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

”آپ مجھے لینے کیوں نہیں آئے؟“

ہاشم نے چونک کر سر اٹھایا۔ شہلا نظریں جھکائے قالین کو گھور رہی تھی۔

”میں۔ میں آتا۔ آتا ابھی۔۔۔ دراصل کل مجھے ٹائم نہیں مل سکا۔“ وہ ہٹکایا۔

شہلا نے اب کی بار قدرے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ مجھے فون کر کے کہہ سکتے تھے لیکن آپ نے ایک مرتبہ فون تک نہیں کیا۔“

ہاشم کے ہاتھ میں اس کے موزے تھے وہ انہیں جوتوں میں رکھنا بھول گیا۔ ایسی شکایتیں تو اس نے خواب میں بھی ان کیوں سے نہیں سنی تھیں۔

”امی ایم سوزی۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ ”میں نے شاید خیال نہیں کیا۔“

”جی ہاں اب آپ کم ہی خیال کرتے ہیں۔“ اس نے پھر نگاہیں جھکا دیں۔

ہاشم کھڑا ہوا تھا چند قدم بڑھا کر وہ اس کے قریب آگیا۔ شہلا کو اپنے گالوں پر دوڑتی سرخی کا احساس ہوا۔ اس کا دل کسی نئی رفتار سے چلا تھا۔ ہاشم نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ قدرے سمٹ سی گئی۔ ہاشم نے وارڈروب کا دروازہ کھولا۔

شہلا نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ بیگر میں اپنی شرٹ لٹکا رہا تھا۔ شہلا خفیف سی ہو گئی۔

”کھانا۔۔۔ کھانا۔۔۔ اوپر لے آؤں؟“ وہ ہلکی سی آواز میں اتنا ہی پوچھ سکی۔

”نہیں، نیچے سب کے ساتھ کھاتے ہیں۔“

”نیچے تو۔۔۔ ابھی کوئی نہیں ہے۔۔۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ نرم لہجے میں بولا تھا۔ ”میں نما کر فریش ہوتا ہوں تب تک سب آجائیں گے لیکن پہلے ایک کپ چائے پلا دو تو بہتر ہو۔“

”میں ابھی لے آتی ہوں۔“ وہ تیزی سے باہر کی جانب بڑھی۔

ہاشم ایک بار پھر حیران ہونے پر مجبور ہوا تھا۔

\*\*\*

”یہ لو۔“ رابعہ بیگم نے ایک سفید لفافہ وردہ کی جانب بڑھایا۔

”یہ کیا ہے امی جی!“ اس نے اشتیاق سے لفافہ کھول کر اندر دیکھا پھر حیران ہوئی۔ ”یہ تو اچھی بھلی رقم ہے۔“

لفافہ کے اندر نیلے رنگ کے کئی نوٹ تھے وردہ نے رقم نکالی۔

”کتنے ہیں؟“

”پتا نہیں، ممکن لو۔ یہ اماں نے دیے ہیں۔ ان کی جانب سے ناعمہ کے لیے شادی کا تحفہ ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس رقم سے فرنیچر وغیرہ بنوایا جائے۔“

وردہ رقم گننے لگی۔

”پورے پچاس ہزار ہیں لیکن ٹالی امی نے اتنے زیادہ کیوں دیے؟“

”میں نے بہت منع کیا تب عذرا بھی ناراض ہو گئیں اور اماں بھی۔ مجھے ان کا تحفہ قبول کرنا پڑا۔ اماں

بہتے لگیں کہ وہ خود بھی آزاد کر سکیں لیکن صرف ناعمہ کی پسند شامل ہونے کے خیال سے رقم دے رہی ہیں

تاکہ ناعمہ خود اپنی پسند کا فرنیچر بنوائے۔“

”چلیں خیر ہے، وہ بھی ہمارے اپنے ہیں۔ انہوں نے تو ایسا سوچنا ہی تھا۔ آپ کا بھی بوجھ ہلکا ہو گیا۔“

”فراز کی والدہ جیڑو غیرو کے خلاف ہیں۔ وہ شاید یہ سب کچھ پسند نہ کریں۔“

وردہ خاموش سی ہو کر سوچنے لگی۔

”ایک مرتبہ فریڈ بتا رہی تھی کہ فراز بہت سلیکٹو ہے۔ اسے ہر چیز پسند نہیں آتی۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس نے

اپنا کمرہ بہت علیحدہ انداز سے فیکٹ کیا ہوا ہے۔ یونیک ڈیزائن کا فرنیچر خاص طور پر صرف کمرے کی بناوٹ کو مد نظر

رکھتے ہوئے بنوایا ہے۔ میرا خیال ہے انہیں فرنیچر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ یہ رقم ناعمہ کے اکاؤنٹ میں

ڈال دیں۔“

”ایسا کیوں نہ کریں کہ تم باتوں ہی باتوں میں فراز کا عندیہ لے لو۔ ہو سکتا ہے وہ فرنیچر تبدیل کرنا چاہے۔“

”اچھا۔“ وردہ نیم رضامندی سے بولی۔ ”چلیں یہ بھی کر لیں گے۔ ثانیہ کہہ رہی تھی کہ اس نے سینڈلز لیا ہیں

تو ساتھ ہی ناعمہ کی سینڈلز بھی لے لی جائیں۔ آپ سے اس نے کہا نہیں؟“

”کہا ہے۔“ وہ فراغت سے بیٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ ”ابھی رافع آفس سے آجائے تو ثانیہ اور ناعمہ کو مارکیٹ

لے جائے گا۔ تم بھی ساتھ جانا۔ اس ناعمہ کو تو کوڑی کی عقل نہیں ہے۔ صرف میچنگ چلیں لے آئے گی۔ تم

اسے ایسی سینڈلز دلوانا جو ایک سے زیادہ جوتوں پر چل جائیں۔“

وردہ متاثر سی نظر آنے لگی۔ ہر چند کہ ماں کی بات رو کر اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

”رہنے دیں امی!“ پھر وہ بولی۔ ”ثانیہ اور ناعمہ کو ہی جانے دیں۔ جو چیز بھی ہو وہ ان کی ذاتی پسند کی ہونا

لاؤنچ کے دروازے پر رافع کھڑا تھا۔ رابعہ بیگم بھی اُسے ساختہ کھڑی ہوئی تھیں۔ رافع کی نظریں دروازے کی نظریں سے ملیں۔ دروازہ مڑ کر کمرے میں چلی گئی۔  
 ”اور رافع!“ رابعہ بیگم نے سنبھل کر اسے پکارا۔  
 وہ چند قدم اندر چلا آیا۔

”السلام علیکم۔ باہر کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا میں نے سوچا لاؤنچ میں دستک دے دوں گا۔“  
 ”وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں ابھی تمہاری طرف سے آ رہی تھی۔ دروازہ میں نے ہی کھلا چھوڑا کیونکہ ثانیہ نے کہا وہ بھی پیچھے آ رہی ہے۔ بیٹھو۔“ انہوں نے رافع کا چہرہ بغور دیکھا لیکن کچھ اخذ کرنے سے قاصر رہیں۔

”میں ناعمہ کو لینے آ رہی ہوں پچھو! ثانیہ گاڑی میں بیٹھی ہے۔“  
 ”اچھا۔ میں ناعمہ کو بھیجتی ہوں۔“

”وہ کون ہے؟“ رافع نے پوچھا۔ ”وہ بھی ساتھ چلے۔“ وہ قدرے جھجک کر بولا۔  
 ”نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔ ”وہ نہ سنا۔ کچھ نہیں لیتا۔“

پھر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”وہ کل ماہین کے ساتھ باریکٹ جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

”بہتر پھر آپ ناعمہ کو بھیج دیں۔ میں اور ثانیہ گاڑی میں بیٹھے ہیں۔“ وہ اٹھ کر چل پڑا۔ رابعہ بیگم نے اس کے چوڑے شانوں اور دراز قامت کو دیکھ کر دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا تھا پھر وہ کوئی خیال آنے پر ورنہ اور ناعمہ کے کمرے کی جانب پرہیز۔

”میں نے کہا نا آپ! آپ جو بھی لے آئیں گی مجھے قبول ہو گا۔“ ناعمہ بے دلی سے کہہ رہی تھی۔  
 ”نا بابا میں کیوں لے آؤں؟ تم خود جاؤ اپنا کام کر لیں۔“

”آپ میرے سارے کام کر دیتی ہیں۔ اس میں کیا تامل ہے؟ ثانیہ بھی تو ساتھ ہے۔ آپ اور ثانیہ اچھی شاپنگ کریں گی۔“

”پلیز ناعمہ۔“ وہ زنج ہوئی۔  
 ”پلیز آپ!۔“

”ناعمہ۔“ رابعہ بیگم قدرے سختی سے بولیں۔ ”کیا مذاق ہے یہ؟ چلو اٹھو چادر لو اور جاؤ۔ وہ لوگ گاڑی میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

ناعمہ نے ماں کے تیور دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اب ایک لفظ مزید کہنا محال ہے۔ وہ چپکے سے اٹھی اور الماری کھول کر چادر نکالنے لگی۔ دروازہ کچھ کمرے سے نکل گئی تھی۔ رابعہ بیگم بیڈ پر بیٹھ گئیں اور کچھ سوچنے لگیں۔

\*\*\*

”تم یونہی مجھے تنگ کر رہے ہو۔“ وہ جھلائی تھیں۔ ”جانتے ہو ماں کو ستانا کتنا بڑا گناہ ہے۔“  
 ”جی جی۔ جانتا ہوں۔ آپ مجھے یہ گناہ کر لینے دیجئے۔ چلیں انھیں شہابش۔“ عباد نے چپیل لا کر ان کے قدموں کے قریب رکھ دیں۔

”دیکھو میرے زندگی کے جتنے دن ہیں وہ یہ ٹیسٹ کروانے سے بڑھ نہیں جائیں گے۔“  
 ”مصلح لازم ہے۔ شاید آپ نے سنا نہیں اور مجھے یہ جذباتی باتیں نہ سنائیں۔ میں نے آپ کے لیے ٹائم لیا

چاہیے۔ ناعمہ کو سچنگ سینڈلز کا کریم ہے تو چند سینڈلز زیادہ ہی لے گئی نا۔ کیا فرق پڑتا ہے میں نہ جاؤں تو بہتر ہے۔“  
 ”چلو۔ کوئی بات نہیں۔ لیکن تم اپنے لیے شاپنگ کر لینا۔ شادی سر پر ہے تم نے ابھی تک اپنے لیے کچھ نہیں خریدا۔“

”میں ماہین کے ساتھ جاؤں گی کل پاپا سوں۔“

رابعہ بیگم نے قدرے غور سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ دروازہ نگاہیں چرانے لگی۔

”دروہ۔ بیٹی۔ کیا تم رافع کے ساتھ جانے سے انکاری ہو؟“

”جی؟“ وہ چونکی۔ اس کے کمان میں بھی نہ تھا کہ رابعہ بیگم ایسی بات کہیں گی۔

”جی نہیں۔“ اس کے لبوں سے بے سوچے سمجھے نکلا۔

”مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔“ اب ان کی نظریں میں گہری تشویش اتر آئی۔ ”دروہ۔ بیٹی! یہاں آؤ۔ یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔“

دروہ آہستگی سے اٹھی تھی۔ مدھم چال چلتے وہ ان کے قریب چلی آئی۔ رابعہ بیگم نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے برابر بٹھالیا۔

”دروہ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسا رشتہ جو گیا ہے۔ وہ تم سے کڑیاں ہے تم اس سے خفا۔“

”نہیں میں تو کسی سے خفا نہیں ہوں۔“ اس نے عجلت میں ماں کی بات کالی۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“

”پھر یہ گریز کیسا؟ یہ تو محض دلوں کے میل کو ظاہر کر رہا ہے۔ کیا تمہارے دل میں اس کی جانب سے کوئی بدگمانی ہے؟“

”نہیں ای! کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی پھر ان کی جانب دیکھا۔ ”میرے دل میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ بات محض اتنی سی ہے۔“

رابعہ بیگم تھیرے اس کا چہرہ دیکھ گئیں۔  
 ”بس یہ اتنی سی بات ہے؟ اس بات پر تو زندگی کی خوشیوں کا وہ بیدار ہوا کرتا ہے ورنہ! تم اسے اتنی سی بات کہہ رہی ہو۔“

دروہ نے سر جھکا لیا۔ رابعہ بیگم متکرمی ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔  
 ”اور اس کے دل کی کو؟ کچھ خبر ہے؟ وہاں تمہارے لیے کتنی جگہ ہے؟“

”میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”غلط۔ یہ بات رافع کے علاوہ صرف تمہیں معلوم ہوگی۔ ایسے جذبے گلاب کے پھول ہوتے ہیں۔ نظروں آئیں تو ان کی خوشبو ان کی موجودگی کی خبر دیتی ہے۔“

دروہ کو لگا جیسے وہ روہنے والی ہے۔ ماں نے دل کے نازک گوشے کو نشتر سے چھیڑا تھا۔  
 ”بولو ورنہ! کیا تم دونوں ایک دوسرے سے بندھ جانے والے دو مختلف سمتوں کے نشان ہو؟“

”اس بات کی کیا اہمیت ہے امی؟“ وہ خم ناک لہجے میں بولی۔

”اہمیت ہے جی! میں اولاد کی خوشی کے لیے زمانے سے بغاوت کر سکتی ہوں۔ اگر تم اپنے دل کو رافع کے لیے آمادہ نہیں یا تم تو کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرو۔ زبردستی جانوروں کے ساتھ کی جاسکتی ہے انسانوں کے ساتھ نہیں۔ کیا تمہیں رافع پسند نہیں؟“

دروہ نے نظریں اٹھا میں پھر دھک سے رہ گئی وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔

”میر حسن کے کزن ہیں شہیار احمد! وہ بوکے سے آئے ہیں۔ میں نے کل ان لوگوں کو کھانے پر انوائٹ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کھانا بہت وی آئی لی قسم کا ہو۔ ویسے تو تم بہت ماہر ہو کوکنگ میں لیکن کل کمال ہی کر رہو تو اچھا ہے۔ امیر حسن تو خیر بہت سادہ مزاج آدمی ہے لیکن یہ شہیار صاحب کیسے ہیں، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ پہلا امپریشن اچھا پڑنا چاہیے۔ کیوں؟“

”جیسے ٹھیک ہے عباد بھائی!“ اس نے سر ہلایا۔  
”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟“

”کمال کرتے ہیں۔“ اس نے برا مانا۔ ”آپ صبح ناشتے کے وقت ڈشیز ڈیسائیڈ کر لیجئے گا۔ ایک مرتبہ مینیو سیٹ ہو جائے تو میں سامان بھی منگوا لوں گی اور اشارت بھی جلدی لے لوں گی۔“ عباد نے پیار سے اسے دیکھا۔  
”یہ انہی ایک نمبر کی کام چور اور بے ڈھنگی ہے۔ اسے تمہاری ہیلپ کے لیے کہا تو شاید تمہیں مزید پریشان ہی کرے۔“

”اس کی بدحوالی زوروں پر چل رہی ہے اسے تنگ نہ کریں۔ میں خود اپنی ہیلپ کر سکتی ہوں۔ سات آٹھ ڈشیز ہی ہوں گی نا۔ کوئی اتنا بڑا پروجیکٹ نہیں ہے جو آپ میرے لیے پریشان ہوں۔“

”مختینک یو سوچ۔“ وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔

”عباد بھائی! آج مجھے بازار میں ترانہ ملی تھی۔“

”رنگی۔“ عباد کو حیرت ہوئی۔

”جی، وہ بیاری سے شادی کر رہا ہے۔ اس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دیا ہے۔“

”تو براؤن اسے یہاں بلا لیتا تھا نا؟“

”میں نے تو اسے اپنا ایڈریس نہیں دیا، غلطی ہوئی پھر برسوں آپ مجھے ترانہ کے گھنرہ جھوڑ آئیں گے نا؟“

”میں کل رات ہی چھوڑ آؤں گا۔“ وہ ہنسا۔ ”جانتا ہوں تمہارے پیٹ میں کتنے تل پڑ رہے ہوں سبک۔ میں نے شاید کل دعوت کا کہہ کر غلطی کی۔“

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”آؤ اب۔۔۔“ عباد نے آواز پر فردوس بیگم نے مڑ کر دیکھا تھا پھر انہیں خاصی حیرت ہوئی۔

”جیتی رہو یہ ہمارے نصیب کیسے کھلے؟ ایقان بیگم ہمارے گھر آئیں۔ خدا کی قدرت! اسے کبھی انہیں تو کبھی گھر دیکھتے ہیں اپنا۔ بیٹھو۔“

ایقان صوفے پر ٹک گئی پھر اس نے لاؤنج کا جائزہ لیا۔ واقعی وہ کافی عرصے کے بعد آئی تھی وہاں کی سٹینڈ

تک تبدیل ہو گئی تھی۔ کئی اشیاء نئی معلوم ہوئی تھیں۔

”کوئی کیسی ہو؟“ وہ قریب آئیں۔

”شکر ہے خدا کا۔“ وہ آستکی سے بولی۔

”عاشرمیاں کی کوئی خبر؟“ وہ رازداری سے آگے کو جھکیں۔

”نہیں۔“ اس نے چپ کر کہا۔

فردوس بیگم قدرے سٹپٹا کر پیچھے کو ہوئیں۔

”ہے اور ہم ہاسٹل جا رہے ہیں۔“

”ربیعہ ان کی باتیں سن کر مسکرا دی۔“

”آپ ماں بیٹے کی نوک جھونک میں تو ناظم ضرور ہی نکل جائے گا۔“ وہ بولی۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ پر عزم انداز میں بولا۔ ”اب اگر انہوں نے ذرا سے پس و پیش سے کام لیا تو میں انہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

وہ بازو چڑھانے لگا۔ منیو بیگم اٹھ کر چھیل پھیل پھیل گئیں۔

”پلو جیسے کہو۔“ وہ بارمان کر لوی تھیں۔

عباد نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور ان کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔

”تنگ کرنے پر معذرت۔ لیکن یہ گناہ نہیں ہمیں کارِ ثواب ہے۔“

انہوں نے مسکرا کر اس کے سر پر ایک چیت لگا لی تھی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد اذیقہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی جبکہ ربیعہ سوچ و غور سمیٹنے کے لیے لیکن میں چلی آئی تھی۔

کام کے دوران وہ ترانہ کے متعلق سوچتی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ کل شیخ الشیخ نے ترانہ سے فون نمبر بھی لے لیا ہوتا تو اس وقت وہ اس سے فون پر ہی تھوڑی بہت بات کر لیتی۔ وقت گزرتا کافی مشکل لگ رہا تھا پھر اسے خیال آیا

کہ اس کے پاس ترانہ کا صرف تحریر شدہ ایڈریس تھا جسے دھونڈنے میں وقت ہو سکتی تھی۔ اسے یہ بھی خیال آیا

کہ اس نے عباد سے ترانہ کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ اسے وقت ہی نہیں ملا تھا۔ وہ ابھی آیا تھا اور

آتے ہی منیو بیگم کو ٹیسٹ کے لیے لے گیا تھا۔

ربیعہ نے ارادہ باندھا کہ وہ ان لوگوں کے آنے پر عباد کو ترانہ کے متعلق بھی جانے لے گی اور اس کے گھر بھی جائے گی۔

اسے ترانہ کے گھر ڈراپ بھی کر دے۔

”قربا“ وہ گھٹنے کے بعد ان لوگوں کی واپسی ہوئی تھی۔ منیو بیگم اس قدر تھکی ہوئی تھیں کہ وہ کوئی بھی بات کیے بغیر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ عباد تھکا تھکا سا صوفے پر بیٹھا تھا۔

”جائے بنا دوں عباد بھائی!“ ربیعہ نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔

”اگر تکلیف نہ ہو تو۔“

”تکلیف تو بہت ہوگی لیکن میں پھر بھی بنا دیتی ہوں۔“ وہ برا مان کر بولی۔

پھر وہ چائے بنا کر اس کے پاس چلی آئی۔ عباد آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ اس کی آہستہ پا کر بیٹھ گیا۔

”امی کو کیا براہم ہے عباد بھائی؟“ ربیعہ اس کی سنجیدگی سے ڈر سی گئی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔ ”ابھی تو ٹیسٹ چل رہے ہیں۔ تم دعا کرو ربیعہ!“

”یہ بھی کہنے کی بات ہے بھائی! میں ہر نماز کے بعد آپ سب کے لیے دعا کرتی ہوں۔“

”تم بہت اچھی ہو ربیعہ!“ وہ ممنونیت سے مسکرایا۔

”اپنوں کے لیے تو سب ہی دعا کرتے ہیں۔ آپ سب میرے اپنے ہیں۔“ وہ آستکی سے بولی۔

”بے شک۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

ربیعہ اسے ترانہ کے متعلق بتانے کا سوچنے لگی۔ تب ہی عباد بولا تھا۔

”ربیعہ کل ذرا سا کام ہے۔“

”جی؟“ وہ چونکی۔ ”کہیے؟“

”خرچا تو بھیجتا ہو گا یا وہ بھی نہیں؟“

ایقان اس قسم کے سوالوں سے ناک تک بھری ہوئی تھی۔ وہ کوفت زہ انداز میں کھڑی ہوئی۔

”میں شہلا سے ملنے آئی ہوں بھابھی بیگم! کیا وہ اپنے کمرے میں ہے؟“

”اے ہاں۔ ہم بھی سوچیں یہ بھابھی بیگم کے لیے لڑوا کیسے پکا تمہارا؟ ہاں بھی۔۔۔ سبھی تمہاری اپنے کمرے میں ہی ہیں۔ سیکے کے علاوہ وہ زیادہ تر وہیں ہوتی ہیں۔ ہم تو اس عید کے چاند کو کم ہی دیکھتے ہیں۔“

اچانک ہی بچن کے دروازے پر شہلا نمودار ہوئی تھی۔

”میں یہاں ہوں ایقان! روٹی پکا رہی رہوں۔ تم بیٹھو میں ابھی آئی۔“

فردوس بیگم بری طرح سٹپٹائی تھیں پھر انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔

”جائے کب چلی آئیں۔۔۔ مٹی کی طرح۔۔۔ وہ بڑبڑائیں۔“ ”خبر ہی نہیں ہوئی۔“

ایقان بیٹھنے کے بجائے بچن کی جانب ہی بڑھ گئی تھی۔ دفعہ ”جیسے اسے کچھ خیال آیا تھا اس نے مڑ کر دیکھا۔“

”بھابھی بیگم! یہ آپ کے برادر محترم کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“

”ہائیں۔ کون؟“ ”وہ قطعاً نہ سمجھیں۔“

”محترمیوں کا پوچھ رہی ہوں۔“

”آخر؟“ ”ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔“ ”کک۔۔۔ کیوں۔۔۔ کچھ کیا اس نے تمہیں؟ اے ہاں۔۔۔ وہ تو ایسا ہی باؤلا ہے۔۔۔ تم تو جانتی ہو۔“

”میں تو صرف اتنا پوچھ رہی ہوں کہ وہ آج کل کہاں ہوتے ہیں؟“

”یہیں کہیں ہوتا ہے۔ آجاتا ہے کبھی کبھار۔“

”ہوں۔“ ”اس نے ہنکارا بھرا پھر آگے بڑھ گئی۔“

شہلا اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”بس پک گئی ہیں۔“ ”وہ روٹیاں رومال میں لپیٹ کر باٹ پیٹ میں رکھتے ہوئے بولی۔“

”تمہیں یوں کام کرتا دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔ اچھی لگ رہی ہو۔“ ”ایقان مسکرائی۔“ ”ہاں ہاں جانتی ہیں؟“

”میں نے لانگ لیو لے لی ہے۔“ ”وہ کھلے گل کے نیچے ہاتھ دیے ناخن اچھی طرح صاف کر رہی تھی۔“

”کیوں؟“ ”ایقان کو حیرت ہوئی۔“ ”پرفیکٹ ہو گیا؟“

شہلا نے جیسے حکم کرا سے دیکھا پھر ہولے سے ہنس دی۔

”ارے نہیں۔“ ”وہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی تھی۔“ ”بس یونہی دل بھر گیا تھا اس بو جھل

روئین سے۔ اپنے گھروالوں کے لیے وقت ہی نہیں نکلا۔ ہر کسی کو شکایت تھی مجھ سے۔ سوچا سب کی شکایتیں

دور کی جائیں۔“

”قانع ہو گئیں تو چلو تمہارے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔“ ”ایقان بولی۔“

”ٹھیک ہے۔“ ”شہلا نے اثبات میں سر ہلایا۔“

\*\*\*

”اب سناؤ۔“ ”شہلا نے خود بھی ٹیک لگائی اور ایقان کو بھی ایک تکیہ فراہم کیا۔“ ”کیسی گزر رہی ہے؟ ہم نے تو

ایک دوسرے سے دل کا حال کہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔“

”دل کا حال کہنے کے لیے بھی یا تو بہت حوصلہ چاہیے یا پھر بالکل بے حوصلہ ہونا چاہیے۔ ہمارے ساتھ دونوں

ہی باتیں نہیں ہیں۔ خود ہی جلتے۔ کلتے رہتے ہیں۔ آج بے کلی حد سے سوا تھی۔ سو میں یہاں چلی آئی شاید نا سوچے سمجھے ہی۔“

شہلا نے اس کی خالی آنکھوں میں جھانکا۔

”یہ بے کلی۔۔۔ اس کی فرقت کا دوسرا نام ہے ایقان! تم سمجھتی کیوں نہیں؟“

”شاید ایسا ہی ہو۔“ ”وہ بڑبڑائی۔“

”پھر اسے آواز کیوں نہیں دے لیتیں؟ بلائی کیوں نہیں؟“

”وہ میری پکار کا منتظر نہیں ہے شہلا! وہ بے نیاز ہو چکا ہے۔ اب چاہے میں اسے پکاروں خواہ اس کے اپنے

بچے۔۔۔ نئی دنیا کھونٹے چلا ہے۔ دیکھو یہ سفر کب ختم ہوتا ہے۔“

شہلا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

”تو انہوں نے وہاں شادی کر لی؟“ ”ایقان کی باتوں سے وہ یہی سمجھی تھی۔“

”کر لی ہوگی یقیناً۔“ ”مجھے اس نے کچھ عرصہ پہلے یہ اطلاع دی تھی۔ ہر چند کہ وہ جانتا ہے کہ اسے میری اجازت

کی ضرورت نہیں۔“ ”وہ طنزاً ہنسی۔“

شہلا کو حقیقتاً ”افسوس ہوا تھا“ ”خاموش بیٹھی رہ گئی۔“

”یہ تو برا ہوا ایقان۔“ ”پھر وہ بولی۔“ ”تمہاری حاضری میں تمہارے بچوں کا نقصان ہوا ہے۔“

”بچوں کے پاس تو وہ پہلے بھی نہیں تھا۔ صرف اس کی بھیجی ہوئی آسائشات تھیں۔ سوا ب بھی ہیں۔ جانتی ہو

شہلا! پچھلے ماہ اس نے پورے بیٹیس لاکھ روپے بھیجے ہیں۔ شاید عقد ثانی کی خوشی میں۔ پیسے کو تو ہمیشہ سے انسانی

جذبوں کا بل ہے۔“ ”شہلا نے اس کے سر کو دھڑکا دیا تھا۔“ ”خود دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔“

”ایقان! شہلا نے اس کے سر کو دھڑکا دیا تھا۔“ ”خود دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔“

شہلا کو اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوا۔ اس کا وجود ایک بھٹی اپنا ہوا تھا جس میں اس کے سارے جذبے جل

رہے تھے۔

”اپنے بچوں سے بات تو کرتے ہوں۔“ ”اس نے ہمدردی سے پوچھا۔“

”بات؟“ ”ایقان کی آنکھیں پھیل گئیں۔“ ”بات کیسے ہو؟ وہ تو۔۔۔ وہ تو جانے کہاں چھپ گیا ہے۔ وہ غائب ہو گیا

ہے۔ سلیمانی ٹوپی پہن لی ہے۔ اس نے جانتی ہوں وہ صرف مجھے تنگ کرنے کے لیے مجھے جھکانے کے لیے یہ

سب کچھ کر رہا ہے۔ اور میں ٹوٹ جاؤں گی لیکن جھکوں گی نہیں۔ مراؤں گی لیکن اسے نہیں پکاروں گی جس نے

میری جگہ اتنی آسانی سے کسی اور کو دے دی۔ میں اسے بتاؤں گی کہ میں اس کی جگہ کے دیتی ہوں۔“

شہلا بری طرح سے چوکی۔

”ایقان۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے بھارت میں بھجوا رہی ہو۔ صاف صاف کہو کیا ماجرا ہے۔ عاشر

بھائی کہاں چلے گئے ہیں اور۔۔۔ اور تم کیا کرنا چاہتی ہو؟“

ایقان نے دفعہ ”جیسے اسے خود پر قابو پا لیا تھا۔“

”وہ لڑا سے شادی کر کے کسی دوسرے ملک شفٹ ہو گیا ہے شہلا!“ ”پھر وہ آہستگی سے بولی۔“ ”اور شفٹ ہونے

سے قبل اس نے مجھے یہ رقم بھیج کر شاید اگلے پچھلے حساب برابر کر دیے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے میں اس بھیک کے

سہارے پوری زندگی گزار لوں گی لیکن میں۔۔۔“

اس کی سانس شہج تھی۔ شہلا دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔  
”کیا کرو گی دو بچوں کے ساتھ؟“

”کیوں نہیں؟ جو وہ کر سکتا ہے کیا میں نہیں کر سکتی۔ مجھے تو صرف اتنا پتا کرنا ہے کہ وہ ہے کہاں پھر میں اس سے طلاق لوں گی ہر صورت ہر قیمت پر اور پھر۔۔۔ پھر اسے بتاؤں گی کہ میں اس کی جگہ کسے دیتی ہوں۔“  
”ایقان۔۔۔“ شہلا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”خدا کے لیے۔۔۔ خدا کا واسطہ تمہیں۔۔۔ اتنی کم عقلی سے تو کام نہ لو۔ تم غم و غصے سے بالکل دیوانی ہو گئی ہو۔ اپنی ذات کوئی اتنی بڑی چیز نہیں ہوتی کہ اسے روک دے پر انسان دنیا کو روک دے پر تیار ہو جائے۔ اس نے تمہاری جگہ اگر کسی کو دی تو اس میں بھی تمہارا ہی قصور ہے۔ تم مرد کو کیا سمجھتی ہو۔ وہ تم سے بے تحاشا محبت کر کے بھی یہی سننا چاہے گا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔ محبت ایسی خطا ہے جسے مرد ہمیشہ عورت کے کھاتے میں ڈالنا چاہتا ہے۔“  
”یہ اس کی غلطی ہے اسے ضرور دکھ اٹھانا ہو گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے خود کو پیٹرول چھڑک کر آگ ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔“

شہلا آنکھیں کھولے اس دیوانی کو تکتی رہ گئی۔ وہ محبت میں شدتوں کی قائل تھی۔ شہلا ہمیشہ سے جانتی تھی لیکن اس درجہ دیوانی کا تو اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔  
ایقان جو دل ہلکا کرنے آئی تھی۔ اب اطمینان سے تکیے سے ٹیک لگائے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے کسی اور کی آنکھیں تھیں۔ شہلا کو اس سے خوف سا محسوس ہوا۔  
اس نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ اسے تمام کو ضرور ایقان کے ارادوں سے مطلع کر دے گی۔

Urdu Photo

بھگی ہوئی رات نے پھر پھر پھر اسے عریضہ آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ قسمت آزمائی کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اس نے ماہین کے گہری نیند میں ہونے کا اطمینان کیا اور اٹھ کر بستر سے نکل آئی۔ آہستگی سے چلتی ہوئی وہ لاؤنج میں چلی آئی تھی۔

ٹیلی فون سیٹ گود میں رکھ کر وہ پھر وہی پچھلی باتیں سوچنے لگی اور جب ناعمہ کے قسموں سے اس کا وجود گونجنے لگا تب اس نے فراز کا سیل نمبر ڈائل کیا۔

اچانک ہی اس کے سب ہی حواس کام کرنے لگے تھے۔ دوسری جانب بیل جا رہی تھی۔  
”ہیلو۔“ پھر وہ آواز سنائی دی جس سے اس کا روم روم جاگ اٹھا۔  
عریضہ کی آواز اس کے گلے میں پھنس سی گئی۔  
”ہیلو۔“ وہ پھر بولا۔

”میں۔۔۔ میں عریضہ بات کر رہی ہوں۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں آہستہ سے بولی۔  
”عریضہ! کیسے؟“ وہ سادہ لہجے میں بولا۔

ساتھی آئینہ شہلا ہے میں



اس نے یہ نظر غائر ایک مرتبہ پھر ڈالتا تھا۔ ٹیبل کی جانب دیکھا جسے اس نے بہت محنت اور شوق سے سنوارا تھا۔ سلیقے سے رکھے گئے۔ چمکتے برتنوں صاف ستھرے سفید فینیکسز اور درمیان میں رکھے خوبصورت گلدستے نے میز کو بہت کشش بخش دی تھی۔

”ہوں۔ بہت خوب“ اپنے پیچھے عباد کی آواز سن کر وہ چونک اٹھی۔  
”آپ کب آئے عباد بھائی۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”جب سے آپ اکیلے ہی اکیلے خود کو داد پیش کر رہی ہیں۔۔۔“ وہ ہنسا ”بھئی کچھ حصہ اس میں ہمارا بھی ڈال لو۔ ہمیں بھی ”بہت خوب“ تو کہنے دو۔“

”آپ کہہ چکے۔“ وہ جینپ کر بولی ”اور یقیناً داد کھانے کے بعد پیش کیجئے گا۔“  
”کیا کیا بنا ہے اور کیا کیا اندر پر دس ہے؟“

”سب کچھ بن چکا ہے۔ اندر پر دس کچھ بھی نہیں، ماسوائے اس کے کہ پلاؤ دم پر رکھا ہے اور کباب فراہم کرنا ہے۔“

وہ ان کو اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا تھا۔

”وہی جو آپ نے ڈیپا لگائی تھی۔ کوفتے وہ بھی نرگسی، پلاؤ افغانی، چرنہ پشوری، چکن جاؤمین اور فروٹ ٹرانگل۔ کباب ہماری بھی ہیں اور شام بھی۔“ عباد اس کے پروڈیوشل انداز پر ہنسنے لگا۔

”نسم سے۔۔۔ کسی فائو اسٹار ہوٹل کی ویسٹرن لپ رہی ہو۔۔۔“  
”جی ہاں!“ اس نے عباد کو گھورا ”بس یہی ایک ڈاڈائی رہ گئی تھی۔ سو آپ نے پیش کر دی۔ بالی ڈاؤسے۔ میں شیف بھی ہوں۔ صرف ویسٹرن نہیں۔“

”یہ تو بڑی جلدی ہے کان پکڑیے پھر ہاتھ جوڑ دیے۔“  
”نسم صرف میری پیار کی سی نہیں۔“ وہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ رعبہ اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں سے خفقت زوہ کر مڑی۔  
”امی کہاں ہیں؟“ عباد نے نظر دوڑائی۔

”نماز پڑھ رہی ہیں۔ میں نے ہی انہیں کہا تھا کہ مہمانوں کے آنے سے پہلے فارغ ہو جائیں ورنہ انہیں یہی فکر ستائی رہتی۔“

وہ کچن میں چلی آئی اور چاؤ ڈال کے نیچے آنچ مزید دھم کرنے لگی۔  
”وہ لوگ کب تک بیٹھے ہوں گے۔“ عباد نے گھڑی دیکھی ”تم بھی شاور لے لو اور فریش ہو جاؤ۔۔۔“

”میں۔۔۔“ رعبہ متاثر سی ہوئی ”عباد بھائی۔ میں۔۔۔“  
”ہوں۔ کھو؟“ عباد نے جاتے جاتے اسے رک کر دیکھا۔

”مجھ سے وہاں کھانے کے لیے اصرار مت کیجئے گا۔ میں صرف سرو کر کے اپنے کمرے چلی جاؤں گی۔“ عباد نے ابرو اٹھا کر اسے قدرے حق سے دیکھا تھا۔

”دیکھیں؟“  
”نسم دراصل میں تھک گئی ہوں۔“ اس نے معقول سی معذرت کرنا چاہی۔ ”میں کچھ دیر آرام کر لوں گی۔“

”ضرور کرنا۔ لیکن مہمانوں کے جانے کے بعد۔ جہاں اتنا کام کیا ہے وہاں تھوڑا سا صبر بھی۔“  
”لیکن عباد بھائی۔۔۔“ وہ زنج ہوئی ”میں آخر۔۔۔ کروں گی کیا۔“

”سب کے ساتھ مل کر کھانا کھاؤ گی۔“ وہ حتمی انداز میں بولا۔

عربشہ کو اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا اپنے کانوں میں بجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے فراز کی ٹھنڈی اور اجنبی آواز سن کر اپنے دل کو ایک دھچکا سا لگتا ہوا محسوس کیا تھا۔ نجانے کیوں اتنے عرصے سے ایک گمان اس کے ساتھ ساتھ جیتا تھا کہ برسوں بعد بھی وہ ایک دوسرے کو ویسے ہی پہچان لیں گے جیسے روز اول پہچانتا تھا، اس کی آواز سنتے ہی فراز کے کانوں سے ناعمد کے جھوٹ کا رُخ اٹھ جائے گا۔

اسے احساس ہوا کہ فراز اس کی جانب سے گفتگو کا منتظر تھا۔  
”آپ۔۔۔“ اس کی آواز پھنسنے لگی تو وہ دھیمے سے کھنکھاری ”لگتا ہے۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا!“

اس کے مدھم لہجے میں دیکھ بھی تھا۔ شکایت بھی تھی۔ بے یقینی بھی تھی۔  
”ایسی بات نہیں ہے!“ وہ بولا ”میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔“

عربشہ بے طرح چونکی۔  
”آپ نے خود بتایا کہ آپ عربشہ ہیں۔ اور میرے جاننے والوں میں صرف ایک عربشہ ہے۔“ وہ اطمینان سے

سادہ لہجے میں بول رہا تھا۔ عربشہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے، سانس روکے اس کے اگلے جملوں کی منتظر رہی۔  
”آپ یقیناً شہلا آلی کی مندی ہیں۔ ہاشم بھائی کی سسر بہ نافع کی منکوحہ! نافع عباد کا بہت اچھا دوست ہے۔ اس

حوالے سے بھی میں آپ کو جانتا ہوں۔ ایم آئی رائٹ؟“ عربشہ کو لگا اس کے جملے میں اس کی اپنی سانس نے پھندا ڈال دیا ہے۔ جو نہ اوپر کو جاری تھی اور نہ نیچے کو صرف اس کے گلے کے گزردہ کسی بل دار سانپ کی مانند اپنا گھنجدہ کس رہی تھی۔

”ہیلو۔“ اس کی جانب سے گہری خاموشی پا کر فراز بولا ”آپ خیریت سے تو ہیں؟ یوں آدھی رات کے وقت آپ

کانوں آٹا اور پھر کچھ نہ بولتا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔“  
”جی۔۔۔ کچھ نہیں۔“ وہ بمشکل بولی ”میں نے۔۔۔ میں نے شاید۔۔۔“

اس سے مزید کچھ بھی نہ بولا جاسکا۔ اس نے فون بند کر دیا اور کھل کر سانس لینے کی کوشش کرنے لگی۔  
وہ چند لمحوں کے انتظار میں اس نے ایک طویل عرصہ اندھے غار میں بیٹھے ہوئے جوگی کی طرح گزارا تھا۔

وہ چند لمحوں اتنی تیزی سے گزرے تھے کہ اب ان پر کسی خواب کا گمان ہو رہا تھا۔ یوں جیسے لمحہ بھر کے لیے آنکھ مل گئی تھی اور کوئی بے ربط سا خواب بنا اور ٹوٹ گیا تھا۔ وہ حیران پریشان سا لگ رہی تھی۔

وہ تو اسے کئی حوالوں سے جانتا تھا اور وہ اپنی زندگی میں صرف ایک عربشہ کو جانتا تھا وہ عربشہ جو ہاشم کی بہن تھی۔ شہلا کی مندی تھی اور نافع کی منکوحہ تھی۔ بس اس سے آگے شناخت کا کوئی حوالہ نہ تھا اور جتنے حوالے اس

نے گوائے تھے اس کے بعد کچھ بھی کہنے کا نہ حوصلہ تھا اور نہ ضرورت۔  
عربشہ کو لگا جیسے اس کے وجود پر دم گھوٹے جس کا جو عالم چھایا ہوا تھا۔ وہ اب گھٹنا چاہ رہا ہے۔ اچانک ہی اس کی

آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے اور لبوں سے آہیں نکلتی گئیں۔ اس کے پورے جسم پر ایک شدید کھپکھپاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اس نے خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ آگے کو جھکتے جھکتے وہ صوفے سے نیچے گر گئی تھی۔

بند روم سے مابین گھبرائی ہوئی باہر نکلی تھی۔ اس نے لائٹ جلائی پھر عربشہ کو نیچے گرا ہوا دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔

”عربشہ! مابین نے اسے کاندھوں سے تھام کر سیدھا کیا۔  
اس کا ہونٹ اس کے دانت سے رگڑ کھا کر پھٹ گیا تھا خون کی بوندیں اس کی تھوڑی پر سے پھسل رہی تھیں۔

وہ بے ہوش بے سندھ تھی۔

ربیعہ خاموش ہو گئی۔ وہ یونہی ہار مان لیا کرتی تھی۔  
 ”اب جلدی سے فریش ہوں۔ میں بھی پیٹنج کر لیتا ہوں۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔“  
 وہ مصروف انداز میں سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔

”مجھے آپ کی طبیعت کچھ خراب لگ رہی ہے۔“ ربیعہ متفکری ہوئی۔ ”انہی کو ملاؤں؟“  
 ”نہیں۔“ وہ فوراً بولیں۔ ”کسی سے کچھ مت کہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کھانا لگا دو۔ بچے بھوکے ہیں۔“

ربیعہ ان کے پاس سے اٹھنا نہ چاہتی تھی۔ لیکن ان کا دلوک انداز دیکھ کر وہ کچن میں چلی آئی۔  
 تمام ڈشز ڈائننگ ٹیبل پر پہنچا کر ان لوگوں کو ٹیبل پر آنے کا کہہ کر وہ پھر منیجر بیگم کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ  
 آنکھیں موندے صوفے کی پشت سے سر نکالے بیٹھی تھیں۔

”امی جی۔“ ربیعہ نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”کھانا کھا لیجئے۔“  
 ”مجھے بھوک نہیں ہے ربیعہ۔“ وہ روٹی روٹی سی آواز میں بولیں۔  
 ”آپ وہاں کھانا نہیں کھائیں گی تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔“ ربیعہ بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ ربیعہ نے ان کے بعد میں کھالیں گے۔ ”پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر ربیعہ کو دیکھا۔ ”سنو ربیعہ۔“  
 ان لوگوں کے جانے کے بعد ربیعہ عمار سے پوچھنا۔  
 وہ رک گئی تھیں۔ ربیعہ نے دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”جی۔ جی امی۔ کیا پوچھوں؟“  
 ”شہریار احمد کے والد کا کیا نام ہے۔“ وہ گلو کیڑے میں بولیں۔  
 ربیعہ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

ماہین کے کہنے پر وہ عرشہ کا چیک اپ کر رہی تھی۔ بجائے کیوں اس کا نچلا ہونٹ زخمی تھا۔ اس کے پوٹے  
 متورم تھے اور اسے ہلکا نمیر پڑ تھا۔

”کیا کر گئی تھیں؟“ اس نے ہونٹ کو انگلی سے چھوئے ہوئے نرمی سے پوچھا۔  
 ”جی! وہ آہستہ سے بولی۔ ”گر گئی تھی۔“  
 ”کہاں سے؟“

عریشہ نے نظر اٹھا کر شہلا کی جانب دیکھا اور خاموش رہی۔ شہلا کو اپنی شادی کے روز سے اب تک کبھی اس  
 لڑکی کی سمجھ نہ آ سکی تھی۔ ہر وقت چہرے پر ایک تاؤ اور انداز میں ایک سوگ کی کیفیت لیے۔ اس لڑکی کو اتنی سی  
 غمزدگی تو ان کے دل کے لائق تھے اسے کبھی علم نہ ہوسکا۔

ماہین زیادہ تر اپنے سرال میں ہی رہتی تھی۔ شاد و نادر ہی وہ میکے میں نظر آتی تھی۔ اس کے سرال والے ان  
 معاملات میں کافی سخت تھے پھر بھی شہلا عرشہ کی نسبت ماہین سے زیادہ قریب تھی۔ عرشہ سے تو اکثر ایک نامحسوس  
 سا خوف آتا تھا۔

”کچھ گولیاں لکھ رہی ہوں۔“ اس نے سانس بھر کر ماہین کو دیکھا۔ ”ایسی تو کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔“  
 ہلکا سا بخار ہے۔ آنکھیں بتا رہی ہیں کہ۔۔۔ روٹی رہی ہے۔ یا پھر موسم کا اثر ہے۔ میں نے پر سکون نیند کے لیے  
 ٹیبلٹ لکھ دی ہے۔ ہونٹ پر لگانے کے لیے ایک مرہم بھی لکھا ہے۔“

اس نے نسخہ ماہین کو تھمایا۔  
 ”میں ابھی حنزو سے منگوا رہی ہوں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔  
 شہلا نے مسکرا کر عرشہ کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو عمار صوفے سے اٹھ کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھا۔  
 ”میرا خیال ہے وہی لوگ ہیں منیجر بیگم سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے انہیں۔ ربیعہ نے بھی ان کی تقلید  
 کی تھی۔“

عباد کی رہنمائی میں وہ دونوں اندر آئے تھے۔ ایک امیر حسن تھا اور دوسرا وہی نوجوان تھا جس کی تصویر ربیعہ نے  
 امیر حسن کے آفس میں دیکھی تھی۔

ایک مرتبہ پھر وہ لمحہ بھر کے لیے قلم سی گئی تھی۔ وہ چہرہ اتنا ہی مقناطیسی اور پرکشش تھا عباد ان لوگوں کا  
 تعارف کروا رہا تھا۔

”جی۔ ان سے ملے۔ شہریار احمد امیر حسن کے کزن بھی ہیں اور بہت اچھے دوست بھی۔“  
 ”اور بزنس پارٹنر بھی۔“ امیر حسن مسکینی سے گویا ہوا۔ ”ہر چند کہ شہریار مجھ سے چند برس چھوٹا ہے لیکن اس کا  
 ذہن کئی مقامات پر مجھ سے بہت تیز چلتا ہے۔“

شہریار مسکراتا ہوا منیجر بیگم کے سامنے ذرا سا جھکا تھا۔ منیجر بیگم بے حس و حرکت سی کھڑی رہیں۔  
 ”جی۔ جی۔“ عباد نے انہیں بیکار۔ تب وہ چونکیں۔  
 ”جیسے رہو بیٹا! انہوں نے شہریار کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”ان کا چہرہ اتنا خوبصورت ہے۔“

”امی جی۔ ہمیں بھی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ امیر حسن نے شہریار کو آگے بڑھا۔ ”منیجر بیگم نے اسے بھی  
 پیار دیا۔ پھر عباد نے شہریار کا تعارف ربیعہ سے بھی کروایا تھا۔ ربیعہ اسی کیفیت کا شکار تھی۔ وہ چہرہ ایک خاص  
 کشش کا حامل کیوں تھا؟ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

عباد ان دونوں کو ذرا تنگ روم میں لے گیا۔ ربیعہ منیجر بیگم کی جانب متوجہ ہوئی۔  
 ”امی۔ آپ بھی چلیں اندر۔ میں تب تک کھانا لگاتی ہوں۔ کافی لیٹ ہو گیا ہے۔“ پھر اس نے رک کر منیجر  
 بیگم کو غور سے دیکھا وہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھیں۔

”امی جی۔ ربیعہ نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔  
 ”آل۔“ وہ چونکی۔  
 ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ ربیعہ ان کا نہایت زور دیکھ کر ڈر گئی۔  
 ”میری طبیعت؟“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولیں۔ ”نہیں یہ لڑکا۔ کون ہے ربیعہ؟“

”یہ شہریار احمد ہیں۔ ابھی عباد بھائی نے آپ سے متعارف تو کروایا ہے نا۔ امیر حسن صاحب کے کزن اور  
 بزنس پارٹنر ہیں۔ عباد بھائی سے بزنس سے متعلق معاملات ہی تو طے کرنے آئے ہیں۔“

”یہ کہاں سے آیا ہے۔؟“ وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔  
 ربیعہ کو عجیب پریشانی نے آگھیرا۔ شہریار احمد میں آخر ایسی کون سی بات تھی جو ہر شخص کو ڈسٹرب کرتی تھی۔  
 ”انگلینڈ سے آئے ہیں۔ اب آپ ذرا تنگ روم میں چلیے۔ کچھ دیر بیٹھ کر بے شک اٹھ جائے گا۔“  
 ”میں ادھر ہی بیٹھی ہوں ربیعہ۔“ وہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”میں اپنے کمرے میں ہوں۔ ہاشم آجائیں تو کھانا لگاؤں گی۔ پھر سب اکٹھے مل کر کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔“

ماہین نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا تھا۔ عریضہ نے آنکھیں موند لی تھیں۔ شہلا باہر نکل آئی، بیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے مخصوص رنگ سنائی دینے لگی تھی۔ کمرے میں اس کا سیل فون بج رہا تھا۔ شہلا نے رفتار تیز کر دی اور لپک جھپک کمرے میں چلی آئی۔

آنے والی کال کا نمبر دیکھ کر وہ ٹھٹھکی تھی۔ پھر گہری سانس بھر کر اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو۔“ وہ محتاط انداز میں بولی۔

”دوسری جانب عمر تھا۔“ ”مما۔ السلام علیکم۔“  
”و علیکم السلام۔“ وہ اسے چونے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ ”ٹھیک ہے میرا جانو بیٹا۔ میری زندگی!“

”آئی ایم فائن مما۔ آپ کیسی ہیں۔؟“  
”میں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بیٹا۔ آپ اس ویک اینڈ پر مما سے ملنے نہیں آئے۔“

”کوئی بات تھیں۔ کسی تبرک کی طرح تھا، ہوا تھا۔ الفاظ بے تالی سے۔ لبوں سے ٹوٹ پڑتے تھے۔“  
”بس مما۔ اس مرتبہ میں اور پچا گاؤں چلے گئے تھے۔ آپ نے دیکھا ہے پچا گاؤں؟ پچا بتا رہے تھے کہ آپ بھی ادھر جا چکی ہیں۔ پچا نے مجھے وہ کمرہ بھی دکھایا۔ جس میں آپ رہتی تھیں۔ مجھے وہ کمرہ بہت اچھا لگا مما۔ میں جب اس بستر پر سویا تو مجھے بہت اچھی نیند آئی۔ وہاں مزہ آیا مما۔ میں نے تو فرسٹ ٹائم گاؤں دیکھا۔ بہت اچھا لگا۔“

شہلا کی لبوں پر دھیمی افسردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا بیٹا شاید بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی گفتگو میں ایک ٹھہراؤ سا محسوس ہوتا تھا۔ اس بچکانہ پن میں واضح کمی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کچھ ہی دن پہلے کسی شخصیت کا حصہ تھی۔  
”آپ کو مما یاد آئیں؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”جی مما۔ بہت یاد آئیں۔ آپ، نانو، عبادا مومن، ربیعہ، خالہ۔“ انہی خالہ میں نے سب کو بس یکایک پھر بھی میں نے بہت انجوائے کیا۔“

شہلا کی پلکوں پر نمی چمکنے لگی تھی۔ اس کا بیٹا زندگی سے آشنا ہو رہا تھا۔ جیسا کہ پچا کہہ رہا تھا۔  
”اور آپ کی پڑھائی۔ اسکول لگ۔ وہ سب؟“ اس نے خود پر قابو پایا تھا۔

”پچا نے مجھے بہت اچھے ٹیوٹر رکھ دیے ہیں مما۔ بہت جتنیں ہیں میرے سر۔“  
”انہی خالہ بھی ان جیسا نہیں پڑھا سکتیں۔ پتہ ہے مما! اس مرتبہ شیڈول ٹیسٹ میں میرے مارکس پوری ٹاس میں سب سے زیادہ ہیں۔ پچا بھی خوش ہوئے۔ مجھے گفت بھی دیا ہے انہوں نے۔“

”اچھا!“ اتنا ہی کہہ پائی۔  
”مما۔“  
”جی۔“

”آپ کب تک آرہی ہیں یہاں؟“ عمر کے انداز میں قدرے تبدیلی آئی جیسے کوئی اسے کچھ کہنے پر آمادہ کر رہا تھا۔

”میں؟ میں وہاں کیوں آؤں گی عمر؟ وہ صرف آپ کا گھر ہے۔ میرا نہیں۔ میرا گھر وہ ہے جہاں میں رہتی ہوں۔ آپ کے ہاشم انکل کا گھر۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔ اب آپ بڑے ہو گئے ہو۔ زندگی جینے لگے ہو۔ انجوائے

کرنے لگے ہو۔ آپ۔ آپ۔“ الفاظ اس کے گلے میں چھنے لگے تھے۔  
”آپ مما کو کم کم یاد کیا کرو۔ بس کبھی کبھی۔ بہت دل چاہے تو ملے آجایا کرو۔ لیکن بیٹا ایسی بات مت کہو جسے پورا کرنا آپ کی مما کے بس میں نہ ہو۔“

”مما۔ آپ میرے بغیر بھی خوش ہیں؟“ وہ آزرہ سا ہو گیا تھا۔

”نہیں“ آپ کے بغیر کیوں۔ آپ تو اپنی مما کی جان میں اترے ہوئے ہو۔ ہر وقت ہر مل آپ کو یاد کر کے مما کا دل دھڑکتا ہے جیتا ہے لیکن بیٹا! ہمارے درمیان یہ جتنا فاصلہ ہے اب اہل ہے۔ اسے کم کرنا نہ آپ کے اختیار میں ہے نہ میرے۔ اب ہمیں اتنا فاصلہ رکھ کر اسے برداشت کر کے جینا ہے۔ سمجھتے نا آپ؟“

دوسری جانب سے کوئی جواب نہ دیا گیا تھا۔ شہلا کو یکایک ہی احساس ہوا کہ فون عمر کے ہاتھ سے لے لیا گیا تھا۔ اس کی باتیں کوئی اور سن رہا تھا۔

”عمر کا خیال رکھنا بہت زیادہ ہمیشہ۔“ وہ بولی پھر اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

عباد نے کمرے کے اندر جھانکا تو بیٹہ منیوہ بیگم کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گردن جھما کر عباد کی جانب دیکھا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”چائے بنا دوں عباد بھائی؟“

”تم لوگوں نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟“ وہ اندر چلا آیا۔ ”ای کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”نہیں امی کو اچانک ہی کیا ہوا تھا۔“ ”ربیعہ۔“ شہلا نے ہوا کر اسے بتانے لگی۔ ”ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا پی پی کو ہو گیا ہو۔ میں نے بہت کما کہ میں انہیں کو جگارتی ہوں لیکن نہیں مانیں۔ امی بہت ضدی ہو گئی ہیں عباد بھائی۔“

عباد ماں کے قریب بیٹھ گیا اور پُر تشویش نظروں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ منیوہ بیگم وائی کے زیر اثر سکون کی نیند سو رہی تھیں۔

”ربیعہ! تم امی کا اتنا خیال رکھتی ہو۔“ عباد کو اس کا خیال آیا۔ ”میں چاہوں بھی تو تمہاری خدمتوں کا۔“  
”عباد بھائی پلینز۔ آپ نے ایک لفظ بھی مزید کہا تو میں۔“ وہ روپا ہسی ہو گئی۔ ”آپ۔ آپ کیوں نہیں بھول جاتے کہ میں اس گھر کا حصہ نہیں ہوں۔“

”ربیعہ۔“ وہ ملاحت سے بولا۔ ”تم میری سگی بہن بھی ہو تیں تب بھی میں ان ہی الفاظ میں اسی طرح تمہارا شکر گزار ہوتا۔ تم نے اپنی ناتواں ہستی پر اس گھر کے سب ہی بار بہت سہولت سے اٹھالے ہیں۔ اب دیکھو انہی خالہ صرف پڑھائی سے تھک کر کیسی بے فکری سے سوئی پڑی ہے اور تم۔ تم صبح سے کچن میں کچھی مصروف تھیں۔ امی کی دیکھ بھال بھی کر رہی تھیں اور اب بھی بے تکان ان کی خدمت کر رہی ہو۔ مجھے خیال آتا ہے ربیعہ۔ کہ ہم نے تم پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالا ہوا ہے۔ تم کچھ کہتی بھی نہیں؟“

ربیعہ سادگی سے مسکرا دی۔

”یہ سب آپ کو محسوس ہو رہا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پُر سکون پُر عافیت چھت کے نیچے ہونے کا احساس اتنا قوی ہے کہ چھوٹے موٹے کاموں کی کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ سب کی محبتوں نے اتنی آسودگی بخشی ہے عباد بھائی کہ کسی قسم کی تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔“

”تم اتنی زیادہ اچھی ہو تب ہی۔“ وہ پُر شگفتہ سے انداز میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

لڑکی کچھ خوبصورت ہے۔ تو بی! چاند بھی سیاہ آسمان پر ہی چمکتا ہے۔ سامنے سورج آجائے تو ماند پڑ جاتا ہے اور پھر شکل ہی شکل ہے۔ وہ تمہاری سگی بہن تو نہیں۔ نجائے کہاں سے شکی بن بادل برسات کی مانند اور پھر ایسی جی کہ بٹنے کا نام نہیں لیا۔ برامت ماننا مگر ایسی لڑکیوں کے لیے رشتہ دینا بھی جگر والوں کا کام ہے۔ حوصلہ چاہیے بے نام کی بی بی کو اپنانے کے لیے۔“

”تو آپ سے کس نے کہا یہ کار خیر کرنے کے لیے۔“ شہلا غم و غصے میں حفظ مراتب بھلا بیٹھی۔ ”ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی کے لیے وہ آپ کے نکھوٹن رسیدہ بھائی ہی رہ گئے ہیں؟ اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں تو آپ بہت غلط رخ پر سوچنے کی عادی ہیں۔ ربیعہ میری سگی بہن نہ سہی لیکن سگی بہنوں سے بروہ کر پاری ہے۔ شہلا میرا بھائی اگر اسے بہن نہ ماننا ہو تو اسے کسی باہر کے رشتے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور آج تو آپ نے یہ بات کہہ دی۔ آئندہ میں ربیعہ کا نام کسی ایرے غیرے کے ساتھ لینے پر حشر مچا دوں گی۔“

شہلا کے ہاتھ پیر غصے سے بری طرح کانپ رہے تھے۔ فردوس بیگم نکر نکر اس کی صورت دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے بے حد اطمینان سے اپنے اندر اس کے سامنے اس طرح پیش کیا تھا جیسے طوعاً و کرہاً ”شہلا کو یہ رشتہ منظور کرنا ہی ہو گا لیکن شہلا کی جانب سے جو رد عمل آیا تھا اس نے انہیں ششدر کر دیا تھا۔“

”یہ تم کس طریق سے مخاطب ہو، ہم سے؟“ انہوں نے واویلہ بجانے کے انداز میں کہا۔

”میں معذرت خواہ ہوں۔“ وہ روکھے انداز میں بولی۔ ”لیکن آپ کی بات اتنی ہی غلط تھی۔ اپنے بھائی کے متعلق میں کم اور آپ خود زیادہ جانتی ہیں۔ درست فرمایا آپ نے کہ وہ سیاہ رات کی مانند ہیں۔ ایسی سیاہ راتوں کے لیے کوئی چاند نہیں ہوتا۔“

”نہیں، کوئی چاند نہیں ہوتا۔“ فردوس بیگم نے کہا۔ ”لیکن وہ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔“

”نہیں، کوئی چاند نہیں ہوتا۔“ فردوس بیگم نے کہا۔ ”لیکن وہ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔“

”نہیں، کوئی چاند نہیں ہوتا۔“ فردوس بیگم نے کہا۔ ”لیکن وہ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔“

”نہیں، کوئی چاند نہیں ہوتا۔“ فردوس بیگم نے کہا۔ ”لیکن وہ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔“

”نہیں، کوئی چاند نہیں ہوتا۔“ فردوس بیگم نے کہا۔ ”لیکن وہ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔“

”نہیں، کوئی چاند نہیں ہوتا۔“ فردوس بیگم نے کہا۔ ”لیکن وہ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔“

”تب ہی۔“ اس نے دلچسپی سے عباد کو دیکھا۔ ”تب ہی کیا؟“

”تب ہی سب کو اچھی لگتی ہو۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”ربیعہ! آئی فیل کنسے۔“

وہ کچھ کہتے کہتے جھجک کر پھر سے رک گیا تھا۔ ربیعہ کو حیرت ہوئی۔

”کہہ بھی چکیں۔ یہ مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں آپ؟“

”آئی فیل کہ مسٹر امیر حسن! تم میں انٹر سٹڈ ہو رہے ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”انہوں نے اتنی بار تمہارا پوچھا کہ میں حیرت زدہ اور وہ خود شرمندہ ہو گئے۔ تمہارے بنائے ہوئے کھانے انہوں نے اس قدر ذوق و شوق سے کھائے اور اتنی زیادہ تحریف کی کہ میرا جی چاہ رہا تھا باقی ماندہ کھانا بیک کر کے ان کے ہمراہ کر دوں۔“

ربیعہ عباد کے منہ سے ایسی باتیں سن کر شرم سے سرخ پڑ گئی۔ اس سے نظریں اٹھانا محال ہو گیا۔

”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”ربیعہ! ہی از سونا کس کہ میں تم سے یہ ٹاپک ڈس کس کیے بغیر رہ نہ سکا۔“ عباد بولا۔ ”آئی ایم شیور کہ وہ چند ایک روز میں ضرور تمہارے لیے اپنا ہاتھ برھائیں گے اس لیے میں پہلے تم سے تمہاری باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”بولو ربیعہ! ایسی صورت حال میں تمہارا جواب کیا ہو گا؟“

”مجھے نہیں پتا عباد بھائی! ربیعہ بے طرح گھبرا گئی۔ ”مجھ سے ایسی باتیں نہ کیجئے پلینز۔“

”مجھے برا بھائی سمجھتی ہو تو اچھے بچوں کی طرح بات کرو۔ ایسی باتوں کا میں اپنی آزاد رائے استعمال کرنے کا حق نہیں ہمارے مذہب نے دیا ہے ربیعہ!“

اسی لمحے منیژہ بیگم نے کسمسا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”ای جی!“ عباد نے ان کا ہاتھ تھاما۔ ”آپ ٹھیک ہیں نا؟“

”وہ لوگ سہ لڑکے۔“ وہ جیسے خواب میں بولی تھیں۔

”کون لوگ؟“ عباد کچھ نہ سمجھا۔ ”کون لڑکا؟“

”ای شہیار احمد کے متعلق پوچھ رہی ہیں۔“ ربیعہ نے اپنے بتایا۔

”جی ہاں وہ جا چکے ہیں۔ کھانے پر آپ لوگوں کا بار بار پوچھ رہے تھے لیکن آپ کا شاید بی بی لو ہو گیا تھا۔ ربیعہ نے منیژہ سے دے کر آپ کو سلا دیا تھا۔“ عباد ان کا ہاتھ سہلاتے ہوئے نرمی سے بتانے لگا۔

”مجھے اس لڑکے کے باپ کا نام بتاؤ۔“ انہوں نے بچوں کی طرح عباد کا چہرہ دیکھا۔

”اس کے والد کا نام۔“ عباد سوچنے لگا۔ ”وہ یو کے میں ہوتے ہیں۔ بہت بیمار ہیں۔ پیرالاڑ ہیں بے چارے۔“

”میرا خیال ہے۔“ ہاں یاد آیا۔ احمد جہاں زیب ہے ان کا نام۔

”احمد جہاں زیب۔“ منیژہ بیگم کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلا تھا۔ ”احمد جہاں زیب۔“

ربیعہ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی رہ گئی تھی۔ کیسا عجیب اتفاق تھا؟ اس کے والد کا نام بھی تو احمد جہاں زیب ہی تھا۔

شہلا نے از حد حیرانی سے اپنی پوری آنکھیں کھول کر فردوس بیگم کو دیکھا۔

”یہ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”اسے کچھ بہت اٹو کھا بول دیا ہم نے؟“ انہوں نے نظریں جراتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولنے کی کوشش کی تھی۔ ”دستور ہے دنیا کا۔ لڑکے والے لڑکی کا ہاتھ مالتے ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ اخترمیاں کے مقابلے میں

”ای! ماہین دکھ سے بولی۔ ”کاش“ آپ نے سمجھا ہوتا کہ بیٹیاں کتنی نازک ہوتی ہیں۔ ان کے جذبات آئینوں کی مانند ہوتے ہیں ان کے تصورات میں سچی دنیا اتنی اہم ہوتی ہے کہ باقی ہر معاملہ غیر اہم ہو جاتا ہے لیکن افسوس آپ جیسے ماں باپ اولاد کو موم کی ٹاک سمجھتے ہیں اور اسی طرح موڑتے ہیں اپنے فیصلوں کے مطابق۔ نتیجہ اس صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔“ اس نے عریشہ کی جانب اشارہ کیا جس کی بند پیلوں پر موتی کرز نے لگے تھے اور ہونٹ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

”کون سی گولی ماری ہم نے اسے؟“ وہ ابرو چڑھا کر پوچھنے لگیں۔ ”جو اس کا نصیب تھا اسے مل گیا۔ اب جا کر لڑے خدا سے نصیب تو وہی لکھتا ہے۔“

”درست لیکن ای! جی! اولاد کو اعتماد میں لے کر فیصلے کیے جائیں تو ایسی غلط فہمیاں کبھی نہیں ہوتیں۔ یہ کیا کہ فرد جرم پڑھ کر سنا لی اور مزا دے ڈالی۔ مجھے سخت افسوس ہوتا ہے اسے یوں کڑھتا دیکھ کر۔ نفسیاتی مریض بن گئی ہے یہ۔“

”فردوس جی! بیگم جینے ہی ہو گئیں۔ کچھ دیر تو دوسے انہوں نے عریشہ کا چہرہ دیکھا۔ ”کیا بہت برا لگتا ہے آئینے پر؟“ پھر انہوں نے سرگوشی میں ماہین سے دریافت کیا۔

ماہین نے سانس بھر کر اپنی نا سمجھ کان کو دیکھا۔ ”ضروری نہیں کہ اسے نافع پائند ہو۔ کچھ بے چارے تو ایک اچھا سلجھا ہوا سیدھا سا انسان ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اسے کوئی اور پسند ہو۔“

”ہائیں۔“ وہ حیرت سے بولیں۔ ”بہت خوب پھر جاؤ گی ہمیں اپنی پسند۔“

”کاش“ ان کے اعمام ہمارے والدین اپنی اولاد کو دے سکیں۔“

وہ مومن اور ایمان کے دھلے ہوئے استری شدہ کپڑے رکھنے کے لیے ان کے کمرے میں آئی تھی تب ہی وہ دروازے میں ہی ٹھک کر رک گئی۔

مومن کان سے موبائل فون لگائے کپڑے پہنے سے محو گفتگو تھا۔ دھیمی آواز میں وہ کیا باتیں کر رہا تھا ایتان کے لیے سننا ممکن نہ تھا۔ تب ہی اس نے اپنے ڈرائیو گریڈن موز کرماں کو دیکھا اور جلدی سے فون آف کر دیا۔ ایتان چند قدم آگے بڑھ کر آئی۔

”کس کا فون ہے تمہارے پاس؟“ وہ سخت حیرت زدہ تھی۔ ”اور۔ اور کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

”اپنے دوست سے۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”یہ موبائل کہاں سے آیا تمہارے پاس؟“ وہ حیرت زدہ تھی۔

”رافع بھائی نے دیا ہے۔“ وہ متامل ہو کر بولا۔

”رافع نے؟ لیکن کیوں؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔

”میں نے ان سے کہا تھا مجھے سیل فون کا شوق ہے انہوں نے مجھے گفٹ کر دیا۔ بس آپ کو بتانے والی اس میں کون سی بات ہے؟“

”مومن!“ اس نے تاسف سے بیٹے کو دیکھا۔ ”تم۔ تم روز بروز بگڑتے ہی جا رہے ہو۔ بڑے ہونے کا مطلب سرکش ہونا نہیں ہوتا۔“

”خدا کے لیے ای! ماہین فوج ہوئی۔“ کچھ تو سوچ سمجھ کر بولا کریں۔ شہلا بھابھی جیسی شائستہ خاتون سے کسی برے سلوک کی میں تو توقع نہیں کر سکتی۔“

”شرم کرو۔“ وہ اس پر الٹ پڑیں۔ ”ماں کو جھوٹا بتاتی ہو؟“

”معاملہ کیا ہے آخر؟“ وہ زچ ہو کر بولی۔

پھر ساری بات سن کر اس کی بھی وہی حالت ہوئی تھی جو شہلا کی تھی۔

”غضب خدا کا۔ یہ بات کہتے ذرا لحاظ نہ کیا آپ نے؟“ وہ بگڑ کر بولی۔ ”کہاں اختراموں کہاں وہ پھولوں سی لڑکی۔ ای جان! آپ نے تو حد ہی کر دی۔ میری بہن کے لیے کوئی ایسے شخص کا رشتہ پیش کرنا تو میں نجانے کیا حال کرتی اس کا۔ کچھ تو سوچا ہوتا آپ نے۔“

”اے لی! یہ دیکھو۔“ انہوں نے پھٹ سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ ”یہ دیکھو۔“ پھر انہوں نے اپنے کان پکڑ کر کھینچے۔

”اب بولو تو ناک سے سولیکس کھینچیں۔ ارے بہن ہوں بہن۔ اس مردار کی۔“ کچھ دھمکے تو آتا ہے اس کی حالت دیکھ کر۔ کیا بونہی رلتے رلتے مرجانے کے لیے اس دنیا میں آیا ہے وہ۔“

”تو ای! جی! ان کے حساب سے بھی تو رشتہ دیکھا اور دعوہ دیا جاسکتا ہے۔ لہذا اپنی نرم پڑی۔“

”وہ جو مرا جا رہا ہے اس کم سن حسینہ کے عشق میں پھر ہم کیا کریں؟“

”کون اختراموں؟“ ماہین گنگ ہو گئی۔

”اور کون۔ ایک بار پوچھی ہم نے ذکر کر دیا۔ وہ تو میرے بھائی ہو گیا۔ روز صبح اپنا میلا منہ لے کر سامنے آ بیٹھا ہے۔ ہاتھ پیر جوڑتا ہے پھر ذکر کرتے شہلا سے تو اور کیا کر لیتے۔“

”اختراموں یا گل ہو گئے ہیں۔“ ماہین خفا ہوئی۔ ”ان کے کو مانگ کا علاج ہونا چاہیے۔“

”اے اب تم کوس لو اس بد بخت کو۔“ انہیں برا لگا۔ ”ماں! نہ ہوا کھلے کا سودا لی ہو گیا۔ ارے بھلا چنگا ہے سلامت ہاتھ پیروں کا ہے تو کوری نہیں کرتا تو کیا ہوا؟ ہم اس کے سر پرست ہیں اسے پال رہے ہیں اس کی آل کو بھی پال لیں گے۔ ہم تو اپنی محبت سے مجبور ہیں۔“

”چلیں کسی سے تو محبت کا دعوا ہے آپ کو۔“ ماہین قدرے ناگوار لڑی سے بولی۔ ”اختراموں تو بہت خوش ہیں۔“

”اس نے اپنے سے فردوس بیگم کا منہ کھل گیا۔“ یعنی ہم سب سے نفرت کرتے ہیں۔ لی! ان کی برائی چارے۔ میرا ذہن۔“

”احمد جمال نش۔“ ماہین نے ترشی سے کہتے ہوئے عریشہ کی جانب اشارہ کیا تھا۔ ”دیکھیں اس کی اس حالت۔“

”ربیعہ اپنی جگہ کون ہے ذمہ دار اس کا۔“

”ظہیران سے گویا ہوئیں۔“ اس کا غصہ اس کی بے جا ضد۔ ہمارے سرکس بات کا الزام لگاتی ہو شہلا نے از حد یہ ضدی ہے غصہ دہے لیکن ماں باپ کا اور خصوصاً ”ماں کا فرض بنتا ہے کہ وہ ہر بچے کو اس کی نیکی سے آ رہے ٹریٹ کرے۔ آپ نے اپنے ہر بچے کو صرف اپنی طبیعت اور عادت کے حساب سے ٹریٹ کیا۔“

”کی تھی۔ کیا ٹریٹ کیا ہم نے؟ ہمیں بھی بتاؤ؟“ وہ غصے سے بولیں۔ ”یہ ٹریٹ درمٹ کے ناز خرنے نہ کسی نے اٹھائے نہ ہم کسی کے اٹھانے والے ہیں۔“



وہ مڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر مزید سرکشی سے بولا۔

”آپ کا بیٹا ہوں نا“ آپ پر ہی گیا ہوں۔“

ایقان کے قریب سے نکل کر وہ باہر چلا گیا۔ ایقان اپنی جگہ جیسے جم کر رہی رہ گئی تھی۔ حیرت، دکھ، تاسف اور غم غصے سے اس کے اعصاب شل ہونے لگے۔

بو جھل قدموں سے آگے بڑھ کر اس نے مومن کی الماری کھولی اور اس کے کپڑے رکھ کر ان ہی قدموں سے واپس چلی آئی۔ اچانک ہی وہ رکی۔

لاؤنج کے بیرونی دروازے پر اخترمیاں کھڑے تھے۔ ایقان کا دل مزید غمگین ہوا۔

”تشریف لائیے۔“ وہ قدرے طنز سے آستکی سے گویا ہوئی۔

وہ چند قدم آگے بڑھ آئے۔

”کہاں تھے آپ، پچھلے کئی روز سے نظر ہی نہیں آئے۔“ وہ آہستہ آہستہ بول کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہم۔۔۔ ایقان بیگم! آپ سے معذرت کرنے آئے ہیں۔“ اخترمیاں قدرے بے مروت سے انداز میں دفعنا بولے۔

”معذرت؟“ ایقان کو حیرت ہوئی۔ ”کس بات کی؟“

”ہم اس روز یونیورسٹی میں آپ سے وعدہ کر بیٹھے، ہم اپنا وعدہ وفانہ کر سکیں گے۔“

وہ کان کھجائے ہوئے بولے۔ ایقان نے حیرت سے پوری آنکھیں پھاڑ کر انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”وہ اصل کچا بھی بیگم نے ہمارے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔“ وہ وانت نکوس کر بولے۔ ”اور ہمیں وہ سندھ

پری جی جان بھیج رہے ہیں۔ ہم نے سوچا آپ ہادی آسٹریلیا میں بیٹھی رہ جائیں۔ اس دن کئی خیال میں جانے آپ سے کیا کر لیتے۔“

ایقان کو ایسا لگا جیسے پورے سمندر کا پانی اس کے سر پر سے بہتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ذلت اور تحقیر کے احساس

سے وہ پوری کانپنے لگی۔

”تم۔۔۔ تم گھٹیا۔۔۔ تم۔۔۔ ایک نظر کرم سے خود کو کوئی دیوتا خیال کر بیٹھے۔“ وہ ذلت پیتے، مٹھیاں بٹھپتے ہوئے

آگے بڑھی۔ اخترمیاں ڈر کر پیچھے ہٹ گئیں۔

”ہمیں گالی مت دیں ایقان بیگم! ہم تو اپنا حق استعمال کر رہے ہیں۔ برسوں پہلے آپ نے بھی تو اپنا حق استعمال

کیا تھا۔ آپ اگر بھول گئی ہوں تو ہم نہیں بھولے۔“

ایقان نے جھک کر میز پر رکھی ایش ٹرے اٹھائی اور زور سے انہیں کھینچ ماری۔

”تم صرف اپنی اوقات بھلا بیٹھے ہو، زمینی کیڑے۔“

اخترمیاں اچھل کر ایک طرف ہوئے تھے۔ ایش ٹرے کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی گری۔

”تم سمجھے میں تمہارے عشق میں دیوانی ہو رہی ہوں۔“ ایقان نے اب ایمان کا کھلوٹا بس اٹھایا تھا اس بار وہ

اخترمیاں کے سر میں جا لگا۔

”تمہارے جیسے کہنے کے لیے اپنی اوقات دکھانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔“

اخترمیاں پورے لاؤنج میں ناچتے پھر رہے تھے۔ ہمیشہ طاری رہنے والی حالت نشہ ہرن ہو گئی تھی۔ اخترمیاں

خود بھی ہرن بنے ہوئے بسی بسی چھلانگیں مار رہے تھے۔

ایقان کے ہاتھ اب سبزی کاٹنے والی چھری لگ چکی تھی۔ اخترمیاں یہ خطرناک نظارہ دیکھ کر زور زور سے

چلانے لگے۔

”تمہارے جیسے عاشقانِ دل کے لیے ایک ہی سیدر پری ہے۔ موت۔“ وہ دیوانوں کی طرح ان پر چبھی۔  
”دفعاً“ وہ پوری کی پوری کسی کے شکم میں آگئی تھی وہ رافع تھا۔

”پچھو۔ پچھو کیا دیوانی ہے یہ۔“ وہ اس کا چھری والا ہاتھ قابو میں کیے ہوئے تھا۔

”چھوڑو۔ میں کہتی ہوں چھوڑو مجھے۔ اس کینے کو نہیں چھوڑوں گی میں۔ حساب برابر کرنے آیا ہے کتا۔

میں اس کے سارے حساب برابر کیے دیتی ہوں۔“

آخر میاں جان بچا کر بڑی مشکلوں سے نکل پائے تھے۔ رافع کو پھری شیری کو قابو کرنا مشکل لگ رہا تھا پھر دفعاً  
ای ڈی بالکل ہی بے حس و حرکت ہو کر رافع کے بازوؤں میں جھول گئی۔

\*\*\*

”شدید منٹل شک۔“ ڈاکٹر نے انہیں بتایا تھا۔ ”یہ خوش قسمت ہیں جو اپنے حواسوں پر قائم رہیں اور نہ ان کی

کی باطنی حالت بتا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن پر کوئی بڑا صدمہ برداشت کیا ہے۔“

”یہ صرف اپنی ضد سے لڑ رہی ہیں ڈاکٹر صاحب! اپنی شدید محبت کی نفی کرنے کی سعی کر رہی ہیں۔“

رافع تاسف سے بولا۔ اس کے ساتھ ہاشم اور عذرا بیگم بھی ہاسپٹل میں موجود تھے۔

”آج رات یہ ہاسپٹل میں ہی گزاریں گی۔ اندر آبرو دینے کی کوشش آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر آگے بڑھ گیا۔ ہاشم سینے پر بازو پیٹے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ کسی

گہری سوچ میں مغموم ہوتا تھا پھر اس نے رافع کو دیکھا۔

”پچھو نہیں مانیں رافع! ہمیں ہی کوئی حل نکالنا ہو گا۔“

”دیکھتے ہیں۔ ابھی تو۔ ابھی تو ان کی حالت ایسی نہیں کہ انہیں کچھ بتایا جائے۔ کیا خبر اور بڑے میچس ہیں۔“

عذرا بیگم نے باری باری دونوں کی شکل دیکھی تھی۔

”ہاشم! رافع نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم بچوں! سلام آباد جا رہے ہو نا؟“

”ہوں! دون کا وزٹ ہے۔“

”پچھو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ آفس کے کاموں سے فرصت ملے تو انہیں مری اور بھورن لے جانا۔“

”پچھو کو۔“ ہاشم متال ہوا۔ ”لیکن۔۔۔“

”سمجھا کرو! انہوں نے اپنا اپنی مون وہیں گزارا ہے۔ ان کی ذہنی حالت پر اچھا اثر پڑ چکا ہے۔“

”لیکن رافع یا۔۔۔ میں اور پچھو۔۔۔“ وہ گڑبڑایا۔

”تو بھابھی کو بھی ساتھ لے کر جاؤ نا۔“ رافع اس کا مدعا سمجھ کر مسکرایا۔ ”دون کا چھوٹا سا اپنی مون تم بھی

منالو۔“

ہاشم کے چہرے پر ایک رنگ سا گزرا تھا۔ اس کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے ویران ہوئی تھیں پھر اس نے خود پر

قابو پایا۔

”شہلا اپنی مرضی کی مالک ہے۔ پتہ نہیں وہ جانا بھی چاہے یا نہیں اور۔۔۔ اور پچھو۔۔۔ پچھو کے بارے میں

تمہیں کیا گمان ہے؟ یہ صاف انکار کر دیں گی۔“

”نہیں کریں گی۔“ رافع دھیرے سے بولا۔ ”ٹوٹ چکی ہیں اندر سے اپنی کرجیاں سمیٹنے کے لیے انہیں بھی ستر

در کار ہے۔ تم اپنی کو۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر شہلا اور ایقان پچھو راضی ہوں تو میں ان کے ٹکٹس بھی کنفرم کروالیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم ٹکٹس کنفرم کروالو۔ شہلا بھالی نے اگر انکار کیا تو میں خود ان سے بات کر لوں گا۔ رہے

ایمان اور مومن تو وہ امی کے ساتھ دون گزار لیں گے۔“ اس نے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں بالکل۔“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”میں بھی سمجھتی ہوں کہ ایقان کو تبدیلی کی ضرورت ہے۔“ ہاشم نے

دھیرے سے اثبات میں سر ہلادیا۔

\*\*\*

منیوہ بیگم کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔ عباد اور انقدا انہیں اسپتال لے گئے۔ ربیعہ پریشانی کے عالم میں گھری ان

کی صحبت کے لیے دیوانی مانگتی رہی۔

”اسے بار بار ترانہ کا خیال بھی آتا تھا۔ اس سے ملنے کا وعدہ کر کے وہ ایسی الجھنوں میں گرفتار ہوئی تھی کہ باوجود

کوشش کے چند گھنٹوں کے لیے بھی نہ جاسکی تھی۔“

”نجانے ترانہ کیا سوچتی ہوگی۔ کاش ہم دونوں اتنی غفلت میں علیحدہ ہونے سے پہلے ایک دوسرے کے فون

نمبرز ہی لے لیتے۔“

”ترانہ کے پاس عباد کا بیل نمبر تھا جس پر وہ لاہور سے ربیعہ کو چند مرتبہ فون کر چکی تھی لیکن اس روز ترانہ نے

اسے بتایا تھا کہ وہ کچھ ایسی مشکلات کا شکار رہی تھیں کہ بہت سی چیزیں اس سے مٹ ہو گئی تھیں۔

فون کی بیل بھی تو ربیعہ کی بیوی سے چاہہ نماز سے اٹھ کر فون تک گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فون ہاسپٹل سے عباد

لے کر آیا ہو گا۔“

”سیلو۔“

”السلام علیکم۔“ دوسری جانب سے ٹھہری ہوئی، شگفتہ آواز سنائی دی تھی۔

”السلام علیکم السلام۔ امیر حسن صاحب! کیسے ہیں آپ۔“ ربیعہ نے گہری سانس بھرے ہوئے کہا۔

”آپ کی دعاؤں سے خوش باش ہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”ہر چند کہ آپ سے کئی شکایتیں بھی ہیں۔“

”مجھ سے۔؟“ وہ متعجب ہوئی۔ ”میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں کس۔ کبھی ایسا کیا قصور ہوا ہے مجھ

”آپ نے اس روز اتنے مزے دار کھانے کھلائے اور اس طرح کہ ہم آپ کی میزبانی کا شکریہ بھی ادا نہ

کپائے۔ کم از کم گھر آئے مہمانوں کو گیٹ تک سی آف ہی کر دیتیں۔“

”اوہ۔“ ربیعہ اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔ ”دراصل امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں ان کے پاس

تھی۔“

”غیریت۔“ وہ چونکا۔

”عباد بھالی اور انقدا امی کو اسپتال لے کر گئے ہیں۔ ان کی طبیعت کافی ڈاؤن ہو رہی تھی۔“

”لوہ۔ آئی سی۔ میں معذرت خواہ ہوں مجھے تو بالکل علم نہیں تھا۔ عباد بھی کمال کا انسان ہے۔ کم از کم بلند

اتنی تو خیر خبر دیتا ہے اپنی۔ پھر پرو فیشنل ازم سے نکل کر بھی ہمارے درمیان دوستی اور خلوص کے کئی رشتے استوار

ہوتے ہیں۔ اور۔ اور۔ شاید مزید کچھ رشتے استوار ہو سکیں۔ اگر آپ چاہیں تو۔ مس ربیعہ! ”ربیعہ۔ اس کا مطلب جان کر خاموش کھڑی رہ گئی۔

”آئی ایم سوری کہ اس وقت آپ پریشانی میں ہیں آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں لیکن ایسا ہے کہ میں چند ایک روز میں یو کے جا رہا ہوں۔ پاکستان میں معاملات کو فی الوقت شہر بار ہینڈل کرے گا۔ سو جانے سے پہلے یہ معاملات خوش اسلوبی سے کسی حتمی نتیجے تک پہنچانا چاہتا ہوں۔“

”ربیعہ چاہتی تھی کہ اسے اس موضوع پر مزید بات کرنے سے روک دے۔ وہ ہولے کھٹکھٹا رہی۔ امیر حسن اپنی جون میں تھا۔

”مس ربیعہ! میں آپ کو اتنا بتا دوں کہ میں عباد سے پریشانی لے کر ہی آپ سے یہ گفتگو کر رہا ہوں۔ دراصل فرام داوریری فرسٹ ڈس۔ آپ نے۔ عجب سحر انگیزی کیفیت کا شکار کر رکھا ہے مجھے۔ پتا نہیں اس کیفیت کو کیا کہتے ہیں؟ کشش! اثر! انیسیت! یا پھر محبت! آئی ڈونٹ نوربیج۔ میں خود نہیں جانتا۔ میں نے کبھی آپ سے یہ بات نہیں کی تھی۔ اس طرح کہ پھر گردو پیش کا حساب کتاب نہیں رہتا۔ کبھی بھی سخت مصروفیت کے عالم میں کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ مکمل فراغت کے احساس کے ساتھ آپ سے گفتگو کی جائے۔ یا کسی اہم فائل پر کام کرتے کرتے میں نوٹ یڈ نکال کر آپ کو اس کیج کیونکر لکھا ہوں۔ مجھے آپ کے گھر کو جاتے رستے کیوں اتنے پسند ہیں۔ آپ کے گھر کے سامنے وہ لپٹاؤں کی خالی جگہ دیکھ کر کیوں مجھے اپنا اور آپ کا خیال آتا ہے۔ کیوں ربیعہ کیوں؟ ازاں لو۔“

ربیعہ ریسیور تھا۔ بے حس و حرکت کھڑی تھی اس کے ماتھے سے پسینہ ٹپک کر اس کی گردن میں سرسراہٹ کرنے لگا۔

”ربیعہ! اس ساری صورتحال کے بعد یہ غیر ممکن ہے۔ میں آپ سے یہ نہ پوچھوں کہ کیا آپ میری زندگی میں شامل ہونا پسند کریں گی؟ آپ۔۔۔ آپ شادی کریں گی؟ مجھے۔۔۔؟“

ربیعہ نے بمشکل ٹھوک لگلا۔ گھر میں چھائے ہوئے کنبہ سناٹے اور اکیلے پن کے درمیان ریسیور سے آتی ہوئی خواب ناگ سی آواز اس کے دل میں کوئی الجھل مچائے بنا اپنا مذہبی سناٹا رہی تھی۔ ربیعہ کو اپنے پتھرے جذبات پر حیرت ہوئی اس نے اپنے دل کو ٹٹولا اور خوف زدہ ہو گئی۔

”ربیعہ! میں چاہتا ہوں کہ یو کے جانے سے پہلے میں اپنا ماسنڈ بالکل سیٹ کر دوں۔ ایسا ممکن ہے یا پھر ایسا ممکن نہیں ہے۔ داوریدار آپ کی ہاں یا ناں پر ہے۔“ ربیعہ بالکل خاموش کھڑی رہی۔ وہ خود کو ایسے پور پر استیلا۔

محسوس کر رہی تھی جہاں سے کہیں کسی اور کوئی رستہ نہیں جاتا۔

تیری ایک چپ میں جو ہے چھپی۔

وہ ہزار باتوں کی بات ہے

امیر حسن دھیرے سے ہنستا تھا۔

”شاید میں نے آپ کو کچھ زیادہ ہی ڈسٹرب کر دیا ہے۔ سو سوری ربیعہ! لیکن یہ حال دل ایسا ہے کہ ایک نہ ایک دن عیاں کرنا ہی پڑتا ہے۔ نیک یور ٹائم ربیعہ! آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ لیجئے۔ بس اتنا ہے کہ میرے یو کے جانے سے پہلے مجھے آگاہ کر دیجئے گا۔ میں تب تک گن گن کر گھڑیاں گزارتا ہوں۔“

شاید اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اور ہاں۔ ایک آخری بات! وہ بولا۔ ”اگر آپ کا جواب ہاں میں ہوا تو میں آپ کو ایک خوبصورت سی قانونی ڈور میں باندھ کر جاؤں گا۔ کیونکہ مصروفیت نے اگر پلٹ کر آنے کی اجازت نہیں دی تو پھر آپ کو وہاں آنا ہو گا۔ کلینر؟“

ربیعہ ہنوز دم صم تھی۔

”اللہ حافظ!“ امیر حسن نے فون بند کر دیا۔

ربیعہ نے سلسلہ منقطع ہو جانے پر خالی خالی سی نظروں سے ریسیور کو دیکھا جو ابھی کیسی انہونی داستانیں سن رہا تھا۔

وہ پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جاء نماز تک آئی اور اس پر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر سیدھے دل نے نجانے کسے پکارا تھا۔ ربیعہ نے سم کر آنکھیں کھول دیں۔

ناشم نے ہارن دیا تھا۔ شہلا نے شیزی سے اپنا اینڈ بیگ اٹھایا اور دروازے کی سمت بڑھی۔ فلاٹ صرف ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر تھی اور ایر پورٹ تک کچھ رستے میں خاصا ٹائم لگ سکتا تھا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اجڑی اجڑی سی ایقان بیٹھی تھی۔ اگلی سیٹوں پر ہاشم اور رافع تھے۔ رافع ان کو گون کو سی آف کرنے جا رہا تھا۔

شہلا بالائی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھی۔ ہاشم نے گاڑی اشارت کی۔

”شہلا! وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ ہاشم نے ہاتھ پر پینڈ بیگ میں ہیں نا؟“

”اوہ گائے!“ شہلا کو اپنے حافظے پر حیرت اور ناسف ہوا۔ ”تو اوپر۔۔۔ کمرے میں۔۔۔ میں ابھی ملائی۔“

وہ گاڑی سے اتر کر تقریباً دوڑتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی کمرے میں آئی۔

”کہاں۔ کہاں رکھے تھے۔“ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ ”پتا نہیں ہاشم نے مجھے دیے بھی تھے یا پھر ان ہی کے برف کیس میں ہوں۔“

شہلا نے کونے میں رکھا برف کیس اٹھایا۔ وہ لاک تھا۔ شہلا کو ہاشم کے مخصوص نمبروں کا علم تھا۔ دسرت بربر برف کیس کھل گیا۔

اندر رکھا ہوا وزن لفافہ اٹھا کر اس نے اندر رکھے کاغذات نکالے۔ پھر جیسے وہ گنگ ہو گئی تھی بالکل شدرا! وہ آئی ورس پیر تھے بالکل تیار حالت میں ان پر صرف ہاشم کے دستخط کی ضرورت تھی۔ ہاشم نے اسے طلاق دینے کے لیے کاغذات بنوائے تھے شہلا کو درو دیوار کھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ نیچے ہاشم نے ہارن پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

باقی آئندہ شمار ہے میں

یوسف نہ تھے مگر سربازار آگئے  
خوش فہمیاں یہ تھیں کہ خریدار آگئے  
آواز دے کے زندگی ہر بار چھپ گئی  
ہم ایسے سادہ دل تھے کہ ہر بار آگئے  
اب دل میں حوصلہ نہ سکت بازوؤں میں ہے  
اب کے مقابلے پہ مرے یار آگئے

دانتوں سے لبوں کو کاٹتے ہوئے وہ گہری سوچ میں گم تھی۔ نرم و ملائم سفید بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے اور کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتے جاتے تھے لیکن دھیان کا پیچھی ان سے نہیں دور رہتا۔ بہت دور محو پرواز تھا۔ اس کے برابر والی نشست پر ایقان کم و بیش اسی کے انداز میں دنیا و مافیہا سے بے خبر آنکھیں بند کیے گویا مراقبہ کر رہی تھی۔ اٹلی کو آنے والا شعلہ شعلہ پر ہاشم بیٹھا اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شعلہ نے ذرا کی ذرا ہاشم کو دیکھا اور ایک مرتبہ پھر اپنے لبوں کو کچلنے کی شق شروع کر دی۔

ایک تیر تھا جو دل میں یوں پیوست ہوا تھا کہ نہ آ رہا تھا نہ چلا رہا تھا۔ جو کچھ نظروں نے دیکھا تھا اب دل کو ایک فسانہ معلوم ہوتا تھا۔ یقین کرنا مشکل تھا۔ سوالیہ نشان قطار در قطار اس کے اندر اتر رہے تھے۔ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ اس تکرار کا جواب اس کے اپنے پاس نہ تھا۔ جس کے پاس جواب تھا وہ ایک نشست کے فاصلے پر بیٹھا اخبار بنی میں مصروف تھا۔

زندگی کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اب کس جانب رہا ہے؟ شعلہ نے ایک لمحہ اپنے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ احساس ہوا یہ محض اعتبار کا سفر تھا۔ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنے کا سفر۔ اسے دکھ ہوا ہر سفر کا انجام ایک سا کیوں تھا؟

وہ ابرار پر اعتبار کر کے اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ ابرار کے لیے اس کے پاس محبت تھی، خلوص تھا، وفا تھی، انجام کار دکھ ہے اعتبار ہو جانے کا دکھ۔

ہاشم کے ساتھ سفر کی ابتدا کیا تھی؟ محض اعتبار۔ اس نے بالآخر اس کی خاموش محبت اور دل کو چھوتے جذبوں پر اعتبار کر لیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر ہر اندیشے کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کرتے چل پڑی تھی اور اس بار بھی سفر کا انجام مختلف نہ تھا۔

ہاشم کے برف کیس میں رکھے ہوئے پیرز کس جرم کی سزا تھے؟ شعلہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا کیا تھا اس نے؟

شعلہ نے سوچنے کی کوشش کی۔ شاید کچھ جرم اس کے نامہ اعمال میں درج تھے۔ ہاں شاید اس کے تغافل برتنے کی ادا غلط تھی۔ شاید اظہار محبت محض سننا ہی کافی نہ تھا۔ اظہار محبت کی جرات بھی ضروری تھی۔ شاید شاید لا شعوری طور پر وہ اس کی مہربانی سے بے مہری برت جاتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے نازک جذبوں کا ادراک کیے بنا سنگ دل کا مظاہرہ بھی کر جاتی تھی لیکن یہ سب کچھ تو اس کے روتے کو گزرے وقت کا بخشا ہوا انعام تھا۔ یہ ادائے بے مہری و سنگدلی اس کا اپنا مزاج نہ تھی۔ یہ تو یاد ماضی کا شاخسانہ تھی۔ ہاشم کو اس سے شکایت نہیں ہونا چاہیے تھی۔ ہاشم نے اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ زنگ آلود تالوں پر ہر ہم ہونے سے کیا حاصل؟ وہ تو خود ایک ناقابل بیان الجھن و مشکل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کسی مسیحا کے منتظر۔ کسی اسم اعظم کے تمنائی اور محبت سے بڑا اسم اعظم کیا ہے؟

ہاشم نے اس کی محبت پر اعتبار نہ کیا اسے کم از کم اپنے جذبوں کی پختگی پر تو یقین ہونا چاہیے تھا وہ اپنے ہی جذبوں کو رسوا کرنے کیوں چلا تھا؟  
سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہونے لگا، رگیں کھینچنے لگیں، وہ نہایت بے بسی کے عالم میں ایقان کی طرح نڈھال ہو کر نیم دراز ہو گئی۔

\*\*\*

شام غم کی سحر نہیں ہوتی یا ہم ہی کو خبر نہیں ہوتی  
ہم نے سب دکھ جہاں کے دیکھے ہیں بے سکی اس قدر نہیں ہوتی  
دوستو! عشق ہے خطا لیکن کیا خطا درگزر نہیں ہوتی  
ایک جاں سوزو نامراد خلش اس طرف ہے اوجھر نہیں ہوتی  
دل پہ پالہ نہیں گدائی کا عاشقی در بدر نہیں ہوتی  
دل پہ پالہ نہیں گدائی کا۔

ہاشم کے سینے میں ایک ہوک سیٹھی تھی۔ تہ شدہ اخبار آنکھوں پر رکھے وہ ایک ہاتھ کے فاصلے پر موجود نفس کے احساس کو خود پر کسی غلاف کی طرح لپٹا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

سنگ دل ہے وہ تو بچوں اس کا گلہ میں نے کیا  
جبکہ خود پتھر کو بت، بت کو خدا میں نے کیا!

تصور وار اگر کوئی ہے تو میرا دل ہے شعلہ! تم میرا الزام سے بری ہو۔ تمہاری آمادگی کو میں محبت سمجھا۔ تو کیوں سمجھا؟ تمہاری رغبت مندی کو پھل ہے اپنے لبوں کی سچائی جانا۔ کیوں جانا؟ تم سے شکایت کا کوئی حق میرے پاس نہیں ہے۔ تم نے مجھے اگر اپنی محبت تلک پہنچنے کا راستہ بنایا تو کوئی بات نہیں۔ مجھے تم سے گلہ نہیں ہے۔ میرے سینے پر سر رکھ کر تم نے کسی اور کی دھڑکن کو سننا چاہا تو بھی کوئی بات نہیں۔ محبت میں نے بھی کی ہے۔ اس کی منہ زوری سے میری ناتواں ہستی بھی ڈال ف ہے شعلہ۔ یہ بہت ایمان دار بھی ہوتی ہے۔ بہت بے ایمان بھی۔ تمہیں میری ذات کا یہ سہہ چاہیے تو میں تمہیں یہ رستہ دوں گا۔ تم جہاں تک جانا چاہتی ہو، میں تمہیں پہنچاؤں گا۔ تمہارا اضطراب تمہاری یہ کشمکش۔ کچھ کھنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ پاتا۔ میری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ کہ تھوڑا سا انتظار۔ تھوڑا سا صبر۔ ایک بار اور آخری بار میرے گھر کی خوشیوں میں شراحت داری کر لو پھر جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔ میری منشی میں تمہارا وجود نہیں ہے شعلہ! صرف تمہاری آجکل کا ایک کونا ہے۔ تمہارے آنکھوں کا اذن رخصت میری منشی کھول دے گا۔ میرا یقین رکھنا۔

اخبار کے کونے نے اس کی آنکھ کی نمی جذب کی تھی۔ جہاز بازو پھیلائے محو پرواز تھا۔

\*\*\*

سب مایا ہے، سب دھلتی پھرتی چھایا ہے  
اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے  
جو تم نے کہا ہے، فیض نے جو فرمایا ہے  
سب مایا ہے

جو لوگ ابھی تک نام وفا کا لیتے ہیں  
وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں

ہاں ٹھوک بجا کر ہم نے حکم لگایا ہے

جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہرجائی ہے  
اس شر سے دور اک کٹیا ہم نے بنائی ہے  
اور اس کٹیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے

آنکھیں موندے وہ اندر ہی اندر کہیں پگھل رہی تھی۔ کیا بچا تھا اس کے پاس؟ اک جھوٹی انا کا احساس تھا سو وہ بھی نہ رہا۔ کسی رزم کے شکست خوردہ سپاہی کی مانند جس نے آخری دم تک ہتھیار اٹھائے رکھے اور پھر ہر راستہ مسدود پا کر خود کشی کر لینا چاہی۔ بچ جانے کے باوجود جس کے پاس جینے کا کوئی اخلاقی جواز تک نہ ہو، ایقان خود کو ایسا ہار اہوا سپاہی محسوس کر رہی تھی زندگی نے جسے خود تک پہنچنے نہ دیا اور موت جس سے کتر کر رکھ گئی۔ بس سائیس کی زنجیر میں بیڑی کی مانند بیڑی تھی۔

آفس کتنی خوش نصیب تھی اس کے بائیس جانب بیٹھی ہوئی شہلا جس پر زندگی ہتھاکا مانند میران تھی جس کی ڈولتی ناؤ کو ہر بار محبت کا میران سہارا مل جاتا تھا جس کے سر پر تنی اعتماد کی چادر لمحہ بھر کو سرکتی تھی تو اگلے ہی پل یقین اور اعتبار کے رنگ پھر اسے گھیرے میں لے لیتے تھے۔

کتنا خوش قسمت تھا اس کے دائیں جانب بیٹھا ہوا ہاشم اس نے زندگی سے جو مانگا زندگی نے اس کی خاطر سنبھال رکھا اور پھر اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ اور کتنی بد نصیب تھی وہ سب کچھ پا کر بھی کچھ نہ پاسکی۔ وہ گویا خوشبوؤں کے پھولوں کی شیدائی تھی۔ اور اب سونا دل خالی ہاتھ لیے نجانے کس رستے کی مسافر تھی۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ہار گئی تھی وہ عاشر سے ہار گئی تھی وہ قسمت سے ہار گئی تھی وہ خود سے ہار گئی تھی۔ اس نے اپنے سارے ہتھیار گرا دیے تھے۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جیسی بنائی ہے اسے ویسا ہی رہنا ہے اسے جتنی حد دی گئی ہے وہ بس وہاں تک ہی جاسکتی ہے۔ قسمت میں جو جیسا پیش آتا ہے اسے خندہ پیشانی سے قبول کرنا ہے۔

ہر کوئی شہلا جیسا نصیب لکھوا کر نہیں لاتا۔ ہر کوئی ہاشم جیسا پر خلوص اور قابلِ بھروسہ نہیں ہوتا۔ وہ شہلا نہیں ایقان تھی۔ عاشر ہاشم نہیں تھا۔ اس نے کیوں اس کی ذات میں ہر خوبی کو مجتمع دیکھنا چاہا تھا؟ جتنا اپنا وہ ایقان کو دے سکتا تھا اس نے دیا تھا اس سے زیادہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایقان نے کیوں اس سے زیادہ کی طلب کی؟ وہ قصور وار تھی اس نے اسے انسان سمجھنے سے انکار کیا اسے فرشتہ سمجھنے اور فرشتوں کا سا سلوک پانے پر مصر رہی۔ رتی بھر جھکنے سے انکار کر کے وہ اسے اپنے سامنے ٹھکے ٹھکے دیکھ رہی تھی۔

نتیجہ وہی تھا جو ایسی کسی بھی سر پھری ضد کا ہونا ہے۔ آج وہ تنہا تھی، اس طور پر خود کو بیمار بزمِ مرہ تصور کر رہی تھی۔ دوسرے اسے زندگی کی طرف لانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ زندگی کو خود سے بھاگتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

صلیب وقت پہ میں نے پکارا تھا محبت کو  
مری آواز جس نے بھی سنی ہوگی ہنسا ہوگا

\*\*\*

منیوہ بیگم اس طرح ہسپتال گئیں کہ پھر لوٹ کر گھر نہ آسکیں۔ انہیں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ عباد گھر لوٹا تو اس کی

رنگت اڑی ہوئی تھی۔ وہ از حد پریشان معلوم ہوتا تھا۔ ربیعہ کا دل اس کی صورت دیکھ کر دھک سے رو گیا وہ اس کے پیچھے پیچھے گئی۔

”عباد بھائی!“

عباد نے مڑ کر ربیعہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں گہرا دکھ تھا۔

”ربیعہ! تیار کرلو۔ تمہیں امی کے پاس ہاسپٹل جانا ہے۔ میں تمہیں ہی لینے آیا ہوں۔“ دکھ کے گہرے احساس سے اس کی آواز بو جھل ہو رہی تھی۔

”امی! امی کو کیا کیا ہوا ہے عباد بھائی؟“ ربیعہ کو پوری دنیا اندھیر ہوئی محسوس ہوئی۔

عباد خاموش رہا پھر اس نے اپنی رستہ وارچ اتار کر سائیڈ میبل پر رکھی۔

ایک گلاس پانی لالہ۔ پلیرز۔ وہ اس کے سوال کا جواب دینے سے احتراز کر رہا تھا۔ ربیعہ دھڑکتے دل کے ساتھ

پانی لینے چلی گئی۔

ایک میران سا برابن تھا جس کے نیچے وہ پناہ گزین تھی۔ ربیعہ کو نجانے کیوں اپنے سر سے وہ سون سا یہ در بانا

ہوا محسوس ہوا پانی لے کر وہ اپنی لولی تو عباد ایک ہاتھ سے سر تھامے بیٹھا تھا۔

”عباد بھائی! پانی۔“ وہ کچھ دیر کھڑے کھڑے بولنے کے بعد آہستگی سے بولی۔

عباد نے سر اٹھایا۔ ربیعہ بری طرح سے چوٹی۔ عباد کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”ربیعہ! وہ بولا۔“ وہی ہوا جس کا شک تھا۔ امی کو۔۔۔ بلڈ کیفر ہے۔۔۔ شاید۔۔۔ زیادہ غرصے تا۔

وہ جی پائیں۔ ہماری امی ہم سے بچھڑ جائیں گی۔ ربیعہ نے

وہ کچھ بولنے چھوٹ کر رو دیا۔ ربیعہ کے ہاتھ سے اگلا کچھ بھوٹ گیا۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑی عباد کو روٹا دیکھتی رہی

پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر دیکھتی چلی گئی۔

\*\*\*

”کیوں فکر کرتی ہو؟“ وہ ربیعہ کو خود سے لپٹا کر طمینان سے بولیں۔ ”میں ٹھیک ہوں بالکل ٹھیک۔ کل ہم گھر چلیں گے۔“

ربیعہ نے بے بسی سے ان کے چہرے کی جانب دیکھا وہ ان سے کیا کہتی؟ وہ ان سے کیا کہہ سکتی تھی؟

”اے ربیعہ! کیا بول رہی ہو؟“ انہوں نے ربیعہ کے بال سمیٹ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ”تم ایسی صورت بنا کر

بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ مجھے تو تم مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ میری آنکھوں میں روشنی سی بھر جاتی ہے۔“

ربیعہ ایک ٹک انہیں دیکھتی رہی۔ وہ ایک دو دونوں میں ہی بالکل گھل سی گئی تھیں۔ ان کی رنگت پہلے بھی

کملانی گملاتی سی تھی لیکن آج ان کے چہرے پر مردنی کا تاثر اتنا واضح تھا کہ ربیعہ بالکل کم صم سی ہو گئی۔

”شہلا نہیں آئی؟“ وہ اداسی سے بولیں۔

”آئی اسلام آباد گئی ہیں کھل پر سوں تک آجائیں گی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”آئی اداس کیوں ہو ربیعہ! وہ تھکے تھکے انداز میں پوچھنے لگیں۔ ”کیا میری وجہ سے پریشان ہو؟ مت ہو

پریشان۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور۔۔۔ بہت خوش ہوں۔۔۔“

ربیعہ خاموش رہی عباد بھی بالکل خاموش سا صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ انیقہ ربیعہ کے آنے پر گھر جا چکی تھی۔

اسے بھی رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔ کمرے میں ہلکی سی سردی اور بو جھل پن تھا۔

”عباد! منیوہ بیگم بولیں۔“



”جی امی! وہ چونکا اور جلدی سے اٹھ کر ان کے قریب چلا آیا۔“ کہیے۔“

”تم اب گھر جاؤ آرام کرو۔“

”میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”ماں کی بات نہیں مانو گے تو ماں خفا ہو جائے گی۔“ وہ دھیرے سے بولیں۔

عماد نے بے بسی سے ربیعہ کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا کر اسے جیسے جانے کا اذن دیا۔

”لیکن... یہاں خدا نخواستہ کوئی ضرورت...“

”یہاں صرف مریض کی ضرورت ہوتی ہے سو میں ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔ ”میرا خیال رکھنے کے لیے

ربیعہ ہے۔ تم اب جاؤ آرام کرو۔ انیقہ کا خیال رکھنا۔“

عماد ناچار اٹھا تھا چند قدم چل کر وہ ربیعہ تک آیا۔

”ربیعہ! کوئی مسئلہ ہو تو فوراً...“

”جی ٹھیک ہے۔ آپ کے سیل پر کال کروں گی۔“ وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بولی تھی۔

رات کا سناٹا گہرا تھا، اتنا گہرا کہ آپ ہی بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ کمرے میں خنکی کا احساس لحظہ بہ لحظہ بڑھنے لگا۔ سوتی ہوئی ربیعہ کو بچانے کے لیے کس احساس نے جگایا تھا اس نے گردن گھما کر برابر کے بلیک برسولی ہوئی منیوزہ بیگم کو دیکھا پھر اس کی نظر کھڑکی کے بند شیشے پر پڑی۔ ان کا کمرہ دوسری منزل پر تھا اور کھڑکی کے شیشے سے پرے ہاسپٹل کے لان کا سبزہ قریب کھڑے ہونے سے دکھائی پڑتا تھا۔ دور سے صرف اندھیرا ہی باہر فضا میں پھیلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

UrduPhoto.com

ربیعہ نے نچائے کیوں شیم غنودگی کے عالم میں اس اندھیرے کو گھورتی رہی جیسے کوئی اسکا احساس وہاں دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا پھر اس نے وہاں ایک ہیولہ نمودار ہوتا دیکھا اور ہیولے نے آہستہ آہستہ وادی کا روپ اختیار کر لیا۔

”ربیعہ! وہ اسے پکار رہی تھیں۔“

ربیعہ کو اپنی جگہ پر ان کی آواز ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے وہ اس کے قریب ہی بول رہی ہوں۔

”وادی! وادی! آجا میں... اندر آجا میں...“ وہ ربیعہ نے اندر نہیں پکارا۔

استے دنوں کے بعد وہ وادی کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔ وادی خوش نہیں لگتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اداسی منجمد ہو چکی تھی۔ پریشان بالوں اور سوکھے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ وہ بیمار لگ رہی تھیں۔

”وادی! اندر آجا میں...“ ربیعہ نے پھر اندر نہیں پکارا۔

”وہ نہیں آنے دیتی۔“ انہوں نے اشارہ کیا۔

”کون؟“ ربیعہ نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔ ”کون؟“

”وہ... وہ جو بستر لیٹی ہے۔“

ربیعہ نے دیکھا بستر پر منیوزہ بیگم لیٹی تھیں۔

”یہ... یہ تو میری امی ہیں۔“ ربیعہ مسکرائی۔

”ہاں۔“ وہ بولیں۔ ”یہ مجھے اندر نہیں آنے دیتی۔ اس سے کہو ربیعہ! مجھے اندر آنے دے۔“ وہ لجاجت سے

بولیں۔ ”باہر سردی ہے اور مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“

ربیعہ کو ان پر بہت ترس آیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا جسم

پتھر کا ہو گیا ہے وہ اٹھ نہ پائی۔

”ربیعہ! دادی اچانک ہی شیشے سے دور ہونے لگیں۔ ”ربیعہ! مجھے روک لو۔ اس سے کو مجھے اندر آنے دے۔“

”دادی! ربیعہ نے ہاتھ بڑھا کر انہیں روکنا چاہا۔ ”رک جائیں۔“

”اس سے کہو ربیعہ! اس سے کہو۔“ وہ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھیں۔

”ای۔ ای۔ ای۔“ ربیعہ نے بے ساختہ منیوزہ بیگم کو پکارا۔ ”ای۔ ای۔ ای۔“

دادی اب دور ہوتے ہوئے پھر سے ایک ہولے کا روپ اختیار کر چکی تھیں۔

”ای۔ ای۔ ای۔“

ایک فخت ربیعہ کی آنکھ کھل گئی وہ اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا گلا خشک تھا اور تنفس بے حد تیز ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کمرے کا ماحول بالکل وہی تھا جیسا وہ چند لمحوں قبل اپنے خواب میں دیکھ رہی تھی۔ وہی اندھیرا، وہی سناٹا، وہی خنکی۔ اس نے کھڑکی کے شیشے کو دیکھا جس کے پار کھجور کے درخت ملتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس نے برابر میں سوئی ہوئی منیوزہ بیگم کو دیکھا۔

پھر وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ دیر سے دیر سے چلتے ہوئے کھڑکی تک آئی اور باہر دیکھنے لگی۔ باہر ڈراؤنا، گھبرانا تھا۔ ربیعہ نے آہستگی سے کھڑکی کھولی پھر بیٹھ گئی وہ بری طرح سے کپکپاتی تھی۔ باہر سے ہوا کا اتنا سرد جھونکا اندر آیا تھا کہ ربیعہ کے ہاتھ سن ہو گئے۔ ہر چند کہ سردی نے ابھی پوری طرح سے اپنے قدم نہیں جمائے تھے ربیعہ کو خوف محسوس ہوا۔ اس نے جلدی کر کے کھڑکی بند کی اور پلٹ کر بمشکل اپنی جگہ تک آئی۔ اپنی جگہ پر بیٹھ کر کمرے کے اوڑھ کر وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرنے لگی۔

”وہ مجھے اندر نہیں آئے دیتی۔“ اسے دادی کی بات یاد آئی۔ ربیعہ نے حیران سوچتی ہوئی نظروں سے بستر پر بیٹھی منیوزہ بیگم کو دیکھا جو ر سکون دواؤں کے زیر اثر بے خبر سو رہی تھیں۔ ربیعہ اب تک کمرے میں ایک انجانا اثر محسوس کر رہی تھی۔ بالی کی رات ربیعہ نے یونہی بیٹھے بیٹھے گزار دی تھی۔

\*\*\*

باہر پھیلی ہوئی رات بہت خوبصورت تھی۔ اپنے کمرے کے ٹیرس پر کھڑی بیٹھلا نے بھورن کی ساری خوبصورتی اور دلکشی کو ایک ہی سانس میں اپنے اندر سمونا چاہا۔ نجانے زندگی میں پھر کبھی ایسی دلکش رات آئے گی یا نہیں۔ بھرپور وقت میسر آنا بھی تھا یا نہیں۔

”تم ہو ساتھ رات بھی خیس ہے۔ اب تو موت کا بھی غم نہیں ہے۔“

لٹاکی خوبصورت آواز نے یک لخت ہی جیسے ماحول کو مزید سحر انگیز کیا تھا۔ شہلا نے حیرانی سے مڑ کر دیکھا۔ شیشے کے دروازے کے پار بیٹھا ہاشم ہاشم کی کھینچل بدل رہا تھا۔ شہلا کافی دیر سے ٹیرس پر کھڑی تھی۔ قریباً سورج کے ڈوبنے کے وقت سے۔ بھورن کی خوبصورتی سے اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ کبھی وہ طالب علمی کے زمانے میں کالج کی جانب سے آل پاکستان ٹور پر گئی تھی تب کالج کی دوستوں کے پورے ٹولے کے ساتھ یہاں آئی تھی۔

تب وہ اور ایقان ہاتھوں میں ہاتھ دیے یہاں سڑکوں پر گھومتی پھری تھیں۔ مری پیریاہ، بھورن، ننھیا گلی۔ انہوں نے سب ہی کچھ ناپ چھوڑا تھا اور قصد کیا تھا کہ وہ لوگ ہر سال نہ سہی تو چند ایک سال بعد ضرور یہاں آیا کریں گی اور اب کتنے سالوں بعد قسمت چند روز کے لیے یہاں لائی تھی وہ بھی اس طرح کہ شہلا اکیلی ٹیرس پر

کھڑکی پر سی کے خوبصورت لان کو ایک گہری اداسی کے ساتھ دیکھ رہی تھی اور ایقان برابر کے کمرے میں لائنٹس آن کیے بستر پر لیٹی نجانے کیا سوچے جاتی تھی۔

شہلا نے ایک بار پھر مڑ کر کمرے میں اکیلے بیٹھے ٹی وی دیکھتے ہاشم کو دیکھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہاشم بھی اس کے پاس وہاں ٹیرس پر چلا آئے۔ اسی التفات کے ساتھ جو اس نے شہلا کے لیے وابستہ کر رکھا تھا وہ نری بھری محبت جو دیر سے دیر سے دل کے دروازے پر دستک دیتی تھی، آج نجانے کہاں گم تھی۔ وہ بولتی آنکھیں، راز افشا کرتی مسکان، وہ سکون آمیز لمس، ہاشم نے اپنے سب ہی خزانے نجانے کہاں چھپا دیے تھے۔ ایک گہری خاموشی تھی جو اس نے خود پر طاری کر لی تھی۔

شہلا کو ایک مرتبہ پھر ڈائونورس پیپر زیادہ آئے۔ اس کی پلکوں پر نمی چمکنے لگی۔ ہاشم نے ایسا کیوں سوچا؟ وہ کیا کرنے جا رہا تھا؟ اس نے شہلا سے کچھ بھی کیوں نہیں کہا؟ اوس۔ اوس۔ وہ کس بات کا انتظار کر رہا تھا؟

\*\*\*

”تم ہو ساتھ رات بھی خیس ہے۔ اب تو موت کا بھی غم نہیں ہے۔“ ہاشم کی چینل بدلتی انگلیاں ایک جگہ ٹھم گئیں۔ کتنا خوبصورت گیت تھا۔ محبت کا کیسا درد آشنا احساس تھا وہ چینل بدلتا بھول گیا۔

کن اکھیوں سے اس نے باہر ٹیرس پر کھڑی شہلا کو دیکھا جسے وہاں کھڑے کھڑے دھننٹوں سے زیادہ کاٹاٹم ہو چکا تھا۔

”کمرے سے بھاگ رہی ہو تم۔“ اس نے آواز دہرائی۔ ”جو خود تمہیں ہر غم، ہر فکر سے آزاد کرنے کی ٹھان پڑا ہے شہلا! کیوں اپنی دہائی تلے؟ کیوں اتنا جبر کیا خود پر۔ مجھ سے پہلے دن ہی آزادی مانگ لیتیں۔ میں زندگی کی پہلی اور آخری رات تمہارے ساتھ گزار کر بھی شیاوان رستا کہ محبت میں اتنا کام آنا فرض سے اہل دل پر۔ اگر ابراہیم سب کچھ نہ بتاتا تو میں ساری عمر بھاریے تنہا اور تمہاری بے مہری کو مسہا کر بھی کچھ نہ سمجھ پاتا۔ نہ جان مانا کہ تم نے میرا ساتھ کیوں قبول کیا۔ اپنا نام میرے نام سے وابستہ کیوں کیا۔ میں نہ جان پاتا شہلا! کبھی نہ جان پاتا لیکن اب میں تمہیں یہی یاد دلانے چاہتا ہوں کہ رستہ بدلنا چاہتی ہو میں تمہیں بد سراسر تہ دوں گا لیکن یہ بے مہری، یہ جبر، یہ کٹنگی یہ اجنبیت۔ کچھ دن تو میری بن کر جیو، کچھ دیر کو تو پاس آؤ۔ چند لمحے تو ساتھ گزارو۔“

پچھلے دن کو سو میری آنکھوں میں پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔ ٹی وی پر نشر ہوتے او اس گیت دل کا درد مزید بڑھا رہے تھے۔ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی شہلا خود سے بہت دور محسوس ہو رہی تھی۔

\*\*\*

ڈاکٹر منیوزہ بیگم کا چیک اپ کر رہے تھے۔ انیقا بھی وہاں موجود تھی۔ ربیعہ کمرے سے باہر نکل آئی، اس کا دل بے طرح اداس ہو رہا تھا۔ آئے والے سوان شامیں ابھی سے یاسیت اور احساس زندگی سے بھری ہوئی تھیں۔

آہستہ آہستہ کاریڈور میں چلتے ہوئے وہ یکایک رکی۔ سامنے سے آتی، ولی خاتون آتھا تھیں۔ ربیعہ بیگم غمراہ بیگم کو روک کر آ رہی تھیں۔ ربیعہ نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔ ”وہ بیگم السلام اب کیسی ہیں منیوزہ بہن!“ رابعہ بیگم نے پوچھا۔



دورہ چند لمحے دانتوں سے لب کاٹتی رہی۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھاربیعہ!“ وہ مایوسی سے بولی۔

”دورہ!“ ربیعہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ”زندگی کی عمارت کبھی بھی جذبات کے ستونوں پر قائم نہیں کی جاتی۔ تدریجاً معاملہ فہمی، دورانہشی، بنیادوں میں ان سب کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تم جو کچھ بھی سوچ رہی ہو، محض جذبات کے دھارے میں بہہ کر سوچ رہی ہو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس فیصلے میں جذبات کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم بھی یہ فیصلہ تدریجاً اور دورانہشی کے سہارے کرو۔ تم نے ابھی بالکل ٹھیک کہا کہ رافع کسی بھی لڑکی کو زندگی کی ہر خوشی دے سکتا ہے۔ وہ لڑکی کسی اور کو نہیں، تمہیں ہونا ہے دورہ۔ صرف تمہیں۔“

اس نے اپنے ہاتھوں میں موجود دورہ کے ہاتھ کو سرد تر اور بے جان سا ہوتا ہوا محسوس کیا پھر اسے تھپتھپا کر چھوڑ دیا۔

”او، کمرے میں چلیں۔ سب لوگ کہیں گے کہ ہم دونوں نجانے کہاں چلے گئے۔“ وہ دونوں کمرے کی جانب مڑ گئیں اور آہستہ آہستہ کاریڈور کے کونے سے دور ہونے لگیں۔ تب بہت آہستگی سے رافع وہاں سے آگے بڑھا تھا۔ اس نے کونے پر نمودار ہو کر دورہ جاتی رہی اور دورہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ اداسی اور دکھ تھا۔ وہ خود کو بے تحاشا تھکا ہوا اور نڈھال محسوس کر رہا تھا۔

دورہ اور ربیعہ کمرے میں داخل ہو کر اس کی نگاہوں سے او تھل ہو گئیں تو وہ بے جان ہوتے قدموں سے واپسی کے لیے مڑ آیا۔

UrduPhoto.com

ہسپتال کے لان میں ایک دورہ افتادہ لڑکی نے اپنی سگی بیٹی پر ہلکا کر لائن سے خود کو بہت تھکا دیا اور ادھورا محسوس کیا۔ اٹھاٹھانہ ہوا اور اس قدر پروردہ اس نے خود کو کبھی پایا ہوسا اسے یاد نہ تھا۔ وہ صرف مستحضرہ ہنگام کی مزاج پر سی کے لیے وہاں آیا تھا اس میں اس کی کسی اور چاہ یا تمنا کا دخل نہ تھا۔ لیکن یہاں آکر دل نے کیسا بوجھ سہا تھا وہی جانتا تھا۔

”میں سے شاید رافع سے شادی نہ کر پاؤں۔“ دورہ نے کہا تھا۔

”بس۔ دل آمادہ نہیں ہوتا۔“

”میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔“

”میرے لیے رافع کے پاس کچھ بھی منفرد نہیں ہے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔ میں یہ اقرار کسی اور کو دے چکی ہوں۔“ یہ ربیعہ کی آواز تھی۔

”زندگی کی عمارت کبھی بھی جذبات کے ستونوں پر قائم نہیں کی جاتی۔“

”وہ لڑکی۔ کسی اور کو نہیں۔ تمہیں ہونا چاہیے دورہ۔“

رافع نے اپنا سر پیچ کی پشت سے نکایا اور آسمان کی وسعتوں کو کھوجنے لگا۔ کتنا حقیر، کتنا بے مایہ تھا اس لمحے اس کا وجود جسے کوئی بھی اپنانے کو تیار نہ تھا۔

اس نے لان میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا۔ پودوں کو، پھولوں کو، سگی بینچوں کو، فوارے کو، سبز گھاس کو، اس نے ہر شے کو ذر ذرہ نظروں سے دیکھا جیسے وہ سب اس کا بھید جانتے تھے جیسے وہ سب اسی پر مسکرا رہے تھے۔ اس پر طعنہ زن تھے۔ رافع کا جی چاہا کہ وہ ساری دنیا سے اپنا چہرہ چھپا لے۔

گہری سانس بھر کر وہ سیدھا ہوا۔ تب اس نے دور روش پر عباد اور امیر حسن کو اندر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ لمحہ بھر میں وہ رخ موڑ گیا تھا۔ فی الوقت کسی کا سامنا کرنے کوئی آمادہ نہ تھا۔ جیب میں اپنی گاڑی کی چابی کی موجودگی کا یقین کرتے ہوئے وہ پارکنگ کی سمت بڑھنے لگا تھا۔



پی سی بھورن کے سرسبز و شاداب بلدان میں بیٹھی وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ نرم دھوپ اس کے پیروں سے ذرا پرے گلاب کی کیاریوں پر دمک رہی تھی۔ ایقان کی نظریں اس جگہ پر جم گئیں۔ کئی سال پہلے اسی جگہ بیٹھ کر اس نے کتنے شوق سے تصویریں بنوائی تھیں۔ وہ تصویریں اب تک اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔

ایقان کی پلکوں پر موتی چمکنے لگے۔ دل میں ایک ہوک انھی تھی جس نے سوئے ہوئے ہر جذبے کو جگا دیا تھا۔ خوابیدہ جذبے کسسا نے لگے تھے۔ اس کا جی چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ قدم قدم پر بڑھتی ہوئی یادیں اپنا

اچانک ہی سیاہ اسٹریپ والی چیلوں میں قید و نہایت گورے، حسین پیر اور بڑے قریب آکر رہے تھے۔ ایقان نے وہ گئی۔ وہ بھی بے حد غور سے ایقان کا نقش نقش دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ہر لمحے سے وہ فارز لڑکی تھی۔ ایقان اسے دیکھتی "پس؟" چند لمحوں بعد ایقان حیرانی سے بولی۔

"میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو تم ایقان ہو۔" وہ انگریزی میں بولی۔ ایقان نے نہایت حیرت سے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں کچھ دیر یہاں تمہارے پاس بیٹھ سکتی ہوں۔" وہ بولی۔ ایقان نے پھر سر ہلایا وہ محتاط سے انداز میں اس کے قریب بیٹھی۔ "آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟" ایقان نے پوچھا۔

"یہاں کس کے ساتھ آئی ہوئی ہو؟" اس نے ایقان کا سوال نظر انداز کر دیا۔ "میں اپنے نتیجے اور اس کی بیوی کے ساتھ۔ اس کی بیوی میری بہت اچھی دوست بھی ہے۔" ایقان نے اپنے سوال سے اس کا احتراز واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ "یہاں تو اپنے شوہر کے ساتھ آنا چاہیے۔" وہ مسکرائی۔

اس کی مسکراہٹ میں ایک واضح اداسی تھی جس نے اس کی پلکوں کو بھی غم کر دیا۔ ایقان لمحہ بھر کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

"وہ پاکستان میں نہیں ہوتے۔" پھر وہ آہستگی سے بولی۔ "پاکستان میں نہیں ہوتے؟" اس فارز لڑکی کو حیرت ہوئی۔ "پھر کہاں ہیں وہ؟" "وہ؟" ایقان لمحہ بھر کو رکی۔ "جاپان میں۔"

"نہیں۔" وہ بے اختیار بولی تھی۔ "وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔" ایقان بے طرح جوگی۔ بے یقینی سے وہ اس فارز لڑکی کو گھورنے لگی۔ "تم نے تم جانتی ہو میرے شوہر کو؟" "پس۔" آف کورس۔ بہت اچھی طرح سے۔ اسی لیے تو میں تمہیں جانتی ہوں۔"

"تم کون ہو؟"

"الزبتھ۔" وہ حیرے سے مسکرائی۔

"الزبتھ؟" ایقان نے دہرایا۔ "لیکن عاشر سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"ایک کولیگ کا ایک اچھے دوست کا اور یک طرفہ محبت کا۔ میں اس سے محبت بھی کرتی تھی۔"

ایقان کے وجود کو ایک جھٹکا لگا۔

"لڑا؟" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ "تم۔ تم لڑا ہونا؟"

"ہاں میں لڑا ہوں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

ایقان کے ہونٹ انترت سے سکڑ گئے۔ آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ اس کا جی چاہا تمام اخلاقیات بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ اس منحوس عورت کا گریبان پکڑ لے اور طمانچے مار مار کر اس کا چہرہ لال کر دے۔ یہی عورت اس کی بریادی کا سبب بنی تھی۔ اس کی زندگی کی تمام تر خوشیاں دکھ میں بدل دینے میں اس عورت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے انترت کی شدت سے اپنے گریبان میں جھٹکے لگتے محسوس کیے۔

"لڑا۔" کسی مرد کی بھاری آواز قریب سے آئی تھی۔ "لڑا ڈار لنگ۔"

لڑا چونک کر مڑی۔ ایقان نے بھی پیٹھی پیٹھی آنکھوں سے آنے والے کو دیکھا وہ چہرے مہرے سے پاکستانی ہی لگتا تھا۔

"مائی اسپیٹل۔" منیر۔ اور منیر ایقان ہیں۔ پھر بہت اچھے کولیگ عاشر کی وائس۔ "لڑا ایقان کے جذبات سے بے خبرانہ نظروں کا تعارف کر داری تھی۔ منیر صاحب شائستگی سے سر ہلارہے تھے۔ "تاکس تو میٹ یو مسزنا شری۔" پھر وہ اسی رسمی و شائستہ مسکراہٹ کے درمیان بولے۔ ایقان نے بمشکل ذرا سا سر ہلایا تھا۔

"ڈار لنگ۔" لڑا کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ لڑا سے مخاطب تھے۔ "سوری منیر! میں نے ناشتہ کالی ہوئی کیا ہے۔ اب میں شام تک کچھ نہیں کھاؤں گی۔ آپ لہجہ لینا چاہیں تو میں یہاں مسزنا شری سے گپ شپنگ لگاؤں؟" لڑا نے مسکراتے ہوئے اجازت چاہی۔ "اوکے ڈیئر۔" لڑا نے اپنے روم میں ملتے ہیں۔

ایقان کا ذہن ان کی گفتگو کی جانب ذرا بھی نہیں تھا۔ وہ تو مسلسل عاشر کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ عاشر نے اس سے کہا تھا کہ وہ چند ہی روز میں لڑا سے شادی کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے کبھی ایقان سے رابطہ نہ کیا پھر اس نے ایقان کو ایک خطیر رقم بھیج دی اور اس کے بعد سے اس کا کچھ اتنا پتا نہ تھا۔ یہاں لڑا کسی اور کے ساتھ موجود تھی اور اسے اپنا شوہر بتاتی تھی، منجانب معاملہ کیا تھا۔ ایقان کا ذہن ایک جگسا پزل میں الجھا ہوا تھا۔

"یہ۔ یہ تمہارا شوہر ہے؟" منیر کے جانے کے بعد اس نے جلدی سے پوچھا۔ "یقیناً۔ میں نے ابھی بتایا ہے تمہیں۔" اس نے سر ہلایا۔ "شاید تم یہ نہ جانتی ہو مسزنا شری کہ میں نے عاشر کو پروپوز کیا تھا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتی تھی، میں محبت کرنے لگی تھی اس نے۔ تم اس کی بیوی ہو، سمجھ سکتی ہوئی کہ کوئی بھی عورت جو عاشر جیسے مرد کی قربت میں رہے وہ اسے چاہنے لگے گی۔ وہ نہ صرف ہینڈ سم بلکہ بہت پیارا انسان ہے۔ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟"

ایقان سے کچھ بھی نہ بولا جاسکا۔ نہ اس نے لڑا کا گریبان پکڑا نہ اس پر تھپڑوں کی بارش کی نہ مغلظات کہیں



وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ اتنا ضرور تھا کہ عاشق کا ذکر اور وہ بھی ایسے الفاظ میں سن کر اس کا دل سینے میں یوں تڑپنے لگا تھا جیسے کسی نے اس پر چھری چلا دی ہو۔ عاشق کی بے پناہ محبت جو خون میں حل شدہ تھی جیسے ہر گرجاں سے چھن کر کاسٹل میں جمع ہو رہی تھی۔

”پھر تم نے مسٹر منیر سے کیوں شادی کر لی؟“ دھواں دھواں لہجے میں وہ اتنا ہی پوچھ سکی۔

”کیونکہ عاشق کے انکار سے میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ میں اسی جیسا مرد چاہتی تھی۔ اتنا ہی مکمل، اتنا ہی پیارا، اتنا ہی نائس۔“

”عاشق کے۔۔۔ انکار۔۔۔“ ایقان بس حیرت سے بدبوا کر رہ گئی۔

”پھر میں نے طے کیا تھا کہ اگر کبھی شادی کی تو کسی پاکستانی مرد سے کروں گی، کسی مسلمان سے۔ میں نے محسوس کیا تھا ایقان! کہ عاشق میں جتنی بھی خوبیاں تھیں جو کہ مجھے اٹریکٹ کرتی تھیں وہ اس کے مذہب نے عطا کی تھیں۔ تمہارا مذہب بہت عمدہ ہے ایقان! میں۔۔۔ میں پچھلے چند ماہ سے یہاں پاکستان میں ہوں۔ منیر کی جانب امریکہ میں ہے۔ وہ ایک کانٹریکٹ کے سلسلے میں جاپان آئے تھے جہاں ہماری ملاقات ہوئی اور ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ تب سے ہم چھٹیاں لے کر پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ یہاں آکر میں نے تمہاری مشرقی روایات کو بہت قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ میں اس کے چند دنوں میں اسلام قبول کر لوں۔ میرا دل۔۔۔ میرا دل مسلمان ہو چکا ہے۔ پس انکار کی دیر ہے اور میں لڑا سے۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

ایقان اس کی بات مکمل ہونے کے خیال سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”لڑا سے۔۔۔ ایقان بن جاؤں گی۔“ اس نے مسکرا کر اور قدرے جھینپ کر اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔

”میں نے اپنا اسلامی نام بھی سوچا ہے۔“

دونوں نے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں پھر لڑا نے اسے دیکھ کر جھجکتے ہوئے کہا۔

”عاشق کہاں ہے؟ کیا اب وہ پاکستان میں ہے؟“

ایقان نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور خاموش رہی۔

”میں نے اسے پروپوز کیا تو اس نے انکار کیا جس سے میرے دل کو بہت ٹھیس پہنچی۔“ لڑا نے لگی۔ ”میں نے غصے میں اسے نجانے کیا کچھ کہہ دیا وہ ناراض ہو گیا پھر اس کے بعد کبھی مجھ سے نہیں ملا۔ اس نے جاپان جا کر اپنی جاب تبدیل کر لی۔ ہمارے راستے الگ ہو گئے۔ میں نے اسے کئی بار دوستی کا پیغام بھیجا لیکن اس نے جواب نہیں دیا پھر نجانے وقت کی دھند میں وہ کہاں گم ہو گیا۔“

لڑا کی نگاہیں بھور بن کی پہاڑیوں پر چمکتی دھوپ دیکھنے لگیں۔

”ایک۔۔۔ بات پوچھوں لڑا۔۔۔؟“ ایقان نے ٹوٹے لہجے میں جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہاں ضرور مجھے خوشی ہوگی۔ یوں بھی میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔“

”تمہارے اور عاشق کے مابین کس قسم کے تعلقات رہے تھے؟“

لڑا کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ کچھ دیر ایقان کو دیکھتی رہی۔

”میں نے ابھی تمہیں بتایا تھا ایقان! کہ مجھے تمہارے شوہر کی جس خوبی نے اٹریکٹ کیا وہ اسے تمہارے

مذہب نے دی۔ وہ یہی خوبی تھی یہی بات جو تم مجھ سے جانا چاہتی ہو۔ میں اس کے پاس جاتی تھی اسے اپنی قیوت کی آنچ سے پکھلانے کی کوشش کرتی تھی۔ اپنے جلوؤں کی بھرپور داد اس کی بے بسی اور بے چارگی سے وصول کرنا چاہتی تھی لیکن ایقان! نجانے یہ تمہاری محبت تھی یا اس کا ایمان۔۔۔ وہ پکھلتے پکھلتے بھی سنبھل جاتا تھا جیسے۔۔۔ جیسے اس کے اندر بیٹھا کوئی فرشتہ عین وقت پر اس کے منہ پر طمانچہ کھینچ مارتا ہو۔ وہ یونہی چو نکتا تھا یونہی ہڑبڑاتا تھا۔

اس کی مدد ہوشی اچانک ہی ہوش مندی میں بدل جایا کرتی تھی۔ وہ بے بس ہوتے ہوتے پھر سے توانائی حاصل کر لیتا تھا۔ تمہاری محبت سے یا اپنے ایمان سے۔ یہ دونوں باتیں اخلاقیات تمہارا مذہب سکھاتا ہے۔ اس نے گہری سانس بھری۔

”اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ جب بھی شادی کی کسی مسلمان مرد سے کروں گی اور اگر وہ پاکستانی بھی ہو تو کیا کہنے۔ خدا نے میری دونوں آرزو میں پوری کر دیں۔“ وہ مسکرائی۔

ایقان کو اس کی مسکراہٹ بھور بن گئی چمکتی دھوپ سے زیادہ خوبصورت محسوس ہوئی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ایقان کو خود پر ایک وقت رشک بھی آیا اور خود سے نفرت بھی محسوس ہوئی۔

”تم نے مجھے کیسے پہچانا تھا اڑا؟“ اب وہ قدرے دوستانہ سے انداز میں بولی۔

”عاشق اپنے والٹ میں تمہاری اور اپنے بچوں کی تصویر رکھتا تھا۔ بہت صاف گوئی سے بتا دوں کہ تمہارے بچے مجھے بالکل یاد نہیں لیکن تمہارا نقش میرے حافطے میں محفوظ رہ گیا۔ ویسے کیا اب میں پوچھ سکتی ہوں کہ عاشق کہاں ہے؟“

”عاشق۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں پاکستان میں ہیں۔“

”کیا کر رہا ہے آج کل؟“

”مجھے اور بچوں کو یاد کر رہا ہے۔“

”اسے یہاں کیوں نہیں لائیں؟“ ترا حیرانی سے بولی۔

”اگلے ماہ لے کر آؤں گی۔“ وہ مسکرائی۔

سوٹ کیس کولاک کر کے اس نے سر اٹھایا۔ شہلا اس کے بالکل قریب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دکھ اور بے اعتباری تھی۔ ہاشم جزیرہ سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”ایقان پیچھو اب تک نہیں آئیں۔“

”بس آئی ہی ہوگی۔“

”اسلام آباد پہنچنے میں بھی دو گھنٹے لگ جائیں گے۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔ ”اب نہیں ٹکنا چاہیے۔ کہیں ڈرائیور بھی صبح سے گاڑی لے کر آیا ہوا ہے وہ ہمارا منتظر ہے۔“

”میں کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ شاکی سے انداز میں بولی۔ ”میں اور میرا بیٹا بیگ تیار ہے۔“

اسی وقت تیل ہوئی تھی۔ ہاشم نے بیسہ کر دروازہ کھولا۔ باہر ایقان کھڑی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہاشم نے غور سے ایقان کا چہرہ دیکھا۔

”چلیں؟“ وہ شادمان سی بولی۔

ہاشم کے ابو حیرت سے تن گئے۔ ایقان کے گزشتہ سارے انداز غائب ہو چکے تھے۔ وہ بالکل پہلے والی ایقان نظر آتی تھی۔

”آپ تیار ہیں۔“

”ہاں۔ بالکل۔“ میرا بیگ بھی تیار ہے۔“ وہ مسکرا دی۔ ”کیوں بھی شہلا! مختصر سا ہنی مون کیسا گزرا۔ دیکھو میں نے تم لوگوں کو بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ گواہ رہنا کہیں جا کر سب سے کہو۔ پیچھو نے رنگ میں بھنگ ڈالا۔ کباب میں ہڈی اپنی رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔“

ہاشم نے بے اختیار شہلا کو اور شہلا نے بے اختیار ہاشم کو دیکھا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں حیرت کے سمندر تھے۔

”میں اپنا بیگ لے آؤں پھر نیچے چلتے ہیں۔“ میرا انتظار کرنا۔“ وہ ان کی حیرانی سے قطع نظر مسکراتی ہوئی مڑ گئی۔

”یہ تو بالکل تبدیل ہو گئیں؟“ ہاشم کے بنانہ روکا۔ ”رافع ٹھیک کہتا تھا۔“ شہلا نے جواب نہ دیا۔ اس کا ذہن ایقان کے جملے میں الجھا ہوا تھا۔ ”ہنی مون کیسا گزرا؟“ ہونیٹ کاٹتے ہوئے وہ اپنے مختصر ”ہنی مون“ کے متعلق سوچنے لگی تھی جس میں ہاشم نے مراقبے کے سوا کچھ نہ کیا تھا۔

”تم چاہتے ہو عباد کہ مرے وقت۔ مجھے ذہنی سکون میسر نہ ہو؟“

عباد نے چونک کر ماں کی جانب دیکھا۔ وہ گلوگیر لہجے میں اپنی بات کہہ کر اب شاکی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”امی۔“ وہ رکھ سے بولا۔ ”یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟“

”تم نے مجھے یہاں اسپتال میں کیوں لا کر بٹا دیا ہے عباد! میں یہاں نہیں مرنے چاہتی میرے بچے! میں اپنے گھر میں اپنے بستر پر بہت سکون سے جان دینا چاہتی ہوں۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے عباد! مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ انہوں نے بچہ دوں ہاتھ جوڑ دیے۔ آنسو ان کی آنکھوں سے رواں تھے

عباد تیزی سے ان کے قریب گیا اور انہیں سینے سے لگا لیا۔

دونوں ہاں بٹا دیا۔ شہلا اس کے بالکل قریب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دکھ اور بے اعتباری تھی۔ ہاشم جزیرہ سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”ایقان پیچھو اب تک نہیں آئیں۔“

”بس آئی ہی ہوگی۔“

”اسلام آباد پہنچنے میں بھی دو گھنٹے لگ جائیں گے۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔ ”اب نہیں ٹکنا چاہیے۔ کہیں ڈرائیور بھی صبح سے گاڑی لے کر آیا ہوا ہے وہ ہمارا منتظر ہے۔“

”میں کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ شاکی سے انداز میں بولی۔ ”میں اور میرا بیٹا بیگ تیار ہے۔“

اسی وقت تیل ہوئی تھی۔ ہاشم نے بیسہ کر دروازہ کھولا۔ باہر ایقان کھڑی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہاشم نے غور سے ایقان کا چہرہ دیکھا۔

”چلیں؟“ وہ شادمان سی بولی۔

ہاشم کے ابو حیرت سے تن گئے۔ ایقان کے گزشتہ سارے انداز غائب ہو چکے تھے۔ وہ بالکل پہلے والی ایقان نظر آتی تھی۔

”آپ تیار ہیں۔“

”ہاں۔ بالکل۔“ میرا بیگ بھی تیار ہے۔“ وہ مسکرا دی۔ ”کیوں بھی شہلا! مختصر سا ہنی مون کیسا گزرا۔ دیکھو میں نے تم لوگوں کو بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ گواہ رہنا کہیں جا کر سب سے کہو۔ پیچھو نے رنگ میں بھنگ ڈالا۔ کباب میں ہڈی اپنی رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔“

(ان شاء اللہ آخری قسط آئندہ ماہ)

ماہنامہ شعاع 56 نومبر 2007

ماہنامہ شعاع 57 نومبر 2007

## جپانیسو میں قسط

ترانا ربیعہ کو دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

صوفے پر بیٹھا ہوا عبدالباری بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”اگر تمہیں اچھی طرح سے جانتی نہ ہوتی تو یہی سمجھتی کہ تم ماضی کے ساتھ مجھے بھی بھلا چکی ہو اور اب تمہیں مجھ سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن۔۔۔“ ترانا گلوگیر لہجے میں بات ادھوری چھوڑ کر ہنس دی۔

”لیکن میں اپنی ربیعہ کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں اس لیے لمحہ بھر کے لیے بھی میرے دل میں کوئی شک کوئی وسوسہ پیدا نہ ہوا۔ مجھے علم تھا کہ تم کسی مجبوری کے تحت ہی میرے گھر نہ آسکی ہوگی اور یہاں پہنچ کر یہ خیال ٹھیک ثابت ہو گیا۔“ انہی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

ربیعہ نے نم آنکھوں سے ترانا کا پر خلوص چہرہ دیکھا۔

”ہم انہیں گھر لے آئے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے اب ٹھیک ہیں؟“ ترانا مطمئن ہوئی۔

”ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں۔“ وہ خود پر کمال ضبط کر کے بولی۔ ”دل کی تسلی کے لیے ٹریٹ منٹ چل رہا تھا لیکن امی نے ضد کی کہ وہ ہسپتال میں مزید ایک گھنٹہ بھی نہیں رکھیں گی۔“

”او۔۔۔“ اس کے بازوؤں پر ترانا کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔

”بہت افسوس ہوا یہ سب کچھ جان کر۔“ عبدالباری بولا۔

”آپ کیسے ہیں باری بھائی۔“ ربیعہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”دکھ کی شدت سے دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔“

آپ سے سلام دعا تک نہ کی۔

”اٹس اوکے ربیعہ!“ وہ نرمی سے مسکرایا۔ ”میں تمہاری کنیت سے محسوس کر سکتا ہوں۔“

”آپ لوگ بیٹھیں نا۔“

”میں پہلے آنٹی کو دیکھنا چاہوں گی۔“ ترانا بولی۔ ”باتیں تو کبھی بھی کی جاسکتی ہیں ان کی عیادت ضروری ہے۔“

”او امی کے کمرے میں چلتے ہیں۔“ ربیعہ ان کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں منیرہ بیگم کے پاس لے آئی۔ ”وہاں کے زیر اثر نیم غنودگی میں تھیں۔ انہیں دیکھ کر قدرے ہشاش بشاش غلطیوں کی کوشش کرنے لگیں۔“

”کیسی ہو بیٹی!“ ربیعہ کے تعارف کروانے پر وہ خوش ہو کر بولی تھیں۔

”جی میں ٹھیک ہوں آپ۔۔۔“

”اللہ کا احسان ہے۔“ وہ مطمئن انداز میں بولیں۔

”ایسا لگتا ہے جیسے آپ کو کہیں دیکھا ہو۔“ ترانا نے جیسے حافظے پر زور دیا۔

”ہو سکتا ہے۔“ وہ شفقت سے مسکرائیں۔ ”تم ربیعہ کی وہی بہن ہونا جو ایک مرتبہ بازار میں اسے ملی تھیں۔“

”جی ہاں لیکن تب میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ آپ شاپ کے اندر تھیں۔ ربیعہ اور میں شاپ سے باہر تھے۔“

”مجھے ربیعہ نے بتایا تھا کہ اسے تم سے ملنے جانا ہے لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے بیٹی کہ ہم چاہتے ہوئے بھی اسے تمہارے پاس نہ بھیج سکے۔“

”جی میں جانتی ہوں۔ میرے یہاں تک پہنچنے میں سارا کمال باری کا ہے۔ انہوں نے بہت کوشش کے بعد کسی طرح عمار بھائی کا سیل نمبر اور پھر ایڈریس حاصل کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ربیعہ کے ساتھ کوئی براہم ہو گئی ہوگی۔“

ترانا اور منیرہ بہت گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ ربیعہ چائے بنانے کے خیال سے بچن میں چلی آئی تب

اسے حیرانی ہوئی تھی۔

انہی نے چائے تیار کر لی تھی اور اب ٹرائی میں چیزیں سیٹ کر رہی تھی۔

”تم کیوں چلی آئیں ربیعہ!“ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ ”میں چائے لارہی ہوں نا۔“

”حیرت انگیز۔“ ربیعہ مسکرا دی۔

”مظن کر رہی ہو؟“ وہ بھی مسکرائی۔

”بھذا نہیں۔ تمہاری حرکت پر پیار آ رہا ہے۔ میں دو دن کے لیے ہسپتال گئی اور تم نے سب کچھ سیکھ لیا۔“

”تمہارے جانے سے احساس ہوا کہ تم اس گھر کے لیے اللہ کا کتنا بڑا انعام ہو۔ تم کس طرح سارے کام آسانی سے سرانجام دے لیتی ہو ربیعہ؟“

معصومیت سے پوچھتی ہوئی انہی ربیعہ کو بہت اچھی لگی۔

”جیسے تم نے اتنی جلدی اتنی آسانی سے یہ سب کچھ تیار کر لیا ہے۔“ اس نے ٹرائی پر نظر دوڑائی۔

”تمہاری کنین آئی ہے۔ اتنی خاطر داری تو اس کا حق ہے۔“ انہی نے ٹرائی دھکیلتے ہوئے بولی تھی۔ ربیعہ اس کے ساتھ چل دی۔

\*\*\*

”آپ لوگوں کا بہت احسان ہے آنٹی! ربیعہ کو اسے گھر کی مضبوط اور محفوظ چھانوں دے کر آپ نے جو احسان ہم پر کیا ہے اس کا بدل تو صرف خدا ہی دے سکتا ہے۔“ ترانا کہہ رہی تھی۔ ربیعہ کے قدم دروازے پر لمحہ بھر کے لیے رکے پھر اندر داخل ہو گئی۔

”ایک عرصے سے وہ اپنا باغیچہ ایک جگہ پر چھپائی رہی تھی۔ ہر چند کہ اس میں چھپانے والی کوئی بھی بات نہ تھی۔ وہ اکثر صوفیاں لگاتی تھیں کہ اس نے اور عمار کے گھر والوں سے حقیقت چھپا کر اچھا نہ کیا تھا۔ وہ سب کے سب اتنے کشادہ دل لوگ تھے کہ ہر بات جانتے ہوئے بھی اپنے گھر میں خندہ پیشانی سے جگہ دیتے۔ منیرہ بیگم نے ترانا کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔

انہی سب کو لوازمات کے ساتھ چائے پہنچانے لگی تھی۔ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے موقوف ہو گیا تھا۔

چائے لی کر عبدالباری نے سب سے رخصت چاہی تھی۔ وہ کسی ضروری کام کے تحت جا رہا تھا۔ البتہ ترانا کا ارادہ رات گئے تک ان لوگوں کے پاس رکنے کا تھا۔

عبدالباری کے جانے کے بعد عمار بھی کچھ دیر آرام کرنے کے خیال سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منیرہ بیگم کے پاس ترانا اور ربیعہ ہی بیٹھی رہ گئیں۔

”اومس۔“ اچانک ہی ترانا کو کچھ یاد آیا تھا۔ ”میرا ایک بیگ ڈرائنگ روم میں رکھا ہے ربیعہ! اس میں تمہاری کچھ امانتیں ہیں میں آج اسی خیال سے وہ ساتھ لے آئی کہ وہ سب کچھ جس پر صرف تمہارا حق ہے تمہیں سونپ دیا جائے۔ یہ زندگی تو قدم قدم پر ہمیں جدا کر دیتی ہے۔ جانے کل ہم دونوں پھر کہاں ہوں۔“

ربیعہ نے قدرے حیرانی سے ترانا کو دیکھا۔

”بھول گئیں؟“ ترانا مسکرائی۔ ”جب تم لاہور آئی تھیں تب تم نے اپنا کچھ سامان میرے پاس امانت رکھوایا تھا پھر عمار بھائی کے ساتھ جانے کے لیے جب تم گھر سے نکلیں تو غفلت میں سب ہی کچھ میرے پاس بھول گئیں۔“

اب ذرا ڈرائنگ روم سے وہ بیگ اٹھا کر لے آئی اس کے سامنے تمہارا سامان تمہارے حوالے کر دوں۔“

ترانا اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

ربیعہ مترددی ہو کر اٹھی۔ منیذہ بیگم کی طبیعت کے پیش نظر وہ انہیں کوئی ٹینشن دینا نہیں چاہتی تھی لیکن اس بات کی مٹنی بھی تھی کہ انہیں اپنے متعلق ہر بات سے آگاہ کر دے۔ منیذہ بیگم سے اس کا جو دلی رشتہ استوار ہو چکا تھا وہ متقاضی تھا کہ ربیعہ اپنے اور ان کے مابین پڑا ہر پردہ اٹھا دے۔

چھوٹا سا بیگ اٹھا کر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ منیذہ بیگم کے پلنگ اور ترانہ کی کرسی کے بیچ پرٹی ٹیبل پر اس نے بیگ رکھ دیا۔

”تم خود ہی کھولو اسے اور اپنی چیزیں چیک کر لو۔“ ترانہ بے حد اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ربیعہ نے بیگ کھول کر اس میں سے سامان نکالنا شروع کیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ خود بھی ساکت رہ گئی تھی۔

ایک سرخ جوڑا تھا، سونے کے تاروں کے کام سے مزین۔ کام اب تک کالا نہ پڑا تھا، البتہ چمک ضرور مدھم پڑ گئی تھی۔ ایک چھوٹا سا پاکس تھا۔ ربیعہ اسے کھولے بنا بھی جانتی تھی کہ اس پاکس میں کیا ہے پھر بھی اس نے وہ پاکس کھولا۔ اس میں طلائی زبورات تھے، کندن کے کام کا بھاری گلو بند اور جھمکے، دو خوبصورت کنگن۔

ربیعہ ساکت ان چیزوں کو گھور رہی تھی۔ اس کی پلکوں پر موتی چمکنے لگے تھے۔ اسے نچا بنے کیا کچھ یاد آیا تھا۔ اپنی داری اماں ان کے چھوٹے چھوٹے صندوق جن میں سے ایک برتالا لگا رہتا تھا۔ اپنا چھوٹا سا گھر جس کے تختہ میں بار سنگھار کا درخت اپنی مہک پھیلانے رکھتا تھا۔ اپنا محلہ، محلے کے پرخلوص لوگ۔ اپنی سہیلیاں، اپنا کالج، اپنا بچپن، اپنی معصومیت۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جیسے تسبیح کے دانے ایک کے بعد ایک گرتے ہوں۔

دفعتا ”وہ بری طرح سے چونکی تھی۔ اس نے منیذہ بیگم کو ان چیزوں کے پاس کھڑا دیکھا، وہ دیوانوں کی طرح انہیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ کسی دیوانے کا چہرہ محسوس ہوتا تھا، ان کے انداز میں حد درجہ وحشت تھی۔“

”یہ سب کچھ یہ سب کچھ۔۔۔“  
 ”یہ سب کچھ ربیعہ کا ہے آئی!“ ترانہ بھی قدرے گھبرا کر کھڑی ہوئی۔  
 ”نہیں۔۔۔ وہ چلا میں۔“ یہ سب کچھ میرا ہے۔ یہ سب کچھ میرا ہے۔۔۔“  
 پھر وہ دیوانوں کی طرح ربیعہ کی جانب بڑھیں۔  
 ”یہ بھی میری ہے۔“ وہ ربیعہ کو خود سے بچھین کر چلا میں۔ ”یہ بھی میری ہے۔ یہ بھی میری ہے۔ یہ میری ہے۔“  
 میری بیٹی۔۔۔ آہ۔۔۔ میری بیٹی۔۔۔

عباد اور انیقہ گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔  
 ”اُمی۔۔۔ اُمی۔۔۔“ عباد ان کی جانب بڑھا۔  
 تب تک وہ ربیعہ کے بازوؤں میں جھول چکی تھیں۔



میرا نام مونا تھا، مونا جوزفس۔ میں ایک کر سچن فیملی کا حصہ تھی۔ مجھے اپنا بچپن کچھ یاد ہے۔ میری ماں ایک مڈوائف تھی، باپ ایک شرابی۔ میری ماں جو کچھ کمائی تھی میرے باپ کے تشے کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔ ماں بیمار رہتی تھی، میرے باپ کا کہ اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کر تاجلا گیا۔ اسے لپٹی ہو گئی۔ اسے اپنا مستقبل نظر آ رہا تھا، اس لیے اسے میرے مستقبل کی فکر ستانے لگی۔ اس نے مجھے نرسنگ اسکول میں داخلہ دلوا دیا، خود زندگی کا گاڑی کو اپنا پورا زور لگا کر کھینچتی رہی۔ میں نرس بن گئی اور مجھے ایک چیریٹی اسپتال میں نوکری مل گئی۔

پہلے دن ہی میری ماں اسی اسپتال کے ایک بستر پر گھری نیند سو گئی، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ میرے اور اس نے کا گہرا اثر پڑا لیکن میرے باپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، اس کے لیے کمانے والے دو تازہ دم ہاتھ میدان عمل اتر چکے تھے۔ زندگی یونہی بے یابی سے گزر رہی تھی، تب ایک روز کچھ زخمیوں کو ہسپتال لایا گیا۔ وہ لوگ کسی زخماں سے گزر رہے تھے کہ ان کی بس گہرے کھڈ میں جا گری تھی۔ ان ہی بچ جانے والے زخمیوں میں ایک احمد جہانزیب تھا۔ ایک خوبصورت جوان جو اپنے آبائی شہر سے بہت دور کسی باہم پرو جیکٹ پر کام کرنے ہمارے قریب آ گیا ہوا تھا، اس کی بس کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا اور یوں وہ ہسپتال لایا گیا۔ شاید قسمت نے جنہیں جدا ہو اور جنہیں ملانا ہو، ان کے لیے ہی حادثے تشکیل پاتے ہیں۔

وہیں جو کہ ہسپتال میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہی تھی، احمد جہانزیب کو بھاگئی۔ نجانے اسے میری کیا بات ہو آئی۔ میرے نقش بہت خوبصورت تھے لیکن میرا رنگ سانولا تھا جبکہ وہ گورا چٹا، یونانی دیوتاؤں کا سا حسن نہ والا ایک خاندانی آدمی تھا۔ وہ ڈیڑھ ماہ سپتال میں رہا اور اس ڈیڑھ ماہ میں ہم دونوں نے نظروں ہی نظروں میں اپنے تمام عہد و پیاں اٹھا لیے، جس روز اسے چھٹی ملی، اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی۔ مجھے بھلا کیا چاہیے

میں نے اپنے باپ کو محض ایک روز ہی سی اطلاع دی کہ میں مسلمان ہو رہی ہوں اور ایک مسلمان نوجوان سے بیاہ کر رہی ہوں۔ اس دن میرا باپ بہت ڈھنگ سے گڑ گڑایا۔ مجھے میری مری ہوئی ماں کے واسطے دیے لیکن احمد جہانزیب کی محبت ایک مقناطیس تھی اور میرا وجود ایک شہنشاہ کی طرح اسے لوے کا لکڑا۔

اپنے اپنے باپ کی ایک نہ سنی۔ احمد جہانزیب اور میں نے شادی کر لی۔ میری ماں نے میرے لیے شادی کا جوڑا تیار کیا، وہ تھا سفید لیس دار فراک۔ میں نے اپنی شادی کے دن وہی جوڑا پہنا۔ ہماری شادی مسجد میں ہوئی، ان دنوں پاکستان میں اکثر شادی اسلام ہوئی، پھر ہمارا نکاح ہوا۔ جوزف فرنانڈس مسجد کے باہر بیٹھا رو تارہا اور مجھے اور احمد جہانزیب کو بددعا میں دہراتا رہا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ شاید اس دن میرے باپ کی کسی بددعا نے میرا قب شروع کیا تھا اور۔ اور تادیر میرے تعاقب میں رہی۔ تادیر۔۔۔ میرے اور میری خوشیوں کی راہ میں حائل نہ۔

خیر میں بتا رہی تھی کہ مونا جوزف سے منیذہ احمد بن کر میں وقتی طور پر بہت خوش تھی۔ احمد جہانزیب میرے ہونے سے شہر سے بھی دور دراز ایک پھاڑی علاقے میں ایک پرو جیکٹ پر کام کرنے کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا، شادی کے بعد بتایا۔ اس نے بتایا کہ دنیا میں اس کے خونی رشتوں میں نہ اس کی ماں اور اس کی ایک بہن ہیں۔ بہن شادی شدہ ہے اور ماں اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ جب سے ان کا ٹرانسفر دور دراز کے علاقے میں ہوا، ماں اکیلی ہو گئی۔ اسے اکیلا پن برا لگنے لگا، تب اپنی بیٹی بلتیس کے اصرار پر انہوں نے ماں کو احمد جہانزیب کی مستثنیٰ بلتیس بانو کی نندینا بیگم سے کر دی۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی، افسوس بھی ہوا۔ مجھے علم نہ تھا کہ وہ ایک مستثنیٰ شدہ شخص ہے، ورنہ شاید میرا فیصلہ مختلف ہوتا۔ احمد جہانزیب نے نوکری سے چھٹی لے لی۔ وہ مجھے اپنے شہر لے آیا، جہاں اس کی ماں رہتی تھی۔ ان دنوں اس کی بہن بھی اپنی ماں کے پاس آئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں احمد جہانزیب کے لیے سخت پریشان تھیں کیونکہ جہان علاست اس نے اپنے گھر والوں کو اپنے ارادوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ مجھے اب تک وہ دن یاد ہے۔ میں احمد جہانزیب سے پیچھے کھڑی تھی۔ بلتیس بانو اور ماں۔۔۔ دونوں احمد سے لپٹ کر رو رہی تھیں، اسے پیار کر رہی تھیں، لپٹے سے صدقے واری ہو رہی تھیں۔ تب اچانک ان دونوں کی نظر مجھ پر پڑی۔  
 ”آہ۔۔۔ میں آج تک اپنے آپ میں ان نظروں سے خوف زدہ رہتی ہوں۔ وہ نظریں۔۔۔ وہ تلوار تھیں، وہ آری

تھیں جو میرے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں۔ ان میں اتنی نفرت تھی کہ اب تک اس نفرت کا سوچ کر میرا دل لرز کر رہ جاتا ہے۔ ان میں اتنی تپش تھی کہ اس تپش کو آج اتنے سالوں بعد بھی میں اپنے رخساروں پر دکھاتا ہوں۔ محسوس کر سکتی ہوں۔

”یہ کون ہے؟“ اماں نے اسی تپش زدہ لہجے میں پوچھا۔  
”میری سیجا!“ وہ مسکرایا۔ ”میری بیوی۔“ منہ زہ! میں نے اپنے خطوط میں اسی کا ذکر کیا تھا۔ ”دفعۃً“ بلقیس بانو نے اپنا سر پٹینا اور بین کرنا شروع کر دیا۔  
اسی طرح احمد کی اماں نے بھی میرا استقبال اسی انداز میں کیا۔ وہ دونوں اس طرح رو رہی تھیں جیسے جیسے کسی کا انتقال ہو گیا ہو۔ میں ان کے انداز سے سخت خوف زدہ ہو گئی تھی۔

احمد نے بہت مشکلوں سے انہیں خاموش کرایا، ان کی منت سماجت کی، ان کے آگے ہاتھ جوڑے، ان کے پیر پکڑے۔ اماں اندر سے تو راضی نہیں تھیں لیکن احمد کی منت سماجت سے خاموش ضرور ہو گئیں۔ تاہم باقیقیس بانو خاموش بھی نہ ہوئیں۔ وہ چیخ چیخ کر مجھے برا بھلا کہتی رہیں۔ میرے پیچھے مذہب کو وہ میرا قابلِ معافی جرم گردان رہی تھیں، ان کے لیے میں جیسے ایک نجس، ناپاک شے تھی جسے وہ کسی طور قبول نہ کر سکتی تھیں۔  
”کتنا سمجھایا تھا اماں! کتنا سمجھایا تھا میں نے آپ کو لیکن آپ کرا پیٹے بیٹھے پر بہت مان بہت بھروسہ تھا۔“  
جاتے جاتے اماں سے بولیں۔ ”دیکھ لیں، میری زندگی برباد کر ڈالی، آپ کے بیٹے نے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں۔ مینا اور منور مجھے معاف کر دیں گے؟ کبھی نہیں، منور میری زندگی برباد بنا دے گا میرے لیے۔“  
وہ آنسو پونچھتی باہر کی جانب بڑھیں پھر لمحہ بھر کے لیے میرے قریب رکیں۔  
”کلموئی۔ کلموئی۔ کیا پڑھ کر پھونکا تو نے میرے منہ پر؟ جادو گرئی۔ ہمیں برباد کر کے تو بھی خوش نہ رہے گی۔“

یہ دوسرے شخص کی بددعا تھی میرے لیے۔ پہلے میرا باپ اور پھر ساس اور منند۔ میرے دل کو اندیشوں اور دوسلوں کی آندھی نے گھیر لیا۔  
زندگی بہر طور شروع ہوئی۔ جہانزیب کو نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ ڈار ٹمنٹ اتنی چٹھیاں برواشت نہ پڑایا۔ گھر میں مشکلات کا آغاز ہو گیا۔ ادھر بلقیس کا کہنا سچ ثابت ہوا کہ منور امین نے بلقیس بانو کو ہمارے جرم کی سزا سنائی شروع کر دی۔ مینا بنے زہر کھا کر زندگی ختم کرنے کی کوشش کی، تاہم اسے بچا لیا گیا۔ میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا کہ مینا احمد جہانزیب کو دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔

کچھ دن اور نکلے، میں نے احمد جہانزیب سے نوکری کی اجازت مانگی۔ اس نے قدرے تردد کے بعد میری بات مان لی۔ میں نے ایک مقامی اسپتال میں نوکری کر لی۔ وہاں میری ملاقات رابرٹ سے ہوئی۔ رابرٹ میری رشتہ کی ایک خالہ کا بیٹا تھا۔ پوری دنیا میں وہ واحد شخص تھا جس کا میری آنجہانی ماں سے کوئی تعلق بنتا تھا۔ مجھے رابرٹ سے مل کر بہت خوشی ہوئی لیکن جلد ہی یہ خوشی ایک ناقابلِ بیان الجھن میں بدل گئی۔ رابرٹ میرے گھر آنے جانے لگا۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی لیکن میں اسے منع بھی نہ کر پائی۔ شاید میری اسی خاموشی سے میری بد قسمتی کا آغاز ہوا۔ مجھے علم نہ ہوا یا کہ احمد جہانزیب کے دل میں کس وقت میری جانب سے بدگمانی نے جنم لیا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہ کہا، کچھ نہ پوچھا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھوں کا رنگ بھی نہ بدلا۔ وہ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔

رابرٹ کچھ دنوں کے لیے میرے آباؤی شہر گیا، وہاں سے واپسی پر اس نے مجھے بتایا کہ میرے باپ کی حالت کتنے سے بھی بدتر ہے۔ وہ شہر سے دور ایک جھونپڑے میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں صرف اس امید پر تھامے ہوئے ہے کہ میں ایک مرتبہ اس سے مل جاؤں۔  
ماں اور بلقیس بانو مجھے ہلا پھلا کر ایک دور افتاد علاقے میں بے ہمتال میں لے آئیں، جہاں ان کے بقول نرک پیدا نش ہوئی تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ احمد کا بچہ بھی اسی ہسپتال میں جنم لے۔ نجائے کیوں مجھے ان کی بات سننے نہ تھا۔ میرے دل میں ایک کھٹکا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے اور پھر وہ انہونی ہو کر رہی۔ دردزدہ

احمد مجھے چھوڑ کر رہا۔ ”اتھا“ ایک غیر معینہ مدت کے لیے مجھے کچھ بھی بتائے بغیر مجھ سے ملے بغیر۔ وہ بائیس کر سکتا تھا؟۔۔۔ جی سوچ کر میں یا گل ہو گئی لیکن کوئی سرا میرے ہاتھ نہ آیا۔ آخر وہ اچانک تو نہیں گیا تھا۔  
میں نے کوئی پلاننگ کی ہوئی۔ میں ایسا ہی کیا ہو گا، کوئی طے شدہ پروگرام ہو گا جس پر عمل درآمد کیا گیا تھا لیکن میری ہمت کا جواب مجھے دینے والا کوئی نہ تھا۔ بلقیس بانو تو میری صورت سے نفرت کرتی تھیں۔ اماں کی بے نیازی بھی بے عروج پر تھی۔ میں نہ زندہ ہوں میں رہی تھی نہ مردوں میں۔ مارے باندھے نوکری پر جاتی تھی واپسی پر پورے گھر کا کام کرتی تھی پھر بھی کوئی مجھ سے خوش نہ تھا۔ مجھے کسی کی خوشی سے غرض نہ تھی، سوائے احمد جہانزیب کے بن اس ظالم نے تو مجھے اپنا کوئی فون نمبر کوئی اتنا تک نہ دیا تھا جس پر میں اس سے رابطہ کر پاتی۔  
پھر میرے اندر خوشی کی ایک کونیل پھولی۔ احمد جہانزیب سے جانگھسل جدائی کا اکیسواں روز تھا۔ میں نے اس شک سا ہونے پر اس کی تصدیق چاہی۔ ہسپتال میں دورانِ ڈیوٹی ہی مجھے یہ خوش خبری ملی کہ میں ماں بننے والی ہوں۔  
میں گھر پہنچی، اماں کو بتایا۔ ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ مجھے

ان کی کیفیت سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے ان سے احمد کا پتہ یا فون نمبر مانگا، ان کے تہموں میں جھک گئی لیکن ان کا ایک جواب تھا۔ انہیں بھی میری طرح کچھ علم نہ تھا، حالانکہ میں جانتی تھی کہ ان کا احمد سے فون پر رابطہ ہے۔ اکثر اس سے بچہ انہیں بلانے آتا تھا۔ احمد ہرگز سر۔ بدن انہیں فون کرتا تھا۔  
مجھے احمد کے رہنے پر حیرت کم اور افسوس زیادہ ہوتا تھا۔ اس نے جیسے میری زندگی کے ساتھ ایک بے رحم ٹھکانہ بنا لیا۔ میں نے مجھے ایک دلدل سے نکال کر ایک صحرا میں لاکھڑا کیا تھا۔ میں نے خود کو تقدیر کے آگے زکوں کر دیا۔ حالات سے سمجھوتہ کر کے میں بالکل خاموش ہو گئی۔ دن گزرتے گئے۔ میں اس گھر میں تنہائی اور ان کی بے نیازی اور بے مہری کے ساتھ جیتی رہی۔ حتیٰ کہ میری ڈیلیوری کا مہینہ آپہنچا۔ تب اچانک نجائے کیا۔۔۔ اماں اور بلقیس بانو کا رویہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ وہ دونوں میرے آگے پیچھے پھرنے لگیں۔ مجھ سے اپنے سابقہ سہارے کی معافی چاہنے لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مجھے دلاست دینے لگیں کہ بچے کی پیدائش پر وہ ضرور کسی نہ کسی طرح احمد کو اطلاع بھجوائیں گی اور وہ ضرور آئے گا۔ میں نے سمجھا کہ تقدیر کی بے مہری ختم ہوئی، آزمائش ختم ہوئی، آج سے دن جن کی آس میں جیتی تھی، آگے کیا خبر تھی کہ یہاں سے ایک نیا امتحان، نئی آزمائش کا آغاز ہوا۔

اماں اور بلقیس بانو مجھے ہلا پھلا کر ایک دور افتاد علاقے میں بے ہمتال میں لے آئیں، جہاں ان کے بقول نرک پیدا نش ہوئی تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ احمد کا بچہ بھی اسی ہسپتال میں جنم لے۔ نجائے کیوں مجھے ان کی بات سننے نہ تھا۔ میرے دل میں ایک کھٹکا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے اور پھر وہ انہونی ہو کر رہی۔ دردزدہ



سے پہلے ہی مجھے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کروایا گیا اور جب مجھے ہوش آیا۔ آفس۔ میری کوکھ خالی تھی، میرے ہاتھ خالی تھے، میرا دل خالی تھا۔  
آپریشن کے ذریعے ڈیویری عمل میں لائی جا چکی تھی۔ وہاں میرے پاس کوئی نہ تھا نہ اماں نہ بلقیس بانو نہ میرا بچہ۔

میں بہت روئی چٹی، بہت شور مچایا لیکن سب کے منہ پیسے دے کر بند کئے جا چکے تھے۔ پورا عملہ بیک زبان کہہ رہا تھا کہ مرہ بچہ پیدا ہوا تھا جسے دفنا کر اس کی وادی اور پھونکی وہاں سے چلی گئی تھیں۔  
جانے سے قبل وہ ایک لفافہ بھی میرے لیے دے گئی تھیں۔ میں نے لفافہ چاک کیا اور مجھے علم ہوا کہ منیبت کبھی اکیلی نہیں آئی۔ اس میں احمد جہانزیب کا تحریر کیا ہوا طلاق نامہ تھا۔ کیوں؟ کس لیے؟ کس جرم کی سزا؟ میرے سوالوں کا جواب دینے کے لیے وہاں کوئی نہ تھا۔ طلاق نامے پر لکھی تاریخ آٹھ ماہ پرانی تھی۔ گویا آٹھ ماہ قبل اس نے مجھے طلاق مجبوا دی تھی جسے مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا۔ یہ ایک گتھی تھی جسے میرے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں دن رات روتی اور اسے سلجھانے کی کوشش کرتی۔ ہسپتال کے کمرے میں رکھے اپنی کیس میں میرے سارے کپڑے اور میرا سب سا زوسا مان موجود تھا۔ گویا وہ مجھے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہنے کے لیے ہی وہاں لائی تھیں۔

آپریشن کے پانچویں دن مجھے فارغ کر دیا گیا۔ ہسپتال کے اخراجات کی ادائیگی کی جا چکی تھی۔ میرے مہر کی رقم بھی مجھے اپنی کیس میں مل گئی تھی لیکن مجھے اپنا بچہ چاہیے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا بچہ زندہ ہے جسے پورے نواہ میں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کر محسوس کیا تھا جس کی کوئل انگڑائیوں کو اپنے اندر سمیٹے رکھا تھا جس کے ساتھ پہروں چھوٹی چھوٹی باتیں کی تھیں۔ اس کے باپ کی جفاؤں کی ساری شکایتیں میں اس سے کیا کرتی تھی۔ اس بچے کو میں نے ایک نظر تک نہ دیکھا۔ میں نے اس کی لڑائی جھگڑائیوں کو جو کچھ نہیں دیکھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہوسہ تک نہ دیا۔ میں نے اس کے نرم وجود کی خوشبو کو اس کے پس کی گرمی کو اپنی روح میں اترا محسوس نہ کیا۔ مجھ سے زیادہ تھی اماں، مجھ سے زیادہ اجاڑ اور دیرین پوری دنیا میں کوئی نہ تھا۔  
روتی، ہلکتی، سسکتی میں اپنا زخمی وجود لے کر ایک لبا سفر پہنچنے کے لیے صرف اپنا بچہ واپس لینے کے لیے گھر پہنچی تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ مکین وہ گھر بچ کر جا چکے ہیں۔ میں پوری دنیا میں اکیلی رہی۔

بہر طور سانس کی ڈور بندھی رہے تو بندہ بشریٹ بن کر ہر مشکل بھیل جاتا ہے۔ میں ہسپتال چلی آئی۔ ایک گہری جامد خاموشی کے ساتھ میں نے زندگی کا ننا شروع کی۔ احمد جہانزیب کون تھا میں نے بھول گئی۔ ہمیشہ کے لیے بھول گئی لیکن ایک ننھے وجود کے بلکنے کی آواز مجھے نیند میں چونکا دیا کرتی تھی۔ پورا ڈیڑھ ماہ میری تپیں میرے سینے پر بھینکتی رہی اور میرے آنسوؤں سے میرا دامن تر ہوتا رہا۔ میرا آجکل گیلا ہی رہتا تھا۔ میرے دل کا خون۔ میرے جگر کا لہو۔ دودھ بن کر چھاتی سے بہتا تھا، آنسو بن کر آنکھوں سے بہتا تھا اور۔ اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اماں اور بلقیس کو ہمیشہ پیا سارہنے کی بددعا دیتی تھی پھر میں کراچی چلی آئی۔

میں ایک ہنگامہ خیز زندگی کا حصہ بن کر اس رونے کی آواز کو فراموش کرنا چاہتی تھی جو میری راتوں کی بے خوابی کا سبب تھی۔ کراچی میں خوش قسمتی سے ایک اچھے ہسپتال میں مجھے نوکری مل گئی۔ وہاں میری ملاقات محسن علی صاحب سے ہوئی۔ وہ ایک ازحد شریف النفس اور بے تحاشا اچھے انسان تھے۔ چند ماہ قبل ان کی بیوی ایک بچی کو جنم دے کر انتقال کر گئی تھیں۔ اس بچی سے پہلے بھی ان کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا ایک بیٹی۔ میری داستان غم نے محسن صاحب کے قلب پر گہرا اثر کیا۔ انہوں نے سیدھے سبھاؤ مجھ سے اپنی زندگی میں شامل ہو جانے کے لیے کہا تاکہ میری متاکو قرار مل سکے اور ان کی بچوں کو ماں کا پیار اور ان کے گھر کو ایک گھراں۔ سو اس طرح ایک بچہ کھو کر

مجھے تین بچے مل گئے۔

چند ماہ کی انیتھ دو سال کا عباد اور ساڑھے تین سال کی شہلا۔ میں نے اپنے بچوں کو کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی حقیقی ماں نہیں ہوں لیکن کبھی ان سے یہ حقیقت چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی اور میرے بچوں نے کبھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی حقیقی ماں نہیں ہوں اور ہمیشہ مجھے یہ بات بھلانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں یہ بات بھول گئی، میں بھول گئی کہ یہ میرے اپنے وجود کا حصہ نہیں ہیں۔

لیکن۔۔۔ لیکن وہ آواز۔ میں وہ آواز نہیں بھول پائی جو میں نے حالت بے ہوشی میں سنی۔ میں ان ننھے ہاتھوں کا لمس نہ بھول سکی جو میرے اندر انگڑائیاں لیتے تھے۔ میری بے خوابی میں کئی ضرور آگئی لیکن اب بھی اکثر رات کو آنکھ بے وجہ ہی کھل جاتی ہے لیکن اب۔۔۔ اب جو سکون کی غیند سوؤں گی تو شاید روز قیامت ہی جاؤں۔

\*\*\*

منیہہ بیگم کی کہانی مجھے میرے والد منور امین نے بستر مرگ پر سنائی۔ یوں تو مرتے دم تک انہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کیا لیکن انہوں نے کسی سے بھی معافی مانگنا پسند نہ کی لیکن ان کی آنکھوں میں موت کا بے تحاشا خوف چخ چخ کر کہتا تھا کہ انہیں اپنی پچھلی پوری زندگی پر وقت ایک فلم کی مانند چلتی نظر آتی ہے۔ وہ مرنے سے سخت خوف زدہ تھے اور ان کی زندگی موت جیسے بھی بدتر تھی۔ ایسا صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جنہوں نے ساری زندگی حقوق العباد کو جی بھر کر ملیا میٹ کیا ہے جنہوں نے دو سروں کی بددعا میں سمیٹی ہوں، دو سروں کو لہو رنگ آنسو رلائے ہوں۔ میرے والد ایک ایسے ہی انسان تھے۔

نجانے کیوں مرنے سے چند گھنٹے قبل انہوں نے بتا میرے کچھ پوچھے مجھے یہ کہانی سنائی۔ شاید انہیں اور اک

ہر ایک کا تھا کہ غلطیوں کی معافی نہ سہی غلطیوں کا اعتراف بھی بہر حال ایک اہمیت کا حامل ہے۔  
میرے اماں نے احمد جہانزیب ایک خوبصورت فنکارانہ مزاج کے حامل شخص تھے۔ انہیں بتائے بغیر میری امی نے میری نالی کو رضامند کر کے مینا پھپھو سے جہانزیب ناموں کی مقلدی طے کر دی۔

مینا پھپھو نہ صرف یہ کہ واجبی شکل و صورت اور واجبی تعلیم کی حامل تھیں، انہوں نے کبھی اپنی شخصیت کو کوئی خوبصورت صفت عطا کرنے کے متعلق بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اچھی صفات سے میرا ایک سخت مزاج، انا پرور عورت تھیں جو میرے والدین کی شادی کے موقع پر ماموں کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھیں اور ماموں کو بلا شرکت غیرے اپنانا انہوں نے زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔

ماموں جب منیہہ دہائی کو گھرا لے تو تمام افراد پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی۔ کئی تو ایسے بھسم ہوئے کہ کبھی ان پر سزہ نہ آگ سکا۔ ان میں مینا پھپھو اور میرے والد شامل تھے۔ امی، نانی اور میرے والد نے ایک مشترکہ منصوبہ بنایا جس کے تحت کسی بھی صورت منیہہ مامی کو خاندان کا حصہ نہیں بنانا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ جہانزیب ماموں کی نہایت فاش غلطی تھی جسے ہر طور درست کرنا تھا۔

ماموں کو دکھانے کے لیے نانی امی نے مرا کیا نہ کرتا کے مصداق بے دلی سے منیہہ مامی کو گھر میں رکھ لیا۔ انہیں وہ زیور بھی دیا جو انہوں نے اپنی بہو کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اپنا خاندانی عروسی لباس بھی دیا۔ منیہہ مامی فطرتاً ایک سادہ اور معصوم خاتون تھیں۔ وہ اس پر ہی خوش ہو گئیں۔

اب پلاننگ پر باقاعدہ عمل درآمد شروع کیا گیا۔ امی اور نانی امی عاموں کے پاس جانے لگیں، ان سے تعویذ لالا کر جہانزیب ماموں کو پلائے جاتے تاکہ ان کا دل منیہہ مامی کی جانب سے بدگمان کیا جاسکے۔ نانی امی جیکے جیکے اندر نناندر منیہہ مامی کے خلاف ماموں کو بھرا کرتی تھیں۔ سوئے اتفاق ان ہی دنوں مامی کے ایک رشتے کے بھائی جو

ایک عیسائی نوجوان تھے 'مائی کو مل گئے۔ بس یہیں سے ان کی ذات کے خلاف سب سے بڑا ایٹو کھڑا کرنے کی بنیاد فراہم ہو گئی۔

امی اور نانی امی نے ماموں کو باور کرانا شروع کیا کہ منیہ مائی جب موناجوزف تھیں تب سے ان کے رابرٹ سے خفیہ تعلقات تھے۔ انہوں نے کئی جھوٹی قسمیں اٹھائیں اور کئی غلط بیانیوں کیں جن سے حقیقتاً "ماموں کا دل مائی کی جانب سے بدگمان ہونے لگا۔ شومنی قسمت سے مائی نوکری بھی کرتی تھیں 'سوان کے دن کا بڑا حصہ ماموں اور گھر سے دور گزرنا تھا۔

ماموں نے اپنی بدگمانی مائی پر ظاہر نہ کی۔ انہوں نے اندر ہی اندر اپنے ملک سے باہر جانے کے انتظامات شروع کر دیے۔ وہ پڑھتے لکھتے قابل نوجوان تھے۔ جلد ہی ان کے باہر جانے کا بندوبست ہو گیا۔ ایک کمپنی نے انہیں ایگریمنٹ کے تحت بلوا لیا۔ ان ہی دنوں امی نے رابرٹ کے ساتھ اپنے باپ سے ملنے کی اجازت مانگی۔

ماموں نے انہیں بلا جوں و چرا اجازت دے دی اور خود دوسرے ہی دن گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ جانتے تو مائی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ بھی سکتے تھے لیکن نجانے کیوں انہوں نے ایسا نہ کیا۔ شاید ان کے دل سے کسی کو بڑے امید کی مدد ہم سی لوروشن تھی۔ شاید وہ سوچتے تھے کہ منیہ مائی بے قصور بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ منیہ مائی کی جانب سے کسی اعتراف 'کسی شکوے 'کسی پیار بھری شکایت کے منتظر تھے لیکن جالافتابی چلی میں پستی مائی نے اوھر توجہ نہ کی۔ یوں ان دنوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی خلیج حاصل ہو گئی۔

امی اور نانی امی کا پروگرام تھا کہ وہ مائی کو گھر سے نکال دیں گی اور ماموں سے کہیں گی کہ موناجوزف کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ لیکن مائی نے انہیں وہ خوشخبری سنا دی جس پر نانی امی رنگ رہ گئیں۔ اب وہ اپنے پروگرام پر عمل نہ کر سکتی تھیں۔ نانی امی خاندانی خاتون تھیں 'وہ اپنے اکلوتے بیٹے کا بچہ کسی طور کسی دوسرے کو نہ دے سکتی تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بچے کی پیدائش تک منیہ مائی کو گھر ہی رکھا جائے گا۔ البتہ ایک کام انہوں نے اور کیا وہ یہ کہ ماموں کو پورے ایک ماہ بعد اطلاع کی کہ منیہ کو گھر سے لے لیا ہے۔ ماموں کے جانے کے پورے ڈیڑھ ماہ بعد اسٹے ہفتے ہی مائی کے لیے طلاق نامہ موصول ہو گیا۔

پروگرام کے تحت یہ طلاق نامہ مائی سے چھپایا گیا۔ نانی امی اور امی نے اپنا رویہ مائی سے بالکل تبدیل کر لیا تاکہ انہیں کسی قسم کا شک نہ ہونے پائے۔ میرے والد نے اپنے ایک دیرینہ دوست کے توسط سے ایک ایسے اسپتال کے متعلق معلومات حاصل کیں جہاں زیادہ تر ناجائز کام کیے جاتے تھے۔ وہاں کئی بڑے گھروں کو ابونے رشوت دے کر اپنی مرضی کا کام کرنے پر راضی کر لیا۔ یوں میری معصوم مائی کو ان کی زندگی کی ہر خوشی سے محروم کر دیا گیا۔

ابو جان کے پروگرام میں تو یہ بات بھی شامل تھی کہ گھرا کر ہونے والی بچی کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا جائے گا تاکہ جہانزیب ماموں ہر جھجھوت سے آزاد ہو کر ان کی بہن کے ہو جائیں لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نانی امی نے اپنے بیٹے کی اولاد 'یعنی ربیعہ کو قتل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس بات پر میرے والد اور نانی کے درمیان ٹھن گئی۔ والد کا کہنا تھا کہ بچی کو جیتا جاگتا یا کر جہانزیب معاملے کی تمہ تک پہنچ جائیں گے کیونکہ بچی نے نقوش ماں کے اور رنگت اپنے باپ کی لی تھی اور جبکہ نانی امی ایک ماں سے اس بے دردی سے اس کی اولاد چھین لینے سے قدرے خوف زدہ سی ہو گئی تھیں۔

انہیں واضح سمجھ میں آ رہا تھا کہ بیٹی اور داماد کی باتوں میں اگر انہوں نے اپنے بیٹے کی زندگی میں ایسا زہر گھولا ہے جس کی کئی قیامت تک اس خاندان کے حافظے سے محو نہ ہو پائے گی۔ ابو کے تیور اس درجہ خطرناک تھے کہ نانی امی اس بچی کے لیے سخت خوف زدہ ہو گئیں۔ ایک رات وہ اس بچی کو لے کر گھر سے چلی گئیں۔ ان کی بہن نواب شاہ کے قریب ایک نواحی علاقے میں رہتی تھیں۔ نانی امی ان کے پاس چلی گئیں۔ دونوں بہنوں کی مشترکہ جائیداد

میں ایک مکان اور چند کانٹیں تھیں 'جن سے وہ زندگی بسر کرنے کے قابل تھیں۔

یہاں امی کو قدرت نے سزا دینے میں دیر نہ کی۔ مجھ سے بڑی بہن تمنا جو اس وقت تین چار سال کی تھی سخت بخار میں مبتلا ہوئی اور چند راتوں میں ہی امی کو اولاد کے دکھ سے روشناس کر کے اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی۔ امی کے دل پر اس حادثے کا شدید اثر ہوا۔ اس کے بعد وہ بھی زیادہ عرصہ نہ جی پائیں اور اپنے گناہ و ثواب کا حساب کتاب لے کر اپنے خالق کے دربرو حاضر ہو گئیں۔ نجانے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہو گا۔

میرے والد پر کسی حادثے کا کوئی خاص اثر نہ ہوا تھا 'ان کی آنکھوں پر بندھی غفلت کی پٹی قیامت تک کے لیے تھی۔ روز قیامت اسے فرشتے ہی کھولیں گے۔

میرے والد کے ہاتھ اس موڑ سے ایک ایسی خزانے کی چابی آ گئی جس کو پا کر وہ اپنی بیوی اور مری ہوئی بچی کو تو کیا اپنی زندہ اولاد تک کو بھول گئے۔

نانی امی کے چلے جانے سے جہانزیب ماموں کے رابطے کا واحد ذریعہ میرے والد ہی تھے۔ انہوں نے ماموں کو جھوٹی بچی کہما بیان سنا دی جس کے مطابق منیہ مائی طلاق کے بعد رابرٹ کے ساتھ چلی گئی تھیں اور نانی امی سخت بیمار تھیں اور ابوان کا علاج کروا رہے تھے۔ جہانزیب ماموں پر اپنی زندگی کے اس حادثے کا اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ انہوں نے کبھی ملک نہ لوٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ابو کے اکاؤنٹ میں نانی امی کے علاج کے لیے پیسے بھجواتے رہے 'بھجواتے رہے اور ابو کے منہ کو ایک بھٹی ختم ہونے والی پیاس لگ گئی۔

نانی امی نے ابو کو کئی خط لکھے اور جہانزیب ماموں کا پیسہ اور فون نمبر مانگتی رہیں۔ وہ ان سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنا چاہتی تھیں 'انہیں سب کچھ بتا کر ہر جرم کا اعتراف کر کے وہ اپنی روح پر دھرا بوجھ اتار پھینکنا چاہتی تھیں۔ ابو نے نانی امی کو اپنے سیدھے مخالفوں کا شکار کر دیا۔ کبھی وہ جہانزیب ماموں کے کسی حادثے میں مرنے کی اطلاع دے دیتے تو بچی کشیدہ قرار دے دیتے۔ نانی امی کو مرنے والے دم تک شاید علم نہ ہو سکا ہو گا کہ جہانزیب ماموں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

جہانزیب ماموں کو جب ابو پر شک ہونے لگا تو انہوں نے اپنے ابو سے دو ٹوک بات کی۔ وہ فون پر اپنی والدہ کی آواز سننا چاہتے تھے تب ابو نے انہیں بتایا کہ نانی امی تو دو سال پہلے انتقال کر گئی ہیں اور ماموں کے بھجوائے پیسوں سے ابو نے مکان خرید لیا ہے۔ انہوں نے اپنے لیے مکان کے لیے ایک رسمی سی معذرت کر لی۔ جہانزیب ماموں نے کچھ بھی کہے بنا خاموشی سے فون بند کر دیا اور اپنے گھر کے بعد کبھی کسی نے ان کی آواز نہیں سنی۔

برسوں گزر گئے۔ ابو پاموں کی بھیجی رقم پر کسی سانپ کی مانند بیٹھے رہے۔ تمدن بھائی چونکہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں 'چنانچہ وہ اس معاملے سے کچھ کچھ آگاہ تھے۔ ابو کے بستر پر بڑ جانے کے بعد تمدن بھائی نے ابو سے وہ پیسے مانگنے شروع کیے لیکن ابو ایک نفسیاتی عارضے کا شکار ہو چکے تھے انہیں لگتا تھا کہ جیسے ہی وہ رقم ختم ہوگی 'ابو کی زندگی بھی ختم ہو جائے گی اور جب تک ان کے پاس وہ رقم باقی ہے وہ زندگی کی گاڑی کو کھینچتے رہیں گے۔

انہیں اپنی تعفن زدہ زندگی ہر شے سے زیادہ پیاری تھی۔ انہیں پیاس کا عارضہ لاحق تھا جو شاید اسی نفسیاتی گہرے پیوستہ کوئی بات تھی۔ وہ ہر وقت پیاس کا شکار رہتے تھے۔ وہ خود پانی پی پی کر اور انہیں پانی پلانے والے پلا پلا کر تنگ جاتے لیکن وہ پیاس جوں کی توں رہتی۔

ربیعہ نے ابو کی بہت خدمت کی۔ اس بات سے بے خبر ہو کر کہ ابو نے اس کی زندگی کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں کیں۔ ابو مرتے وقت ربیعہ ربیعہ کہہ رہے تھے۔ نجانے ان کے دل میں کیا تھا؟ کیا وہ اس کو سب کچھ بتانا چاہتے تھے یا وہ ربیعہ سے معافی مانگنا چاہتے تھے؟ ربیعہ کے علاوہ اگر ان کی زبان کوئی اور لفظ ادا کپاتی تو شاید سمجھ میں

”آتا۔ ابو مرگئے۔ تمدن بھائی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ انہیں ابو کے سامان میں بھی کچھ نہ مل سکا۔ وہ غم و غصے سے گویا پاگل ہی ہو گئے۔ تب ایک دن مینا پیپھو خاموشی سے صولت کو لے کر چلی گئیں۔ کچھ دن بعد خبر ملی کہ مینا پیپھو نے اپنے لیے ایک گھر خرید لیا ہے وہ اور صولت بڑے مزے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سنتا تھا کہ تمدن بھائی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے خنجر کی نوک پر مینا پیپھو سے سب کچھ اگلا لیا۔ ابو نے ماموں کو بھجوائے ہوئے پیسے نکسٹر اکاؤنٹ میں ڈلوائے تھے جو اتنے عرصے میں دو گئے تھے ہو چکے تھے۔ ابو کی وفات سے چند روز قبل پیپھو نے ابو کی چھپائی ہوئی چیزوں میں سے بینک کاغذات اور چیک ایک نکال کر چھپائی تھی تاکہ پیچھے کوئی سراغ باقی نہ رہے۔ بعد میں پیپھو اس رقم کی بلا شرکت غیرے مالک بن گئی تھیں۔

تمدن بھائی پیپھو سے مطالبہ کرنے لگے کہ وہ مکان تمدن بھائی کے نام لکھ دیں۔ پیپھو نے صاف انکار کر دیا۔ تمدن بھائی کے ہاتھوں پیپھو کا قتل ہو گیا۔ وہ خون آلود خنجر لے کر گھر آئے اور کچھ ہی دیر بعد پولیس وہاں پہنچ گئی۔ ہمارے گھر کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ تمدن بھائی کو گرفتار کر لیا گیا۔ تصور بھائی فرار ہو گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھے فون کر کے گھر نہ لوٹنے کے لیے کہا۔

میں اس وقت آفس میں تھی۔ میں نے عبد الباری کو سب کچھ بتایا۔ یہ مجھے اپنے گھر لے گئے لیکن ان کے گھر والوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے پناہ دینے سے انکار کر دیا بلکہ مجھ پر رکیک الزامات بھی عائد کیے۔ عبد الباری اگلے قدموں مجھے وہاں سے لے آئے۔ ہم نے شام کو باری کے ایک دوست کے گھر نکاح کر لیا اور اگلے ہی دن شہر چھوڑ کر کراچی چلے آئے۔ یہاں باری کے ایک دیرینہ دوست اور لاڑشتہ دار کے توسط سے ہمیں گھر بھی میسر آ گیا اور باری کو جلد ہی نوکری بھی مل گئی۔ یوں زندگی قدرے بہتر شکل میں رواں ہو پائی۔ وہاں تمدن بھائی کو عمر قید سنائی گئی۔ تصور بھائی نے صولت سے نکاح کر لیا۔ یوں ان دونوں کا بھی گھر بس گیا۔ سو یہ بھی ہمارے گھر کی کہانی ہے ایک عمر کی لالچ، طمع اور حرص کا انجام۔ ساری عمر کی پیاس اور خالی ہاتھ رو آئی میرے پاس کا مقدر۔

نشہ خواہشات کو اپنے خون سے سیراب کر کے ہمیشہ کی نیند سو جانا پیپھو کی قسمت اور نکلتے سکوں کی جھنکار سننے کے شوق میں۔ ہتھکڑیوں اور پیر یوں سے نبرد آزما تمدن بھائی کا نصیب ٹھہرا۔

”مال۔ مال۔“ اس کے لب دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے اور بند پٹکوں جیسے آنسو رواں تھے۔ اپنا سراپنی ماں کے سینے پر دھیرے وہ محض اسی لفظ کی تکرار کیے جاتی تھی۔

”میری بچی۔ میری بیٹی۔ میری زندگی۔“ وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لیے ایک عمر کی بچی کو قطرہ قطرہ سیراب کر رہی تھیں۔

عباد انیقہ، ترانا اور عبد الباری ساکت بیٹھے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ زندگی اتنے رنگ بھی بدل سکتی ہے یقین کرنا مشکل تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، نظروں کے سامنے تھا۔ ”جب آنکھ کھلی تو میری کوکھ خالی تھی ربیعہ! میری ہاتھ خالی تھے، میرا دل خالی تھا۔“

وہ ان ہی الفاظ کی تکرار کیے جاتی تھیں۔

”آج میں آپ کے پاس ہوں امی! آپ کے سینے سے لگی ہوئی ہوں۔“

ربیعہ نے ان کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے دیوانگی سے اس کے ہاتھ کو بوسے دیے۔

”اسی لیے جو ما کرتی تھی ان ہاتھوں کو میں۔ انہیں دیکھ کر نجانے کیوں مجھے اپنے اندر پھیلتی وہ تنہی، غمگیناں یاد آیا کرتی تھیں۔“



گھر پہنچ کر سب سے مل کر پھر کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر وہ چپ چاپ اپنا پنڈیگ اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔ نیکی والے کو مطلوبہ مقام بتا کر وہ پورا راستہ خاموش بیٹھی اپنے دل کی دھڑکنوں کو گنتی رہی۔ نیکی رکی تو وہ باہر نکلے اس کے سامنے واقع اس بلند و بالا عمارت کی تیسری منزل پر اس کا گھر تھا۔ سراٹھائے وہ کچھ دیر اپنے گھر کی کنکریں دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پھر کا ایک اسے خود پر کنٹرول نہ رہا تھا۔ وہ اندر کی جانب بھاگی۔ عمارت میں لفٹ موجود تھی لیکن اس نے سیڑھیوں کا انتخاب کیا۔ تیزی سے بڑھیاں پھلانگتی وہ چند منٹوں میں اپنے گھر کے دروازے پر جا پہنچی تھی۔ اس نے چیک نہیں کیا کہ دروازہ لاک نہ آیا نہیں۔ اس نے نیل پر انگلی رکھ دی تھی اندر نیل کی آواز گونجی اور تو اتر سے بھتی چلی گئی۔ ایک منٹ کے وقفے سے دروازہ کھل گیا تھا۔

ایقان ساکت رہ گئی۔ وہ سامنے کھڑا تھا جیسے کوئی بریل کا بیمار، بڑھی ہوئی شیو، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، زرد رنگت، تلخ کپڑے۔

شہر نے اپنی اسے دیکھ کر اسی کی طرح جھکتے کی حالت میں تھا۔ کتنے ہی یوں گزرے تھے پھر نجانے عاشر کو کیا ہوا؟

## ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- خوشدست سرورق
- خوشدست نمونہ
- منہبوط جلد
- آفسٹ پیپر

شائع ہو گئے ہیں

|                            |                |
|----------------------------|----------------|
| ستاروں کا آنگن،            | قیمت: 400 روپے |
| ایمان، امید اور محبت،      | قیمت: 200 روپے |
| اے وقت گواہی دے، راحت جنیں | قیمت: 350 روپے |
| تیرے نام کی شہرت،          | قیمت: 180 روپے |
| امر نیل،                   | قیمت: 450 روپے |

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

اس نے زور سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ اگلے ہی لمحے ایقان نے اپنا ہاتھ چوکھٹ پر رکھ دیا۔ اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔ "اس کی نظروں میں بھی تحسین ابھری پھر اگلے ہی پل معدوم ہو گئی۔ کراہ تک نہ نکلی تھی۔ عاشر نے فوری دروازہ کھول دیا اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس کی انگلیاں بری آتے لمحوں کا خیال بہت جانیگسل تھا۔ طرح سے مجروح ہوئی تھیں۔ شدت درد سے انگلیاں ہتھیلی نیلی پڑ گئی تھیں۔ پوریں بالکل سفید ہو رہی تھیں۔ خود شادی کی رات سے قبر کی رات تک تم روز و روگی۔ یاد رکھنا۔" اس کا چہرہ اپنی رنگت کھو بیٹھا تھا۔

"پائل ہو؟" وہ غرایا۔

"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب لرز رہے تھے۔

"جانتا ہوں۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔ "اچھی طرح جان گیا ہوں۔"

"پھر ایک پاگل کو سزا دیتے رہے؟"

"خود ساختہ پاگل بن قابل معافی نہیں ہوتا۔" وہ بے رخی سے بولا۔

"پھر یہ خود ساختہ نظر بندی؟ کیوں کیوں؟ خود ساختہ ترک دنیا۔ یہ کیوں؟"

وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک ہی دونوں کو احساس ہوا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے وہ گھر کے اندر تک آگئے تھے۔ عاشر نے

احساس ہوتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر اس کی جانب پشت کر لی۔

"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ اسی بے رخی سے بولا۔

ایقان دھیرے سے مسکرائی۔ وہ بے رخی سے پیٹھ موڑ لے کھڑا تھا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھی اور اس کی پشت پر

سزا دے کے دونوں بازو اس کے گرد حائل کر دیے۔

"اب تم میرے سامنے نہیں ہو اب جواب دو۔"

"تم۔" اس کے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑا تھا۔ "تم۔ جاؤ یہاں سے۔ میں۔ میں تمہیں معاف نہیں

کر سکتا۔"

"میں معافی نہیں اپنا حق مانگنے آئی ہوں۔"

"تم اپنے حقوق میرے منہ پر مار چکی ہو۔" وہ تلخ انداز میں بولا۔

اپنے گرد حائل اس کے بازوؤں کو سختی سے جھٹک دینے کی خواہش سر اٹھا کر پھر گرا چکی تھی۔ وہ توڑ پچکی

تھی۔ وہ خود کو بے بس پیچھی محسوس کر رہا تھا۔ ایقان کی بے خود محبت جال کی طرح اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔

"میں آگئی ہوں عاشر! اور ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی۔ مجھے بھولا ہوا امت کہو۔ مجھے برا بھلا مت کہو۔ میں سب

کچھ سنوں گی لیکن ابھی نہیں ابھی صرف۔ صرف اپنی محبت دو مجھے جو تم نے ساری دنیا سے بچا کر صرف میرے

لیے رکھی ہے۔ اس محبت پر میرا ایسا ہی حق ہے جیسا میرے وجود پر تمہارا حق ہے۔ پلیز عاشر۔"

وہ اس کی پشت پر سے ٹھوم کر اس کے سامنے آگئی۔ عاشر کے لیے مزید دافعت ممکن نہ رہی تھی۔ دریا سارے

بند توڑ چکا تھا۔ محبت اور آنسو ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے۔

\*\*\*

"یہ ہو گیا مکمل۔" اس نے پیلا نیٹ کا خوبصورت دوپٹہ ناعمہ کے اوپر ڈال دیا۔ ہرے گولے کا نہایت نفیس

اور باریک کام پورے دوپٹے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ درود کی پورے ایک ماہ کی محنت کا پھل تھا۔

"ایسا دوپٹہ کسی دلہن کا نہ ہو گا۔ یاد رکھنا۔" اس نے ناعمہ پر رعب جمایا۔

اس کی نظروں میں بھی تحسین ابھری پھر اگلے ہی پل معدوم ہو گئی۔ کراہ تک نہ نکلی تھی۔ عاشر نے فوری دروازہ کھول دیا اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس کی انگلیاں بری آتے لمحوں کا خیال بہت جانیگسل تھا۔ طرح سے مجروح ہوئی تھیں۔ شدت درد سے انگلیاں ہتھیلی نیلی پڑ گئی تھیں۔ پوریں بالکل سفید ہو رہی تھیں۔ خود شادی کی رات سے قبر کی رات تک تم روز و روگی۔ یاد رکھنا۔" اس کا چہرہ اپنی رنگت کھو بیٹھا تھا۔

"پائل ہو؟" وہ غرایا۔

"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب لرز رہے تھے۔

"جانتا ہوں۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔ "اچھی طرح جان گیا ہوں۔"

"پھر ایک پاگل کو سزا دیتے رہے؟"

"خود ساختہ پاگل بن قابل معافی نہیں ہوتا۔" وہ بے رخی سے بولا۔

"پھر یہ خود ساختہ نظر بندی؟ کیوں کیوں؟ خود ساختہ ترک دنیا۔ یہ کیوں؟"

وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک ہی دونوں کو احساس ہوا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے وہ گھر کے اندر تک آگئے تھے۔ عاشر نے

احساس ہوتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر اس کی جانب پشت کر لی۔

"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ اسی بے رخی سے بولا۔

ایقان دھیرے سے مسکرائی۔ وہ بے رخی سے پیٹھ موڑ لے کھڑا تھا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھی اور اس کی پشت پر

سزا دے کے دونوں بازو اس کے گرد حائل کر دیے۔

"اب تم میرے سامنے نہیں ہو اب جواب دو۔"

"تم۔" اس کے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑا تھا۔ "تم۔ جاؤ یہاں سے۔ میں۔ میں تمہیں معاف نہیں

کر سکتا۔"

"میں معافی نہیں اپنا حق مانگنے آئی ہوں۔"

"تم اپنے حقوق میرے منہ پر مار چکی ہو۔" وہ تلخ انداز میں بولا۔

اپنے گرد حائل اس کے بازوؤں کو سختی سے جھٹک دینے کی خواہش سر اٹھا کر پھر گرا چکی تھی۔ وہ توڑ پچکی

تھی۔ وہ خود کو بے بس پیچھی محسوس کر رہا تھا۔ ایقان کی بے خود محبت جال کی طرح اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔

"میں آگئی ہوں عاشر! اور ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی۔ مجھے بھولا ہوا امت کہو۔ مجھے برا بھلا مت کہو۔ میں سب

کچھ سنوں گی لیکن ابھی نہیں ابھی صرف۔ صرف اپنی محبت دو مجھے جو تم نے ساری دنیا سے بچا کر صرف میرے

لیے رکھی ہے۔ اس محبت پر میرا ایسا ہی حق ہے جیسا میرے وجود پر تمہارا حق ہے۔ پلیز عاشر۔"

وہ اس کی پشت پر سے ٹھوم کر اس کے سامنے آگئی۔ عاشر کے لیے مزید دافعت ممکن نہ رہی تھی۔ دریا سارے

بند توڑ چکا تھا۔ محبت اور آنسو ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے۔

\*\*\*

"یہ ہو گیا مکمل۔" اس نے پیلا نیٹ کا خوبصورت دوپٹہ ناعمہ کے اوپر ڈال دیا۔ ہرے گولے کا نہایت نفیس

اور باریک کام پورے دوپٹے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ درود کی پورے ایک ماہ کی محنت کا پھل تھا۔

"ایسا دوپٹہ کسی دلہن کا نہ ہو گا۔ یاد رکھنا۔" اس نے ناعمہ پر رعب جمایا۔

"جی نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا آپ تو شادی ہو کر بھی یہیں رہیں

یہاں بازو میں تو سسرال ہے آپ کا۔" وہ دودھ دھعتا ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

اسی لمحے رابعہ بیگم تیزی سے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر خوشی اور انداز میں بے حد گرم جوشی

تھی۔ "وہ بے ساختگی میں کچھ کہتے کہتے رک گئیں جیسے انہیں کچھ یاد آیا ہو۔"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔ "کھڑی ہوئی۔" کہنے۔

وہ بولا۔ "میں نے تمہارے تئیں تئیں سے اس کا چہرہ دیکھا جیسے میں اس کی جانب سے کسی قسم کا کوئی خدشہ ہو۔"

"کہنے امی! کیا بات ہے؟" درود کچھ حیران ہوئی۔

"بیٹا! ابھی عذرا کہ اس سے آری ہوں میں۔ انہوں نے بلوایا تھا۔"

"جی! اس نے ماں کا چہرہ دیکھا جس پر چراغ سے روشن تھے۔"

"رافع نے۔ ان سے بات کی ہے۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا

دروازہ کھلا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔ تمہارا



”ربیعہ..... ربیعہ! پیاس لگی ہے ربیعہ۔“ اکٹا لیدو۔ سن قدر

”دادی! دادی! کہاں ہیں آپ؟“ حدنگاہ تک پہلے ہوئے صحرائے چمکتی دھوپ جیسے آنکھیں ہی بے جہان کی دراز کھول کر سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا۔ رگ و پے میں کپکپاتی رہی تھی۔

”ربیعہ! ربیعہ!“ دکھ میں ڈوبی آواز کسی ٹیلے کے پیچھے سے آئی تھی۔ ”میں یہاں ہوں۔ یہاں۔“ ربیعہ کی ہر پھیل گئی تھی۔ ایک عرصے سے وہ جس وحشت کا شکار تھا اس سے چھٹکارا مل جانے کا احساس بہت اندھوں کی مانند آگے بڑھی۔ دھوپ کی شدت نیزوں کی صورت جسم کے آپار ہوئی جاتی تھی۔ ربیعہ ہاتھ پھیلائے آگے بڑھتی رہی۔

”یہاں گرمی ہے ربیعہ! اندھیرا ہے۔ پیاس ہے۔“ آواز میں ہلاکی حسرت اور بچھتاوے تھے۔ ”میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں دادی! میں۔ میں روشنی کیے دیتی ہوں۔ آپ میرا انتظار نہ کریں۔“ ربیعہ دیوانوں کی مانند بھاگنے لگی۔

”روشنی لاؤ ربیعہ! ذرا سی روشنی۔ ذرا سا پانی۔“ آواز دم ہونے لگی۔ آسمان پر آگ برساتا سورج غائب ہونے لگا۔ ہر طرف خاموشی بھٹکا اور اندھیرا چھیل گیا۔

ربیعہ کی بند پلکوں میں دھیرے دھیرے جنبش ہوئی۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ماتھے پر قطرہ کی صورت ابھرتے سینے اور جسم میں گھٹتے بڑھتے تنفس کے دباؤ کو محسوس کیا پھر گرمی سانس لیتے ہوئے یکدم وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کا پورا جسم دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہتھیلیاں چہرے پر پھیرتے ہوئے اس نے خود کو جمع کرنے کی کوشش کی۔

وہ خواب پوری جزئیات کے ساتھ اب جاگتے میں یاد آ رہا تھا۔ وہ لمبورنگ ماحول، وہ ہلاکی گرمی۔ وہ گویا حشر کا میدان تھا۔ اس کی دادی کی روح پر عذاب دینے والے فرشتے منہ پر تھے۔ وہ دیکھتا تھا کہ وہ لکائی گئی کمانی ہے آخرت کا عذاب خریدنے پر مجبور تھیں۔

”دادی!“ ربیعہ کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔ اس کی پلکوں پر ستارے چمکنے لگے۔ اس کی دادی نے اپنی ہی ماں کے ساتھ بہت برا ظلم کیا تھا۔ اس میں کسی قسم کا ابہام تھا ہی نہیں لیکن اس کی دادی نے اسے ممتا کے ہر ذائقے سے روشناس کرایا تھا۔ ربیعہ کے لیے وہ گرمی کی چھاؤں اور سردی کی دھوپ تھیں۔ وہ اس کی ابتدائی بیس سالہ زندگی کی واحد ساتھی، واحد غم خوار، واحد مہربان ہستی تھیں۔ انہوں نے کبھی اسے جھڑکانہ تھا، کبھی اسے سخت نظر سے نہ دیکھا تھا، کبھی اس کے لیے وہ شیرینی ہی شیرینی تھیں۔ ٹھنڈک ہی ٹھنڈک تھیں۔ محبت ہی محبت تھیں۔ انہوں نے منیوہ بیگم کے ساتھ جو بھی برائی کی تھی، ربیعہ کو ہمیشہ اچھائی اور بھلائی کا درس دیا۔ ربیعہ کی ذات میں جتنے بھی ثمر پوشیدہ تھے، ان کا بیج دادی نے ہی رکھا تھا۔

ربیعہ کا ان سے قلبی و روحانی رشتہ اتنا گہرا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد بھی یہ تعلق ختم نہ ہوسکا تھا۔ اس نے گردن گھما کر برابر میں سوئی ہوئی منیوہ بیگم کو دیکھا، ان کے مرتے ہوئے چہرے پر بھی ہلا کا اطمینان تھا۔ زندگی کی آخری گھڑیوں میں انہیں کوئی ملال، کوئی بچھتاوہ نہ تھا۔ وہ خدا کے سامنے سرخرو تھیں۔ وہ اپنی ذات کے سامنے سرخرو تھیں۔ عمر دادی بھی گزار کر گئی تھیں۔ عمر۔ اس کی ماں نے بھی گزار دی تھی۔ عمر۔ گزری جاتی ہے لیکن انجام۔ انجام گہرا جاتا ہے۔

عاشق نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ نبھانے کس وقت گرمی نیند میں چلی گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردست

عاشق نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ نبھانے کس وقت گرمی نیند میں چلی گئی تھی۔ اس کی سانسوں کا زبردست



تھی بالکل خاموش۔ عاشر بر سکون اور مطمئن تھا جیسے کچھ کھانا کچھ سنانا چاہتا ہو۔

ایقان نے اسے لڑا سے ملاقات کا احوال ذرا نہ کہا تھا۔ یوں جیسے وہ بغیر کچھ جانے بوجھے یونہی ہار مان کر چلی تھی۔

عاشر نے اسے جاپان سے پاکستان تک چلے آنے کے پیچھے کسی بچپتاوے، تاسف یا شکست کا اظہار نہ کیا تھا۔

لڑا کا ذکر دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ دونوں چاہتے تھے کہ وہ ہار کر بھی نہ ہاریں۔ دونوں ہی چاہتے تھے کہ وہ باظرف فتح یا بے ہول۔ دونوں ہی محبت کے امتحان میں ہارے تھے اور اپنی اپنی نظریں سرخ و زرد بنا چاہتے تھے۔

عاشر جانتا تھا کہ ایقان کے یوں چلے آنے میں اس کی فراخ دلی کا ہاتھ نہ تھا۔

ایقان سمجھتی تھی کہ واپس پلٹ کر فراخ دلی کا ثبوت اس نے دیا ہے۔ عاشر نے اسے آخر تک نہیں پکارا تھا۔ محبت لیوں پر گہری معنی خیز مسکراہٹ لیے بادل خواستہ کسی بار نہ دعا کی طاقت ہے۔ مجبور ہو کر کوئی ضرور تھی مگر چپ چپ تھی۔

ایقان سوری تھی اور عاشر چپ چاپ سگریٹ پھونک رہا تھا۔

وہاں سے بہت دور اپنے بیڈ روم میں۔ نیم دراز موبائل پر کوئی ٹیکم کھلتے ہوئے رافع کا ذہن ٹیم میں محو نہ تھا۔

وہ ایقان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ عاشر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تقدیر اور قسمت جیسی چیزوں کے متعلق وہ پہلے کبھی اتنا سنجیدہ نہ ہوا تھا۔ آج اسے پکا یقین ہو چلا تھا۔ آپ قسمت سے منہ پھیرتے رہیں۔

اس کی ذرا سی پلاننگ سے ایک گھر ویسا ہی بن گیا تھا جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔ اس کی قسمت کو منظور تھا۔ یہ وہاں اور اس کی شدید کاوشوں کے بعد بھی دل کا ٹکڑیوں سے نہ بن سکا جیسے وہ ہانا چاہتا تھا کہ قسمت کو نا منظور تھا۔

اب وہ روٹھتی تقدیر کے سامنے گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا لیکن باوجود بے رخی سے منہ موڑے کھڑی تھی۔ اب کیا ہونے جا رہا تھا؟ کس کو علم تھا!

تلیے بالوں میں بے دھیانی سے برش پھرتے ہوئے وہ آسمان کی وسعتوں کو کھوج رہی تھی۔ اس کی بے چین متلاشی نگاہیں جیسے افق کے پار کسی کو ڈھونڈنا چاہتی تھیں۔ اپنی ہستی اسے ایک جگسا پرل کی مانند لگ رہی تھی جس کے تمام حصے مل جانے کے بعد بھی ٹھیک طرح سے جڑ نہیں پائے تھے جیسے چند حصے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔

”ربیعہ! شہلا نے اسے آواز دی تھی۔

کھڑکی میں کھڑی ربیعہ چونک کر بال سمیٹتے ہوئے وہ پلٹ آئی۔

”جی آئی۔“

”وہاں کھڑی کیا سوچے جا رہی ہو؟“ شہلا نے محبت سے اسے دیکھا اور منیوہ بیگم کا چہرہ لٹو سے صاف کرنے لگی۔ وہ انہیں سوپ پیار ہی تھی۔

”مجھے تو جب سے علم ہوا ہے تب سے تمہیں دیکھتے ہی پیار آنے لگتا ہے۔ عزیز تو تم پہلے بھی بہت تھیں اب تو عزیز تر ہو گئی ہو۔“

ربیعہ نے آگے بڑھ کر شہلا کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”میرے دل سے پوچھیے آئی! میں نے کبھی بھی آپ لوگوں کو پایا یا غیر نہیں سمجھا لیکن امی سے ملنے کے بعد ان کے حوالے سے آپ میرے کتنے اپنے ہو گئے ہیں۔ میں شاید سمجھانہ سکوں۔ ایسا لگتا ہے میرے وجود کے گم شدہ حصے اچانک مل کر میری ذات کی تکمیل کر گئے ہیں۔“ بولتے بولتے اس کی آواز رندنے لگی تو وہ یکنگشت خاموش ہو گئی تھی۔

”ربیعہ! منیوہ بیگم نے بازو پھیلائے۔

ربیعہ بے اختیار آگے بڑھ کر ان سے پلٹ گئی تھی۔ منیوہ بیگم نے اس کے سر کو چوم لیا۔

”ہائے ربیعہ! اب تو مجھے جیسی ہونے لگی ہے۔“ انیقا شرارت سے بولی۔ ”جانتی ہو امی کی محبت کا یہ اظہار صرف میرے لیے ہی مخصوص تھا۔ شہلا آئی اور عباد بھائی امی سے شکایت کرتے تھے کہ مجھے جس بے اختیار سے امی پیار کرتی ہیں وہ ان کے حصے میں کیوں نہیں آتی؟“

”تم امی کو اس عمر میں ملی تھیں جس عمر کی اس وقت ربیعہ تھی۔ امی اسی لیے تمہیں پیار کرتے وقت یوں۔“

بے اختیار ہو جاتی تھیں۔ عباد پرانہ انداز میں بولا۔

وہ سب پروانوں کی مانند منیوہ بیگم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

”اس کا مطلب ہے تم میں سے کسی کو بھی مجھ سے سچا پیار نہیں ملا؟“ منیوہ بیگم قدرے روٹھے ہوئے انداز میں بولیں۔

شہلا، عباد اور انیقا بے اختیار ان سے لپٹے تھے۔

”بھاری۔ سگی ماں بھی نہیں اس سے زیادہ محبت اور شفقت نہ دے پاتی امی جی۔ اقامت کے دن بھی ہماری یہی نگاہیں ہوتی۔“ شہلا جذباتی ہو کر بولی تھی۔

”یہی امیری فحش بات ہے بچو۔“ ان کی پلکیں جھپکیں۔

مطمئن بہت معنی ہوں۔ مجھے سادولت مند کوئی نہیں۔

سب کی پلکیں نم ہو گئی تھیں۔

”ابھی آپ نے بہت جینا ہے امی! ہم بہت بگڑے لیے۔ ربیعہ کے لیے۔ ہم سب کے دامن آپ کی بے پناہ توجہ اور محبت سے بھرے ہوئے ہیں لیکن ربیعہ! یہ تو ابھی کچی مٹی کی مانند نقشہ ہے پیاسی ہے آپ کی محبت اور مٹاکی۔ ابھی آپ نے اپنے لیے کتنی سیراب کرنا ہے۔“

عباد ان کے لڑوؤں باتھ تھاے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ منیوہ بیگم بے بسی سے مسکرا دیں جیسے عباد کی بات رد کرنے کا حوصلہ ان میں نہ ہو لیکن اسے پورا کرنا بھی ممکن نہ دکھائی پڑا ہو۔

ربیعہ کی آنکھوں میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔

وہ رات گئے تک اسٹڈی میں مصروف تھا۔ عموماً ”ربیعہ یا انیقا چائے کا تھریاس بھر کر اس کی اسٹڈی میں رکھ دیا کرتی تھیں۔ وہ بستر تک جانے سے پہلے دو تین کپ چائے ضرور ہی پی لیا کرتا تھا لیکن آج غالباً ان دونوں کو بھی علم نہ تھا کہ عباد کا سونے سے قبل کچھ مطالعے کا ارادہ ہے۔ وہ بزنس قوانین سے متعلق کتابیں کھول کر بیٹھا ہوا تھا تب ہی بے اختیار اس کی نظر دروازے کی جانب اٹھ گئی جہاں منیوہ بیگم کھڑی ہوئی تھیں۔ عباد بے اختیار اٹھ کر ان کی جانب بڑھا تھا۔

”امی جی۔! کیوں چلی آئیں آپ؟“ وہ پریشان ہو کر ان تک پہنچا اور انہیں تھام لیا۔ ”کچھ تکلیف ہوئی؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں سنچے۔“ وہ مسکرا دیں۔ ”انتظارِ یثبان مت ہو۔“  
عباد انہیں سہارا دے کر اندر لے آیا۔

”اس نے انہیں نرم کاؤچ پر بٹھایا اور خود ان کے قریب نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔“ اور اب بتائیں، اتنی رات کو آرام دہ گرم بستر سے اٹھ کر آنے کا کیا مقصد ہے؟“

منہزہ بیگم نے محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”اپنے بچے کو ایک نظر دیکھنے کا خیال آیا تھا۔“ وہ لبوں پہ نرم مسکان سجاسے بولیں۔

”ریجہ سوئی؟“ عباد نے پوچھا۔

”ہاں، پورا دن میری خدمت کر کے بہت تھک جاتی ہے۔ وہ سبے خبر سو رہی ہے۔“  
 ”آپ کی خدمت عین عبادت و سعادت ہے، ہم سب کے لیے۔“ عباد نے ان کا ہاتھ تھاما۔  
 ”محبوب!“

”جی! جی! حکم۔“

”ہیٹا! ایک بات کہنا چاہ رہی تھی تم سے۔“ وہ قدرے ہچکچا کر بولیں۔  
”آپ ہمیں کچھ نہ کہیں۔“ عمار نے فریاد کیا۔

”عبداللہ! اسی دن امیر حسن کے ساتھ جو لڑکا آیا تھا۔“ وہ ذرا کانڈھکیا۔

لے جا

لے گا، کی سب بوئیں۔ ”سیرار احمد“ میں نے یہ کہتے اس کے والد کا نام دریافت کیا تھا۔ جانتے ہو کسی

عبدالجواب سیے بنان کی اور اس آنکھیں دکھاتا رہا۔

۵۹ رات ہو، سو احمد جہاں زیب کی تصویر ہے، وہاں بیٹھتا ہے۔ وہ ہر روز اس سے رنج و کد کے والدین احمد جہاں زیب میں نے جس لمحے اسے دیکھا، کوئی انتہائی طاقت نہیں پوری شدت سے رہنمائی ہوئی ماضی کی بحول بیلوں میں لے گئی۔ میرا پورا جسم پسینہ پسینہ ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے ایک فریم میں قید کر دیا ہو۔ آج سے پچیس برس پہلے کی تصویر کے فریم میں۔“

عبارتے ان کے نحیف جسم کو کاٹتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ان کے رخ ہوتے ہاتھ اپنے مكرم ہاتھوں میں دباتے ہوئے انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

”پھر میں نے تم سے اس کے باپ کا نام پوچھا اور میرے شک پر تصدیق کی مہر ثبت ہوئی۔ یاں باں غبار! مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لڑکا جسے ربیعہ کا بھائی ہے۔ احمد جہاں زیب کا بیٹا ہے۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے کپکپا رہے تھے۔

”کیسا انہونا اتفاق ہے۔“ غبار بڑبڑایا۔

”بھئی۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں عباد! اگر واقعی وہ ربیعہ کا بھائی ہے تو ان رشتہوں کو ملنا چاہیے۔ ربیعہ کو اپنے بھائی سے اپنے باپ سے ملنا چاہیے۔“

”لیکن انہوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا تھا امی جی۔“ عباد کو ان کے ساتھ ہونے والی ساری نا انصافیاں یاد آئیں۔ ”ربیعہ کیوں ملے ان سے۔“

”میں نے اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر دیے ہیں میرے بیٹے!“ وہ رونے لگیں۔ ”اس کے بعد مجھے کچھ

اختیار نہیں رہا کہ میں کسی شخص کے خلاف اپنے دل میں کچھ کدورت رکھوں۔ میرا اللہ سب کا حساب کتاب انصاف سے کرے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔“ عباد نے بے اختیار ہو کر ان کے ہاتھوں کو چومنا اور آنکھوں سے لگا لیا۔

”مٹھیک ہے امی جی۔“ پھر وہ بولا تھا۔ ”امیر حسن یوں بھی آپ کی عیادت کے لیے آتا چاہتا ہے۔ میں شہر ار کے لیے بھی اصرار کروں گا۔ میں۔۔ میں کل ہی انہیں بلواتا ہوں۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔

شام ست رنگی چڑیا اودھ کر "حیات دلا" میں اتری تھی۔ وسیع و عریض رقبے کے حامل پورے گھر پر تازہ رنگ و روغن کے بعد ہونے والی لائٹنگ نے ایک عرصے کے بعد کونے کونے کو رونق اور دلکشی کا اچھوتا احساس بخشا تھا۔ جا بجا دھنک کے سب ہی رنگ بکھرے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

عمارت کے پچھلے وسیع لان کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ یہاں ایک وقت تینوں دہنوں کی رسم مندی کا انتظام کیا گیا تھا۔ تین فائیں باندھ کر کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ کرسیوں کے درمیان میں اسٹیج اس طرح بنایا گیا تھا کہ ہر طرف سے مہمانوں پر نہیں وغیرہ رکھ سکیں۔

کہ ہر طرف سے مہمان پریشان و مایوس تھے۔ جا بجا رکھے حمیے تازہ پھولوں کے گلہ۔ ستوں نے ماحول کو  
شام ابھی اتنی ہی تھی لیکن تمام لائٹس آن تھیں۔

لطیف و معطر بنا دیا تھا۔  
پورے ماحول کا یہ نظر غائر جانتے لینے کے بعد عیشہ نے کھڑکی بند کر دی پھر رخ موڑ کر کھڑکی سے نیک ننگا گھومتی رہ گئی تھی۔  
نچلے لب کا کونا اس کے دانت کے دباؤ تھا۔ آج بڑے معرکے کا دنت آیا تھا۔ اس کے برابر  
میں نے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی اس کا فریاد سنا تھا۔ کیا اس وقت گزر رہا تھا اس کے ناتواں دل پر آج۔

نہیں ہوئی تاہم اور ساتھیوں نے بھی اس کی طرف سے ہرگز ہمت نہ ہاری۔ انہوں نے اپنی فوجوں کو اکٹھا کر کے اس کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی فوجوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ انہوں نے اس کی فوجوں کو شکست دے دی۔ ان کے ہاتھوں میں اس کی فوجوں کی ہتھیاروں کی کچھ بڑی مقدار بھی مل گئی۔ ان کے ہاتھوں میں اس کی فوجوں کی ہتھیاروں کی کچھ بڑی مقدار بھی مل گئی۔ ان کے ہاتھوں میں اس کی فوجوں کی ہتھیاروں کی کچھ بڑی مقدار بھی مل گئی۔

”عمیشہ!“ ماہین کی حیرت بھری آواز پر وہ چیختی تھی۔ ”وہاں کٹری کیا کر رہی ہو؟ میں نے تمہارا جوڑا واش روم میں لٹکا دیا ہے تمہا کرپس لو۔“

میں لٹکا دیا ہے، کہا کریں لو۔  
 عریضہ نے خاموشی سے لڑائی میں سر ہلایا۔ ماہین اس کے قریب آگئی پھر اس نے پیار سے بسن کی ٹھوڑی کو  
 چھوا۔  
 ”کائنات“ : ”اے لڑکی، اے لڑکی“

عزیزوں! میں میری بہن لاجواب ہوگی۔ دیکھ لینا، آج پیرا جوڑا کیسا غضب دھجائے گا۔“

”غصب اسی تو دکھاتا ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔  
پھر وہ خاموشی سے واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔

کھانے اور دیگر انتظامات کا جائزہ لینے کے بعد وہ نہانے کے ارادے سے تھکا ہوا سا کمرے میں داخل ہئی ہوا تھا۔

کہ یکایک ٹھٹک کر رک جانے کے تمام لوازمات نگاہوں کے سامنے آئے تھے۔  
 شہلا کمرے زرد رنگ کی بنارس سیٹھاڑھی زیب تن کیے، سرایا ناز بنی کھڑی تھی۔ وہ کٹائی میں موتیے کے مہکتے  
 پھولوں کا صبر پھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خود پر از حد جبر کر کے بھی باشم اس منظر سے آزاد ہونے میں ناکام ٹھہرا اور

نکلنے کی باندھ کر اپنے کام میں منہمک شہلا کو دیکھتے گئے۔

گہرا زرد رنگ اس نے شاید پہلی مرتبہ پہنا تھا اور اس رنگ میں وہ کس قدر حسین نظر آتی تھی۔ شاید اسے خود بھی احساس نہ تھا۔ کمر تک آتے سیاہ، کھنیرے، چمکیلے بال اس نے کئی دن بعد یوں سنوار کر رکھے جھوڑے ہوئے تھے۔ بالوں میں لگائی ہوئی ڈھیروں ڈھیر موٹے کی لڑیاں اس کے دونوں کاندھوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ گلے میں سچے ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک تھی۔ اتنا چمکدار، مہکتا روپ تو ہاتھ نے شاید ساگ رات کو بھی محسوس نہ کیا تھا۔ لپکایک اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی دیوانی محبت سے شہلا کا سارا روپ بگاڑ دے۔ اس کے نک سب سے درست انداز کو بکھیر سادے۔

شہلا اچانک چونکی تھی۔

”ارے آپ۔۔۔ آپ کب آئے؟“

ہاشم کو خود میں لوٹنے میں چند لمحے لگے۔

”میں۔۔۔ بس۔۔۔ ابھی۔۔۔“

”انتظامات مکمل ہیں؟“ وہ گجرا لیے اس کے قریب چلی آئی۔

”ہاں۔۔۔ بالکل۔۔۔ رافع نے سب ہی کچھ اپنے ہاتھ میں لیا ہوا ہے۔“ ہاشم نے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

”اچھا۔۔۔ یہ ذرا گجرا تو مزہ کر دے۔“ شہلا نے کلائی آگے کی تھی۔ ہاشم نے کسی معمول کی مانند گجرا لیا تھا۔ شہلا کے مخصوص ریفرم کی دلکش مسک نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ ہاشم نے اسے گجرا پہنا دیا۔ شہلا نے اس کے جذبوں کی بکری کو بالآخر محسوس کیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے نظریں اٹھا کر پھر فوراً ہی جھکا لیں۔ راز و نیاز کرتی ان آنکھوں سے باتیں کرنا اس کے لیے کار دشوار تھا۔ موبائل کی ویسپ نے دونوں کو کسی پرسوں لمحے کی گرفت سے آزاد کیا تھا۔ شہلا چونک کر موبائل کی جانب بڑھی۔ ہاشم اس کی پشت پر بکھرے بالوں کو دیکھتا ہوا ڈرنگ، شہلا کی جانب سے ہیلو۔ شہلا نے کال ریسیو کی تھی۔

الماری سے اپنا ہینگ کیا ہوا کرتا شلوار نکالتے ہوئے ہاشم نے ہاتھ ہتھم گئے۔ اس نے شہلا کی بہت دلکش، مترنم ہنسی کی آواز سنی تھی۔ اس ہنسی میں اس کے روپ سے بڑھ کر نازکی پوشیدہ تھی۔

”ہاں زندگی۔۔۔ بولوس۔۔۔ میں تمہارے ہی فون کی منتظر تھی۔“ ہاشم نے لمحہ بھر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا الجھنے، ایسے الفاظ، کبھی اس کا بھی مقدر نہ بنے۔

”بہت تنگ کرنے لگے ہو مجھے،“ خفا ہو گئی تھی میں تم۔“ وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کمرے میں چل پھر کر چیزیں بھی ان کی جگہوں پر رکھ رہی تھی۔

”میری جان۔۔۔! میں نے کبھی تم کو خود سے دور محسوس کیا ہی نہیں پھر بھی تمہیں دیکھنے کو پیار کرنے کو میرا دل تڑپا ہے۔ تمہارا دل نہیں کرتا اپنی ممتا سے ملنے کو؟“

ہاشم کے لبوں سے گہری سانس آزاد ہوئی۔

”بس کچھ دلتی مصروفیات ہیں پھر ماما ہوں گی اور ماما کا بیٹا۔“ وہ ہنستے ہوئے تویہ لٹکانے کے ارادے سے ڈرنگ روم میں آئی تھی۔

ہاشم کو ہنوز وہیں کھڑا دیکھ کر وہ ٹھنک گئی۔ ہاشم قدرے خفیف سا ہو کر دوش روم میں گھس گیا تھا۔ شہلا نے تویہ لٹکایا اور کچھ سوچتے ہوئے عمر کی معصوم باتوں پر ہوں ہاں کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

\*\*\*

لوکیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر روایتی گیتوں کا آغاز کیا تھا جو کچھ ہی دیر بعد فلمی، علاقائی اور مختلف قسم کے ہنوں سے ہوتے ہوئے شور شرابے اور پیمبتیوں کا رخ اختیار کر گئے تھے۔ بیٹھ کی طرح لڑکے بھی ڈفلیاں اور میٹھاں لیے محفل میں شریک ہو گئے تھے اور ”وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ“ کے نظریے کو الٹا ثابت کرنے کے لیے اپنی پوری پوری توانائیاں صرف کر رہے تھے۔ ایقان کا جوش اور ولولہ عروج پر تھا۔ سب کی پیٹھ جھاڑ، شرارتوں اور شوخیوں کا برا منائے بغیر مفضل جواب دیتے ہوئے وہ جان محفل نظر آرہی تھی۔ کمرے سبز رنگ کے لباس میں اس کی خوبصورت رنگت لودے رہی تھی۔ آنکھوں میں ایک عجب چمک بھی جیسے آئینے کو بہت سی روشنیوں میں آئینے کے ہی مقابلے لے آیا جائے۔ ڈھولک بجائی، بلند لے میں آواز کا جادو جگائی وہ طلسماتی حد تک حسین لگ رہی تھی۔

مگر راتی نظریوں سے اسے دیکھتے ہوئے رافع کسی کام کا خیال آجانے پر پلٹ رہا تھا جب عاشر سے ٹکراتے ٹکراتے بھا۔

”دیکھ کر بھائی۔۔۔! عاشر نے مجھے بازوؤں سے تھاما۔“ کہاں کھوئے ہوئے ہو؟“

رافع نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”اپنی دیکھیں جان“ کا بدلا بدلا خوبصورت روپ دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ روپ تو پیچھا جان آپ کا بھی دمک رہا ہے۔

اس نے کھنکھنایا ہوا ہنسنے لگا۔ ہاشم نے اسے دیکھا۔ عاشر غور کرتے ہوئے کہا۔ دونوں نے ایک قہقہہ لگایا تھا۔

لوکیوں کے درمیان بیٹھتی ایقان ان کے آگے کی بات متوجہ ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے اس نے غور کرنے کی کوشش کی کہ وہ دونوں بات پر پہلے سے بھرپور توجہ کر اپنے گیت کی جانب متوجہ ہو گئی۔

\*\*\*

”ماشاء اللہ۔“ وردہ کے لبوں سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔ زرد لباس پر اس کا بنایا ہوا نیٹ کا پیلا اور ہرا روپٹہ اوڑھے دونوں کلائیوں ہری چوڑیوں سے بھرپور ناعمہ سادہ روپ میں بھی فرشتوں کی سی معصومیت اور دلکشی کا پیکر معلوم ہوتی تھی۔

اس نے بہن کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے اسے گلے سے لگایا۔ دونوں کا ہی دل بھر آیا تھا۔ ناعمہ بھوت چھوٹ کر زردی۔ وردہ نے خود پر کڑا ضبط کر کے آنسوؤں کو اپنے اندر ہی اتارا اور ناعمہ کا چہرہ صاف کرنے لگی۔

”برای بات ہے۔“ اس نے چھوٹی بہن پر رعب جمانے کی ناکام سی کوشش کی۔ ”امی نے اگر تمہیں یوں نیر بہاتے دیکھ لیا تو وہ اپنا ضبط کھو بیٹھیں گی۔ اگر تم چاہتی ہو کہ امی خوشی خوشی تمہیں دواغ کریں تو اپنے آنسوؤں پر قابو رکھنا۔“

”آئی! وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔“ امی کے لیے ہی یہ پل صراط پار کر رہی ہوں، صرف ان کی خوشی کے لیے۔“

”برای بات ہے۔“ ایسے مت کھوس۔ فرازا اچھا لڑکا ہے۔ خوش رکھے گا تمہیں۔ ذرا سی غلط فہمیوں سے زندگی کی مضبوط بنیادوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ہر طرح کے وہم اور دوسوے دل سے نکال کر نئی زندگی کی شروعات کرنا۔“

”مجھے اپنی پروا نہیں۔“ اس نے سوں سوں کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ”صرف امی کا خیال ہے۔ آج احساس ہو رہا ہے کہ ماں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور اس سے یوں جدا ہونا لڑکیوں کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔“

”یہ دکھ۔۔۔ نئی خوشیوں کی اساس ہونا ہے ناعمہ۔“

”ہاں۔ اگر خوشیاں مقدر میں ہوں تو۔ میں تو خوف اور دوسوسوں سے بھری انجانی دنیا میں قدم رکھنے جا رہی ہوں۔ مجھے تو یہ جدائی اور بھی مشکل معلوم ہو رہی ہے۔“

اتنے عرصے بعد آج وہ بہن کے سامنے کھل کر بول رہی تھی کہ دل کا بوجھ آج سوا معلوم ہوتا تھا۔

”میری بہن، بہت ہمدرد، بہت ہمت والی ہے۔ تم نے جس صاف دلی اور ثابت قدمی سے یہ محاذ لڑا ہے، اللہ تمہیں ضرور اس کا اجر دے گا۔ جو دوسروں کے پردے رکھنا جانتا ہے، خدا اسے ہر مشکل سے بچاتا ہے۔“ درود نے اس کے دل کا بوجھ کم کرنے کی بھرپور سعی کی۔

ناعملہ گہری سانس بھوکے کچھ سہ چنے لگی تھی۔

چنڈال میں سب ہی آچکے تھے اب صرف فراز کے گھر، اس کا انتظار تھا۔

نافع کے مخصوص بے تکلف دوستوں کو انتظامات دیکھنے پر رایت آتا، رافع، ہاشم کو دھونڈنے چاہی تھا کہ ٹھک کر رک گیا۔

شہلا کی ہمراہی میں انیقہ اور ربیعہ آ رہی تھیں۔ رافع نے سوچا کہ وہ مر جائے یا وہ ان سے کتر اگر گزرے یا پھر وہ ربیعہ کا دل اس سے کلام کر لے۔ دل ناداں نے لمحہ بھر میں کئی صورتوں پر غور کیا۔

ربیعہ کا دل اسے یوں راہ میں حائل دیکھ کر مختلف لے پر دھڑکا تھا۔ اس نے ہنسی بھرا دہرے کے بغیر شہلا اور انیقہ کے ساتھ سر جھکا کر گزر جائے یا یوں ظاہر کرے جیسے اسے دیکھا ہی نہیں یا پھر اس کے پاس ٹھہر کر اس کا حال پوچھے۔

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں غم، ایک سی کیفیت کا شکار تھیں۔ اچانک دونوں ہی جو کئے تھے۔ شہلا اور انیقہ اپنی دھن میں باتیں کرتی کب کی آگے نکل گئی تھیں۔ ربیعہ نے ہاتھ کب اور کیسے دیں ٹھہر گئی تھی۔ ڈھیر ساری روشنیوں اور خوشبوؤں کے ہالے میں بس وہی دونوں وہاں کھڑے رہ گئے تھے۔

”آپ۔۔۔“ ربیعہ بے ساختہ ہی گھبرا کر بولی۔

”آپ۔۔۔“ رافع نے چونک کر بے ساختگی سے کہا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ پھر دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔

پھر دونوں کو ہی اس عجیب سی صورت حال پر ہنسی آگئی۔

”بہن اور بھائی کی شادی مبارک ہو آپ کو۔“ یہ بولی۔

”شکریہ۔“ وہ مختصراً بولا۔

مزید رکنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ ربیعہ سر جھکا کر آتے بڑھ گئی۔ رافع کو ایک یوں محسوس ہوا جیسے ساری دنیا بڑھ رہی ہو۔

اور خوشبو میں اس کے قدموں سے بندھ چکی تھیں۔ اس کے ساتھ پورا منظر ہی جانے لگا۔

”ربیعہ۔۔۔“ وہ بے ساختہ پکارا۔

ربیعہ کے قدم ٹھم گئے وہ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا وہ صغیرا میں پادل کی مانند تھا۔ وہ کسی سراب کی مانند تھا۔ اس کی نظروں کی وہ دنیا کی صرف اس کے لیے تھی یا سب ہی کے لیے تھی؟ اس کے لبوں کی دو مہیاں مسکراہٹ اس کے دیدار کی عطا تھی یا ہمیشہ وہ لب یونہی مسکراتے تھے؟

زندگی سے لگتے ہو، زندگی سے ملتے ہو  
ایسی ہی خوشی سے کیا ہر کسی سے ملتے ہو؟  
خوابوں سے جی دنیا اک تمہارے آئے سے  
روشنی سے لگتے ہو، چاندنی سے ملتے ہو؟

اپنے درمیان ایک متناطیسی کشش کے زیر اثر دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے عجیب کیفیت کا شکار تھے۔ دفعنا زوردار آوازوں کے ساتھ آسمان رنگ برنگ روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا اور ربیعہ اور رافع جیسے کسی طلسم سے آزاد ہوئے۔ ربیعہ نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا جو بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ رافع تیزی سے باہر کی جانب بڑھتا تھا۔ یہ فراز کے گھر والوں کی آمد کا اعلان تھا۔

”امی جی۔“ عباد نے انہیں پکارا۔

منیزہ بیگم کی بند پٹکوں میں لرزش سی ہوئی۔ نبجانے وہ سوئی ہوئی تھیں یا کسی گزشتہ یاد کا عکس ان کی نم پٹکوں پر لرزاں تھا۔

”جی بیٹے! کہیے۔“ ان کا لہجہ بھی بھگیا بھگیا سا تھا۔

”امیر حسن اور شہرار احمد آئے ہیں۔“ عباد نے سہارا دے کر انہیں بٹھایا۔ ”آپ کو ذرا تنگ روم میں لے چلوں؟“

”نہیں۔“ وہ تھکے تھکے لہجے انداز میں بولی تھیں۔ ”نہیں یہیں لے آؤ اپنے ہی بچے ہیں۔“

”جی بہتر۔“ عباد باہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

انہوں نے امیر حسن اور شہرار احمد کو غائب طور پر اسی وقت بلوایا تھا۔ وہ یہ باتیں ربیعہ کی غیر موجودگی میں کرنا چاہتی تھیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس پر کسی ایسی بات کا کشاف ہو جو اس کے نازک دل کو مزید تھیں پہنچانے کا باعث بنے۔

عباد کی ہمراہی میں وہ دونوں اندر داخل ہوئے تھے۔ دونوں نے انہیں بہت احترام سے سلام کیا اور ان کی خیریت دریافت کی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، بچو! اللہ تمہیں صحت مند دوستی عطا فرمائے، خوش رکھے۔ بٹھو امیر حسن۔۔۔“

”شہرار۔۔۔ آپ یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔“

امیر حسن اور شہرار احمد کی آنکھوں میں عجیب غماز ابھرا تھا۔ امیر حسن عباد کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ شہرار ان کے قریب جا بیٹھا۔

منیزہ بیگم نے بہت محبت سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

”بیٹے! میں نے آپ کو ان لوگوں کو پریشان تو نہیں کیا؟“

”وہ کیسی باتیں کرتی ہیں! ہمارے لیے تو یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ ہم تو ویسے بھی آپ کی عیادت کے لیے آنا چاہتے تھے۔“ وہ بھی بہت محبت بھرے انداز میں بولا۔

”مجھے خوشی ہوگی اگر آپ مجھے ”امی“ کہو۔“ منیزہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

”ضرور۔“ شہرار نے ان کے ہاتھ تھامے۔ ”آپ کو دیکھ کر ”ماں“ کا ہی خیال آتا ہے۔ میں سوچتا ہوں، عباد صاحب بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ ان سے بہت پیار کرتی ہوں گی۔“

”سب ہی مائیں اپنے بچوں سے پیار کرتی ہیں۔“ منیزہ بیگم دھیرے سے مسکرائیں۔ ”آپ کی امی بھی آپ سے پیار کرتی ہوں گی۔“

شہرار کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے اداسی بکھری تھی۔

”شیری کی ماما۔۔۔ شیری کی پیدائش کے چند سال بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔“ امیر حسن نے دھیرے سے بتایا۔

”میری ماما نے ہم دونوں کی دیکھ بھال کی۔ میری ماما اور شیری کی ماما بہنیں۔“

”اوسے افسوس ہوا بیٹے آپ کی والدہ کے بارے میں جان کر۔“ منیزہ بیگم کے چہرے پر کرب کا سایہ لہرایا تھا۔  
”اور آپ کے والد؟“

”میرے والد کا تعلق پاکستان سے ہی ہے۔ برسوں پہلے وہ ہمیشہ کے لیے وہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ میرے نانا ایک انڈین تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں برطانیہ گئے پھر وہیں کے ہو رہے۔ ان کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ میری ماما پیدا انہی طور پر دل کی مریضہ تھیں۔ ان کے دل میں سوراخ تھا۔ ایسے میں ان کی ملاقات میرے بابا احمد جہاں زیب سے ہوئی، جنہوں نے یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی کہ ماما کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، ماما کو اپنا رفیق فرمایا۔ نجانے کیوں وہ شروع سے کہتے ہیں کہ ان کے دل میں بھی سوراخ ہے، اسی لیے انہوں نے ماما سے شادی کی۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کا ہارٹ بالکل پرفیکٹ ہے پھر بھی نجانے کیوں بابا اپنی بات پر اٹل ہیں۔ انہیں وہم ہے کہ وہ دل کے مریض ہیں۔“

شہریار احمد سادگی سے کہہ جا رہا تھا۔ عباد نے اپنی ماں کی پلکوں پر ستارے سے چمکتے دیکھے۔  
”پچھلے چند سالوں سے انکل پیرالا نہیں۔“ امیر حسن گویا ہوا۔ ”وہ صرف اشارے سے اپنا مدعا بیان کر سکتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہے جو اندر ہی اندر انہیں گھلاتا ہے لیکن انہوں نے کبھی کسی سے کچھ کہا نہیں۔ شہری سے بھی نہیں۔“

”لیکن میں جانتا ہوں بابا کے ماضی کے متعلق۔ مجھے ان کے ایک بہت گہرے دوست نے بہت کچھ بتایا ہے۔“ شہریار نے بہت سکون سے کہا پھر اس نے منیزہ بیگم کا چہرہ دیکھا۔ حقیقت یہ تھی کہ عباد نے ان دونوں کو اختیار میں لے کر سب ہی کچھ بتایا ہوا تھا اور شہریار نے بہت سی باتوں کی تصدیق بھی کی تھی لیکن منیزہ بیگم کے لیے وہ لوگ دھیرے دھیرے ساری باتیں کہہ رہے تھے۔  
”کیا... کیا بتایا انہوں نے آپ کو؟“ منیزہ بیگم نے سہمے ہوئے چہرے سے پوچھا۔  
”بابا... پاکستان چھوڑ کر گئے تو وہ غیر شادی شدہ نہ تھے۔ انہوں نے ایک کرپشن خاتون کو مسلمان کر کے ان سے شادی کی تھی لیکن بعد میں غلط فہمی کا شکار ہو کر انہوں نے ان خاتون کو ڈال دی اور دے دی تھی۔“ ایک آنسو منیزہ بیگم کی آنکھ سے بہہ کر ان کی گردن کی جھڑپوں میں گھو گیا۔ بہت ضبط سے انہوں نے باقی اشکوں کو اپنے اندر ہی سمیٹ لیا۔

”آپ کے بابا... جانتے ہیں... کہ انہیں غلط فہمی ہوئی تھی؟“ بہت سی آہوں اور سسکیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے انہوں نے دھیرے سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ شہریار بھرپور اعتماد سے بولا۔ ”وہ جانتے ہیں کہ انہیں غلط باتیں بتائی گئیں۔ انہیں اصل رستے سے بھٹکایا گیا تھا۔ ان سے جھوٹ در جھوٹ بولا گیا تھا اور ایسا کرنے والا کوئی اور نہیں، ان کی اپنی ماں اور بہن تھیں۔“

”الحمد للہ۔“ منیزہ بیگم نے ذریعہ کما اور آنکھیں بند کر کے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔  
شہریار، امیر حسن اور عباد نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کئی پل یونہی گزر گئے۔ منیزہ بیگم کی بند پلکوں میں جنبش نہ ہوئی۔

”امی جی...“ عباد غمبہ اس گیا۔

منیزہ بیگم نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا اور سکون و اطمینان سے مسکرائیں۔ عباد کو یک ٹونہ تسلی ہوئی۔

”ادھر آؤ بیٹے... میں آپ کی پیشانی چومنا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے شہریار کی جانب ہاتھ بڑھائے، وہ فوراً ان کی طرف جھکا تھا۔ منیزہ بیگم نے اس کی پیشانی پر محبت سے بوسہ دیا اور اسے سینے سے لگالیا۔

”میں تمہاری ماں ہوں شہریار... مجھے اپنی ماں سمجھو۔ میں تمہاری بہن کی ماں ہوں۔“  
شہریار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا لیا۔  
”انسان بہت ناشکر اور جلد باز ہوتا ہے۔“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”کبھی میں ایک بیٹی کے چہن جانے پر تڑپ تڑپ کر روتی تھی اور آج میری ماما کو سیراب کرنے کے لیے میری اتنی بیٹیاں اور بیٹے میرے پاس ہیں۔“  
امیر حسن بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آ بیٹھا تھا۔ منیزہ بیگم نے اسے بھی پیار کیا۔  
”میری بیٹی، بہت امتحانوں سے گزری ہے۔ خدا نے اسے سب ہی آزمائشوں میں سرخرو کیا۔ اسے سب ہی رشتے عطا کیے۔ اے میرے رب! تیرا شکر ہے۔“  
وہ اپنے سچے رب کی بے پایاں عنایتوں پر شکر گزار تھیں۔

اس نے خود کو کونکے کی طرح دکھتا ہوا محسوس کیا تھا۔  
اس کے ہاتھیں جانب ٹانہ تھیں، اسی کی طرح زرد پیراہن میں ملبوس۔ ہاتھیں جانب ناعمہ تھیں جس کا چمکتا روپ اس کے گھونٹنے کی آواز سے بھی اپنی روشنیاں، کھیر رہا تھا اور اس کے عین مقابل صوفے پر بیچوں بیچ فراز احمد ستادہ تھا۔

میروں، خوبصورت شہروانی زیب تن کیے وہ بہت پر تمکنت اور پر کشش نظر آ رہا تھا۔ عرشہ کو احساس ہوا، کسی نے اسے نگاہیں جھکانے کی ہدایت کی ہے پھر اپنے احساس ہوا کہ وہ ٹھنکی باندھ کر فراز کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بہ وقت تمام نظریں جھکا لیں۔

فراز کے گھر والوں نے عین وقت پر نکاح کی اجازت طلب کر لی تھی تاکہ شادی کی تقریب میں وقت بچانے کا مقصد حاصل کیا جاسکے۔ کسی کو اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ سو مختصر سے وقت میں اس ضروری کام کو خوش آہستگی سے سرانجام دے لیا گیا تھا۔ ناعمہ، فراز کی منگوتھ ہو چکی تھی۔ اس کے دل کی کیا حالت تھی، عرشہ کو علم نہ تھا لیکن اس کا اپنا دل کونکے کی مانند دھب دھب کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس شر سے وہ ناعمہ کے گھونٹنے کو آگ لگا کر اسے بھی راکھ بنا دیں۔ سامنے بیٹھے مطمئن و خوش خرم فراز کا گریبان تار تار کر کے اس کے چہرے پر پھیر سائے اور اپنے دل کو برباد کرنے کی وجہ پوچھے۔ وہ سلگ جا رہی تھی۔

تب ہی نافع آکر فراز کے قریب بیٹھا تھا۔ تعلق، منگوتھ لمحہ بھر کے لیے ٹھنک سی گئی۔ اس نے بہت دنوں کے بعد اسے دیکھا تھا یوں بالفاظ میں دیکھا تھا۔

شہریار اور منیزہ شہروانی میں گورا چٹا نافع اتنا دجیرہ لگ رہا تھا جیسے آدھی رات کو چاند کے بجائے سورج نکل آئے۔ عرشہ کو اپنی نظروں پر اعتبار نہ آیا۔ فراز کے ساتھ بیٹھا ہوا نافع وجاہت میں فراز کو بھی مات دے رہا تھا۔ وہ چونکہ اپنی ہی آکر بیٹھا تھا اس لیے اس کے انداز میں فراز کا سا تکلف نہ تھا۔ وہ خوش باش اور بے فکر نظر آتا تھا۔

”یہ اجتماعی شادی کون کروا رہا ہے؟“ علی نے اسٹیج پر نظر ڈال کر پوچھا، ایک قہقہہ پڑا تھا۔  
”جی کوئی راضی ہو تو آپ بھی بیٹھ جائیے۔“ کسی کونے سے آواز آئی۔ مزید قہقہہ بلند ہوا۔  
”مجھے شادی کرنی ہے، راشن کی قطار میں نہیں لگنا۔ قاضی صاحب نہ ہوئے تو ٹیلیفون اسٹور والے ہو گئے۔“  
اس کی باتوں پر سب ہی کے ہونٹوں پر مسکان تھی۔ سوائے عرشہ کے جو لب پیچھے کسی پتھر کے بت کی طرح رسیں کر رہی تھی۔



”ٹھیک طرح سے کھانا۔“ وردہ نے کونے میں پلیٹ پکڑے کھڑی رہی۔ کوہدایت کی تھی۔  
 ”یہ کیا؟“ پھر وہ اس کی پلیٹ میں ذرا سے چاول اور سلاد دیکھ کر بولی۔ ”بی چریا۔ اتنا تکلف نہیں چلے گا۔  
 اور لاؤ پلیٹیں۔“

ربیعہ نہ نہ کہتی رہ گئی۔ وردہ نے اسے روسٹ پیس اور کباب لا کر دیے۔  
 ”میں اتنا نہیں کھا سکتی وردہ!“ ربیعہ منت سے بولی۔ ”میں تو تقریباً کھا چکی ہوں۔“  
 ”چلو میں تمہارے ساتھ کھاتی ہوں۔“

دونوں قریب کی میز پر آ بیٹھیں۔  
 ”گھر جانے سے پہلے میں نانا کو مبارک باد بھی دینا چاہتی ہوں۔ رش میں مجھے موقع نہ مل سکا۔ کافی لیدرنگ ہے نا۔“

”خاندان بھر سے سب ہی کو دعویٰ کیا گیا ہے نا پھر دوست احباب۔ ملنے ملائے والے۔ یوں ایک بڑی تقریب بن گئی۔“

ربیعہ نے آستکی سے سر ہلایا پھر اسے کچھ خیال آیا۔  
 ”آئی راجس۔ ملی تھیں ابھی۔“  
 وردہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔  
 ”ہوں۔“ وہ آستکی سے بولی۔  
 ”وہ کہہ رہی تھیں۔“

”کہ میں نے رافع سے شادی سے انکار کر دیا۔ ہے نا؟“ وردہ نے اس کی ادھوری بات مکمل کی۔  
 ”کیوں وردہ۔ کیوں؟“ ربیعہ کے لہجے میں احتجاج تھا۔ ”کیا برائی ہے رافع میں؟“  
 ”تم بتاؤ۔“

”میں؟“ وہ حیران ہوئی۔  
 ”ہاں ربیعہ۔ تم بتاؤ مجھے۔ رافع میں کیا برائی ہو سکتی ہے؟“  
 ”کچھ نہیں۔ خدا کی قسم۔ کچھ بھی نہیں۔“ ربیعہ اسے دیکھ کر دلالت کرنے لگی۔  
 ”پھر تم رافع سے شادی کر لو ربیعہ۔“ وردہ اچانک بولی۔

ربیعہ نے دفعتاً پلیٹ سے ہاتھ کھینچ لیا اور نشو سے ہاتھ پونچھنے لگی۔  
 ”دیکھو ربیعہ! میں رافع سے شادی نہیں کر سکتی وجہ کچھ بھی ہو۔ اتنا طے ہے کہ میں رافع سے شادی نہیں کر سکتی لیکن رافع میں اتنی خوبیاں ہیں کہ تمہارے جیسی پیاری لڑکی اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔ میرا دل کہتا ہے۔“ وردہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔  
 ”میں تمہیں بتا چکی ہوں وردہ۔ میں کسی سے۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”غلط۔ بالکل غلط۔ تم کہیں بھی انکج نہیں ہو۔“ وردہ دھوک سے بولی تھی۔  
 ربیعہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔

”غذرا مایہ بہت اچھی ہیں ربیعہ! وہ تمہاری دل سے قدر کریں گی اور رافع۔ وہ تمہیں چاند تاروں سے بڑھ کر چاہے گا۔ تم ایک مرتبہ ہاں تو کہو۔ تمہارے اور رافع کے ایک ہونے میں کوئی مشکل حائل نہ ہوگی۔“  
 وردہ جذباتی ہو گئی تھی۔

”لیکن۔ تم ایسا کیوں چاہتی ہو وردہ؟“ ربیعہ نے تحیر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں۔ تمہارا ساتھ ایک اچھے انسان سے جڑے۔ میں چاہتی ہوں۔ میرے انکار سے۔ رافع کو مجھ سے بھی اچھی لڑکی کا ساتھ ملے۔ میرے انکار کا دکھ اس خاندان کے دل سے مٹ جائے۔ اس لیے۔ میں ایسا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری دوست نہیں ہو رہی۔ کیا تم ایسی ہی محبت مجھ سے نہیں کرتیں جیسی محبت میں تم سے کرتی ہوں؟“

”میں تمہیں اس سے بھی بڑھ کر چاہتی ہوں۔“ ربیعہ دھیرے سے مسکرائی۔

”پھر انکار مت کرو۔ تمہارے انکار سے میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ پلیز۔“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ ربیعہ کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ ربیعہ تذبذب اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو وردہ۔ اتنا بڑا فیصلہ میں اکیلے کیسے کر سکتی ہوں۔“

”رافع جیسے لڑکے کا رشتہ تو خوش نصیبی سمجھا جاتا ہے۔“ وردہ کی مسکان میں کیا تھا ربیعہ سمجھ نہ سکی۔

”تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ میں خود منہ زہ آئی سے بات کروں؟“

ربیعہ کا دل اس خیال سے بھی تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

”تم پاگل ہو گئی ہو وردہ۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”دوست تو ہاتھ پکڑ کر کھائی میں چلا نکلا دیتے ہیں تم اتنے سے پاگل پن میں میرا ساتھ نہیں دے سکتیں پھر کیسی دوستی؟“

”یہ کیسی دوستی ہے کہ میں تمہارے مشاعرے سے شادی کر لوں؟“ ربیعہ زچ ہوئی۔

”وہ میرا مشاعرہ نہیں ہے ربیعہ۔ وہ سکون سے بولی۔ ”یہ دیکھو۔“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کر دیے۔

”میری انگلیوں میں کوئی انگلی نہیں ہے اور میرے دل پر کوئی نام نہیں ہے۔“

ربیعہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

آپ اپنے جملہ عروسی میں ایک فراڈ دھوکے باز لڑکی کو لے کر جا رہے ہیں۔

یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس سے آپ نے تاروں کی روشنی میں رات بھر باتیں کی تھیں۔

یہ وہ لڑکی نہیں ہے جو آپ کے دل دھڑکنے کا سبب بنی۔

یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس سے آپ نے قول و قرار کیے تھے۔

یہ لڑکی اس کی آواز بنا سکتی ہے اس کے الفاظ چرا سکتی ہے اس جیسا دل نہیں لاسکتی۔

آپ کو دھوکا دیا گیا ہے آپ کی محبت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

کبھی اس سے اپنی گزشتہ محبت کا ثبوت مانگے گا۔ وہ کوئی ثبوت نہ دے پائے گی۔

ایک خوں بہا۔ آپ دونوں کے سم۔“

اس نے اپنے لکھے ہوئے میسج کو بار بار پڑھا پھر فراز کے موبائل نمبر پر سینڈ کر دیا۔

اپنا لکھا ہوا میسج ڈیلیٹ کر کے اس نے موبائل کی سم نکال کر الگ رکھ دی پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے

تکیے کے نیچے سے ایک چھوٹا سا چاقو نکال کر دیکھا تھا۔

”ایک خوں بہا۔ آپ دونوں کے سم۔“ اس نے زیر لب کہا۔

”عریض۔“ ماہین کی آواز پر وہ یکدم چونک گئی تھی۔

چاقو اس نے واپس تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

”امی تمہیں بلا رہی ہیں ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ ماہین فکر مند تھی۔

عریضہ وال کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات کے مین بج رہے تھے۔

”میں تمہیں رگولا نرودیتی ہوں۔“ ماہین بولی۔ ”تم پُر سکون سی نیند سو جاؤ گی اور کل فریش بھی لگو گی۔“  
عریشہ بادل خواستہ ماں کے ساتھ لیٹ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات گردش کر رہے تھے لیکن ماں اور  
بہن نے فی الوقت اسے مجبور سا کر دیا تھا۔

\*\*\*

اس نے پھر بے چینی سے کرویٹ بدلی تھی۔ کرویٹیں بدل بدل کر اس کے اعصاب جھنجھلا اٹھے تھے۔ نیند کسی  
بے مروت کی مانند نہ تھی۔ ہوائی تھی جس نے رابطے کا ہر سلسلہ منقطع کر دیا ہو۔  
شہلا بالآخر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سارے دن کی تھکاوٹ والی مصروفیت کے باوجود اس کا ذہن ذرا سی تھکن محسوس  
نہ کر رہا تھا۔ ایک ہاتھ کے فاصلے پر سوئے ہوئے ہاشم کی سانسوں کا زیروم اسے بار بار اپنی جانب متوجہ کرتا تھا۔  
شہلا نے ہاتھ بڑھا کر اپنی جانب کا سائیڈ لیپ روشن کر دیا۔ کمرے میں ہلکی دودھیا روشنی نے ماحول کو عجب سحر  
بخشا پھر اس نے ڈال کا لک کی جانب دیکھا جواب رات کے چکر سے نکل کر دن کی جانب محو سفر ہوا چاہتا تھا۔

”اے دل ناداں! آرزو کیا ہے؟“ اس کے اندر خود کلامی سی ہوئی۔ ”نیند کیوں نہیں آتی سحر کیوں  
نہیں ہوتی؟ چین کیوں نہیں ملتا؟ اس کی نیند بے اعتنائی سے دل سے محو کیوں نہیں ہوتی ہے؟“

وہ اپنی جگہ سے ذرا سا کھسک کر ہاشم کی طرف ہو گئی۔ فاصلہ ہاتھ بھر سے سمٹ کر دو بالشت کا رہ گیا۔ ہاشم  
دھیرے سے سیدھا ہوا تھا۔ شہلا کا دل دھڑکا لیکن وہ ہنوز نیند میں تھا۔ ایک لمبے عرصے سے وہ دونوں میاں بیوی  
کے روپ میں دو اجنبیوں کی مانند زندگی گزار رہے تھے۔ دو نہایت شائستہ اور مہربان اجنبیوں کی مانند۔ جنہیں  
شک کا جستہ کرنا آتی ہو نہ گھبراہٹ سے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عمر گزار دینے کے حوصلے کے ساتھ وہ دونوں ساتھ

تھے۔  
”تم از کم شہلا کو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا، بریف کیس میں رکھے ہوئے وہ چند پیروز کتنی ہی بار ذہن کے پردے پر  
پھرے تھے پھر ایک موہوم سائیں اسے کہتا تھا کہ ایسا ہونا ہوتا تو اب تک ہو چکا ہوتا۔ تذبذب اتنا بھی طویل نہیں  
ہوا کرتا۔ محبت ایسی بھی کمزور نہیں ہوتی۔“

”ایک بار اس سے پوچھ تو لے کہ اس اندیشے کو صداقت سے کتنا واسطہ ہے؟ پوچھ تو سہی۔“ شہلا پھر ذرا سا  
سرکی تھی۔ اب کے فاصلہ محض بالشت بھر کا رہ گیا تھا جسے ہاشم کی ایک کروٹ نے پاٹ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ  
جاگ اٹھا تھا۔

چند سانسے ڈال کر رہے یقینی اور حیرانی سے ان ستارہ آنکھوں کو اپنے قریب چمکتے دیکھتا رہا پھر اپنے بازو کے نیچے اس  
کے نرم کھیرے بالوں کو محسوس کر کے وہ یوں اٹھ بیٹھا جیسے اسے گرنٹ لگا ہو۔ شہلا بھی اس کے عقب میں۔  
بے حد آہستگی سے اٹھ کر بیٹھی تھی۔

”سوئیں کیوں نہیں؟“ ہاشم نے گھڑی کی جانب نگاہ کر کے بو جھل آواز میں پوچھا۔  
”نیند نہیں آتی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیوں؟“

جواب میں جو خاموشی تھی اس کی ملک سے ہاشم نے اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس کیے۔ اس نے گردن  
موڑ کر دیکھا۔ اس کا گلاب چہرہ اس کے شانے کے بالکل قریب تھا۔ ان آنکھوں کی سطح شفاف اور پر غم تھی۔ ہاشم  
کا جی چاہا وہ اس کی سے اپنی پوری ہستی کو سیراب کر لے۔  
”ہاشم!“ شہلا کے لب دھیرے سے کانپے۔

”عریشہ!“ فردوس بیگم نے بے حد محبت سے اسے پکارا تھا۔  
وہ بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر حد درجہ نقابست نظر آتی تھی۔ عریضہ کے پتھر لے جذبات میں  
مناکی تیز آنچ سے پھیل سی ہوئی وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔  
”عریشہ!“ انہوں نے اس کا سر ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹی! ہماری غلطیوں کو معاف کر دینا۔“ ان کی آواز میں

لرزش تھی اور لمبے میں بچتا دے کا احساس۔  
”آپ نے کوئی غلطی نہیں کی امی!“ ماہین دوسری جانب سے ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔ اس نے ماں کا  
دو سرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”ماں باپ! بس بھی جان بوجھ کر اولاد کو دکھ دینے کا نہیں سوچ سکتے۔ عریضہ یہ بات تب سمجھے  
گی جب ماں بنے گی۔ ماں کی سب سے بڑی پناہ محبت اور بے غرضی کو یہ اس وقت صحیح طور پر پرکھ پائے گی! ابھی یہ ناقص سوچ  
رکھتی ہے اس لیے مغالطوں کا شکار ہے۔“

عریشہ خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے کسی بھی بات کی تائید یا تردید کی ضرورت محسوس  
نہیں کی۔

”تم نافع کے ساتھ بہت خوش رہو گی بیٹی! یہ ایک ماں کا یقین ہے اور دعا بھی ہے۔“ فردوس بیگم اس کے اندر کے  
شانے سے کوئی گونج سننے کی متمنی تھیں۔

”اتنا تو میں سمجھ چکی ہوں کہ تم اس رشتے سے سخت ناخوش ہو لیکن بیٹی! یہ تمہارے باؤ کا فیصلہ تھا اور باپ  
بیٹیوں کے مقدر کا فیصلہ بہت سمجھ کر ہی کرتے ہیں۔ اپنا تو یقین ہے نا تمہیں کہ تمہارے باپ تم سے بہت  
پیار کرتے ہیں؟“

”صرف بابا جان ہی نہیں! آپ بھی ہم سب سے بہت محبت کرتی ہیں امی!“ ماہین پھر جلدی سے بولی تھیں۔  
”ہم سب کو اس بات کا یقین ہے۔ ماں اگر سخت گیر بھی ہو تو اس کی محبت میں کسی کمی نہیں۔“ فردوس بیگم نے  
”ہاں۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔ ”شاید میں نے تم لوگوں سے سختی ہی روارہی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے میرے  
بچوں کہ میں تم سب کو بہت چاہتی ہوں۔“

”عریشہ!“ ماہین اس سے مخاطب ہوئی۔ ”امی کی طبیعت تمہارے نہیں ہے اور وجہ جانتی ہو؟“ عریضہ نے  
خاموش مگر سوالیہ نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔

”کل تمہارے اس گھر سے چلے جانے کا خیال انہیں ستا رہا ہے۔ تمہاری ناخوشی ہے یہ خود کو بیمار کر رہی  
ہیں۔ بہتر ہو گا کہ تم انہیں بتا دو کہ تم مطمئن ہو اور خوش بھی۔“

عریشہ کے لبوں پر ایک ناہم سی مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ ماہین نے ایک گہری سانس بھری تھی۔  
”تم یہاں امی کے پاس ہی لیٹ جاؤ عریضہ! تمہاری یہاں موجودگی سے امی کو تقویت رہے گی۔“ پھر وہ اپنی جگہ  
سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں نیچے کارپٹ پر سو جاتی ہوں۔“

”میں سمجھے۔“ عریضہ بے چین سی ہوا تھی۔ ”مجھے شاید یہاں نیند نہ آئے۔“

ماہین نے کھڑے ہوتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے حیرت سے اسے دیکھا۔  
”کوئی بات نہیں۔“ پھر وہ اطمینان سے بولی۔ ”تم تو یوں بھی راتوں کو جاگنے کی عادی ہو۔ ایک رات اپنی ماں کے  
لیے بھی جاگ لو گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”بیٹی! ماہین ٹھیک کہتی ہے۔ تم میرے پاس ہی لیٹ جاؤ۔ مجھے سکون رہے گا۔“ فردوس بیگم قدرے لجاجت  
سے بولی تھیں۔ عریضہ نے خود کو بے بس سا محسوس کیا۔

ہاشم نے بے حد بے اختیاری کے عالم میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ شہلانے پلکیں موند لیں۔  
 ”میں نے اسے کہا تھا۔“ چند الفاظ بڑی تیزی سے ان دونوں کے درمیان آئے تھے۔ ”اگر وہ مجھ تک واپس آنا چاہتی۔ میں نے اسے کہا تھا۔ اسے کسی صورت۔ ماں نہیں بننا۔ اگر وہ۔ لوٹ کر آنا چاہتی۔ آپ کی ذرا سی قربانی سے۔ مسٹر ہاشم! کیا آپ ایک خوبصورت تصویر۔ آپ کی ذرا سی قربانی سے۔ ایک خوبصورت تصویر۔“

ہاشم کا ذہن ان آوازوں کی شدت سے گونجنے لگا۔ دھمک لہجہ بہ لہجہ بڑھنے لگی تھی۔ ہاشم کا تنفس اتنا تیز ہوا کہ نرم گرم جذلوں کے دھارے میں بہتی شہلانے گھبرا کر آنکھیں کھولی تھیں۔  
 ”ہاشم! کیا ہوا؟“ وہ گھبرا کر بولی تھی۔

”میں سونا چاہتا ہوں۔“ پلکیں۔ اس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔  
 ”ہوں۔“ اثبات میں سر ہلا کر وہ اپنی جگہ پر ہو گئی۔

ہاشم نے لیٹ کر اس کی جانب پشت کر لی تھی۔ شہلا کا دماغ بالکل سن ہو رہا تھا۔ کھلی آنکھوں سے پچھت کر گھورتے ہوئے اس نے بقیہ رات تمام کی تھی۔

صبح بے حد خوبصورت اور معطر معطری تھی۔ اونچے درختوں سے پھن کر آتی صاف ستھری ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خراماں خراماں بہت کچھ سوچتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

”تم ایک بار“ ہاں“ تو کو ربیعہ! رافع تمہیں چاند تاروں سے بڑھ کر چاہے گا۔ رافع جیسے لڑکے کا رشتہ تو خوش نصیبی سمجھا جاتا ہے۔ ربیعہ! تم ایک مرتبہ“ ہاں“ تو کہو۔“  
 ربیعہ کے دل کو یہ احساس جان فراگد گدا نے لگا تھا۔ اس نے روٹی سے اٹھ کھینچا کرتی ہوا کو محسوس کیا اور آہستہ سے ہنس دی۔

”تمہارے گھروالوں کو کوئی اعتراض نہ ہو گا“ میں خود منیوہ ٹیڑھی سے بات کروں گی۔“ ورہ جیسے اس کے کان میں بولی تھی۔ ربیعہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا ہی ہو جائے گا۔“  
 اس نے اپنے گال گرم ہوتے محسوس کیے اور انہیں ہتھیلیوں سے چھو کر دیکھا۔

”لیکن ورہ!“ پھر وہ برگد کے پھلے ہوئے درخت کے چوڑے تنے سے پشت ٹکا کر حیرانی سے سوچنے پر مجبور ہوئی۔ ”ورہ ایسا کیوں چاہتی ہے؟ اپنی قسمت کی زلفوں میں سجا خوبصورت چمکتا تارہ توڑ کر وہ میرے بالوں میں لگاتا چاہتی ہے۔ کیوں؟“ ربیعہ سوچنے لگی۔

”وجہ کچھ بھی ہو اتنا طے ہے کہ میں رافع سے شادی نہیں کر سکتی۔“ ورہ کی آواز پھر آئی تھی۔  
 ”وجہ کچھ بھی ہو بھلا کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کیا ورہ کسی اور سے نہیں بھلا ایسا کیسے ممکن ہے؟ ایسا ہوتا تو ورہ مجھ سے کیوں چھپاتی؟“

”کیا تم نے ورہ سے نہیں چھپایا کہ تم رافع سے۔۔۔“  
 ”نہیں۔“ وہ بے چین ہوا تھی۔ ”میں نے کچھ چھپایا نہیں۔ بتانے کے لیے بھلا میرے پاس تھا ہی کیا؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ ورہ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے۔ وہ کیوں نہیں بتاتی کہ وہ رافع سے شادی سے کیوں گریزاں ہے؟ کیا محض اتنی سی بات کہ کرن ہونے کے ناتے رافع سے اس کا وہ دلی تعلق استوار نہ ہو سکا جو ان دونوں کے مابین قائم

رشتے کے تحت ہونا چاہیے۔ کیا یہ تعلق خاطر شادی سے پہلے قائم ہونا ایسا ہی ضروری ہے کہ اس کے نہ ہونے سے برسوں پرانی منگنی کو توڑا جاسکتا ہے۔ کیا ورہ سچ بول رہی ہے؟“

اپنی سوچوں سے بے چین اور مضطرب ہو کر وہ پٹی تھی پھرویں تھم کر رہ گئی۔ سامنے والے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے رافع نجانے کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اوہ!“ ربیعہ کے لبوں سے نکلا تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر گیا تھا۔  
 ”مزان بچیر؟“ وہ مسکرایا۔

”جی۔ شکر یہ۔“ وہ سر جھکا کر آگے بڑھی۔

رافع اس کے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگا تھا۔ ربیعہ سے قدم اٹھانا دشوار ہونے لگا۔ ابھی چند لمحوں قبل وہ جس طرح کی سوچوں کا شکار تھی اس کے فوراً بعد رافع کا سامنا ہو جانا اسے بزل کر گیا تھا۔

”بہت دن بچہ ہی رہی ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔  
 ”ہوں تب ہی مجھے روز بخیر ملتی تھی۔“ وہ بھی آہستہ سے بولا۔

ربیعہ کے قدم است ہونے لگے۔ ہر چند کہ وہ انہیں تیزی سے بڑھانا چاہتی تھی۔  
 ”ربیعہ!“ ایک رافع رکا تھا۔ ”آپ۔ مجھے شادی کریں گی؟“

ربیعہ ششدر رہ گئی۔ یوں اچانک سر راوہ اس قدر آسانی سے ایسا مشکل سوال پوچھ لے گا اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔ گئے درختوں کے سائے میں بنا دیکر وہ بہت خوبصورت تھا۔

”رافع!“ وہ ہنکارتی ہوئی۔ ”کیا آپ مجھے شادی کریں گے؟“  
 رافع چند لمحے اس کی آنکھوں میں الجھتا رہا پھر دھیرے سے مسکرایا۔

”آپ نے صرف میرا نام لیا ربیعہ! آپ نے اپنا نہیں کہا کہ آپ الیکٹرک ہیں۔ جانتی ہیں کیوں؟ کیونکہ بے اختیاری میں ہی انسان کے لبوں سے سچ نکلتا ہے۔ اس روز ہامپٹل میں آپ نے ورہ سے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا۔

نجانے ورہ کو سنانے کے لیے تھا یا مجھے بہتر حال، ہم دونوں ہی نے اس پر یقین نہیں کیا۔“  
 ربیعہ خاموش کھڑی اس کی آواز کے شرٹ کے ٹن لگتی رہی۔

”نجانے اس سے آپ کا مقصد کیا تھا؟ رشتے زبردستی باندھے نہیں جاتے ربیعہ! تو زبردستی توڑے بھی نہیں جاسکتے اور رشتے محض خونی یا قانونی ہی نہیں ہوتے۔ کچھ رشتے صرف نگاہوں کے مابین قائم ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی غرض، کوئی کھوٹ، کوئی ریا نہیں ہوتی۔“

ربیعہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔  
 ”میرے اور آپ کے درمیان۔ کیا ہے رافع؟“

رافع نے قریب سے گزرتی تلی کے تعاقب میں دوڑ تک دیکھا۔  
 ”اب تک جو تھا وہ محض ایک احساس تھا ربیعہ! جس کے رنگ دل کی سطح پر ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن اب اس احساس کو یقین بنانے کا وقت ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دینے پر راضی ہو۔ تو۔۔۔“

رافع نے بات مکمل کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ربیعہ نے سر جھکا لیا۔  
 ”یہ احساس میں خود تک محدود رکھنے کا پابند تھا۔ لیکن ورہ نے منگنی ختم ہونے کا اعلان کر کے مجھے اس بندھن سے آزادی بخش دی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں ہیں ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اس زبردستی کے رشتے کو نبھاتے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔“

ربیعہ نے اس کی بات پر اپنے اندر غجب بے چینی سی محسوس کی تھی۔

”کیا ورنہ واقعی آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی؟“

”وہ تو میری کہتی ہے۔ اور آخر وہ غلط کیوں کہے گی؟ اور میں۔۔۔ جب ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی۔۔۔ یقیناً مجھ سے بہت بہتر کوئی شخص کہیں اس کا منتظر ہو گا۔۔۔ ٹھیک ہے نا!“

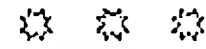
”پتا نہیں۔۔۔“ اس کے لبوں سے نکلا۔

”میں اپنی ہی کو تمہارے گھر بھیج سکتا ہوں؟“

ربیعہ خاموش کھڑی اپنے دل کی دھڑکنیں کتنی رہی جو کوئی انوکھا سا پیغام دینے پر آمادہ تھیں۔

”تمہاری خاموشی۔۔۔ تمہارا اشیاء تجھوں؟“ رافع کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔

ربیعہ دھیرے سے مسکرا کر آگے بڑھ گئی تھی۔



رات نے جھملا تالیاں پہنا۔۔۔ گھنیری زلفوں میں چمکتے ستارے ٹانگے۔۔۔ موتیا اور گلابوں کی مہک کو ہمراہ کیا اور ”حیات ولا“ کے کیمینوں کے پاس چلی آئی۔

تین براتوں کی آمد کے پیش نظر شہر کا سب سے بڑا اور کشادہ ہال ارنج کیا گیا تھا۔ جہاں ”حیات ولا“ کے سب ہی یکساں موجود تھے سوائے نافع اور رافع کے۔ جنہوں نے نافع کے دوست احباب کے ہمراہ ایک عدد ”بارات“ کا سا تاثر لے کر آنا تھا۔

ثانیہ کی برات کو دور جانا تھا سو اس کے سرال والے بارائیاں کر بیچ چکے تھے۔ ثانیہ کو نافع کے بعد اسٹیج پر لے جایا گیا تھا جہاں اس کی اور اس کے گھر والوں کی تصاویر بن رہی تھیں۔ عریشہ کی خاموشی کاٹ ڈالو نظریں ناعمہ کے ہیرا پہنیں جیسے سوئیاں سی چمپوری تھیں۔ دوبار بار پہلو بدلتی تھیں۔ اسے اس لڑکی کی کشلی نظروں سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔

گھرا سرخ پیش قیمت بناری غرارہ زیب تن کیے انٹیک لک دیئے تھناری زاورات سے مزین ناعمہ کو پہچانا آج مشکل محسوس ہوتا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر کلیوں کے بیچ چمکتا گلاب چروانی معصومیت بھری چمب سے پھوٹا اور کلیوں کو بھی مات دے رہا تھا۔ عریشہ کا لباس میروں تھا جس پر میروں اور گولڈن کام تھا۔ گولڈن جیولری اور میروں میک اپ نے اس کے اداس چہرے اور خاموش نگاہوں کو غجب پر اسرار سا تاثر بخشا ہوا تھا۔

”کچھ بات کرو نا۔“ ناعمہ گھبرا کر بولی تھی۔ ”اتنی خاموش کیوں ہو؟“

عریشہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔

”جو کچھ کہنا تھا۔۔۔ کہہ چکی۔۔۔ پھر وہ بولی تھی۔“ اب۔۔۔ خاموش ہی ہونا ہے!“

”میں کچھ سمجھی نہیں!“ ناعمہ نے حیرانی سے اس کا اسرار سے بھر روپ دیکھا۔

”سمجھ جاؤ گی! سب ہی سمجھ جائیں گے۔“

دونوں کے درمیان پھر خاموشی در آئی تھی۔ عریشہ چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ ناعمہ نے مسکراتے کی کوئٹش کی۔

”دیکھ رہی ہوں۔ کہ آنے والے لمحوں کے احساس نے تمہیں خوبصورت بنا دیا ہے۔۔۔ ورنہ تم اتنی خوبصورت تو نہیں ہو۔“

”آنے والے لمحے۔۔۔“ ناعمہ کا دل بیٹھنے لگا۔

”جو جھوٹ بولے ہیں“ اس سے۔۔۔ ناہواؤ گی؟“ اس نے کاٹ وار انداز میں پوچھا تھا۔ ناعمہ نے چونک کر اس کی شعلہ بار آنکھوں میں دیکھا۔

”جھوٹ بولتے وقت۔۔۔ صرف تمہارا خیال تھا۔۔۔ یا اپنے خاندان کی عزت کا۔۔۔“ پھر وہ رسائیت سے بولی۔

”اب بھی میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے جو کچھ کہا۔۔۔ کسی کی بھلائی کے لیے کہا۔“

”ہنس بھلائی؟ بھلائی تو صرف تمہاری اپنی پوشیدہ تھی۔ تم کسی بھی طرح اسے پانا چاہتی تھیں۔۔۔ خواہ جھوٹ سے ہی سہی۔۔۔ بعد میں کہا ہوتا ہے اور کیا ہو گا۔ تم نے اس بارے میں سوچا تک نہ ہو گا!“

”غوریشہ! مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی بھی تمہارا دل صاف کر پاؤں گی۔۔۔ لیکن مجھے اپنی آنے والی زندگی کے کسی پل سے کوئی سکھ نہ ملے اگر میں نے ایسا کچھ بھی سوچا یا چاہا ہو۔۔۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نے فراز کو پانے سے پہلے اس سے جھوٹ بولنا تو درکناس۔۔۔ کبھی اس سے بات تک نہ کی تھی۔ اس سے رشتہ جڑنے کے بعد اگر میں نے خود کو وہ لڑکی کی ہر گز بات سے رات رات بھر فون پر باتیں کرتی تھی تو محض تمہاری اور نافع کی اور اپنے پورے خاندان کی عزت کے لیے۔۔۔ کیونکہ ابھی وقت تم نافع کی منکوحہ اس کی عزت تھیں۔ نافع اور فراز آپس میں دوست اور شناسا نہیں۔ تم ہی تناؤ۔۔۔ حقیقت جان لینے کے بعد فراز کی نظروں میں تمہارے لیے کون سا جذبہ ہوتا؟“

”کم از کم وہ تم سے شادی تو نہ کرتا۔“ وہ پتھر کا پری۔ ”میری نظروں کے سامنے کسی اور کا تو نہ ہوتا میں آنے بھی اس سے محبت کرتی ہوں۔ سنا تم نے؟ ان الفاظ کی باہر کتنی تم کبھی نہیں بھول پاؤ گی۔۔۔“

ناعمہ ساکت رہ گئی۔ کھلی آنکھوں سے وہ اس دیوانی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔



سالور شیش سے سجایا ہوئی لباس زیب تن کر کے اس نے بال سنوارے اور لبوں پر تیز گلابی لپ اسٹک لائی۔ کانوں میں فیوزے کے ٹاپس یکن کروہ پلٹ ہی رہی تھی جب منیوزہ بیگم اس کے قریب چلی آئیں۔

”ماشاء اللہ۔۔۔ چشم بدور۔۔۔“ انہوں نے محبت سے اس کا چہرہ دیکھا اور پیشانی پر مہر محبت ثبت کی۔

”آج تو میری بیٹی کا روپ ہی نرالا ہے۔“

ربیعہ نے جھینپ کر سر تھکا لیا تھا۔

”یہ الوہی چمک۔۔۔ ایسا دکھتا اور کا بال۔۔۔ جیسے یہ کسی فرشتے کا چہرہ ہو۔۔۔“ انہوں نے ربیعہ کو غور سے دیکھا۔

”آج میری بیٹی بڑی خوش نظر آتی ہے؟“

ربیعہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ ماں کی نظروں میں چھپی پوشیدہ مگر شدید قوت کا اسے احساس ہوا تھا۔

حقیقت یہی تھی کہ صبح رافع سے ہونے والی ملاقات کا اثر اب تک اس کے رویوں میں روئیں میں مہک رہا تھا۔ وہ خود کتنی ہی بار آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ چکی تھی۔ رات کو ہونے والی اس تقریب کا اسے صبح سے ہی انتظار تھا۔

منیوزہ بیگم اب تک اس کا چہرہ غور دیکھ رہی تھیں۔

”ربیعہ۔!“

”جی ای۔!“ وہ چونکی۔

”ایک بات پوچھوں؟“

”یہ بھی پوچھنے کی ضرورت ہے۔“ وہ ہنس دی۔

”امیر حسن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

ربیعہ یکدم حیران ہوئی تھی۔ اس کا چمکتا چہرہ قدرے ماند پڑا۔

”امیر حسن۔“

”وہ تم سے شادی کا خواہش مند ہے بیٹی!“

”لیکن امی جی۔!“ وہ بے اختیار پریشانی سے بولی۔ ”مہم میں ان سے شادی۔“ وہ بولتے بولتے خاموش سی ہو گئی۔ منیوہ بیگم بے چین ہو گئیں۔

”کیا بات ہے ربیعہ۔ کیا تمہیں امیر حسن پسند نہیں۔ کیا کسی اور کو۔“

اسی لمحے کمرے میں انبیقہ داخل ہوئی تھی۔ مسٹر ڈاؤر گھرے کبھی نیشن کے بے حد اسٹائلش کرتا شلواریں ملبوس کاندھے پر ہلکی سی شال ڈالے۔ وہ دلکش لگ رہی تھی۔

”ربیعہ۔۔۔ اعباد بھائی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ شہلا آپلی کا دو مرتبہ فون آچکا ہے۔ سب ہی برائیں ہال میں پہنچ چکی ہیں۔ جلدی کر۔“

”جاؤ بیٹی۔ تم لوگوں کو واقعی دیر ہو چکی ہے۔“ منیوہ بیگم نے تفکر سے گھڑی کی سمت دیکھا۔

”واپس آؤ گی تو بات کریں گے ان شاء اللہ!“

”آپ اکیلی رہ جائیں گی نا۔“ ربیعہ پریشان تھی۔

”بے فکر ہو کر جاؤ۔ میری طبیعت ابھی بالکل ٹھیک ہے۔“

”ہم جلدی آجائیں گے امی جی۔“ انبیقہ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ان کا گال چوما۔

”ہاں بچو۔ جلدی آجانا۔ اکیلے گھر میں میرا دل بالکل نہیں ٹھیک لگے گا!“ انہوں نے پیار سے کہا تھا۔

اسٹیج پر رنگ و بو اور روشنیوں کا جھوم سا اکٹھا ہو گیا تھا۔ کسی کنسرٹ کے اسٹیج کی طرح چہنائے گئے وسیع وسیع عریض اسٹیج پر تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دو لہا اور دلہنیں اپنی اپنی نشستوں پر براجمان تھیں۔ مدد کی اور تھوڑی سی شیدا لڑکیاں تصویریں اور موسیقی بنوا رہی تھیں۔ اسی آفراتفری میں بڑے بزرگوں کو بھی اس کار خیر کو سرانجام دینے کے لیے بھیج لیا جاتا تھا۔

”حیات ولا“ کے سب ہی مکین چروں پر خوشگوار مسکراہٹ لیے ہوئے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے دعائیہ کلمات وصول کرتے ہوئے سب ہی کے احساسات و جذبات خوشگوار تھے۔ وسیع وسیع عریض ہال میں اتنے دھیر سارے مہمانوں کو دیکھتے ہوئے ربیعہ قدرے گھبرا سی گئی تھی۔ تاہم اس کے لیے خرید آگیا گفٹ وردہ کو تھماتے ہوئے اس نے اس بات کا اظہار بھی کر ڈالا تھا۔

”ارے۔۔۔“ وردہ ہنس دی۔ ”جانتی ہوں کم آمیز ہو۔ مگر ایسی بھی کیا کم آمیزی۔ اتنی بھرپور تقریب ہے۔ انجوائے کرو۔“

”میرا جی چاہ رہا ہے۔ میں بالکل کونے والی میز پر بیٹھوں۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ کونے والی میز پر ہی بیٹھ جائے۔“ وردہ مسکرائی تھی۔ ”تم جہاں بھی بیٹھو گی۔ ڈھونڈ لی جاؤ گی۔“

ربیعہ نا سمجھی سے مسکرائی۔ وردہ نے اسے غور سے دیکھا پھر قدرے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”رافع تمہیں ڈھونڈ ہی لیں گے!“

ربیعہ کی تحیر بھری آنکھوں نے وردہ کی بے اثر نظروں میں کچھ کھوجنا چاہا۔ آخر اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟

”تم بیٹھو نا ربیعہ۔“ وردہ نے اچانک اس کے دونوں ہاتھ دھیرے سے دبائے۔ ”ابھی کھانا لگے گا تو ساتھ کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک؟“

ربیعہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ وردہ کسی مہمان کو آمادہ دیکھ کر اس جانب بڑھ گئی تھی۔ انبیقہ اپنی چند

شنا سائیکوں کے ساتھ میڈیکل کالج کے حالات پر سیر حاصل بحث کر رہی تھی۔ ربیعہ تنہا ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ارد گرد بکھری خوشیوں اور روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ یکایک ایک مخصوص ملک کا احساس ہونے پر وہ چونکی تھی۔ رافع اس کے قریب موجود تھا۔ ربیعہ کو اپنی آنکھوں میں روشنی سی بھرنے کا احساس ہوا۔ دل انجینی سی تال پر دھڑکا۔ رات گئے صبح صادق کے حوالے یاد آنے لگے تھے۔

”اکیلی ہی آئی ہیں؟“ رافع نے اسے تنہا پوچھا۔

”نہیں۔ انبیقہ اور عباد بھائی بھی ساتھ ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ربیعہ ماں کے حوالے پر قدرے اداس ہوئی تھی۔ ”وہ گھر پر ہیں۔“

اسی لمحے رافع کو حمزہ نے آواز دی تھی۔ رافع نے پلٹ کر دیکھا، حمزہ کمرہ تھا۔ ہاتھ ہلا کر اسے بلارہا تھا۔ شاید کسی گروپ فوٹو کے لیے۔

رافع نے ربیعہ کو قدرے معذرت خواہانہ پر مسکرا کر دیکھا اور حمزہ کی جانب بڑھ گیا۔ ربیعہ کی نگاہوں نے کچھ دیر اسے دیکھا۔ سیاہ کوٹ پیلیٹ میں ملبوس رافع آج ہمیشہ سے زیادہ خور و نظر آ رہا تھا۔ ربیعہ کی نظریں میں کافی دور تک اس کے ساتھ گئی تھیں۔

یکایک اس نے اپنے قریب کسی کی کھانکھنا دیکھنی تھی۔ ربیعہ چونک کر خود میں پلٹی۔ رائے اس کے قریب بیٹھ رہی تھی۔

”السلام علیکم۔“ ربیعہ نے گرجوٹی سے سلام کیا۔

”و علیکم السلام۔“ کیسی آہور ربیعہ۔ اوتھے پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوبصورت اور بیاری تھی۔ جب آتا تھا تو ہوتے ہیں تو نظر کا قیل بھلی لگاتے ہیں۔“

رائے نے اپنی آنکھ کے گوشے سے ذرا سا کاہل لے کر اس کے کان کے پاس لگایا۔ ربیعہ بے طرح جھینپ گئی۔

”وردہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ اکثر تمہارا ذکر کرتی ہے۔ حالانکہ وہ بہت لمبے دیے رہنے والی لڑکی ہے۔ لوگوں سے کم ہی مٹھتی ملتی ہے۔ تم نے اب ذرا ڈھنگ لگایا ہو گا؟“

”جی۔“ ربیعہ دھیرے سے مسکرائی۔ ”ایسا ہی ہے۔ پھر بھی اس کی ذات کی خوبصورتی سب ہی کو اپنا بنا لیتی ہے۔“

”نہیں۔“ رائے نے سانس بھر کر کہا۔ ”ایسا بھی نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو رافع۔۔۔ رافع کیوں نہ بن سکا اس کا؟“

اس نے یہ سوال براہ راست ربیعہ کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا تھا۔ ربیعہ کا چہرہ قدرے بے رنگ ہوا۔

”رافع۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ پائی۔

”ہاں رافع۔ جسے وہ بچپن سے چاہتی ہے۔ اس وقت سے جب ان دونوں کی نسبت بھی طے نہ ہوئی تھی۔ اسی رافع سے جسے وہ از حد خاموشی سے اپنی پلکوں اور اپنی دعاؤں کے حصار میں رکھتی تھی۔ وہ رافع اسے چھوڑ کر۔“

مگر سانس بھر کر اس نے ربیعہ کے سراپے کو بے حد غور سے دیکھا تھا۔

”چاندی میں۔ سونے سے زیادہ چمک ہوتی ہے۔“ پھر وہ زیر لب بولی جیسے خود اپنے آپ سے مخاطب ہو۔ ”لیکن چاندی۔ سونے سے زیادہ تو نہیں ہوتی۔ ہے نا ربیعہ؟“



پھر ایک ورہیہ کو دیکھ کر مسکرا دی۔

”خیر تم دورہ کی دوست ہو۔ اس لیے تم سے کہہ گئی یہ سب کچھ۔ ورنہ دورہ نے تو اس ایثار پر بات کرنے پر بین لگایا ہوا ہے لیکن تم ہی کو ورہیہ! اتنی پرانی نسبتیں یوں بیک جنبش ابو ختم کی جاسکتی ہیں؟ ختم کی جانی چاہئیں؟ لڑکوں کا کیا ہے۔ وہ تو ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہی رہتے ہیں۔ ایسی باتوں پر رشتے ٹوٹ جایا کرتے ہیں؟ دورہ تمہاری دوست ہے۔ اگر تم اسے سمجھا سکو تو۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور رافع بھی۔ شاید تمہارا کھانا مان لے۔ دراصل امی بہت پریشان ہیں۔“ وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

ورہیہ کچھ دیر بالکل بے حسن و حرکت بیٹھی رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ حرکت کرنا چاہے گی بھی تو کرنہ پائے گی۔ پھر اس نے بروقت میز پر دھرا اپنا ہاتھ اٹھا کر اپنے گال پر رکھا۔ اس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ پھر اسے لگا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے والی ہے۔ اسے لگا وہ ابھی اتنے ڈھیر سارے لوگوں کی موجودگی میں زور زور سے رونے لگے گی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اپنا دوشہ اس نے سر پر یوں اوڑھ لیا کہ اس کا آدھا چہرہ ڈھک گیا۔ پھر وہ بیٹھ کر تیزی سے لوگوں کے درمیان سے نکلتی چلی گئی تھی۔

\*\*\*

عباد اور انیقہ بے حد گھبراہٹ کے عالم میں گاڑی سے اترے تھے۔ مرکزی دروازہ انہیں کھلا ہی ملا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اندر آئے۔ لاؤنج میں بیٹھی منیجر دیکھ کر دوڑتے ہوئے گئے۔

”امی! وہ ورہیہ۔۔۔“ عباد نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”دوسری ہے۔“ انہوں نے سکون سے کہا۔

وہ دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

”سورہی سے؟“ پھر عباد نے نہایت حیرانی سے کہا تھا ”وہ سب کچھ کے ساتھ آئی ہے؟“

”نیکسی لے کر آگئی تھی۔ اس کے سر میں بہت سخت درد شروع ہو گیا تھا۔ تم دونوں کی تقریب خراب نہ ہو۔ اس خیال سے وہ نیکسی لے کر گھر چلی آئی۔ اب ٹیلیفٹ کھا کر سو گئی ہے۔“

”لیکن وہ کم از کم مجھے بتا کر تو جاتی۔“ عباد کو ایک غصہ چڑھا تھا۔ ”میں اتنا پریشان ہوا اسے کہیں نہ پا کر۔ میں اور انیقہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تحک گئے۔ ہم دونوں کھانا تک پہنچو نہ ہو۔“ وہ گاڑی کا ٹ بلوک ورہیہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کر سکتی ہے۔“

”چھوڑو سنا بھائی! وہ بے چاری ہمارا خیال کر کے ہی ہمیں بتا بتائے چلی آئی اس نے سوچا ہو گا ہم کو کون شاید گھر فون کر کے پتا کر لیں گے، ہمیں بھی تو گھبراہٹ میں اتنا دھیان نہیں رہا۔ امی سے فون پر کنفرم کر لیتے تو اتنی پریشانی اٹھانا نہ پڑتی۔“

انیقہ نے ورہیہ کی طرف داری کرتے ہوئے عباد کو ٹھنڈا کیا۔

”میں کھانا لگاتی ہوں۔۔۔ آپ چیخ کر لیں!“

”ورہیہ؟ اس نے کھانا کھایا؟“ عباد نے بے چین ہو کر اس سے پوچھا۔

”نہیں۔ اس کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے جیسے رستہ بھر رہی آئی ہو۔ منیجر دیکھ کر اسے اداسی سے بولیں۔

”لیکن کیوں؟ اسے کسی نے کچھ کہا ہے؟ کسی نے اس کے ساتھ مس بی ہو تو نہیں کیا؟“

”ایسا کچھ نہیں ہے عباد بھائی!“

ورہیہ کی آواز پر وہ سب چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔

”کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میرے سر میں اچانک اسی درد اٹھا تھا۔ میں آپ لوگوں کو ڈھونڈ بھی نہ پائی۔“

ورہیہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے دوپٹہ نماز پڑھنے کے انداز میں چہرے کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ شاید وہ نماز پڑھ کر ہی آئی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی متورم تھیں لیکن چہرہ اور انداز بالکل پرسکون تھا۔ عباد اور انیقہ اس کے قریب جا کر جیسے اپنا اطمینان کرنے لگے تھے۔ انیقہ نے اس کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔

”سچ ورہیہ۔! نبھانے کیوں ہم لوگ بہت پریشان ہو گئے تھے!“

ورہیہ کے اندر سے ایک سکسی سی نکلی مگر اس نے خود پر قابو پایا۔

”میں کھانا لگاتی ہوں۔ پھر ہم سب مل کر شادی کی دعوت کا مزمزہ لیتے ہیں۔“ انیقہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

\*\*\*

نہایت خواب ناک اور معطر ناخون میں وہ کسی بہت کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔ پورے وجود میں ایک پاگل دل تھا جو خاموش ہونے پر راضی نہ تھا اور شور مچاتے بیٹھا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو لمحہ بھر کے لیے پاگل دل بھی سم کر خاموش سا ہوا پھر سوچ سوچ کر دھڑکنے لگا۔ وہ آہستگی سے چلتے ہوئے قریب آ بیٹھا تھا۔

ناعمہ نے ڈرتے ڈرتے پلوں کو اٹھایا۔ پھر فوراً گرا بھی لیا۔ وہ خشک تیور لیے اس کی جانب متوجہ تھا۔

”بہت ڈھکیچڑکی ہو۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

ناعمہ نے رونمائی میں ملا لعلہ خاموشی سے سنا۔

”خود سر۔۔۔ جھولی۔“ تنہا لف بڑھنے لگے تو اس نے بے چین ہو کر نگاہیں اٹھائیں۔ اسے لگا ”فراز نے دھیمی سی مسکان کو چھپایا تھا۔“

”دو نمبر فراز لڑکی!“ جونہی فراز کے لبوں نے کچھ کہنا چاہا تھا ناعمہ نے بے اختیار رول کر اسے حیران کر دیا۔

”کیا کیا۔ کیا کہا؟“ اس نے متعجب ہو کر اسے دیکھا۔

”دو نمبر فراز لڑکی یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟“ وہ سکون سے بولی۔ ”تمام الزامات کے ساتھ حاضر ہوں جو چاہے۔“

”ہے۔“

فراز نے چند لمحے اس کا چہرہ دیکھا، جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر ہلکا ہلکا ہوا۔

”ہوں گویا آپ سزا پانے کے لیے تیار ہیں۔ فرد جرم آپ پر چسپاں کیا گیا؟“

”فرد جرم کی ضرورت نہیں۔ بنا سنے ہی میں ہر الزام تسلیم کرتی ہوں۔“

”پھر بھی ایک آدھ الزام دہرایا جائے تو حرج بھی کیا ہے۔“ اس نے مسکراہٹ دہائی تھی۔ ناعمہ نے سوالیہ نظروں سے اس کا جاذبِ نظر چہرہ دیکھا اور اس کی کشش سے گھبرا کر نگاہیں جھٹالیں۔

”پہلی نظر میں تم میرا دل چرا لے گئی تھیں یا گل لڑکی۔ اتنے طویل عرصے سے تمہاری۔۔۔“ وہ دم ادا میرا

دائیلے پر نقش ہے۔ بولو کیا سزا دوں اس جرم کی؟“

اس کے بوجھل، معنی خیز کجے کی پیش نے ناعمہ کے حواس جھنجھوڑے۔ وہ بری طرح ہونٹکی۔

”تمہاری ایک پاگل کزن کے ساتھ کچھ عرصہ باتیں کرتا رہا۔ ذہن میں تمہارا تصور باندھے۔ بخدا ناعمہ! میں نے اس سے تمہارے دھوکے میں باتیں کیں۔ یہ واحد خطا ہے جو سرزد ہوئی، مجھ سے۔ اس سے قطع نظر میں نے کبھی تمہارے علاوہ کسی کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اسی لیے میں اس تعلیق کے منقطع ہونے پر اتنی شدت سے رد عمل ظاہر کرنا چاہتا تھا خدا بھلا کرے فریحہ کا جس نے تم دونوں کی گفتگو سن کر مجھ سب احوال سنا دیا۔ ورنہ ’ورنہ تم اسی دھنکالی اور خود سری سے خود کو وہی لڑکی ظاہر کرتیں اور اپنی اور میری عمر کو ضائع کر ڈالتیں۔ تمہاری فرد جرم میں از حد قسم کی بے وقوفی کا بھی اضافہ کرتا ہوں۔“

”فریحہ نے آپ کو۔۔۔ آپ سب جاننے ہیں؟“ ناعمہ نے خود کو بڑی بڑی زنجیروں سے آزاد ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

”شکر ہے خدا کا جس نے پردے ہٹائے۔“ وہ مسرور سا بولا تھا۔

”آپ سب کچھ جانتے ہو جیسے بھی مجھے پریشان کرتے رہے؟“ اس کی آنکھیں بھرا آئی تھیں۔

”نہیں یہ حقیقت جان لینے کے بعد میں نے کبھی تمہیں پریشان نہیں کیا۔“ اس نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”آپ۔۔۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ اتنا برا جھوٹ بولنے پر؟“ ناعمہ کی بے پرواہی نے لگی تھی۔

”اس جھوٹ کے پیچھے تمہارے جو احساسات و جذبات پوشیدہ تھے ناعمہ! انہوں نے مجھے تمہارا بے دام غلام بنا ڈالا ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں جو تمہارے جیسی بالغ نظر اور ایثار پسند لڑکی میری شریک حیات بنی ہے۔ اور معافی تو میں تم سے طلب کرتا ہوں۔ بے پرواہی کے ایک غافل حصے میں میں نے یقیناً ”ایک خراب و خطرناک حرکت کی ہے چند لمحوں کی نشاط انگیزی ساری عمر چند لمحوں سے شرمسار رکھے گی۔“ نظر نہیں ملایا پڑا۔“

”عریشہ!“ ناعمہ بے حد دکھ سے بولی تھی۔ ”اس کا پاگل پن ایسے ہی برقرار ہے۔“

”میں جانتا ہوں ناعمہ۔ لیکن وقت ہی ایسے پاگل پن کا دوا ہوا کرتا ہے۔ نئی زندگی کی شروعات اسے بھی بدل ڈالیں گی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ وہ آہستہ سے بولی تھی۔

اسے عریشہ کا وہ خطرناک انداز یاد آ رہا تھا۔ اسے بے چینی سی ہونے لگی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ فرزانے اس کا چہرہ اپنی جانب کیا تھا۔

”عریشہ کے بارے میں سوچ رہی ہوں میں، میں صبح اس کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں!“

”ایسا ہی ہو گا۔“ فرزانے آہستگی مگر یقین سے بھرے انداز میں کہا تھا۔ ”لیکن میں۔۔۔ ابھی تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

ناعمہ اس کے بدلے انداز پر چونکی، سنبھلی پھر دھیرے سے مسکرا دی۔

”میں تو سوچے بیٹھی تھی کہ آپ میرے آنسوؤں کے سوا کچھ دیکھنے کے متمنی نہ ہوں گے!“ فرزانے دھیرے سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔ انہیں آہستہ سے دبایا اور مضبوط تھپتھپ میں کہا۔

”ہم اس بل سے۔۔۔ ایک بالکل نئی زندگی کا آغاز کریں گے ناعمہ! ہمارے درمیان پچھلا کوئی حوالہ کبھی نہیں آئے گا پچھلی کوئی بھی بات کوئی جگہ کوئی شکوہ کچھ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تمہارا دامن تمہاری طرح پاک اور صاف ہے لیکن مجھ سے کچھ غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں اسی لیے میں سب کچھ بھلا دینا چاہتا ہوں۔ آئندہ ہمارے درمیان کسی تیسرے فرد کے حوالے سے کوئی بات نہ ہوگی میں اور تم بس یہی دنیا ہے۔ ٹھیک ہے نا!“

ناعمہ نے آہستگی سے سر ہلایا۔ وہ خود کو بے حد آزاد ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ نیک نیتی کے ثمر اس کے چہرہ جانب بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا دل دباغ اور روح آسودگی اور سیرابی کی انتہا کو محسوس کر رہے تھے۔ ایسے لمحوں میں بھی اس نے چپکے سے عریشہ اور نافع کی خوشگوار زندگی کی ابتداء کی دعا کی تھی۔

\*\*\*

لباس تبدیل کر کے وہ چہرے کو کلیننگ ملک سے صاف کر رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو شہلا کو تدریج حیرت سی ہوئی۔ ہاشم اور رافع تو فارغ ہو کر محفل جمائے ہوئے تھے۔ گھر کے بقیہ افراد بھی تھکے ماندے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ عریشہ کی رخصتی کا عمل ایسا ہی تھکا دینے والا اعصاب شکن محسوس ہوا تھا۔ اس نے رات کے دو بجائی گھڑی کو دیکھا اور برہنہ کردروازہ کھولا۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

”نافع!“ پوری آنکھیں کھول کر اس نے نافع کو دیکھا۔ ”تم یہاں اس وقت؟“

”نافع نے یہاں تک اس کی کٹائی پکڑی تھی پھر وہ اسے کھینچتا ہوا از حد غلجٹ میں۔ میں لے جانے لگا۔“

”نافع!“ شہلا نے پکارا۔

”شش۔۔۔ خدا را بھالی خاموشی رہیں۔“ اس نے سرگوشی کی تھی۔

شہلا کو کسی غیر معمولی احساس نے تھیرا۔ وہ خود بھی تیزی سے قدم بڑھانے لگی۔ نافع اسے لان کے بجائے گھر کی پچھلی گلی کی جانب لے گیا تھا جہاں نکاسی آب کی لائنیں اور اکثر کمروں کے باہر کی جانب کھلنے والے دروازے تھے۔ نافع کے کمرے کا بھی ایک دروازہ اس گلی میں کھلتا تھا۔

وہ نون تیزی سے قدم بڑھاتے اس کے کمرے میں پہنچے تھے۔ شہلا اس دوران چشم تصور سے نجانے کیا پتہ دیکھ چکی تھی۔ سوچ کر بے خودی عریشہ کو دیکھ کر اسے سنبھلنا پڑا۔

”کیا کھانا ہے اس نے؟“ عریشہ نے غلام میں پوچھا۔ اس کی نبض وغیرہ دیکھنے لگی۔

”شاید گولیاں کھائی ہیں۔۔۔ یہ خالی شیشی۔“ نافع نے اس کی توجہ خالی شیشی کی جانب مبذول کرائی۔

”اوہ گاڈ۔۔۔ یہ لڑکی۔۔۔ یہ پاگل لڑکی!“ شہلا کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔

”بھالی بات اس کمرے سے باہر نکلی تو میں ساری عمر کسی سے نظر نہیں ملا پاؤں گا۔“ وہ شکستگی سے بولا تھا۔

”تم نے کچھ نہیں کیا نافع۔“ شہلا نے اسے تسلی دی۔

”شاید۔۔۔ یہی میرا قصور ہے۔ میں نے ابی سے کہا بھی تھا۔“ اس کی آنکھیں بے اختیار نم ہوئی تھیں۔

”انہوں نے یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے نافع! تم اسے اٹھاؤ میں گاڑی کی چابی ملائی ہوں۔“

”لیکن اس وقت کہاں جائیں گے؟“ وہ ہراساں ہوا۔ ”یہ تو پولیس کیس ہے!“

”ڈونٹ وری۔ میرے پروفیسر ہیں ڈاکٹر خالد، ان ہی کے کلینک لے کر چلتے ہیں اسے۔ جلدی کرو نافع دقت ہمارے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔“

نافع نے بے سدھ پڑی عریشہ کو کاندھے پر ڈال لیا۔ شہلا تیزی سے کمرے سے نکلی تھی۔

\*\*\*

صبح صادق ہو چلی تھی۔ شہلا بے حد تھکے تھکے سے انداز میں نافع کے سامنے آ بیٹھی۔ چہرے پر صدیوں کی تھکن لیے بیٹھا نافع چونکا پھر آنکھیں مسلنے لگا۔

”اسے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ تم اسے دیکھ سکتے ہو۔ ویسے ابھی ہوٹل تو نہیں آیا۔ لیکن خطرے سے باہر ہے۔“ شہلا آہستگی سے بولی تھی۔

نافع نے چند لمحے اسے دیکھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ شہلا کی ہراسی میں وہ بے ہوش، بے سدھ پڑی عریشہ کے پاس جا رہا تھا۔

”کچھ دیر میں ہوش آجائے گا۔“ شہلا نے تسلی دی تھی۔  
نافع نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ ایک گہری سانس ضرور اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔ ایک نرس ٹرے میں چائے کے دو کپ لیے چلی آئی۔

”ڈاکٹر خالد کہہ رہے ہیں وہ کچھ دیر میں آتے ہیں۔ آپ لوگ تب تک چائے پیئیں۔“ اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ انہیں اطلاع دی تھی۔ دونوں نے گرم گرم چائے کی شدید طلب کو محسوس کرتے ہوئے کپ اٹھالے تھے۔ ایک گھونٹ بھر کر شہلا نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”گھر والوں سے کیا کہنا ہے؟“  
جواب میں نافع نے سوالیہ نگاہیں اس کی جانب اٹھائیں۔  
”نوڈ پوائزنگ۔“ شہلا خود کو سہارا دینے کے لیے کھٹکھٹاری۔ ”نوڈ پوائزنگ ہو گئی ہے عریشہ کو یہ رات گئے۔“  
طبیعت خراب ہوئی تو ہم اسے یہاں لے آئے۔ ٹھیک ہے نا؟“  
”ہوں!“ وہ آہستگی سے بولا۔

”تم۔ تم پریشان مت ہو نافع۔“ شہلا نے اسے تسلی دینا چاہی۔ ہر چند کہ وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جو اس وقت اس کے دکھ اور شدید قسم کے تپش کا درماں بن سکیں۔  
”عریشہ عریشہ اچھی لڑکی ہے۔ اسے تھوڑی سی تو جھجھکی سی محبت ملے گی تو۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

نافع نے بے تاثر سپاٹ نظروں سے شہلا کی جانب دیکھا پھر چائے پیئے لگا۔  
”اور پھر اب تم ہی۔ اس سر پھری لڑکی کا پرہیز ہو نافع۔“ وہ نافع کی خاموشی سے قدرے خوف زدہ ہو گئی۔  
کچھ بھی تھا۔ عریشہ اس کی نند اس کے شوہر کی بہن اس کے بچنے والے کی عزت تھی۔  
”بے فکر رہیں شہلا بھالی!“ نافع نے کپ خالی کر کے میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہمارے گھر نے الگ الگ نہیں ہیں۔ ہم ایک خاندان کا حصہ ہیں۔ عریشہ صرف آپ کی نہیں میری بھی عزت ہے۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس کی تمام تر بے اعتنائی۔ بے توجہی اور بے نیازی کے باوجود میں اس سے محبت بھی کرتا ہوں۔ وہ محبت جو نکاح کے پاک بولوں سے دودلوں کے درمیان خود بخود سبزے کی مانند آگ آتی ہے۔ امن کا دل اگر بھر رہا تو شاید میری ناکامی ہے۔ میں اپنا قصور تسلیم کرتا ہوں۔“

شہلا نے بہت محبت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔  
”بہت کم لوگ تمہارے جیسے ہوتے ہیں نافع۔ ایسے وسیع القلب۔ اتنے باظرف۔ جیسے ٹھاٹھیں مارتا دریا ہو۔ تم ناکام ہو ہی نہیں سکتے۔ ایسا دریا تو صحرا میں پھول کھلا سکتا ہے۔ پورے کا پورا رنگ زار بنا سکتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ ایسے ہی رہو۔ اتنے کشادہ دل۔ ایسے ہی مہربان۔ باوصف۔ خدا تمہیں ہر موڑ پر سرفراز کرے۔“  
شہلا کے الفاظ جاودا اثر تھے۔ نافع کے چہرے پر بکھری اداسی اور آنکھوں میں بسی تنہائی کی جگہ بشاشت اور سکون نے لے لی۔

”تھینک یو بھالی!“ وہ ممنونیت سے بولا۔  
”یہ ڈرپ ختم ہو جائے تو ہم اسے گھر لے چلتے ہیں۔ اگلی ڈرپ میں اسے گھر پر ہی لگا دوں گی۔“

آج رات ثانیہ کا لمحہ ہے۔ کل ناعمد کا۔ پرسوں تمہارے دلیئے تک میں اسے بالکل فریش کر دوں گی۔“  
شہلا نے لمبے میں بے فکری اور بشاشت پیدا کرتے ہوئے است مزید ریلیکس کرنا چاہا۔ عریشہ کی بند پٹکوں کو دیکھتے ہوئے نافع نے سر ہلایا تھا۔

ازحد تھکے ہوئے انداز میں وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی ہی تھی کہ گال پر پڑنے والے زنانے وار تھپڑ نے اسے چند لمحوں کے لیے ماؤف سا کر دیا۔ اسے دیکھنے میں دشواری سی ہوئی۔ پیچھے دونوں کی بے تحاشا مصروفیت کے بعد رات بھر کی تھکان نے اسے بہت نڈھال کر ڈالا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سانسے دیکھا۔

”ہاشم!“ پھر اس کے لبوں سے نہایت حیرت اور افسوس کے ساتھ نکلا تھا۔ ”آئیے آپ نے۔ مجھ پر ہاتھ آٹکھوں میں سرخا اور وحشت کا جنگل لیے وہ چہرہ ہاشم کا چہرہ تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور سانسیر بے ترتیب تھیں۔

(ماہلک اس بار بھی قسط کا اختتام نہ کر سکیں اس کے لیے آپ سب سے معذرت۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ ”ریگ زارِ تنہا“ کی آخری قسط شائع ہوگی۔)

UrduPhoto.com

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی قیمت: 400 روپے
- ☆ ایمان امید اور محبت، عمیرہ احمد قیمت: 200 روپے
- ☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین قیمت: 350 روپے
- ☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 180 روپے
- ☆ امرتیل، عمیرہ احمد قیمت: 450 روپے

نوبل دست سہرا  
نوبل دست سہرا  
منسوب جلد  
آفٹ وی

شائع ہوئے ہیں

منکوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

”رات بھر اپنے بیدار رہنے والی بیوی اپنے شوہر سے کیا توقع کرتی ہے شہلا؟“ وہ پھرے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ ”وہ کون سا مقام تھا جہاں سے تمہاری آواز کا سننا بھی محال تھا؟“ شہلا ششدر رہ گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اسے دیکھنے لگی۔

”کہاں گئی تھیں؟“ اس نے دانت پیسے۔ ”جواب دیجئے۔ ابھی وہ پیرز میں نے سائن نہیں کیے ہیں شہلا احمد! جس کو لے کر تم آزاد ہو جانے کی خوشی میں سب ہی کچھ فراموش کر کے۔“

اس کے الفاظ اس کے لبوں میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ شہلا کسی زخمی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی تھی۔ ہاشم اس کے تھپڑوں کی بوچھاڑ سے گھبرا گیا۔

”کیا سمجھتے ہو۔ کیا سمجھتے ہو مجھے۔ آوارہ۔۔۔ بدکردار ہوں میں؟ اتنا کمزور جانا تم نے مجھے۔ بس اتنا ہی سمجھ پائے۔ یہ تھا تمہاری کھوکھلی محبت کا دعوا؟“ در دیوانی ہونے لگی تھی۔

”شہلا۔۔۔ شہلا! تمہا گل ہو گئی ہو۔“ ہاشم نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ شہلا اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اپنے ہاتھ چھڑوا کر اس نے کشن اٹھا کر اسے پار پر بٹھوایا۔

”تم سے محبت چاہتی رہی میں۔ تم سے۔۔۔ تمہارے جیسے کمزور ذاتیت کے انسان سے۔۔۔ جو رات بھر بیدار رہنے والی بیوی کی بد چلنی گردانتا ہے ہاشم! ہاشم! آئی دل کل یو۔“

ہاشم اس پھری شیرنی کو سنبھالنے کی کوشش میں بیدار رہا اور اپنے آگے ہولی شہلا اس کے سینے پر آگری۔ ”عریشہ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔“ شہلا گلوگیر لہجے میں بولی ”مجھے اور نافع کو اچانک ہی اسے ہسپتال لے جانا پڑا۔ میرا بیل بھی جلد بازی میں کمرے میں ہی رہ گیا۔ ابھی میں عریضہ کو اس کے کمرے تک پہنچا کر آ رہی ہوں۔“

مجھے یقین نہیں آ رہا ہاشم۔ کہ آپ بھی اپنے بے اعتبار ہو سکتے ہیں۔“ پھر اگلے ہی پل اس کے سینے پر سر رکھ کر زور زور سے رونے لگی تھی۔

رات بھر اپنے اعصاب سے جنگ لڑتا ہاشم شل ہو چکا تھا۔ شہلا کے گرد اپنے بازوؤں کو لپیٹے ہوئے وہ تھکے انداز میں سانس بھرنے لگا تھا۔

”شہلا! شہلا! مجھے معاف کرو۔ زندگی نگاہوں کے سامنے رو تھم کر جا رہی ہو تو بڑے سے بڑا ذی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ میں بھی تمہارے جانے کے تصور سے ہی دیوانہ ہو گیا۔“ مجھے تسلیم ہے شہلا! میں تم سے دور رہ کر نہیں جی پاؤں گا۔“

شہلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس لاوے کے بہہ نکلنے کی وہ کب سے منتظر تھی۔

”اور وہ پیرز۔۔۔ وہ کس بات کا اعتراف ہیں؟“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”اسی محبت کا؟“ ہاشم پچھو دیر اس کی نظروں میں دیکھتا رہا پھر اس نے انگلی کی پور سے اس کے آنسو پوچھے۔

”کہاں گئے وہ پیرز؟ وہ تم نے ہی اٹھائے ہیں؟“

”جلائیے تھے میں نے۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”ان کا خوف مجھے رات کو سونے نہیں دیتا تھا!“

ہاشم نے ساختہ ہنسا تھا۔ اس کی شفاف ہنسی میں زندگی کی بھرپور حرارت جی اٹھنے کا مکمل احساس تھا۔

”صدر شکر۔“ وہ تشکر سے بولا۔

”کیوں دینا چاہتے تھے مجھے یہ سزا؟“ شہلا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظروں میں اب تک شکایت تھی۔ بے یقینی تھی۔

”شہلا! شہلا! میں گمراہ کیا گیا تھا۔ لیکن آج تمہارے اس انداز نے بدگمانی کا ذرہ ذرہ میرے دل کی تنوں سے پھونک نکالا ہے۔ یہ انداز محبت کا ہے سراسر محبت۔“

شہلا چند لمحے اس کی نظروں میں دیکھتی رہی۔ ساری بات سمجھ میں آ رہی تھی۔

”ہاشم۔۔۔ وہ محض ایک پرچھائیں ہے۔ میں سمجھتی تھی تمہارے جیسا مضبوط شخص کبھی بھی ایک پرچھائیں سے خوف زدہ نہ ہو گا۔ یہ یقین تم نے میرے خوف زدہ دل کو اپنی محبت سے اپنے اعتماد سے بخشا تھا۔“

ہاشم شرمسار تھا۔ شہلا کی نظروں میں دیکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

”آئی ایم سوری۔ لیکن جانو محبت جواب میں محبت اور اعتبار جواب میں اعتبار مانگتا ہے۔۔۔ صحرا میں جیتے رہنے کے لیے ایک نخلستان بھی درکار ہوتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں ہاشم۔“ شہلا اپنے آپ میں لوٹ چکی تھی۔ آہستگی سے بولی۔ ”آپ کے گریز کے دور میں جیتے ہوئے مجھے اپنی سب ہی خامیوں کا ادراک ہو چکا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ہمراہی کے اس عرصے میں میں نے کئی مقام پر آپ کو مایوس کیا ہے۔“

پھر اس نے ہاشم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

”لیکن ہاشم۔۔۔! اب اس بات کا یقین کر لیں کہ آپ تک آنے والی راہ میں نے کسی لالچ، کسی دھوکے کی آڑ لے کر پار نہیں کی تھی۔“

میرے ہاتھ ساتھ محض اعتبار تھا۔ آپ کے خلوص کا اعتبار۔ زندگی کو نئے سرے سے رکھنے کا اعتبار۔ ہاشم! میں نے کبھی بھی خود کو اتنا اڑا نہیں سنبھالا کہ ایک مرتبہ جہاں سے سر جھکا کر نکلی وہاں پھر وہی جھکا ہوا سر لے کر واپس جاؤں۔ اس شخص نے جس تنفر، غرور اور بے نیازی سے مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا اس کے بعد اس کی سمت کو جاتے تمام رستے ہمیشہ کے لیے اندھے ہو گئے تھے ہمیشہ کے لیے۔ میں نے کبھی پلٹ کر ان رستوں کو پہچاننے کی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ عمر کی محبت بھی مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہ کر سکی۔“

مجھے وہ وقت ہمیشہ یاد رہے گا جب اس نے اطلاق نامہ بھیج کر مجھے میرے محبت کرنے والے ماں باپ اور بہن بھائی کے سامنے ہمیشہ کے لیے شرمسار اور بے ہول کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس پلٹنے کے سبب جواز ہوں۔ میرے پاس ایک بھی نہیں۔ مجھے آپ کی محبت، خلوص اور احترام کی جو گھنی چھاؤں ملی ہے۔ اس سے میں مر کر بھی دستبردار ہونا نہ چاہوں گی۔ مرنے کے بعد اگر خدا نے مجھے جنت عطا کی تو۔“

ہاشم لب بستہ حیران یک تک اسے دیکھ رہا تھا۔

”تو میں وہاں بھی آپ جیسے شخص کا ساتھ چاہوں گی ہاشم!“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”یہ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی اگر آپ مجھے خود سے دور کرنا چاہتے ہیں تو۔“

”شہلا۔۔۔“ ہاشم نے بے خود ہو کر اسے سینے سے لگایا تھا۔ ”کچھ مت کہو بس اب ایک لفظ بھی نہیں۔ یہ سب کچھ تم پہلے ایک بار بھی کہہ دیتیں تو میں قیامت تک تم سے بدگمان نہ ہوتا۔ محبت لفظوں کی محتاج تو نہیں ہوتی لیکن لفظ اندیشوں اور بدگمانیوں کے قائل ضرور ہوتے ہیں۔ اس لیے کم از کم ایک مرتبہ تو کسی کو اپنے لفظوں کی بارش سے سیراب کرنا ہی ہوتا ہے۔ آج تم نے میری زندگی بھر کی پیاس کو اس طرح سیراب کر دیا ہے کہ قیامت مجھے اپنی مٹی سے اس کی خوشبو آتی رہے گی۔“

شہلا نے اس کے کاندھے سے سر نکا کر سکون و طمانیت کے احساس سے سرشار ہو کر آنکھیں موندی تھیں۔

”اب شیطان کوئی سارو پ بدل کر آئے۔ میں اسے پہچان لوں گا۔“ ہاشم مزید بولا تھا۔ ”ہمیں ساتھ ساتھ رہنا ہے شہلا۔ جنت میں بھی!“

شہلا کی ہر ہنسی نے کمرے کا ماحول مزید خوشگوار کر دیا تھا۔

سب لوگ اس کے ارد گرد جمع تھے۔ سب ہی کے چہروں پر فکر مندی تھی۔

”میری بچی پوری رات ہسپتال میں گزار آئی اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ ذرا چہرہ دیکھو کیسا زرد ہو رہا ہے۔ جیسے مردہ قبر سے نکلا ہو۔ ایسا بھی کیا ہو گیا تھا آخر۔“

فردوس بیگم نے عریشہ کو خوب پیار کرنے کے بعد نافع کو دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں ہی نہیں لہجے تک میں شکایت تھی۔

نافع نے نگاہیں چرائیں۔ وہ قدرے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے، سینے پر بازو لپیٹے کھڑا تھا۔

”جو اس نے کھایا، وہی کھانا سب نے کھایا۔ پھر اسی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ کیا تم نے اسے کچھ اور کھلایا تھا؟“

انہوں نے سب ہی افراد کے سامنے نافع سے مزید جرح کی۔ عریشہ نے بے چین سی ہو کر ماں کی جانب دیکھا۔

”میں نے کچھ نہیں کھلایا تھا! نہیں۔“ نافع سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”آپ ان ہی سے پوچھ دیجیے!“

”کیسی باتیں کرتی ہو ہو۔“ شفیقہ حیات قدرے برا مان کر بولی تھیں ”بچہ کیا نئی دِل سن گوز ہر کھلا دے گا؟ کچھ کھلایا بھی ہو گا تو شوق سے اچھا ہی کھلایا ہو گا۔“

کچھ لوگ مسکرا دیے تھے۔ کچھ ہنس پڑے۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ شہلا اس کو ڈرید گارہی تھی، مسکراتے ہوئے بولی۔ ”فوز پواز تنگ ضروری نہیں کہ سب ہی کو ہو۔ کسی شخص کو ایک چیز سوٹ کرتی ہے وہ سب سے کوئی نہیں کرتی۔ پواز تنگ کر دیتی ہے۔ ایسا ہی عریشہ کے ساتھ ہو گیا۔“

ماہین نے ماں کا ہاتھ دبا کر انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

عریشہ کی نگاہیں بے اختیار نافع کی سمت اٹھی تھیں۔ وہ اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر عریشہ کے اعصاب میں جھنجھٹا ہٹ سی دوڑ گئی۔ نافع کی بے اثر سپاٹ نگاہوں میں کون سے خوابوں کی جذباتی لکڑیاں لٹکتی تھیں۔ وہ سب کچھ نہ پانی کی آہٹ کی ڈرپ کی سوئی چبھنے تک کا احساس نہ ہو سکا۔

”میرا خیال ہے ہم سب لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ عریشہ نے ایک اہم امر کی جانب سب کو متوجہ کیا تھا۔ ”عریشہ بھی آرام کر لے گی اور نافع بھی!“

”بالکل ٹھیک۔“ ماہین نے تائید کی۔

فردوس بیگم نے پھر عریشہ پر بوسوں کی بوچھاڑ کی اور بمشکل خود کو سنبھال کر کھڑکی پر بیٹھ گئیں۔

پھر سب ہی عریشہ کو پیار کر کے باہر نکلے تھے۔ آخر میں نافع بھی باہر کی سمت بڑھا تو شہلا نے اسے نظروں سے گزرنے میں کچھ سمجھانا چاہا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

\*\*\*

دونوں کے مابین گھنی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ عریشہ نے چند ایک مرتبہ چور نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا لیکن نافع ذرا بھی متوجہ نہ تھا۔ اس کے بیڈ کے قریب بڑی کرسی پر بیٹھا وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ عریشہ کے لیے جیسے وہ ایک اجنبی تھا۔ یہ وہ نافع نہ تھا جو اس کا کزن تھا۔ جس کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلے کم اور لڑی زیادہ تھی جو اس کی شکایتیں ہاشم سے کیا کرتا تھا۔ نا تجربہ کار نا بیختہ کا۔ وہ نافع نجانے کہاں کھو گیا تھا۔ یہ سنجیدہ اور باشعور شخص تو کوئی اور تھا۔

”میری جان بچا لینے کے لیے شکریہ!“ وہ آہستگی سے بولی۔

نافع نے نظروں کا زاویہ موڑ کر اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھا رہا۔

”جان دینے اور لینے کا اختیار اللہ کے پاس ہے۔ اس کا شکر ادا کرو۔ اس نے تمہیں حرام موت سے بچا لیا۔“

عریشہ سے چند لمحوں کے لیے بولنا نہ جاسکا۔ وہ لفظ بہ لفظ درست کہہ رہا تھا۔

”پھر بھی۔“ وہ بولی۔ ”جان بچانے کا نہ کسی۔ پروں رکھ لینے کا شکریہ!“

”یہ میرا فرض تھا۔“ وہ پھر بولا۔ ”تم میری بیوی ہو۔ تمہاری عزت سے میری عزت۔ تمہاری بے عزتی سے میری بے عزتی ہے۔“

بہت عرصے کے بعد عریشہ کی پلکیں نم ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے اندر کچھ جاگتا ہوا محسوس کیا۔ اسے لگا وہ کسی اپنے کے پاس بیٹھی ہے۔ اسے لگا وہ سب سے اپنے کے پاس بیٹھی ہے۔ ایسا اپنا اب تک کوئی نہ بنا تھا۔ دل رکنے کی ایسی کوشش بھی کسی نے نہ کی تھی۔

”نافع۔!“ وہ آہستہ سے بولی۔

نافع نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”تم۔ پوچھو گے نہیں۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟“

”نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”میں نے پوچھنا نہیں چاہا۔“

اب کے وہ جو بچی تھی۔

”ایسا پوچھنے میں مجھے اپنی انسلٹ فیل ہوتی ہے اور میں ایسا بھی نہیں چاہتا!“ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔

”تم آرام کرو۔ اگر بہتر محسوس کرو تو شام کو ٹائیٹل کے ولیمہ میں شرکت کے لیے تیار ہو جانا!“

”ہاں!“ اس نے گم حسم سے انداز میں سر ہلایا۔

نافع کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ عریشہ کی نظروں نے وہ دروازے کے بند ہونے تک اسے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ کی پشت میں پوست سولی کو دیکھا۔ جس میں سے قطرہ قطرہ نکلتی زندگی اس کی رگ جاں میں اتر رہی تھی۔ آتش فشاں کے پھٹ جانے کے بعد دھواں اٹھتی چوٹی اب خاموش پڑی تھی۔ جسم و جاں میں سب کچھ ساکن تھا۔ شور و گماہ سرد ہو چکا تھا۔ بس، پچھتاوے کا ایک لہر احساس تھا جو سوچ میں پوست تھا پچھائیں کی طرح۔

”کیوں کر رہی تھی میں ایسا۔“ کیوں؟ ایسے سدھ ہونے سے لے کر ہوش میں آنے تک وہ بارہا خود سے پوچھ چکی تھی۔ اس وقت جب بغضیں ڈوب رہی تھیں۔ ذہن گہری غیند میں جانے لگا تھا۔ ہاتھ بیربے جاں ہونے سے تھے۔ عریشہ نے زندگی کو پورے احساس کے ساتھ جانا تھا۔ زندگی جو حرارت ہے، حرکت ہے، تڑپ ہے، خوب صورتی ہے اس زندگی کو وہ یوں ٹھکرا رہی تھی تو کس لیے؟

اس کے لیے جو اس کی نظروں کی سامنے کسی اور کا بنا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ پوری شان اور طمطراق کے ساتھ، خوشیوں کے ساتھ، مسکراہٹ کے ساتھ۔ پچھتاوے یا تاسف کی ایک شکن کے بغیر!

نافع سے انتقام کے لیے؟ نافع جو اپنی زندگی کی خوشیوں کی قسم کھا کر کہتی تھی، اس نے جو کچھ بھی کیا عریشہ کی عزت کے لیے کیا اور حالات و واقعات اس کے لیے کی پوری تائید بھی کرتے تھے۔

اپنے ماں باپ سے انتقام کے لیے؟ جن کے لیے گئے فیصلے کی بدولت وہ ایک ایسے شخص کی پناہ میں چلی آئی تھی جو اس کی سنگین غلطی کو بھی اپنے سر لے کر پورے خاندان کے سامنے اس کی ڈھال بن کر کھڑا تھا۔

کیوں اس نے زندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ کیوں اس نے اپنے لبوں کو مسکراہٹ سے لاد رہنے کی سزا سنائی تھی کیوں اس نے ایک زندہ حرارت سے بھرپور وجود کو مردنی اور بے دلی کے کفن میں پٹ کر تنہائی اور خوشحالی کی قبر میں دفن ڈالا تھا۔



کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟  
اسے اندر سے اٹھتی ٹکرا کر عرشہ نے سر تکیے پر ڈال دیا۔ پھر اس نے بے تابی سے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں خاموشی تھی۔ اب اسے صرف اس خاموشی کے ٹوٹنے کا انتظار تھا۔

\*\*\*

”ربیعہ بیٹی! اب کیسی طبیعت ہے؟“ اس کی آنکھ کھلی تو منہ بند بیگم اس کے اوپر جھکی ہوئی تھیں ربیعہ چند لمحے ان کا مہراں چہرہ محبت بھری نظریں اور خوب صورت مسکان کو دیکھتی رہی پھر رشتہ سے مسکرا دی۔  
”میں بالکل ٹھیک ہوں امی جی!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یہ لو۔ چائے پی لو۔“ انہوں نے اسے چائے کی پیالی پکڑائی۔  
”آپ نے تکلیف کیوں کی امی جی!“ وہ شرمندہ ہوئی۔ ”آپ کی خدمت کرنا میرا کام ہے بجائے اس کے۔“  
”بس خاموش رہو۔“ انہوں نے محبت سے اسے ڈانٹا۔ ”کبھی کبھی خدمت کروا بھی لیا کرو۔“  
ربیعہ مسکراتے ہوئے چائے پیئے گئی۔

”ربیعہ۔۔۔ میری جان!“ انہوں نے اس کے بال سنوارے تم مجھے پریشان ہی لگتیں۔ کیا بات ہوئی؟ کوئی مسئلہ ہے تو اپنی ماں کو بتاؤ۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے امی جی۔!“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”بلکہ میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی آپ سے۔“  
اس نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا پھر قدرے جھینپ کر پھر سے سر جھکا لیا۔

”آپ۔۔۔ امیر حسن کے لیے پوچھ رہی تھیں؟“  
”مگر تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہوگی ربیعہ!“ منہ بند بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”لیکن اس وقت سے جڑی ایک حقیقت بھی ہے جو میں نہیں۔۔۔ بتانا چاہتی ہوں۔۔۔ وہ سن لو پھر پوچھا جائے فیصلہ کرو۔ تمہاری ماں ہر صورت تمہارے ساتھ ہے!“

”کیسی حقیقت!“ ربیعہ حیران ہوئی۔  
منہ بند بیگم چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ وہ تذبذب کا شکار لگتی تھیں۔  
”ربیعہ۔۔۔!“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”میں جانتی ہوں قدرت نے میرے لیے جو فیصلہ کر دیا ہے۔۔۔ میں اب چندا سے زیادہ نہیں جی پاؤں گی۔“

ربیعہ نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھامے۔  
”امی جی!“

”ماں میری جان۔! میں جانتی ہوں مجھے کینسر ہے۔“ ان کی آنکھیں ڈبڈبائیں گئیں۔ ”لیکن مجھے اپنے اللہ سے کوئی شکوہ نہیں۔۔۔ جو اس کی رضا اس نے میرے دل کی سب ہی مرادوں کو یوں پورا کیا ہے کہ دل میں کسی حسرت کا پرچھاواں تک نہیں۔ مجھے اپنے بیٹی مل گئی۔ میں نے جی بھر کر اپنی ممتا کو سیراب کیا۔ چھپے اپنی بے گناہی ثابت ہونے کی نوید ملی۔۔۔ میں اپنے رب کی آزمائشوں میں سرخرو ہوئی۔۔۔ ایک گناہ گار انسان اور کیا چاہ سکتا ہے اس کے سوا؟“

ربیعہ نے اپنا سر ان کے کاندھے پر رکھ دیا۔  
”میں تمہاری محبت سے سیراب ہوں ربیعہ! اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تمہارا باپ بھی اپنی بیٹی کی محبت اور خدمت کے ذائقے سے روشناس ہو سکے۔ اسے تمہاری ضرورت ہے!“

ربیعہ نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اٹھایا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔  
”ہاں ربیعہ! احمد جہاں زیب تمہارے والد بقید حیات ہیں۔“ ”شہریار احمد تمہارا بھائی اور امیر حسن تمہارا کزن ہے۔“

”امی جی۔۔۔!“ ربیعہ کے لبوں سے بمشکل نکلا تھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔“  
”یہ سچ ہے بیٹی۔!“ وہ بھیگی ہلکوں کو جھپکتے ہوئے بولیں۔ ”شہریار احمد تمہارا سویتلا بھائی ہے۔۔۔ تمہارے والد نے باہر جا کر اس کی ماں سے شادی کر لی تھی لیکن انہیں سکون نہ مل سکا۔۔۔ وہ ساری عمر اپنے غلط فیصلے پر پشیمان اندر ہی اندر گھلتے رہے ہیں۔۔۔“

حیرانی کے سمندر میں ڈوبی ربیعہ یک ٹک انہیں دیکھ رہی تھی۔  
”تمہارے والد پیر الا زہیں بیٹی۔! ان کی دیکھ بھال کے لیے محض نرسوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ وہ ساری عمر اپنے حقیقی رشتوں سے دور کس طرح تڑپے ہوں گے۔۔۔ کتنا ترسے ہوں گے۔۔۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں ان کی سزائیں کچھ تخفیف ہوں ان کی اپنی بیٹی ان سے مل پائے ان کی خدمت کر سکے۔ ان کے ساتھ کچھ حرکتیں بیٹا پائے۔۔۔ اگر تم امیر حسن کا ہاتھ تھامنے پر راضی ہو سکو تو ایسا ممکن ہے۔“  
ان کی نگاہوں میں التجا بھی ابھی ابھی رہی تھی۔

”میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“ وہ یکایک ان سے لپٹ گئی ”کبھی نہیں۔“  
”میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گی بیٹی!“ انہوں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ ایک التجا ہے۔ تمہارے والد کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”میرے والد۔۔۔ جنہیں یہ تک علم نہیں۔۔۔ کہ میں ہوں۔“ وہ دکھ سے بولی۔ ”وہ ایک اچھے انسان ہیں بیٹی۔! ان کی طرف سے بدگمانی نہ ہو۔“ منہ بند بیگم نے اس کے ہاتھ میں دکھ بول رہے تھے ”تمہیں ان سے ضرور ہی ملنا چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ تمہیں دیکھ سکیں۔ اپنے اپنے سے لگائیں۔۔۔ تمہیں ایک باپ کی طرح پیار کریں۔۔۔“  
”امی جی! امی جی۔“ ربیعہ ان سے لپٹ کر بھونٹ پھوٹ کر رو دی۔ ”میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”میں آپ کو۔۔۔“  
منہ بند بیگم دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ چھپک رہی تھیں۔

\*\*\*

”نئی فرمائش جو سبوں میں ایک جاوٹی اثر تھا اراغ نے مشام جاں کو معطر ہوتا محسوس کیا۔ پھر اس نے دس بجاتی غزلی کی سونیوں کو دیکھا۔“

رنگ دیو سے سچی اس محفل میں بہت سے چہرے تھے۔ لیکن نظریں جس چہرے کو دیکھنے کی متنی تھیں وہ اب تک دکھائی نہ دیا تھا۔

آن فرزا اور ناعمد کی تقریب ولیمہ تھی۔ اسٹیج پر بیٹھے دولہا، دولہن کے چہرے حقیقی خوشی کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ ان کے انداز میں ایک دوسرے کے لیے چاہت اور الفت تھی۔ ان دونوں کو خوش و خرم دیکھ کر کئی نازک فکر اور طمانیت کا بھرپور احساس ہوا تھا۔

راجہ بیگم رائے اور درویش ناعمد کو ہنستا مسکراتا اور مطمئن پا کر اراغ خوش تھیں۔  
دخانہ بیگم بیٹے اور بہو کو آپس میں ملتفتیا کر شاداں و فرجاں تھیں۔

تقریب میں جگمگاتے چہروں کے درمیان ایک مسکراتا چہرہ اسٹیج کی جانب رواں دواں تھا۔ گولڈن بنارسی ساڑھی زیب تن کیے 'بھاری زیورات پہنے عریشہ نے جب دولہا، دولہن کو مبارکباد دی تو وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھنے بنارہ نہ پائے۔

”عریشہ! ناعم نے بے ساختہ مسرت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ ”کیسی ہو تم؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

ایک عرصے بعد ناعم نے اس کی آنکھ کے کاجل کو مسکراتے دیکھا تھا۔ اسے اپنی دعا کی مقبولیت کا احساس ہوا تو اس کا رواں دواں خداے پاک کا شکر بجالانے لگا۔

”خوش ہوتا تم؟“ ناعم نے غلٹ بھرے انداز میں تصدیق چاہی۔

”الحمد للہ... میں بہت مطمئن اور خوش ہوں ناعم!“

اس نے ذرا کی ذرا فراز کی جانب دیکھا جو اس کی سمت دیکھنے سے گریزاں، قدرے شرمندہ سا نظر آتا تھا۔ ”اس دنیا میں زیادہ تر لوگ ایک مرتبہ جیتے اور ایک مرتبہ مرتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر ان کا خدا کچھ زیادہ ہی مہربان ہوتا ہے۔ انہیں سیدھی راہ چلانا چاہتا ہے۔ انہیں بے چین نہ دیتا۔ پھر بھی وہ اگر بھٹکیں تو انہیں ہدایت دے کر پھر سے سیدھی راہ پہ لے آتا ہے۔ میں اب بھی خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہوں۔“

ناعم حیرانی سے آنکھیں کھولے ایک ٹک اس کا جگمگاتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”نافع؟“ پھر اس نے استفسار کیا ”نافع کہاں ہے؟“

عریشہ کا چہرہ نافع کے نام پر جس طرح کھلا تھا اس نے ناعم کو مزید حیرت میں غرق کیا۔

”آئے تو ہیں۔“ وہ قدرے شرما کر بولی۔ ”شاید دوستوں، غمخواروں کو اپنی ادبیات دے رہے ہیں۔“ ناعم ہنس پڑی۔ تو عریشہ نے چونک کر دیکھا۔ نافع اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ نافع اور فراز آپس میں ملنے لگے۔ عریشہ شفق رنگ چہرے کے روپس مڑ گئی تھی۔

تقریب اب اختتام پذیر تھی۔ انتظار کرتا نافع اب قدرے مایوس ہو چلا تھا۔ اس کے انداز کی تمام شکستگی اور دلکشی ماند پڑ گئی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ غلطی پر تھا۔ عبادت تو تقریب میں موجود تھا۔ بیچہ کو اگر آتا ہوتا تو وہ عباد کے ساتھ ہی آتی نہ کہ بعد میں۔ اس نے اپنی حماقت پر خود کو سرزنش کی۔

”ہم بھی آدمی تھے کام کے۔“ بڑبڑاتے ہوئے وہ مڑائی تھا کہ ہاشم کے مقابل آگیا۔

ہاشم کے لبوں پر ناقابل فہم سی مسکراہٹ تھی۔ سنجیدہ، نرم، قدرے افسردگی کو ظاہر کرتی مسکراہٹ۔ رافع کو محسوس ہوا جیسے وہ مسکراہٹ رافع کے لیے ہی تھی۔

”کسے ڈھونڈ رہے ہو؟“ ہاشم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”قسمت کو!“ اس نے جیسے آہ بھری۔

”وہ کھڑی ہے!“ ہاشم نے اشارہ کیا۔

رافع نے غلٹ اور حیرانی سے اس سمت دیکھا پھر فوراً ہی اس کے تاثرات تبدیل ہوئے تھے۔ ہاشم نے جہاں اشارہ کیا تھا؟ وہاں درود کھڑی تھی۔

رافع نے جیسے قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا ہاتھ کاندھے سے ہٹایا تھا۔

”تیرا دوست ہوں یا۔!“ ہاشم نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

”نہیں۔۔۔ ستم ظریف ہو!“ وہ ایک سمت کو برہم گیا۔

ہاشم اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ پھر سے اس کے کاندھے پر رکھ لیا تھا۔

”رافع...! میری جان قسمت سے منہ نہیں پھیرتے۔ برا مان جاتی ہے اور جو ستارہ قسمت کے ستارے سے دور کہیں چمکتا ہو۔ اس سے روشنی نہیں ہاتھ آتی۔ اس کی روشنی کسی اور کے لیے ہوتی ہے۔“

رافع اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ پھر اس نے ہاشم کی جانب رخ کیا اور چند لمحے اس کی مہربان اور پر خلوص نظروں میں دیکھتا رہا۔

”ہاشم۔!“ وہ یوں بولا جیسے خود سے بھی خوفزدہ ہو۔

”ہاں۔۔۔ بولو!“

”کیا وہ... کسی اور کے لیے ہے؟“ اس کے لہجے میں انتہائی بے یقینی تھی۔

”ہاں!“ ہاشم سپاٹ ہے انداز میں بولا۔

رافع کا چہرہ تیزی سے تاریک پڑا تو ہاشم کی آنکھوں میں رحم در آیا۔

”میں نہیں مانتا۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”کل شام ربیعہ کا نکاح ہے۔ اس کے گزرنے پر حسن کے ساتھ! میں اور شہلا ابھی وہیں سے آرہے ہیں جہاں ساری تفصیلات طے کی جا رہی تھیں۔ وہ کسی اور کا ستارہ ہے رافع۔ اسی کے نام ہونے جا رہا ہے۔“

رافع کو یوں لگا جیسے وہ اس دنیا سے بہت دور ہے۔ سویرے سے ہزاروں کلاکھوں میل دور ہے۔ کسی اندھیرے، سرد، نا معلوم حصار کے پیچھے کھڑا ہے۔ اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ کچھ بھائی نہ پڑتا تھا۔ وہ خلا میں تھا یا اس کے قدموں تلے زمین ابھی اسی کی آغوش میں تھی۔ بے وزنی اور بے بسی کی اس کیفیت میں وہ کتنی دیر مبتلا رہا، اسے علم نہ تھا۔ ہاشم مزید کیا کہہ رہا تھا اسے علم نہ تھا۔

ہاشم جو اسے مزید تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا، خاموش ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ محض ایک بت سے غائب ہے۔ اس کا سب سے پیارا دوست اور گزرنے اس کے سامنے نہیں ہے اس کے سامنے صرف اس کی صورت کا ایک بت ہے۔

ہاشم نے خود کو ایک بے رحم، مڑجھن محسوس کیا جو مریض کوئی زندگی دینے کے لیے سفاکی سے اس کا سینہ چاک کرتا ہے اور دل نکال کر باہر رکھ دیتا ہے جو خود پر ایک شیشی بے جسی صرف اس لیے طاری کرتا ہے کہ اس کے سارے نرم احساسات اور جذبات دور بیٹھے اس دل کی صحت یابی کا وظیفہ بڑھ رہے ہوتے ہیں۔

ساری دنیا نجانے کیا کر رہی تھی؟ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے! پھر کیا ایک بے جان بت میں جان لوٹی۔۔۔ رافع اچانک مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس سے دور جانے لگا۔

ہاشم نے اسے پکارا نہیں۔ اس کے لب آپس میں پیوست تھے۔ اس نے اپنا کام کر دیا تھا۔ نیابل کتنی دیر بعد دھڑکنے شروع کرتا ہے۔ اسے اس کا انتظار تھا۔

\*\*\*

کارپورج میں کھڑی کر کے وہ تیزی سے چلتا ہوا اندر آیا تھا۔ اپنے پورشن کی سمت بڑھتے ہوئے یکایک اس کے قدم ٹھکے تھے۔

”حیات دلا“ کے درودیوار ہنوز رنگ برنگ روشنیوں سے سجے ہوئے تھے۔ رات کے اس پہر، خالی عمارت

روشنیوں میں گھر کر بھی ایک اداسی کا شکار لگتی تھی۔ تقریبات ختم ہو جانے کے احساس کے ساتھ تھکی تھکی سی عمارت۔ رافع کو یاد آیا۔ چند دن قبل مندی کی تقریب میں وہ اور ربیعہ اسی جگہ ٹھہر گئے تھے! ربیعہ نے آگے بڑھنا چاہا تھا مگر اس کے قدم اس کے دل کے تابع ہو گئے تھے۔ انہوں نے داغ کا کھانا منے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دل جو اس کے قدموں سے ضدی بننے کی مانند لپٹ گیا تھا۔ وہ دل جو اس کی آنکھوں کی روشنی میں کسی ہیرے کی مانند آشکار ہوا تھا۔ وہ دل جو اس کی نرم، شرمیلیں مسکراہٹ کے گوشوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ دل۔ کیسے بدل گیا؟ اس دل نے کسی اور نام پر سر تسلیم خم کیسے کیا؟ رافع تو یہ کوشش کر کر کے بری طرح ہار چکا تھا۔ کچھ دیر اس نظروں سے سارا منظر دیکھ کر وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا اندر چلا آیا جہاں صرف ایک ملازمہ سب گھر والوں کا انتظار کر رہی تھی۔ رافع کو دیکھ کر وہ کچن میں چلی گئی۔ رافع اپنے کمرے میں آکر ٹیلی فون پر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری جانب سے غالباً "انہو نے فون اٹھایا تھا۔"

"ہیلو۔"

رافع چند لمحے تذبذب کا شکار ہوا پھر بولا۔

"میں۔۔۔ ربیعہ سے بات کر سکتا ہوں؟"

"ربیعہ سے؟" انہو کے انداز میں قدرے حیرت دور آئی۔ "جسٹ ہولڈ آن پلیز!" پھر وہ بولی تھی۔

رافع خاموشی سے کھڑا سامنے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھتا رہا جہاں سورج غروب ہونے کا منظر اداسی پھیلا رہا تھا۔

اپنے کمرے کی دیوار پر لگی یہ تصویر اسے پہلے کبھی اتنی اداس نہیں لگی تھی۔

"ہیلو۔" چند ہی لمحوں میں اس کی مترنم آواز سنائی دی تھی۔

"رافع!" وہ آہستگی سے بولا۔

دوسری جانب چند ہی لمحوں کی خاموشی چھائی تھی۔ اسے کچھ ہی لمحوں کے اندر ہی پلٹ کر دیکھنا پڑا۔

"کیسے ہیں رافع آپ؟"

"آپ۔۔۔ آج تقریب میں نہیں آئیں؟" وہ آہستگی سے بولا۔

"جی۔۔۔ امی کی وجہ سے میں اور انہو گھر پہ ٹھہر گئے۔"

"سنائے۔۔۔ کل آپ کے گھر بھی ایک تقریب ہے۔" رافع نے خود پر از حد جبر کیا تھا۔

ربیعہ کافی دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

"جی!" پھر اس نے آہستگی سے کہا۔ "اور میں چاہتی ہوں۔۔۔ آپ اور وہ بھی شریک ہوں اس تقریب میں۔"

رافع نے اپنی آنکھوں میں تیزی سے ابھرتی نمی کو محسوس کیا۔ پھر وہی نمی اس کے حلق میں اترنے لگی۔

"وردہ تو آپ کی دوست ہے۔۔۔ میں کس ناتے؟"

"آپ۔۔۔ وردہ کے منگیتر ہیں!"

"اوردہ۔۔۔ آئی سی۔۔۔ آپ مجھے وردہ کے منگیتر کی حیثیت سے انوائٹ کر رہی ہیں۔" رافع نے اپنی ذات کے حوا

میں جیسے دکھ اور تاسف کے بلوے اٹھتے دیکھے۔

"ربیعہ۔۔۔ آپ کو دیکھ کر بالکل احساس نہیں ہوتا۔ کہ آپ اس قدر ظالم ہیں۔" وہ ٹوٹ کر بولا۔

وہ دھیرے سے ہنس دی۔ رافع نے اپنے کان کے اس قدر قریب اس کی مدھر ہنسی کو پہلی بار سنا اور شاید

آخری بار۔۔۔ باوجود شدید ضبط کے اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

"رافع۔۔۔ آپ حقیقت پسندی کو ظلم کے نام دے لیں تو میں ظالم ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں افسانے

حقیقت دونوں کو برتا ہے رافع۔! حقیقت کی جانب آپ بیٹھ کر لیں گے تو وہ گھوم کر پھر سے آپ کے سامنے چلی آئے گی۔ سو آگے بڑھ کر اس کا مقابلہ کرنا ہی عقل مندی ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں صرف محبتیں ہی دیکھی ہیں۔ ابھی آپ کو نفرت سے واسطہ نہیں پڑا اور میں چاہتی ہوں کہ زندگی میں کبھی آپ کو نفرت سے واسطہ نہ پڑے جو آپ سے محبت کرتے ہیں وہ ہمیشہ آپ کی محبت میں مبتلا رہیں۔ تاہم۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں محبتیں بھی دیکھی ہیں اور نفرتیں بھی۔۔۔ نفرتیں وہ سوئیاں ہوتی ہیں رافع۔! جو ایک جیتے جاگتے جسم کو برسوں کے لیے ملا دیتی ہیں اور یہ سوئیاں نکلنے کا انتظار بہت طویل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں۔۔۔ میں جینا چاہتی ہوں مسکراتا چاہتی ہوں۔ مسکراہٹیں میں نے بہت مشکلوں سے حاصل کی ہیں رافع! میں کسی قیمت پر ان کا سودا نہیں کر سکتی!"

وہ بول بول کر تھک سی گئی۔ اتنا بولنا اس کی سرشت نہ تھی۔ وہ بہت کم گو تھی! رافع کم صم سی کیفیت کا شکار تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔

"وردہ! میری زندگی بھر سے۔۔۔ پھر وہ آہستگی سے بولی تھی۔ "اس لیے میرے بلائے پر وہ کل ضرور آئے گی۔"

نہ! آپ نجانے آئیں گے یا نہیں۔" پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

رافع چند لمحے اسی طرح ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا پھر ریسیور کان سے ہٹا کر اس نے لیوں پہ عجیب سی

مسکراہٹ لیے اسے دیکھا تھا۔

"آؤں گا۔" وہ برسرِ پایا۔ "تم پکارو گی۔ تو دنیا سے آخری کونے پر بھی چلا آؤں گا۔ بے شک۔۔۔ تم نے

میں الوداع کہنے کو ہی پکارا ہوا!"

UrduPhoto.com

وہ جلدی جلدی ہاتھوں میں چوڑیاں ڈال رہی تھی۔ ماہین نے کمرے میں جھانکا تو حیران رہ گئی۔

"بھائی۔! وہ اندر چلی آئی!" بھی تو صرف پانچ بجے ہیں۔"

اس نے شہلا کی تیاری پر اپنی حیرانی ظاہر کی تھی۔ شہلا چونکی پھر ہنس دی۔

"جانتی ہوں ابھی صرف پانچ بجے ہیں اور تقریب دیر سے رات کے نوبت ہے۔ لیکن میں ابھی تقریب نکاح

کے لیے تیار ہوئی ہوں۔"

"کس کا نکاح؟"

"میری بہن! یہ تو یہی نکاح ہے آج۔ سادگی کے ساتھ۔ صرف گھر کے چند افراد کی موجودگی میں یہ فریضہ

ایکجا رہا ہے۔"

"اچھا۔۔۔" ماہین حیرت سے مسکرائی "ربیعہ کو میری طرف سے مبارکباد دیجئے گا۔ اور نوبت تک ضرور

بٹ آئیے گا۔ میں عریشہ کے ساتھ پار لڑ جا رہی ہوں۔ اسے لے کر سیدھی ہال چلی جاؤں گی!"

"تم بے فکر رہو۔۔۔ مہمانوں کے آنے سے پہلے ہی میں اور ہاشم ہال میں پہنچ جائیں گے!"

ماہین نے ایک محبت بھری نگاہ اپنی خوش اداؤں پر ڈالی اور دل ہی دل میں اس کے حسن اور شخصیت کو

گراؤتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔

ہاشم کی شہلا کو احساس ہوا تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ہاشم کا موبائل مسلسل واٹر پروف کر رہا تھا۔ وہ ذرا سا

سکڑھی اور اسکرین پر آیا نمبر دیکھنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے وہ چونکی تھی۔ اس نے پلٹ کر ڈرائنگ روم کے بند

دروازے کی جانب دیکھا۔ گھر کے لیے سوچا پھر موبائل اٹھا کر آن کیا تھا۔

”ہیلو۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔  
دوسری جانب حیرت بھری خاموشی چھائی پھر آواز آئی تھی۔

”ہیلو۔ شہلا!“  
”آپ کو اس نمبر پر فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ابرار صاحب؟“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ابرار قدرے محتاط ہو کر گفتگو کرتا تھا۔

”شہلا! میں ہاشم سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
”نہیں ابرار! وہ دفعتاً بہت سہولت سے بولی۔ ”میں تم سے ملنا چاہتی ہوں!“

”اوہ۔۔۔ یہ تو میرے لیے بہت مبارک خبر ہے۔“ اس کے لہجے میں چکار آئی۔ ”کب کہاں؟ کیونکر۔“  
شہلا نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔

”پرسوں۔۔۔ پھر وہ بولی۔ ”شام پانچ بجے۔۔۔ جگہ میں تمہیں گھر سے نکلنے سے قبل بتا دوں گی۔“  
”سونا کس آنے کو میم؟“ وہ ہنسا۔ ”سمجھ نہیں آتا یہ سچ کا وقت کیسے گزرے گا!“

شہلا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر وہ پٹی اور ہاشم کی ہاشم اس کے عین پیچھے کھڑا تھا۔  
”یہ میری کالز تم کب سے اینڈ کرنے لگیں؟“ وہ مسکرایا۔

”تمہیں اعتراض ہے؟“ شہلا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔  
”تم من دو تو کا فاصلہ مٹاؤ اور میں معترض ہوں ایسا ممکن ہے؟“

وہ اس کے قریب ہوا۔ شہلا نے جھینپ کر اسے دھکیلا تھا۔  
”دیر ہو رہی ہے۔۔۔“

سے لپٹ جائے گی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گی۔

منیوہ بیگم نے اسے بازوؤں سے تھاما اور کچھ دیر دیکھتی رہیں۔

”سدا سکھی۔۔۔ آباد رہو۔“ پھر وہ جیسے سرگوشی میں بولی تھیں۔ ”ہمیشہ خوشیوں اور پھولوں سے بھر رہے  
دامن۔ اس پیشانی پر کبھی غمو فکر کی ہلکی سی شکن نہ پڑے۔۔۔ یونہی نور کے ہالے میں چمکتی رہے۔“

پھر انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ربیعہ کے لب کپکپائے پلکیں لرزیں لیکن اسے اپنے اندر اٹھتے جوار  
بھانے کو حدوں میں رکھنے کا سلیقہ آتا تھا۔

\*\*\*

وہ گوگوسی کیفیت کا شکار ہوئی بیٹھی تھی۔ حالات نے یکایک جس طرح پلٹا کھمایا تھا۔۔۔ اس کے لیے ایک  
ناقابل فہم سی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

”یہ کس طرح سے ایسا کر سکتی ہے۔۔۔ کیونکر۔“ وہ بار بار ابھرتی تھی۔  
”وہ نے نظروں کا زاویہ بدل کر گھڑی کو دیکھا جو ساڑھے پانچ بج رہی تھی۔

”رات عریضہ اور نافع کا وقت ہے۔۔۔ تمہیں جلدی واپس آنا ہے۔۔۔ فنانس تیار ہو جاؤ۔“ وہ کہتی ہوئی آگے  
بڑھ گئی تھی۔ ورنہ اسی ہنس کیفیت کا شکار ہوئی بیٹھی رہی۔

اچانک دروازے پر مدھم سی دھمک نے آگے چڑھ گیا تھا۔ پھر دروازے کی سمت دیکھ کر وہ بے اختیار کھڑی ہو  
گئی۔ وہاں رافع کھڑا تھا۔

”آپ۔۔۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”آئیے۔“  
وہ چپقلش سے اٹھا۔ ہلکی سی ہلک لڑکتی والی آواز۔

”وہ چپقلش سے اٹھا۔ ہلکی سی ہلک لڑکتی والی آواز۔  
”وہ چپقلش سے اٹھا۔ ہلکی سی ہلک لڑکتی والی آواز۔“

”تم تیار نہیں ہوئیں؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔  
”آپ۔۔۔ وہاں جا رہے ہیں؟“ اس کے لہجے میں ہلکی سی حیرانی تھی۔

”ہاں۔۔۔ میں اور تم دونوں جا رہے ہیں۔ تیار ہو جاؤ۔“  
نجانے کیوں ورنہ نے کچھ روٹوٹ کی مانند اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”رافع باہر نکل گیا۔“ ورنہ نے لباس تبدیل کرنے اور بال بنانے میں صرف دس منٹ لگائے تھے۔ پھر وہ دونوں  
ساتھ ساتھ ہی باہر کی جانب بڑھ گئے تھے۔

\*\*\*

عباد کے ساتھ نکاح کے کاغذات کے ساتھ الجھا ہوا ہاشم بری طرح سے چونکا تھا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے  
پر رافع کو دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ارے رافع بھائی۔۔۔“ عباد بھرپور خوشی سے بولا۔ ”زبردست۔۔۔ آپ نے تو ہماری سادہ سی تقریب کو چار چاند  
لگا دیے۔۔۔ آئیے ٹاپلیز!“

رافع سے مصافحہ اور معافتہ کر کے اس نے رافع کو ہاشم کے برابر بٹھایا۔ رافع نے ہاشم کو دیکھا وہ گردن موڑے  
اس کی جانب متوجہ تھا۔ رافع کے لبوں پر دھیمی ”فسرہ سی“ مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ ہاشم نے اپنا بازو اس  
کے کندھے سے گرو لیا۔ باہر گاڑی کا مارن بجاتا ہوا چونکا تھا۔

photo.com

پنک اور سی گرین کنٹراسٹ کا بیش قیمت اور خوب صورت سوٹ زیب تن کئے کسی گرین مونیوں سے مزین  
نازک سائیٹ پین گریج سنور کر جب اس نے آئینہ دیکھا تو حیران ہی رہ گئی۔ اس ”ربیعہ“ سے تو اس کی آج تک

ملاقات نہ ہوئی تھی۔ یہ ربیعہ جو آئینے میں نظر آتی تھی بے تحاشہ حسین۔ نازک اندام۔ خوش انداز زیب لڑکی  
نجانے کون تھی۔

”تمہاری تصویریں کسی میگزین میں لگ جائیں تو میں پاکستان کی نمبرون بیوٹی شوشن مشہور ہو جاؤں۔۔۔“ اینفنے  
اسے تیار کیا تھا اور اب اپنی مہارت پر خود بے حد حیران تھی۔

ربیعہ نے مسکراتا چاہا۔ پھر اسے محسوس ہوا اس کے لب مسکرانے پر آمادہ نہ تھے۔ اس کا دل ایک جامہ کا  
کیفیت کا شکار تھا۔

انفقداب کیمرہ اٹھا کر دھڑا دھڑا اس کی تصویریں بنا رہی تھی۔  
”میں بہت ایکسیٹینڈ ہو رہی ہوں ربیعہ! کہ میں نے تمہیں تیار کیا ہے اور تم اتنی حسین لگ رہی ہو۔۔۔ ورنہ

دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔۔۔ مجھے نہیں لگتا کہ مسٹر امیر حسن پرسوں کی فلائٹ سے جا سکیں گے۔۔۔ آج تمہارا  
روپ دیکھتے ہی وہ اپنی فلائٹ کینسل کروالیں گے۔“

اس نے شرارت سے اسے چھیڑا تھا۔ ربیعہ محض اس کا دل رکھنے کے خیال سے مسکرا دی۔  
اسی لمحے کمرے میں منیوہ بیگم داخل ہوئی تھیں۔ وہ بہت تھکی تھکی پڑھو اور بیمار نظر آتی تھیں۔

کے قریب آ کر وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں۔ ربیعہ سے نظریں اٹھانا محال ہو گیا۔ اسے لگا ان کا چہرہ دیکھتے ہی وہ ان

”میرا خیال ہے وہ لوگ آگئے۔ آئیے ان کا استقبال کرتے ہیں۔“ عباد کے انداز میں بے حد خوشی اور گرم جوشی تھی۔ ہاشم اور رافع بھی اٹھ کر اس کی پیروی میں باہر کی جانب بڑھے تھے۔

امیر حسن کے ساتھ شہریار احمد اور چند قریبی دوست تھے۔ خوب صورت کڑھائی والے بلک کرتا شلواری میں ملبوس امیر حسن بے حد خوش تھا۔ شہریار احمد ایک وجیرہ مگر نو عمر جوان لگتا تھا۔ عباد کے علاوہ ہاشم اور رافع نے بھی ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں نکاح کی رسم کا آغاز ہوا۔

”میں ربیعہ کی جانب سے گواہ ہوں۔“ شہریار احمد نے کہا تھا۔

”میں امیر حسن کی جانب سے۔“ عباد نے مسکرا کر کہا پھر اس نے رافع کو دیکھا۔ ”ربیعہ کی جانب سے دوسرا گواہ رافع بھائی ہوں گے۔ اور امیر حسن کی جانب سے ہاشم بھائی۔“ ٹھیک ہے نا۔“ رافع اور ہاشم نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ رافع آہستگی سے بولا۔

پھر اس نے نظر اٹھا کر امیر حسن کو دیکھا۔

”میں گواہ بنوں گا۔ اور میں گواہی دوں گا امیر حسن۔“ کہ میں اپنے دل کی ہر تمنا۔ ہر خیال سارے تصور۔ ساری چاہتیں سارے جذبات تمہیں سونپے۔ وہ تمہاری ہی تھی۔ اس سے محبت کرنے کا حق صرف تمہارا ہوا۔ اسے دیکھنے۔ سوچنے۔ سمجھنے کا حق صرف تمہارا۔ یہ دل اس کے تصور سے بھی دستبردار ہوتا ہے کہ اس میں اس بار سا کی توہین ہوتی ہے۔“

ہاشم کا ہاتھ رافع کے زانو پر دھرا ہوا تھا۔ دلفنا ”ہاشم! نہ کہتے تھے تہا کی پشت پر ایک قطرہ گرے محسوس کیا۔ اس نے رافع کے زانو پر دباؤ ڈالا۔ رافع نے دھیرے سے سر ہلایا تھا۔

\*\*\*

بہت اطمینان اور آسانی سے اس نے تین مرتبہ دھیرے دھیرے مگر مضبوطی سے ”ہاں“ کہا تھا اور وہ کسی کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔ ربیعہ امیر حسن بن گئی تھی۔

منیزہ بیگم، شہلا، انیقہ، ترانہ اور وردہ اس کو گلے لگا کر مبارک باد دے رہی تھیں۔ ربیعہ چہرے پر سکون اور خاموشی لیے ان سے دعائیہ کلمات وصول کر رہی تھی۔

”ربیعہ۔“ ترانہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے کہہ رہی تھی۔ ”تم سے متعلق میری جتنی دعائیں تھیں۔ خدا کے پاک نے وہ سب کی سب قبول کر لیں۔ میں آج بہت خوش ہوں ربیعہ۔“

ربیعہ دھیرے سے مسکرائی تھی۔ وردہ یک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کی نگاہ بار بار اس سے ٹکراتی تھی۔ اسے وردہ کی نظروں میں پوشیدہ بے چینی، بے قراری اور سوالیہ نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ جواب میں صرف ایک مبہم سی مسکان تھی جو لبوں کے گوشوں میں چھپی ہوئی تھی۔

کہانے کے انتظامات کے سلسلے میں شہلا، انیقہ اور ترانہ ادھر ادھر ہوئی تھیں تب وردہ نے لب کھولے۔

”یہ سب کیا ہے ربیعہ؟“

”وہی۔ جو میں نے تم سے کہا اور تم نے اس کا یقین نہ کیا۔ میں نے کہا تھا نا۔ میں انگلی جھلے ہوں تم نہیں مانتیں۔ دیکھ لو میں نے سچ کہا تھا۔“

”لیکن رافع۔“ وردہ کے لب کانپے۔

”رافع بہت اچھے انسان ہیں وردہ!۔“ ربیعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ان کی جوڑی تمہارے ساتھ بنی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہو۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں کا ساتھ بہت مضبوط محبت بھرا بہت طویل اور خوب صورت ہو۔“

وردہ اداسی سے مسکرائی۔

”ایسی دعا میں مت کرو ربیعہ! جن کا پورا ہونا ممکن ہی نہ ہو۔“

”میری دعا کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں وردہ۔“ ربیعہ مضبوط لہجے میں بولی ”میری دوست ہو تم۔ اور دوست تو۔ دوستی کی خاطر۔ آنکھ بند کر کے کھائی میں بھی چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ تمہارے ہی الفاظ ہیں نا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنے الفاظ کو ثابت کر سکو۔ اگر میں تم سے ایسا چاہتی ہوں تو تمہیں ایسا ہی کرنا ہو گا۔“ وردہ نے بے حد بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

\*\*\*

”ربیعہ! امیر حسن تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ عباد اس کے پاس آیا تھا۔

ربیعہ نے سر اٹھا کر حیرانی سے عباد کو دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

عباد خاموشی سے باہر چلا گیا تھا۔ چند لمحوں بعد امیر حسن اور شہریار احمد اندر داخل ہوئے تھے۔ ربیعہ بے اختیار کھڑی ہوئی۔ امیر حسن اپنی جگہ ٹھہر گیا جبکہ شہریار احمد آگے بڑھا تھا۔

اس نے ربیعہ کے ہاتھ تھامے اور مسکرایا۔

”آلی۔“ آپ میری آلی ہیں نا؟“ وہ شفاف نظر اس کے چہرے پر جمائے پوچھ رہا تھا۔ ربیعہ اب تک نہ دلی تھی۔ اچانک ہی اس کے کان میں اس کے سر کا گڑبڑی۔

شہریار نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا چہرہ اٹھا کر اس کے آنسو صاف کیے۔

”مت روئیں آلی۔ رونے کے موسم گزر گئے ہیں۔ اب تو صرف ہنسنے اور مسکرانے کے دن ہیں۔ آپ اپنی ای سے جدا ہو کر اپنے باپ اور بھائی کے قریب رہیں گی۔ ہر طرح کی فکر اور اندیشے سے خود کو آزاد کر لیں۔“

”قرابت داری میں خاکسار کا نام بھی شامل کر لیں تو کوئی حرج نہیں۔“ امیر حسن مسکراتا ہوا آگے بڑھا تھا۔

شہریار ہنس دیا۔ ربیعہ بھی دھیرے دھیرے مسکرا دی تھی۔

”چلیں آپ لوگ باتیں کیجئے۔ میں امی کے پاس بیٹھتا ہوں۔“ شہریار مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر وہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔

امیر حسن ہولے سے کھنکار کر اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ ربیعہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔

”ربیعہ!“

ربیعہ نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں متبسم اور مہربان تھیں۔

”نئے ساتھ کی ابتدا مبارک ہو۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھوں میں جذب کرتا ہوا بولا تھا۔

”میرے جذبات کو پذیرائی عطا کرنے کا شکریہ۔“ آپ کی یہ نوازش عمر بھر اس دل پر جلی حروف میں لکھی رہے گی۔“

ربیعہ نے بے ساختہ حیران نگاہیں اٹھائی تھیں۔ بے حد کوئل اور اچھوتے پن سے وہ اپنے جذباتوں کا اظہار کر رہا تھا امیر حسن نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما۔



”میں پرسوں یو کے جا رہا ہوں وہاں کام تو خیر کیا خاک کروں گا۔ ساری توجہ سارا ارتکاڑ تو یہاں چھوڑ جاؤں گا۔“  
 آپ کے پاس۔ آپ کے کاغذات تیار ہونے میں جتنا وقت لگے گا میں ایک ایک سیکنڈ بھی گن کر گزاروں گا۔“  
 اس کے ہاتھ میں ربیعہ کا ہاتھ لرزے لگا تھا۔ اس کی ہتھیلی بھیگ گئی۔ امیر حسن ہولے سے ہنس دیا۔  
 ”آپ۔۔۔ کچھ نہیں کہیں گی؟“ وہ فوراً شوق سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”نہیں!“ اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔

امیر حسن مسکرا دیا۔  
 ”آپ کی تین مرتبہ والی ”ہاں“ کے بعد اب ہر ناں منظور ہے۔“

ربیعہ نے لب بھینچ کر مسکراہٹ روکی تھی۔  
 ”لیکن آپ سے ”ہاں“ کہلوانے کے کئی طریقے مجھے بھی آتے ہیں۔ مثلاً۔۔۔“ ربیعہ نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں اب جاؤں؟“

ربیعہ نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔  
 ”دیکھا آپ نے۔۔۔“ وہ زور سے ہنس دیا تھا۔

ربیعہ بری طرح سے جھینپ گئی۔

امیر حسن نے اس کا ہاتھ چھوڑنے سے قبل آہستگی سے لبوں سے لگا دیا۔

”آپ کی یہ حیا۔۔۔ اور کم آمیزی۔۔۔ فی الوقت یہیں تک آنے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن خدا را۔۔۔ میرے حال پر ترس کھائیے گا۔ کاغذات بننے کے بعد ایک دن کی ڈوری کی اجازت نہیں ہوگی۔ ٹھیک ہے نا؟“  
 ربیعہ نے سر جھٹک لیا۔

”جلدی آجانا ربیعہ! پلیر۔“ وہ اس کے کان کے قریب گپٹایا تھا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

”خدا حافظ۔“ وہ مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔

”خدا حافظ!“ ربیعہ نے اس کی پشت کو دیکھ کر آہستگی سے کہا تھا۔

بہت سے چمکتے چہروں کے درمیان وہ تنہا اور اداس تھا۔ ہنستے مسکراتے نفوس کا اس کے ارد گرد سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان اس طرح چل رہا تھا جیسے اس کی کوئی پہچان، کوئی شناخت نہ ہو۔ کوئی اسے جاننا نہ ہو۔ وہ کسی کو جانتا ہو۔

”رافع۔۔۔“ ایقان نے دفعاً ”اے پکارا تھا۔“

رافع کسی معمول کی مانند اس آواز پر ٹھہرا۔ چمکتی مسکتی ایقان کی نظروں میں بے اختیار سی جیرانی تھی۔  
 ”ایسے خاموشی سے، یوں سنجیدہ سی شکل بنا کر کہاں سے آرہے ہو۔۔۔ کچھ دیر پہلے سب تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“

رافع کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

”پہچھوس۔۔۔ آپ خوش ہیں نا؟“ اس کے سوال نے ایقان کو حیران کر دیا۔

”ہاں۔۔۔ بہت!“ اس کا اعتراف بھرپور تھا۔

”خوش رہیں۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔“ اس نے محبت سے اس کا کال پتھپٹا کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ایقان نے نہایت جیرانی سے اس کی پشت دیکھی تھی۔

پاس سے گزرتے ہاشم نے دفعاً ”رافع کا بازو تھام لیا تھا۔ رافع رک کر اسے دیکھنے لگا۔“

”ہاشم۔۔۔“

اس کی نظروں میں عجب سی وحشت اور ویرانی تھی۔ ہاشم رہ نہ پایا اس نے رافع کو گلے سے لگا لیا۔  
 ”ہاشم۔۔۔ تم خوش ہونا؟“

ہاشم خاموشی سے اس کی پشت تھپکتا رہا۔

”سب لوگ خوش رہیں ہاشم۔! اور میں بھی بہت خوش ہوں۔۔۔ مجھ پر ترس مت کھاؤ۔ کمزور مت سمجھو مجھے۔۔۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ حقیقتوں کا سامنا کیسے کیا جاتا ہے۔ مسکرا کر خندہ پیشانی سے مردانہ وار۔ وہ بہت بہادر ہے ہاشم! اتنی بہادر جتنی وہ نازک ہے اس نے مجھے بہادر بننا سکھایا ہے، جینا سکھایا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراتا سکھایا ہے۔ میں اس کا احسان مند ہوں۔۔۔ ہمیشہ رہوں گا۔“

ہاشم نے الگ ہو کر اٹھنے کا چہرہ دیکھا۔

”ابھی بھی بہت فرق ہے رافع۔“ پھر وہ بولا ”میں ابھی اس سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان ہے۔ آنکھوں میں نہ ختم ہونے والا یقین اور اعتبار۔ اور گفتگو میں ربط اور ٹھہراؤ۔ تمہاری آنکھوں میں وحشت ہے۔ چہرے پر مایوسی اور گفتگو میں بے ربطی کیا سیکھا تم نے اس سے؟“

رافع ٹھٹھک سا گیا۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتا رہا۔

”ٹھٹھک کہتے ہو تم ہاشم۔“ پھر وہ آہستگی سے بولا ”محبت و وحشت کا جنگل نہیں ہے۔ یہ وہ دیوانگی ہے جو زندگی گزارنے کا سلیقہ بن جاتی ہے۔ وہ گداز، خشک خیال، کہ دو سروں کے دکھوں پر رونا اور دو سروں کی خوشیوں پر مسکراتا آ جاتا ہے۔“

ہاشم یک لخت کھل کر مسکرا دیا۔

”میرا دوست تو جی جی میں بدل گیا۔۔۔ واہ رے محبت۔۔۔ تجھے سلام!“

رافع دھیمے سے مسکرایا تھا۔

رنگ و بو کی محفل میں خوشیوں کی پڑیاں ہنستی مسکراتی پھر رہی تھیں۔ ہر چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ تھی۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیکھنے لگے۔

\*\*\*

کمرے میں داخل ہو کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھکا پھر خاموشی سے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھا تھا۔

بیچ پر بیٹھی عریشہ نے اس کی پشت کو دھیمے سے مسکا کر دیکھا تھا۔ چند دن پہلے ایسی ہی ایک مہلتی رات اس کی بے وقوفی کی نذر ہو چکی تھی۔ ایسی بڑی حماقت کی۔ کہ نافع جیسا حوصلہ مند ہی اس کا تحمل ہو پایا تھا۔ ایسی بے وقوفیاں جو زندگی بھر کے تاسف اور پچھتاؤں کا سبب بن جایا کرتی ہیں عریشہ بحفاظت اس شرر کی بلند ہوتی لپٹوں سے باہر نکل آئی تھی تو نافع کے ظرف کی بدولت۔۔۔ وہ اس کا سامنا کرتا تھا۔ اس کا محافظ۔ ہاں اس سے کچھ ناراض ضرور تھا لیکن آج وہ اس کی ہر ناراضی دور کر دینے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی۔

نافع لباس تبدیل کر کے باہر آیا۔ نظروں میں الجھن بھر کر اس نے بیڈ کے پیچ بیٹھی ”دلہن“ کو دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ گلی کی جانب کھلتے دروازے کی جانب بڑھا۔ شاید عریشہ کے سونے کا انتظار وہ کمرے سے باہر جا کر کرنا چاہتا تھا۔

”نافع!“ یکایک اس کی مترنم آواز پر وہ پلٹا تھا۔ ”مجھے کچھ کہنا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ بولو۔۔۔“

”یہاں آؤ۔۔۔“ وہ مسکرائی۔

نافع کو اس کی دودلکش مسکراہٹ اپنی کسی حم گشتہ قیمتی متاع کی مانند لگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تھا۔ عریضہ بید سے اتری پھر اچانک جھک کر اس نے نافع کے پیر تھام لیے۔

”نافع۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔ پلین۔۔۔“

نافع نے بجلی کی سی تیزی سے جھک کر اسے اٹھایا۔ عریضہ تڑپ کر اس کے سینے سے لگی تھی۔

”نافع۔۔۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے کہنے کے لیے۔۔۔ بس اتنا کہ مجھے معاف کر دو۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔ ”نئی زندگی کی شروعات اس طرح سے کرو کہ ہمارے درمیان یقین، محبت اور اعتبار کے سوا کچھ نہ ہو۔ کوئی جگہ، شکوہ، شکایت، بے یقینی۔۔۔ خفگی، ناراضی کچھ بھی نہیں۔“

نافع نے اسے الگ کر کے اس کا چہرہ دیکھا۔

”مجھے کوئی بے یقینی۔۔۔ خفگی ناراضی نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”ہاں کچھ شکوے ضرور ہیں مجھے میرے اس حق سے کیوں محروم کر رہی ہو؟“

”جس سے تمہیں گلے شکوے تھے نافع۔۔۔ وہ عریضہ شادی کی کرات اس سچ پر مرچکی ہے۔۔۔ جو تمہارے سامنے ہے۔۔۔ اس عریضہ سے گلے شکوے کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔۔۔ کیونکہ یہ سر سے پاؤں تک صرف تمہاری ہے ہمیشہ سے ہمیشہ کے لیے۔“

نافع اس کی خوب صورت وضاحت پر مسکرائے بنانہ رہ چکا۔

”تم کتنا ہی بچو۔۔۔ میں نے وہ سارے گلے شکوے ضرور اگلے ہیں۔۔۔ جو تمہارے کب سے اندر ہیں۔“

براجمان ہیں کہ محبت کو جگہ تھوڑی پڑتی ہے۔

وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر بولا۔ عریضہ کلی نظروں سے اسے تنگنے لگی۔

”ان بے چاروں کے کہنے سننے سے اس رات کی خوب صورتی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ مزید بولا۔ ”کیونکہ محبت جس چیز میں مل جائے اسے خوب صورت بنا دیتی ہے۔۔۔“

عریضہ مسکرا دی۔ نافع بھی مسکرا دیا۔ سچ پر بکھرے پھول بھی مسکرا دیے تھے۔

دونوں ہاتھ کر پر رکھے وہ شوریدہ سر لہروں کو اپنے قدموں تک آ کر دم توڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آج بھی اس کے انداز میں وہی غرور اور طنطنہ تھا۔۔۔ نہ جھکنے والی کیفیت تھی۔

”ابرا صاحب!“ شہلا نے اسے قدرے فاصلے سے پکارا۔ وہ اچانک ہی مڑا۔

”اوہ۔۔۔ تم آگئیں۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ اس کے قریب چلا آیا۔

”کتنی مرتبہ کہا تمہیں۔۔۔ یہ گلاسز مت پہنا کرو۔“ وہ اس کے سیاہ گلاسز دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

”اپنے اور تمہارے درمیان مجھے اب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔“

”میرے اور آپ کے درمیان صدیوں کا نوری فاصلہ حائل ہے ابرا صاحب۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

”اسے پانا ناممکن امر ہے۔“

”ایسے مت کہو شہلا! پلین۔۔۔“ وہ تڑپ سا گیا۔ ”میں تو سمجھا تھا تم مجھے ہر فاصلہ ختم کر دینے کی نوید سناؤ گی۔۔۔ وہ الفاظ جو سننے کے لیے میں۔۔۔ نجانے کب سے۔۔۔ تمہاری کے صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔“ شہلا گلاسز کے پیچھے سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے لب آپس میں سختی سے پوست تھے۔

”مسٹر ابرا۔۔۔“ پھر وہ بولی ”آج میں بیس سال کی کم فہم اور جذباتی دو شیرہ نہیں ہوں۔۔۔ میں ایک باشعور عورت ہوں۔۔۔ جو الفاظ اور عمل میں فرق بخوبی محسوس کر سکتی ہے۔۔۔ تم نے مجھے طلاق دی۔ جذباتی ہو کر، غفلت میں، غصہ میں۔۔۔ چلو! میں مان لیتی ہوں پھر تم نے پلٹنے میں اتنا عرصہ لگایا اتنا کہ تمہارا بیٹا اپنے قدموں پر چل کر بولنا سیکھ گیا۔ تمہارے بارے میں استفسار کرنا سیکھ گیا۔۔۔ اتنا عرصہ کہاں تھے تم؟ جوگی بن کر خھر پاتے رہے؟ وحشی بنے جنگلوں کی خاک چھانٹتے رہے؟ نہیں ابرا۔۔۔ تم اپنے ماں باپ کے اس دنیا سے گزر جانے کا انتظار کرتے رہے۔“

”شہلا۔۔۔“

”میری بات سنو ابرا! مجھے میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ آج میں کچی عمر کی لڑکی نہیں ایک سمجھ دار عورت ہوں۔ ہر قسم کے حالات کا تجزیہ کر سکتی ہوں میں جانتی ہوں کہ تم نے اپنے باپ کی زندگی میں بغاوت کیونکر نہ کی کیونکہ شادی کے ابتدائی چند مہینوں کا عرصہ ان کی کفالت کے بغیر گزار کر تمہیں ان کی اہمیت کا پوری طرح اندازہ ہو چکا تھا۔ سو میرے ساتھ رکھے گئے ناروا سلوک پر بھی تمہاری زبان خاموش رہی اور مجھے طلاق بھیجتے وقت بھی تم نے ان کے پٹے میں رکھے ہوئے زمین و جائیداد کے وزن سے میری محبت کے وزن کو ہلکا اور بے مول تصور کیا۔۔۔ جب تک وہ زندہ رہے تم نے کبھی مجھے ٹوکا یا اپنے لب سے کوئی بات بھی یاد نہیں کیا جس کی محبت کو آج تم اپنی زندگی کے لیے لازماً قربان کر دیتے ہو۔۔۔ اب تم آزاد ہو ابرا! تو ایک بار پھر میرے وجود کو محبت کے نام پر اپنی کشتی میں قید کر لیا جاتے ہو۔“

وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکی۔ ابرا حیرت سے پھٹکی آنکھیں لیے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔

”لیکن اب میں محبت کو پہچانتی ہوں۔۔۔ اس کی خوشبو، اس کی دلکشی۔۔۔ اس کے تقاضوں کو بخوبی سمجھ لیتی ہوں۔۔۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میرے شوہر نے مجھے سچی محبت کی ہے۔ ایسی اصلی اور سچی محبت جس کے چہرے پر

نفس اور کھوٹ کا کوئی نقاب نہیں۔۔۔ جس کی روشنی سے زندگی کی نظریں خیرہ ہو جاتی ہیں۔۔۔ جس کا ذائقہ چکھنے کے بعد میں قیامت تک بکے لیے آسودہ اور مطمئن ہوں۔۔۔ سو اب تم مجھے پکارو یا یوس ہو کر پلٹ جاؤ۔۔۔

(بکھرے دل کے لیے بکھرے دل کے لیے) میرے پاس وہ سماعت ہی نہیں جو تمہیں سن سکے اور وہ گویائی ہی نہیں جو تمہاری کسی پکار کا لب رے پاتی۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے درمیان یہ آخری وضاحت ہے۔۔۔ میں تمہارے اندر کے کھوٹ پہنچاتی ہوں ابرا۔۔۔ اس یقین دہانی کے بعد آئندہ مجھ سے نظر مت ملانا ہاں ہمارے درمیان رابطے کی ایک کرن ضرور موجود ہے۔ لیکن اس کڑی کے سروں کو آپس میں کچھ نسبت نہیں۔۔۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔۔۔ عمر کے واسطے جب بھی ہماری ملاقات ہوگی اس میں ہمارے درمیان پہچان کا کوئی حوالہ نہ ہو گا۔“

ابرا خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر یکایک وہ پلٹا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دور جانے لگا۔۔۔ بالا خروہ بڑھتے ہوئے ایک نقطے کی سی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ شہلا کافی دیر وہاں کھڑی اپنے پیروں سے لپٹتی لہروں کو

دیکھتی رہی۔

”نہیں؟“ اچانک کوئی بے حد قریب سے بولا تھا۔

”بے اختیار پلٹی۔“

”ہائیم! آپ! یہاں؟“ وہ نجانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

”بے اختیار پلٹی۔“

”ہاں... میں یہاں۔ تم جہاں کہیں بھی ہوتی ہو۔ محبت مجھے آواز دے لیتی ہے... میں مجبور ہوں“ وہ دلکشی سے مسکرایا تھا۔ شہلا نے کلا سزا تار کربا تھ میں تھام لیے اور اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کے اور ہاشم کے درمیان کچھ حائل ہوتا... اسے گوارا نہ تھا۔

\*\*\*

وہ پورے ایک ہفتے کے بعد لوٹا تھا لیکن اس کے چہرے پر شاشت اور تازگی تھی۔ ”سب کام نمٹا کر آ رہا ہوں...“ عباد نے ربیعہ کو فائل تھمائی۔ وہ نواب شاہ سے ربیعہ کی ملکیت کا رد عوادا کر کے اور اس کے مکان اور دکانوں کے کاغذات حاصل کر کے آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا ربیعہ کے نام جو کچھ ہے اسے مل سکے۔ ربیعہ نے فائل کھول کر دیکھی... کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور اداسی سے مسکرائی۔ ”میں نے تو آپ کو منع کیا تھا عباد بھائی...“ وہ بولی ”مجھے ان چیزوں کی تمنا نہیں اور ضرورت بھی نہیں۔“ ”یہ تمہارا حق ہے ربیعہ بیٹی۔“ منیزہ بیگم نقاہت سے بولیں۔ ”اپنا حق حاصل ضرور کرو... پھر خواہ اسے رکھو یا کسی غریب کو بخش دو۔“

”عباد بھائی...“ ربیعہ نے اچانک فائل اسے واپس تھادی۔ ”مجھے اس گھبرائی چند دکانوں کی قطعاً حاجت نہیں... یہ دادی کی ملکیت تھیں دادی ہی کو ان کی ضرورت ہے۔“ ”تمہاری دادی کو؟“ عباد نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”جی ہاں!“ ربیعہ نے اپنی پلکوں پر چمکتے ستارے محسوس کیے۔ ”میری دادی کو... میں چاہتی ہوں عباد بھائی کہ آپ یہ سب کچھ کسی ٹرسٹ کو دے دیں تاکہ یہ صدقہ جاریہ بن کر ان کے عذاب میں تخفیف کا باعث بنے۔“

”ربیعہ!“ منیزہ بیگم کے لب کانپے تھے۔ ”جی امی...“ ربیعہ بے اختیار ان سے لپٹ گئی۔ ”میری دادی اس جہاں ہیں خوش ہیں... میں جانتی ہوں آپ کی ممتا کی پیاس نے ان کی روح کو پیٹے صحرائے بیہوشی میں رہنے کی سزا سنائی ہے۔ لیکن امی جی! دادی نے مجھے ہمیشہ محبت کے دریا سے سیراب رکھا۔ اس طرح کہ میں اپنے عمر کے اس حصے میں ممتا کی طلب کو بھی محسوس نہ کیا۔“

منیزہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو چلے۔ ”امی جی... امی جی... ہو سکے ہو سکے تو میری دادی کو معاف کروں امی جی... بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ منیزہ بیگم کی بند پلکوں سے موتی سیج کے دانوں کی مانند گر رہے تھے۔ ”امی جی... میری دادی... بہت عذاب سہا، چلیں... اب میری خاطر آپ انہیں معاف کر دیں۔“ وہ تواتر سے کہے جا رہی تھی۔ منیزہ بیگم کا کپکپاتا ہاتھ اس کی پشت تھپکنے لگا۔

\*\*\*

ایک ماہ کے اندر اندر اس کے کاغذات تیار ہو گئے تھے۔ وقت روانگی آپہنچا تھا۔ عباد اس کے اور شہر کے ٹکٹس کنفرم کروا کر لوٹا تو ماحول سوگوار سا ہو گیا۔ منیزہ بیگم بے حد کمزور ہو چکی تھیں۔ اب بستر سے اٹھنا بھی ان کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ربیعہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ جتنا چاہتی تھی سو ہر وقت ان کے قریب ہی موجود رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ان کے قریب بیٹھی ان کا سر آہستہ آہستہ دباری تھی۔ ان کی آنکھوں سے بار بار قطرے پھسلتے۔ ربیعہ خاموشی سے انہیں صاف کر دیا کرتی تھی۔

”تمہارا سارا سامان تیار ہے۔“ انیقہ اس کی پیکنگ سے فارغ ہو کر اس کے قریب آ بیٹھی۔ ”یہاں جا کر کھولو گی تو مجھے یاد کرو گی... اتنی نفاست سے پیکنگ کی ہے میں نے... چیکنگ کے دوران بھی اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”میں ویسے بھی تم سب کو بہت یاد کروں گی انیقہ۔“ وہ اداسی سے بولی۔ ”امی کا بہت بہت خیال رکھنا۔“ ”پگلی... یہ کہنے کی باتیں ہیں۔“ انیقہ نے اسے گلے سے لگالیا۔

\*\*\*

ایئر پورٹ پر معمول کی گھما گھمی تھی۔ ربیعہ کو الوداع کہنے کے لیے کئی چہرے موجود تھے۔ شہلا، ہاشم، انیقہ، عباد، وہیل، خیبر، منیزہ بیگم... ترانا، عبدالباری، فراز، ناعمدہ اور سب سے مل کر اس نے وردہ کو دیکھا تو اسے خوشی آمیز حیرت نے گھیر لیا۔

”وردہ...“ وہ اس سے لپٹ گئی۔ ”تم نے تو مجھے حیران ہی کر دیا۔“ ”کیوں...“ وہ پر غم آنکھوں سے مسکرائی۔ ”مجھے دوست نہیں سمجھتیں؟“ ربیعہ نے ناقابل فہم سی مسکان کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا۔

”تم جانتی ہو وردہ...! میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں! بہت چاہتی ہوں میں تمہیں...“ اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے وردہ کے ہاتھوں کو انہوں نے دھیرے سے دیا۔

”اور میں چاہتی ہوں کہ تم زندگی سے اپنے حصے کی سادگی حاصل کرو۔“ دونوں بے اختیار لپٹ گئیں۔ پھر سب سے باری باری مل کر باری باری یاد خدا حافظ کہہ کر اور شہر بار احمد لاؤنج میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کے اندر چلے جانے کے بعد ہر نظر ان کی طرف ہی رہا۔ انیسو صاف کر رہے تھے۔ انیقہ نے منیزہ بیگم کا چہرہ صاف کرنا نہیں خود سے پسند کیا۔ ”میں ہوں نا امی... آپ کی دادی ربیعہ...“ وہ بولی تھی۔

## ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت ناول

خوبصورت ناول

منیہرہ جلد

آفٹ ہیپ

شائع ہو گئے ہیں

|                                 |                |
|---------------------------------|----------------|
| ستاروں کا آئینہ، نسیم سحر قریشی | قیمت: 400 روپے |
| ایمان امید اور محبت، عمیرہ احمد | قیمت: 200 روپے |
| اے وقت گواہی دے، راحت جبین      | قیمت: 350 روپے |
| تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری  | قیمت: 180 روپے |
| امر نیل، عمیرہ احمد             | قیمت: 450 روپے |

ایئرپورٹ سے باہر آتے ہی وہ ٹھٹھک گئی۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر رافع کھڑا تھا۔ وردہ نے گردن موڑ کر فراز اور ناعمہ کو دیکھا۔ وہ ان کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ رافع نے گلاسز اتارے اور آگے بڑھ آیا۔  
”وردہ!“

وردہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان سپاٹ نظروں میں عجب سی خاموشی تھی۔  
”چلیں؟“

”لیکن میں۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا پھر رک گئی۔

پھر اس نے ناعمہ اور فراز کو دیکھا تھا۔

”آپ لوگ چلیں۔۔۔ میں رافع کے ساتھ آجاتی ہوں۔“ کہتے ہوئے اس کے انداز میں ہلکی سی حیا در آئی اور گال سرخ پڑ گئے۔ فراز اور ناعمہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ شہلا اور ہاشم بھی دور سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

وردہ نے رافع کا پھیلا ہوا ہاتھ تھاما اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے ساتھ ہوئی۔

وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھیں۔  
”امی جی۔۔۔“ عباد کی پکار پر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ان کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔  
”ربیعہ اور شہریار احمد، شہناز خیریت کے پہنچ گئے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔  
انہوں نے آہستہ سے الحمد للہ کہہ کر لرزتے ہاتھ منہ پر پھیرے۔

”میں ان سے آپ کی بات کروا تا ہوں۔“ عباد کے انداز میں عجیب سی ٹینشن تھی۔

پھر اس نے دونوں بازوؤں میں انہیں اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھایا اور وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اپنی اسٹڈی میں لے آیا جہاں انیقہ اس کے کمرے کی طرف دیکھ کر بیٹھی تھی۔  
اسکرین پر ربیعہ نظر آرہی تھی۔ منیوہ بیگم کی آنکھوں میں روشنی در آئی۔ عباد نے انہیں ربیعہ کے روبرو کر دیا۔

ربیعہ کی آنکھوں میں نمی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ”دفعۃً“ اسکرین پر ایک کمزور مدقوق چہرہ نمودار ہوا۔ منیوہ بیگم سہکت رہ گئیں۔ یہ چہرہ یہ سناسا چہرہ۔۔۔ یہ اپنا اپنا سا لگتا چہرہ۔۔۔ کون تھا یہ شخص۔۔۔ ان کا ماضی۔۔۔ ان کی روشنی تقدیر۔۔۔ ان کا مہربان۔۔۔ پھر ان کا ستم گر۔۔۔  
احمد جہاں زیب نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ ان کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں منیوہ بیگم ساکت بیٹھی رہ گئیں۔ وہ ان ہاتھوں کو دیکھے جاتی تھیں۔

اچانک ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اسکرین خاموش ہو گئی۔

عباد نے چونک کر ماں کی سمت دیکھا۔ وہاں بھی ایک جلد خاموشی تھی۔

”امی۔۔۔“ اس کے لبوں سے سرگوشی کی صورت برآمد ہوا۔

”امی۔۔۔“ انیقہ نے چیخ ماری تھی۔

سارے رابطے منقطع ہو چکے تھے۔ عباد نے آہستگی سے ماں کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بابا۔۔۔ بابا۔“ ربیعہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ شہریار احمد نے اسے گلے سے لگایا۔ امیر حسن نے ان کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بند کیا تھا۔

دو روحیں بدگمانی کے ہر بندھن سے آزاد آسمانوں کی جانب محو سفر تھیں۔

(ختم شد)